

UNIVERSAL
LIBRARY

OU_224083

UNIVERSAL
LIBRARY

OSMANIA UNIVERSITY LIBRARY

Call No.

1915011-0

Accession No. 8

Author

Title

19111
This book should be returned on or before the date last marked below.

رسالہ کلیم دہلی

سورجہ یکم جنوری ۱۹۳۸

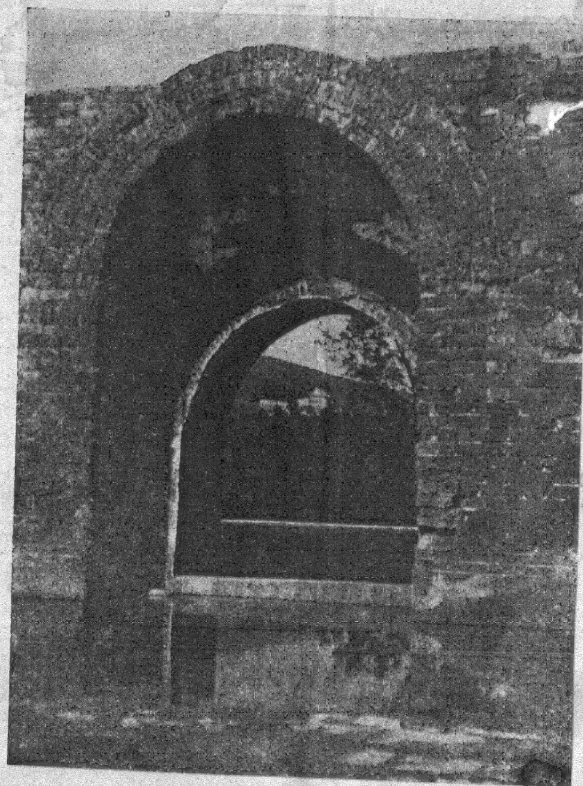
Checked 1963

CHECKED 1951

cked 1975



لنس سپاواچہ پتیاالہ



نانکن-ہون شہر پناہ کے دروازہ سے جھوڑیہ چین کے باقی
سی بافت کے مقبرہ کا نظارہ

بنام قوت و حیات

کلدھ

اے گے گی صدیوں ہے فسانہ اپنا
بہروں کو سنائے جاترا اے اپنا
چند سہ ماہی، دو روپے

منظور شدہ
ڈاکٹر کران تعظیم

آئے گلہز جانے کب زمانہ اپنا
قدرتِ مہربانے محکوم صغیف حکیم
سلاخانہ چند، چھ روپے
ششماہی چند، تین روپے

ریاستہائے میسور، پٹیلہ وحید رآباد (دکن)
قیمت فی کپی: نو آنے

جلد	عنوان	مضمون نگار	نمبر صفحہ	نشر	عنوان	مضمون نگار	نمبر صفحہ
۱	اشعار	میلید	۳	۱۶	کب آئے گا؟ (نظم)	جناب سید صاحب سیدی چوٹی ٹونک رانا	۵۲
۲	سکس چوٹی (نظم)	چوٹی شیخ آبادی	۱۱	۱۷	افواجی	جناب سید عبدالنہد صاحب آسیر	۵۳
۳	قرآن اور اس کے مطالعہ میں بھارت	جناب مولانا ابوالکلام صاحب آزاد دہلا	۱۳	۱۸	نجاتی عارفانہ (نظم)	چوٹی شیخ آبادی	۵۵
۴	رفیقہ حیات کے نام (نظم)	جناب مجید ملک صاحب	۱۶	۱۹	پاکستانی بکر (دکٹر پروگیا)	مستر جناب منٹو صاحب	۵۶
۵	انسانی فرائض و حقوق	جناب سید اختر علی صاحب تہری	۱۷	۲۰	عورتوں کی لائی	جناب گوڑ صاحب چاند پوری	۶۳
۶	باغی شاعر	جناب نند لال صاحب قلم گھوڑی	۲۰	۲۱	آزادی تحریر (نظم)	جناب حفیظ صاحب بوسنی راپوری اہلے	۶۶
۷	معاذتِ ذہین	چوٹی شیخ آبادی	۲۱	۲۲	شاعری اور تنقید جدید	جناب رامیش نارائن صاحب انتر اہلے آگرہ	۶۷
۸	دین کے فرائض سے خطاب (نظم)	جناب علامہ پندت برج بھون صاحب داتا گپتی	۲۲	۲۳	اسے کاش.....! (نظم)	جناب اعظم صاحب خردی بے پوری	۶۹
۹	مناسباتِ خیریت	جناب عبدالرحیم صاحب شیخ بی کام	۲۵	۲۴	حبیب وطن اور وطن (نظم)	چوٹی شیخ آبادی	۷۰
۱۰	نہیں ہی کوئی ساتھ نا (نظم)	جناب بزم کشوی	۲۸	۲۵	خیر و کفایتان	چوٹی شیخ آبادی	۷۱
۱۱	دقت سے بچک	جناب مجید ملک صاحب	۲۹	۲۶	ادب و ہنر سے	جناب آکمل صاحب امرت سر	۷۲
۱۲	ریا کاری (نظم)	جناب سنجش اکبر آبادی	۳۲	۲۷	محبت	جناب حماد وحید صاحب شیخ آبادی	۷۳
۱۳	نہولی ادبیت	جناب انصاف احمد خان صاحب شیخ آبادی	۳۳	۲۸	رقا برداشت	ادب و ہنر	۷۴
۱۴	جوانی (نظم)	چوٹی شیخ آبادی	۳۴	۲۹	نقد و نظر	ادب و ہنر	۷۹
۱۵	نظم اور قدم (دکٹر پروگیا)	مستر جناب اسرار علی احمد خان صاحب	۳۵	۳۰	ارستہا تات	مستہرین	۸۰

(چوٹی شیخ آبادی پر نکلنے والے ہر خط پر محبوب اللہ علی برلی پریس دہلی میں چھپو اگر دفتر سرائیہ دریا گنجیہ جیست شریانی)

دہلی کے حاکم نے فرمایا کہ اس کا حال یہ ہے کہ وہ
مردم کو دیکھ کر کہتا ہے کہ یہ لوگ کون سے ہیں
وہ کہتا ہے کہ یہ لوگ کون سے ہیں
وہ کہتا ہے کہ یہ لوگ کون سے ہیں

اشک

ہندوستان کی غلامی کے ذمہ دار

مدیر

تو کیا چیز ہے، تمام یورپ کی تمام مجموعی قوتیں بھی کوئی حقیقت نہیں رکھتی ہیں۔
لیکن اس تمام عظمت و پہنائی کے باوجود ہندوستان آج ایک
مغلوب و مفتوح ملک بنا ہوا ہے۔

آخر اس کے اسباب کیا ہیں؟

ہر چند میں سیاسیات کا ماہر نہیں ہوں، اور اسی وجہ سے یہ بت
نہیں کہ میری رائے سچی، یا غلط ہو، مگر میں نے غلوں کے ساتھ میں چرکا
تھا چلا یا ہے۔ اجازت دیجئے کہ اُسے آپ کی خدمت میں پہنچ کر دوں۔
میرے نزدیک ہندوستان کو انگریز نہیں، بلکہ غلام بنائے ہوئے
ہیں ہندو، اور مسلمان ——— جی ہاں، آپ کے کانوں کو دھوکا نہیں
ہوا، میں نے یہی عرض کیا ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو غلام بنائے ہوئے
ہیں، ان کے مذہب۔

مذہب کا نام شکر آپ چمکے نہیں۔ یہ ہم میں بڑا عیب ہے کہ
ادھر مذہب کا نام شتا، ادھر ہم کف دروہاں ہو کر محبت و خیر کرنے لگے۔
حواں کو ملنے کے لیے ہری بات بنیے۔ ——— میں نفس مذہب پر
کوئی حملہ نہیں کر رہا ہوں۔ یہ یہ امدعا نہیں کہ ہندوؤں مسلمانوں کا مذہب
ایسا ناقص ہے کہ وہ انہیں غلام بنائے ہوئے ہے۔

میں تو صرف اس قدر کہنا چاہتا ہوں کہ ہندو، اور مسلمان، دونوں
مذہب اور مذہب مذہب کو اس غلط طرے استعمال کر رہے ہیں کہ ان میں
شتر کہ قوم کی مجموعی قوت پیدا ہی نہیں ہونے پاتی، اور اسی وجہ سے ہندوستان

اسلامی حکومت کے زوال، اور ایٹم انڈیا کہنے کے موقع کے اسباب
وہی ہیں کہ کوئی گتھ کرنا نہیں چاہتا۔ ——— یہ عرض کرنا ہی چاہتا ہوں
کہ وہ کیا اسباب تھے، جن کی بنا پر ہندوستان کا سا ملک، ایک غلام
ملک بن کر رہ گیا۔

اس وقت تو صرف اس امر پر غور کرنا مقصود ہے کہ اس میں ہر
میں، جب کہ تمام قومیں بیدار ہو چکی ہیں، وہ کونسی بنیادی شے ہے جو ہندوستان
کو اُسے کرنے کا موقع نہیں دیتی۔ اور بدستور اسے مغلوب و محکوم بنائے ہوئے ہے؟
اگر یہ کیا جائے کہ ہندوستان کو غلام بنائے ہوئے ہے، انگریز کا
تدبیر، انگریز کی حکمت عملی، انگریز کے جنگی چارہ، انگریز کی فوجیں، تو ہیں،
اور دشمن انگلیں، یا انگریز کی وہ چیز جسے ہم اہل ایشیاء، اقبال کے وسیع اپنی
نفس سے منسوب کرتے ہیں، تو میں نہایت مبذو آواز سے کہوں گا کہ یہ غلط اور
مراصر غلط ہے۔

میں اب انگریزی حکومت کا شور مچا رہا ہوں، انگریزی حکومت کی بحری
وہ بڑی دہراچی قوت، اور انگریزی حکومت کا مظہر ایک بہت ہی نیکی
اور ٹیپ چیز ہے لیکن ہندوستان کے سے دیکھو کہ عظیم الشان برطانوی
حکومت کے سامنے، بشرطیکہ وہ اپنی طاقت کو استعمال کر سکے، بھارہ ملکات

اب تک آزادی سے محروم ہے۔

کادش ہیلم کے بعد بھی تبدیل بنی کی جا سکتی — اس لئے آئیے آج سے ہم یہ بند کر لیں کہ ایک آن و احد میں تبدیل ہونے والی چیز کو، خواہ وہ کتنی ہی مقدس کیوں ہو، ہم اس قدر اقتدار و اختیار بھی نہیں دیں گے کہ وہ اس شے کو تسلیم ہو چکا دے جو بھی، اور کسی حالت میں بھی تبدیل نہیں ہو سکتی ہے۔

اچھی طرح اسے ذہن نشین فرمالیا جائے کہ مشورہ یہ نہیں دیا جا رہا ہے کہ ہندو، ہندو — اور مسلمان مسلمان نہ رہے، اور یہ دونوں خدا سخاوت سے اپنے اپنے مذہب کو ترک کر دیں — ہندوؤں اور مسلمانوں کو کامل اختیار اور مکمل آزادی ہے کہ وہ صرف تمام عمر ہی نہیں، بلکہ جہات بعد الممات میں بھی ہندو اور مسلمان ہی رہیں۔ لیکن صرف اسی قدر تودہ باز درخواست ہے کہ اپنی فلاح و بہبود کی خاطر اپنی آئندہ نسلوں پر رحم کیا کہ ہندو اور مسلمان یہ پتہ کر لیں کہ وہ

(۱) مذہب کو ایک قسمی، اور پرائیویٹ چیز سمجھیں گے۔
(۲) مذہب کی بنا پر ایک دوسرے کو آزار نہیں پہونچائیں گے۔
(۳) مذہب کی رو سے اپنے کو عیدہ، عیدہ، دو قوس نہیں سمجھیں گے،
(۴) اسنے کو ایک قوم سمجھنا، عصبیت کا حقیقت ہے، زندگی کے تمام امور میں دو قوس بدوش جنگ کریں گے۔

(۵) اور ہلکا میں اپنے کو "ہندو" اور مسلمان کہنے کے عوض خود کو "ہندوستانی" اور صرف ہندوستانی کہیں گے۔

(۶) اور اگر کوئی اُن سے اُن کے مذہب کے باب میں سوال کرے گا تو وہ اُسے اپنے وطن عزیز، اور اپنی قوم، قومیت کا دشمن سمجھ کر نہایت دُشمنی کے ساتھ یہ جواب دیں گے کہ "تمہارے پرائیویٹ حالات، اور ہمارے سرسبزہ اسرار دریافت کرنے کا حق کہاں سے پہونچتا ہے؟ اور اُسی کے ساتھ ساتھ اُس سے یہ بھی کہیں گے کہ "تو ایک ایسا مخلناک جاسوس معلوم ہوتا ہے کہ غارتگاشی کے عزم ہماری ذہنی تلاشی، کی فکر میں لگا ہوا ہے۔" چاہے کیسے تک یہ انہیں سنا کہ چاہے پچھو کہ ہم ہندوستانی اور صرف ہندوستانی ہیں، ہندوستانی کے ساتھ اور کچھ نہیں ہیں۔

کسی کو یقین ہو کہ ہندو — مگر مجھے تو یقین، بلکہ کانٹا یقین ہے کہ

مذہب اور ہندو مذہب کے غلط استعمال سے میری یہ مراد ہے کہ ہم مذہب کو زندگی کے ہر سسٹم میں پیش پیش رکھتے، اور حیات کے ہر چھوٹے بڑے شے کو مذہب، اور صرف مذہب ہی کی تازد میں تو لاکرتے ہیں، قدر ہو کہ معاشرت، سیاست، ہر کہ اقتصادیات، فنون لطیفہ ہوں کہ علوم ریاضی اور علمی ہو کہ مذہب، یہ تمام مسائل اُس وقت تک ہمارے نزدیک ہیج و پچھو ہیں، جب تک کہ مذہب اُن پر ہر تصدیق ثابت نہ کر دے۔

ہندوستان کے علاوہ اس گڑھ ارض میں اور بھی بہت سے ملک ایسے ہیں جہاں ہندو مذہب کا دُجو و پا یا جاتا ہے، لیکن ہندوستان کی طرح وہاں یہ اندھیر نہیں ہے کہ مذہب کے بغیر قدم ہی نہ اٹھایا جاتا ہو۔ ہزاروں ٹھوکریں کھائے، اور گزشتہ صدی میں خون بہا چکنے کے بعد دیگر اقوام کی سمجھ میں یہ بات آچکی ہے کہ مذہب نام ہے ایک ذاتی اور پرائیویٹ تصور کا، ایک ایسے ذاتی اور پرائیویٹ تصور کا جسے زندگی کے دیگر مسائل پر جمادی نہ ہونا چاہیے، اور جس کی بنا پر انسان کو انسان سے نفرت کرنا کسی طرح جائز نہیں ہو سکتا۔

لیکن ہندوستان میں شکل یہ آچری ہے کہ یہاں مذہب کے بغیر سائنس تک لٹا حرام سمجھا جاتا ہے — ذرا تصور کیجئے۔ اُس ملک کی پرنسپل کا جہاں چین کا آتے ہی "الحمد للہ" کا نعرہ لگایا جاتا ہو، اور جہاں جا ہی آتے ہی غورائشکیاں بگنے لگتی ہوں — اور جہاں عمل خانے میں داخل ہوتے ہی کان پر ڈورا لپیٹ لیا جاتا ہو —

میں، عصبیت کا بھی عرض کر چکا ہوں، مذہب کی تنقید نہیں کرنا چاہتا، لیکن اتنا کہوں گا اور ضرور کہوں گا کہ مذہب کا لکھ مقدس ہے، مگر اُس کے سبب سے وطنیت کے حقوق کو محروم نہ کرنا چاہیے — کیونکہ کسی چیز کو خواہ وہ کتنی ہی مقدس کیوں ہو، عقل انسانی اس کی جائز نہیں دیتا کہ وہ زندگی کے بنیادی اصول، اور اساسی مسائل کو تباہ کر دے۔

میں اس قول کو کسب و جہم قبول کئے لیتا ہوں کہ مذہب ایک سماجی چیز ہے، لیکن کسی کی مجال ہے کہ وہ اس حقیقت سے انکار کر دے کہ مذہب ایک ایسی آسانی چیز ہے، جسے آن و احد میں تبدیل کر دیا جا سکتا ہے، اور اس کے برخلاف وطنیت ایک ایسا اصرار ہے جسے سے کہہ کر وہ صدیوں کی

ایک جگہ سے دوسری جگہ تاش معاش میں گہرا یا گہرا یا پھر اکڑنا تھا، مگر تمہیں علم و ادب نے اُس کے مصائب کا احساس ایک بار بھی نہیں کیا۔
میں بہ آواز بلند کہتا ہوں، سُنئے والے سُن لیں کہ پریم چند کو موت نے نہیں، ہندوستان کی ناقدروں نے شہید کر ڈالا ہے۔
آپ نے ملاحظہ فرمایا۔ حکیم میں جو کچھ عرض کیا گیا تھا، وہ کس طرح حجت بھرت پورا ہوا۔

ابھی کیا ہے، ابھی تو پریم چند کی موت کو صرف ایک ہفتہ ہی گزرا ہے کہ اُن کی برسی میں اکابر و اُدما ہر ایک ہونے لگے ہیں۔ ذرا اُن کی موت کو اور مدت گزر جائے دیجئے۔ پھر دیکھئے ہندوستان کے مژدہ برست کیا کیا شاد مروتاں گہرا کریں گے، اور کتنے شہروں میں منشی جی کے استیضاب کئے جائیں گے۔

اگر زندگی میں منشی پریم چند حیدر آباد جاتے اور کوشش کرتے کہ انھیں ملازم رکھ لیا جائے، یا کم سے کم اُن کی ادبی پیش رفت کو ردی جائے تو بھی اکابر و اُدما اُن پر قہقہے مارتے، انھیں حقیر الفاظ سے یاد کرتے، اور انھیں مالک محروس سے خارجہ کر دیتے۔ مگر چونکہ وہ آج دنیا میں موجود نہیں ہیں، اور میں اس کا اطمینان ہو چکا ہے کہ اب میں اُن کی کوئی امداد نہیں کرنا پڑے گی، اس لئے ہم چوتھے پڑے ہیں، اور اُن کی تعریفوں کے بل باندھنا بدھ کہ یہ نجات کر رہے ہیں کہ ہم دنیا کے بزرگ ترین قدس شہنا سانی علم و ادب میں سے ہیں۔

اگر اسی برسی کے موقع پر یہ ایک منشی جی کی بڑھ اسٹیج پر آجائیں اور اپنے مرحوم شوہر کے نام پر صرف اتنی سی درخواست کریں کہ مرحوم کے چند غیر مطلوبہ ناولوں کی اشاعت کے واسطے سوڑے سے سرمائے کا انتظام کر دیا جائے، تو مجھے کامل یقین ہے کہ برسی منانے والوں میں سے کچھ تو کہیں اُن کے بچے چھپ جائے، اور کچھ گہرا کہہ کر بالا خانے کی کھڑکیوں سے سرک کی طرف کود پڑتے۔ خواہ اس کو دھڑکنے سے اُن کی انگلیں ہی کیوں نہ ٹوٹ جائیں۔

یہ کچھ حیدر آباد ہی پر موقوف نہیں ہے (حیدر آباد میں تو پھر بھی ارباب علم و فن کی نسبت بہت کچھ قدر دانی کی جاتی ہے) ہمارے تمام مولوں ضلعوں، گشتروں، شہروں، اور قصبوں کا یہی حال ہے کہ ہم اپنے ارباب جوہر کی زندگیوں کو نہایت ہی حقارت سے ٹھکرانے بہتے ہیں۔ لیکن اُن کے

بس روز ہر سب اپنے کو ہندوستانی محض ہندوستانی، خالص ہندوستانی، خالص ہندوستانی اور اول و آخر ہندوستانی سمجھ لیں گے، تو اُس کی دوسری صیغہ کو جب آفتاب طالع ہوگا تو وہ آزاد ہندوستان کے آفتاب سے طالع ہوگا۔

موت زندہ باد!

روزنامہ سپہام حیدر آباد دکن، پہلے ۲۲ اکتوبر ۱۹۳۷ء کے ذریعے سے یہ خبر معلوم ہوئی کہ حیدر آباد میں منشی پریم چند مرحوم کی برسی بڑے تزک و احتشام سے منائی گئی اور حیدر آباد کے اکابر و اُدما نے اس میں سرگرم حصہ لیا۔ اور منشی صاحب مرحوم کے ادبی و قومی خدمات کو بڑے پرجوش طریقے سے سراہا گیا۔

یہ وہ چیز ہے جس کے وقوع کی پہلی ہی سے توقع تھی۔ اور منشی صاحب کی وفات کے موقع پر حکیم میں جس کے متعلق اس طرح اظہار خیال کیا گیا تھا کہ۔

”پریم چند! مبارک ہو کہ تو اس مایا کے جال، اور اس جھوٹے سفر سے نکل گیا، جہاں دولت کے سوا کچھ جوہر کی پرستش نہیں ہوتی، تو اس ہندوستان کی بھرپور محفل کے دیرانے سے اُٹھ گیا، جہاں اہل قلم کو رسوائی کے سوا اور کچھ نہیں ملتا۔“

اسے ہندوستان کے مژدہ پرستو! آؤ، اب ہتھاری جیت و خیر کی باری ہے۔ پریم چند مرحوم کی، اب اخباروں میں مقالے لکھو، اُس کی تعریفوں کے بل باندھ دو۔ اور اُس کی یادگار قائم کرنے کی، جھوٹے ٹیٹ فارموں کے آوازیں بند کرو تاکہ دنیا ہتھاری معارف نوازی، اور علم دوستی پر ایمان لے آئے۔ ایسے ذہن موافق ہیں روز روز لکھنے سے۔ یہ خود ہی کا دن تو کہیں برسوں ہی میں آجائے۔ مگر میں جانتا ہوں تم کیسے ہو۔ مجھے ہتھاری علم دوستی خوب اچھی طرح معلوم ہیں۔

آج ہم جس پر مقالے لکھ رہے ہو، اور لکھنے والے ہو، وہی پریم چند مجھ سے ہتھاری ہے، انھیں تو اور دوسروں کا روٹا نائے دن روٹا کرتا متحدہ آہستہ کرتے ایک دن ہی چین سے بیٹھ نہیں دیا۔ وہ لاغر و نحیف انسان

مگر خیام کے اس قول کے مطابق کہ،

بر موجب عقل، زندگانی کرو نہ

شاید کرو نہ، دوسے عالمی کرو نہ

استاد تو درگاہ جا ملک دست است

چندان کہ سے زندگانی کرو نہ

میں یہ فیصلہ کرنے پر مجبور ہو گیا کہ ایک میرے سے قبل اوساں شخص کے لئے جو خود بھی زندہ رہنا چاہتا ہے، اپنے اہل و عیال کو بھی زندہ رکھنا چاہتا ہے، اور کچھ نہ کچھ اپنے گرد و پیش کے لوگوں کی بھی مالی خدمت کرنا چاہتا ہے، یہ ہرگز نہ سبب نہیں کہ وہ شور و برود زبان سے نافرمان ہے، اور اس سر و دہر دنیا میں ایک انسانی انسان کیلئے زندگی بسر کر کے اپنے متعلقین کے حقوق کو نہ چھری سے ذبح کر دالے۔

اسی لئے میں اپنے کو اس اعلان پر مجبور پاتا ہوں کہ اب میں اس وقت تک کسی مشاعرے میں شریک نہیں ہوں گا، جب تک مقامی مشاعرے کی شرکت کے لئے ملین پچیس روپے اور برائی مقامات کے واسطے (ملازمہ سمیت) سیکڑ لکھاس کے کرایہ آمد و رفت کے علاوہ میرے دیگر ضروریات، اور تعلیم کے اس مالی نقصان کی خاتمہ پڑی کے طور پر جو میری عدم موجودگی کے باعث ہمیشہ ہوتا رہتا ہے، مزید سروس روپے وصول نہ ہو جائیں گے۔

آج سے دو برس پیشتر تک میں اسے ایک ننگ بھٹا تھا کہ ادب و مشاعرے سے کرایہ لوں۔ مشاعرہ کی طرف سے جب کبھی کرایہ روا نہ کرنے کے واسطے لکھا جاتا تھا تو میں اس قدر براخود تھا کہ اشتیاق کے طور پر اس مشاعرے میں شریک نہیں ہوتا تھا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلتا تھا کہ ہر مشاعرے کے سلسلے میں کسی کے میرے سوا سوا سو روپے صرف ہوتا تھا، لیکن اب حالات کی وہ نوعیت باقی نہیں رہی ہے۔ میری زندگی،

ایک بہت بڑے مالی انقلاب سے دوچار ہو چکی ہے۔ اور اسی کے دوش بدوش دوسری شکل یہ آ پڑی ہے کہ میری غیر حاضری کا حکم کی اخلاقی اور مالی حالت پر بہت برا اثر پڑتا ہے۔ اس لئے، ہر چند کہ اس اعلان سے میرے جالیاتی شعور کو تو غرور و صدمہ پہونچ رہا ہے، مگر میرا ضمیر بالکل مطمئن ہے۔ یہ دنیا ہے۔ سر و دہر ہر دنیا۔ اس کے قوانین سے نہ انبیا مستثنیٰ ہو سکتے ہیں نہ شاعر۔ ہم بھلائی کے پروں پر اڑتے ہوئے خدا، عرش و کرسی ہی سے کیوں نہ گزر جائیں، مگر یہ دنیا ہمیں ہماری تمام

مرنے ہی ان کی قبول کی پریشانی کرنے لگتے ہیں۔

بات یہ ہے کہ ہندوستان ایک مژدہ ملک، اور ہندوستانی ایک مژدہ قوم ہے ظاہر ہے کہ مژدوں کو زندوں سے کوئی پھردی نہیں ہو سکتی۔ زندہ ہی زندوں کو سمجھ سکتا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ حبیب تک کوئی شخص زندہ رہتا ہے، ہندوستان کے مردے اس سے بچ کر بچتا رہتے ہیں۔ اور حبیب وہ مکر ان کے گردہ میں شامل ہو جاتا ہے تو تم زندہ بچنے کا پھنس پڑو، اس کے تحت یہ اس کی قدر افزائی کرنے لگتے ہیں۔

وہ ارباب فکر جن کے قلب ریڈیو کی طرح فضا سے آوازیں اور دلوں کے مضامین سن سکتے ہیں، ان کا بیان ہے کہ جب رات بیگ جاتی ہے تو صبح تک یہ آوازیں آتی رہتی ہیں کہ اسے ہندوستان کے پریشان حالی ارباب ہنر قمر سرنگوں اور آبدیدہ کیوں ہو۔

یہ کلاسی دانش مندی ہے کہ مژدہ ہو۔ تم آخر مر کیوں نہیں جاتے۔ تمہارے لباس بوسیدہ اور تمہارے معدے خالی ہیں، محض اس جرم میں کہ تم زندہ ہو، تم سانس لے رہے ہو۔ اگر عقائد ہو تو مر جاؤ، خدا کے لئے مر جاؤ۔ ہم تمہاری قوم کے افراد تمہاری خدمت گزاری کے شرف سے کب تک محروم رہیں گے۔ ہم نہیں یقین دلاتے ہیں کہ جس روز تم مر جاؤ گے ہم تمہارے نام پر لنگر جاری کریں گے، غریبوں کو کپڑے پھنائیں گے اور تمہاری قبر سونا چڑھا کر دنیا کو دکھائیں گے، مگر ہندوستانی اپنے مایہ ناز افراد کی قدر وانی میں کسی قوم سے پیچھے نہیں ہیں۔

مر جاؤ، مر جاؤ، خدا کے لئے مر جاؤ، اور ہمارے

ممبر کو دیر تک نہ آؤ!

میری مشاعروں کی شرکت

مجھے اس کا ہنایت حق ہے کہ دوسروں کی طرح، آج کا میرے لئے بھی یہ دن آنا لازمی تھا جس دن انسان میں وہ چیز بیدار ہو جاتی ہے، جسے شور و برود زبان کا لقب دیا جاتا ہے۔ میں اب تک اسی شور سے بچتا رہا، بچتا ہی نہیں، بلکہ ناخ-

ہندو و زبیر کے باوصف آخر کار کثافت کے غاروں میں اتار کر دم لیتے ہیں کیونکہ ۔۔

لطافت، بے کثافت جلوہ پیرا ہو نہیں سکتی

ایک خط

”کفر، الحاد اور دہریت“ ایسے ستے اور پٹے اللہ تعالیٰ میں جنہیں ہم بڑی آسانی سے، اُن کا مفہوم متعین کئے بغیر بے مدعڑک استعمال کرتے رہتے ہیں۔

ہندوستان میں ہر وہ چیز جو ہمارے روایات کہن اور اداہم پارینہ کے خلاف ہو، کفر، الحاد اور دہریت کے نام سے منسوب کر دی جاتی ہے۔ اور یہ کہ یہاں تک بڑھی ہوئی ہے کہ مذہبی عقائد سے گزر کر اُن تمام دیگر مسائل کو بھی مذہبی روشنی ہی میں دیکھا جاتا ہے، جن سے مذہب کو کوئی دور کا بھی علاقہ نہیں ہوتا۔ مثالی کے طور پر کانگریس ہی کو لے لیے۔ مسلمانوں میں ایک ایسا طبقہ اس دور بیداری میں بھی موجود ہے جو کانگریس کو ہندوؤں کا ایک بُت، اور کانگریس کے ارکان کو بُت پرست سمجھتا ہے اور جو مسلمان کانگریس کی حمایت کرتا ہے، یہ خاصاً خدا اُس پر کفر کا فتویٰ لگا دیتے ہیں۔

سچ ہے مسلمانوں میں عقلی، مالی افلاس، اور کفر و الحاد سے زیادہ ارزاں کوئی عین ہی نہیں ہے۔

ایک زمانہ تھا کہ برہمنی کی دار الفرب میں کفر کے فتوے ڈھلکاتے تھے، لیکن یہ دبا ہوا اس قدر عام ہو چکی ہے کہ ہر شہر اور ہر محلے میں کفر کے سکے ڈھالنے کی کشمکش لگا دی گئی ہیں۔

سب سے زیادہ عجیب و غریب بات یہ ہے کہ کارخانہء عالم برآزادی کے ساتھ سرچینا تک کفر میں داخل فرمایا گیا ہے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ ہم آپ تک یہ شرمناک اعلان کر رہے ہیں کہ ہر عورت اپنے محلے کے بڑے مولوی صاحب ہی کے دماغ سے سوچیں گے، اور جو شخص ہمیں اس بیگانہ کا مشورہ دے گا کہ ہم اپنے ذاتی دماغ سے بھی سوچیں گے، اس کا کام ہم تو ہم اُسے پھٹ سے پھاڑ لیں گے۔

چنانچہ مندرجہ ذیل خط جو مدراس سے دفتر ”علم“ میں شرفِ ہمدرد لایا ہے، قارئینِ کلم کی عجزت انگیزی کے واسطے لفظ بہ لفظ درج کیا جا رہا ہے۔ جس سے اندازہ ہو جائے گا کہ وہ اسلام جو دنیا میں غلامی اور دہم پرستی ماننے کے واسطے آیا تھا، اب اُس کے فرزندِ غلامی و دہم پرستی کے کس قدر زبردست مبلغ بنے ہوئے ہیں۔ اور وہ پتھرِ علم جس نے منافقوں تک کو دائرۂ اسلام سے خارج نہیں فرمایا تھا، اب اُس کی اُمتِ ثانیہ قلب اور روا داری کی دشمنی پر کس شہیت بنی ہوئی ہے،

بہیں نقابِ رُہ از کجاست تا بکجا!

خطِ ملاحظہ ہو!

۱۹۱۱

چوکِ ترجمانی مدراس

موضوعہ ۲۰ مارچ ۱۹۱۱ء

محرم جناب منبرِ صاحب رسالہ ”علم“ دہلی

آپ اگر جوشِ صاحب کے ہم عقیدہ ہیں تو خدا جانے کس پیام کے تحت ہیں۔ دونوں سلام مسنون قبول فرمائیے۔ ختمِ سعادتِ خیرِ ابدی کا اعلانِ مبارک۔ یا دعوتِ فانی کا شکر۔ یا جانا جو من ہے کہ اسلام اہل اسلام اور متدین اسلام کی ہر ترین دشمن کانگریس کا بُت۔ ”علم“ اور وہ زبان کی سند یہ ترین مخالف اور ہندو راہ کی ملیر دار کانگریس کا حاجی کلیم، اور الحاد و دہریت کے مضامین کا حامل ”علم“ ہر گز ہرگز اس قابل نہیں کہ کوئی قوم پرست اور سچا مسلمان اس کا خرید لے لے اور لکڑا رس کو دیکھنا تک گوارا کرے۔ صرف ہر ہی نہیں بلکہ سیرے ان تمام مزین و احباب کی جنہوں نے گزشتہ بارہ جیتے۔ ”علم“ کا مطالعہ کیا ہے یہی حقیقت رہا ہے۔ لہذا ”علم“ کی خریداری اس کے ہم سنگ اور ہم عقیدہ حضرات کو مبارک۔ مجھے دہلی، اپنی روانہ فرمائے کی زحمت نہ کیجئے۔ خدا حافظ۔ حق۔

إِنَّا لِلّٰہِ وَإِنَّا إِلَیْہِ رَاجِعُونَ!

اگر ایک لمحے کے واسطے بھی شک ہو جائے گا کانگریس ”اسلام“

بہرِ نفاق ہیں۔ تو میں ایک لمحے کے پس و پیش کے بغیر ہندوؤں کی طرف سے مسلمانوں پر حملہ آور ہو جاؤں گا۔

میرے دوستو! افراط و تفریط سے بچ کر اعتدال پر عمل بہت ہی سخت کام ہے، ہم صرف جذباتی حیوان ہی نہیں ہیں، قدرت نے ہم میں عقل و شعور اور عدل و انصاف کا بھی مادہ رکھا ہے، اور جا رہی ہے کہ جب عقل و شعور اور عدل و انصاف سے ہمارے جذبات ٹکرائے گئیں تو ہم جذبات کو ترک کر کے عدل و انصاف کا ساتھ دیں، اس لئے کہ اسی میں ہمارے دلکے برکت و سعادت ہے۔ میں نے اپنے دل کو وہ لاپتہ نہ لکھ لیا کہ اپنی پوری کیفیت دکھا دی ہے، اب آگے آپ کو اختیار ہے کہ مجھے مسلمانوں کا دشمن سمجھ کر مجھے سے کنا رو کشی اختیار کریں۔ یا میری طرف سے جو اشتباہ آپ کے دل میں پیدا ہوا تھا اس سے توبہ کر لیں۔

اگر یہ کوئی جرم ہے کہ میرے نزدیک کانگریس ہی وہ جماعت ہے جو ہندو مسلم اتحاد کے ذریعے سے ملک کو آزاد کرانے کی ہے تو خشک میں مجرم ہوں۔ آپ جو سزا دے جائیں، میں اسے قبول کرنے پر آمادہ ہوں۔

سر دستاں سلامت کو تو خیر آزمائے!

پُر امن ہندوستان یا انسان متقبرہ

”تمام ملک یورپ کے مقابلے میں ہندوستان غیر معمولی غصے

پر امن ہے۔ جیسی کہ سے بڑے شہر میں کوئی بیمار لیا نہ ہیں، حالاکہ

یورپ کا ایک شہر بھی ایسا نہیں ہے، جہاں تو میل کے اندر اندر

پانچ سو بار دیا نئے ہر وقت موجود رہتے ہو، اور یہی وجہ ہے

کہ میں ہندوستان میں اس قدر خوش ہوں، جہاں ہر شے نہایت

پُر امن، اور ہر نفل نہایت ہی خوشگوار ہے۔“

یہ ہیں وہ بظاہر شیریں، اور باطن تلخ الفاظ جو ہمارے عربی و سرسبز حضورِ لاؤگو تین ہواؤں نے دوسری یا تیسری و دیگر شے کو اکال انڈیا ریڈو ایشن بجلی سے رات کے وقت براؤن کا کارٹ فرمائے تھے۔

شاید ہم نے اکثر سمجھ لیا ہے ہندوستانی ”لاٹ“ صاحب بیاد کہ اس شاطرا نے تقریباً دس سال پہلے ہی دل میں نیت خوش ہوئے ہوں گے کہ ہمارا

”اہل اسلام اور تمدن اسلام“ کی ”بہترین دشمن“ ہے، یا کانگریس اور ہندوؤں کی ”شدید ترین مخالفت“ اور ہندو راجا کی ممبر دار ہے تو میں ہندوستان کا وہ پہلا شخص ہوں گا جو کانگریس کے سربراہان کے تمام اعصاب کو پوری شدت کے ساتھ پھینک کر ایک ایسا زبردست گمن اور ایک اناہل گرز مارے گا کہ کانگریس کا بھیجا ناک کے رستے سے نکل جائے گا۔ مجھے میرے بھائی مذہبی نقطہ نظر سے خواہ وہ متحد کعبین یا مرتد، لیکن انہیں یہ معلوم ہو ا جائے کہ میں مسلمان خاندان میں پیدا ہوا ہوں مسلمانوں کا خون میری رگ و پے میں گردش کر رہا ہے، اور مجھے زندگی میں مجھے غلطی طور پر اجمیت محسوس نہیں ہو سکتی ہے تو وہ ہندوستان کے مسلمانوں کی جماعت اور ہندی مسلمانوں کا حلقہ ہے۔

میری معاشرت، اور میرا مزاج، میرا ادبی ذوق، اور میرے عادات تمام تر اسلامی ہیں۔ میرے دل سے کوئی توخت مسلمانوں کی محبت چھین نہیں سکتا ہے، اگر میں خود بھی کوشش کروں کہ میرا دل مسلمانوں کی محبت سے خالی ہو جائے، تو بھی میں اس سعی میں نامکمل کامیاب نہیں ہو سکتا ہوں۔ اس لئے کہ مسلمانوں سے محبت نہ کرنا، میرے واسطے خود اپنی ذات سے محبت نہ کرنا ہے۔ اور کوئی ایسا مذہبی حیات ہے جسے اپنی ذات سے محبت نہ ہو۔

لیکن مجھ میں اور دوسرے غیر کانگریسی مسلمانوں میں فرق صرف اتنا ہے کہ وہ ہندوؤں سے محبت بھی، نفرت کرتے ہیں۔ اور اس نفرت کا نتیجہ یہ ہے کہ ہندوستان متحدہ قومیت کے قدام برکات سے محروم ہے، میں ہر چند مسلمانوں کی محبت پر مجبور ہوں، اسی طرح مجبور ہوں مجھے کوئی ہندو، ہندوؤں کی محبت کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ اور یہ محبت ایک ایسی فطری شے ہے جس پر صرف عقل کے اندسے ہی اعتراض کر سکتے ہیں۔ مگر اُسی کے ساتھ ساتھ میرا دل ہندوؤں کی محبت سے بھی خالی نہیں ہے۔ اس لئے کہ میں اس قدر شفیق واقع نہیں ہوا ہوں کہ اُس گروہ سے محبت نہ کر سکوں جو میرا پڑوسی، میرا موطن اور میرا بھائی ہے۔

مجھے صفائی کے ساتھ یہ کہنے کی بھی اجازت دیجئے کہ کسی، اور باقی اثرات کی بنا پر اس محبت کے باوجود مجھے مسلمانوں سے ہے، اگر میں یہ دیکھوں گا کہ ہندوؤں، اور مسلمانوں میں جنگ ہو رہی ہے، اور مسلمانوں کے سر

ہندوستان، بشارتہ جیہندو دور، اس قدر پُر امن اور اُس کے ساتھ ہی ساتھ، اس درجہ خوشگوار واقع ہوئے کہ حضرت لالہ صاحب اُسے اپنے وطن عزیز کے مقابلے میں زیادہ پسند فرماتے ہیں۔

اس میں کس کا ذکر شک ہے کہ لارڈ صاحب موصوف ہندوستان کے پُر امن، اور خوشگوار ہونے سے نہایت ہی خوش ہیں۔ لیکن یہ شاید کم لوگوں کو معلوم ہو گا کہ ہندوستان کی "امنیت" و "خوشگوار" پر لارڈ صاحب اپنی کی سرست، اہم ترین کی طائیت، نیز سرست ہے جو ایک ہوشیار آقا کے دل میں اُس وقت پیدا ہوتی ہے، جب وہ اپنے قومی غلام کے جسم کو کاہیدہ اور اُس کی میان کرے تو اور دیکھ کر اُس شیعہ پر پوچھتا ہے کہ اب میری طاقت کے سامنے یہ غلام کھینے عاجز، اور قطعی بے دست و پا ہو چکا ہے۔

اس زمانے میں جب کہ دنیا کی ہر جھوٹی سے جھوٹی قوم اپنی بھائی بھائی اپنے مقبوضات کی توسیع پر جان دیے دے رہی ہے، اور ہر جھوٹے سے جھوٹا ملک ہی نہیں، ہر مملکت سے مملکتی شہر اپنے جسم پر زہر اور سر پر زہر پہن چکا ہے۔ عین اِس دورِ فتنہ و فساد میں ہندوستان کی عسکری روح کا تضییع، اور ہندوستان کی قوم کا غیر مسلح رہنا ایک ایسی شامتِ اعمال ہے جس پر خود موت تک آنسو بہا سکتی ہے۔ لیکن ہمارے لارڈ صاحب یہاں اس صورتِ حال پر ماتم کرنے کے عوض، اہلِ بدستِ فرماتے ہیں۔

دماغ ہو کہ لارڈ صاحب کا یہ اہلِ بدست، کسی نوع کی سادہ لوحی، یا علمِ حاضر کے مقنیات سے بھری کا نتیجہ نہیں۔ لارڈ صاحب، خدا اخصی سلامت رکھے، نہایت ہی ہوشیار واقع ہوئے ہیں، اس اہلِ بدست سے صاحبِ بہادر کا مقصود یہ ہے کہ ہم ہتھیاروں، اور طبائزوں کی عدم موجودگی کو اپنے ملک کے واسطے ایک برکت و سعادت خیال کریں، اور جب ہم جسے کوئی ہندوستانی شہر، اور ہندوستانی قوم کو مسخ ہونے کا مشورہ دے، تو ہم اپنے کانوں میں انگلیاں دے لیں، اس وجہ سے انگلیاں دے لیں کہ ان "منجوس" اور اس مشن "سامانِ حرب کی عدم موجودگی ہی وہ دولتِ بیدار ہے، جس پر ہمارے امنِ پند لالہ صاحب اہلِ بدست کو فیلچے ہیں۔

اور ظاہر ہے کہ لارڈ صاحب جس چیز کو برائے سمجھتے ہیں، اُسے ہم کیونکر اچھا سمجھ سکتے ہیں؟ اس اہلِ بدست، یا اہلِ امن کی گولی میں ایک غیر مغربی اعلان یہ بھی

ہے کہ اسے ہندوستان، بھوہشکر بھالو، کہ ہم ہمارے ایسے شفیق حاکم ہیں کہ عین اِس دورِ فتنہ میں، جب کہ خاکِ یورپ مشتعل ہو چکی ہے، اور مغرب کے ہر ذرے سے ٹوٹل رہی ہے، ہم نے ہمارے گروہِ مسلحانہ کی ایک ایسی دیوارِ امان دی ہے کہ تم ہر قسم کے اور ہر طاقت سے بے خبر رہ کر عین سے زندگی بسر کر رہے ہو، اور عین اُسے ہی کہ بیدار یورپ میں آگ اور خون کا کھیل کھیل جا رہا ہے، ہم نے تمہیں ایسی خاموش خواب گاہیں عطا فرمادی ہیں کہ تم سبھی نیند سو رہے ہو۔

اس میں لارڈ صاحب یہاں دو کا کوئی خاص قصور نہیں۔ دنیا کے ہر بہادر کا مزاج ایسا ہی واقع ہوا ہے۔ ہر صاف دماغ کے پاس اگر کچھ بات ہے کہ اسے میری پیاری بچے کے گرد والی چڑی، تمہیں کیا معلوم کہ آزاد طائزوں پر زمین اور نفس میں کیا کیا عینیں گزر رہی ہیں۔ وہ دانے دانے کے مارے مارے پھر رہے ہیں، دشمنوں کے تعاقب، اور نیکوں کے شہداء نے انہیں زندہ درگزر کر رکھا ہے۔ ہمارک میں ہمارے ہتھیار کی ہتھکڑیوں سے گروہِ فتنہ "پُر امن" مسلح ہیں، اور ہمارے آب و دانے کے فرائض میں نے اپنے ذمے کر کے رکھ دیے۔

لارڈ صاحب ہندوستان کی جس چیز کو امن کے نام سے منسوب فرماتے ہیں، وہ دراصل ہندوستان کی ایک ایسی گزندِ دوری ہے، جسے اب بھی زیادہ دیر تک برداشت نہ کرنا چاہیے۔

ظالم ہونا کوئی عیب ہو کہ ہوا، لیکن اس سے کوئی انکار کر سکتا ہے کہ مظلوم ہونا عیب اور سب سے بڑا عیب ہے۔ خدا کی لڑکتی بہن وہ چیز ہوتی ہے، جسے ظالمِ انشان طاقت کہتے ہیں، اور طاقت دنیا کی سب سے بڑی سعادت ہے، لیکن مظلوم کے مثل حال وہ چیز ہوتی ہے جسے ظالمی کہتے ہیں، اور ظالمی ان کو کہہ ارض کی سب سے بڑی نعمت ہے۔

لارڈ صاحب یہاں دو: ہماری خوشستوں کو سعادت، ہماری کمزوریوں کو طاقت، اور ہماری نرس کو "امن" کا خطاب دے کر کہیں کب تک دھوکے میں رکھنے گا؟

اُنہیں صاحب نے ہندوستان کو صرف "پُر امن" ہی نہیں فرمایا ہے، اس پر بختِ خدا ارض کو خوشگوار کا بھی خطاب دیا ہے۔ ہندوستان۔ اور۔ خوشگوار! یہ ہے۔

”کلمیم کی دو سالہ زندگی پر ایک نظر“

جنوری ۱۹۳۷ء کے ساتھ کلمیم ماشا اللہ تیرے سال میں قدم رکھ رہا ہے، بظاہر یہ کوئی شہن کی تقریب نہیں ہو سکتی۔ اتنی ہی مدت زندگی عمر دوازہ کیا مہینہ گنتی ”بھی نہیں کہی جاسکتی“ تاہم چونکہ ہندوستان ”شرخوارگی کے ایام کی ہلاکت عام“ (Infantile mortality) کی سرزمین ہے، اس لئے کسی سفینہ ادب کے لئے ابتدائی ۱۲ مہینوں کا محفوظ بحری سفر خاموشی اور خوش تقدیر ہی کی بنا پر ہے! ہماری ادنیٰ شہتیں کے اکثر حادثات، ساحلی رہے ہیں، اس لئے سواصل کے قرب و جوار کی ان خلیجوں، آبناؤں، اور سخت الجھڑیوں سے سلامت گزر جانا عطا ملک - ہفتخوان کے لئے بوجہ جانے کے بہت ہی سمجھا جاسکتا ہے! یہ

غافل مرد کو تا در بیت احوام عشق
صد منزل است و منزل اول قیامت!

تاہم ہم ان صد باندل و دراصل کی سیران کی کو محسوس کرنے سے انکار نہیں کر رہے ہیں! ہمیں ”دامگاہ حیات“ کی اُس بے دریغی خطرات کا پورا علم ہے جس کی پیمائش ”ذندان زندگی“ کے کسی ”دامگاہ جس“ نے کبھی اس طرح کی کبھی کر، یہ

دام ہر موج میں ہے معلق صد کام ہنگ
دیکھیں کیا گزرتے ہیں بے قطرے پہ گہر ہونے تک!

ہاں بہرہ مستقبل کی فکر کو مستقبل ہی پر چھوڑ دیتے ہیں! ہم اک معلوم و مشہور مثل کی قبل پر کسی قدر اک نیا متولد بنا سکتے ہیں کہ ہم عالم انضمام کرو، اور مستقبل اپنا انتظام خود کرے گا! — درحقیقت یہ اک صحت و عین حکمت حیات ہے! وہ نہ صرف ساری زندگی پر حاوی ہے، بلکہ آخرت تک چھٹاؤ ہے! اک محتاط جوانی اک محفوظ پیری کا ہمیشہ، اور اک متقی حیات ارضی اک باہر ادعا بقبت کی ضمانت! لاریب کہ ہم اپنے موجود طرز عمل سے اپنی آئندہ تقدیر کی کتاب کیا کرتے ہیں! آج

باشد ز نقش با ”رقم“ سر نوشت! ما!

خون ہے خامہ کا آئینے گھٹن کی مہار
لارڈ صاحب آپ نے بال سجا فرمایا، ہندوستان بنایت ہی خوشگوار
واقع ہوا ہے۔ کیوں نہ ہو اگر ہندوستان کا سا جواں نعت و آزاد کا خوشگوار
نہ ہو گا تو پھر اور کون ہو گا —

ہاں وہ بلند اقبال ہندوستان، جہاں کا سونا، ایک ہمیشہ جاری رہنے والے آبشار کی طرح دوسرے ملک کی طرف لگتا تا رہیت چلا جا رہا ہے، وہ خوش قسمت ہندوستان، جس کا غذا و درخام مالی دوسروں کے معدوں اور کارخانوں میں ہر روز داخل ہو رہا ہے۔ وہ بے روزگار ہندوستان جس کے خانائے فیصدی کی جو بیٹ پیٹ پکڑے کڑے و فزوں میں صدیوں دیتے پھر رہے ہیں۔ وہ نہ ہو کا ہندوستان جس کے لئے فیصدی زندگی کو بعد ہزار دشواری صرف ایک وقت فدا ہتی ہے، اور وہ بھی ناکافی۔ وہ دماغی میل ہندوستان جہاں مسلم لیگ، اور ”مہا سبھا“ کے مداری، مسلمانوں اور ہندوؤں کو اپنی اپنی گزلیوں پر بچا بچا کر حوں ریز یاں کر رہے ہیں۔ وہ ہندوستان جہاں درج صحابہ کے سلسلے میں بڑے بڑے ہٹے گئے حضرات و السرائے کے پاس و فڈے جانے کی شرمناکیوں میں مبتلا ہیں۔ وہ ہندوستان جہاں مبلغ و منبر کا گلا گھنٹا رہتا ہے۔ اور وہ ہندوستان جس کے گھٹے میں غلامی کا طوق لعنت پڑا ہوا ہے۔ اگر خوشگوار نہ ہو گا تو اور کون ملک ہو گا؟

اگر جنت نشان ہندوستان خوشگوار نہیں ہے، تو پھر کیا امریکہ انجمنستان، جرمنی، فرانس، اور آئی کو خوشگوار کہا جائے گا جہاں زندگی کی کشش، توپوں کے دھانے کو بے ہوش ہے؟

ہاں مرزا غالب نے خوب فرمایا ہے:—
نے تیر لگاں میں ہے دنیا دیکھیں میں
گوشت میں نقص کے بجائے آرام بہت ہے

پایندہ باد گوشہ رقص

زندہ باد گوشہ رقص!

نظر آتا ہے کہ

بالائے سرکش زہر شمشد

می تافت ستارہ لبندی

کم از کم اتنا کہنے میں تو مطلق کلام نہیں کر میرا کہ رسالے کا نکالنا میرے
جن مخلص ترین دوستوں کے لئے ایک فرماؤشی تحفے کی دعوت بنانا، یا جن
"لبی دشمن" کے لئے مستقبل قریب کی ایک لطیفی "شات ہسایہ" کی بشارت "ان
ہر دو طالعوں کے ارکان کے خدشات و توہمات کی روشنی میں مئے معقول کا
کا کا دیدنی معرکہ کر کیا ہے؟

نوسید ہم مہاش کہ رندان جرد نوش

ناگ چو یک خروش مبسزل رسید

بہر حال حکیم کے مستقبل کے ممکنات و مستحکامات کے متعلق اگر کہیں
اندازہ بھی لگایا جائے تب بھی اُس کی زندگی و سلامتی کے بارے میں
تمام سامعین کیلئے میری اتنی اطمینان دہی تو ہر شائبہ شک سے بالاتر
ہی تسلیم کی جائے گی کہ

گزر گیا ہے وہ کوسوں دیا ہر حرماں سے؛

~~~~~

الغرض، اسی کے تجربے اور حال کے "میں" سے دیا وہ نہ ہم پر کچھ  
"مقتضیات" ہیں نہ ہمارے کچھ ممکنات: ہم اپنی حدود کی حد تک اپنا جائزہ  
لیتے ہیں اور ————— اگر یہ کوئی خود ستانی یا خود فریبی ہو تو —————  
اپنی ذات سے حکایت کے چنانچہ اسباب ہیں بابت "جو کچھ ہم سے ہو گا ناقابل  
اعتنا نہیں کیا جاسکتا، اور جو ہونے کا اُس کے لئے وہ گونا گوں مواقع اور از  
شمار افزہ شکلات کافی ذمہ دار ہیں، جو ہندوستان کی ادبی صحافت میں  
خاصی معروف و بجا نام ہیں؛ ہم اپنے معیار کی رفعت سے نا آشنا نہیں لیکن  
اس صحرائے فن و ادق میں "سالمک" کی "راہ و رسم منزل سے باخبری" کچھ  
برائے نام ہی "تو نہ سفر" ہو ہیچا سکتی ہے؛ لیکن شکلات کو محض خوش نظری  
کہاں تک تکمیل کر سکتی ہے؟

تو کو بھی ہم دیکھیں کہ چمڑوں نے کیا کیا

فرحت کش کش غم نہیں سے گئے!

میں بار و بار یہ کہنے کی اجازت چاہتا ہوں کہ حکیم کی موجودہ دو دواؤں  
عمر میں اس کے شباب و مقدور کی بعض نشانیوں کی جہن صیغہ پر درخشاں  
پاتا ہوں۔ لیکن ہے بعض حضرات میرے ہم نظر ہوں، لیکن مجھے تو اپنا اس  
مولود فکر و کاوش — حکیم — کی چشم واد بر و کی بعض ادائوں میں یہ کتبہ کث

ہر ذرہ ہر آفتاب یکے کے  
ہر گہ ہر اک کتاب یکے کے  
خوشی و شہر جس کے جلوں کا ہوا  
وہ حسن ہے لب شہاب یکے کے

دہ

ہر چشم و دل یکے کے ہونے آؤ  
تو بطلان سے لو لگائے ہونے آؤ  
مزمزم کیسے ہر بار نہیں دیکھو لگا  
شہسب و قمر قدم بھانے آؤ

چشتی

# مسک جوش

کیا تجھ کو ہے یہ وہم کہ دشمن ہے ترا جوش؛ افسوس کہ تو واقفِ اسرار نہیں ہے  
 آگاہ ہو آگاہ کہ اس جوش کے دل میں یہودگی اندک و بسیار نہیں ہے  
 واللہ کہ یہ جوش، خرابات نشین جوش منجملہ زُبا و ریا کار نہیں ہے؛  
 وہ نشہ صہبا کا ہے چڑھتا ہوا پارہ ہاں زہد کی گرتی ہوئی دیوار نہیں ہے  
 ہو اُس میں جو ہے ابر کی مستانہ خرامی رکتی ہوئی ہنصوں کی تو رفتار نہیں ہے  
 ہاں ہاں وہ بنظر باز و قدح خوار ہے معنی توفیقِ الہی کا گنہ گار نہیں ہے؛  
 اس آدمِ خاکی کے ہو خواہ کے دل میں جُز نہر و وفا اور کچھ آزار نہیں ہے؛  
 ہاں اُس کو مبارک ہو غم و غیظ و عداوت جو زلفِ محبت کا گرفتار نہیں ہے؛  
 دشنام و ملامت کا تو کیا ذکر کہ یہ شخص یاروں کی شکایت پہ بھی طیار نہیں ہے  
 اس خلوتی شاہدِ توحید کے دل میں آتشِ شعلہ و زنا نار نہیں ہے؛

اس واقفِ اصداد کی دنیائے نظر میں      بیہودگی کا فرو دیندار نہیں ہے !  
 ہاں اُس کا یہ ایمان ہے اس باغِ چہنیں      ہر خارِ خوش گل پر کوئی غار نہیں ہے !  
 اس شخص کے سینے میں ہیں بیگانے بھی داخل      یہ صرف یگانوں ہی کا غوار نہیں ہے  
 ہاں خانہٴ دشمن کی بھی جاروب کشی میں      واللہ کہ اس شخص کو کچھ عار نہیں ہے !  
 اس واقفِ ماحول و وراثت کی نظر میں      قاتل بھی ملامت کا سزاوار نہیں ہے !  
 آواز دو آواز کہ یہ رندِ قدحِ خوار      کیا دوست کہ دشمن سے بھی نیر نہیں ہے  
 اس محرمِ خود واری عشاق کے نزدیک      ابلیس بھی مردود و گنہگار نہیں ہے !  
 رکھے گا وہ اور تجھ سے عداوت کا تعلق ؟      کونین سے کچھ جس کو سرور نہیں ہے !  
 خود جنسِ دو عالم ہو تو ہو اُس کی خریدار  
 وہ جنسِ دو عالم کا خریدار نہیں ہے !

جوش ملیح آبادی

پروردہ شہین ہے ترنم میرا  
 فریاد کی کہلے ہے تنگم میرا  
 مانے گا اسے کون کہ تیرا ہے خلوت  
 ہم نسو کے اُفتی سے ہر تبسم میرا  
 آواز ہی آواز ہے اور کچھ بھی نہیں  
 انجام ہمیں اک راز ہے اور کچھ بھی نہیں  
 کہتی ہے جسے غنڈہ شاوی دنیایا  
 اک کہ ب کی آواز ہے اور کچھ بھی نہیں  
 (جوش)





مولانا ابوالکلام آزاد

Muhammad Ali Shau

# قرآن اور اُس کے مخالفوں میں بنابر نزاع!

مولانا ابوالکلام آزاد

اُس نے کسی مذہب کے ماننے والے سے یہ مطالبہ نہیں کیا کہ وہ اپنے مذہب کی دعوت سے انکار کر دے۔ بلکہ جب بھی مطالبہ کیا تو یہی کیا کہ اپنے اپنے مذہبوں کی حقیقی تعلیم پر کاربند ہو جاؤ، کیونکہ تمام مذہبوں کی اصل تعلیم ایک ہی ہے، اُس نے نہ تو کوئی نیا اصول پیش کیا، نہ کوئی نیا عمل بتلایا، اُس نے ہمیشہ انہیں باقوں پر بند دیا جو دنیا کے تمام مذاہب کی سب سے زیادہ جانی فوجھی ہوئی باتیں رہی ہیں، یعنی ایک پروردگار عالم کی پرستش، اور نیک عمل کی زندگی، اُس نے جب کبھی لوگوں کو اپنی طرف دعوت دی ہے تو یہی کہا ہے، اپنے اپنے مذہبوں کی حقیقی تعلیم از سر نو تازہ کر لو، تمہارا الہا کرنا ہی مجھے قبول کر لینا ہے۔

سوال یہ ہے کہ جب قرآن کی دعوت کا یہ حال تھا تو پھر قرآن میں اور اُس کے مخالفوں میں وجہ نزاع کیا تھی؟ ایک شخص جو کسی کو برا نہیں کہتا، سب کو ماننا اور سب کی تعلیم کرتا ہے، اور ہمیشہ اپنی باتوں کی تسکین کرتا ہے جو سب کے بھان مانی ہوتی ہیں، کوئی اُس سے لڑے تو کیوں لڑے؟ اور کیوں لوگوں کو اُس کا ساتھ دینے سے انکار ہو؟

کہا جا سکتا ہے کہ قریش مکہ کی مخالفت اس بنا پر تھی کہ قرآن نے بُت پرستی سے انکار کر دیا تھا اور وہ بُت پرستی کے طریقوں سے، لوٹ ہو چکے تھے، بلاشبہ ایک وجہ نزاع یہ بھی ہے، لیکن صرف یہی وجہ نزاع نہیں ہو سکتی سوال یہ ہے کہ یہودیوں نے کیوں مخالفت کی جو بُت پرستی سے قطعاً تارکاش تھے۔ عیسائی کیوں برسرِ پکار ہو گئے، جنہوں نے کبھی بُت پرستی کی حمایت کا دعویٰ نہیں کیا؟

اب چند لمحوں کے لئے اُس نزاع پر غور کرو جو قرآن اور اُس کے مخالفوں میں پیدا ہو گئی تھی۔ یہ مخالفت کون تھے؟ پچھلے مذاہب کے پیرو تھے، جن میں سے بعض کے پاس کتاب تھی، بعض کے پاس نہ تھی۔

اچھا بنا، نزاع کیا تھی؟

کیا یہ تھی کہ قرآن نے اُن کے بانیوں اور رہنماؤں کو جھٹلایا تھا، یا اُن کی مقدس کتابوں سے انکار کیا تھا؟ اور اس لئے وہ اس کی مخالفت میں کمر بستہ ہو گئے تھے؟

کیا یہ تھی کہ اُس نے دعویٰ کیا تھا، خدا کی سچائی صرف میرے چہرے میں آئی ہے، اور تمام پروردان مذاہب کو چاہیے، اپنے اپنے مذہبوں کی دعوت سے برگشتہ ہو جائیں؟

یابھو اُس نے دین کے نام سے کوئی ایسی چیز پیش کر دی تھی، جو پروردان مذاہب کے لئے باطل غی بات تھی، اور اس لئے قدرتی طور پر انہیں ماننے میں تامل تھا؟

قرآن کے حصے کھلے ہوئے ہیں اور اُس کے نزول کی تاریخ بھی دنیا کے سامنے ہے، یہ دونوں ہیں بتائے ہیں کہ ان تمام باتوں میں سے کوئی بات بھی نہ تھی، اور نہ ہو سکتی تھی، اُس نے نہ صرف اُن تمام رہنماؤں کی تصدیق کی جن کے نام لیا اُس کے سامنے تھے، بلکہ صاف صاف لفظوں میں کہہ دیا، جو سے پہلے تھے میری رسول اور مذاہب کے بانی آپکے ہیں میں سب کی تصدیق کرتا ہوں، اور مان میں سے کچھ ایک کے انکار کو کبھی خدا کی سچائی کا انکار نہیں ہوں۔

خدا کی براہ راست پرورش کی جائے، لیکن دنیا کے تمام مذہبی گروہوں نے کسی نہ کسی شکل میں شرک، دُست پرستی کے طریقے اختیار کر لئے تھے، اور گونا گویں اس سے انکار نہ تھا کہ اصل دین خدا پرستی ہی ہے، اور خدا ایک ہی ہے، لیکن یہ بات شاق گزرتی تھی کہ اپنے، لاف، دُستا و طریقوں سے دُست بردار ہو جائیں۔

## خلاصہ بحث

مذکرہ تفصیلات کا حاصل حسب ذیل دفعات میں بیان کیا جا سکتا ہے۔  
(۱) نزولِ قرآن کے وقت دنیا کا مذہبی شکل اس سے زیادہ وسعت نہیں رکھتا تھا کہ سُنوں، خاندانوں، اور قبیلوں کی معاشرتی چند بنیوں کی طرح، مذہب کی بھی ایک خاص گروہ بندی کر لی گئی تھی باہر گروہ بندی کا آدمی سمجھتا تھا، دین کی سچائی صرف اُسی کے حصہ میں آئی ہے، جو انسان اس کی مذہبی جذبہ میں داخل ہے، نہایت یا فتنہ ہے، جو داخل نہیں ہے، نہایت سے محروم ہے۔

(۲) ہر گروہ کے نزدیک مذہب کی اصل و حقیقت محض اُس کے خدا ہی اعمال و رسوم تھے، جو نبی ایک انسان اُنھیں اختیار کر لیتا، یقین کیا جاتا کہ بتا دسات اُسے عامل ہو گئی، مثلاً عبادت کی شکل و طریقہ، قربانیوں کے رسوم و عوامد کسی خاص علماء کا کھانا یا نہ کھانا، کسی خاص وضع و قطع کا اختیار کرنا یا نہ کرنا۔

(۳) چونکہ یہ اعمال و رسوم ہر مذہب میں الگ الگ تھے۔ اس لئے ہر مذہب کا پیر و یقین کرتا تھا کہ دوسرا مذہب مذہبی صداقت سے خالی ہے، کیونکہ اُس کے اعمال و رسوم ویسے نہیں ہیں جیسے خود اُس نے اختیار کر رکھے ہیں۔

(۴) ہر مذہبی گروہ کا دعویٰ صرف یہی نہ تھا کہ وہ سچا ہے، بلکہ یہ بھی تھا کہ دوسرا جھوٹا ہے، نتیجہ یہ تھا کہ ہر گروہ صرف اتنے ہی پر قانع نہیں رہتا کہ اپنی سچائی کا اعلان کرے، بلکہ یہ بھی ضروری سمجھتا کہ دوسروں کے خلاف تعصب و نفرت پھیلائے، اس صورت حال نے نوبع انسانی کی تو ایک دائمی جنگ و جدال کی حالت میں مبتلا کر رکھا تھا، مذہب اور خدا کے نام پر ہر گروہ دوسرے گروہ سے نفرت کرتا اور اُس کا خون بہانا جز سمجھتا۔

(۵) لیکن قرآن نے نوبع انسانی کے سامنے مذہب کی عالمگیر سچائی کا اصول پیش کیا۔

(الف) اُس نے نہ صرف نبی تبلیہ کا ہند مذہب میں سچائی ہی

اصل یہ ہے کہ پیر و ان مذاہب کی مخالفت اس لئے نہ تھی کہ وہ خیر مجتہد تائید ہیں، بلکہ اس لئے تھی کہ جھوٹا تائید نہیں، ہر مذہب کا پیر و چاہتا تھا کہ وہ صرف اُسی کو سچا کہے، باقی سب کو جھوٹا کہے، اور چونکہ وہ کیسا طریقہ پر سب کی تصدیق کرتا تھا، اس لئے کوئی بھی اُس سے خوش نہیں ہو سکتا تھا، یہودی اس بات سے تو بہت خوش تھے کہ قرآن حضرت موسیٰ کی تصدیق کرتا ہے، لیکن وہ صرف اُنہی نہیں کرتا تھا، وہ حضرت یسوع کی بھی تصدیق کرتا تھا، اور عیسائی اگر اُن میں اور بنو دیوں میں نزاع شروع ہو جاتی تھی، عیسائیوں کو اس پر کیا اعتراض ہو سکتا تھا کہ حضرت یسوع اور حضرت مریم کی پاک و صداقت کا اعلان کیا جائے، لیکن قرآن صرف اُنہی نہیں کرتا تھا، وہ یہ بھی کہتا تھا کہ نہایت کا دار و مدار عمل پر ہے نہ کلمہ اور اھلباب پر، اور قائلانِ نہایت کی یہ عالمگیر مساعی کلیسا کے لئے ناقابلِ برداشت تھی؛

اسی طرح قریش مکہ کے اس لئے سے بڑھ کر کوئی دلوں کو نہایت نہیں ہو سکتی تھی، کہ حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل کی بزرگی کا اعتراف کیا جائے، لیکن جب وہ دیکھتے تھے کہ قرآن میں طرح ان دونوں کی بزرگی کا اعتراف کرتا ہے، اُسی طرح یہودیوں کے پیغمبروں اور عیسائیوں کے داعی کا بھی بڑھ کر ہے، تو ان کے نفسی اور اجتماعی غور کو گھسن لگتی تھی، وہ کہتے تھے، ایسے لوگ حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل کے پیر و کیونکر ہو سکتے ہیں، جو ان کی بزرگی اور صداقت کی صفت میں دوسروں کو بھی لاکھڑا کرتے ہیں؟

مختصر قارئین سمجھا چلیے کہ قرآن کے تین اصول ایسے تھے جو اُس میں اور تمام پیر و ان مذاہب میں دُج نزاع ہو گئے؛

(۱) وہ مذہبی گروہ بندی کی روح کا مخالف تھا، اور دین کی وحدت یعنی ایک ہونے کا اعلان کرتا تھا، اگر پیر و ان مذاہب یہ مان لیتے تو انھیں یہ تسلیم کر لینا پڑتا کہ دین کی سچائی کسی ایک ہی گروہ کے حصہ میں نہیں آئی ہے سب کو یکساں طور پر ملی ہے، لیکن یہی ماننا اُن کی گروہ پرستی پر شاق گزرتا تھا۔

(۲) قرآن کہتا تھا، نہایت اور سادات کا دار و مدار عمل پر ہے، نسل، قوم، گروہ بندی اور ظاہری کمزوری پر نہیں ہے، اگر یہ اصل وہ تسلیم کر لیتے تو پھر نہایت کا دروازہ بجا امتیاز، تمام نوبع انسانی پر کھل جاتا، اور کسی ایک مذہبی حلقہ کی تشکیل ہی باقی نہ رہتی، لیکن اس بات کے لئے اُن میں سے کوئی بھی تیار نہ تھا،

(۳) وہ کہتا تھا، اصل دین خدا پرستی ہے، اور خدا پرستی یہ ہے کہ ایک

وہ کہتا ہے، ایک خدا کی پرستش اور نیک عملی کی زندگی، جو انسان بھی ایمان اور نیک عملی کی راہ اختیار کرے گا، اُس کے لئے نجات ہے، خواہ وہ تہا رہی گروہ بندیوں میں داخل ہو یا نہ ہو!

(۹) اُس نے صاف صاف لفظوں میں اعلان کر دیا کہ اُس کی دعوت کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ تمام مذاہب اپنی مشترک اور متفقہ سچائی پر جمع ہو جائیں، وہ کہتا ہے تمام مذاہب سچے ہیں، لیکن ہر وان مذاہب سچائی سے سخر ہو گئے ہیں؛ اگر وہ اپنی فزائوس گروہ سچائی از سر نو اختیار کر لیں تو سیراکام پورا ہو گیا۔ اور انہوں نے مجھے قبول کر لیا، تمام مذاہب کی یہی مشترک اور متفقہ سچائی ہے، جسے وہ اللہ میں اور الاسلام کے نام سے پکارتا ہے!

(۱۰) وہ کہتا ہے، خدا کا دین اس لئے نہیں ہے کہ ایک انسان دوسرے انسان سے نفرت کرے، بلکہ اس لئے ہے ہر انسان دوسرے سے محبت کرے، اور سب ایک ہی پروردگار کے رشتہ عیوب میں بندہ کہ ایک ہو جائیں، وہ کہتا ہے جب سب کا پروردگار ایک ہے، جب سب کا مقصد اُسکی کی بندگی ہے، جب ہر انسان کے لئے وہی ہوتا ہے حبیب اُس کا مل ہے تو ہر خدا اور مذہب کے نام پر یہ تمام جنگ و نزاع کیوں ہے؟

(۱۱) مذاہب عالم کا اختلاف صرف اختلاف ہی کی حد تک نہیں رہا ہے بلکہ باہمی نفرت و مخالفت کا ذریعہ بن گیا ہے، سوال یہ ہے کہ یہ مخالفت کیونکر دُور ہو؟ یہ تو ہمیں سکھاتا ہے تمام مذاہب اپنے دعوے میں سچے مان لے جائیں، کیونکہ ہر مذہب کا پروردگار اسی بات کا مدعی نہیں ہے کہ وہ سچا ہے، بلکہ اس کا بھی مدعی ہے کہ دوسرے جھوٹے ہیں، پس اگر اُن کے دعویٰ مان لے جائیں تو تسلیم کرنا پڑے گا کہ ہر مذہب بیک وقت سچا ہے، اور جھوٹا بھی ہے، یہ سچی نہیں ہو سکتا کہ سب کا جھوٹا قرار دیا جائے، کیونکہ اگر تمام مذاہب جھوٹے ہیں، تو ہر مذہب کی سچائی ہے کہاں؟ پس اگر کوئی صورت

بلکہ صاف صاف کہہ دیا کہ تمام مذاہب سچے ہیں، اُس نے کہا کہ دین خدا کی عاجزش ہے، اس لئے ممکن نہیں کہ کسی ایک قوم اور جماعت ہی کو دیا گیا ہو، اور دوسروں کا اس میں کوئی حصہ نہ ہو!

(ب) اُس نے کہا، خدا کے تمام قوانین فطرت کی طرح انسان کی روحانی سعادت کا قانون بھی ایک ہی ہے، اور سب کے لئے ہے، پس ہر وان مذاہب کی سب سے بڑی گمراہی یہ ہے کہ انہوں نے دین الہی کی وحدت فزائوس کر کے الگ الگ گروہ بندی کر لی ہیں۔ اور ہر گروہ بندی دوسری گروہ بندی سے لڑ رہی ہے۔

(ج) اُس نے بتلایا کہ خدا کا دین اس لئے تھا کہ نزع انسانی کا نفرت اور اختلاف دُور ہو، اس لئے تھا کہ نفرت و نزع کی ایک علت بن جائے، پس اس سے بڑھ کر کراہی اور کیا ہو سکتی ہے کہ جو چیز نفرت دُور کرنے کے لئے آئی تھی، اُسکی کو نفرت کی بنیاد بنا لیا ہے؟

(د) اُس نے بتلایا کہ ایک چیز دین ہے، ایک شرع و منہاج ہے، دین ایک ہی ہے، اور ایک ہی طرح پر سب کو دیا گیا ہے، البتہ شرع و منہاج میں اختلاف ہوا، اور یہ اختلاف ناگزیر تھا، کیونکہ ہر عہد اور ہر قوم کی حالت یکساں نہ تھی، اور ضروری تھا کہ جیسی جس کی مشابہت دیکھو ایسے احکام و اعمال اُس کے لئے اختیار کئے جائیں، پس شرع و منہاج کے اختلاف سے اہل دین مختلف نہیں ہو جاسکتے، تم نے دین کی حقیقت تو فزائوس کر دی ہے، محض شرع و منہاج کے اختلاف پر ایک دوسرے کو کھینچا رہے ہو!

(دھ) اُس نے بتلایا کہ تہا رہی مذہبی گروہ بندیوں اور اُن کے ظواہر و رسوم کو انسانی نجات و سعادت میں کوئی دخل نہیں؛ یہ گروہ بندیان تہا رہی بنائی ہوئی ہیں، ورنہ خدا کا منہرایا ہر وان تو ایک ہی ہے، وہ دین متعین کیا ہے؟

تھے سب انسان کے ہاتھوں ٹوٹ چکے، سب کی نسل ایک تھی، مگر ہزاروں نسلیں ہو گئیں، سب کی قومیت ایک تھی، مگر بے شمار قومیتیں بن گئیں، سب کی وطنیت ایک تھی، لیکن لیکن نیکو لوگوں و طہیتوں میں بٹ گئے، سب کا درجہ ایک تھا، لیکن امیر و فقیر، شریف و ضعیف، اور ادا و نفاذی کے بیت سے درجے بٹ گئے، ایسی حالت میں کونسا رشتہ ہے جو ان تمام تفرقوں پر غالب آسکتا ہے، اور تمام انسان ایک ہی صف میں گھرنے ہو جائیں، قرآن کہتا ہے کہ خدا پرستی کا رشتہ ہے، یہی ایک رشتہ ہے جو انسانیت کا پھر اہوا گھرانہ پیدا کر دے سکتا ہے، یہ اعتقاد کہ ہر سب کا پروردگار ایک، یہی پروردگار ہے، اور ہر سب کے سر اسی ایک چو کھٹ پر جھکے ہوئے ہیں، ایک حقیقی و جلالیت کا ایسا جذبہ پیدا کر دیتا جو ممکن نہیں، انسان کے بنائے ہوئے تفرقے اس پر غالب نہیں

رشتہ نزارع کی ہو سکتی ہے، تو وہ وہی ہے جس کی دعوت سے قرآن خود راہوا ہے، تمام مذاہب یکے ہیں، کیونکہ اصل دین ایک ہی ہے، اور وہ سب کو دیا گیا ہے، لیکن تمام چیراں مذاہب بھائی سے معرفت ہو گئے ہیں، کیونکہ انھوں نے دین کی حقیقت اور وحدت مضائقہ کر دی ہے، اور اپنی گمراہیوں کی الگ الگ ٹولیاں بنالی ہیں، اگر ان گمراہیوں سے لوگ باز آجائیں، اور اپنے ذہب کی حقیقی تعلیم پر کاربند ہو جائیں تو مذاہب کی تمام نزاعات ختم ہو جائیں گی، ہرگز وہ دیکھا کہ اس کی راہ بھی اٹھا وہی ہے جو اور تمام گمراہوں کی راہ ہے، قرآن کہتا ہے تمام مذاہب کی یہی مشترک اور متفقہ حقیقت: اللہین ہے، یعنی ذریعہ انسانی کے لئے حقیقی دین، اور اسی کو وہ اسلام کے نام سے پکارتا ہے۔

(۱) ذریعہ انسانی کی باہمی جلالیت اور اتحاد کے لئے رشتے بھی ہو سکتے

## رفیقہ حیات کے نام

میں اپنی طبع کی آوارگی سے خائف ہوں کہ مجھ کو پھر یہ ہواؤ ہو جس میں ڈال نہ دے  
مرے ابو کو یہ وحشت سے ہمتب نہ کرے سکون قلب کو ترغیب استعمال نہ دے  
ترمی نظر نے جو مجھ کو کمال بخشا ہے یہ اُس کمال کو خمیا زہ زوال نہ دے  
ترے لئے یہ کہیں وجہ غم نہ بن جائے مجھے کہیں قلق شرم و لغفال نہ دے  
خدا کرے کہ مجھے فصل گل کی رعنائی تحیلاتِ ملوث بہ استبدال نہ دے

مبادا اپنا مقام بلند کھو بیٹھوں

مر ہی ہو جس مجھے فردوس نہ نکال نہ دے

محمد ملک

# انسانی فرائض و حقوق کی بحث

## جوزف میزنی کے خیالات

سید اختر علی تھری

(گلدستہ سے پیوستہ)

### اٹلی کے مزدور!

میرے بھائیو، میری باتیں اچھے طریقے سے سمجھو میں جب یہ کہتا ہوں کہ حقوق کے علم سے انسان اس قابل نہیں بنتا کہ وہ کوئی قابل مد ستعمل ترقی وجود میں لائے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں تم سے یہ کہتا ہوں کہ اپنے حقوق ترک کر دو۔ میرا مقصد صرف اتنا ہے کہ حقوق کا قیام فرائض کے مکمل کے نتیجے ہی کی شکل میں ہو سکتا ہے۔ حقوق کی منزل مقصود تک پہنچنے کے لئے ابتداء فرائض کی انجام دہی کے بغیر چلنا لازمی ہے۔ اسی طرح میں جب یہ کہتا ہوں کہ خوشحالی و خوشوقتی و مسرت یعنی مادی اغراض کو زندگی کا مقصد قرار دینے سے ہم ایسے لوگوں کی آفرینش کے خطرہ میں مبتلا ہوں گے جن میں انسانیت و خود پسندی، پورے طور سے موجود ہوگی تو اس کا مدعا یہ نہیں ہے کہ بہتیں ان چیزوں کے حاصل کرنے کی کبھی کوشش نہ کرنا چاہیے۔ میرا مقصد صرف یہ ہے کہ صرف مادی اغراض کے حاصل کرنے کی سعی کرنا اور اُمیدیں کو اصل قرار دے لینا خوفناک نتائج پیدا کرنے کا سبب ہو سکتا ہے۔

جن ملکوں نے اپنے شہنشاہوں کے تحت سوائے مادی اغراض حاصل کرنے کے اور کسی چیز سے طلب نہیں رکھا تو اس کا نتیجہ کیا ہوا؟ وہ ایک

ذلیل قوم بن گئے اور اپنے بادشاہوں کے سفاکانہ اور خوشحالانہ مقام بہتے بہتے وحشی حد اور قوموں کی غلامی میں ہنایت ذلیل طریقہ سے گرفتار ہو گئے۔ فرائض میں اور دوسرے مقامات میں معاشرتی ترقی کے دشمنوں نے مادی جہد و جد کو ترقی دے کر تخریب و فساد کی غیر ریزی کی اور تعمیر و تبدل کے خیالات دوسری طرف موڑ دیے۔ کیا ہم دشمنوں کی مدد اپنے ہاتھ سے خود کر رہے گئے؟ مادی ترقی ضروری ہے اور ہمیں اس کے حاصل کرنے کی کوشش کرنا چاہیے، لیکن اس لئے ہمیں کہ ایک انسان کے لئے یہ ضروری ہے کہ اسے "اچھا گمان" اور "اچھا مکان" ملے بلکہ صرف اس لئے کہ کسی شخص میں خود داری اور اخلاقی ترقی کا احساس اس وقت تک پیدا نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ خواہشوں اور ضرورتوں سے مسلسل جنگ میں مشغول ہے۔ صبح کو آٹھ بجے حالت ہو رہی ہے۔ تم ہر روز دس بارہ گھنٹے کام کرتے ہو، تم کو اس نگاہت کہاں مل سکتا ہے کہ تم اپنے کو تعلیم دو۔ تمہاری بڑی تعداد و شکل سے انسانیت ہے جو اسے اور اس کے تعاقب کے لئے کافی ہو سکے۔ ایسی صورت میں تمہارے پاس وہ ذرائع کہاں ہیں جن سے تم اپنے کو تعلیم دو، سکو، کام کے لائق بنو، نہروں اور سہولتوں میں حیات و دخول کے پیدا ہونے سے یہ نہایت ہوتی ہے کہ یا تو تم اپنا وقت کا بلی و مستحق میں صرف کر دو یا پھر بہت زیادہ

بنانے کے لئے نہیں بلکہ اپنے بہتر بنانے کے لئے اس کے حصول کی کوشش کرو۔ اگر یہ صورت نہیں ہے تو بہتر تم میں اور تمہارے غلاموں میں کیا فرق ہوگا؟ وہ فقر اسی لئے تو ظالم کہلاتے ہیں کہ انھیں اپنی بہتری میں اور طاقت کے سوا کسی اور بات کی پروا نہیں ہے۔

اپنے کو بہتر بنانا نہ ہی زندگی کا مقصد ہو نہ چاہیے۔ اپنی حالت کو ترقی ہی دے کہ اگر آپ کو مستقل طور سے خوشحال بنائے ہو۔ اگر کمزور مادی اغراض میں کی غلط یا کسی مخصوص جماعت کے حکام سے جنگ کر کے تو ہزار روپیہ کا مالک تم میں پیدا ہو جائے گا۔ اگر کمزور چھوٹے دھرماء یا جذبات اور امانت اپنے میں بدستور باقی رکھو گے تو معاشرتی نظم کے مقابل سے کیلی فرق نہیں پیدا ہوگا۔ یہ سوسائٹیاں یا جماعتیں مثل بودوں کے ہیں جو اپنے طریق استعمال کے لحاظ سے زہر یا تریاق پیدا کرتے ہیں۔ اچھے آدمی بڑے سماجوں اور بڑی جماعتوں کو اچھا بنا دیتے ہیں اور بڑے آدمی اچھی جماعتوں کو بُرا۔ نہیں اُن طبقوں کی جو اختیاری یا اضطراری طور سے تمام اچھی عظم کہتے ہیں اصل کرنا اور انھیں ان کے فرائض جتنا نہیں، لیکن تم اس میں اُس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتے جب تک کہ اسکا اپنی حالت اپنی حالت کے بہتر بنانے سے ابتدا نہیں کرتے۔

حب قرآن لوگوں کو جو کل معاشرتی تبدیلی کی ضرورت کی تمہیں تلقین کرتے ہیں یہ کہتے ہوئے سنو کہ وہ صرف تمہارے حقوق سے اپیل کر کے اس ضرورت کو پورا کر دیں گے تو ان کی نیک نیتی کے تو شکر گزار ہو نہیں اُن کے پیش نظر نتیجہ پر اعتبار نہ کرو۔ غریب آدمیوں کی تکلیفیں اور مصیبتیں کم سے کم ایک حد تک امیر طبقہ کو معلوم ہیں، لیکن اُسے اس کا احساس نہیں ہے۔

ایک فقرہ عقیدہ کے فقدان کی وجہ سے جو عام بلے پروائی موجود ہے اور اتنے برسوں تک مادی بہتری و خوشحالی کی مسلسل تبلیغ و تلقین کے سبب سے جو انانیت پیدا ہو گئی ہے اُس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ وہ لوگ جو ان معمولی اور تکلیفوں سے الگ ہیں وہ رفتہ رفتہ اس خیال کے عادی ہو گئے ہیں کہ تکلیفیں معاشرتی نفع کے رعبہ لازم میں سے ہیں، اور اسی لئے انھوں نے اُس کے دوران کی تلاش آئندہ مصلوں کے لئے چھوڑ دی ہے۔ اُن کو اس کا یقین دلانا دشوار نہیں ہے بلکہ دشواری جو کچھ ہے وہ اس میں کہ اُن کی اس بے علمی کی حالت کو اُن سے دور کیا جائے اور اُن کو اس کی ترمیم دینی تھی اس کے وہ اپنے یقین پر حاوی ہوتے ہوئے تمہارے

کام کرو۔ اس صورت میں ترتیب اوقات پابندی اوقات اور مسلسل سرگرمی کی عادت، تم میں کیونکر پیدا ہو سکتی ہے؟ لکھائیوں کی کمی کی وجہ سے تم اتنا بچا ہی نہیں سکتے جو تمہارے بچوں کے یا عالم مغربی میں تمہارے کام اسکے ایسی حالت میں تم کیونکر اپنے میں کفایت شاعری کی عادت پیدا کر سکتے ہو؟ انفلک کی وجہ سے تم میں سے بہتر اس پر مجبور ہیں کہ اپنے بچوں کو (یہ تو میں کہہ نہیں سکتا، ماؤں کی پُر اہنگ تربیت سے کیونکہ غریب مزدوروں کی غریب بیویاں اپنے بچوں کو تربیت ہی کو نہ ہی دے سکتی ہیں، البتہ یہ کہیں لکھائی ماؤں کی محبت بھری نگاہوں سے علیحدہ کر دیں، اور انھیں چند چھوٹی چیزیں لے کر گھر سے باہر فیلڈوں میں غیر صنعتی مشینوں کے لئے بھیج دیں۔ ان صورتوں میں غذا انی محبت کے سونے تمہارے دلوں سے کیونکر بیوٹ ہو سکتے ہیں۔ اور اُن میں شرافت کیونکر پیدا ہو سکتی ہے؟ بہترین شہریوں کے حقوق حاصل نہیں ہیں اور نہ انتخاب یا ووٹ کے ذریعے سے تم اُن قوانین کے بنانے میں کوئی شرکت رکھتے ہو جو تمہارے اعمال اور زندگی پر مادی ہیں۔ ایسی صورت میں تم میں شہرت، کاکوٹن فخر یا حکومت کے متعلق کوئی جوش یا قوانین کا کوئی سماجی خیال پیدا ہو سکتا ہے؟ دوسرے طبقوں کے ساتھ جو انصاف روا رکھا جاتا ہے وہ تمہارے ساتھ نہیں۔ ایسی صورت میں عدل و انصاف کی محبت اور عزت تم میں کیونکر پیدا ہو سکتی ہے؟ ہوسکا تمہارے ساتھ بالکل ہمدردی کا برتاؤ نہیں کرتی۔ ایسی صورت میں ہوسکا کے ساتھ ہمدردی کا سبق نہیں کہاں سے حاصل ہو سکتا ہے؟ ان اسباب کی بنا پر تمہیں اپنے مادی حالات کے بدلنے کی ضرورت ہے تاکہ اخلاقی حیثیت سے تم ترقی کر سکو۔ تمہیں اس کی ضرورت ہے کہ محنت اور مزدوری کا کافی معاوضہ ملے تاکہ تم کچھ پس انداز کر سکو۔ مستقبل کی طرف سے مطمئن ہو جاؤ، اور اپنے نفوس کو اُن تمام جذبات انتقام و قصاص سے پاک کر دو جو ان لوگوں کی طرف سے تمہارے دلوں میں جاگزیں ہیں جنہوں نے کبھی تمہارے ساتھ رحم کا برتاؤ نہیں کیا۔

اس نظریہ کے لئے نہیں کوشش کرنا چاہیے اور اس طرح تو کامیاب بھی ہو سکتے، لیکن اس کے حصول کی کوشش نہیں اسے ذریعہ واسطہ سمجھ کر کرنا چاہیے۔ اُسے مقصد نہیں قرار دے لیا چاہیے۔ نہ صرف حق سمجھ کر بلکہ اپنی رائے سمجھ کر اس کے حاصل کرنے کی کوشش کرو، صرف مادی حیثیت سے اپنے خوشحال

بدل دیں۔ اُس میں سچا رعب پیدا کر دیں۔ اُس کے تمام افراد اہل کام کرنے والوں کو ایک عقیدہ میں ایک قانون کے تحت ایک مقصد پر لگاؤ اور خدا نے اپنی مخلوق میں جو قوتیں اور صلاحیتیں عطا کی ہیں اُن کو آزادانہ اور صحیح نشو و نما دیں۔ ہم دنیا پر دسی ہی بلکہ اُس سے کچھ بہتر طور پر خدا کی حکومت چاہتے ہیں جو آخرت میں ہوگی، تاکہ دنیا عقیقہ کے لئے تیار کی جگہ اور سوسائٹی کا قیام یزدانی نظریہ کی طرف رہنمائی کی کوشش نہ کیے۔

حضرت مسیحی کا ہر عمل اُن کے اُس عقیدہ کا جس کی وہ تلقین کرتے تھے منظر ہو رہا تھا، اُن کے ارد گرد جو حوالے تھے ہو گئے تھے ان کے اعمال بھی اُسی عقیدے کے منظر تھے جسے انھوں نے قبول کیا تھا۔ انھیں جیسے تم بھی ہو جاؤ۔ تم بھی غفلت و غلو نہ کرو۔ اُنہیں یہ قوتیں جو تمہارے ہاتھ میں فرائض کی تلقین کرو اور جہاں تک ہو سکے اپنے فرائض پورے کرو۔ نیکی، قربانی اور محبت کی تعلیم دو۔ خود نیک، محبت کرنے والے اور قربانی کے لئے آمادہ اور مستعد ہو، خیرات کے ساتھ اپنی ضرورتوں اور اپنے خیالات کا اعلان کرو دیکھیں اس میں غصہ ہو۔ انتقامی جذبہ ہو اور کوئی دھمکی ہو۔ سب میں زیادہ طاقتور دھمکی (اگر اس کی ضرورت کچھ لوگوں کو ہو) تو وہ فقر پر ہو تو ہے جو عزم و ارادہ کی مالک ہو۔ وہ تقریر نہیں جو غیظ و غضب پر مشتمل ہو۔

جب کہ تم اپنے ساتھیوں میں اپنے مستقبل کے انہماکوں کے تخیل اور ایک ایسی قوم کے تخیل کا پروکینڈ کر رہے ہو جو نہیں تعلیم، کافی مزدوری اور کام کے دوش بدوش خودداری اور ہمارے عطا کر کے اور اسی طرح جب کہ تم اُن کا جوش اُٹھاتے ہو کہ وہ کشش کے لئے اپنے کو آمادہ کر سکیں اور خواب و اہمی حکومت کی طاقتوں کے باوجود وہ کام چیزیں حاصل کر سکیں تو یقیناً تمہیں چاہئے کہ اپنے کو بہتر بناؤ۔ اپنے فرائض اچھے طریقے سے سمجھو، اور اُن پر عمل کرو۔

انہی کے برے حصہ میں عوام کے لئے یہ کام نامکن ہے، جمہور کے واسطے مفید تعلیم و تربیت اُس وقت تک وجود میں نہیں آسکتی، جب تک کہ لوگوں کی مادی حالت میں تغیر اور سماجی فضا میں انقلاب نہ ہو۔ وہ لوگ جو کہ اپنے نہیں دھوکے دے کر اس کے خلاف اُنہیں رکھتے ہیں اور آزادی کی تیاری کے لئے اسے ضروری سمجھکر اس کی تبلیغ کرتے ہیں وہ

مسند اور شرک، ہرگز نہ یوں کی طرح ایسی معاشرتی کیفیت، اجتماع کے وجود میں لانے کے لئے جدوجہد کریں جو اُن صحت چھان تک کہ انسانی حالت اجازت دیں، بہاری مصیبتوں اور اُن کے خوف کو مٹا دے مگر یہ بے عقیدہ کے نہیں ہو سکتے بغیر اُس عقیدہ کے جو انسان کو اُس میں بہرہ و نفع چاہیے جس کی تبلیغ کے لئے وہ دنیا میں بھی گیا ہے بغیر اُس عقیدہ کے جو اُس ذمہ داری پر ہو جسے انجام دے بغیر ہر شخص ایک قسم کا بار محسوس کرے۔ بغیر اُس عقیدہ کے جو اُس فرائض پر ہو جو ہر فرد کو صداقت کی خاطر عمل سہل اور قربانی پر مجبور کرتا ہے۔

حقوق اور مادی خوشحالی کے تمام نظریے صرف اُن کوششوں تک منہمی ہو سکے ہیں جو اگر جماعتی اور ہتہا متباری قوت پر منحصر رہے تو وہ کبھی کامیاب نہیں ہوں گے۔ البتہ بدترین قسم کے معاشرتی جرائم اور سوسائٹی کے مختلف طبقوں میں باہمی جنگ پیدا کر دیں گے۔

انہی کے مزہ دور و میرے بھائیو! جب سچ کا ظہور ہوا تھا اور اُنھوں نے دنیا کی ظاہری حالت بدل دی تھی تو اُن کی طرف سے نہ تو کبھی امیروں کو "فرائض حقوق" کی تلقین کی گئی تھی (جن کے حاصل کرنے کی فی نفسہ انھیں ضرورت تھی نہ تھی) اور نہ کبھی غریبوں کو جو بیت ممکن تھا کہ امیروں کی نقل میں اُن سے ناجائز فائدے اٹھاتے۔

جناب مسیح نے کبھی اپنے فائدے اور ذاتی اغراض پر نظر کرنے کی تبلیغ اُس قوم کو نہیں کی جسے یہی چیزیں تباہ و برباد کر چکی تھیں۔ اُنھوں نے فرائض کی سچا اور سچی تلقین کی، محبت کی تلقین کی، قربانی کی تلقین کی، اعتقاد کی تلقین کیا۔ اُنھوں نے یہی کہا کہ سب سے آگے والی جگہ ہی لوگ پائیں گے، جنھوں نے دوسروں کے ساتھ سب سے زیادہ مہربانی کی ہے۔ ان خیالات نے اُس سماج "کو جس میں زندگی کی کوئی چٹکاری باقی نہیں رہی تھی پھر سے زندہ کیا۔ لاکھوں کو منسوب کیا۔ دنیا پر فتح حاصل کی۔ اور انسانی جماعت کی تعلیم کو ترقی کے راستہ پر لگایا۔

انہی کے مزہ دور و ہم بھی حضرت مسیحی ہی کے سے زمانہ میں زندگی بسر کر رہے ہیں، ہم بھی اسی سماج میں رہائیں لے رہے ہیں جو رومی سلطنت ہی کی طرح فاسد ہو چکی ہے۔ ہم اپنی روحانی میں یہ احساس رکھتے ہیں کہ اس سوسائٹی کو بالکل

یہی چند افراد بھی ہیں ان میں وہ سبھی اصول سرایت کر گئے جن پر ایک قوم کی داخلی تعلیم کا انحصار ہے انہیں ہزاروں آدمیوں میں منظر گردی کے یہی اصول راستہ کے رہنما بن گئے اور ان مغالطوں اور باطل نظریوں سے تحفظ کا کام دیں گے جو صحیح اصولوں پر رہنمائی کے لئے راستہ میں ملے ہیں۔

بے عملی کے علاوہ کسی دوسرے امر کی تعلیم نہیں دے رہے ہیں۔ اس کام کو ہمارے درمیان میں وہ لوگ انجام دے سکتے ہیں جن کے حالات کسی قدر اچھے ہیں اور جنہوں نے غیر ممالک میں قیام کی وجہ سے آزاد تعلیم حاصل کی ہے انہیں لوگوں کو یہ کام انجام دینا چاہیے۔

## مظلوم کی تھلوی

## باغی شاعر

”لیکن حضور میں اپنے خمیر کی قیمت مال دوزر سے کہیں زیادہ سمجھتا ہوں“ شاعر نے جواب دیا۔

اشارہ گو لطیف تھا، مگر راجہ فرما سمجھ گیا، آنکھوں سے آگ برسنے لگی، بھوین خنجر کی طرح تن لگیں اور مدح کی طرح گرج کر بولا: ”اسے جیل میں ٹھونس دو“ شاید اسے معلوم نہ تھا کہ آج کا باغی کل کا تاجدار بن سکتا ہے۔

راجہ کے حکم کی تعمیل کر دی گئی، سحر قید خانہ میں ڈال دیا گیا، مہل خنجر میں ٹھونس دی گئی، لوگوں نے یہ دیکھا اور غن کے گھونٹ پی کر رہ گئے، راجہ کے حکم سے شاعر کا نام لینا جرم قرار دے دیا گیا۔ لوگ اس کی ننگوں کو ترسنے لگے، راجہ کے حکم کی خلاف ورزی کی سزا موت تھی، اور اسی خوف سے لوگ خاموش تھے، مگر راجہ سمجھتا تھا۔ میں نے باغی شاعر کی یاد لوگوں کے دلوں میں نکال دی ہے:

ایک روز جب سورج اپنے پورے صلال میں زمین پر آتشیں کرنیں برسایا، ہاتھ جیل کے بڑے پھانگ سے ایک ایسی باہر نکلی۔ یہ شاعر کی اناجی تھی، — شاعر کی جوانی غیر ضرورت کرنے کی بجائے موت سے ہم آغوش ہو گیا، ارستی کو دیکھ کر لوگوں کے دلوں میں راجہ کے خلاف نفرت و حقارت کا سمندر موجزن ہو گیا، راکھ میں دہی ہوئی چٹکاری سمراک اٹھی، ان کی نظروں میں راجہ جیسے ظالم، بدچلن اور بے رحم ہی تھا مگر اب قاتل بھی بن گیا تھا —

دو شاہو متھا، اس کی نظموں میں آزاد دی کا چننا مضمعتا، وطن کی حالت زار پر خاک میں ترپنے والے آنسو پوشیدہ تھے، غریبوں کا خون چوسنے والے ظالموں کے خلاف اعلان جنگ کی تلقین تھی، ہر شہر دل میں اتر جانے کی تاثیر رکھتا، مظلوم، مغلوب اور مجبور لوگ اس کے اشعار پڑھ پڑھ کر جھومتے تھے، اس شاعر کا نام تھا سحر۔

سحر ایک ایسی ریاست میں رہتا تھا، جس کا راجہ بدچلن تھا اور ظالم۔ وہ ہر وقت شراب میں غلطان اور خوبصورت عورتوں کے حلقہ میں گھرا رہتا تھا، مگر اس عیش پسندی کے باوجود اسے شہرت کی کمی تھی۔ نام آدری کا جنوں تھا، غفلت کی خواہش تھی۔

سورج طلوع ہو اور روشنی ڈھیلے یہ نامن ہے، سحر بھی آسمان ادب پر آفتاب بن کر چمک رہا تھا، راجہ کی عیش گاہوں میں اس آفتاب کی کرنیں پہنچیں۔ راجہ نے اسے طلب کر کے کہا۔ ہماری شان میں قیدہ لکھو شاعر:

سحر نے جرت کو ضبط کرتے ہوئے پوچھا۔ آپ کی شان میں؟ — وہ سورج رہا تھا کہ ایک ظالم خرابی اور ادا باش کی شان میں کیا لکھا جاسکتا ہے؟ اسے شش درخ میں دیکھ کر راجہ نے کہا۔ ”تم ہمیں خوش کریں گے شاعر!“ — زرد مال سے تھاری مہولی بھر دیں گے۔

اب رب آزادستے، ظالم اور جہن راجہ کا خوف مٹ چکا تھا، اور لوگ ہر طرف دیہی فلیں گانے گئے جن میں آزادی کا بنام مہم تھا، وطن کی حالت زار پر ترانے سنے، غریبوں کا خون چوسنے والے ظالموں کے خلاف اعلان جنگ کی تلقین تھی۔

دریائی روائی رک سکتی ہے مگر مذہب کی روائی کو نہیں روکا جاسکتا۔ لغزت نے تہرہ غضب کی صورت اختیار کر لی۔ راجہ اپنی زندگی خطرے میں دیکھ کر کشت و تاجہ چھوڑ کر بھاگ نکلا اور جنگوں میں جا چھا، لوگوں نے شاعر کا ایک مٹائی بُت تخت پر رکھ دیا، اور شہر کے بہترین دماغ اس کے نام پر حکومت کرنے لگے۔

## مقلات زین

بعض مرگے اور زندہ ہیں، اور بعض زندہ ہیں اور مر رہے۔ ایک اچھا دل بتر ہے دیکھ کے تمام بچے دماغوں سے۔ صرف شہید ملک الموت کو شکست دیتا ہے۔ شباب کی آنکھوں کے سامنے کوئی بد صورت نہیں۔ بیاریاں کیا ہیں؟ اجل کے تقاضے — اور صحت — اُن تقاضوں پر کامیاب معذرت کا نام ہے۔ خوشی کے بھول کو زیادہ پیار نہ کرو، ورنہ اُس کی نازک پٹھریلوں سے غم کا عرق ٹپکنے لگے گا۔ دولت، کی کم وقتی اسی سے ظاہر ہے کہ جب تک اُسے جدا نہ کیا جائے، راحت ملن نہیں۔

میں آج کے سرت خیز واقعات سے کم خوش ہوں؟ جانتا ہوں کل ہی واقعات ایک جہت انگیز باد "بن کر ستانے آئیں گے۔ اسے دنیا ہم فقیروں کو نہ تنگ، ہم شادوں کو نہ لہجہ، بڑھے پائے میں نہیں جھٹلائے جاتے۔ بڑھتیوں کی ہر باریاں بڑی بڑی بوندیں ہیں، جو بیک بیک پڑ گئی ہیں۔ اور چشم زدن میں غائب۔ مکہ کلام ایک عصا ہے، جس کے سہارے ضعیف گویا بی ٹھوکتی ہوئی چلتی ہے۔

(جوش ملیح آبادی)

عالم شباب میں موت آنا، کہاں ہی شروع ہوئی تھی کہ نیند آگئی۔ جو جسم ہی نہیں، جس کی جلو میں آنسوؤں کا کاش نہ ہو۔ خدا نہ کرے، خوشی ورجہاں تک پہنچ جائے۔ جس مرض کا علاج نہیں، اُس سے مصالحت کر لو۔ محبت، تلوار کے بغیر زنج کرنے کی صنایع ہے۔ حسد کے ٹکے میں کسی تعلیل نہیں۔ سزا بھی دی دے جو محبت کرتا ہے۔ صرف رقیب القلب ہی بہادر ہو سکتا ہے۔ تاریکی بھی ایک قسم ہے خواب کی۔

جوانی کی بلے اعتدالیان ہا رقص ہیں، جنہیں پیری میں سودا

کرے گی۔

خوبصورتی کا نازک ترین حصہ وہ ہوتا ہے جو تصویر میں نہ آسکے۔ ہمارے دور میں نیک آدمیوں کے سوا سب شریک ہیں۔ اسے مغرور؟ کوئی ایسی ترکیب بھی ہے کہ تو قبر میں نہ بیٹھے؟ رواج بڑی سے بڑی چیز سے سفاک کر دیتا ہے۔

تمام دنیا کی بہترین عقلیں، شاعر کے ایک جنون کی قیمت نہیں لیتیں، اگر اتنے بڑے آدمی نہ ہوتے تو اس قدر اچھے وکیل بھی نہ ہوتے۔ سچے شاعر کا مینات کے اتالیق ہیں۔

ہیت سے استادا، شاگردوں کے بنائے ہوئے ہیں۔

# وطن کے نوجوانوں کے خطا

تو ہی تولے نوجوال تعمیر خواہے قوم ہے  
زندگانی کے قصیدے کی تو ہی تئیب ہے  
نوجوال یہ یاد رکھتے ہیں مستقبل ہے تو  
ہے عروس زندگی کا تو ہی سرتاج اور ہنگام  
کیا فقط ماں باپ ہی کی آنکھ کا تار ہے تو  
کارگاہ وہر میں ہے نواک ایسی خور وہیں  
لمعن کی باتیں بھی سنتے ہیں جوانوں کے خلاف  
جاو بجا لوگ کہہ اُٹھتے ہیں تم کو دیکھ کر  
بن سنور کر کالجوں کو اس طرح جاتے ہو تم  
وقت نامی اور برش لگنے میں ہو جاتا ہے ضرب  
زیب و زینت اور خود بینی کا ہے تم کو مرض  
دم سے چلتی ہیں تمہارے یہ دکانیں بال کی  
ہوسل، لکچر کے کمرے، کھیل کے میدان میں  
زیب و زینت کے ہونڈے، سادگی سے دودھ  
پاس ہونے کی خوشی ہوتی نہیں اتنی تمہیں  
اور کچھ باتیں بھی ہیں کہہ جاتے ہیں جو کلمہ ہیں  
تھوڑے جاتے ہیں جو تم پر عیب یا ہیں واقعی

وقت باندھے ہوئے ہے، شباب قوم ہے!  
حریت کی تو وطن کے واسطے تقریب ہے  
قوم کو یا جسم ہے۔ اُس کا دماغ و دل ہے تو  
تو رہا بستی انسان کا ہے کیا نراگ  
ہے وطن کا تو یہ چشم، اور قوم کا پیرا ہے تو  
جس سے آئینہ ہوا سر ارغلاک۔ راز زمین  
کچھ گمنام یہ میں بھی جاتی ہیں تو کچھ صاف صاف  
”تم میں انسانی ادائیگی آگئی ہیں بیشتر  
اپنی زیبائش سے دلہنوں کو بھی شرت ہے تو تم  
اس سے جو سمجھتا ہے پڑھ لیتے ہو اس چارہ  
یہ بیدی ہے کہ کیسی چیز اس سے کیا غرض  
جان ہو تم ہی سنیا اور سقیر بال کی  
مُجول جلتے حضرت یوسف کو دیکھ جاتے ہیں  
تم خود آرائی کے نشہ میں ہمیشہ چور ہو  
جسکی لالچ چھوڑ کر ہوتی ہے مایوسی تمہیں  
ذمہ داران کا مگر میں تم کو کہہ سکتا نہیں  
نتیجہ اُن کے لئے تم ہو نہیں سکتے کبھی

اس حقیقت سے مگر واقف نہیں ہیں جو وہ ہیں

مغربی یا مشرقی ہو کچھ سبھی اپنی کی نوعیت  
ذمہ دار اس کے سلف ہیں، کب ہٹا ہی ذات

ان عوارض میں بہت رد عمل درکار ہے

امر حق میں کچھ ضرورت استعاضے کی نہیں

مجھ کو کہنا ہے یہ تجھ سے کُن اے اے نوجوان

جو بڑے ہیں تجھے، اے اُنکے نقائص سے سبق

ہو وطن آزاد۔ اس کی لاکھ ہم باتیں کریں

فرقہ بندی سے یہاں مجروح ہے حب وطن

ہم اٹھتے ہیں قدم تو چھونک کر اور تول کر

تجزیہ ہو ذہنیت کا ان بزرگوں کی اگر

تجزیہ بد بختیوں، ناکامیوں کا ہے ہیں

سورج کا اور فکر کا تو اب زمانہ ہو چکا

وہ ہے ہماری ماقبت مبنی کا یہ کچھ حاصل

ما مصلحت اندیشیوں سے کام چلے گا نہیں

کام وہ ہو جس سے نکھرے کچھ دُلوں کا رنگ

جوش آیا تھا کبھی وہ انقلاب آنے کو ہے

دیکھتے ہو گل جہاں کس کام پر تیار ہے

تم عصا ہو اے جو انہی قوم پیسہ کا

قومیت اپنی جو ہے وہ اک ملیّت کا نام ہے

مغز فرسودہ میں ہے بزمِ بیدگی اس قند

مذہبوں مبروسوں کی شعلہ بازی رہی

یہ سب اخلاقی وراثت کے سوا کچھ سبھی نہیں

ان میں اسلاف اور بزرگوں کا عطیہ ہے بہت  
غمر ہے کوشش وراثت کا یہ سدھی بات ہے

یہ جو ہو جائے تو کچھ دم میں بیڑا پار ہے

ہو جو نیت نیک تو حاجت اشارے کی نہیں

تیری ہی جانب اٹھائے ہے نظر ہندوستان

تھا دلو العزیز کا اُن کو تا ہیوں سے لے سہن

ہے غلامی حاوی دوسری ہماری ذات میں

جل رہا ہے نفرت کی آگ میں سارا جہن

یہ ہماری چال تعلیق اور لبس اسفر

تو جھک دے گی جائے اس کو اک صدی سے بیشتر

آزمودہ کار ہیں ہم مبر میں اور شکر میں

بند مبروشکر کا اب کارخانہ ہو چکا

وقت آیا ہے کہ بوم ہاتھ میں تیغِ عمل

یہ شجر آہوں کی گرمی سے تو پھلے گا نہیں

اہل دنیا کو دکھا دو تم بھارت کے سہوت

عالم تہذیب کو روزِ حساب آنے کو ہے

جانتے ہو تم کہ کیا اس عزم میں اسرار ہے

رنگ بدلو اس کی تم گڑھی ہوئی تقدیر کا

ملیت سبھی کیا کہ ایک فرقہ سے ہے جو کام ہے

تیز چلنے میں نظر آتا ہے گرنے کا خطر

عقل کی ذوق عمل سے حلیہ یر داڑی رہی

کویتوں جب جوانی کا کہیں جوش و خروش  
میں نے مانا کام بے سوچے کوئی اچھا نہیں  
کاٹ دی ہے سوچنے میں ہم نے جو عمر عزیز  
سادگی اطوار میں ہو، دل میں ہو خبِ وطن  
یہ جوانی تو نہیں بس خطا اٹھانے کے لئے  
لہلہ بھاؤ اور رونق باغ کی پھولوں سے ہو  
پھول تو کچھ دن میں مڑھجا اور کھٹا جائیگا  
تم سے آئے گی بہارِ بختِ نالِ گلزار میں  
نہ وطن کے کام میں مصروف ہو گئے جس گھر میں  
ہادیوں کے بھس میں پہکانے والے آئیں گے  
لے کے تسبیح اور سحر ن بھی بہت آئیں گے لوگ  
اک بے کیا ناک زک اور دوزخ دکھا یا جائیگا  
ایک بھی اُن کی نہ سنا وہ ربا کاری ہے سب  
چل چکا صدیوں وہ جادو اُن کا اپنی قوم پر  
فتنہ پروازی سے اُن کی بچکے رہنا تو جواں  
اُن کو ماضی جان کر مطلق نہ رکھو اُن سے کام  
ہے یہ میدانِ عمل! آجاؤ تم سر جوڑ کر!  
اس قدر خود رفته ہو جاؤ غلب کی راہ میں

تو یہ کہہ اٹھتے ہیں، لو کو بیٹے دھب عقل فریشت  
سورج ہی میں کاٹ دینا عمر بھی اچھا نہیں  
استفادہ تم کو اس سے کہ ہر صاحبِ تمیز  
اور اداسے فرضِ آئندہ کی ہوجی کو لگن  
رکھو محفوظ اس کو آئندہ زمانے کے لئے  
غور سے دیکھو تو ہمیں پھول کی کلیوں سے ہو  
ہیں وہ غنچے ہی تو جو گلزار کو مہکا میں گے  
جلوہ گر ہو گا ارم اس وادی پُر خاریں  
خضر و نار دین کے آئیں گے بہت سے آدمی  
تم کو راہِ راست سے بھٹکانے والے آئیں گے  
ڈاڈھیوں اور چوٹیوں سے تم کو پہکانے لگے لوگ  
محشرِ کبریٰ کا منظر آگے لایا جائے گا  
وہ تو چادرِ اور تختہ کی اداکاری ہے سب  
اُن کی لوری کام دے سکتی نہیں وقتِ سحر  
آہنیے جو دام میں اُن کے تو آزاد ہی کہاں  
تم ہو مستقبل کو آئندہ کا حسنِ نظام  
اور وطن کے فرض کو انجام دو جی توڑ کر  
ہر قدم پر منزلِ مقصود دو دو موندتے ہیں

جب تمہارا جذبہ نہیہاں عیاں ہو جائیگا

نوجوانو! پھر وطن بھی نوجواں ہو جائیگا

# معاشی قومیت

عبدالرحیم شبلی بی کام

لیکن باوجود اس حمایتی پروپگنڈے کے معاشی قومیت عامہ دراز تک ایک مجبور کر دینے والی طاقت کی بجائے ایک محکم قوت ہی اور اندر ہی اندر اس نے معاشی سامراجیت کے خیالات کو فروغ دیا جو بعد کو بحارِ بظیم کا باعث بنے۔ اس جنگ کے بعد صوبے بڑا بہت جوقام عالم نے سکینا، یہ تھا کہ سیاسی اقتدار حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ معاشی تغویٰ بھی حاصل ہو، اور اس کے لئے اُنہوں نے معاشی خود مختاری اور تجارتی انحصار کے اصول وضع کئے۔

پس اگرچہ تاریخی لحاظ سے معاشی قومیت کا ارتقاء ثابت کیا جاسکتا ہے، لیکن معاشی طور پر اس کی حمایت میں کوئی دلیل پیش نہیں کی جاسکتی، دوسرے الفاظ میں تاریخ والوں کے نزدیک یہ نظریہ لاپرواہی ہو تو ہو لیکن ایک ماہر معاشیات کے نزدیک یہ ملحقہ نظریہ قابلِ قبول نہیں۔ آئیے ہم اس کی موافقت و مخالفت میں مختلف دلائل کا تفصیل تجزیہ کریں۔ پہلی دلیل معاشی قومیت کی حمایت میں حیاتیات یا بالوجی سے

مستفیس ہے۔ قدرتی انتخاب اور بقا، اصل کے قوانین نے اجتماعیات کو کیا حیاتیات کے بارہ میں سبھی انسان کی خیالات کو تبدیل کر دیا ہے۔ ان کی رُوسے کمزور کرنا ہو جانا چاہیے۔ صرف اصل کو باقی رہنے کا آئخان ہے۔ پس اگر کوئی ملک یا قوم زندہ رہنا چاہتی ہے تو اُسے چاہیے کہ اپنے آپ کو سیاسی لحاظ سے مضبوط بنائے اور سیاسی لحاظ سے مضبوط بننے کے لئے ضروری ہے کہ معاشی طور پر خود مختاری حاصل کی جائے۔

”معاشی قومیت“ وہ جذبہ یا اعتقاد ہے جو اپنے ملک کو اقتصادی طور پر خود مختار اور کافی بالذات بنانے کے لئے کسی گورنمنٹ میں پایا جائے، اُس کو قومی ترقی یا ملکی خوشحالی کے مرادف سمجھا جاتا ہے۔

تاریخی لحاظ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ”معاشی قومیت“ انیسویں صدی کے حامیان تجارتیت کے خیالات کی مرہون منت تھی، کیونکہ ان لوگوں کا خیال تھا کہ سب اپنی برآمد کو درآمد سے محض اس لئے زیادہ رکھنا چاہئے تاکہ زائد خارجہ کے عرصہ میں سونا حاصل ہو، اور ملک کی خوشحالی بڑھے، پس یہ جذبہ حصولِ دولت اور معاشی اقتدار ہی ”معاشی قومیت“ کا باعث بنا۔

انیسویں صدی کے آخر میں آدم سمٹھ نے ”معاشی قومیت“ کے نظریہ کی پرزور مخالفت کی۔ علاوہ ازیں کچھ سیاسی و معاشی حالات میں بھی تغیر رونما ہو گیا۔ اس لئے قومیت کی بجائے ”معاشی مین الا قوا“ کے خیالات زور پکڑنے لگے۔

کچھ عرصہ کے بعد فریڈرک لٹ

نے پھر معاشی قومیت کی حمایت کا ناشر دے کر دی، اور اپنے خیالات کی موافقت میں سبیل کے اس فلسفہ کو پیش کیا، کہ حکومت کا اقتدار اور دقتاری سب سے بڑا شعور اور عقلیت مندرجہ ذیل ہے۔ پس اس وقار اور اقتدار کو قائم رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ ملک معاشی طور پر خود مختار اور کافی بالذات رہے۔

دوسرے الفاظ میں جنگوں کے انداد کا بہترین طریق یہ ہے کہ کسی ملک کو معاشی طور پر خود مختار نہ ہونے دیا جائے۔

بعض اوقات کہا جاتا ہے کہ جب دوسری اقوام اس اصول پر عمل نہیں کرتیں تو ہمیں دوسروں پر انحصار رکھ کر تکلیف اٹھانے کی کیا ضرورت ہے؟ بظاہر یہ دلیل وزنی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا دوسروں کی تقلید کسی لائسنس عمل کو درست ثابت کر سکتی ہے؟ میرے خیال میں تو یہ دلیل بالکل اس دلیل کی طرت ہے کہ اسلمہ بڑھانے سے ہی اسلمہ کو ہسکتے ہیں۔ حتیٰ کہ اعتبار صرف اعتبار کرنے سے ہی پیدا ہوتا ہے۔ پس دوسروں کے دل سے شک و شبہ دور کرنے کے لئے کسی قدر قربانی کی ضرورت ہوگی۔

حال ہی میں معاشی قومیت کی حمایت میں عالمگیر کساد بازاری کی دلیل پیش کی گئی ہے اور کہا گیا ہے کہ تجارتی زبوں حالی سے بچنے کا بہترین طریق یہ ہے کہ اقتصاد دی طور پر خود مختاری حاصل کی جائے۔ لیکن ایسا کہنے والے غالباً ملت و مملکت میں فرق نہیں کر سکتے۔

در اصل معاشی قومیت کی وجہ سے زراعت و زری کی مذموم عادت پیدا ہوتی ہے اور اس وجہ سے تجارت میں لنگھل پیدا ہوتا ہے جس کے نتیجہ میں صنعتی زبوں حالی اور اقتصاد دی استحکام کا ظہور ہوتا ہے۔ پس معاشی قومیت کو جو ایک علت ہے، کساد بازاری کی، جو معلول ہے، علاج کے طور پر پیش کرنا یقیناً حیرت انگیز ہے۔

علاوہ ازیں آج کل کے پیچیدہ متمدن میں معاشی اقتصاد اقتصاد نامکنت میں سے معلوم ہوتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ معاہدہ دسائی، سیاسی قومیت کی ایک بڑی فتح تھی۔ لیکن اقتصاد دی نقطہ نظر سے اس کی ضرر رسانیاں اہل نظر سے پوشیدہ نہیں۔ اگرچہ سیاسی طور پر جرمنی کو دبا مانگ تھا۔ لیکن اقتصاد دی طور پر اس کی وجہ سے تمام یورپی طاقتوں کو سخت نقصان ہوا۔

معاشی بین الاقوامیت کی موافقت میں سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ قدرت نے ہر ملک کو مختلف صلاحیتوں سے نوازا ہے۔ اس زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کی خاطر، بہتر یہی ہے، کہ ہر ملک صرف

بھروسہ کا خیال ہے کہ چونکہ غیر مساوی اجزاء میں ارتباط نہیں ہو سکتا۔ اس لئے معاشی عالمگیریت اور انحصار باہمی کے رشتہ میں منہک ہونے کے لئے ضروری ہے کہ تمام اقوام دہل یکساں طور پر مضبوط و مقدر ہوں اور اس کے لئے معاشی قومیت ہی بہترین لائحہ عمل ہے۔

دلیل واضح ہے، لیکن ایک طرہ، اگر یہ درست ہے کہ انسان کے بارہ میں "قدرتی انتخاب" کا اصول کارفرما ہے تو مجھے خطرہ ہے کہ یہ مصنوعی انتخاب ہے۔

لیکن اگر یہ سچ ہی کر لیا جائے کہ تنازعہ للمیات کے لئے مصنوعی انتخاب کے معجزاتی عمل آئے گا کوئی امکان نہیں تو سچی اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اقتصاد دی انقطاع اور معاشی خود مختاری کو مضبوط اور طاقتور بنادے گی۔ مگر ذرا وقام کو مضبوط بنانے کو دوسروں کے اتحاد و ارتباط ہے نہ کہ انقطاع و خود مختاری۔ مگر الذکر طریق سے تو یہاں قدرت اور طاقت و وقت کے خاتمہ ہونے کا خطرہ ہے۔ ان کے نفع بخش رودار میں دواں ہونے کی امید نہیں۔

دوسری دلیل جو معاشی قومیت کی حمایت میں پیش کی جاتی ہے "متوازن معیشت" ہے۔ یعنی ملک میں زراعت و صنعت و حرفت اور تجارت یکساں نسبت سے ترقی یافتہ ہونا چاہئیں تاکہ تمام پہلوؤں کے لحاظ سے متوازن نہ ہلا سکے۔

خیال اچھا ہے۔ لیکن متوازن معیشت کی برکات کو صرف ایک ملک تک ہی محدود کیوں رکھا جائے؟ ان کو بین الاقوامی کیوں نہ بنایا جائے؟

کہا جاتا ہے کہ اگر معیشت غیر متوازن ہو تو جنگ کے دوران میں جب خارجی تجارت منقطع ہو جاتی ہے تو اس وقت لوازم حیات کا ملنا بھی دشوار ہو جاتا ہے۔ اندر میں حالات کیا یہ بہتر نہ ہو گا کہ ہر ملک کافی طاقت ہو۔

اس قسم کی دلائل کا پیش کرنا نیک فال نہیں ہے۔ ان سے تو معلوم ہوتا ہے کہ ہم دنیا کی جماعتوں کو آپس میں متحارب و دیکھا پسند کرتے ہیں۔ پھر بات میری دلیل کو اور بھی زیادہ قوی کرتی ہے۔ اگر معاشی خود مختاری کے بغیر جنگیں کامیابی سے نہیں لڑی جا سکتیں تو یہ تو بہت منفید بات ہے

زیادہ ہے۔ اگر تجارت آزادانہ ہو، اور سب ممالک مل جل کر کاروبار کریں تو اس رائیگاں جانے والے سرمایہ کی بچت ہوسکتی ہے۔ یہی حال دیگر اقوامت دولت آفرینی کا ہے۔

اب ہم ان معاشی مسائل کو لیتے ہیں جو اس جذبہ قومیت کی وجہ سے منفعہ شہود پر آگئے ہیں۔

پہلا مسئلہ یہ ہے کہ ایک طرف تو جرمنی کو مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ اپنے جنگی قرضجات اور نادان کا تصفیہ کرے اور دوسری طرف تحفظات تجارت کے ذریعہ سے اس کے لئے جو ادائی کا واہد راستہ تھا وہ بند کر دیا گیا ہے۔

پھر معاشی قومیت کی وجہ سے سوئے کو ایک طاقت تصور کیا جانے لگا ہے۔ اور ہر ملک زیادہ سے زیادہ سونا اپنے بنکوں میں جمع کرنے کی سعی کر رہا ہے۔ اس وقت دنیا کا پچھوننا فرانس اور امریکہ کے پاس ہے۔ علاوہ انہی آبادی اور مزید رقبات کے حصول کا مسئلہ بھی اسی جذبہ قومیت کی تخلیق ہے۔

جنگ عظیم کے بعد یورپ کو لاتعداد جمہوریتیں چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا جس کی وجہ سے وہ معاشی طور پر دیگر دنیا سے منقطع ہونے پر مجبور ہو گئے۔ اور آج اس کا نتیجہ یہ ہو رہا ہے کہ جرمنی اور اطالیہ ایسے ممالک جو جرمنی اور اسیکی لحاظ سے قدرے مغبوط ہیں اپنی برصغیر ہوائی آبادی کے باعث مزید رقبات کے حصول کے لئے سر توڑ کوشش کر رہے ہیں۔ اور اس مقصد کے لئے وہ جنگ آزمائی کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ حال ہی میں رومانیہ بھی دنیا کو پامال کیا ہے۔ اور مزید علاقہ جات پر دندانِ حرم و آزر رکھتا ہے۔ جرمنی نے اپنے ”مغضب شدہ“ ممالک کی دلچسپی کے لئے جمعیۃ اقوام والوں کو چینج دئے ہیں جس کا نتیجہ سوائے خون آشام محاربہ عظیم کے اور کچھ نہ نکلے گا۔ یہ سب معاشی قومیت کی برکات ہیں!!

معاشی خرابیوں کے علاوہ اس جذبہ سے کئی دیگر برائیوں کے پیدا ہونے کا بھی احتمال ہے۔ اگر یہ نظریہ قائم رہا تو لوگ روز بروز مستعصب اور تنگ نظر ہوتے جائیں گے۔ اگر وہ انگلستان میں ہیں تو صرف انگریزی اشیاء کے استعمال پر مصر ہوں گے، جتنی کہ ایک دن وہ روسی سے روسی انگریزی فلم محض اس لئے دیکھیں گے کہ وہ قومی ہیں اور امریکن

ان اشیاء کی ساخت و پیدائش میں تخصیص کرے۔ جن کے لئے اس کے قدرتی وسائل اور جغرافیائی حالات سازگار ہیں۔ مثلاً اگر کوئی ملک اپنے وسیع رقبات اور مخصوص آب و ہوا کے لحاظ سے صرف کاشتکاری کے اہل ہے تو اسے چاہئے کہ صرف زراعت کی طرف ہی توجہ رکھے۔ لیکن اگر وہ صناعت و تجارت کے لئے مخصوص کیا گیا ہے تو اسے اسی شعبہ کی ترقی و تہذیب کی طرف توجہ رہنا مفید رہے گا۔

بہت اس کے خلاف یہ کہتا ہے کہ عملی اس جغرافیائی تقسیم اور مبادلہ آزاد سے قوم کی تخلیق قد ریا تو بیشک بڑھ جائے گی، لیکن تخلیق قوتوں یعنی پراس کا بہت ناخوشگوار اثر پڑے گا۔

لیکن یہ اچھا ہے کہ ”تخلیقی قوت“ ایک بہم اصطلاح ہے، اور اس نے خود اس کے معنی صنعت کے علاوہ اخلاقی اور سیاسی ادارہ کے بھی کہے ہیں۔ لیکن جمعیۃ معاشیات کے ایک طالب علم ہونے کے ہمیں اس کے معنی صرف صنعت و حرفت تک محدود رکھنا چاہئیں۔ پھر پھر کے نزدیک کسی قوم کی دولت آفرینی کے لئے حسن کارکردگی کا کوئی مسئلہ سمجھنا نہیں ہے۔ اور نہ ہی مجاہد ممالک پیدائش دولت کے لئے مساویانہ اہل ہوتے ہیں۔

اگر ہم دولت آفرینی میں انسان کی قابلیت مساویانہ تسلیم کر لیں تو سبھی آب و ہوا، معاشرت، اور جغرافیائی حالت یقیناً جدا جدا ہوں گے اور ظاہر ہے کہ ان چیزوں کا پیدائش دولت پر کم اثر نہیں ہوتا۔

پس چونکہ دولت آفرینی ایک اعتباری اور ارضانی شے ہے اور ہر ملک کی قوت پیدائش دولت جدا گانہ ہوتی ہے، اس لئے بہتر یہ لائحہ عمل بھی ہے کہ ہر ملک صرف ان اشیاء کی ساخت و پیدائش میں تخصیص کرے جس کے لئے اس کے قدرتی وسائل سازگار ہیں۔ اور باقی اشیاء بین الاقوامی مبادلہ کے ذریعے سے درآمد کرے۔

پھر معاشی قومیت سے اقتصادى منبع کا بھی خطرہ ہے۔ مثلاً ای قومیت کے زمانہ میں ہر ملک جدا جدا چھانڈنا ضروری سمجھتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہو رہا ہے کہ طلب کے مقابلہ میں چاندوں کی پھر سرائی بقدر ۲۲ منصفی

نہم کا محض اس لئے ہائیکاٹ کر دیں گے کہ وہ خارجی ہے۔ پھر بڑھتے بڑھتے یہ  
جذبہ کتاؤں اور اخباروں کے بارہ میں بھی کارفرما ہو گا۔ ہو سکتا ہے کہ لوگ  
گوئے ٹالسٹائی اور کٹر سیرگو کی کتاؤں کا محض اس لئے مطالعہ کر دیں  
کہ وہ خارجی مصنفین تھے۔  
پس یہ جذبہ سوائے مجنونانہ حرکت کے اور کچھ نہیں، اور اس کی  
عقبتی بھی مذرت کی جائے کم ہے۔

# نسیم اُن کو بھی ساتھ لانا

اگر کہیں ہو اُدھر بھی جانا  
نسیم اُن کو بھی ساتھ لانا

سنبھل سنبھل کر قدم اٹھانا      ذرا دبے پاؤں پاس جانا  
ہٹانا آہستہ اُن کی زلفیں      مگر اُنھیں ہاتھ مت لگانا  
پیام بن کر جو دل میں اُترے      وہ مست نغمہ اُنھیں سنانا  
زیادہ اٹھکیلیاں نہ کرنا      بہت متانت سے گد گدانا  
بڑے ہی نازک مزاج ہیں وہ      نزاکتوں سے اُنھیں جگانا  
اگر وہ پوچھیں کہ کس نے بھیجا      نہ کچھ بتانا پتا۔ ٹھکانا  
نہ آئیں گے گر ہوا بھی پالی      یہی ہے بہتر ہوا بتانا

بنا کے جھوٹا کوئی پہنانا  
نسیم، اُن کو بھی ساتھ لانا

## مجید ملک، بی، اے، ایل، ایل، بی ملک

میں نے کہا مجھے ایک گھڑی چاہیے۔  
اُس نے جواب دیا۔ معاف کیجئے، گھڑیوں کی قیمتیں مجھے معلوم نہیں۔  
ملک دوکان باہر گئے ہیں، تھوڑی دیر میں آئیں گے۔  
میں نے دل ہی دل میں باہر کی گڑگڑائی، جھپٹائی، دھوپ کا دوکان کی  
خٹک، دھبی روشنی سے مقابلہ کیا، اور بادل ناخوہستہ واپس چلا، لیکن اس  
آدمی نے کہا اگر آپ کو تکلیف نہ ہو تو کچھ دیر انتظار کر لیجئے۔  
میں ایک آرام کر رہی تھی کچھ ایسی آرام دہ نہ تھی جیسا کہ، مختلف گھڑیوں  
کی متوازن ٹاک ٹاک اور سبکی کے ٹپکے کی مسلسل سنسنی کے علاوہ درنگ  
میں نے اور کوئی آواز نہیں سنی، آہستہ آہستہ خشکی اور دھندلک نے اپنا  
اثر کیا۔ میری آنکھیں دڑتی ہو گئیں۔ باہر بازار میں دو آدمی ہاتھیں کر رہے  
تھے، ایک نے کہا میں اس کا غلام نہیں کہ ہر وقت ہاں میں ہاں ملاتا رہوں،  
دوسرے نے کہا۔ مسیحا وقت ہو دیا ہے، بیٹے! سچے نے کہا وقت  
کی ایسی تھی۔

خدا جانے ان الفاظ میں کیا بات تھی کہ تمام گھڑیوں میں ایک  
خشونت ایک کرشماتی پیدا ہو گئی۔ ٹاک، ٹاک، ٹاک، آوازیں بلند اور  
بند تر ہوتی گئیں، اور انجام کار فوجت یہاں تک پہنچی کہ گویا کوئی ترمیم  
آہستہ تھوڑے کی چوٹیں لگا رہا ہے، بڑے بڑے ٹاک اور مرمائم چوٹوں کی

## وقت سے جنگ

بعض باتیں درست ہوتی ہیں اور بعض غلط، لیکن وقت یہ ہے کہ ایک  
ہی بات کو کچھ لوگ درست بتاتے ہیں اور کچھ غیر درست۔  
مثلاً ایک مرتبہ میں ایک لڑائی میں شریک ہوا۔ شریک کیا ہوا میں۔  
ایک ایک طرف تھا اور دوسری جانب۔  
لیکن بہتر یہ ہو گا کہ ابتدا سے قطعہ بیان کر دوں۔

میں ایک بارہ پندرہ روپے کی گھڑی خریدنا چاہتا تھا، میرا خیال  
تھا اور ہے کہ بڑی دوکانوں پر پندرہ روپے کی گھڑی پچیس روپے میں ملتی  
ہے، اس لئے میں نے فیصلہ کیا کہ ہمارے ہی بازار میں گھڑیوں کی چڑھائی  
سہی، لیکن پرانی اور مشہور دوکان ہے اُسی سے گھڑی خریدوں گا۔  
چنانچہ ایک دن دوپہر کے وقت میں اپنے ارادے کی تکمیل کے  
لئے ایک بے رنگ و درجن دروازے سے ایک بوسیدہ سی جتن ہٹا کر  
دوکان کے اندر داخل ہوا۔ باہر کی تیز دھوپ کے بعد دوکان کی دھبی  
روشنی میں تین چار لمحوں کے لئے میری آنکھوں نے پوری طرح سے کام  
نہیں دیا۔ اور مجھے ایسا معلوم ہوا کہ دوکان بالکل خالی ہے، دوکان کا  
مالک جس غیر معمولی طور پر ادنیٰ کرسمی پرستی کا عادی تھا وہ کرسی یقیناً  
خالی تھی، لیکن تھوڑی دیر کے بعد ایک کونے سے ایک آدمی نکلا اور میرے  
پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔

کہا۔ خاتین و حضرات! انسان سمجھتا ہے اس کی مخلوق میں، اس کی عقل و دانش اور صنعت کاری کا منہ نہیں، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ انسان ہمارا ادنیٰ غلام ہے، یہ غلام باغی ہونے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس فکر میں ہے کہ ہمارے غلام سے نکل جائے، بلکہ انسانی جماعت کے وہ کچھ نگاہ و کچھ کمزوریوں کو عقل کو عقل کل اور حاصل کائنات سمجھتے ہیں، اور جن کے دلوں میں عداوتی اور بغاوت کا زہر بدرجہ اتم سرایت کر چکا ہے اس فکر میں ہیں کہ موجودہ نظام کو درجہ ہریم کر دیں، میں تجویز پیش کرتا ہوں کہ انسان کو اس گستاخی کی قرار دینی سزا دی جائے۔ سب سے ایک زمان ہو کہہا "بیشک، بیشک" سے عمل کر لیا، سزا دیا ہو؛ کسی نے کہا "سولی پر لٹکا دیا جائے" ایک جوشیہ نام میں نے کہا "جس بجلی پر اسے بہت ناز ہے اور جس کے بل بوتے پر اسے زمان و مکان کی منزل لیں گے کرنے کا خیال ہے اس کی لہروں میں نہیں کراس کی زندگی ختم کر دی جائے۔ کسی نے کہا "دن کو طیل کر دیا جائے، یہاں تک کہ آفتاب کی گرمی سے تڑپ تڑپ کر مر جائے" کچھ کچھ نظاروں میں سے ایک آواز آئی "ہیں! ایک لاشتا ہی رات کی تانکی میں اسے خود سر پھونڈ کر مرنے کا موقعہ دیا جائے" اس آخری تجویز پر ہر طرف سے آفرین و تحنیں کی صدائیں بلند ہوئیں، اور میں نے سمجھا کہ یہی تجویز منظور ہو گئی۔

لیکن ایک نازنین آگے بڑھی، اور اُس نے کہا "میں موجودہ فیصلہ کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتی ہوں، اور تجویز پیش کرتی ہوں کہ اُسے سزا دیا جائے، اس نے ہمیں یہ فیصلہ غلط ہے یہ فیصلہ صحیح اور بالکل صحیح ہے، لیکن اس کے باوجود یہ قابل استرداد ہے، کیوں؟ اس نے کو طبقہ اناتش کی رائے اس میں شامل نہیں۔

میں نے دیکھا کہ ستر کلاؤں کی بٹائی پر کچھ بل سے پڑ گئے، لیکن نو جوانوں نے شکر اُٹھایا ہو کر کہا "بجی ہے، درست ہے، بالکل درست ہے، یہ فیصلہ قابل استرداد ہے، صدر نے کہا "ہیں عزودت صرف اس بات کی ہے کہ خاتین ایک علیحدہ مجلس قائم کر کے فیصلہ کریں۔ چنانچہ اسی وقت خاتین کا ایک علیحدہ جلسہ ہوا جس میں بار بار نئے نئے لباس پہن کر گرم گرم تقریریں کی گئیں، بہت سے آئینہ بے گئے اور پوچھنے سے پہلے تک کہ بعض مقررین اور سامعین کی سائروں کے آنکھوں پر عاصیوں کے

آواز میں غیظ و غضب کے ساتھ ٹکنت اور وقار چھٹی تھا، لیکن جھوٹی گھڑیوں کی آواز میں ایک مسلسل اور لامتناہی احتجاج کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ سب سے بڑا کھاک مجھے کچھ خاصے پر تھا۔ معاً اس کے ان دوسرا چوہے میں جن سے چائی دی جاتی ہے ایک حرکت، ایک چٹک، ایک جان سی پیدا ہو گئی۔ اور اب جو دیکھتا ہوں تو دو غضب آلودہ آنکھیں ہر چار طرف دیکھ رہی ہیں۔ گھنٹوں اور منٹوں کی سریموں نے قوی بازوؤں کی صورت اختیار کر لی ہے، اور شاہ بلوط کا صد سالہ چوبیس فریم انسانی جسم کے حصے زیریں کی صورت میں مبدل ہو چکا ہے۔

میں نے اس بہت ناک مشاہدے کو ایک ڈراؤنا خواب سمجھنے کی کوشش کی اور گہرا کراس بڑے کھاک سے نگاہ ہٹائی۔ لیکن کیا دیکھتا ہوں کہ کمرے کی تمام گھڑیاں انسانی پیکر اختیار کر چکی ہیں، ایسا انسانی پیکر جس میں ایک ہڈی کی آہنیت اور جو بہت کے باوجود دلچاک اور جان ہے، بڑے بڑے کھاک اور نام میں اپنے اپنے کاسنوں سے یوں اتر رہے ہیں جس طرح کسی فاتح فتح کے قوی ہیکل، دیو پیکر، زرد پوش سردار، ہریت خورہ و نیم کے قلعہ کی فضیلوں سے اترتے ہیں، اور چھوٹی چھوٹی گھڑیاں نازنینان حرم کی طرح حریر و پریاں میں لمبوس مشرق و مغرب کے سخن کو ماندہ کرتی ہوئی اپنے جھلوں سے نکل کر یوں زمین پر قدم دھر رہی ہیں جس طرح آخر شب میں شجر کلاب کی پتیوں پر گرتی ہے۔ لیکن میں نے دیکھا کہ ان نازنینوں کے چہروں پر بھی عزم یکہ خوشنود اور خشم کے آثار موجود ہیں۔

بڑا کھاک تین چار قدم آگے بڑھ کر مالک و دکان کی اونچی کرسی پر بیٹھ گیا، اور بلا۔ میں اُس حق کی دُوسے جو مجھ کو حاصل ہے اور جس کی تفصیلات کے انہار کی ضرورت نہیں، اپنے آپ کو صد نامزد کرتا ہوں۔ نامزد نہیں منتخب کرتا ہوں، اور میں حکم دیتا ہوں کہ آپ لوگ تقریریں کریں، اور ان تقریروں میں میرے خیالات کا انہار کریں۔

کمرے میں جتنے مرد و زن یعنی کھاک، نام میں، اور چھوٹی بڑی گھڑیاں موجود تھیں، سب نے تالیاں بجائیں، جو زیادہ جوشیہ تھے اُسکوں نے نعرے بھی سر کئے۔ صدر نے ہاتھ اُٹھا کر کہا "خاموش، اور ایک مقرر کلاب کی طرف اشارہ کیا، اس مقرر کلاب نے دو قدم آگے بڑھ کر

میں دواں دواں، افتال خیزاں، ہانتا کا نبتا دور نکل گیا، ادا  
اُس وقت تک دم نہیں لیا جب تک مجھے یقین نہیں ہو گیا کہ تعاقب کا  
کوئی اسکان باقی نہیں رہا۔ ایک کھلے میدان میں پہونچ کر میں سستے  
کے لئے بیٹھ گیا۔ میں نے گرد و پیش کے حالات پر غور کیا۔ انہی نکات پر  
خدا کا شکر بجالایا۔ اپنی چوڑوں کا جائزہ لیا اور یہ دیکھ کر کوئی شدید  
چوٹ نہیں آئی مطمئن ہو گیا۔ لیکن مجھے احساس ہوا کہ میرے پاؤں  
میں ٹخنے کے پاس کوئی چیز مجھے تکلیف دے رہی ہے۔ میں نے پانچو اٹھا کر  
دیکھا تو معلوم ہوا کہ ایک بال برابر ٹخنے کے گرد لپٹی ہوئی ہے، میں  
نے اسے اتارنے کی کوشش کی، لیکن نتیجہ کچھ نہ نکلا، بلکہ وہ اور بھی  
پہٹ گئی۔ میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا، میرا من خشک ہو گیا،  
کیونکہ میں نے دیکھا کہ یہ باریک تار درحقیقت ایک گھڑی کا پرنک  
ہے۔ اور اس کا ایک سر میرے ٹخنے پر ہے اور دوسرا سر —  
خدا جانے کہاں ہے۔ میں نے گہرا کر — سٹپا کر — جھنجھکا کر —  
ڈر کر — کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اس تار کو پاؤں پر سے فوج کر  
پھینکنے کی کوشش کی۔ لیکن میرے دیکھتے ہی دیکھتے اس باریک تار  
نے مجھے شیعے کی طرح پکڑ لیا۔ مجھے بے دست و پا کر دیا — اور اب  
کسی نا دیدہ طاقت نے مجھے کھینچنا شروع کیا۔ میں زبا — اٹھی۔ بھاگنا،  
گرا۔ لیکن وہ باریک اسپرنگ نہیں ٹوٹا، اور میں کھینچتا، گھٹناتا، گرتا،  
پڑتا، اٹھڑاتا اور منہلتا ہوا پورا سی کمرے میں پہونچ گیا، جس سے میں  
جان بچا کر بھاگتا تھا۔

اور جب میں اس کمرے میں پہونچا تو سب کھلاک اور ٹائمیں  
اپنی انسانی شکلوں میں زندہ و سالم موجود تھے۔ اور مجھ پر نہیں رہے  
تھے۔ تاہم جن صبی گھڑیوں نے سر علی آوازوں میں اور سحر کلاں نے  
کھوکھلے۔ پھٹے ہوئے گلوں سے کھانسن کھانسن کر قہقہے لگائے۔۔۔

میرے شانے پر کسی نے ہاتھ رکھا۔ میں نے ڈر کر کہا: ادا  
میرے خدا! لیکن میرے سامنے دو کاٹا کھڑا تھا، اس نے کہا،  
"آپ سو گئے۔" کئے آپ کو کسی گھڑی کا پانچہ؟  
اس سے عرض نہیں کہ میں نے کسی گھڑی خریدی، یا خریدی

ہاں ترکاشہ پہونے لگا، لیکن جذبات کا یہ ظالم۔ سر علی آوازوں کا یہ  
زیر دم، بیوسات کا یہ رنگین تنوع، نتیجہ ثابت نہ ہوا۔ اور میں کوئی رائے  
تایم نہ کر سکی۔ اسٹیم کو سب نے مل کر صدر سے کہا ہم رائے قائم کرنے سے انکار  
کرتی ہیں، کیونکہ یہ انکار ہمارا پیدا انہی حق ہے۔ اور اس حق سے ہمیں کوئی  
محروم نہیں کر سکتا۔ آپ لوگوں کے جی میں جو آئے وہی کہجئے۔"

تعب اس بات پر ہے کہ اس وقت تک مجھے کسی نے بھی نہ دیکھا  
تھا۔ میں خائف اور بہوت اپنی کرسی پر سٹ سٹ کر ڈنٹوں کی نگاہوں  
سے چھیننے کی کوشش کر رہا تھا، لیکن اس مرحلہ پر خوف مجھ پر اس قدر  
غالب آ گیا کہ میں نے بھاگ نکلنے کی کوشش کی۔ یہی کوشش میرے  
لئے مصیبت کا باعث بن گئی۔ کیونکہ میں کسی نے کہا: "دیکھو، پکڑو!  
باغی خزاں ہوتا ہے۔" ایک ہی لمحے میں چاروں طرف سے گھر لیا گیا۔  
میں نے دل میں کہا: "موت کا ایک دن مقرر ہے۔ مردوں کی طرح  
جان دوں گا۔" چنانچہ دو قدم آگے بڑھ کر میں نے ایک جوان کھلاک  
کے چہرے پر اس قدر زور سے گھونسا مارا کہ وہ چیخ مار کر زمین پر گرا  
اور پاش پاش ہو گیا۔ لیکن فورا ہی دوسرا کھلاک میرے اور بجائے گئے  
درمیان حائل ہوا، اور فزاکار راستہ پر مسدود ہو گیا۔ اب میں سر  
اور مارنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ خون میرے سر پر سوار تھا۔ میں دیوانوں  
کی طرح اپنے ڈنٹوں پر بل پڑا۔ آگے بچھے دائیں بائیں، چپاں اور  
حسن طرح مکن ہوا، پینتر سے بدل بدل کر۔ موت سے بے خوف اور  
زندگی سے ناامید ہو کر میں نے اپنے درپے حملہ کئے۔ میرے ہاتھ کاٹنے  
کی خزانوں سے ہلو بہان ہو گئے۔ لیکن میرے دشمن ہر جہاں طرف بھی  
پہونکر گر رہے تھے اور میں آزادی کی امید سے غمور اور فوجندہ کی کھانسن  
سے سرشار ہو کر انہیں موت کے گھاٹ اتار رہا تھا۔

آخراں مجھے خزاں راستہ مل گیا اور میں بوڑھے صدر کے جو  
دروازے کے سامنے کھڑا تھا، میں ایک گھون مار کر بھاگ نکلا،  
بوڑھا صدر تراتاق سے نیچے گر کر چلنے چور ہو گیا، لیکن جب میں دروازے  
سے باہر نکلا تو مجھے ایسا معلوم ہوا کہ کمرے کے اندر سے قہقہوں کی آوازیں  
آ رہی ہیں۔

بھی یا نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ میں اپنے دوستوں سے کہتا ہوں کہ میں نے اس  
بیمانک خواب میں جو کچھ دیکھا وہ سچ ہے، اور حقیقت پر مبنی ہے، اور میرے  
اجاب کہتے ہیں کہ اس کی دنیا لغویت پر ہے۔  
سوال یہ ہے کہ کچا کون ہے؟

## ریاکاری

ترے عرصہ کہ ہر جائیں تالے ایزد باری  
بنے بیٹھے میں سب معبود اپنے اپنے حلقوں میں  
کد بے دینی بھی اک فیشن ہے مذہب بھی ریاکاری  
نانش کا ہے تقویٰ اور تصنع کی ہے بخواری  
مثال گریہ صوفی یہ نہتا بھی ہے مکاری  
ضروری جانکر روتا ہے بیامرگ مادر پر  
مگر سمجھا ہے اس کو بھی محرم کی غذا داری  
گوئیے نے اگر خلوت میں گائی بھی تو درباری  
مٹی جاتے ہیں باہم ماشت و معشوق الفت میں  
لے پھرتا ہے شوق خود نانی سر پہ شاعر کو  
مگر اسٹیج پر جس طرح کرتے ہوں اداکاری  
ابھی چلنا نہیں سیکھا ہے یہ فرزند ریاکاری  
کد بے سخن کرتا نہیں ہے کوئی غداری  
سجد اللہ مسلمان ہو گئے تعظیم کے خوگر  
اسی میں مافیت ہے کیجئے تعظیم ملا کی  
اگرچہ شہر پر روشن ہے ملا کی سیہ کاری  
اسی میں مصلحت ہے، مانے ہر حکم لپڈر کا  
اگرچہ کھل چکی ہے قوم پر لیڈر کی غداری  
غلط فہمی ہے دنیا کو مرے طرزِ تعلم سے

بیاں کرتا ہوں درنہ میں تو میکش کی ریاکاری

میکش الہ آبادی

# بھوک کی آدمیت

النفات احمد خاں بی اے علی آباد

آدمی اشرف المخلوقات ہے۔ رُوحِ آدم کل اسرار کائنات کا گنجینہ ہے جس نے رُوح کو بچان لیا، خدا کو بچان لیا۔ اس وقت آدمی کو اپنی زندگی کی ضروریات کے سلسلے میں جس عقیدے کی ضرورت تھی وہ نظریہ تخلیق نے نہایت خوبصورت انداز میں ہم پر بچایا، اس عقیدے کی یوں اور ضرورت پیش آئی، کہ اس اثرن المخلوقات کو اپنے روحانی سفر میں کچھ ایسے بھتے پہلو نظر آئے، جو روحانی تلمذ کے خلاف ہیں۔ لہذا ایک مکمل آئین کے تحت — مذہب نے — اپنی رہنمائی شروع کی۔

ایک عظیم اثرن ہرگز قوت کا اقرار کر لیا گیا، جو اب اعلیٰ ہے، خالق کو نہیں ہے، پروردگارِ عالم ہے، ہر چیز پر قادر ہے، اُس کے حکم کے بغیر ایک ذرہ بھی حرکت نہیں کر سکتا۔ اُس کی قدرت و عظمت کا مقابلہ دنیا بھر کی قوتیں مل کر بھی نہیں کر سکتیں۔ وہ سورج سے زیادہ وسیلہ القدر، شہنشاہوں سے زیادہ واجب التعلیم ہے۔

مذہب نے جہاں جبرِ انسانی پر نشانہ بردار عالم کا عقدہ دالیا وہی چند نفسانی ضروریات کی ترغیبی کمی کی۔ یتیم آدمیت کو ایک سرپرست کی ضرورت تھی، ایک عادل فرمانروا کی ضرورت تھی، وہ مذہب نے پوری کی، قبر کے پہلو پر پہورحم کی ضرورت تھی، لہذا خدا جبریم بھی ہے، کریم بھی، وہ رزاق ہے، رزق دیتا ہے، یتیموں کی فریاد منسا ہے، شرِ رنگ سے زیادہ قریب ہے۔

زمین، ہماری زمین، ہزاروں انقلابات کے کڑے دیکھ چکی ہے۔ اور یہ قانونِ قانونِ تغیر، آج بھی جاری ہے، جو کل تھا وہ آج نہیں ہے، جو آج ہے وہ کل نہ رہے گا۔

”دفترِ امر و زمین، فرداؤ و دوش کے نہ جانے کتنے صحیفے، حیات انسانی کے نہ جانے کتنے دیوان، زیرِ ترتیب و تنقید میں۔ ہزاروں غیرات، لاکھوں انقلابات ہو چکے ہیں۔ مگر آدمیت کی استہتا، آج بھی اتنی ہی شدید ہے جتنی کبھی تھی، بھوک کی آدمیت، گزشتہ شخصیت، آج بھی غیر آسودہ ہے، جو سوال کل تھا وہ آج بھی ہے، آدمیت کیا چاہتی ہے؟ آدمیت کا وعدہ اتنا قوی ہے کہ علوم و درعلوم، اُس کی استہتا کو ناکافی ہیں۔ مگر پھر بھی آدمیت، اپنی فذائی نوعیت سے ناواقف نہیں، اپنی استہتا کی اہمیت سے آگاہ ہے مسلسل جدوجہد جاری ہے۔ اور ہر قدم پر حرکت محسوس ہو رہی ہے۔

آدمیت کا جہد طفلی، طفلانہ حیرت و استعجاب میں صرف ہوا۔ یہ عظیم اثرن کارخانہ عالم، درجوں میں کتر کتر پی۔ اگر دینے والا کارخانہ عالم، جاذبِ نظر بنا رہا۔ قوتِ تخیل کی بہترین پیداوار، نظریہ تخلیق اسی عہدِ حیرت و استعجاب کا مہوون منت ہے۔

زمین کو نظامِ شمسی کا مرکز قرار دیا گیا اور آدمی خالق کو ”غبن“ کی مہوون مخلوق۔ خود نظامِ شمسی کا وجود آدم کے وجود کا مہوون منت ہے

ہو گیا کہ زمین نظام شمسی کا مرکز ہے، بلکہ آفتاب ہے، کوئین آدنی کے لئے خلق نہیں کی گئی ہے، بلکہ زندگی کا سلسلہ ارتقائی صورت سے قلابانِ فطرت کی ضرورت کے مطابق آدمی کی شکل میں اختتام پر پہنچا ہے۔

آدمی حیوان ہے، حیوان کی آخری صورت ہے، حیوانی دنیا سے الگ، کوئی مخصوص مخلوق نہیں، وہی سلسلہ ہے، آدمی لطیف ارتقائی آخری اولاد ہے۔

زندگی کے اس تصور نے کایا بلٹ کر دی۔ آدمی کی خود ساختہ علمیت "خدا داد" و "فادہ" گہرا اٹھا، مذہبی روایات کو شہید و ہکا بھکا، اور آدمی کی پرہیزی، آسمان سے زمین کی طرف رجوع ہونے لگی، جمعیت کے ہر طبقہ پر اس کا اثر پڑا، انقلاب و لغات کی چنگاریاں، تصورات سے اڑنے لگیں اور مہو کی آدمیت نے نئیدوں کی طرح زندگی کے اس پہلو پر منہ ڈالا، مگر ہم کو بے لونی سے ہر حقیقت کا اعتراف کرنا چاہیے، خواہ کسی سمت سے کیوں نہ آئے، یہ انتہائی غلط خیال ہے کہ حقیقت صرف اُس ماضی کا حق ہے جو مذہب کے دورِ کامیابی میں منکشف ہوئی، حقیقت کسی لباس سے کبھی عین آئے، اُس سے ہلکا رہو ناحق پرستی کی شان ہے، میں سمجھتا ہوں کہ محیض حقیقت کا ٹکڑا بھی نہیں ہوا، ہزاروں اسرارِ الہی اوجھل ہیں۔

"نظریہ ارتقاء" نے فخر حقیقت میں بیش بہا اوراق کا اضافہ کیا ہے جس سے مستقبل و حال کو مزور فائدہ اٹھانا چاہیے، مذہبی لوگ ہر وہ دنیا تصور جو انھیں حال میں شکل ماضی نظر نہیں آتا، الحاد قرار دیتے ہیں۔ لیکن یہ کونسی دیانت داری ہے کہ ہم ایک حقیقت کا محض اس عذر پر انکار کریں کہ وہ ہمارے بزرگوں کی نظر سے اوجھل تھی، میں نہیں کہتا کہ نظریہ ارتقاء، سلسلہ حقیقت کی آخری کڑی ہے، ہاں یہ کہوں گا کہ حقیقت کی ایک اہم کڑی ضروری ہے۔

نظریہ ارتقاء نے آدمی کی "بنیادی حیوانیت" کا صحیح اندازہ کیا، اور اُس کے دماغ کو رسوم سے بڑی حد تک آزاد کر دیا، جنھوں نے ایک نہ جانے کتنے دماغوں کو تار بکری کے غار میں جھونک دیا ہے، اور مذہب کے پردے میں نہ جانے کتنے شخصی و قومی ہر جو جس لئے کیا حیوانیت سے صرف اس وجہ سے انکار کیا جاسکتا ہے کہ وہ خوشنما اراکوں کے سلسلے میں

دعائیں منتہا ہے۔ خالوں سے خفا ہوتا ہے، اور جن نقصانات کی تلافی جمعیت انسانی نہ کر سکے اُن کا اجماعی میں دنیا ہے، خدا صابروں کے ساتھ ہے، جو لوگ نیک ہیں اُن پر رحمتیں نازل کرتا ہے وغیرہ۔

اس تصور سے تلخ جمعیت میں بے حد حساب مدد ملی، جس کے ہلکے اثرات مہربوں صدی میں کئی محسوس کے جاتے ہیں، مگر ان تصورات سے اُن لوگوں کو بہت فائدہ ہوا، جو اپنی صدی کے فارغ البال لوگوں میں پیدا ہوئے۔ کہونکہ جمعیت البانی زبانِ الہی کے مطابق ہے، جو جہاں ہے وہی اُس کا مقام ہے، اور وہی تقدیر ہے۔ اس جمعیت سے انحراف، خدا سے انحراف ہے، لہذا انحراف ہر جبر و تشدد کا نتیجہ، ہندوؤں میں ذات پات کا طوق اسی لوہے سے بنا گیا ہے۔ یہ پیچیدوں نے اکثر جمعیتِ حق سے انحراف کیا، مگر صرف اس عذر پر کہ وہ فرمانِ الہی کے مطابق نہیں ہے، اس روحانی تحریک کو حیوانیت سے اس قدر دوسرے ملن تھا کہ مادیت اور روحانیت میں ایک وسیع فوج پیدا کر دی۔ عیسائیت نے اس میں سب سے زیادہ غلو سے کام لیا، مگر شہنشاہ رہے، سامعے کی ہانڈی چوڑا پر پھونچتی ہے، چنانچہ پوپ اور قسریٰ روحانی "بانتھاپانی" زندگی کے دنگل میں ہزاروں مشکوک کا سبب بن گئی۔ اس بانتھاپانی میں قیصر نے پوپ کو چپت کیا۔ کیونکہ آدمی نے اپنے کو ادبیات سے زیادہ قریب پایا، وقتی طور پر اسلام نے وحدانیت کے بل بوتے پر اس وقت کا مقابلہ کیا مگر رفتہ رفتہ روحانیت اور مادیت کا تصادم روشن ہوتا گیا، اور روحانیت، مادیت کو اپنا سرخرو حریف تصور کرنے لگی۔

بالشبہ اسلام نے آدمیت کو وہ مراعات بخشیں جس میں دوسرے مذاہب نے دماغی بغل سے کام لیا تھا، مگر بہت جلد خود اسلامی اداروں کے سینے میں غلغلہ پیدا ہوا اور متعدد فرقوں نے پیغامِ رسالت کی مختلف تاویلیں کیں، جب اسلامی مصلحتوں پر زوال آیا اور پوپ نے قومیت کی آندہ دین پوپ اور قیصر و دولاں سے انحراف کیا، روحانیت بُری طرح زخمی ہوئی۔ قومیت کی تحریک نے آزادانہ تنقید و تحقیق کا سلسلہ شروع کیا۔ انقلابِ فرانسیسی نے ان شغلوں کو اور تیز کیا، سائنس اور فلسفہ نے دینیات کے فرائض ترک کر کے، پوری جدوجہد جاری کی۔ اس کشمکش میں ڈارون اور دیگر مفکرین پیدا ہوئے۔ یہ فعلی طور پر غلط ثابت

ظاہر ہوئی۔

ہے، جسے میریں صدی میں یوں کہتے ہیں کہ خدا خالق نہیں آدمی کے ذہن کی مخلوق ہے۔ مگر میں اس خیال سے متفق ہونے کی کوئی دلیل نہیں رکھتا، میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ نہ اکثر ممکن ہے نہ انکار۔

جہاں تک معاشی و معاشری پہلو حیات کا ہے مذہب بری طرح سے ذہنی افلاس میں مبتلا ہے۔ اس افلاس کے اسباب سے ابھی کے قبل پہلے یہ ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ اس وقت آدمیت کے کیا مطالبات ہیں، وہ کس قسم کی غذا چاہتی ہے؟ اس وقت زندگی کے ہر کھس پر آفتاب بخیرت کی شعاعیں پڑ رہی ہیں، جو چہرہ توہمات کا کچھ دیکر سامنے آئے گا وہ محسوس جائے گا۔ ضروری ہے کہ ہر پہلو کو بخوبی ٹولا جائے۔

فرد اور فرد کے ساتھ جماعت دونوں کا تجربہ کیا گیا ہے، اور ہر تصور آج دنیا سامعوس ہو رہا ہے، انیسویں صدی نے دو نہایت حقیقتیں پیدا کیں، جنہوں نے فرد کی نفسیات اور جماعت کے تجربے میں بہت گہرا گہلا کیا اقدام سے کام لیا۔ اور ایک حد تک مسائل حیات کی نوعیت بدل دی۔

میرا اشارہ ڈاکٹر فرڈ اور کارل مارکس کی طرف ہے، میں ان کے دلائل کی عداقت بھی کا نہیں، اہمیت کا ضرور قائل ہوں۔ طوائف کے خوف سے مختصر تذکرہ دونوں کا ضروری ہے۔

ڈاکٹر فرڈ نے، جسے بہترین کام کر "فرد" کی نفسیاتی زندگی قرار دیا، فرڈ نے اعلان کیا کہ شخص "شعور" سے نفس انسان کی تو ضمیمہ نہیں ہوتی، شعور کی پشت پر ایک نیم شعوری دماغ ہے، جہاں ہزاروں فعلوں اور خواہشوں کا تھلا مچ رہتا ہے، سیکڑوں تائیں، ہزاروں آرزوئیں ایک دوسرے سے برسرِ بیکار رہتی ہیں۔ جو بہت کم اپنے اصل رنگ میں شعور کی آنکھوں کے سامنے آتی ہیں، تہذیب و تمدن کی پابندیوں ان فطری خواہشوں پر برت "کابل لگا کر روکتی ہیں، ضمیر کی بیداری، تہذیب و تمدن کی دھڑکتی آن پر قابض ڈالتی ہے، اور ان کو ہلکا سمجھ کر تخت الشعور کے چھریں میں متعلیٰ کر دیتی ہے جہاں ایک دوسرے سے جوتی پیرا رہتی ہے، اور شعور کی بزم میں وہی خواہش بایا ہو سکتی ہے جو ضمیر کی بیداری اور اس کے پیر بزرگ اور تمدن کو دھوکا دینے میں کامیاب ہو جائے۔

ڈاکٹر فرڈ کے نزدیک فرد فقط تابعی ہے۔ تہذیب و تمدن سے باغی، تمدن اس کی فطری خواہشوں کی راہ میں ایک ٹکا کاٹ ہے، یہ خواہشیں

نظر سے ارتقاء نے زندگی کے ہر پہلو پر روشنی ڈالی جس کی بدولت بیسویں صدی ایک گھلگھاتی ہوئی صدی ہے، اکثر لوگ میں جہیں ہیں کہ ان تجربوں سے آدمی، دایات سے قریب تر ہو گیا۔ مگر میرا ذاتی خیال ہے کہ مادیت سے اتنا حسن ظن بطور رد عمل خود مذہب کی شدت سے پیدا ہوا، اور یہ مادہ پرستی، روحانیت کی پیداوار ہے، لوگ اسے قبول نہ کر سکیں گے، مگر مجھے ایسا ہی غلط آتا ہے۔ آج مادی کشش کی مایوسیوں روحانیت کے حق میں مفید ثابت ہو جائیں تو عجیب نہیں، مگر حقیقت یہ ہیں الا قوامی تنظیم کی بے ضابطگی کی شہادت ہے، قومیں بے نظام ہو رہی ہیں بے احساس نہیں، مذہبی جماعت نظم و درستی مگر بے اساس تھی، اور صرف ایک نفسیاتی کمزوری پر قائم تھی ایسی خوف، لہذا بے اساس بھی تھی، غیر مستقل بھی، آج اگر کوئی جماعت مذہبی روایات پر منظم ہونا چاہتی ہے تو اس کے اٹانے کے بغیر ایک منٹ بھی سانس نہیں لے سکتی۔

نظر سے ارتقاء نے بہت بڑا فائدہ تاریخی قدر و قیمت کو پرستیا ہے، جن سے عہد ماضی کی اکثر تنظیمیں پوری تو ضمیمہ سے اپنے سینے کے راز کھول دیتی ہیں، جو اصول عالم حیوانی میں کارفرما محسوس کیا گیا وہی جمیعت انسانی کا بھی راز ہے، یعنی فرد کی طرح اس کی بھی ایک عمر ہوتی ہے، بچپن، شباب اور پیری کے دور اس پر بھی آتے ہیں، اگرچہ فرد و جماعت کی موت میں ضرور فرق ہے، نظر سے ارتقاء کو احاطہ دے کوئی تعلق نہیں، ہاں تجربے نے یہ ضرور بتایا کہ مذہب آدمیت کے ارتقاء کی مسڑ میں ایک خاص منزل پر ظاہر ہوا جس نے اس وقت آدمیت کی اشتہا کو آسودہ کیا۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ ہر منزل کو پیادہ پار ہو کر پوری پوری تکمیل اور سفر کا پابند ہونا پڑے گا۔ ہر منزل کا ایک مقام ہے جہاں ہر چکر مسافر وہاں رہتا ہے ایک منزل قبل تھا، مذہب بھی جمیعت انسان کے اثرات سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔

مذہب کے اس حقے کا فیصلہ جو خدا کے وجود سے تعلق ہے ہنوز قائم ہے۔ ممکن ہے اس نظام عالم کی پشت پر ویسی ہی ہر گیر و ہر ساعت بیدار قوت ہو جس نے مذہب نے تصور کی ہے، مگر ہر قسم کی محکمہ اقرار اور اقرار پر اس کی تبلیغ محض روحانی، معصومیت ہے، ہذا کا اقرار بھی مسفر ارتقاء کی ایک منزل

ہر عہد کی ایک اسپرٹ ہے، اور یہی مخصوص اسپرٹ ذات مطلق کا مکس ہے، اس فلسفے سے حکومت وقت کی حقانیت تسلیم کر لی گئی، کارل مارکس نے اس متحرک خیال پر نظر دوڑائی، اداروں کے، روحانی، فزینوں کا اثر قبول کیا، اس سحر ہو کر گیا، وہ خود بھل کا شاگرد تھا مگر اس کی ذہنیت ہندوستان کے مذہبی عالم کی ذہنی جو صرف اس صداقت کا قائل ہو جائے، جو کاغذ کے پڑ سے پر خط و علی ثبت ہو، قدرت نے اُسے دل بھی دیا تھا، دماغ بھی، اُس نے بہت جلد اس نیر ولی فلسفے کو تار لیا کہ مادی کشش کے بعد مذہب جم پر یہ بعض خوبصورت نرم و نازک لباس ہے اور کچھ نہیں۔

اگر وہ مخصوص اسپرٹ ہر ادارہ قومی کو حرکت میں لاتی ہے تو خود اُس اسپرٹ کو متحرک کرنے والا کوئی عقدہ ہے، اس سوال نے بھل کی صوفیت کو ایک بھونک میں اڑا دیا۔ مارکس نے بھل کا اصول "امضاد" (Dialectics) ترک نہیں کیا۔ مگر اُس نے اُس کا مکس نہیں اٹھایا، رخ دکھایا، خیال کے باہر مادی کشش کو دکھایا اور خیال کو اُس کا عکس قرار دیا۔ بھل کی کشش امتداد، سماج میں طبقاتی جنگ و فساد کی پیداوار ہے جو اپنی حفاظت کے لئے "خیال" کی نقاب ڈال لیتی ہے، سماج کو اُس نے دو بڑے اقتصادی طبقوں میں تقسیم کیا، اول وہ کہ جن کے ہاتھ میں قومی پیداوار و ذرائع پیداوار ہیں جو اپنے اقتدار کو برقرار رکھنے کے لئے مذہبی استحکام بھی کرتے ہیں، مذہب، فلسفہ، اخلاقیات اور قانون سے حسب مدعا عدلیے ہیں۔ دوم وہ گروہ ہے جس کی روزمری صرف اُس کی محنت ہے، قوت و اقتدار سے محروم ہے، جب پیداوار، ذرائع پیداوار اور تقسیم پیداوار کے بدلے پر سماج و حکومت کا جائز تنگ ہو جاتا ہے، جھجکی پیدا ہو جاتی ہے، تغیرات و انقلابات رونما ہوتے ہیں، محروم طبقہ اپنے حقوق کے لئے جنگ کرتا ہے۔ ان طبقوں میں اُس وقت تک کشش رہے گی، جب تک جمیعت کی کلیم طبقوں کے فوق و عراب پر قائم رہے گی، آدیت اُس دن سکون پاے گی، جب سماج میں صرف ایک طبقہ رہ جائے گا وہ طبقہ آدیت کا طبقہ ہوگا جمیعت کی کلیم طبقوں کے مفاد پر نہیں آدیت کی فلاح پر ہوگی۔

کارل مارکس نے خصوصیت کے ساتھ نظام سرمایہ داری کا تجزیہ کیا، اور دکھایا کہ کس طرح یہ پیرزن فرما دے ہمدردی دکھا کر چالیں چل رہی ہے، نظام سرمایہ داری جمیعت میں عرف سرمایہ دار طبقے کے لئے ہے یا ان انجمنوں

بہ زور شور و بوجہ جاتی ہیں مگر فائز نہیں ہوتیں۔ تحت الشوری میں اتر کر فدر کی ایسی مجلسی ڈالتی ہیں جو اکثر صبح پرات کی عرصہ کی باعث فز کی شخصیت کو میل کر دیتی ہیں، نفس کی بنیاد رکھ دیتی ہے اور فرد اگر کامیاب رہیں تو غیر فزری رجحانات کے گرداب میں گھٹس جاتا ہے۔

ممکن ہے ڈاکٹر فزاد کا نظریہ غلط ثابت ہو، اور چنانچہ اس کا خاہش میں مرکزی خواہش کا لغت ہے اُس نے ضرورتوں سے کام لیا ہے تاہم ان خیالات کے ہادوں میں ایک خاص قسم کی جھاک ہے۔ جن فلیوں کو ہم "شیطان" مینے کہتے ہیں ان کی اہمیت اور طاقت خیر نتائج کی نزاکت و وجہ ہو جاتی ہے جس سے والدین اور استاد کی سرپرستی اور زیادہ توجہ کی محتاج ہے۔ یہ شیطان غیبی بھی دے ہیے فزری ہیں جیسے "روحانی جذبہ" اور یہ کہ فز کی نفسیاتی زندگی بنایت نازک ہے، جن پر ہر دم گہری توجہ کی ضرورت ہے، فز کی اصلاح دینا کی کو راہ عقیدت میں ان فلیوں کو قوت سے دبانے پر مکتب نہیں، بلکہ پورے پورے افکار کو متوجہ دینا چاہیے، اس سے یہ مطلب نہیں کہ انسان اخلاقی کی ہر قید سے آزاد ہو جائے، بلکہ ان فلیوں کو صحیح راہ دکھا کر فزائوں کو شخصیت کے لئے مفید بنانا چاہیے۔

مجھے اپنے ایک نہایت گہرے دوست کا تجربہ ہے جس کا ہر دور زندگی میری ہی آنکھوں نے دکھایا تھا جس کی بیا شخصیت نے میں غمناک شباب میں، روایات کے منبر پر اڑیاں لڑ کر ڈاکو کر جان دے دی۔ تڑپ تڑپ کر دم توڑ دیا، اور آج صبح آباؤ کا ہر فرد اُس جو ان کی موت پر کڑتا ہے، مگر خود اُس کے والد کے عقائد میں تزلزل نہیں آیا، اُن عقیدہ بھی کس قدر سفاک ہوتا ہو۔ کارل مارکس نے اپنی تحقیقات کا مرکز جماعت کو قرار دیا، اور جماعت و معاشرے کی ذمہ داری سے تجزیہ کیا، سماج کی دھکی رگ پکڑی، آج سرمایہ و محنت کی مومر کہ آریاں اُن کی نگاہ نے دکھائی تھیں، جب مارکس دور طالب علمی سے گزر رہا تھا، جمعی میں بھل کا سکہ دلوں پر بٹھا ہوا تھا، بھل کا فلسفہ جرمی کے جڑو کلی پر چھایا ہوا تھا، فلسفہ روحانی فلسفہ۔

بھل اپنے عہد کے غبار میں سے اس خصوصیت کی وجہ سے ممتاز ہے کہ اُس نے مادی کشش کی اہمیت کو برقرار رکھا، مگر بحیثیت ایک فرض ثانوی کے، بھل کے نزدیک عالم آدمیت ایک ذات مطلق کی تلاش میں مبتلا ہوا ہے اور مسئلہ امتداد سے بے ربط وہ ذات مطلق اپنے کو تدریجی ارتقا میں ظاہر کرتی جا رہی ہے۔

اس کی وہ بنیاد جو ان کی وراثت کے ایسا سے ہزاروں معصوموں کا بھتیجی ملی ہے، ان کی آنکھوں کے سامنے ہے۔ چین کے کہنے کی صدا، جاپان کی ٹوکا کی آواز ان کے کانوں میں آ رہی ہے۔ مگر ان سفالیوں پر اتنا استغاب کیوں ہے؟ کیا اقصیٰ خبر نہیں کہ "مغلو خودی" کے غلبے وہ شدید غلبے ہیں، کہ جب زخمی ہو جاتے ہیں، آدمی پوری درندگی سے مقابل ہو جاتا ہے، درندگی کے علاوہ اور توقع ہی کیا ہے؟ کیا سرمایہ داری خوشی سے اپنا گلا آپ گھونٹ لے؟ خود کشی وہ حماقت (جانگی) ہے جو صرف فرد سے سرزد ہو سکتی ہے، لیکن جماعت امید کے آخری لمحے تک ہنگامہ آرا رہیگی۔ یہ درندگی بالکل فطری ہے۔

یہ ہیں اس دقت سمجھ کی ادیت کے مطالبات۔ مذہب کا افلاس یہیں سے ظاہر ہو جاتا ہے، دو ہی طریق کار ممکن ہیں، مذہب یا تو غیر جانبدار رہے یا ان متضاد ارادوں میں سے ایک کا معاون بنے۔ حالات موجود ہیں اول طریق کار محض دھوکا ہے، غیر جانبداری ناممکن ہے، اور دوسرا تک حالات کی روشنی کام دیتی ہے، اغلب ہے کہ مذہب، استعمار کا مہم جو کا مذہب، سرمایہ دار قوتوں کا ساتھ دے گا۔ اگرچہ اس کا افلاس خود بہت ہی پرہیزگار ہے۔

اس افلاس کے کیا اسباب ہیں؟ مذہب ہسپن صدی میں ایک رحمت پسند ذہنی رجحان ہے، جو معاشی دقتوں سے گھبراہوا ہے، مذہب نے اپنے اوائل عمر میں آدمی کی صرف "روحانی" اصلاح کرنا چاہی، اور افراد کو جلیقت افزا کے دیکھا، محبت انسانی سے قدرے بے نیازی دکھاتے ہوئے معاشی دشمناری شکلات کو مل کرنے کے عوض ان سے گریز کیا، مثالی میرے دو چھوٹے بھائیوں میں ام کے پڑپڑوں پر چھگڑا ہوا گیا ہو، اب اگر میں یوں اسے مل کروں کہ یہ یہ باتیں دولوں میں، دونوں جب گھر ملے گا تو ایک کو رستی پر لٹکا دوں گا اور ایک کو آگ میں جلا دوں گا تو میں نے اس سسٹے کو حل کیا یا اس سے گریز کیا؟ اگر میں اپنی ہٹ دھرمی سے اسی کو حل "کہوں، بہترین حل "تو مجھے بھی یقین کر لینا چاہیے کہ جب میرے دولوں میں بھائیوں کو اس بہترین سے بہتر کوئی حل مل جائے گا تو دولوں نہایت حقارت و تنفر سے میرے "ابھائی" کو جو بزم بزرگی میں سے صادر کیا تھا ٹھکرا دیں گے کیا

کے لئے جو سرمایہ داری کی ہر آہنگی میں سازشیں کر رہی ہیں، محروم طبقہ، عوام کا طبقہ، اس سے قوت چھین لینے کا حق رکھتا ہے کیونکہ کل دولت، کل پیداوار کی محنت کا ثمر ہے۔ سرمایہ داری کو اس سے تنفید ہونے کا حق نہیں۔

کارل مارکس کے اس مطالبے نے روحانی اور مادی دنیا میں کھلی ڈال دی۔ انجمن روحانیان، اور محفل سرمایہ داران دونوں سر پر گئیں۔ خاندان نے فرد کو ان تند و تیز غلبوں سے آگاہ کیا جو سیکڑوں معصوم افراد کو کچل چکے ہیں، مارکس نے محروم طبقے کو سیاسی قزاقوں سے متنبہ کیا جو ادیت و تہذیب و مدنیت کے نام پر اس کا خون چوس رہے ہیں۔ چنانچہ آج سرمایہ و محنت برہنہ ہو چکے ہیں، زمین سرمایہ پسند زلازلوں کے جھٹکے آ رہے ہیں، مغرب بنیاد و نہند ہو جانے کو ہے۔ مارکس کا اثر سیاست حاضر پر بے حد وسیع پڑا ہے، رفت و رفت بدل گئی، محاذ بدل گئے۔

بافصوص ہر دس نے اس کی عملی ترجمانی کر کے سرمایہ دار قوتوں کو چنچا دیا ہے۔ قزاقوں کو خبر ہو گئی ہے، کہ ادیت کا گھر آسانی سے نہیں لوٹا جاسکتا، گھروالے جاگ پڑے ہیں، بالشوہزم، جو مارکس کی فتووں کا پلہ شرہ ہے، اسے آسانی سے گھر لٹنے نہ دے گا۔

اب سرمایہ داری کے پاس صرف دو ذرائع ہیں، ایشید ہو جائے یا شہید کر دے۔

اول تو ممکن نہیں، دوم ہی ممکن ہے، لہذا سرمایہ دار قوتیں قوت و "غیشنازم" کے پردے میں (مے پردہ یہ کیسی ہنسی اتیں) "فاشیزم" کا علم بند کر رہی ہیں، جھنجھلا جھنجھلا کر علم بلند کر رہی ہیں، سرمایہ داری آج زندگی کے رن میں ہاپ رہی ہے، حکومتیں، سرمایہ دار حکومتیں آخری سانس لے رہی ہیں، آخری اٹھری سانس لے رہی ہیں۔ آخری زور آزمائی کے لئے فاشیزم کا دودھ پی بی کر سرمایہ داری غم ٹھونک رہی ہے، اس کے ساتھ فرزند سولہی اور شہر، دودھ کا حق، مادا کر رہے ہیں۔ یہ جھنجھلائی ہوئی فاشیزم گیس اور بم میں پھولی ہوئی فاشیزم، یورپ کے دغل میں کور رہی ہے، اور ایک عالمگیر جنگ کا خواب دیکھ رہی ہے۔ مگر شاید سہارک حافظے سے اڑ گیا ہے۔

محکم و غلام مالک، اٹلی، جرمنی اور جاپان (اور برطانیہ) پرٹالکی و درندگی کے الزام رکھ رہے ہیں، کیونکہ ان کے سامنے اٹلی نے صلیب لٹا دیا،

حمایت نہیں کی۔ بہت کچھ اس وجہ سے کہ مادیات کو حیوانیت کی بنیاد  
فرض کرتے ہوئے اُسے ہمیشہ روحانیت کے منافی سمجھا۔

مگر کیا کبھی میں اتنی بہت ہے کہ مادیات سے بے نیاز ہو جائے؟  
کیا آدمی محض روحانیت سے آدمیت کو اُسودہ کر سکتا ہے؟ کیا یہ  
”حیوان ہندب“ یعنی — آدمی — صرف اخلاقی فتوؤں سے صلح  
کار بن سکتا ہے؟ اور کیا انفرادی تکمیل روحانی کی بجائے شعاری، عبادت  
سے بے نیازی کو اخلاقاً مستحسن قرار دے سکتی ہے؟ نہیں، ہرگز نہیں۔  
لاکھ بار نہیں اور اگر اس پر بھی کوئی سر ہرا کہے ”ہاں“ تو میں اتنا  
کہوں گا (بقول جوش صاحب) ”آغا و رے مادے!“

مذہب نے اس خوف سے کہ آدمی مادیات میں پھنس نہ جائے  
جس کی لازمی شکل روحانیت سے انحراف ہوگی، اُسے اور مادیات سے  
قرب نہ کر دیا، آدمی جس پر کبھی عقلی شباب نہیں آتا۔ جو ہمیشہ تجرّی ہیبت  
ہے۔ ادا و نوای کا اٹا ہی اثر قبول کرتا ہے۔ نتیجہ کیا ہوا، وہ مادیات  
پر اور زیادہ فریفتہ ہو گیا، اور اپنی عقیدت کا اظہار عالمگیر شکوک میں  
کر رہا ہے، کیا یہ کہنا غلط ہے کہ جو دن حضرت مسیحؑ کی پیدائش کا تھا،  
وہی سال ۱۹۱۲ء تھا؟

ماہرین نفسیات نے اس طوق کار کا ذہنی افلاس پوری طرح  
سے روشن کر دیا، بیویں صدی کا پیغمبر روحانی پیغمبر نہ ہوگا، اُس کا  
صحیفہ بھی کی آدمیت کے لئے ہوگا، معاشی مل کا صحیفہ ہوگا، معاشری  
استحکام کا صحیفہ ہوگا، آسمان نہیں زمین کا صحیفہ ہوگا، نفسیات کی کمزوری  
کا نہیں فتوؤں کا صحیفہ ہوگا، وہ پیغمبر حال مستقبل کا پیغمبر ہوگا، آدمیت  
کا پیغمبر ہوگا، اُس کی اُمت میں نہ تاجدار ہوں گے نہ گدا، نہ امیر ہوں  
گے نہ غریب، اُس کے سایہ عاطفت میں آدمیت کو فروغ ہوگا، اُمت  
پہلی بار کھلی ہوا میں مسائل سے لے گی، آسمان بڑھا ہوا چوکا، اب زمین  
جوان ہوگی۔ زمین پر شباب آئے گا، اور آدمی آزاد ہوگا اُتار۔

## ضروری نوٹ

خطوات بت کرتے وقت خبر خریداری کا حال ضرور دیکھتے رہنا اور غلط

کہتے ہیں اس مسئلہ کے بیچ میں خواجہ حسن نظامی یا مولانا عبدالاحد دریا بادی  
صاحبان۔

مذہب نے معاشی مشکلات کا کیا حل پیش کیا ہے؟ میرے داغ  
ناتقص میں کچھ نہیں آتا۔ اخلاقیات کے کچھ اصول ضرور دینے کے لئے کہہ دوں  
اسنے میہم (غالباً متفاد) جو بیک وقت ”قاصی“ اور ”چر“ دونوں کے ہم  
آہنگ ہوں یا جس کو مجھی قوت ہو، مذہب نے اس حیوان کو جسے اثرات  
الطوفات کہتے ہیں، ایسے مضرب و معدوں پر فرشتہ بنانا چاہا جو ایسی  
کے لحوں میں اکثر و بیشتر شیطان پر زیادہ اعتبار رکھتا ہے، پولیس کی لاشی  
اور دوزخ کی آگ سے بنی پید کرنے کی کوشش کی گئی، اور پٹی بھی کی،  
جمہیت وقت کی صحت۔ ظاہر ہے غنیم دہوی طرح پر فخر کیا جاسکتا ہے یا  
اپنی قوت سے یا خود اُس کی کمزوری سے، اس ٹیم، مدین کے پیدائشی ہائی  
کو بھی انہیں حربوں سے فخر کرنے کی کوشش کی گئی، پولیس کی لاشی نے فخر  
کی قوت کا مظاہرہ کیا، دوزخ کی آگ نے غنیم کو اُس کی کمزوری کا احسا  
دلایا۔

آج بیویں صدی میں فردوس کا چ اپنے حقوق اور اپنے مقاصد  
سے بہت کچھ واقف ہیں لہذا اس دور میں دوزخ کی آگ کا حربہ رنگ  
آلود ہو گیا ہے، اب صرف پولیس کی لاشی سے کام لیا جاسکتا ہے لیکن  
اگر ایک طرف پولیس کی لاشی ہے تو دوسری طرف دہقان کا ڈنڈا،  
اب مذہب لاشی کا ساتھ دے گا یا ڈنڈے کا؟ دوسرے الفاظ میں  
یہ کہنے کا مذہب اب سراپہ دار استبداد کی حمایت کرے گا یا جمہوریت  
کا کولس و غماز ہوگا۔ یہی ادارے نے اب تک اس دنیا سے بہت  
کم کچھ کیا انہار ریکلے (عمی نہیں) ”خدا“ سے اتنا شغف بڑھا رہا کہ  
تنبہ سے کہے ”اُداس چہرے پر نظری نہ لگئی، اور اگر کبھی مادی مزوریات  
نے مجبور کیا تو ماضی کے منہ پر شند افشانی کر کے افراد سے مطلب برآری  
کر لی۔ مذہب نے معاشیات مادیات میں کبھی انقلاب پیدا کرنے کی کوشش  
ہی نہیں کی، کبھی بنیاد کو چھوا ہی نہیں۔ تقدیر سے رشوت لے کر ہر عہد کے  
فرماؤ کی تائید کی۔

چند افراد ضروریات کے اہم فریضوں کی طرف رجوع کرتے رہے۔  
مگر مذہب نے ہمیشہ ادارے کے بعد ختم ثبوت کبھی انقلابی جدوجہد کی

# قلم اور قدم

مترجمہ اسرائیل احمد خاں

ہیوگو کے کہانی میں ہمیشہ کو سنجی رہی کہ جان پر: اعلان حق اور قیام عدل مقدم ترین ذلیفہ انسانی ہے: تمام اسباق تعلیم کا یہی عنوان ملی ہے: ————— وکٹر ہیوگو لاریب کو اک نادر و درویش کا شخصیت گز رہا ہے: وہ ایک وقت حکیم شاہ خواہ اور مجاہد واقع ہوا تھا: وہ ہالفاؤ خورشید "عورت کے دل کی زمی اور غازی کے جگر کی گری" سے بناتا تھا: ————— برگ گل اود پارہ خار کا نادرالوجہ داستانہ: تو جس قزح اودہ ————— مویج خون کی آہنی بی ہم آغوشی!! ————— ایسے اٹن خود اپنے خالق کے لئے سو جب کبھی ہوتے ہیں ابع خدام درگشاں آہستہ ہست!

وکٹر ہیوگو کی سوانح عمری کے اس شخص میں ایک چیز قابل غور ہے: آپ دیکھیں گے کہ ایک مجاہد، اک جماعت غوث، کا ذکر کرتا ہے: اداقت یہ ہے کہ جماعت غوث، اقوام کی دھڑکی میں اک مستقل تاریخی منبر ہے، ہر عہد کے دقت نزع اور اک دوسرے دور کے کمزوریات کے ماحول میں اک ناگزیر دہشت و وحشت، آغا ز پندیر باب تاریخ کے سلق محسوس کی جاتی ہے: یہ محسوس تو

"قلم اور قدم" ————— یا اقوال و افعال ————— وکٹر فرانسس دہلی نویس اور انقلاب نگار وکٹر ہیوگو کی سبک زندگی، خفیات اور مختصات کا تجزیہ ہے، جو ۱۸۰۲ء اور ۱۸۸۵ء کے دوران میں شائع ہوا۔ اس تعریف میں وکٹر ہیوگو نے فلسفہ سیاسی و معاشرتی کے متعلق اپنے مسلک و مشرب کو بے نقاب کیا ہے۔ یہ کتاب بے غش و جلد دل پرکشش ہے: پہلی جلد "۱۸۰۲ء کے واقعات کو بیان کرتی ہے۔ دوسری، اس کے سنہین جلا وطنی کے واقعات و واردات کی ترجمان ہے، اور تیسری اور چوتھی جلد "۱۸۷۰ء کے حادثات و سوانح پر حاوی ہے: آخر الذکر سال اس انقلاب فکر اور شباب پر حاوی ہے: "کا۔ سنہ غروب" ہے: وکٹر ہیوگو کا تاریخی فیصلہ یہ ہے کہ وکٹر ہیوگو کی زندگی انیسویں صدی کے نیمہ اول میں سر زمین فرانس کی ساری تحریکات کی آئینہ دار واقع ہوئی ہے! ————— قلم و قدم ————— میں یہ حیثیت مجموعی انقلاب پرکاش سے خدائی پراک صدا کے امتحان ثبت جویہ کی گئی ہے: یہ ہیوگو کا سرگ آرا کا نام ہے: وہ نیپولین کو کوئی چار دم کا اوتار سمجھتا ہے: اس کے دادا نے نیپولین کے خلاف سازش کرنے کی بادشاہی میں شرکت کا غیر مقدم کیا تھا: اپنے جبر مجرم کی وصیت

ہیں چاہئے : اپنے معاملے کو دوسروں کا مقدمہ بنا دینا ان کے لیے  
بائے کا کرب ہوتا ہے : اس کے لیے اپنے مخالفین کی زیادہ سے زیادہ  
تخلیف و ترسب ان کا شغل و مشغل ہوا کرتا ہے ۔ خوف و تکلیف  
کی یہ محسوس دعت ان کی پشائیں پر جماعت خوف کا سپاہ  
کتبہ کندہ کر دیتی ہے :

ہم ہندوستانی انقلاب منظر کے اس قابل مرت پرینٹ  
اس نے یہی شاخ کر رہے ہیں کہ وطن کا نوجوان ملتہر جہد عام کا  
جماعت خوف کو بچائے : اور ان کی مرگ لڑائیوں کو انقلاب  
زندہ باد کے نعروں میں دفن کر دے !

مردانہ کار سے کن دستے بدو عالم زن !

## (۱) حق و باطل :

نیل آدم کا سارا دفتر فصاحت و بلاغت — تمامی اقوام عالم  
کا، اور صحیح قرون تاریخ میں فراہم ہونے والا ! — سب کا لب لباب  
یہ ہے کہ وہ اک تفہیم مقدمہ ہے : نزاع حق و باطل کی ! — لیکن حق  
و باطل کی اس آویزش کی تاریخی رفتار یہ رہی ہے کہ اس کی حرارت و جذبت  
مسئلہ کم ہوتی رہی ہے : — یہی کمی امتیاس رہی ہے انسانی ترقی کی  
جس شام غم میں یہ معرکہ ختم ہو جائے گا : اُنہی کے ابد کی جس سعادت کو بشری  
تہذیب کا آفتاب عالم تاب طلوع ہوگا ! (تجاء الحق و ذہق الباطل !  
ان الباطل کان سرخو قاتا : — قرآن مجید) وہ چیز جو ہوتی چاہیے تھی  
ہم آہنگ ہو جائے گی اُس شے سے جو ہے ! (۱)

آئینہ بود دست و نایب : زبیاں خواہد رفت

و آنچه بایست و نبودت : ہماں خواہد بود — (اقبال)

حوادث و سوانح کا سلسلہ ختم ہو جائے گا : — اور گویا واقعات

و انقلابات یہی کے لبور کا ایک قفل عمل میں آئے گا !!

(محور حیرت ہوں کہ دنیا کیسے کیا جائیگی)

بال زمین پر انسان کی معنوی تاریخ کا منت بالآخر ہو جائے گا : اور سرشار

مرث ناستانی کی خوف زدگی ہو ا کرتی ہے جس میں عوام غفلت  
سبھی کو پیش منبٹا ہوتے ہیں : لیکن جرک خاص جماعت اس  
داعیہ کو اپنا موت بنا لیتی ہے : اور اُس کی بنا پر اک سیاسی  
پارٹی میں ڈھل جاتی ہے : وہ مخلصانہ خوف سے زیادہ اس کا راڈ  
خود غرضی کا شکار ہو ا کرتی ہے ! ہم اُسے خوف سے یکسر غالی  
نہیں سمجھ سکتے — اور سچ تو یہ ہے کہ ایسا ڈونا دہی  
ہوا کرتا ہے کہ دل کی گنجی گنجی کے ساتھ دماغ کی کوئی تاریکی ہر  
نہو : اول دماغ کی طرح میکانی شریک مفاد ہو ا کرتے ہیں  
جس طرح کاندھ و بکریک وقت گرفتار ہوتے ہیں کسی حرکت : —

تاہم غالب اور فیصلہ کن عنصر ان کی نسبت میں لوٹ ہو ا کرتی ہے : بکر  
نکری مژدوری : لیکن یہ بات مزور ہے کہ وہ بکاک کے سامنے خوفناک  
مستقبل کی اک لڑان و ترسان و غیبی ہی بن کر آتے ہیں : اس لیے کوہم  
جاہل ہوتے ہیں : اور ان کے کلاں میں چم چم جہیں پھونک سکتے ہیں !  
اس طرح خوف چونکہ اُن کا سارا مستندہ اُمس ہے : ہر تپے : اس لیے مشیت  
خوف کا تسبیہ اگر اُن کا طرز اے استیاد زقرار دیا جائے تو جیسا نہیں  
تاہم بارے کہ اُن کے خوف کا تعین اس قدر خود اُن سے نہیں ہوتا  
جس قدر کہ اُن کے سامعین سے ہوتا ہے : جماعت خوف : واصل  
دوسروں کے خوف کی حامل یا محرک ہو ا کرتی ہے ! وہ انہی ڈرتی نہیں  
متنی کہ ڈراتی ہے ! ہر حال : خوف و اندیشہ چونکہ اُس کا نگہی کام ہوتا  
ہے اس لیے اُسے ایسی دھمت سے تعنت اور مصروف ہونا چاہیے :

بعد یہ العبد ہندوستان میں اس ختم کی دُ بانیان کہ اسلام  
خطرے میں : تہذیب اسلامی خطرے میں : نظام ملکی خطرے میں :  
اسی ذہنیت کی ذوائیں ہیں : حقیقتہً ان میں سے کوئی چیز بھی خطرے  
میں نہیں ہے — اور اگر ہے تو محرم کے ان کرانے کے پینے  
دلوں کو مطلقاً اُس کا غم نہیں ! — جو چیز خطرے میں ہے وہ  
مرد جہلی و معاشی نظام میں اُن کی سنت خدایوں اور کاجریوں کا  
منصب ہے ! (۱) اس اقرب سے ہر براہ راست میں اس گروہ کو  
سجاعت خوف : کہہ سکتے ہیں : تاہم یہ بند لگان فرض اپنے ہی قلعے کی  
دافنت کے لیے اپنی جانیں بکھروا دینا چاہتیں ہیں : خطرے میں اُن

میں کچھ بھی نہیں ہے! — حق اور قانون اک غیر منقسم آدیزش کے حریف ہیں!

حق کے پرچم کے سائے میں انسانی جان، امن، اور آزادی کی حرمت ہے، انبی کے پہلو پہلو بہرہ چیز استادہ لفظ آتی ہے جو ناقابل انفساخ ہے، ناقابل رجوع ہے، اور ناقابل تلافی! — قانون کے جھنڈے کے نیچے تختہ دار کھڑا ہے، تیغ جلاد لٹکی ہوئی ہے، اور عصائے شاہی علم ہے! — تمام سلب و فجب، اور جہد جادہ و قتال یہیں خاتم پذیر ہیں! نیز ہر ترک کا طوق لعنت، ناقابل طلاق شادی کے افلاک و کواکب سے لے کر مہر و شہر کی شہر آشوبوں تک! حق کی رخصت مطلق کے تحت عام خلقت کی آزاد آمد و رفت، خرید و فروخت، مبادلہ و تجارت انجام پاتی ہے، قانون اپنی سرحدوں کی تفصیلیں کھینچ کر رہا ہے، اور اپنے گھر گھر قانون کی حرمت کا میں قائم کرتا ہے! حق کا فرمان ہے، لازمی و فطرتی، جس کی فیس میں بچوں کی معصوم نمبریں فرق نہیں کی جاتیں! قانون، جاہل و جاہلداروں کو سب دوسرے پر بٹھاتا ہے! حق، حریت و اعتدال کا روح پرور پیام دیتا ہے، قانون سرکاری مذہب قائم کرتا ہے! عام و غیر مشروط حق و عدل کا علیحدہ، محدود و مخصوص حقوق شہریت قانون کی ایجاد دہندہ ہیں! :

بہیں تفاوت رہ، اور کجاست تاجہ کجا!

اصلاح و تعلیمیت اجتماعیہ کے سارے جہاد باللسان کا معلوم اُس گوشے میں واقع ہے جو قانون کی "راج ہٹ" کے مقابلے میں حق کی استقامت کا میدان ہے! میری زندگی کا مقبول رہا ہے حق جو انسان کو بناتا ہے، مکمل قانون، جسے انسان بناتا ہے! میرا ایمان ہے کہ حریت، حق کا رفیع ترین منہجر ہے، نیز یہ کہ جمہوریت کے کلمات تعلیمات — حریت، مساوات، اخوت — آخری اتمام شریعت سیاسی کی نشارت ہیں! اس لئے کہ حریت حق ہے، مساوات، اک حقیقت ہے، اور اخوت اک فرض عین! یہ انسان کامل کے جملہ عمر ہنر ووری ہیں، ہم صحن حیات کے اندر کھینچنے والے بھولی مہمانی ہیں، ماوراء انسانیت کی آغوش کے اندر یکساں پستانوں سے دو دو پہنے والے قوم یکے ہیں! کنارہ کے اندر یکساں عرض و طول کے بستر پر لیٹنے والے ہم چشم ہیں!

کامرود، مادہ فطرت کی آغوش میں پروان چڑھنا شروع ہوگا!

اس دورِ لازمی میں نہ نزاعات ہوں گے نہ خصومات، اور ان کے فصل و قضا کے لئے نہ قوانین ہوں گے نہ آئین! — صرف نیک ناموس فطرت ہوگا، جو قانون کی طرح وضع نہ کیا جائے گا، الہام ربانی کی حیثیت سے صرف منکشف کیا جائے گا! ان ظلم و عدل کے تعلیم تمام و فائز جنگ کو شروع کر دے گا! اور اک ہر گروہ کے ذریعے قوم آدم کے لئے اک بھائی بھائی "ذہن" کا انتخاب عمل میں آئے گا!

(ہر فرد کو جہاں فضا فرد است!)

اس شاندار و مقدس عہد میں کوئی سر نہ بگاڑ نہ بگاڑیں گے! — صرف اربابِ کائنات ہوں گے! — خالقین، کہہ سکیں! — "جنونِ عمل" کا تمدن ختم ہو جائے گا، اور وجدان خیال کا عمران اُس کا وارث بنے گا! اس دور کی دنیا کے "حوادثِ عظیمہ" صرف ادبیات اور فنون لطیفہ کے اختراعات فائدہ یوں گے!

"ملکوں کی "سردھارت" معدوم ہو جائیں گے! "الانقلابِ فرائض" کا مخلوق فرائض شہداء کی موت مرے گا، اور ہر زمانہ از غیب جان دیگر موت کے اعتبار سے کجائی کے تحت پھر اٹھیں گے، اور اُس کی یہ نشانی تانیہ "اک آلی یورپ حریت کے پیکرِ تعلیم میں نمایاں ہوگی! انقلابِ فرائض تاریخِ عالم میں بشریت کی دستِ ناخیز "کا عنوان علمی اختیار کرے گا! فرائض نے یہ سبے پایاں عجز و بے بسی ہی لئے نہیں کی ہے، اُس نے نامائیک زامیدوں کو اپنی بوش کے اندر اک "پیامِ قوم" سنایا ہے، اپنے "حریت، مساوات، اخوت، عدالت" والے لہرِ خلیل میں وہ مٹی بشریت کا تھرا بنانا ہے!

حق اور قانون وہ دو قوتیں ہیں، جن کی ہر ایک سارے نملہ امن کے تولد و مسادت کی ولدیت واقع ہوئی ہے، لیکن جن کی ان بن جملہ مصائبِ تاریخی کا شہرِ نبیث رہی ہے! حق، ملکی صداقت ہے، اور قانون ارضی حقیقتہ نفس الامری! "حق، لبرٹی ہے،

اور قانون، مہوسائی! "گو یا اس جنگ و عالم میں دو ایوانِ عدل ہیں: ایک، اہل و اقحاق، کا، اور ایک، اربابِ خیالات، کا! — ان دو مطلبِ شہائی اور قلبِ جنونی کے درمیان بیشتر فرائض بشری کی ضمیر

اور دفنائے آزادی میں ہماری رو میں طبع و جنس کی طرح غیر مشرب رہا ہیں اسے

(ماہر تو کتاب حسن از لیم

فرزند ایم آدم و حوا را)

(۲)

## ایام طفولیت

اس انیسویں صدی کے آغاز میں اک بچہ تھا، جو اک پُرشوت قصر میں رہتا تھا، قصر کو راک خانہ کے آغوش میں تھا، لیکن یہ علم زار و عشرت و معیشت شہر چرس کے اک ایسے حصے میں اپنی جائے وقوع رکھتا تھا، جہاں عام سائینس آبادی کی آمد و سب سے کم نظر آتی تھی، یہاں اس کا رہنا سہنا اپنی ماں، دو بہنیں، اور اک بزرگ سن و فاضل پادری کی معیت و محبت میں تھا۔ آخر الذکر بزرگ اس بچے کا معلم و اماں بھی تھا، اس نے اپنے اس شاگرد کو سب سے لکھی پڑھائی، تہذیبی و تاریخی، لیکن تاریخ مطلق کچھ نہیں۔ چرس کا یہ موقع تھا، اور فرانس کی سلطنت اولیٰ کا زمانہ، کہ یہ تینوں بچے کھینچتے اور کام کرتے تھے، آسمان پر بادلوں کا تاشا دیکھتے تھے، اور درختوں پر چڑیوں کے گیت سنتے تھے، اپنی ان کے شرم کی تاثیر شہریر کے تحت اس بچے کی یہ پڑتی تھی۔ اگرچہ کسی کا اس میں کوئی تصور نہ تھا۔

کہ انہی تعلیم و تربیت میں اسے اک پادری سے سائق پڑا، اس سے زیادہ ہونک بات کیا جاسکتی ہے کہ محو کا اک نظام تعمیر کیا جائے، اور اس کی - حواریات میں مسجد ہائے عیدت - نذر کے جائیں، اک پادری کی مسند درس کی تحقیق ایسی ہی واقع ہوئی ہے، وہ خرافات کی تعمیر دیتا ہے، اپنی اپنی ذاتی سے باطل معصوم ہوتا ہے، اور کیرس اس ماجرے کی اک نظیر کرے

اں کس کہ نذاند و بداند کہ بداند

در جہل مرکب ابد الدہر مہربان

ایسا استاد اپنے بچت شاکر کے لیے جو کچھ دماغ سوڑی کرتا ہے

وہ بجائے ذہن تعمیر کے ذہنی تخریب کا کام انجام دیا کرتی ہے، ہر اس ریشہ

دماغی کو جسے فطرت نے درست بنایا، وہ اک نطفہ علمی میں تبدیل کر دیتا ہے

وہ اک معصوم کی روح کو سہم کر دیتا ہے، وہ اک کس کے سینے کو کیر اترن نصیب

سے پاٹ دیتا ہے، وہ سپید سحر کی ناصیہ جمال پر غروب آفتاب کی نقاب ڈال دیتا ہے!

(دروئے کہ شود ادا السار نفقت

من دامن تو بگیرم اندر معات

وہ قدیم و عزت گزین مکان اور باغ، جو اپنے سابق ترماضی

میں اک خانقاہ رہا تھا، اور بعد ازاں اس بچے کی ہمد گاہ بنا تھا، آج اس

کی شام پیری میں بھی اس کے لئے اک حرم محترم کی حیثیت رکھتا ہے۔

اگرچہ اس کا مقدس موقع اب اک جدید الہیہ مرکز سے ناپاک

کیا جا رہا ہے، اس کا شام یہاں اک کیف انگیز فنا کو سونگتا ہے، جہاں

شعبائے آفتاب اور شگوبائے گلپ کے درمیان اس کا فنی روح

کبھی کھلتا تھا، اس مکان کے دیوان خاؤں یا اس خانقاہ کے حجرہ میں

کیسا دیدنی سکوت گوشہ گیر واقع ہوا تھا، عرف طویل و تفنن کے ساتھ

اس قصر خوش کی ہر سکوت ٹوٹا کرتی تھی، یہ وہ وقت ہے ہوا کرتے تھے کہ

اک شیر در کمر اور پشرباغ در کلاہ سر جزل نزل احوال فرمایا کرتا تھا،

یہ جزل اس بچے کا باپ تھا، جو سرگرم کار ہے شہستان خلوت کی

طرت اپنی عنان توجہ موڑا کرتا تھا، اس کا بچہ اب سن تیز کر

پہونچ رہا تھا۔

یہ بچہ نہیں تھا!

ایک رات کا ذکر ہے۔ تملسنہ فرانس کے کسی بڑے شہن

کی تقریب تھی!۔۔۔ سارا پیرس چراغاں سے مطلع الاوار بنا ہوا تھا،

میری ماں ایسی خانہ باغ میں محو حرام تھی، میرے باپ کے تین ڈوآر دھکا

جنگ کے جھگڑے میں، میں بھی ایسی جماعت کا اک مقتدی تھا!۔۔۔ ناگلا

درختوں کی تاریکی میں اک طویل القامت پیکر پر میری نظر پڑی!۔۔۔

یہ ان ایام کا نامور باغی، و کثر تو لہبازی تھا، میرا دادا!

یہ اس مہبت باردقت میں بھی قیام آزادی کی راہ میں جبار و

تہاد و شہرین کے نوکلور استبداد کے انہدام کے لئے مصروف سازش تھا!

مستقبل قریب ہی میں وہ تھمہ وار پسر افرازا ہوا۔

(چول حرف حق بلند شود و تاری شود)

مجھے اپنے جذبات و لہجہ کے کلمات معلیل یاد ہیں!۔۔۔ اگر وہ اپنے

شاہوں کو برابر تاج پوش رکھتا، تو دوست الکبریٰ کے عنوان جلی سے وہ بھی مستزاج عالم نہ بن سکتا۔

پھر وہ غلبت مجسم ہری طرف متوجہ ہوا، اس کی وصیت اس سکوت شب میں ان الفاظ کی جھکاریں گونجی تیسرے نیچے آزاد کی کہ ہر شے پر مقدم رکھیو۔ یہ چند کلمات میری مدت الحمر کے تمام خطبات تعمیر و بناب ہو کر رہ گئے۔

(۳)

## جلاوطنی سے قبل

جب تک کہ ششہ میں میں نے تمام امدادے حریت و سبک سبقت کی کامرانی کا مل اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لی، اس وقت تک اپنے احمق قلب میں مجھے اس حقیقت تکلیف کا احساس نہ ہوا کہ میرا تعلق صفت فائزین سے نہیں ہے، بلکہ میں زمرہ مغلوبین میں داخل ہوں؛ فرانسیسی جمہوریہ اک نقش بھان کی طرح پڑی ہوئی تھی؛ تاہم جب میں نے اس میکانیزم کو گھور کر دیکھا تو سمجھ گیا کہ یہ وہی مشوقہ تجزیہ تھی، یہ بات اک راز فاش تھی کہ اس جاں بحق تسلیم ہو جانے والی مملکت دہلی کی روح پاک سے کسی عقیدت کا اظہار میری جلاوطنی اور خانانہ بربادی کا بیخود پیش خیمہ ہوگا، لیکن اس کے قطعاً علی الرغم میں نے اس مرحوم کے سنگ مرزا دہلی کو اپنی مسجد کا بنایا ہے۔

مرزا عبد الستار جاناں کوتا جاں دیدن دام

ہوا داری کو لیش راجہ جان خوشیشتن دام

۵۰ ارچون ششہ کی فیصلہ کن تاریخ کو ایوان عدل سے میں نے

اپنا نفرت احتجاج بند کیا؛ اور اس دن کے بعد سے میں نے حریت اور جمہوریہ کی راہ میں مٹیاں دھکے لڑے۔ کیے بعد دیگرے مسلسل غیر متزلزل عزم باجزم کے ساتھ!! اور پھر سرور کبر ششہ کے روز مسودہ کو مجھے ان سب کا دشمن کا وہ صلیب مل گیا جو اک نعمت منقرہ تھی! — جلاوطنی! میں سال کی!!

(نہ لہجہ حسن طلب لئے تم اپنا ڈھن ہے تمام ملے جفا شکوہ بیدار نہیں)

یہ وہ سرگزشت ہے جس کا عنوان نادر رکھا گیا؛ وکٹر میوگو کا سیاہی ارتداد!

(دادری دارم، ولے یارب کرا داد کرتے ہیں)

جلاوطنی سے قبل جو حیرت خیز ماہ رسالہ گزرسے، اس کی ایک ایک صبح دھام میں مانتی کا ہونک سا غفرتی مجھ پر چھپا رہا؛ ان ایام میں کوئی مسکند ایسا نہ تھا، جس پر مناظرانہ مسرکہ آرائی ہوئی! — اختلافات تھے جن کا رقص سکونت، مادر دین، بھلاؤ جلاوطنی! — جن حیات، بھلاؤ قانون تیز، مباحث تفریق مابین کلیسا و ایوان حکومت، اختلاف یورپ و آسٹریا، ممالک بر اعظم، بھلاؤ گڑگ خفاست، — ان مصلحتات و مذاکرات کو آزادانہ تحفہ ششہ ذکر و فکر بنا گیا، اور بعض کو ان کے منفی سرانجام کو بھی پہنچا گیا!

اب تمام یادگار ذکر واد کار میں میں نے شرکت بھی کی اور اپنا فرض

بھی ادا کیا؛ نیز اس اداسے وطن کی قرار واقعی داد بھی دی! — لیکن وطن!

(میں حق کی دادوں کس سے

سُن چکا ہوں ف! — مسطورا)

مجھے یاد ہے کہ جب جہد سابق کے لالہ بھگوان، متوقی والدین، پر غلط

فرمایا کرتے تھے تو بعض بے وحدت ایسے بھی ہوتے تھے جو بے ادب، بے لطف

کھد کہہ دیا کرتے تھے کہ بچوں کے بھی کچھ حقوق ہیں!

(میں بھی منہ میں زبان رکھتے ہیں!

کاش بوجھ کو ماجرا کس ہے!)

میں وہ دیدنی لمحے بھی نہیں بھولوں، جبکہ لوگوں کو یہ کہہ کر میں

عاقبت حیرت کر دیا کرتا تھا کہ "مشرقی شری سے اس کی ان کی ملکیت و فلاح کو ختم

کر دینا دائرہ امکان سے خارج نہیں!"

، اور جلاوطنی ششہ کی آتشیں تاریخ بھی کہ میں نے لکھی ہونا پارٹ کی

سازش خلافت انقلاب کو بائناک قابل نشاء طاعت بنایا؛ اور اس کے

اس مسطورہ مشورہ کو بے نقاب کر دیا کہ وہ پرزیدہ فحش کے پردہ ریاکاری کے

پچھے قبا سے طوکت زیب تن کر رہا ہے!

اک دوسرے عظیم النظریہ کے روز روشن میں ایوان عدل کے صند

(نمبر) سے میں نے چند ایسے کلمات کا غلط کیا جو اس سے پہلے فرنگت کی کھٹا

میں نے اپنی یادداشتوں میں لکھا ہے کہ میں نے ان لوگوں کو یہ کہہ کر میں عاقبت حیرت کر دیا کرتا تھا کہ "مشرقی شری سے اس کی ان کی ملکیت و فلاح کو ختم کر دینا دائرہ امکان سے خارج نہیں!"

کے شہداء تباہستان کی ذرا گنیمتوں سے تحلیل ہو رہے ہیں! اگر بیدار واد نظام کی برقراریاں اور ملعون بادشاہوں کے ابر غلط حقیقت چھپتے رہے ہیں، اگر سیاہ بخت بشریت کی قسمت کی محنت کو گنبد گرداں برابر پلٹا رہا ہے؛ تو کچھ شک نہیں کہ ہم مطلع عالم پر اک گلابی صبح کے طلوع کا جشن منانے والے ہیں! (خوش باش! کہ حاجت ناکو خدا بد!)

آؤ اپنے سارے دشمنان جہانستان کو اک پیام امن و اخوت دیں! صلح و سلام کی صراطِ امیشتی پر کسی خار و جنس کا گزرنہ نہ چاہیے؛ قسم خدا کی مادر گیتی کی آغوشِ شریں میں بہت کچھ انسانی خون بہ چکا ہے؛ خاندان آدم کب سمجھا کہ ہم سب ایک ہی کشتی میں سوار ہیں! ہماری سیاسی جہان بندی اک حصارِ آہنی ہوگی، لیکن ہماری بشری برادری و دشمن گلاب کی اک صفتِ جمیل بنے گی!

(ذاتفاق گس شہد می شود سپید!)

خدا چہ لذتِ شیریں در اتفاقِ ہنسدا؟

(۴)

## اصولِ جمہوریت

قوم کا اقتدار اعلیٰ، ہمہ گیر ووٹ اور آزادیِ پرس ہے۔ تینوں چیزیں تین مختلف ناموں کے سہرا ہیں۔ ایک، سہرا بنی تھا حقیقت! ہیں! یہ عناصر رنگ و باری پیکارِ زندگی کی گائے اسکے اجزائے ترکیبی ہیں! اپنی چیز مقصود بالذات ہے، دوسری اس کا غرض کار ہے، اور تیسری اس پر ایزہ اٹھار! اس طرح یہ سب ایک دوسرے سے غیر منسلک واقعہ ہوتی ہیں! عامۃ الناس کی سیادت، قوم کی حیات پر ورور روح رواں ہے، رائے عامہ فرمانِ حکومت ہے، پرس سارِ ہدایت ہے! لیکن تصویر پر ایک ہی چہرہ حقیقت کے متنِ مضار ہے، بعد خط و عالی کی حامل صورت کی پیشانی پر "جمہوریت" کا لفظ لکھا ہوا ہے! یہ تین جوہر اک نظام جمہوری میں جس طرح اپنے ملنا ہر رکھتے ہیں، وہ اک و سبب مآثر ہے، قوم کا غلبہ سیاسی آزادی پیدا کرتا ہے، عام ووٹ صلح سادات کو ہمارا کرتا ہے، اور پرس اخوت کا مہرِ خطابت بنتا ہے!

دوئے زمین کے سب گویہ ہیں یہ عنبرِ ثلث! اپنی چوری قوت اور

میں نہ گونجتے تھے! — ریاست ہائے متحدہ یورپ!

معاہدات و محاکمات کے کھلتے تہری کی چھ پر بارش کی گئی! مگر میں اس ذیلِ قاتل و قتل کو کیا دروغِ رسالت بنانے والا تھا! — کیا ان گدھوں نے جارج واشنگٹن کو کسی جیب کھرا نہیں کیا تھا؟

(دور بینانِ اذل! کوری سپہم بد میں!)

ہم در بجا نگذا، آئینہ در آئینہ بینند!

عیدِ باریز کی فہرست کے باقیاتِ سیاحت کے حامل یہ اہمق اپنی ان باطل کو شیوں میں کیا چرچ کوئی کامیاب شرارت کرتے تھے! مطلق نہیں! شیطان کے یہ قربِ خوردگان اپنے ہی کو اپنی وسیع کاریوں کا نشانہ بنا رہے تھے، بلاشبہ وہ جھوٹ بولتے تھے، لیکن ان کی بظاہرِ علاقہ کی دلیل ثابت ہو رہی تھی!

(درد و شو و سببِ خیرِ گر خدا خواہد!)

وہ زبان سے مجسمِ سخن پروری بہتے ہوئے تھے، لیکن ان کی خلقِ پری کی جہاں آسوی کی جی رہی تھی، ان بشمارِ قوانین و ضوابط کے اغفال و سہل میں جو محض اللہ کے لئے جہانستان بنے ہوئے تھے!

(ما عزمین قن شد نقشِ گیس تر!)

دارند اہل فقر و دستِ آرد جوع!

وہ مجلسِ مملکت نہ تھے: خدائی فوجداروں کا اک غولِ نئے! پھر اس گردہ لالِ عقل کے حضور طرین بھی ماضی! اندوہ تھے جو بدترین خدائے واقع ہوئے تھے!

آؤ! لذت بجا شیطان کا لالہ لڑھیں، اور ان کے ذکرِ شست کو کوثر کریں! — شرب و دجور کو رجحانات دو کہ وہ تاریکی کی ذریات پر آخری پردہ ڈال دے! (الابدالِ لقوم الظالمون! — قرآن)

کیا پراد ہے ہماری ساری عجزِ نریوں، خوفِ نشانیوں، جگر کا دیوں اور جلا و نشانیوں کی، اگر انھما مال و حمل بشریت کے لئے ایسا شرِ شرین بنا؟ (سفید جبکہ کنا سے پہ آٹھا غالب!)

خدا سے کیا ستم و جور نا خدا کہئے!)

اگر شل انسانی سچ ہیں دوسے کی دہریہ سے اردی بہشت و خرد وادیِ مشکوٰۃ پر دشرِ گری کی طرٹ رواں ہے! اگر وہ حقہ زبستان

اس عظیم انیسویں صدی کی جدوجہد کسی ایک قوم کی تحریک نہ رہا کہ جانی چاہئے، وہ تمام اقوام عالم کا اک ہمگیر جہاد عام ہے۔ اس ملبوس انسانیت میں فراتس میر کا رواں واقع ہوا ہے، اور باقی اقوام اس کے پیامِ قرس پر اٹھ کر اس کے نقشِ قدم پر آرہی ہیں، ہم عبدقدوس خیر باد کہہ کر عبدجدید میں داخل ہو رہے ہیں، اور ہمارے حکام عالی مقام اور ہمارے قوانین و الاحکام کی کوئی کاوش ساعتِ وقت کی سونپوں کو اٹھ چلنے پر مجبور نہیں کر سکتی، قائلہ بشریت، سو بخ

گزر گیا ہے وہ کوئل و بار حراں سے!

فرانس اور سارے یورپ میں اس وقت ایک جماعت موجود ہے جو جبریلی امید کی ہیں، الملبس ہراس کی مہم واقع ہوئی ہے! یہ لوگ کسی سر زمین میں خیر راہ نہیں بن سکے، ابھی عناد و پرغاش کی اس بغض میں جو سوال اک غیر متعمد تسلسل سے پوچھا جا رہا ہے وہ یہ ہے۔۔۔ کون مزہ ہے؟ جس نازک دوسرے ہم گزر رہے ہیں۔ اگرچہ یہ دور اپنی ساری نزاکت کے باوجود و سبجز خیر کے کسی اور انجام کا پیش خیمہ بننے لگا۔۔۔ بشریہ موجودہ خونخاک اخلاقی انارکی اور سبکی خطرہ اخلاط پر دشت زدہ و فریادگاہ ہے! اچھا تو کون باقی کار ہے ان مظالم و جرائم میں، ہمارے براعظم یورپ میں جماعتِ خوف کا جواب ہے: فرانس، ہمارے فرانس میں اسی کا جواب ہے، پیرس، ہمارے پیرس میں جس چیز کی طرف انگلی اٹھائی جاتی ہے وہ ہے پیرس، لیکن ساری اقوام عالم کے علی الرغم جو چیز بانی و مبنی ہے وہ ہے: روح انسان!

تو دل و دلیں فطرتِ انسان نے زنجیریں تمام:

دورری جنت میں روتی چیخ آدم کب ٹٹک!

ہاں لاریب کہ یہ روح انسان ابھی ہے جس نے اقوام عالم کو اپنی معلومِ مہبت و حبشیت بخشی ہے، ابھی آفرینش سے لے کر اس وقت تک، بے پایاں بحث و مذاکرہ اور نامتناہی رد و قدح کے دشوار گزار خارزار سے عبور و مرور کرتے ہوئے، اس روحِ انسان نے برابر اپنی کوشش و کاوش کی ہے کہ اس عقدہ لایحل کو حل کرے جو ازل سے اس کے خالق نے اس کی راہ کا سنگ راہ بنایا ہے! یہ روح انسان ابھی ہے جو عہد بہد تاریخ کے تمامی انقلابات کا بارِ عظیم کی باکش بنی ہے! اس کے مظاہر

کثرت میں پائے جائیں گے، وہاں جمہوریت بھی صورتِ نظر آئے گی۔۔۔ پھر جاچو اس پر نوکیت ہی کا فطری کیوں نہ متغوش ہو!۔۔۔ اسی طرح جہاں ان مقاصد مسلسل سے خیانت کی جاتی ہے، ان کی راہ میں مزاحمت پیش کی جاتی ہے، یا ان کی ٹکڑی ٹکڑی و زبان بندی کی جاتی ہے، تو حقیقی قربانِ قربانی وہاں نوکیت ہی کی ہے!۔۔۔ اگرچہ جمہوریت کے تئیں سے اس کی اک نظر ضربِ نانش کی جاتی ہو!

آخر: ہر صورتِ حالات میں ہم وہ ہونا کہ منہ پر سبست دیکھتے ہیں، جب کہ اک حکومت کو خداس کے، امن، دعا دیتے ہیں، ابھی ماجرائے شگفت ہے جسے دیکھ کر بڑے بڑے راسخ اہلِ باطن قلوب، انقلاب سے بددل ہو جاتے ہیں! انقلاب عبارت میں نا پید الکنار، شتر مہیا و تحریکات سے جو سبجز ظلمات سے عظیم ترین و عین ترین حقائق کے جو اہر نکالتی ہیں، اور غلہ زین انسانوں کو سطحِ بالائی کے منظر عام پر آتی ہیں۔

(ہر کے ازلینِ خردش، یا درمن و زور دین من زجبت لہر ابن! ستر من از نا زدن دور نیست) ایک کس را جم آں نظر نیست! جب ہم دیکھتے ہیں کہ انقلاب کی جدول میں کیسے حیل انسان اصولی معرضِ ظہور میں آتے ہیں تو ہم اس کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ لیکن جب ہمیں یہ نظر آتا ہے کہ اس ہنگامے میں کیسے کیسے ناشدنی انسان اپنی سینہ زوری سے صعبِ اول میں آجاتے ہیں تو بادل ناخوشہ ہمیں انقلابات کو حادثات کا نام دینا پڑتا ہے! (کصب من السماء فیہ ظلمات و سر عد و قرا۔۔۔ قرآن مجلی)

ہیں حقیقت کبھی خاموش نہ کرنی چاہئے کہ جمہوریت کے مضرہ بالا اعضاء نے رئیسہ اک جسم واحد کی صورت میں اپنی زندگی بسر کرتے ہیں! یہ قیول باہر خواجہ تاجش واقع ہوئے ہیں: وہ قیام و انہدام و دلاں میں ساتھ ساتھ رہتے ہیں، وہ هجوم و دفاع ہر دو حالتوں میں دفعتاً جنگ نظر آتے ہیں! مثلاً اگر پیرس کی آدائی خطرے سے دوچار ہوتی ہے تو رائے عامہ اٹھتی ہے اور اس کی پشت پناہی کرتی ہے! اور اگر جنوبی شہریت کو دھکی دیا جاتی ہے تو پیرس اٹھیں اپنے سایہٴ محافظت میں لے لیتا ہے، ان دونوں میں سے کسی کے خلاف اگر کوئی اقدام کیا جائے گا تو اس میں قوم کے اقتدارِ اعلیٰ کے خلاف اک فئادری تصور ہوگی!



نظر ڈالنا اور اپنے ہی لئے قوت باہوت بہم پہنچانا، یہ خواب دیکھنے کیلئے کمزور جان  
کو خیر و نیکر کیا ہے، اور پھر اس منصوبے کے لئے فارغ ہو جانے کا اس خواب کی کلی  
تعبیر کو نیکر حاصل ہو، مطلق اکثر کے مفاد کے سلسلے میں جو محرم جہیز حق ہو جانا، لیکن  
اپنے ذاتی غنا و کثرت کا وہ شہرہ کے معاملے میں کیسے کہ نفس کش راہب بن جانا اور  
صحرائے بے بسط کو گڑھ باد میں سانس لینا اور رو جائے یا پاں ہو جانا، اک عمیق فیلہ  
و غضب کو اک عمیق ترمانیت و سکینت سے نکودینا! —

رہا ندی مرا از شہر سحرچی

جو سمیودی پیایے جام سے را!  
چنانچہ جلا وطنی کے اس وحشت زا رہیں ہی میں اکثر اسے سے کہا کرتا تھا کہ  
اگر تسلط یافتہ موجودہ ملکیت و دور استبداد کے  
خلاف اک کامیاب جوانی انقلاب جو ریٹ نمودار میں لائے  
اور بونا پارٹ اپنی جان لے کر کھائے اور میرے کھڑا خواہ  
پر اگر دنگ دے تو دانشگر مجھے یہ نعرہ میرزا بانی بند کرنا  
چاہیئے کوچ  
قدم نما و فرود آ کر خانہ خانہ ترست!

ہاں! یہ

کہیں کیا دل کی وسعت اپنی ہم، اندر ہی وسعت  
اگر ذرا آسمان ہوں جسے اک غالب سویدہ پہنا

ہاں لاریب کہ اک مقبور و مضطرب و جلا وطن اک عاشق فطرت محبت  
عالم بن جاتا ہے، وہ کھلاب کے بھولوں پر انکسین سیکتا ہے، چڑیوں کے  
گھونسلوں کے آستیاں امن کے نظارے سے آسودگی و دل پاتا ہے، بتیلوں  
کی پرواز رنگ سے اک استہزا ز روح حاصل کرتا ہے، وہ وحش و طیور کی  
مختل فطرت سے غلام کا پیدار لیتا ہے، اور عبودہ زار عالم کے پیچھے اک  
دیدنی ہر و لاؤ ازش کو مٹھنا پاتا ہے، اس جلال و مقبناں حقیقت پر اس کے  
سینہ عرفان میں اک غیر متزلزل ایمان با الغیب پیدا ہو جاتا ہے، ایتان  
کے گچھ اس کی حیدہ خوتنگا ہیں ہوتے ہیں، اس کے سالی عمر میں اک مستقل  
ماہ ازوی سیشت رہا کرتا ہے، وہ گھاس کے ایک فرش زمر دین لیا ہوا  
اک برگ درخت پر معرفت گردگار کاک و درق و فخر تلاوت کیا کرتا ہے،  
ایک ایک شاخ شاخ میں وہ گدیا ایک تنہی سی بہری بہری یا سبت سمیودی ہو جاتا

جو تم سے باہمی گفتگو کو شان کرنے کی اعادت سے لیں گے، اور پھر تھارے وہ  
انفاذ نقل کریں گے، جن سے تھارے ہونٹ کبھی سن نہیں ہوئے، ہاں جلا  
وطنی میں کسی کسی دوست یا عزیز کو کوئی خط نہ لکھنا، ہر مکتوب کے مکتوب ایہ یہ  
سرکاری گیرین وغیرہ بن جاتے ہیں، اُن ذاتہ سے شریف سے پوشیدہ رہنا جو  
جلا وطنی میں تئیں دلسرد خط لکھا کرتے ہیں، ایسی بزرگ پیر میں تھاری جریں  
کاٹ رہے ہیں!

تم انکو مڈامی کی طرح الگ تنگ کر دے گئے ہو، لیکن ہر لحظہ لوگ  
تھارے گئے کا ہار بنے ہوئے ہیں، ایک پراسرار مہجی آتا ہے اور مھرا نہ سرگوشی  
کرتا ہے، کہو تو بونا پارٹ کو قتل کروں؟! — یہ بونا پارٹ ہی، بونا پارٹ  
کے قتل کی پیشکش کر رہا ہے!  
ہر طلوع صبح اک نیا فتنہ لاتا ہے، اور ہر غروب آفتاب اک نئے فتنہ  
پر پردہ ڈالتا ہے!

صرف ایک ہی عالم کی پستانیاں جلا وطن پر کھلی ہوئی ہوتی ہیں! —  
عمی و فعیاد ذکر و فکر کی دنیا!

بہاں کم از کم وہ بحر علم کا ہر نشین ضرور ہوتا ہے — جو اسے  
وسیع العرف، عمیق الفکر، اور خواہیں مکتبت بنانے کے لئے کافی ہے، وہ ابدی  
تصادم، امواج طوفان کا سوا حل سے، اور اُن کی سرکوبی و پسپائی ان سوا حل  
پشتہاے سنگ خار سے، گویا پوشین ہوتی ہیں، باطل کو شہ استبداد کی،  
اعلان و اعلائے کلمہ حق پر، غلبہ و کذب کا طغیان و ظلم مبد و فعل در آتش  
ہوتا ہے، کف در دہاں در دے شور کو اس رعب انداز شہر اندر ہی سے  
کچھو کچھ حاصل نہیں ہوتا، اس حال خارا کی اس سے شکست و فرسودہ ہو جاتا ہے؟  
نہیں، بلکہ اس کی اور شکست و شو ہو جاتی ہے، اور آفتاب غالب کی  
نہجی میں اور برقاب ہو جاتا ہے!

جلا وطنی کا ایک فیضان نہایت عظیم ہوتا ہے — اس حالت میں  
ایک انسان فکر، تخیل اور شدائد و بحیات سے تہا نشینے کے لئے مجبور دیا  
جاتا ہے، یکہ و تہا ہونا اور پھر بھی اس عالم جو میں یہ محسوس کرنا کہ میں ساری  
بشریت کے ساتھ من تو شدم تو من شدمی کے مقام میں ہوں، ہمشہریدہ ہونا  
اور اس کے علی الرغم ملکات انسانیت کا ہمشہری بن جانا، سارے مراکز  
مدن سے خارج البلد ہو جانا، اور اس کے باوجود اپنے بازوئے بہت پر

اس لئے کہ پیرس ان سٹون روشنی ہے! ع  
مبادی میں جہاد یا رب علم ازاد و پریشانی!

## (۴) جلا وطنی کے بعد

میری زندگی کے یہ ابواب تھامے۔ "قبل جلا وطنی، دوران جلا وطنی، مابعد جلا وطنی۔" اس قدر میری کارفرمائی نہیں تھی کہ قدر کے پانچ تھامے کی کارستانی ہے! اسی نے میری حیات ارضی کی توجید کو اس تشفیٹ بالا کر دیا، اس میں تبدیل کر دیا، اس میں اُس نے میری روح کے ارتقاء کے "مراتب" رکھ دئے۔ خام، بدھ، پستہ، شدم، سوختم۔ کو پورا پورا دھونڈا رکھا!

ہر سترہ شام کو جب میں طویل سالوں کے بعد میرا دوبارہ ملنے اپنے وطن، اوف سے ہوا تو میں نے اس زمین کے آسمان کو اور بھی زیادہ تار مار دیا۔ آواز آدو یا جس کی تیز و تلبیر کے لئے میں نے غصوں کی کمر سے "شعلہ فریاد" کی اک پیٹے سے بھی بڑھ کر "برق خافت" کی ضرورت ہے! آہ! وطن مقدس کو خیر باد کہنا کون کہتا ہے کہ شاق نہیں! لیکن اس حالت ناشستی میں اس کی طرف غرضت کرنا بڑھ چلا تھا! شاق تر ہے! واہند کہ اک فراموشی تازیت جلا وطنی کا غیر مقدم کرے گا، بقابلہ اس کے کہ وہ اس کو کو پریشانی کی اڑھی کے نیچے اس طرح پالے اور گھائل پائے! وہ سرزمین وطن میں اس عالم میں لوٹے کو میٹھن اور اسٹر اسبرگ کے گھنٹے جگر اس کے پیرے مجروح سے کاٹ لئے گئے ہوں۔

دخواہم زمانے کو اس نوع و سس!

بیفتہ بزیرو جوان "پرہش!"

ندن زارہ فرانس پر یہ باطل و صوبہ برابرہ کی اک پورشی تھی! لیکن اسی مصیبت کی جلعوں اک دوسری بدتر افتا دیکھی تھی! — میرا منشا "الیک،

دیکھتا ہے! وہ چڑوں کو ان کے چھپوں سے ایسا بچانے لگتا ہے جیسے کہ ہر اپنے دوسرے آستانہ کی شناخت ان کے بوجھ سے کر لیتے ہیں! وہ نادار بچوں کو ہر ہند پاس مل بھر کی کنا رر گیار میں حقیقت دیکھتا ہے! اور خود بھی، باں ریش و فٹ، اور فطرت کی آغوش میں چل جانا چاہتا ہے!

یہ ہے وہ خطرناک ان ان جس کے شرف و فتنے کو پا بڑھ کر کرنے کے لئے حکومتیں اور سلطنتیں اپنی طاقت خدا داد کا سارا زور صرف کر دیتی ہیں! رحمت باب جعفر علیا علیہ السلام کو کورہ، ذرا تیزی جہا جرن انقلاب کو کورہ دولت مدار فرانس کے حوالے کی پیشکش فرماتی ہیں! اور مجرہ میں ان کے کی ان دو کین کا جوں — سخت انگلستان و فرانس — کے درمیان — من تر حاجی گوید، قوم حاجی گوید، والہ ماجا پیش آتا ہے! ع

دار و زر کا برقعہ پر در در اقا نشان! گھر پر حساب دوستان در دل کی داد و سبند علما نمبر میں نہ آئی! برطانیہ کے شاہ پرست پرست نے تو اس پر مدائے احسن و مر جا بلند کی، لیکن قلعہ انگلستان — لندن — کی بجائے اس شرن کی کی رد اوار نہ ہوئی! اس علم ان شہر کے آسمان کے گداز نیلے پر احتجاج کی بند بندہ گرج شنائی دی، اور اس جوڑہ ناشستی حرکت پر ہر ہو کر رہ گئی! بلوکیت، بلوس، پشرفت، — یہ ہے انگریزی قوم کی سیرت! الغرض اس نیک سرشت اور غیور قوم کو جلال آگیا! اور عالی جناب پا کون اور مخلص فرست لونا پارٹ کے درمیان اس سے زیادہ دیا یا تحالف کا سبب ملے میں نہ آیا کہ جلا وطنوں کا بس باہمی اخراج ہو گیا!

اپنی فطرت و جلا وطنی کی لبست سال طویل شب و دگر میں "قریریں" ایک لمحے کے لئے میری آنکھوں سے اوجھل ہوا، جب کہ فرانس، بلکہ سارا یورپ، گبن میں آگیا، پیرس کا مطلع روشن بدستور میرے شنائی نثار سے کے سامنے آیا! سہ

گو میں رہا رہیں سہمائے روزگار!

لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا!

ان کی وجہ یہ ہے کہ پیرس ملک مستقبل کی سرحد ہے! — غیر معلوم عالم نو کا شہر آستانہ! پیرس کل کے روز روشن کی شب آکٹین ہے! — سترہ لے نوہ کو جانے والے جتنے من فرہیں ان کی نزول کا ہوا دل پیرس ہے!

لہ پردہ یا پردہ سیسے پردہ، جس طرح دوسرے "مقدس" — اصل محمد شہید ابراہیم خود انقلابی، "آقا کرانی" کا ہے، جس کے دوسرے معرے میں "پردوں" کے بجائے دوس جہاد دسیا، جہنم و دن اور جہنم سکاب، بیت کا خاص تہمان خط!

دو تین آدموں کے جتنے میں داخل ہیں، پوپ اور سینٹ سوم، پوپ پائس بیچ، اسکندر ششم، ارنسٹ ششم، آرتور، ہسپانیاس، ایڈینبر، گلائڈس، اور ایلکس؛ لوگوں کو نیکم دینا ان پر حکومت کرنے کا دوسرا نام ہے؛ پسند درس، ایوان حکومت کی ہم اقتدار ہے؛ اس اک دفتری نمبر کے اجراء کے معنی اک دفتری مقرر کے قیام کے ہیں؛ اس قسم حکومت کا سنگ بنیا ڈھانا ہوتا ہے، اور قلعہ آخون استبداد و شصیت!

دوم کے پنجہ قبر میں ٹوٹے بیٹے ہی آچکا ہے، اور جس اُس کی گنت کی دوسری ڈوٹیں آئے والا ہے؛ ہر اک موت و حیات کے معرکے کے مقابل بن رہے ہیں؛ ہمارے خلاف صف آرا ہے وہ قرن الشیطان والی قوت جس کا سرشبہ چاہ ماضی ہے؛ تاریکی کی یہ ڈریات ہیں، غفرت و کثرت، عصیت، فوجی بارک، دینی خانقاہ، جن کی اخوات طریقت ہیں بزدلی، دیدہ و دلیری، بیجا، خوفزدگی، شک گزیدگی!

ہمارا تہنہ حلیف اس معرکے آما تہا ہے میں علم و نور ہے؛ یہی وجہ ہے کہ کف ہاری ہوگی، ہمارا حربہ جنگ روشنی ہے، روشنی، ذخیرہ حلی کے آہن کو تشکیل کو ڈالے گی؛ لیکن حقیقی صالح آزادوی، ذمہ دار، اک کی "پازب" ہے پائے ساتھ لاتی ہے آزادادی سے بڑھ کر کوئی چہرہ گلین و نازک نہیں؛ دارستہ مزاج حریث کے دوش پر سہی بڑے بڑے بار واقع ہوئے ہیں؛ وہ انسانی جسم کے اعضاء و جوارح سے جتنے بند کاٹتی ہے انہی ہی قیدی انسانی ضمیر پر عاید کر دیتی ہے؛ ہم محرومیوں کی حق تلفیوں کو ختم کر کے حقوق حاصل کرتے ہیں، لیکن دوسرے ہی قدم پر ہمارے یہ حقوق ہماری "ذمہ داریاں" بن جاتے ہیں؛ غ

خود بخود آزاد و لودی، خود گرفتار آدمی!

پس ہم کو بڑے احتساب بنش کی ضرورت ہے؛ ہم ماضی کے عمل میں، مستقبل کے امین؛ اس شہادت میں اب وہ وقت آگیا ہے کہ ہم شہر بہار غوغا کو اک خوش عنان فرس مراعات میں تبدیل کر دیں؛ ان کی تہذیب کی شاہ گام و رفتار سی ہی ہوتی چاہیے؛ ترقی کے نئی نئی ہیں اک خاموش انقلاب کی سبک دوشی؛

پس اسے و اصناف قانون اور اسے شہر بان ریاست؛ آڈاک سینڈ بے کینہ پیدا کریں؛ آڈاسارے زحموں کو مندل کریں؛ ہر تاش و دلو

فرانس پر برطانیات کا اک طوفان؛ انیسویں صدی کے مطلع الا لوار پر قرون تار یکا کی رجعت بہت سی؛ شہنشاہ فرانس کی مغفوری کے بعد پاپائے نو؛ کی سب سے قدیم؛ برکن والی گردن ڈن کے بعد دوم والی گلوگری؛ بشپ شری قنالی کے بعد شب و بچہ کا جنس نظر؛ اس لئے کہ مدن کے مہتاب کی تبدیل کو دوا نہ میاں سمجھا سکتی ہیں؛ ایک فوجی حملہ، دوسرے استبداد و بی کا اک ٹھہرہ؛ اول الذکر مادہ فرانس کے لئے اک خطرہ ہے، آخر الذکر مولو شقیل کا گلا گھونٹ دینے کی اک دھمکی ہے!!

دوسریں میں جو اک جذب قوم کی فیتی ترین متاع ہیں؛ اُس کا وطنی حصار ارضی، اور اُس کا اندرونی حرم غیر واحد؛ و عسکری پہلی چیزیں مداخلت کرتا ہے، اور غلبہ پارسی دوسری کی بے اجترائی کرتا ہے؛ لیکن ان کا ردو بار میں عسکری، مارشل لا کی فرمانبرداری کرتا ہے، اور پارسی اپنے بے روح کلمات دینی کی؛ اس طرح آخر کار دو ہی سمتیں رہ جاتی ہیں، جن کی گردن رسا دار پر حرم واقع ہوتا ہے؛ ایک قید قتل، دوسرا جبر باطل، (استکبار آفی الاسر جن و مسکوا السبی)؛ (القرآن) متعارف ایوان و مذاہب میں کوئی ایسا نہیں جس کا حرم، روح انسانی کے لئے اک تحمیل بن گیا ہو؛ فرانس آج ہی گردش میں گرفتار ہے؛ ایک شخص کہہ سکتا ہے کہ ہمارے زمانے کی تعلیم و تعلیق کے دوسرے میں دوسند ہائے درس واقع ہوئی ہیں، ایک کی تعلیم قبلہ مستقبل کی طرف اٹھی ہوئی ہے، دوسری کی اعلیٰ ماضی کی طرف اک اشارہ معکوس کر رہی ہے؛ امتدین انسانی کی تقدیر آج انہی دونوں قوتوں کی کشمکش میں ملتی ہے؛ اول الذکر مدرسہ پرس کہتا ہے، اور آخر الذکر کا نام "روم" ہے؛ یہ ہر دو مدارس یا معابد اپنا اپنا ایک ایک صحیفہ دینی رکھتے ہیں؛ پہلے کے صحیفے کا نام "اعلان حقوق انسان" ہے، دوسرے کا "پاپائی تورہ چلیخاں"؛ پہلا "ترقی" کو کہتا ہے؛ خوش آدمی؛ دوسرے کا پیام ہے؛ کاش کہ بارگشتہ ان دو متضاد قوتوں میں کلمہ حق دخل دیتا ہے، اور پہلی کو پروانہ راہداری بخش دیتا ہے؛ لاریب کہ ترقی و تقدم، خود خدا کے قدوس کا نقش قدم ہے!!

پرس کے مجمع "اخوان الصفا" کے ارکان میں، متین، ریتائے، پاسکل، کارمیل، تومیر، بانسکیو، دیدو، رسو، والیسیر میرابو، اور

آؤ اپنے انسانی جمال و جمال کی ایک ایک رگ کو جنبش میں لے آئے۔  
 آؤ، قوموں کے شعل جذبات پر صلح و دوستی کا مہم بنید رکھیں؛  
 آؤ، قلوب انسانی کو اخوت کے پیام کی زلفند گرہ گیر کا اسیر کر لیں۔  
 آؤ، اس حقیقت کو اپنے آفتاب قلب کے کسی او جھل نہ ہونے دیں کہ  
 ہم اک عظیم ماضی اور اک عظیم تر مستقبل کے مابین اک بزرخ واقع ہوئے ہیں،  
 یہی چیز انقلابِ فرانس ہے، دوسری چیز انقلابِ یورپ!

کو سمجھادیں، باہمی نفرت و عناد پر غالب آکر یہ جنگ کو باہر بھج کر سکے ہیں؛  
 آؤ ہر ممکن حادثے کو ہر ممکن پیش بندی سے روکیں مستقبل کے غیر متنبوہ عالم  
 میں ہمارا داخلہ ان کمزوریات کے بغیر ہی کچھ کر دیتا رہیں ہے! میں ان لوگوں  
 میں ہوں جو غیر معلوم مستقبل پر ایمان بالحبیب رکھتے ہیں؛ لیکن اس شرط کا زیر  
 کے ساتھ کہ ہم اس دورِ زریں کے جہانِ عزیز کے لئے زیادہ سے زیادہ  
 اپنے صمن دل کی رُفت و روبرو کریں!

## کب آئے گا؟

وعدہ خلاف، وعدہ فردا "کب آئے گا؟  
 وہ منتہائے ذوقِ متن کب آئے گا؟  
 جانِ ادا و نازِ سراپا کب آئے گا؟  
 وہ جس کے پاس بیٹھنا فر دوس ہے مجھے  
 دل ہے بچھا بچھا سا، تنہا اداس، آؤ اس  
 کب تک رہے گا سلسلہ اشک متصل  
 ہنس ہنس کے لوگ دیکھیں گے لبتک می وطن  
 آتا ہے جس سے دل میں زمانہ بہار کا  
 کاندھے پہ زلفِ ناز کی موصی لئے ہوئے  
 وہ جس کا ہر نشان قدم صد بہارِ خلد  
 اس میری جانکشی کی قسم ہے سچے صبا

یارب وہ میرا بھولنے والا کب آئے گا؟  
 فردوسِ دل بہشتِ نظارہ کب آئے گا؟  
 میری طرف نہ دیکھنے والا کب آئے گا؟  
 وہ مجھ سے دور بیٹھنے والا کب آئے گا؟  
 وہ جانِ دل، وہ جانِ تن کب آئے گا؟  
 ان آنسوؤں کا پونچھنے والا کب آئے گا؟  
 وہ شکر ا کے دیکھنے والا کب آئے گا؟  
 یارب بہار کا وہ زمانہ کب آئے گا؟  
 وہ سرِ گلستانِ متن کب آئے گا؟  
 وہ پیکرِ بہارِ سراپا کب آئے گا؟  
 اُس جانِ انتظار سے کہنا کب آئے گا؟

لبل، پھر آئے گا وہ عز و آئے گا، مگر!

اب اس کو یاد وعدہ فردا "کب آئے گا؟

# افوائیں!

مصباح الدین احمد امیر

بیوی، لیکن بہارا بہت کم تو شادی شدہ ہے؟  
بورسل، تو اس سے کیا ہوتا ہے — مگر پیاری ڈاؤس یہ  
ایک دفتری راز ہے اس کا ذکر کسی سے نہ کرنا۔  
(دو لڑاں اندر چھپ جاتے ہیں)

(۳)

(مسٹر ڈاؤس بورسل، اپنے بالا خانہ پر کھڑی ہوئی اپنی پٹن  
مسٹر اسٹیٹ سے باتیں کر رہی ہیں)  
ڈاؤس، کیا تم میرے شوہر کے بہت کم مسٹر اسٹیٹ سے واقف ہو؟  
اسٹیٹ، ہاں، کیوں کیا بات ہے؟  
ڈاؤس، دراصل مجھے تم سے یہ بات نہ کہنی چاہیے مگر مجھے تیرا قبائ  
ہے کہ تم اس کو راز نہ کہو گی،

اسٹیٹ، (اشفاق سے) ہاں، ہاں قطعی، کیا معاملہ ہے؟  
ڈاؤس، وہ غصہ ہو گیا ہے، وہ لڑکی اس کی عمر بچی ہو چکی ہے۔  
اسٹیٹ، تم ایسا مت کہو، وہ تو شادی شدہ ہے،  
ڈاؤس، تو اس سے کیا ہوتا ہے، مگر وہ قطعی اس کو راز رکھنا،  
اسٹیٹ، ہاں ہاں عزیزن قطعی۔

(۴)

(مسٹر اسٹیٹ، مسٹر ڈاؤس اسٹنٹ بیک سے راستہ میں ملتی ہے)

(مسٹر بیورم اینڈ اسکیرم کے نیچر مسٹر تھامس بورسل اپنے دفتر  
سے ڈراؤر سے کچھ پوچھتے ہیں، اُن کی بیوی اُن کی دیررسی پر باز پرس  
کرتی ہے وہ اس کے جواب میں مسکرا کر چپ ہو جاتے ہیں)  
بیوی - پیارے! آج تم غیر معمولی تاخیر سے آئے؟  
- بورسل - ہاں پیاری،

بیوی - کیوں؟

بورسل - کوئی خاص بات نہیں، دفتری میں دیر لگ گئی،  
بیوی - (ذرا جھجھکا ہٹ سے) آخر اس کی کوئی وجہ بھی ہوگی؟  
بورسل - (دراپے صبری سے) چونکہ آج بہت کم کو ایک نوخیز لڑکی  
سے ملاقات کرنا تھی، اس لئے میں بھی بیٹھا رہا۔

بیوی، نوخیز لڑکی؟

بورسل، ہاں، وہ اس کے ہمراہ دیر تک رہی اور میں بہت سے  
پیشہ کی صورت دفتر سے اُٹھ ہی نہ سکا۔

بیوی، (اپنے ہونٹ ہلکا کر) میرا خیال تھا کہ بہارا دفتر ایک  
مہذب ادارہ ہے، آخر وہاں بہت کم کو ایک لڑکی سے کیا فتن؟

بورسل، مجھے کچھ خبر نہیں، غالباً وہ اس کو رکھنا چاہتا ہے،  
کیونکہ وہاں سے عمر بچی کے متعلق کچھ شکایتیں پہنچتی ہیں، لیکن میں ٹھیک  
طور پر ابھی کچھ نہیں کہہ سکتا



عقد کر لیا ہے،

تیسری خاتون، ہم لوگوں کو یہ معلوم کر کے مسرت ہوگی کہ یہ خبر صحیح نہیں ہے۔

بٹن، (دانت ہیکل) تم لوگ سب اوندھی عقل کی ہو، طلاق بھی کیا کوئی کھیل ہے، میرے شوہر کی مچھی میں کوئی خاتون نہیں ہے، تم بھول کی ملی بھگت ہے،

(۱) در غفہ میں اٹھ کر چل دیتی ہے)

(۲)

اسٹر بٹن جب دفن سے گھر واپس آتے ہیں تو دروازہ پر جو بی کو معمولی استقبال کرتے ہوئے نہ پا کر غصت کے ساتھ بلا خانے پر جاتے ہیں جہاں ان کو جو بی اپنے آرام کمرے میں روتی ہوئی ملتی ہے،

بٹن، پیدری تم کو کی گلیف ہے؟

جو بی، ہٹ سکار،

بٹن، (پریشان ہو کر) آئیں میں نے کیا کیا؟

دبوی اٹھ کر مٹی جاتی ہے، اور جو کچھ اسے دارالفریح میں پیش آیا تھا سب رو رو کر اپنے شوہر کو سناتی ہے)

بٹن، (میں غصلا کر) لہو، دارالفریح کی وہ مرداویں یقیناً ذبح کر دینے کے قابل ہیں، اس میں ذرا سچی حقیقت نہیں ہے، میں جانتا ہوں کہ کوئی کمرہ تھہ بنا گیا ہے، سر دفن سے ڈاکٹ کو ہماری شانے میں نئی آنکھ کے قیام کے شعلے گھنٹہ گھنٹہ کرنے کے لئے بجا رہا تھا، کل وہ بھگتے رخصت ہو رہی تھیں، میں ان کو ان کے ہوٹل تک پہنچانے کے لئے بینک گیا تھا، اتوہ! کس قدر غلط! افواہیں مڑا دی جاتی ہیں،

دسٹر بٹن آنسو پونچھی ہوئی اٹھ کر اپنے شوہر کے ساتھ ان کے دارالطافہ میں جاتی ہیں، جہاں نئی آنکھ سے متعلق وہ کل پوشیدہ خط و کتابت دیکھ کر اپنا "طینان کرتی ہیں)

جو بی، (اسے سیریا کر کے) کس خوشنک دنیا میں ہم نے جم لیا ہے،

دسٹر بٹن، بینک کچھ عجیب دنیا ہے، تم کو چاہیے کہ جو کچھ سنو اس پر مطلق اعتبار نہ کرو، اور جو کچھ دیکھو اسے اُدھائی تسلیم کرو۔

## تجاربہ عارفانہ

کیوں صبح یوں عرق میں نہلے ہوئے ہوں  
 الجھا ہوا ہے کرب سے ہر شے نفس  
 شاید کسی غلش کے جگائے ہوئے ہو تم  
 جن مشغلوں سے کھلتی رہتی تھی کم سنی  
 جو دیکھنے میں زلف بنائے ہوئے ہو تم  
 شاید یہ اتہام ہوا خفا کے راز کا  
 جو لیوں سے آنکھ چلے ہوئے ہو تم  
 خود کو لے ہوئے ہو لگہر کہ رہے ہیں طور  
 سینے میں ایک حشر چھپائے ہوئے ہو تم

کیا جوش نامراد کو دیکھا ہے خواب میں

یوں صبح کو جو شام بنائے ہوئے ہو تم

# بلاکش بحر ایک خلوت پسندان

وکٹر میگو

تھا، گلیٹ اور زیادہ قریب ہو گیا، اُس نے دیکھا کہ ایک آدمی سو رہا ہے، وہ سیاہ لباس میں ملبوس ایک پادری معلوم ہوتا تھا، جس کو گلیٹ نے اس پیشتر کبھی نہیں دیکھا تھا، گلیٹ چٹان کے دامن کے ارد گرد جھکے گا ہوا چوٹی کے اس قدر قریب پہنچ گیا کہ وہ اپنی کشتی پر کھڑا ہو کر اس معروف خواب انسان کے پاؤں کو چھو سکتا تھا، چنانچہ وہ اُس کو جگانے میں کامیاب ہو گیا۔

وہ آدمی اٹھا اُس نے آہستہ سے کہا میں مجتبیٰ تھا۔ گلیٹ نے اسے اپنی کشتی میں کو دپڑنے کا اشارہ کیا، جب وہ اس انسان کو جو کسی قدر کافی بناوٹ کا جسم اور شرافت رکھتا تھا، ساحل پر اُتار چکا تو گلیٹ نے دیکھا کہ وہ نہایت گورے ہاتھ سے ایک سادہ رنگ میں کر رہا ہے، گلیٹ نے زنی کے ساتھ اس کا ہاتھ پیچھے پٹا دیا ایک لمحہ کے سکوت کے بعد وہ لاجون سلام کرتا ہوا چلا گیا۔

گلیٹ اس عجیب شخص کو بالکل بھول چکا تھا کسی آواز نے اس کا خیال متقدم کیا، یہ اسی کے گان کا ایک باشندہ تھا، جو جلدی جلدی اُس کی طرف آ رہا تھا،

گلیٹ ا پرویز پر ایک ہنگامہ ہو رہا ہے: اُس نے بچتے ہوئے کہا،

گلیٹ اگر قریب کا ایک باشندہ تھا، جس سے اُس کی خلوت پسندی و فطرت پرستی کے باعث جیسے بالعموم شیطانی چیز سمجھا جاتا ہے، لوگ محض زہار کرتے تھے، ایک دن یہ بھیجی کے شکار سے واپس آ رہا تھا۔ سمندر کی موجیں چڑھ رہی تھیں کہ یکایک اسے سامنے سمندر میں ایک چٹان پر کسی انسانی سائے کا دھوکہ ہوا۔

گلیٹ اس سفر کو عجیب سے دیکھنے لگا، ایسی جگہ اسے نہایت مروجہ سمجھی، پہاڑی بند چٹانوں کے درمیان قدرت کی تراشی ہوئی ایک ایسی نشستگاہ جہاں سمندر کے دلکش مناظر بلا روک حدود نظر میں آسکیں، یہ ایسی جگہ تھی جہاں ایک قید منزل سے آزاد مسافر ساحل سے ہوتا ہوا مشر کے ساتھ مناظر کے کھلے ہوئے درپے میں بیٹھ جائے اور محبت کے عالم میں سمندر کی چڑستی ہوئی موجوں کے خطرہ کو بھی بھول جائے، یہاں تک کہ سلامتی کا دروازہ اس پر بند ہو جائے، اس خاموش شیطانی کرسی سے جتنی پکار کر رسائی کسی انسانی کان تک نہاں تھی۔

گلیٹ اپنی کشتی اس چٹان کے قریب لے گیا، اس نے دیکھا کہ چٹان پر یہ سیاہ وادی ایک انسان کا تھا،

اب سمندر کا فی چڑھاؤ رہتا، چٹان کے چاروں طرف پانی ہی پانی

”کیا معاملہ ہے؟“

میں جلدی میں بیان نہیں کر سکتا۔ جلدی واپس جاؤ، مہیں سب علم ہو جائے گا۔

بروز پریقہری کے مکان کا نام تھا، جس نے گرنیز اور نارمنڈی کے سواحل کے درمیان پہلی دفعہ سٹیٹ کے جہاز کا سسہ جاری کر کے اپنی مالی حالت کو مضبوط بنالیا تھا، اُس نے اپنے جہاز کا نام لاڈلورینڈ رکھا تھا، وہ بات کے باہم شندوں میں جو اس مہیب شے کو شیطانی ایجاد تصور کرتے تھے، یہ جہاز شیطانی کشتی کے نام سے مشہور تھا، لیکن ڈیورینڈان دونوں بندرگاہوں کے درمیان بلا خوف و خطر آجاتا رہا جس سے لیتھری کی امارت میں روز بروز اضافہ ہوتا رہا، اُسے تمام دنیا میں اس جہاز سے زیادہ کوئی شے عزیز نہ تھی، البتہ اس کے لہو وہ اپنی بہانچی ڈراوچٹ کا عزیز رکھتا تھا جو اُس کے گھر کی منتقلہ تھی، ایک دن گلیٹ برٹ سے ڈھکی ہوئی ٹرکوں پر بٹل رہا تھا، ڈراوچٹ دوسری چٹان پر اس کے سر کی بلندی پر پہنچی، وہ ایک لکھ کے لئے رک گئی، اس نے جھجک کر اپنی انگلی سے برٹ پر کچھ لکھا اور چلی گئی، جب یہ باہمی گیر ہاں پہنچا تو اس نے دیکھا کہ اس سختی شیخ جہان نے اسی کا نام لکھا تھا، اس لکھ کے بلکہ گلیٹ اپنی زندگی کی گہری غلوٹوں میں ہمیشہ ڈراوچٹ کے خیال میں محو رہنے لگا۔

اب بروز پر ہنگامے کی خبر سنتے ہی اس فلوٹ پسند انسان نے لیتھری کے مکان کا رخ کیا جو ڈراوچٹ کا آشیانہ تھا، ہنگامے کی تسخیر بہت جلد کر دی گئی، ڈیورینڈ وھند کے بادلوں میں خوفناک جٹاؤں کے ساتھ ٹکر کھا کر تباہ ہو گیا تھا، البتہ اس کا انجن ابھی تک شگستگی سے محفوظ تھا، اب اگرچہ تمام جہاز کو بچا لینا تو ناممکن تھا، لیکن انجن کو بچا لینا ممکن ہو سکتا تھا، یہ انجن بے نظیر تھا، اسی تم کا دوسرا تباہ کرنا دوسرے کا ور یا بیانا تھا، اور پھر اُس کے سمار کی تلاش اس سے بھی زیادہ مشکل تھی، اس کا سمار چھپا تھا، اور دشمنی و دوہزار پونڈ کی لاگت سے تیار ہوئی تھی، اب اگر کوئی ناقابل عمل اور فکوت فہم خیال دماغ میں آسکتا تھا تو وہ انجن کو بچانے کا تھا، جو اس وقت ڈوریز کی چٹانوں میں پھنسا ہوا پڑا تھا، ان چٹانوں پر کئی ملاح کو کام کرنے کے خیال سے

بہین نغول تھا، یہ بھری طوفان کا موسم تھا، علاوہ ازیں سمندر کے درمیان چٹان کی بلند ترین چوٹی پر شکل ایک آدمی کے کھڑے ہونے کی جگہ تھی، لہذا جہاز کو بچانے کے لئے صرف ایک آدمی ڈوریز پر جا سکتا تھا، جہاں وہ سمندر کے درمیان ساحل سے پانچ میل کے فاصلے پر پہنچا تھا کہ کام کرے، بالکل تنہا، اس سمیت ناک خطہ میں ہر طرح کے خطروں کے مقابلہ کے لئے، بھوکا اور عربائی کی سمورت میں بالکل ناجار، جہاں اس کا موت کے سوا دوسرا کوئی ساتھی نہ ہو۔

ایک ملاح نے ایستادہ ہو کر فیصلہ سنایا،

”مہیں اب کام تمام ہو چکا ہے، اس وقت وہ آدمی زندہ نہیں ہے۔

جو وہاں جا کر ڈیورینڈ کے انجن کو بچائے۔“

”اگر میں نہیں جاتا“ ڈیورینڈ کے انجنیز نے کہا۔ ”تو اس کی وجہ صرف

یہ ہے کہ اب یہ کام انسانی طاقت سے باہر ہے،

”اگر ایسا شخص زندہ ہو۔“ ملاح نے اپنی تقریر کو پھر جاری کیا،

ڈراوچٹ نے فوراً اس طرٹ رخ کر کے ملاح کی بات کو کاٹ دیا،

”تو میں اس سے شادی کروں، اس نے معمولانہ انداز سے کہا پھر ایک سکوت

طاری ہو گیا، ایک آدمی عجیب کو چرتا ہوا اس کے سامنے کھڑا ہو گیا، لیکن زرد اور متعزز تم اس سے شادی کرو لگی، ڈراوچٹ!“

اس نے شوق سے پوچھا، یہ گلیٹ تھا، رب کی نظریں اس پر جمی ہوئی

تھیں، لیتھری نے بھی اُسے دیکھا، اس کی آنکھیں محبت سے چمک رہی تھیں، اس نے

اپنی بھری لٹی کو اتار کر فرش پر رکھ دیا، پھر استغفار کے ساتھ سامنے دیکھا

اور مجمع کا خیال نہ کرتے ہوئے بے لگاؤ تو ڈراوچٹ اس کی ہوگی؛

”میں اس کام کا بیڑا اٹھاتا ہوں۔“

چٹانوں کی دو عمودی دیواروں میں تباہ شدہ جہاز کا باقی حصہ

دروازے کی ڈانٹ کے ماتھے سے پھنسا ہوا تھا، اس کا وحشت انگیز

شفات آسمان کے نیچے بالکل صاف نظر آ رہا تھا، جب گلیٹ اپنی دھاتی

کشتی میں وہاں پہنچا۔

یہ چٹانیں اپنے شکار کو دلچسپ ہونے نہایت سمیت ناک نظر آتی

تھیں، ان کی وضع میں ایک دھکی کا انداز تھا، وہ اپنے وقت کی حکمران نظر

یہ بھری امواج کی دھماکا نہ دل گئی کے لئے ایک مکھڑا بنا ہوا تھا، اب کوئی صورت نہ تھی، شیشی کی جلاک جو بیک وقت وزنی اور نازک بھی تھانے بوجھ سے دو چٹانوں کے درمیان پھنس چکا تھا، اور اسے اس عالم سکوت سے نکال کر ساحل تک کے جانے کا خیال بھی دیوانگی معلوم ہوتا تھا، گلیٹ نے اپنے بدن کا بازو لیا۔

جب وہ اپنے بیٹے کی جگہ بنا چکا تھا اسے معلوم ہوا کہ وہ اپنی خوراک کی لاکڑی کو چکا ہے، اس کے پاؤں تلے سے زمین اٹھ گئی، ڈیورینڈ کے آئین کو چٹانوں سے نکالنے کے لئے جن میں وہ تین چوتھائی سے زیادہ دھنسل چکا تھا، ایک پورے لشکر کی ضرورت تھی اور گلیٹ باطل تھا، یہاں بڑی کے پورے ہتھیار اور انجنیئر کے پورے اوزار درکار تھے، لیکن گلیٹ کے پاس صرف آری جمینی، کھارہڑی اور ایک تھوڑا تھا، اس کو ایک پورے وکٹ پیک کی ضرورت تھی، لیکن وہاں سائے کے لئے جوت بھی نہ تھی، اس خشک چٹان پر خوراک بھی ضروری تھی، لیکن اس کے پاس کوئی روٹی تک نہ تھی،

پہلا ہتھ اس نے شلٹ جہاز کے کارآمد مشینوں کو فراہم کرنے میں گزرا، وہ ہر ایک چٹان پر پھرا اور ہر وہ چیز سمندری موجد نے چٹانوں پر پھینکی تھی اکٹھا کر گرا، کچے ہوئے کپڑوں کی دمبیاں، لوبھکے ٹکڑے، چولوں کے پڑے، منشر تھے، لٹی ہوئی سلاخیں، کہیں سے زنجیر کہیں سے چرخی، الغرض جو کچھ ملا اکٹھا کرتا رہا، اس نے سیپوں کے کیرڈوں اور پانی پر گزارا کیا، وہ چنگھا ڈٹے ہوئے بھری شیشیوں اور اڑتے ہوئے اڑتوں کے نرے میں گھرا ہوا تھا، شور بدحوشی کی آواز اس کے کانوں سے کبھی مٹا نہیں ہوئی، وہ دن کو دھوپ کی کبھی میں بھٹکا اور شب کو سیلا سمندری بیج گردینے والی سردی سے شبنم ہو جاتا، اور ہر وقت بھوکا پیاسا رہتا تھا۔

ایک دن چٹان کے گوشوں میں پھرتا ہوا گلیٹ ایک غاری میں پہنچ گیا جو بھری پھولوں سے لدی ہوئی سمندری دیوہی کی غولت گاہ معلوم ہوتی تھی، یہاں سبیاں جو ابھر کی طرح چک رہی تھیں۔ پانی میں چاند کی روشنی منکشف تھی، اگر بھول سبزے کی مانند تھے، ایک عین گڑھے کے کنارے کھڑے ہوئے شفاف پانی میں گلیٹ نے اچانک ایک فلسی چیز کو بڑھتے ہوئے

آتی تھیں، اس سے زیادہ غور اور کثرت کے منظر کا تخیل پیدا نہیں ہو سکتا تھا، شکست خوردہ جہاز، تھمتھمتی صبح — گزشتہ روز کے طوفان کے باعث دو لال چٹانوں سے دھارے اس طرح ابل رہے تھے، جیسے دو پہلو والوں کے جسم سے پسینہ بہ رہا ہو جو ابھی بیکار سے فارغ ہوئے ہوں۔ دماغ افسوس پانی سے باہر نکلے ہوئے دوشیلائی باز و تصور کرتا تھا، جو سمندر کے طوفانوں کو تباہ شدہ جہاز کا شاہدہ کر رہے ہوں، اگر گلیٹ کو جہاز کی تباہی کی وجہ معلوم ہوتی تو وہ اس ہتھاک منظر سے اور بھی زیادہ متاثر ہوتا، تباہی کی وجہ ایک حادثے کا وجود دارادہ پر مبنی تھی۔

کھین لکھی اس جہاز کے عیاں کھین نے جہاز سے روپہ اڑا لیا، اب ایک بیٹی میں تین ہزار پونڈ تھے، اس کا ارادہ تھا کہ وہ ساحل سے ایک میل کے فاصلہ پر جہاز ہینو بیڑیں ڈال کر غرق کر دے اور جب ساحل پر کشتیوں کے ڈریپے ساحل پر پھرتے جاویں تو یہ جہاز کے ساتھ ہی ڈوبنے کا ارادہ ظاہر کر کے کچھ دیر ڈیورینڈ میں توقف کرے اور بعد میں تیر کر ساحل پر پہنچ جائے، یہاں سے کشتی کے مشرق کی جانب فرار ہو جائے، اس کے مختصر ڈرامے کے عمل کی تکلیف ہو چکی تھی، ہر ایک کھین کھین کے اشاری کی تعریف کرتا ہوا چلا گیا — جب ڈھنڈکا صاف ہو گیا تو کھین کے خوف کی انتہا نہ رہی، اس نے دیکھا کہ وہ بیٹھین کی بجائے ڈاوریز رہتا، چٹان سے ساحل ایک میل نہیں بلکہ پورے پانچ میل تھا،

کھین نے دور سے ایک جہاز کو دیکھا، اس نے تیر کر دوسری چٹان پر پہنچے کا ارادہ کیا، چٹان سے وہ جہاز والوں کو نظر آگئے، اس نے اپنے چولے کی پٹمی کے ساتھ دم پڑے اتار کر مشہ جہاز پر رگدے اور سر کے بل سمندریں کو دپڑا، چونکہ وہ بندھی سے گرفتار وہ پانی کی تہ تک پہنچ گیا، اس نے سمندری کی تھوڑی سی گھوس کیا، ایک لمحہ کے لئے وہ زیر آب چٹانوں کے گرد پھرا، پھر دوبارہ سطح آب پر آگیا، اسی وقت اس نے غصہ کیا کہ اس کا ایک پاؤں کسی چیز کے پٹے میں ہے،

لیکن جب گلیٹ ڈوریز پر پہنچا تو وہ اس حقیقت سے متعلق آگاہ نہ تھا، وہ نہاہ شدہ جہاز کے منظر کو دیکھ کر حیرت میں تھا، اس نے دیکھا کہ ڈیورینڈ کی شیشی باطل محفوظ تھی، جس کو سمندر نے آہستہ آہستہ منہدم کرنے کے لئے کچا لیا تھا، جس طرح ایک بیٹی اپنے شکار سے کھیتی ہے

ہوتا تھا، ایک لمبے کے اندر اندر یہ بل کھاتی ہوئی چیز اس کی کلائی اور کمر کے گرد کرشنا نے تک پہنچ چکی تھی اور ایک تیز لوگ اس کی نعل میں کھپ گئی، گلیٹ لڑ گیا، لیکن اس کو ہنسنے کی تاب نہ تھی، وہ اسی جگہ پر کھپ گیا، اس نے اپنے بائیں ہاتھ سے جو اسی تک آدا تھا چھڑا پکڑ کر اپنے آپ کو گھڑنے کے لیے کوشش کی، لیکن بحری بلانے اپنا قبضہ اور کبھی مضبوط کر لیا، یہ چرچے کی مانند نرم لوسے کی مانند مضبوط اور رات کی مانند ٹھنڈی تھی۔

ایک دوسری شکل، تیز اور سکڑی ہوئی شکلات سے اس طرح برآمد ہوئی جیسے ایک اڑدے کے منہ سے زبان پھیرے وہ اس کے نکلے جسم کو چھتی ہوئی محسوس ہوئی پھر یکایک بادیک اور طویل ہو کر اس کے جسم کے گرد لپٹ گئی، شدید درد کی وجہ سے گلیٹ کے جسم کے تمام پٹے سٹان گئے، اس نے اپنے جسم پر کئی انشتر جھپٹے تو بے محسوس کے، اسے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ کئی ہزار بونگیں اس کے جسم پر چٹ کر اس کا چوس رہی ہوں۔

ایک تیسری بھی متحرک شے سوراخ سے باہر آئی، اور اس کے بدن کو ٹوٹتی ہوئی اس کی پستوں کے گرد تھپی کی مانند مضبوطی سے لپٹ گئی گلیٹ ان تمام اشکال کو اچھی طرح دیکھ سکتا تھا۔ ایک اور چیز تیر کی طرح تیزی سے اس کے پیٹ پر حملہ آور ہوئی۔

یہ جاندار چیزیں جا بجا اس کے جسم کے گرد لپٹی ہوئی تھیں، اس نے دباؤ کے مقامات پر خون چوستے ہوئے جبرٹوں کو محسوس کیا، جو ہر لحظہ اپنی جگہ بدلتے تھے۔

پھر ایک بھاری لیسڈار جی ٹی شکل پانی سے نمودار ہوئی، اس کا وسطی حصہ تھا، جس کے اطراف پر کئی تیز ناز بائیں آویزاں تھیں، اس نے اس لیسڈار ڈھیر کے وسط میں دو جھپٹے ہوئی آنکھیں دیکھیں۔

اب گلیٹ نے شیطانی کھیل کو پہچان لیا۔

اس کے پاس صرف ایک ہی ہتھیار یعنی چاؤ تھا۔

وہ جانتا تھا کہ یہ خونخوار عجیب الخلقت بلائیں صرف ایک مقام سے زخم پذیر ہو سکتی ہیں، اس کے جسم کا ایک ایک مقام اس سنگین گرفت میں مضروب اور مجروح ہو رہا تھا، گلیٹ نے شیطانی کھیل کی آنکھوں کو دیکھا اور شیطانی کھیل گلیٹ کی آنکھوں کو دیکھ رہی تھی۔ شیطانی کھیل کے مقابلے میں بلی کے مقابلے کی طرح ایک ایسا وقت

دیکھا، ایک گول گول شے مجموعی ہوئی موجوں میں حرکت کر رہی تھی، یہ تیری تھی، بلکہ پہلا گول ہی تھی، اس وقت یہ ایک متعدد کے ساتھ ایک ملن تندی سے بڑھ رہی تھی، اس کی سببیت ایک کھلنے کے مانند تھی، جس کی لوکار شکلی ہوئی شائیں موجوں میں نہ دبالا ہو رہی تھیں، یہ کچھ لمبے اس طرح دھکی ہوئی نظر آتی تھی، جس پر پانی کا مطلق اثر نہ ہو سکے۔ وہ غار کا تھک تریں پہلو تلاش کر رہی تھی، یہاں وہ بالآخر غائب ہو گئی۔

گلیٹ اپنے کام پر واپس آ گیا، لیکن اس کے دل میں یہ سببیت ناک منظر ہر وقت تازہ گزرتا رہتا، انتہائی جانفشانی کے بعد شینری شستی میں اتارنے کے لئے تیار ہو گئی۔ گلیٹ نے ایک کنڈا تیار کیا، اس کی طویل شدت کا سیٹا سے بدل چکی تھی، اب دوسرے روز وہ گزیر کو لوٹ جانے والا تھا، لیکن نہیں اس نے انتظار کیا، کہ موصی کشی کو آدیراں انجن کے قریب تریں سے آئیں، وہ بھیر کی کھالی اڑھ کر سو گیا۔

جب وہ اٹھا تو طوفان کی آمد آدھی تھی، اب اس کھاتی کو چڑھتی ہوئی موجوں سے بچانے کے لیے ایک مفصل عزم رہی تھی، اس نے ڈیورینڈ کی سلاخوں، ٹوٹے ہوئے تختوں کو اکٹھا کر کے خدائی غضب سے بچاؤ کا سامنا کیا۔

جب غضبناک طوفان کا چڑھاؤ کم ہو گیا گلیٹ بھوک سے دیوانہ ہو رہا تھا، اس نے اتری ہوئی موجوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے پھیلی کی تلاش میں نکلے گا ارا دہ کیا۔ وہ نہ صرف پانی کی حالت میں دانتوں میں چھڑا دباے ہوئے ایک ایک چٹان پر بھاگ رہا تھا، اچانک اس نے اپنے آپ کو دوبارہ اسی غار میں پایا جو اس کے مانند کھپتے ہوئے پھولوں سے لٹی ہوئی تھی، اس نے پانی کی سطح پر ایک شکلات میں ایک پھلی کو دیکھا، اس نے فوراً اپنا ہاتھ پانی میں ڈالی دیا اور تابی میں زیر پاؤں ٹوٹنے لگا، دفتر اس نے اپنے بازو کو کسی چیز کے پٹے میں جکڑا ہوا محسوس کیا۔ اس پر ایک عجیب سببیت طاری ہو گئی۔

ایک بادیک کھر دسی جی ٹی ٹھنڈی اور لیسڈار چیز اس کے بازو پر لپٹ چکی تھی جو اس کے سینے کی طرف رینگتی جاتی تھی، اس کا دباؤ ایک تیزی کے مانند تھا، اور اس کا متواتر بڑھتے جانا جسم پر ایک برسے کی طرح محسوس

اور سر رسلط آسمان تھا، اس نے تمام جد و جہد چھوڑ دی، وہ ایک چٹان پر لپٹ گیا، اس نے نہایت آذر دگی اور عاجزی سے اپنے ہاتھ اٹھائے، اس کی زبان کی بلے ربط جنشوں میں رحم، رحم کی پکار تھی، جب وہ اس بے خودی کے عالم سے بیدار ہوا، تو سرورج کافی بلند ہو چکا تھا، وہ دوبارہ تازگی سے کھڑا ہو گیا، اس نے ہمت بانجی ایک دن کی محنت کے کشتی کا سوراخ بند کیا، دوسرے روز وہ فرہم کردہ جمیع ترلوں سے بلوس ڈارنر سے ساحل کی جانب چلا پڑا۔

### فقت کی آخری ضرب

گلیٹ اپنے جمیع ترلوں میں بلوس رات کے وقت ساحل پر پہنچا، اور لیتیری کے مکان کی تاریکی میں کچھ دیر تک ادھر ادھر پھرتا رہا، پھر اس نے غصہ باغ کا رخ کیا، وہ گھاس پر بیٹھ گیا، اور ارد گرد دیکھنے لگا، باغ کے پھول پڑیاں اور مکان اس کی نظر میں تھے، اس نے ڈراوچٹ کے کمرے کی کھڑکی کو دیکھا، اس کا متعلق بھی ایک رکاوٹ کے ساتھ جاری تھا، اُن کھڑکیوں میں ایک عجیب کشش تھی جن میں دیکھتے رہنا اس کے لئے دائمی مسرت کا شعل تھا، اچانک اس کی نظر ڈراوچٹ پر پڑی،

وہ قریب آ رہی تھی، کچھ خاصے پردے کھڑی ہو گئی تھیں، جہد قدم بھیجے ہٹ کر ایک لمحے کے لئے ٹھہر گئی اور ایک لکڑی کی میخ پر جا کر بیٹھ گئی، چاند درختوں کی آڑ میں تھا، ذرہ زرد ستاروں میں بادل کے جھنڈے تیر رہے تھے، سمندر کی موجیں زبر لب لگنا لگی تھیں۔

صحیف کے دن پر کچھ غامی ہو گئی، وہ اس وقت اپنے آپ کو انتہائی پرہیز اور بدچراخ خوش نصیب محسوس کر رہا تھا، وہ اس لمحہ میں تھا کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔ وہ اس کی خوشی سے اس پر سرسام کی حالت غامی تھی، اس نے ڈراوچٹ کی گردن اور سمندری بادلوں کو گھورے دیکھا،

اچانک ایک آہٹ نے دھڑکن کو مہلکار کر دیا، کوئی شخص باغ میں نہیں رہا تھا، ڈراوچٹ نے اپنی آنکھ اٹھائی، وہ شخص قریب پہنچا تھا، اب داخلہ کی کشافیں درمیان میں اس طرح قابل تھیں کہ ڈراوچٹ تو لامارو کہ دیکھ سکتی تھی، لیکن گلیٹ نہیں دیکھ سکتا تھا، اس نے ڈراوچٹ کی طرف دیکھا، وہ بالکل زبردست ہو رہی تھی، اس کے نیم والے ایک جبرائی کی پیچ کو دبائے

ہوتا ہے جب اُن پر قابو پالینا چاہیے، یہ سوچا اس وقت ہوتا ہے جب بیل اپنا سر بٹھا کر سے اور شیطانی پھلی اپنا سر اٹھائے، یہ سوچا نہایت قلیل ہوتا ہے، اور جو غریب اسے کھودے وہی تباہ ہوتا ہے،

یہ ایک شیطانی پھلی نے ایک اور شاخ چٹان سے باہر نکالی، اور اس سے گلیٹ کا بایاں بازو بھی پکڑ لیا اور ساتھ ہی اپنا سر آگے بڑھایا۔

جتنا بھی یہ سوچہ غمناک گلیٹ نے اتنی ہی تیزی سے تمام گوشے کے ساتھ اپنا خیز اس زم زم لیسدا چیزیں گھونپ کر فوراً اس کی آنکھوں کے گرد ایک زخم کا حلقہ بنا دیا۔

تمام چوکیں بیک وقت گر گئیں اور تمام کا تمام ڈیر پانی کی تیریں غائب ہو گیا۔

گلیٹ زخموں سے چور ہو چکا تھا اس نے اپنے آپ کو پانی میں ڈال دیا۔ اس کی نظریں ایک گوشے کی جانب پھریں۔ وہ قریب گیا۔ یہ کیا چیز تھی۔ ایک انت فی خیر جس میں سفید ہڈیوں کے سوا کچھ باقی نہ تھا، — ماں ایک چیز — ایک جھڑے کی بیٹی اور تلو کا ڈبہ۔

بیٹی پر گلیٹ نے لعین کا نام پڑھا، پھر اس نے تباہی کے ڈبے کو چاقو سے کھول کر دیکھا، اس میں تین ہزار اشرفیاں تھیں،

جب گلیٹ اس ڈبے اور بیٹی کو اسے کراچی کشتی کی جانب ملتا تو اس کے خوف کی کوئی حد نہ رہی۔ اس نے دیکھا کہ کشتی میں پانی بھر رہا ہے۔ اگر وہ ایک گھنٹہ اور دیر سے آتا تو اسے پانی کی سطح پر کھجھ نہ ملتا۔ اس نے زنجیر کے ساتھ ایک تر پالی کشتی میں لپک کر سوراخ بند کر دیا، اور کشتی میں پانی آتا بند ہو گیا۔ گلیٹ نے اپنے تمام کپڑے سوراخ کے منہ میں بٹھا دیئے۔

اس تہنہ خاموش چٹان پر گلیٹ کو لاتعداد اذیتیں پہنچیں، وہ تہنہ بھوک، پیاس، مشتقت اور نیند پر خنچ چکا تھا، لیکن ایک مایوس فنی چیز کا مقابلہ ابھی باقی تھا، گلیٹ کی چٹان کی چوٹی پر چڑھ گیا، اور دو دور دور نظر دوڑانے لگا، اس کے پاس کوئی لباس نہ تھا، اور وہ اس کے

پایاں سمندر کے وسط میں باطل عریاں کھڑا تھا،

ان طرفان خیز اسواج کی گونج میں چٹان اس کے نیچے پھر بے پایاں

ہوئے معلوم ہوتے تھے،

نوراد جو صرف گلیٹ کے لئے اپنی تھا، مصروف گفتگو ہوا، دو خوں کے درمیان ایک آواز سنائی دی جو انسانی ہمسے زیادہ نرم تھی، گلیٹ ایک طویل گفتگو سن رہا، اس کے بعد

”اسے جو بصورت دوشیزہ تم غریب ہو، میں آج صبح سے امیر ہوں کیا تم مجھے اپنا خاندان قبول کرو گی، میں تم سے محبت کرتا ہوں، خدا نے انسان کا دل خاموش رہنے کے لئے نہیں بنایا، اُس نے اس سے حیاتِ ابدی کا وعدہ اس لئے کیا ہے کہ یہ اکیلا نہ رہے، میرے لئے روئے زمین پر صرف ایک کائنات ہے اور وہ تم ہو، میرا ایمان خدا پر ہے اور امید تم پر،“

گلیٹ نے اس کو گفتگو کرتے ہوئے سنا، وہ اس سے محبت کرتا تھا، اُس کا سایہ راستے کی پٹری پر پڑ رہا تھا، پھر اُس نے اسی آدمی کو کہتے ہوئے سنا ”دوشیزہ تم خاموش رہو میں تمہارے جواب کا منتظر ہوں“

”میری آواز خدا میں چلا ہے“ ڈراوچیٹ نے جواب دیا۔ پھر آگے بڑھی، اب پٹری پر دو لڑائی لڑ رہے تھے، دو لڑائی لڑنے لگے، گلیٹ نے دو لڑائی کے کس کو ہم آغوش ہوتے ہوئے دیکھا۔

اچانک دوسرے صبح پکارا شور سنائی دیا، ”مدو، مدو“ ساتھ ہی بندرگاہ کی گھنٹی بجنے لگی۔

یہ لیتھری تھا، اس نے ڈورینٹ کے نفل کو ساحل پر دیکھ لیا تھا، اس کے نظارے نے اُسے خوشی سے دیوانہ بنا دیا تھا، اور وہ مدو مدو پکارتا ہوا باہر بھاگ آیا، ایک دم وہ ٹھہر گیا، اُس نے ایک آدمی کو ابھی گھاٹ سے فرزند ہوا دیکھا، یہ گلیٹ تھا، لیتھری ایک کراؤں سے ہلکی ہو گیا، اور ہوا کرتے ہوئے بردیز کے ذریعے میں کمرے میں پہنچ کر بیٹھ گیا۔

”مجھے یقین دلادو کہ میں ڈوان تو نہیں،“ وہ کہتا جاتا تھا۔ یہ صبح نہیں ہو سکتا۔ آج کل ایک ایک پن سلامت ہے، یہ کس قدر عجیب ہے، اب صرف تیل دینے کی ضرورت ہے، تم میرے عزیز دیکھو ہوا ہوا دیکھو، تم سمندر کے وسط میں اپنی جان پر کھیل کر میرے عزیز ترین جہاز کو چٹاؤں سے سلامتی کے ساتھ واپس لے آئے، میں نے اپنی زندگی میں کتنی عجیب واقعات دیکھے لیکن اتنا عجیب واقعہ کبھی نہیں دیکھا۔

گلیٹ نے کھن کی بیٹی اور مین کا ڈچس میں مین ہزار پونڈ سے بھری کو پیش کر دیا، دوبارہ لیتھری بجز حیرت میں غرق تھا۔ ”کیا کسی نے گلیٹ کا سا شریف آدمی دیکھا ہے؟“ اس نے کہا۔ میں خاک میں مل گیا تھا اور ہاتھیں باہر پھیل چکا تھا، تم نے میری حالت کو دوبارہ سنبھال دیا، ہاں تو عزیز کیا تمہیں یاد ہے کہ کتنی ڈراوچیٹ سے شادی کرنا ہے،

گلیٹ ڈراوچیٹ سے اپنی کڑواہٹ کر کھڑا ہو گیا، اس نے ہنایت دیکھی لیکن صاف آواز میں کہا ”نہیں“ لیتھری چونک اٹھا۔ ”کیسے نہیں؟“

”میں اس سے محبت نہیں کرتا“

لیتھری نے اس کے خیال پر نفرت آمیز قہقہہ مارا، وہ خوشی سے دیوانہ ہو رہا تھا، گلیٹ اور صرف گلیٹ ہی ڈراوچیٹ سے شادی کرے گا۔

اب ہمسائے بھی گھنٹی کی آواز سن سکا کھن ہو گئے تھے، تمام کمرہ ہل گیا تھا، اب ڈراوچیٹ بھی کمرے میں داخل ہوئی، لیتھری نے اُسے دیکھا اور ہجوم میں اسے خبر سنائی۔ ”ہم دوبارہ امیر ہیں، اور تم اس بیاہر سے شادی کرو گی، جس کے سر پر کاسیانی کا سہرا لہرا رہا ہے۔“ اس کی نظریں ایک دوسرے آدمی پر پڑیں، جو ڈراوچیٹ کے پیچھے پیچھے کمرے میں داخل ہوا، یہ وہی نوجوان پادری تھا، جس کو گلیٹ نے سمندر کے وسط میں چٹان سے بچا تھا،

”کیا آپ بھی یہاں ہیں“ بوڑھے لیتھری نے کہا۔ ”آپ ان دو لڑائی لڑنے کے پڑے دیکھیں“ اس نے ڈراوچیٹ اور گلیٹ کی طرف اشارہ کیا،

گلیٹ کا چہرہ اس وقت ڈراوچیٹ سے معلوم ہو رہا تھا، وہ ابھی تک انہیں چیتھروں میں بیٹھوں تھا، جن کے ساتھ وہ ڈورینٹ کی چٹانوں سے چلا تھا، اب کتنی گھنٹیاں گزرتی ہوئی دیکھا، پریشان بال، خون آلود آنکھیں۔ اس کے بچہ پر جاسکا نامور، اس کے خزانوں اور زخموں سے بھرے ہوئے ہاتھ۔

الغرض وہ ایک عجیب حالت میں تھا، ”یہی میرا داماد ہے“ لیتھری نے چلا کر کہا۔ اس نے سمندر کے ساتھ کھن سے مقابلہ کیا ہے، وہ چیتھروں میں بیٹھ ہے، اس کے شانے اتر رہا تھا قابلِ تعلق ہیں، یہ ایک بہت بڑا انسان ہے؟

لیکن گلیٹ لیتھری کی آنکھ چھا کر کمرے سے باہر نکل چکا تھا، اس نے

لگے، اُس نے محسوس کیا کہ پانی اُس کی کمرنگ پیچ گیا ہے۔  
چاند ستارہ زور دہتا گیا،

چٹان کے گرد جہاں گلیٹ میٹھا ہوا تھا، کوئی جھاگ دھتا، اُس کے  
اطراف کوئی شوریہ موج نہیں لگراتی تھی، پانی نہایت سکون سے چڑھ رہا  
تھا، اب یہ گلیٹ کے شاؤن تک آچکا تھا۔

پچھتے ہوئے پرندے اس کے سر پر پھر پڑا رہے تھے، اب صرف  
اس کا سر پانی سے باہر رہ گیا تھا۔

طوفان اپنے پوسے زور پر تھا، شام قریب آ رہی تھی، گلیٹ کی  
آنکھیں شفق کی جانب جہاز چربی ہوئی تھیں، اس سکوت میں غم خیز گہرائیاں  
تھیں، ان میں مایوس امیدوں کی تلکین تھی، اُس پر ایک خاموشی، لیکن نرم  
طریق سے اپنے انجام کو قبول کرنے کا جذبہ، جو اُس کی امیدوں کے بالکل  
برعکس تھا، طاری ہو گیا۔

رفتہ رفتہ شام کی ہلکی غلت پھیلنے لگی، لیکن گلیٹ کی آنکھیں اسی طوفان  
جی ہوئی تھیں، رفتہ رفتہ شام کی دلیوی نے آنکھیں موند لیں، اور سند کی  
چڑھتی ہوئی تند موجوں نے گلیٹ کی آنکھوں کو بند کر دیا۔

عین اس وقت جب جہاز نکلا ہوں سے اوجھل ہوا، گلیٹ کا سر غائب  
ہو گیا، اب سطح آب پر پانی کے علاوہ کچھ نظر نہیں آتا تھا۔

(منظر)

خود را در وحیٹ اور پادری کی شادی کا انتظام کیا اور ان کے سفر کے لئے  
ایک جہاز میں انتظام کیا، جو گلیٹ کو روانہ ہو رہا تھا،

یہ تمام انتظام کر کے گلیٹ نے مسند میں اسی چٹان کی راہ لی، اور وہاں  
انتظار میں بیٹھ گیا، تاکہ جب سے جہاز کو غلط نوا دیکھے، یہاں تک کہ وہ جلد نظر  
سے بعید ہو جائے،

جہاز نہایت مست رفتار سے نکلا، گلیٹ نے اُسے دیکھا، اس کے  
جسم پر کچھ طاری ہو گئی، اس نے سر جھکا لیا، سندر چڑھ رہا تھا، اور پانی اُس کے  
پاؤں تک آچکا تھا۔

اُس نے نگاہیں جھکا لیں، پھر اوپر دیکھا، اب جہاز چٹان کے مقابل  
آچکا تھا۔ اس کے سپاہیوں سند میں نہایت خوبصورت معلوم ہوتے تھے،  
اوپر سے اوپر بادبان ایک لہو کے سارے سورج کی شعاعوں سے منور ہو گئے،  
پانی کا شور جہاز کے چلنے سے دیا وہ ہو گیا تھا۔

گلیٹ عشرہ جہاز پر زندگی کی چیل چل کا نظارہ کر رہا تھا، یہ قدر  
صاف نظر آ رہا تھا جیسے گلیٹ اسی میں سوار ہو، اُس نے عروس اور فرشتہ کو  
ایک جگہ بیٹھے ہوئے دیکھا۔ ان دو معصوم چہروں پر سادہ سی ڈھیر تھا، اور خاموشی  
میں ایک بستی سکوت محض تھا۔

جہاز گزر گیا، گلیٹ کی نگاہیں اس پر ہوئی تھیں، یہاں تک کہ بادبان  
آہستہ آہستہ دور ہوتے ہوئے شفق پر ایک سفید دھبہ کے برابر نظر آنے

دنیا کی ہر ایک شے کو چھاننا تو ہے  
تجسّس کیا نہاک زمانا تو ہے  
ہر شے سے زیادہ سچی سچی ترئیات  
موس اسی کو کچھ نہ جانا تو ہے  
(دکھنا آ رہا تھا)

لے خالق تو یہاں کچھ دیکھ چکی ہیں  
پتہ یہ لالہ زار کچھ دیکھ چکی ہیں  
غفلت سے ہے نہ جا خود اپنی ہیں  
لے موج آ رہا کچھ دیکھ چکی ہیں  
(دکھنا آ رہا تھا)

# عورتوں کی لڑائی

کوثر چاند پوری

میں نے بھلا کہا تھا، ہمیں سیدے سبھاؤ سلام کرنے کو بھی آتی تھی، مجھے کیا خبر تھی، یوں جی بھنگی ہوئی ہو،

جسے تو بھنگے ہی تو، میں کیوں جیتی، جب جلائے کو مجھے تیرا کیا ڈر پڑا ہے؟

کے کیسی لگائی، بازی نہیں آتی، ہاگل سر پہ ہی چڑھی جا رہی ہے، ہم تو بڑھاپے کا خیال کر رہے ہیں، آپ ہیں کہ آپے ہی سے باہر ہوئی جا رہی ہیں، آئی وہاں سے بھاری بڑھاپے کا خیال کرنے والی، بڑھاپے کا خیال کرتی تو مردوں میں بیٹھ کر میری صورت میں کیڑے ہی تو ڈالتی، ارے میرے منہ میں دانت نہیں رہا، آنکھوں سے پانی بہتا ہے، تو تیرے دادا کا لقمہ ہے، یہ تو اللہ کی قدرت ہے جس کو ماہے حبیب بنا دے، مگر بندے کو کسی بات پہ گھنڈ نہیں کرنا چاہیے۔

بڑا، ذرا دوسرے کی بھی سنا کر، تم تو اپنی ہی کہے جا رہی ہو، کون کہتا ہے میں نے تمہاری صورت میں کیڑے ڈالے، بلو اجڑوٹو بوسنے کی میری عادت نہیں، دیکھو، ایسے طوفان مت اٹھاؤ تم مجھ پر، کوئی سے گا گا تو کیا کہے گا، میرے جی جن میں منگوے گا کہ ضرور اس نے بڑا کو کچھ کہا ہوگا، اس گھر میں رہتے رہتے میرے بال سفید ہو گئے، آج تک کوئی کہہ تو دے، میں نے کس پر طوفان اٹھائے ہیں، کس پر ہمت لگائی ہے، اکیلی تھی تو رہتی ہو، مجھ میں کوئی اور تو رہتا ہی نہیں، ایک تم پر ہی طوفان توڑ رہی ہوں میں!

بوسلام! سکینہ نے اپنے کونٹے کی دیوار سے سر نکال کر وحید کو مخاطب کر کے کہا جو مکان کے صحن میں بیٹھی چرخ کات رہی تھی، اس نے اپنی سفید، سفید بھونٹیں نکیر کر کے رونق نکالیں سے اوپر کو دیکھا، اور بے رخی سے کہا، پڑے خاک ایسے سلام ہے!

کیا ہوا ہوا، آج کیوں منہ نہ کھائے بیٹھی ہو؟ چل پڑے، لہجی بن، آئی وہاں سے لو کہ لا ڈلی۔ بڑا کیا ہو گیا نہیں، کیوں تمہارے سر پر سنبھرا ہے آج؟ سنبھرا ہوا ہے تیرے سر پر، دیکھ سکینہ میرے منہ مت لگیو! بڑا کیا باؤ لے گئے نے کٹ کٹ کھا یا تمہیں، جو کٹ کھانے کو دوڑتی پڑتی ہو،

لگتی کٹ کٹے، تیرے پیادوں کو، اللہ نہ کرے جو مجھے کٹے باؤ لائے!

بڑا، دیکھو میرے پیادوں کا نام لیا تو چٹیا کی خبر نہیں، ذرا منہ سنبھال کر بات کرو، منہ دیکھنا ہے جو تیری دہلی بسی بہتی ہو، تیرا دیا لگاتی ہو، مجھ پر تیرا کیا دباؤ ہے، جو میں سنبھالوں نہ کو،

دیکھ سکینہ منہ میں لو کا دیدوں گی، جو میرے بوز سے چونڈے کا نام لیا!

بواہارا تو دماغ چل گیا ہے، زبردستی جب جلائے کو بیٹھ گئیں،

سکینہ اندر تیرا گھوڑا بندھا رکھے، بچی: بے مہر کی کیا خطا ہے، مجھ سے تو عیب کسی نے کہہ دیا، میں نے یقین کر لیا، میں آپ تو مجھ سننے لگی نہیں تھی، مجھ کی خبر کو بڑو دھوین کا قصد تھا، میں تو یہی سمجھی کہ تو مجھ کو کہہ رہی ہو گی، سکینہ میری اول کو قاتل سے گواہی دے رہا تھا کہ زمین آسمان ٹل جائے اپنی جاگ سے، مگر سکینہ میرے لئے ایسے بول منہ سے نہیں نکال سکتی، اور انہیں باتوں کی بدولت تو رات دن تیرے لئے دعائیں نکالتی رہتی ہیں، میرے بدن کے رومیں روئیں سے!

مگر بڑا اتنے کچھے کان بھی کس کام کے آج تو یہ بڑا لڑکھو اور کچھ کہہ دیا، کسی نے تم سے، تو میں کیا بگاڑوں گی، اس کا یا ہتا رہا۔ یوں کہنے سے کہہ ہوتا ہے سکینہ! ایسی میں بالکل مہر کی عورت ہاں ہوں، جو ہر کسی کے کہنے سے یقین کر لوں گی، اب اے اتنی بات تو کہنے والے نے بھی جھوٹی نہیں کہی، کسی کا ذکر تو تھا، تم خود ہی کہتی ہو، بڑو دھوین کو کہہ رہی تھیں، ہاں اتنی بات اور بڑھ گئی، کہ اس کی جگہ میرا نام لے دیا۔

یہی تو کڑوت ہیں بڑو دشمنوں کے میں بھاری ہنسی جان کی قسم کھا کر کہتی ہوں بڑو دھوین کو کہہ رہی تھی، بتیں کیا معلوم نہیں اس کی صورت دیکھ دو صبح صبح تو روٹی نہیں ملتی، سارے دن بھوکا رہنا پڑتا ہے، بھائی خدا کی قسم میں نے تو جس روز اس مردار کی صورت دیکھی، مجھے سو رنج ڈوبنے تک چین نصیب ہوا نہیں،

کیا کہہ رہی ہو سکینہ، بڑو دھوین کا دم نہ ہوتا تو جھینک جھینک کر مچ جاتیں تم، یہ میں ہی تھی کہ جب ناگئیں پھیلنے لگیں ہر پڑی تھیں تم اور کوئی پانی پلانے والا بھی پاس نہ تھا تو اپنے بچوں کو کھانا چھوڑ کر بھاری پٹی نیچے آ بیٹھی تھی، پیر میں نے وہاں سے بھاری منہ ہاتھ میں لے دھوا لیا، روٹی میں نے پکا کے کھلائی سارے کنبہ کو، اور آج تم کہتی ہو بڑو دھوین ہے، اس کی صورت دیکھنے سے روٹی نہیں ملتی، وہ دن بھول گئیں کیا جب بڑو کے سوا انہیں کوئی پوچھنے والا بھی نہ تھا، سچ کہا ہے کسی نے سچ کر اور کنوئیں میں ڈال!

سکینہ بڑو کو دیکھتے ہی چونک گئی، اس کے بدن میں کاٹو تو بڑو کی بوند بنیں۔ اسے سان گان بھی نہ تھا کہ بڑو دیوار کے نیچے کھڑی

اور دل کی میں کیا جانوں بڑو، میں تو اپنی کہتی ہوں، خدا اپنا دلیل اور محمد کی شفاعت نصیب کرے، جو میں نے کسی کے سامنے نہیں کچھ کہا ہوا! خدا کے خوف سے ڈر سکینہ!

اب اس کا تو کوئی علاج ہی نہیں کہ آج ہوئی بات کو تم میرے سر سے چھوڑ دو، کوئی بیچ میں ہو تو اس کا نام لو، میں اولاد کی قسم دے کر پوچھوں کس کے آگے کہا میں نے بڑو کو بڑا بھلا!

سکینہ یوں باتوں میں مت ڈراؤ مجھے، میں نے دھوپ میں یہ بال سینہ نہیں کئے۔

باقی نے دھوپ میں سینہ کئے بڑوں بال یا سایہ میں، مجھے اُن سے واسطہ نہیں میں تو یہ کہتی ہوں تم اس ہندی کا نام بتاؤ، جس کے سننے میں نے ہمیں بڑا بھلا کہا، جب جھوٹ سچ کھلے گا، بڑو اندر کرے میں اتنی ہی بڑی مر جاؤں، جو میں نے ایک حرف بھی زبان سے نکالا ہو۔

کس کس کا نام بتاؤ سکینہ، کوئی ڈھکی چھپی بات ہو تو میں نام بھی بتاؤں، کسی کا بھرے پیچ میں جھپکرتے اس دن تم والے گھر میں مجھے اندھا بنایا، بخوس کہا، آٹسو ڈھال کہا، تم نے کہا صبح کوئی اس کی صورت بھی نہ دیکھے جس دن میں اس کا منہ دیکھ لیتی ہوں شام تک چین نہیں ملتا، تو یہ کر بڑو تو یہ! دیکھو ایسا طوفانِ موت اٹھاؤ، اللہ جیسے پیمانہ باندھ رہی ہو، خدا جانے آسمان کس کے بجا گول کھڑا ہے۔

اچھا تم کھاؤ، تم نے نہیں کہا، بڑو ہتا رہے سر کی قسم، اپنے بچہ کی سول، جو میں نے تمہارا نام بھی لیا ہو، بڑے خاک جھوٹ بولنے والے کی صورت ہے، بچہ سے زیادہ دنیا میں مجھے اور کیا ہے؟ ہاں اتنی بات تو ہوئی تھی، بڑو، دیکھو میں کبھی بتاؤں نہیں کہ بڑو دھوین کا ذکر آگیا تھا، تو میں یوں بولی کہ اب تو اسے شہ جتنا بھی نہیں، اور منہ ہے تو جھپڑوں ڈور بست ہے جس دن سویرے ہی سویرے صورت دکھا جاتی ہے، رد ہی نصیب نہیں ہوتی، اور کچھ نہیں تو کہنا ہی ہندیا میں منہ ڈال جاتا ہے، تو اویہ بات تو ضرور میں نے ہی سچی، تمہارا تو نام بھی نہیں لیا، نہ معلوم بڑھاپے میں تمہاری عقل چرنے چلی گئی ہے کیا، پہلے بات کا انجام سوچ لیا کرو، پھر منہ سے کچھ نکالا کرو، وہ تو اچھا ہوا میں چلی آئی اس وقت، نہیں تو تمہارے دل میں یہ سیل بھرا ہی تھا۔

جیسا کہ وہی دیا سنوگی، بھلا بھی طرح سے لے کان کھول کر میں تیری برابری کی نہیں ہوں۔

زمین پے پاؤں رکھو کے چلو پاؤں میں پے:

اب کیا تیرے سر پے رکھو کے چل رہی ہوں۔

میرے سر پے تم کیا پیر رکھو گی، بھاری، چرخہ کاتے کاتے تمہاری عمر گزر گئی، ایک دن چرخہ پونی لے کے نہ بیٹھو تو اگلے دن کھانے کو روٹی نہ لے تم میرے سر پے کیا پاؤں رکھو گی؟

بھو دیکھو نہ میں لگام دے، چڑیل کہیں کی آئی وہاں سے باتیں بنا ایران تو رانی کی!

بو اعر کا خیال کرتی ہوں، سفید بالوں سے اندریاں کو بھی شرم آتی ہے نہیں تو وہ بے نقط سناتی کہ سر پر لیتیں تم اپنا۔

کھڑی تو رہ دو مارا، — پیڑھی سر پے دے ماروں گی۔

میں چونڈا لکھاڑوں گی، پیڑھی مارنے والی کا!

بابک کے جارہی ہے، چپ نہیں ہوتی، کیٹنی!

تم ہزار دفعہ کیٹنی!

سکینہ سن رہی ہو اس دھوین کی باتیں تم،

ہاں بو اسن تو رہی ہوں مگر کیا کروں، کچھ نہیں جتنا۔

وہ کیا سننے گی، ابھی تو مجھے اس کے دانے دیکھئے ہیں، تم تو ویسے

جی پنج میں ٹانگ اڑا بیٹھیں، جھنگڑا تو سیدانی سے ہو رہا تھا،

میرے کیا دانے دیکھئے گی تو چڑیل؟

سیدانی زبان سبھاؤ، نہیں تو منہ تو بچ لوں گی، بالوں میں آگ

لگا دوں گی۔

میں تیری جیٹا مونڈ لوں گی!

میں تیرے لالوں کا خون پی لوں گی!

ارے تیرے من میں لگے آگ خون پی اپنے پیادوں کا۔

سیدانی اندر کرے تو جیسی ہی ہو جا!

خدا نہ کرے مجھے تجھ جسا۔

تیرے مریں پیٹے سیدانی، مجھے نخوس کہنے والی

بھو دیکھو زبان قالو میں رکھو، کیسا تم بھر بھر کے کوس رہی ہے، ناک حرم!

کھڑی سب کچھ سن رہی ہے، وہ بہت ہی گجرائی، بڈلنے سارا قصہ اپنے کالوں سے سن لیا تھا، اب اس کی تردید ہی کیا ہو سکتی تھی، بڑا کو تو اس نے سبھا بھکا کر دیا تھا، وہ پڑانے وقتوں کی نیک دل بیوی تھیں، مگر تو باہر پھرنے والی بیاگ عورت، اس کی زبان کسی کے سامنے رکنے والی ہی نہ تھی، مگر سکینہ نے بہت کر کے کہا،

بھو کیوں آپ سے باہر ہوئی جارہی ہے، میں تو مذاق کر رہی تھی، بڑا کو مندم کیا ہو گیا تھا، ایک دم سے مجھ پر برس ہی تو پڑیں، اُن کا غصہ منڈا منڈا کر کے میں نے تیرا نام لے دیا تھا، تیرے بچہ کی قسم کوئی اور بات تو بڑی ہی تھی، پوچھ لے لو اسے میں نے کوئی گالی دی ہو سکتی تو!

گالی تم کیا دیتیں سیدانی، میں تو اچھے اچھوں کی نہیں سنتی، تم تو بھاری برس شمار قطار میں، اور گالی دینے میں تم نے کیا کسر رکھی ہے، نخوس تم نے کہا، اندھا تم نے کہا، اور کیا رہ گیا بھلا کہنے کو، سیدانی مجھے ہتھارے یہ کئی معامد نہ تھے، انہیں تو کبھی نہ سمجھتی تھی بھی نہیں، ہتھارے گھر کر کے اور اب دیکھو آگے کو رہ

بھو مندم ہو تا ہے تو سبھی کو تنگ پی کے آتی ہے، میں نے تو گھر بسی نخوس اور اندھا نہیں کہا تھے، پوچھ لے لو اسے!

آنکھوں میں انگلیاں رت کر دسیدانی، میں بہری تو بڑا نہیں، اندر رکھے میرے کان ابھی سلامت ہیں، میں یہیں بھی سب

کچھ سن رہی تھی، کوئی اور ہوتا تو اینٹ مار کے کہیں سے سر پھوڑ دیتی، اندر کی سوں! وہ تو مندم کس بات کا خیال آ گیا، اور بڑا

سے کیا پوچھ لوں، یہ تو تم سب کی کبھی بدی ہے، تم سب ایک تھیلی کے چنے بٹے ہو، پھر بڑا کا ہے کو کہیں گی؟

بھو دیکھو میں اور تم کی عورت ہوں، سکینہ ہی سے منہ ہلا جا، میرا نام لیا تو تھکات ہیں!

کس قسم کی عورت ہو تم بڑا، میرا بھلا کر لو گی، جیسا کہو گی، ویسا سنو گی، میں کب تمہاری دی ہوئی روٹی کھاتی ہوں جو دہوں گی!

دبے گی کیسے نہیں — کیڈوں کو منڈا گانے کا یہ نتیجہ ہوتا ہو — سکینہ دیکھو چارہ برابری بیٹھے بیٹھے آج پلو کا یہ حوصلہ ہو گیا کہ وہ کبھی جو

تیرے نرم لال۔

تو خدا کے لئے۔

تیرے لئے مہاگ۔

تیرا مرے خصم!

تیرا نکلے جنازہ۔

تو تیرے چوڑے دیدے۔

تیرے منہ میں نکلے کالا دانہ۔

تو خدا کے لئے اس کی جیب کتر لو!

سیدانی، قراتنی ہی بڑی مر جائے، اندھ کرے، تجھے شام ہونی نصیب

نہو، اور پورا ذالی کون ہوتی ہے جیب کترنے والی!

تو میں پیٹے کبھی جی ہوں تیرے منہ میں لگ تو!

تو میرا کیا بگاڑے گی۔

میں تیرا کھجور نکال لوں گی،

میں تیرے منہ پہ خاک ڈال دوں گی!

نکل پڑی میرے گھر سے!

ہوا دیکھو مجھے ہاتھ لگا یا تو جان کی خیر نہیں، میں تو مرنے ہی کو پھر

رہی ہوں، کل کی عمر قی آج مر جاؤں، مجھے پروا نہیں، مگر تم کچھ کچھ پھر دیکھو

دماغ بھر میں۔

ہوا اور ہوا کو ابھی کر، سکینہ دے پاؤں کوٹے سے اتر آئی، ادھار

سے کوڑوں کی زنجیر لگا دی، ستوڑی دیر تو ہوا کو کوسنی کا مٹی رہی، وہ

بھی برابر جواب دیتی رہیں، اتنے میں دن چوب گیا، اور ہوا غار کو کھڑی

ہو گئیں، انہو نے خدمت پا کر اور دیکھا تو سکینہ غائب! اُس نے غصہ میں

بائیں ہاتھ کی پتیلی پر داہنے ہاتھ کو کھرا کر کے زور سے مارا، اور دانت

کھچنے کے بولی، تیرے کھڑے تھے! تو آگ لگا کر چل دی، چڑا کہیں کی،

مجھے ہوا سے لڑا دیا، اور آپ کسک گئی۔



## آزادی تحریر

پوشیدہ ہے اس ملک کے اربابِ چشم

آزاد ہوں جذبات اگر قیدِ قسم سے

آہو کو کوئی روک نہیں سکتا ہے رُم سے

وہ خار نکل سکتا ہے بس نوکِ قدم سے

زنجیر کٹے گی یہ اسی تیغِ دو دُم سے

نام اُس کا مٹا صفحہ تاریخِ اُسم سے

افسوس کہ اب تک یہ خطرناک حقیقت

افراد کو دیوانہ بنا دیتے، میں کیسے

لاکھ اُن کو دو بائے کوئی یہ دب نہیں سکتے

جس خار سے خونبار رگِ جانِ وطن ہے

ہاں اور نہیں کوئی مداوا سے عسلا می

جس قوم سے چینی گئی آزادی تحریر

جینا ہے تو حاصل کرو آزادی تحریر

آزادی تحریر کے قبضے میں ہے شمشیر

## شاعری اور تنقید جدید

رامیش نارائن ماتھرا میلے آگرہ

کارآمد اور مفید ہوں۔ شاعری محض وہم و قیاس ہے، اور وہ خیال کے پلاؤ پکانے کے سوا کسی اور بات میں امداد نہیں کر سکتی ہے۔  
عملی زندگی میں شاعری کی تائید میں کچھ کہنا امر لازمی ہے۔ یہ اکثر کچھ جاتا ہے کہ شاعری کے مطالعے سے کیا فائدہ ہے اور وہ کیا ہے؟ لیکن جب غلط فہمیاں جو لوگوں کو اس کے بارے میں ہو گئی ہیں دور ہو جائیں گی، اور جب یہ بات نکشف ہو جائے گی کہ بہترین شاعری کیا چیز ہے اور وہ کیا کتنی ہے تو اس بات کی مطلق ضرورت باقی نہیں رہے گی، کہ اس کے پڑھنے کے فائدہ بیان کئے جائیں، حکمت پر اس کی فوقیت دکھائی جائے،  
یہ ہم کسی پس و پیش کے بغیر کہہ سکتے ہیں کہ شاعری سے ہر شخص اور ہر فرد کو کچھ پسین ہو سکتی، لیکن بہتر قوی امید ہے کہ ہم غفلانہ تنقید سے شاعری کے حدود بڑھا سکتے ہیں، اور اس کے دامنِ عاطفت سے لوگوں کی ایک کثیر تعداد کو مستفیض کر سکتے ہیں، افلاطون نے جب شعر کے خلاف الزام عاید کیا اور ان کو اپنی مخصوص جمہوریت میں داخل ہونے سے محروم رکھا تو اس کوئی ایسا فیصلہ نہیں کیا تھا، جس کے خلاف کوئی اپیل نہ ہو سکتی ہو۔ اگر شاعری کی مدد واری میں ہی مصنفانہ دلائل پیش کی جائیں تو پھر اس کو حلاوتی سے واپس ہونے کی اجازت مل جاتی، اور اس کا خوشی سے استقبال کیا جاتا، چنانچہ حضرت افلاطون خود فرماتے ہیں اور شاعری کی تائید کرنے والوں میں سے جو خوشامیمن ہیں، لیکن شاعری کے شدید باغی ہیں، میں خیال کرتا ہوں،

”شاعری اور تنقید سے عامۃً انسان کو کوئی تعلق نہیں، یہ صرف بیکاروں کا مشغلہ ہے، جو اپنے خلوت خانے میں لکھتے اور پڑھتے ہیں، اس طرح پوپ نے شاعری و تنقید کے تعلق سے یہ کہتے ہوئے اس بات کا احساس کیا تھا کہ شاعری و تنقید کا ذوق محض چند نفیس یا فہم بیکار لوگوں کی مختصر جامعیت تک محدود ہے، لوگوں کا بالکل یہی خیال آج بھی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ لوگ شاعری کے اہل مقصد و ماہریت کو کہ وہ حقیقت میں کیا ہے، اور ہمارے لئے کیا کر سکتی ہے غلط سمجھتے ہوئے ہیں، نقادوں نے سمجھانے کی ہر چند کوشش کی، لیکن لغافی سے مطلب کو خط کر دیا، نتیجہ یہ ہوا کہ تنقیدوں سے لوگوں کا یہ اعتقاد ہو گیا کہ شاعری معنوی لطافت و دلآویزی کا دوسرا نام ہے، وہ محض تنقید اور اطاعت فن کا نتیجہ ہے اور تفسیح اوقات ہے، اس میں پاک و لطیف جذبات کا سراہر فقدان نظر آتا ہے، اس میں تعسف و تکلف، دور انداز تشبیہات و مریض سازئی ہے اس کا زندگی سے کچھ تعلق نہیں ہے، آتش کیا شاعر اس خیال پر صادق آتا ہے،  
کھینچ دیتا ہے شہید شاعر کا خاکہ خیال عقل کی رنگیں کام آس پر کرتی ہے پروان کا جنبش الفاظ جڑنے سے جس کے کم نہیں شاعری بھی کام ہے آتش مریض ساز کا بہت سے لوگوں کے نزدیک حکمت اور شاعری میں یہ فرق ہے کہ حکمت میں امر حقیقی کا انکشاف ہوتا ہے۔ برعکس اس کے شاعری میں خیالی تمکات سے بحث ہوتی ہے، حکمت ان امور پر دلالت کرتی ہے جو زندگی میں

ان کو اختیار ہے کہ وہ شاعری کی بابت نہیں لکھیں، اور یہ بات ثابت کریں کہ شاعری خوشگوار ہی نہیں بلکہ اوسرسلطنت اور انسانیت کے لئے مفید ہے، اگر یہ مسئلہ ہو جائے تو ہم کو دو گنا فائدہ ہوگا کہ شاعری مفید بھی ہے اور فرحت بخش بھی ہے۔

اس زمانے میں لفظ کا بھی یہی فرض ہے۔ اس کو دکھانا ہے کہ شاعری زندگی کے لئے فرحت افزا ہی نہیں بلکہ مفید بھی ہے۔  
ہمارا شاعری پر اسی وجہ سے اعتقاد ہے کہ دنیا کی شاعری میں بڑے بڑے حکماء و عقلاء نے اپنے پاکیزہ خیالات کا اظہار کیا ہے اور شاعری کو زندگی سے تعلق ہے۔

شاعری زندگی سے وابستہ ہے، روشن لوگوں نے شاعری میں اخلاقی پہلو کو بڑی اہمیت دی تھی، اس یقین و ائٹن پر کہ شاعری میں یہ قوت موجود ہے، کردہ انسان کو شائستہ بنائے، اس کے اخلاق کو درست اور اس کو نیک امور کے لئے آمادہ کرے، روشن لوگوں نے اس کو اپنا ذریعہ تعلیم بنا یا تھا، ان کے بیاں تعلیم کا اہم مقصد شعرا کے کلام کا مطالعہ تھا، شعرا لوگوں کو بہادر اور دلیر بناتے تھے، اُن کو خطیب اور مقرر بناتے تھے، اور اُن کو موزونیت بخشتے تھے، ہورس کا قول ہے "شاعر کے کی ناکمل اور کثرت وہ زبان کو سوزاتا ہے، اور اس کے کالان کو دہیات سے محفوظ رکھتا ہے۔ اس کو زندگی کے راز سکھاتا ہے، اس کے دل کے سانچے کو ڈھانچا ہے، اُس کے ناپاکیزہ خیالات کی اصلاح کرتا ہے، اسے عنوانِ شباب میں کارنامہ عظیم مسماںاتا ہے، اور اعلیٰ شائیں پوش کرتا ہے، جس سے اُس کی انگلیں مکمل جاتی ہیں۔

نشاۃ ثانیہ کے لوگ بھی شاعری کے اخلاقی پہلو سے بہت متاثر ہوئے۔ اس زمانے کے لوگ خیال کرتے تھے کہ لوگوں کو بہتر بنانے کے لئے سب سے قوی تر شاعری ہے، اسی خیال سے متاثر ہو کر سدھنی نے لکھا ہے اسی کو مد نظر رکھتے ہوئے بن چوئن نے وعظ مسماںایا ہے، اور یہی شے قلن میں ہے جو ہنشاوی کی اخلاقی پہلو کو بہت زیادہ اہمیت دیتی ہے۔

اطلاہویں صدی کے شعرا کا مزاج اور لفظ نظر مختلف تھا، اور وہ دنیاوی تھا، تاہم اس دور کے شعرا بھی شاعری کا اہم ترین مقصد زندگی کو شائستہ کرنا اور اخلاق اور سیرت کی تعلیم دینا سمجھتے تھے، یہی عقیدہ انیسویں

صدی کے رومانٹک کے درشن سے آتا ہے۔ ہم بازن کو ناصح کبھی خیال نہیں کرتے، لیکن وہ بھی یہی کہتا ہے "بہترین شاعری اخلاقی ہے، کیونکہ اخلاقی امور سب ایشیا سے اعلیٰ تر ہیں۔"

یہاں کہ ایک بڑے صفت کا فرض نصیحت کرنا نہیں ہے، البتہ از قیاس بات ہے، شعرا و دلائل میں وہ حقیقت سائل زندگی کا انکشاف ہوتا ہے۔ شاعری میں جذبات کا جو اظہار کیا جاتا ہے تو وہ جذبات زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہیں، جس سے ہماری اخلاق کا گہرا تعلق ہے، اس لئے وہ لفظ جو اخلاق اور شاعری میں ایک خدنا صل قائم کرنا چاہتے ہیں، سخت غلطی پر ہیں۔

اخلاق انسان کا اہم ترین قابل غور مسئلہ ہے۔ ہم اس بات کا احساس کرتے ہیں کہ بذات خود اخلاق بے لطف و ناخوشگوار چیز ہے، اور ہم اخلاقی دلائل سے اور بھی خوف اس لئے ہوتے ہیں کہ ہمارے مذہبی اعتقادات میں بھی فرق آگیا ہے، اس لئے شاعری کی نہایت ضرورت ہے کہ وہ ان ناخوشگوار چیزوں کی جذہب اور نفس سے تعبیر کی جاتی ہیں، قائم مقام بنے۔

اپنے موضوع کی تائید میں کہ فن لطیف اور شاعری تعبیر حیات ہے، میں شاعری، ڈرامہ اور فن مصوری و مصماں کے گزشتہ تجربہ بات کے متعلق ظاہر کرنا چاہتا ہوں۔

کسی ملک میں کوئی مشہور زمانہ فن لطیف یا صنف شاعری کا لے لیجے، اور آپ کو واضح ہو جائے گا کہ شاعری کا مقصد زندگی کے نکات اور رموز کا انکشاف کرنا ہے، فن لطیف شیع حیات کا کام دیتا ہے، فن لفظی یا شاعری میں جو حسن ہے بذات خود وہی معنی و ہل ہے، اگر وہ کسی خیال یا دلی آرزو یا داغی کیفیت کا اظہار نہیں کرتا ہے۔

قدیم یونان اور قدیم ہند میں فن لفظی کا کوئی شاعر نہیں ہے، جو اس زمانے کے لوگوں کے عقائد اور دلی جذبات اور احساسات کا اظہار نہ کرتا ہو۔ قدیم ہندوستان، یا قدیم یونان کا کوئی ڈرامہ یا شاعرانہ کام نہیں ہے جو اس دور کے طرز زندگی اور سماجی کی حالت کا بلیغ نقشہ نہ کھینچتا ہو، اس پرین بادشہوں کے نفسانی کش پادوں سے اُس زمانہ کی صبح رفتار کا اندازہ ہو جاتا ہے، سانچہ اور امر و حق کی لفظی اور مصوری

ہم کو بدھ مت کی زندگی سے آگاہ کرتی ہے۔

خواہ آپ بھارت کا ذکر کریں، یا کالی داس کے بڑے ڈراموں پر غور کریں، یا یونانی ٹریجڈی یا دائمیات ٹیکسٹس ڈرامہ یا مغل سلطنت کی معنوی کا، یا گیتا دور کی بہترین لطیف نقاشی کا، یا شمالی ہند کے بادشاہوں کی قدیم موسیقی کا، یہ سب کے سب زندگی کے مختلف پہلوؤں پر دلالت کرتے ہیں۔  
اسم لے شاعری کا زندگی سے گہرا تعلق ہے، وہ زندگی کے مختلف

اعمال پر نظر عمیق ڈالتی ہے، ہم کو زندگی کا مقصد سمجھاتی ہے، اور ہماری زندگی کو فحش بخش بنا دیتی ہے، شاعری تعبیرات ہے۔ بہترین شاعری وہی ہے جو واقعیت و اصلیت پر مبنی ہو، ایسی شاعری جو بظاہر دلاویز ہے، لیکن زندگی سے قطعی تعلق نہیں رکھتی، چند روزہ ہے، اور ایسی شاعری ہرگز قبول عام کا شرف حاصل نہیں کر سکتی۔ بہترین شاعری وہی ہے جو زندگی سے تعلق رکھتی ہے، وہ دائمیات ہے اور دلچسپ ہے، اور مقبول عام رہے گی۔

## اے کاش

بیابان خطائیں ہیں، افسردہ مزاریں ہیں مقبول دُعائیں ہیں، مجبور قضائیں ہیں  
بیتاب و فائیں ہیں، شرمندہ جفائیں ہیں، غمخوار ادائیں ہیں، سرشار نوائیں ہیں  
پُر کیف صدائیں ہیں، بدست فضائیں ہیں، گلپاش ہوائیں ہیں، مے بار گھنائیں ہیں

اے کاش کہ ایسے میں اک لمحہ کو آ جاؤ

اس دُحوم سے گلشن میں کچھ موسم گھل آیا ہر ذرہ بے حس پر اک جوش منو چھایا  
پتوں نے جو بل کر اک گیت نیا گایا لی سبزے نے انگریزی، بکلیوں کو کبھی ہٹو لیا

اے کاش کہ دم بھر کو ایسے میں تم آ جاؤ

کاندھے پہ لے بادل سامان بہار آیا ہر قطرہ لیے دل میں طوفان بہار آیا  
ہر لہو نہ رکھے سر پر بستان بہار آیا پڑھتا ہوا ہر تپہ فشر آن بہار آیا  
ہر غنچے کے ہونٹوں پر غنوان بہار آیا ہر پھول لے دل میں عرفان بہار آیا

اے کاش کہ تم خود بھی اک مدد چھپاؤ

# حُبِ وطن اور مُسلمان!

غرف، اور اس حد کا تنگ اے حامیِ دین نہیں حیف اے نا آشنائے رحمتہ للعالمین؛  
 اختلافِ مذہب و ملت پہ، اور اتنا جلال؛ بھائیوں کے خونِ ناحق کو سمجھتا ہے حلال؛  
 حیف اے دیوار کے پابند، اے دُر کے اسیر اپنے جہرگے، اپنے گنبد، اپنے منبر کے اسیر؛  
 دل پہ تیرے نقش ہے وہ فلسفہ اویان کا کاٹتا ہے رشتہ جو انسان سے انسان کا؛  
 چھین لیتا ہے جو لطفِ باہمی کے قہقہے قلوب میں پھینکانے لگتے ہیں جس سے اڑو ہے؛  
 مجلسِ اخلاق کے جذبے کو شکر ااتا ہے جو آدمی کو آدمی کا گوشت کھلواتا ہے جو؛  
 مجھ سے کیا کرتا ہے ہندو کے تعصب کا گلہ؟ مجھ سے کیوں کہتا ہے ہندو کی جفا کا ماجرا؟  
 تنگ فکر و تنگ اماں، تنگ ظرف و تنگ حبب مان بھی لوں میں کہ ہندو عیب ہے، اور زندہ عیب؛  
 فرض بھی کر لوں کہ ہندو، ہند کی رسوائی ہے لیکن اس کو کیا کروں، پھر سچی وہ میرا بھائی ہے؛  
 مرد اگر ہوں بھائیوں کا خون پی سکتا نہیں! بھائیوں کا خون اگر پی لوں تو جی سکتا نہیں!  
 باز آیا میں تو ایسے مذہبی طاعون سے بھائیوں کا ہاتھ تر ہو بھائیوں کے خون سے؛  
 سُبحہ و زُمار کی لہروں ہی پر بہتا ہے تو اور اس تنگی پہ مجھ کو کم نظر کہتا ہے تو؟

تیری ہستی تنگنائے کُفر و ایماں کے لئے میں بنا ہوں آب و رنگِ نوحِ انساں کے لئے  
گو سنجی ہیں قصرِ آفاقی میں آوازیں مری کُفر و ایماں سے بہت بالا ہیں پروازی مری  
لیکن اس کے ساتھ ہی اے مُبتلائے کُفر و دیں دولتِ حُبِ وطن کو چھوڑنا ممکن نہیں!  
حصہ ہے سب سے مقدم زندگی میں خوشی کا خویش سے بچ جائے تو پھر مال ہے درویش کا  
سعی کرنا چاہیے پہلے تو گھر کے واسطے گھر سے فرصت ہو تو پھر نوحِ بشر کے واسطے  
تیرے لب پر ہے عراق و شام و مصر و روم و چین لیکن اپنے ہی وطن کے نام سے واقف نہیں!  
کون کہتا ہے زمین و آسماں تیرا نہیں! کُل جہاں تیرا، مگر ہندوستان تیرا نہیں؟  
مردِ حق کو تعزیرِ باطل سے اُبھرنا چاہیے کعبہ حُبِ وطن میں سجدہ کرنا چاہئے!

سب سے پہلے مردِ ہندوستان کے واسطے

ہند جاگ اُٹھے تو پھر سارے جہاں کے واسطے

جوشِ ملیح آبادی

## خسر و کافیشان

من قبہ راستِ کرم بر طرفِ کجلا ہے  
کل رات کو اس شہر نے دل پر ایک وجد کی سی کیفیت پیدا کر دی، اور  
اُس کیفیت سے ذیل کا شعر پیدا کر دیا۔ ملاحظہ ہو۔  
ایں کمنہ راند اندھرس کد پیشِ عاشق  
صد شربتِ دو عالم، ایک فرصتِ نکاح ہے!

جوش

بیان کیا جاتا ہے کہ حضرت محبوب الہی ایک روز باکی ٹوپی پہنے بیٹھے  
نے کہ خسر و آگئے۔ حضرت محبوب الہی نے یہ شعر پڑھا۔ ج  
ہر دینِ راستِ راستہ، ہر قومِ قیدِ گناہ ہے!  
یہ شعر سننے ہی خسر و نے اپنے پیر پر نظر جما کر فوراً یہ دوسرا شعر  
پڑھا۔ ط

# مادرِ ہمدردی

انجیل امرتسر

ماں تو اغیار کی آماجگاہ

تیری مقدس سرزمین انجیل کے لئے ایک مسلسل قمارخانہ

باہر کے لوگ تیری دولت پر ڈاکہ زن

----- ہندب! جہاز تیرے پسے کو چرتے پھریں  
ماں تجھ پر یہ عالم دہ زخ ----- تو ابرو دباختہ، شائستہ قوموں کی

نظروں میں۔

تیرا جن پر خمزدہ پھول کی پتیوں کی طرح ----- یہ سب کیوں  
ہمیری تیرے بہوت، تیرے نام لیاؤں کے باہمی نفاق کی وجہ سے،

ماں، تیرے یہ فک بوس پہاڑ، تہاں بل فخر حکایات کے آئینہ دار

رب العزت سے دست بدعا میں،

تیرے یہ ترم ریز دریا پتھروں سے سر نہیکے ہیں۔

یہ وسیع میدان سوگوار، یہ شاہ داب مرغزار خزاں دیدہ

پر مونا اٹھنے والی زمین زلزلہ بدوش

یہ کیوں ----- ماں! ----- مجھ کو ----- ناقابل معافی گناہ

بوڑھی ماں۔ تیری آنکھیں شکار - ٹور رہی ہے،

ہم تجھے اپنا رہے ہیں، اپنا کر چھوڑیں گے،

تیرے غلامی سے طوٹ دامن داغدار نہ رہنے دیں گے،

یہ غلام آباد و گوداؤں سے ہماری ہوگی

تب یہ ہمارا دیش ایک نئی دنیا ہوگا، ماں

باہمی افزائش سے کوسوں دور، استحا و کاسم مرکز

اور ہم تیرے بہوت ایک دوسرے سے ہم کنار  
گنگا جمنائے سنگم کی طرح

# محبت

با وحید

رات زیادہ گزر چکی تھی، مگر میں جاگ رہا تھا، کمرے میں بیٹھے تیل  
کا چراغ روشن تھا، اس کی ہلکی ہلکی روشنی میرے کمرے کو سوز کر رہی تھی،  
میرا دل محبت کے جذبات سے لبریز تھا، مگر میں محبت کی حقیقت کو جاننا  
چاہتا تھا، غور کرتے کرتے میرا دماغ جکڑانے لگا، میں نہیں جانتا تھا کہ  
میں ان جذبات کو اپنے دل سے کیونکر دور کر دوں، میں نے کوشش کی  
مگر ناکام رہا۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا، مجھے پیاس معلوم ہو رہی تھی، حلق میں کانٹے  
پڑ گئے تھے، میں نے تنویر پانی پیا اور پھر لیٹ گیا۔

ہوا قدر سے تیز ہو چکی تھی، رات کی بریاں رقص میں مغمویں، میرے  
کانوں میں کبھی کبھی ہوا کے گنگرہوں کی آواز بھی آ جاتی تھی۔۔۔۔۔ تارے ایک  
دوسرے کے شانے پر سر رکھے میٹھی نیند سو رہے تھے، کہ یکایک ٹنڈی  
ہوا کے جھونکے نے چراغ گل کر دیا۔۔۔۔۔

چراغ گل ہوتے ہی کیا دکھتا ہوں کہ میرا دل حقیقت محبت سے  
جگمگا رہا ہے،۔۔۔۔۔ سچ ہے حقائق تاریکی ہی میں روشن ہو سکتے ہیں۔

قلعہ

وہل کی راتوں میں اب اٹل سے آج بیا

جس کے عہد زلزلوں کا گریہ صبح میں

جیسے اکثر تندیوں کو ٹپکتے دشت چوشت  
کائنات میں اتنی جگہ کی توجہ بارش کی صدا  
(پیش)

# زقارِ وقت!

## منبرِ سیاست کے فتوے کفر!

پچھلے پچھلے فلسفہ آور (پہلے) کے اک پہلک جلسے میں اک لگی مولوی نذیر نے مولانا ابوالکلام آزاد کے متعلق فرمایا کہ وہ کانگریس لڑاؤ میں، ہندو پرست ہیں اور خود کو کفر! —

بدتم گفٹی و خورسند، عفاک اللہ کو گفٹی!

کیا مولانا ابوالکلام کی باغ و نظر حکمت اسلامی، اور زرف نگاہ تدبیر سیاسی کی ہی داوید تھی؟ کیا چونکہ مولانا آزاد نے ٹنک و جود مسلم لیگ کی مغلانہ زار نامی اور شرمناک ذہول کاری کو سرہائے استحقار سے ٹھکرا دیا، اس لئے وہ (نمود باللہ من ذلک) کافر قرار پائے؟! ہیں مسلم لیگ کے دارالافتاء کا معیار تفسیر اور اصل الاصول کفر و ایمان بھی طرح معلوم ہے! یعنی غلط

ہر کوئی خراست کافر شیعہ بخواند!

ہم اپنے سامعہ تنخیل میں غلام الشان ابوالکلام کی زبانِ قادِ احلام کا یہ اعلان اذغان گوش زد ہوتا ہوا محسوس کرتے ہیں:

کفر چہ ہے؟ گزات آسان نشود! حکم تراذایان من، ایماں نشود! و درہر چہ من یکے، آں ہر کافر! پس درود و جہاں یکے سماں نشود!

(۱-۱-خ)

## جنرل نیل کا مجسمہ عبرت!

جنرل نیل، جو غدرِ شمشیر کے ملک برطانوی ہیرہ تھے، کانگریسی

## احسن عقلمند

دو برس پہلے تک ماؤنٹ روڈ، مدراس، کی اک عام گزرگاہ اور نمایاں نظر گاہ پر گویا اہل شہر کی جمہاتی پرسورہ تھے، اب خیر سے اُن کی ہسٹنگی نقش "گورستانِ عجائب خانہ میں منتقل ہو گئی ہے، جہاں اُن کی ہشتاد سالہ روشناسی کو چند بازارِ اب تاقیامت اک گوشہ گمنامی کی حیا زہ کش بنے گی! —

بس کن ذکرِ مذاکرہ دیدہ اور نگار! جنہیں تباہ قیصرِ وطن گلاہ گئے! جنگی خود نمائی، سیاسی اشتہار بازی، اور قوم پرستانہ لکھنؤ کے اور جتنے مظاہر و مناظر، خدا کی پاک زمین کو ہنوز یاد نہ کر رہے ہیں، غالباً ایک مزید عشرہ سنین کے اندر، جنرل نیل کے بُت کی طرح، ٹھک پھری میں پہنچ جانے والے ہیں، انسانی بزم و انجمن چیزوں کا چند روزہ نمود و نمائش کے بعد اس انداز سے اک سوختہ پتھر پتھر میں خاکستر ہو جائیگا کی دیدنی عبرت ہے! اللہ اللہ، جنرل نیل کا گراؤ نیل جرنیلی پیکر، اور آثارِ تقدیر کے قبرستان میں اک گوشہ ٹھک کا در یوزہ گر؟! —

دیکھنا اسے اہل عبرت! انتقام آگیا! بننے میں جام گدا خاک بر سرِ نفوذ! (۱-۱-خ)

## کانفرنسِ عجائب خانہ خجانت!

کانفرنسِ عجائب خانہ خجانت ہند کا اجلاس دہلی، گزشتہ شہر، بامباک قابل ذکر واقعہ ہے، کانفرنسِ مذکورہ کا سابق اجتماع یا دس بجیر ایکسٹری صمدی، دھرتی میں مقام مدراس محل میں آیا تھا! ایک پورے قرن



موسٹریٹ پارٹی کی منتظر موقع موجودگی میں کانگریسی عاقلین وزارت  
د حکومت سے برطانوی قیامت کا بلکاڑاک خوریز انقلاب کی دعوت کے  
ہم معنی ہوگا؛ یادش بخیر ٹائمز آف انڈیا جو کانگریسی وزراء کے فضائل و  
منقب میں یوں رطب لسان ہے، وہ اس قدر لیب علی نہیں ہے جس  
قدر کہ لیغی العادیہ" اسے

گرچہ ہوں دیوانہ، پر کیوں دومت کا کھاؤں فریب  
آستین میں دشمن پہناں، ہاتھ میں خنجر کھلا!

(۱-۱-۱۲)

## پریزیڈینٹ کا دورہ آسام

پنڈت جواہر لال نہرو، صدر انڈین نیشنل کانگریس نے گزشتہ ماہ  
ہندوستان کے منہائے مشرق و شمال کے گوشہ آسام کا دورہ کیا۔ کانگریس  
کے اس صدر نے اپنی سابقہ دوسالہ صدارت کے دوران میں کانگریس ہند  
کے اندر معلوم صدر نشینی زیادہ کی ہے، یا پر غم ہند کے میدان و کوہستان  
میں گرداوری زیادہ؛ کانگریس نے صرف چند روز کے لئے جواہر لال کو اپنی  
مسند صدارت کی عزت بخشی، لیکن خود جواہر لال کی فراہم صفت کو کنبیوں  
اور قیس مثال صحرا گردیوں نے اس مسند کو اک ابدی شرفین غلٹہ و طلت  
بنادیا؛ آج وسیع و عریض ہندوستان کے دشت و دژ کا چہ چہ جواہر لال  
کے دانا گردش کُن قدموں کے کس سے گونج رہا ہے!

سہمی بہرہ پر نشان قیس نشان کو بہن  
عشقی نے آباد کر ڈالے ہیں دشت کو بس

اس پر زکبدن، لیکن عقیدتہ، روئیں تن، مرد جوان کے اس رین  
آسمان کے قلعے لانے کی کوئی مدد ہے، ہمارا یقین ہے کہ اگر مستقبل قریب  
میں کوئی ایسا ایشیائین کا خواب باور قیسم ہوا تو اس کی سرکردگی و  
کارمدان سالاری بھی ہمارا جواہر لال اپنی ہی جاکستھی و سبک پائی سے  
انجام دے لے گا جس سے اس نے کبھی شہر آباد کی پیشین گوئی پر لپڈ نشین  
کے کاروبار کی سربراہی کی تھی؛ اسے

نکاح رو پرواسے رُوح غلبتہ و اریں  
بہوش باش کر بزوان شکار ہیں ہم لوگ!

سربایہ داروں کے مابین؛ از جوان گروہ کا شکوہ و شبہ یہ ہے کہ قدرت  
از ان بزرگان کانگریس، ہندوستانی جنگِ حریت کو دوسرے خطہ جنگ  
تک تباہ و بربستہ دینا اپنے ذوقِ رجعت کے لئے کچھ دیا وہ خوشگوار نہیں پاتے؛  
اس طرح اٹھارہ کچھ صلح نظر ہے وہ برطانوی خداوندوں اور ہندوستانی  
”بندگانِ عالی“ کے درمیان اک انتقامی اقتدار سے زیادہ نہیں بھرتا؛ اپنی  
فطری ماہیت کے تقاضے سے یہ ہمارا ان فریقین کے درمیان، شرکتِ بال  
فینت، کا بن جاتے ہے؛ در آئینہ لیکہ ہندوستانی قوم کا سوا و عظم  
کا شنگار ان و مزدوران و عام عزا و سائین — خارج البلد  
ہو جاتا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا بخت ہندوستان موت و آقاؤں کے  
مبادے کے لئے لڑتا ہے؛ اگر نتیجہ یہی اور اتنی ہی تھی تو اس کے معنی نہ صرف  
یہ ہونے کے اسی خلقِ اللہ کے کچھ ہاتھ نہ آیا، بلکہ اس نے دوسروں کی تاج  
پوشی کے لئے، شکارِ الجہری بن کر، یہ سارا عرق ریز اور خون سوز مجاہدہ  
عظیم انجام دیا! اسے

کٹ مرنا داں خیالی دیوتاؤں کے لئے  
شکر کی لذت میں تو لٹاؤ گیا نقدِ حیات!

تاہم میں متفیل کے مقدرات سے یہ خوف نہیں؛ انقلاب، عوام  
کے لئے آتا ہے، نہ خواص کے لئے؛ مانسوں کی طوفانی بارشوں کو اگر اُمرار  
اپنے صحنِ قانا کے حوضوں میں مقید کرنا چاہیں گے تو صرف اپنے ان تنگ  
ظرفِ ابدار خلائق کو دریا بڑو کریں گے؛ مناسب یہی ہوگا کہ ہمارے عمر  
رسیدہ و جہانیدہ اکابر کانگریس، نہاجتی کے خط و خال کی شکنیں اپنی  
”جبین دولت“ پر زیادہ نہ بنائیں؛ اور ملک کی ملن الاحترام و تہذیب  
(Civiltization) کو وطن کے بیرونی معرکے سے پہلے دعوت  
نہیں؛

”موسٹریٹ پارٹی“ کو بھی دعوہ و کبیدہ خاطر ہونے کی ضرورت ہی  
در اسے اعتقاد دار باب کانگریس کو ان کے وجود کو خلی کار یا مخرب تہریر  
کئے کاموں؛ ہماری کانگریسی حزب الاشرار لیکن، بحالت موجودہ کانگریسی  
وزراء کی بہترین مقصد ہے، کانگریسی موسیقی حکومتوں کے اصلاحی و  
معاشی ہمت کے لئے ایک مسلسل تازیانہ ہے، اور ڈاکٹر گورنر زوں اور مقب  
وزیرانوں کے درمیان جھوڑو کے کاک کے خٹا آلا؛

## مطلع عالم

ڈاکٹر سید حسین نے رحیم کالج ہال، دریا کالج، دہلی میں اسٹوڈنٹس فیڈریشن (جمعیۃ الطالب) کے ذریعہ انعام اک اجتماع کی تقریب سے ۳۰ دسمبر گزشتہ کو اپنی اک برق باش تقریر پر لمحہ حال کے سیاسی مصلحتی عالم پر سیر حاصل روشنی ڈالی، ایکچر کا جمل حسب ذیل ہے:

دنیا پر جنگ و پیکار، اضطراب و عدم اعتماد کی اک مہمزمین جیاری مستوی ہو گئی ہے، جنگ عظیم (۱۹۱۴ء) کی خفی و آشکار روشنائی سے لکھے ہوئے سب کسیر فزائوس ہو گئے ہیں، انگلستان کے سابقہ چند روزہ قیام و گشت کے دوران میں یہ تحریک گیر شغریہ دیکھنے میں آیا کہ شہروں کے کچر و بازار کو ان آبادی سے تمام و کمال ویران ہو گئے ہیں، پُر امن ممالک عالم میں بھی اک نفسیاتی حالت جنگ کی فضا طاری ہے، اور ایک ایک نوخیز برو دوش شمع کیپوں سے پابرجہ ہے، اس وقت خطرے کے تین منٹے ہیں۔

(۱) اسپین۔ جہاں اسامہ دوسنا تو اک مذہبی جنگ جاری ہے، لیکن جو عہد اک بین الاقوامی و پابرجہ ہے، بلکہ اک بین الاقوامی معرکے کا سید کا رزار بنا ہوا ہے، فضا کے عالم میں اک سنگین مندی نزار و دریش ہے۔ کیونکہ ہم یا فاسٹرم؛ ایک لاکھ ایلالوسی سپاہی اسپین میں موجود ہیں، اور جرمن عساکر اس پرمسٹر آد ہیں، دوسری طرف روسی سر فر دوش آؤ آؤش جان باز اور مختلف اقوام عالم کے رضا کار جوہر یہ سپاہیانہ کے معرکہ عالم فضا و فضا پر سب سے ہیں، اک قیامت کی مہم فزائوس پابرجہ ہے، جو روز قیامت ہی کی طرح ٹولانی و فزائوس ہے۔

(۲) اٹلی، اور جرمنی، سوئیڈن، اور ہنگر بلاشبہ بڑی تیار و جہاں ہستیاں داتہ ہوئی ہیں، تاہم ان کی آمزناں اور شاہی شیشیں بڑی نازک اور ستر لزل پائی جاتی ہیں۔ چنانچہ قیصر جلیس کے خلف الصدق، سینا رینی اپنی، جیسی سارک، یہی ان شب و روز کی آفتابوں کی نذر فرما چکے ہیں، جلیل القدر ہر شہنشاہ اللہ، ارکان ہاڈی کاڈ کے حصار حراست میں رہتے ہیں اور ساری نقل و حرکت، خطرناک زمین سے بالا بلاکہ ہوائی میں بذریعہ لیاہ مل میں آیا کرتی ہے، یہ دولانی فرنگت کی آتش دہن میں

ہم حیران ہیں کہ جو آبر لال، بال ہوا پر پڑا ہے یا دوش برق پر پڑا ہے۔ وہ آج آسمان میں ہے تو کل صوبہ سرحد شمال و مغرب میں تھا، اور پرنس برتا دیا میں، وہ سچ ہمارا معتمد جہان بینی جہان گشت ہے! اسی شیش محفل، یہ سوز و گداز تین و جاں!! اور اسی شیش عالم گردش عالم، فیضی، احسن اذین عشق کہ دوران امور ز

گرم دار و روز تہنگار رسوائی را! ہمارا دعویٰ ہے کہ جہاں تین تہا مغرب کے سارے ڈاکٹر وں کو سرگرمی و گرم حامی، اضطراب و اضطراب و شکلیائی و برق دہشی کے میدان میں ہر امل پیچھے چھوڑ دیا ہے! یہ

ہم ہیں وہ گرم بردار و فاجو خورشید سائے نکات بھاگ گیا چھوڑ کے تہا ہم کو!

کانگریس پریزیڈنٹ کا مہم جو ذکر دورہ آسمان بعض معنی خیز اور انقلاب انگیز مظاہر و مناظر دکھاتا ہے، باوجود دیگر کانگریسی صوبہ ہونے کے آسمان میں ان کا استقبال کانگریسی قہر و دس سے بھی کچھ زیادہ شاندار ہوا، سر زمین ہند کے اس لیدر گشت میں ان کا خیر مقدم سچ و دہن کے ”یہ تاج کے بادشاہ کی طرح ہوا، ہمیں ربوے اسٹیشنوں، بینک تھاواں اور ان کی بجائی فروگا ہوں میں خوش آمدی“ کہنے والوں میں، بالقرین غیر سرکاری و سرکاری لوگ، ہندو مسلمان فرقہ، ہندوستانی و یوروپین طبقے، اور مرد و زن کے مہینگیں یکساں شریک تھے! یہ دو عالم لغتہاں بردست دارند ہا بازار سے کوسو سائے تو باشت!

لغت یہ ہے کہ سرکاری اسکولوں اور کالجوں کی ذہنی طور پر پرو فیشن، آبادیوں کی گنگوں میں انگلیں ڈال کے، ان سے براہ راست خطاب و کلام کرنے کی اجازت بلکہ دعوت اس مرد حق و حریت کو دی گئی، بہرہ صرف لوگوں نے اپنے چشم و گوش ان کے پیام جاں نواز اور ان کے روستے عشق خیر پر نشانہ کئے، بلکہ ان کا قدر و قوم کی تنگیوں ان کے محرابے میں دیں، آسمان کے مسلمان بھی اپنے تین من و دہن کے ساتھ اس بجم و علقہ میں شریک تھے! یہ

کشتے کہ عشق دار و نگہ اودت بدنیان

عظمت و جبروت یزدان را بسبب اعصاب دوم و الحال را بسبب  
سایم معذور و معزول انکسار کے معنی اک آؤد تا جوش بندون  
کے بنیں! یہاں اک مدائے غفلت شکن رسید کرنے کی ضرورت ہے!  
بہترین بیر و دینی الا قوامی لغتہ لب و سیاست ہی ہمارے لئے کوئی دین  
موقع نہیں ہو سکتا! شاید یہاں لبان الغیب غائب ہمارا خیر راہ ہے،  
جب کہ وہ کہتا ہے کہ

انہی سستی ہی سے ہو جو کچھ ہو! (۱-۱-خ)

## جنگ چین

فی الحال تو صینی اذواج جا پانی چنگریوں کی غبار کے سبیل بے پناہ کے  
سامنے خس و خاشاک ہو کر پہن گئی ہیں! اگرچہ اس میں بھی شک نہیں  
کہ موجودہ آذربائیجان پہلا مرقع ہے کہ جو دو سکوت کے انجون لاش چینیوں نے  
جربیت و سکوت کی شراب دوا آتش سے بدست جا پانیوں کا آنکھوں میں  
انکھیں ڈال کے متعدد معرکوں میں سانس لیا، مارشل چیانگ کا فی ٹیک  
کے روح پروردہ جو دے ناٹنگ سے نصرت ہو جانے کے بعد بھی باقیقت  
کے خضار کے قلعہ بند چینی لشکر نے مسلسل ایک ہفتے تک شانہ و روز محلہ اور  
غیرم کی آڑ و دم توڑوں اور بلائے آسمانی لیا روں کی ہر پاکی ہوئی قیامت  
میں جو آتش و خون کا غسل کیا ہے، وہ "عبدیدہ چین" کے شاندار رزمیہ کا  
عنوان بھی ہے! آئندہ کے مستقبل بھی چینی سرکار، مارشل چیانگ، اگلے اعلان  
کی رودے صینی شہر رخ جنگ کی بساط کا مجوزہ نقشہ یہ ہے کہ وہ شہروں اور  
شہنشاہن مرکزوں کے بجائے دیہات و مغلطات کے کھلے میدان میں فوجی  
جنگ کے منصوبے رکھتے ہیں۔ جبکہ جا پانی افواج وسیع منفرعہ علاقوں  
میں منتشر و منتشر ہو جائیں گی، اور اپنے خطوط و مواصلات کی حفاظت اور  
اپنے غیر گنہگار لشکر کے راب کی ہر سانی میں مخصوص ہتھیاروں سے  
دوچار ہوں گی، چینی کی "سرخ" سپاہ اسی مقصد پر خون کی اک بولی  
کھینچنے کی منتظر ہے۔

پھر جنگ چین و جاپان میں اس وقت تک متعدد سپر فوجی مداخلتوں  
کا بھی احتمال ہے! اپنے جہازوں پر حال میں جا پانی دست دراز ہی ہونے  
پر امریکی اور برطانوی حکومتوں نے جو جنگی ارنڈ ٹاٹ و ٹیکہ کو رسید کئے ہیں،

ڈائنامیٹ کے انبار لگا رہے ہیں، جنہیں مرث ایک چنگاری جہاں ناز میں مشتعل  
کر دے سکتی ہے، ذیلی طور پر مشرقی قریب کا بھی ذکر کیا جا سکتا ہے، جہاں بعد  
جنگ کے اک کمرے صینی و استبداد کو شغل و تسن نے انبیا و رسل کی جنگ  
سر زمین، نقیضین، لوگ جوش زن، و لگ انقیض، بنا رکھا ہے! یہ  
محلہ ڈار آتش و روزن ہمارا دل سبھی  
فشتہ شور بقیہ رست کس کے آب و گل میں ہے!

(۳) چین! یہاں شاید بلا استعارہ اک قیامت گزری گم  
ہے، غیلم چین گم کرہ رغن انشہ کی ہم آہنگ تنہا جامعہ بشری ہے! چند  
لاکھ چینیوں کے مقتول یا چند چینی علاقوں کے مفتوح ہو جانے سے یہ غفلت  
ناپید الگ رعبہ نہیں کیا جا سکتا! پس مشرقی بعیدہ کا چینی عرصہ محشر غائب  
ذلت دراز تاک لالہ زار بنا رہے گا! جاپان کو جرح الارض کا مودی مرن  
بڑی طرح عارضی حال ہے! تاہم ستم ظریفی یہ ہے کہ  
تیغ او ہر بسرو سینہ یاراں نیست!

دوسری طرف مشرقی کا دوسرا غیلم ملک — ہندوستان —  
ہنوز برطانوی دولت بشر کے اقوام کے شاہی دندان کا محسوس ادارہ پیریزم  
کے عالم کا اسیر ہے،

یادش بخیر برطانیہ غلیبی جنگ غیلم سے قبل کے تاریخی دور میں دنیا  
کی غیلم ترین بحری، بری، دوسانی، مالی، مراعی، اور اخلاقی قوت تھی، لیکن  
مرث دو عشرات میں جو دینی انقلاب ظہور میں آ گیا ہے، اس کا  
نقشہ یہ ہے کہ انگلستان آج امریکہ کا مقروض ہے — اور اکت نادر  
مقروض! بحری قوائے جنگی کے اعتبار سے انگریزی ملکہ بحر و دولت  
امریکہ کے ساتھ ہم نشینی کی پستی انگیزہ لگ چکی ہے! پھر جنوبی امریکہ و مشرقی بعیدہ  
کی غیلم و زریز تجارت گاہیں، یا سہائے متحدہ اور جاپان کے ملک التجار  
کے نام داخل خارج ہو چکی ہیں! وادی نیل اور وادی نیلک کی کانہائے  
تجارت بھی جزو انگلستانی "فرما و تجارت" کے تیشے کی زد سے پرے نکل  
چکی ہیں! مشرقی ادنیٰ کے مختلف سیاسی میں برطانیہ کا زوال اقتدار و تار  
اک عبرت آموز ماجرا ہے! برطانیہ یورپ میں انگلستان غیلم کی جو ہوا خیزی  
ہوئی ہے وہ اب طشت اذہام رسوائی ہے، وہ تو خیر انجمنی اور عادیہ  
شباب یافتہ جرمن کی سبیل لگد وادی کی ہدایت کی انشہیں بننا ہوا ہے! یہ

میں برطانوی نظارت خارجہ کو بھی شریک سازش کر کے، پیرس کی بدنام  
ہیورلادیل کا وزیر معین تشکیل میں آئی تھیں! — اور جن کا نشانہ یہ تھا کہ  
اب جبکہ مال مسروقہ خانہ رہزن کو منتقل ہو گیا ہے تو پھر مقرب راہ درون  
خانہ چکا رہا!

ان چمن، حبش کی طرح نہ حقیر و ناچیز ہے، نہ منقطع و گوشہ گیر، نہ  
بے وسیلہ و سپرس، نہ محروم حکومت نیا بتی، نہ آشنائے عزم قومی، نہیں  
اس کے کہ ہم چمن کا آخری انجام دیکھیں، ہمیں بہت کچھ دیکھنا ہے! اسے  
صورت آئینہ سب کچھ دیکھو اور خاموش رہو!  
شورش امر و زمین مجھ سرود و دوش رہو!

(۱-۱-خ)

پھول مسٹی میں اگر کچھ دیر تک رہتے ہیں بند

بات میں ہوتی ہے پیدا اک منظر سی نمی

یونہیں جب کچھ دیر کرتا ہوں تصور سن کا

سانس میں ہوتی ہے خوشبو، اور آنکھوں تری

اور یہ محسوس ہوتا ہے کہ جاناں نے مجھے

بھینچ کر آغوش میں تا دیر چھوڑا ہے ابھی

(جوش)

## ضروری طبع

ہندوستان کے ہر دلعزیز رسالہ کلم دہلی کی سول کھنڈی امت میں تیار ورن  
انڈیا پبلشنگ سروس جبر و مال بازا اثر مت سر والوں کے پاس ہے۔

ان میں اپنی زور آزمائی کے لئے اک جلد جلیبے منصرف پائی جا سکتی ہے۔ آگے جا کے صفی  
پانیوں، میں اس قسم کے مزید "خونی" حوادث پیش آسکتے ہیں، اور انگریزی، امریکی  
جاپانی، مشقی تصادم کے آثار کو قریب ترک کر دے سکتے ہیں، سرزمین چمن میں اپنے  
گوناگون تجارتی و صنعتی منافع و مصالح کے تحفظ کے لئے یہ آخری تہمت ہے! یہاں  
کا لغز تر ہنوز جاپان کے صحت میں ہے، لیکن بہت جلد وہ چین کے ڈرگین کے  
معدہ چنم میں معنم ہو جائے گا! سویت روس کی قسمت آزمائی بھی شاید ان خیالات  
میرا پتہ بند ذہن کو ترک کر دے! چینی جاپانی چپاک میں اس کی انگلیاں لودہ  
توروز ادا لی سے ہیں، حال میں کثیر تعداد مزید فیادوں کی چینی کارزار  
میں ارسال، نیز ماسکو کی شہر چینی شہزادہ حکومت و سیاست کی ترتیب  
جدید — جس میں قوم کے سواد اعظم کے اعزاز و مقاصد کی رعایت اس کی  
خصوصیت خاصہ ہوگی۔ — اک مہنی خیز اقدام کے پیا سہر کی طرح سمجھ ہوتی  
ہے! چمن کے اندر روسی پیام کیم زرم کی راہ میں چینگا کا فی شک کی غالی  
قوم پرستی مرقوں سنگ راہ رہی ہے، اب بعد خرابی لب بار و موچی دلد و گان  
موسل نام کو ملت کا کک جولا نینفک تسلیم کرنے کے آمادہ ہوا ہے! شاید یہ  
روبراہی بعد از وقت ہو، تاہم یہ تاخیر علاج کا بھی نیت ہے،

ابھی تک انگلستان و فرانس، جو ارازم اور اسپن کے معلومہ حالات  
میں گرفتار رہے ہیں، روس اپنے داخلی فتنہ بیدار سے پریشان رہا ہے! نیز  
چینی واپسی کی طرف سے اک بے پروائی سے کی تہدید کی خبر گرم سے حیران! روس  
و برکن کا خط سیاسی جو آٹمانا نا کو کیونک وسعت پذیر ہو گیا ہے، اس نے  
ان تمام ایام میں سوویت روس کو لرزہ برانداز اور اس کا غلاب و خورج  
رکھا ہے! تاہم انگلستان و امریکہ کی شرکت کے بعد با سیاست اٹل  
جائے گی! اس وقت سویتی و ہٹلر کی تیس مار خانیان انشت حیرت دروہا  
رہ جائیں گی! پھر یہ بھی نامکن نہیں کہ سرخ روس کا ایک ہی آخرین چمن جاپانی  
چہرے کو فتن کر دے۔

پس کیم ابھی ختم نہیں ہوا ہے! اگرچہ جاپان کی مہنی آرزو یہی ہے!  
فتح نامک کے بعد جاپانی افواج کا سن حکم کرکشا فی نیز جوشی کی جائے  
بحیثیت وسیطہ کے فریقین کو پیش منج، ان سب باتوں میں بھی عذیر کو  
خاطر نظر آتا ہے! جرمنی، چینی، جاپانی ڈراسے میں شاید وہی "روٹی" کھینا  
جاتا ہے جو جس کے ایچ پر موسیلا واپل نے کھیا تھا، اور جس جنگ دگرگی

# نقد و نظر

## اداسی کلیم

نقد و سلی اسٹریٹ، بی بی ۹۰

یہ ایک دانشمندی کا زمانہ ادبی و اصلاحی رسالہ ہے، جو اردو زبان کے کسی قدر سنگین خط، مغربی ہند سے شائع ہوا ہے، ہمارے سامنے (بعض) ریویو اُس کا میسر نہیں ہے۔

تو یہ اس معاملے میں خوش قسمت ہے کہ اُس کو ادبی ہندوستان کی بعض خاص شخصیتوں کے مبارکباد نامے نصیب ہوئے ہیں، پھر شاعر انقلاب کا معلوم پیام نہایت، جو زیرِ نظر اشاعت کے صفحہ اول کی ذہنت ہے، بلاشبہ ایک مایہ ناز نثر ہے؛ مصنف لطیف کا عنصر اجتماعی تحریکات کے اعلیٰ خانہ میں جو ڈانس میٹ کی جھلکی اور جو دو گونہ رزم و بزم ہم نوا ہے اُس کا ترجمان دو ایک شعروں میں ملاحظہ فرمائیے:

ہاں یہ عورت ہی میں قوت ہے کہ وہ جا ہے اگر

بلین شمش سے شر پیدا ہوں، آہن سے گہرا  
رقص کرتا ہے زمانہ عورتوں کے ساز پر

کارواں چلتے ہیں اُن کے شمس آواز پر؛  
تو یہ کہ صفحات میں ایک خاص جان و جلائی کو دیکھیں یعنی محسوس ہوتی ہے۔ جو شمس صاحب کے اس شعر میں شاید جائز شاعرانہ جوش بیان سے برائے نام ہی کچھ زیادہ مبالغہ ہو گا کہ:

اس کے ہر اک حرف میں غلطی ہے ذہنی انقلاب

دوش پر اُس کے ہے روشن عصر نو کا آفتاب

جو انہی جہتِ تحریر صاحب کی مجدد کا یہ کہ شمس قابلِ ذکر ہے کہ تحویر کے تحریری حلقہ معادین میں حضرت آزاد انصاری، حضرت فرقان گورکھپوری، حضرت محمود اسرار علی، حضرت مگر مراد آبادی، حضرت سافرخانی وغیرہم

(۱) گل فروش، دہلی

پایہ تخت کے اس منصور سیاسی و ادبی ہفتہ وار پر وعدہ ہوا ہے کہ ہر گز ریویو کیا جاتا، صرف یہ نہیں کہ وہ سلی نظر ایک عین ترجمان سے جلی جانیکی طالب ہے، بلکہ گزشتہ دو تین ہفتے کے دوران میں اخبار مذکور کی نگاہ پر دیکھنی حیثیت میں ایک نہایت خوشگوار نثر لکھو میں آیا ہے جو ایک نظر ثانی کا متقاضی ہے، ہم گل فروش کے صبر و ادارت و اہتمام کو تحسیناً مبارکباد دیتے ہیں کہ انھوں نے اپنے اس قریب میں ایک معتد بہ ترقی و بہتری کی جھلکی ہی ہم سر کی ہے، ہمارے ملک کی علمی و ذہنی فضا ادبی مصافت کے لئے سازگار نہیں ہے، بس اہم بہت شکر ماحول کے علی الرغم اگر کوئی ہندوستانی رسالہ یا اخبار جن افسان و غبرِ ان جاری بھی رہے تب سب کافی داد کا مستحق ہے! اور اس پر گوارِ خشک و گرم میں ترقی و سرسبزی کے کسی نخلستان کو نشو و نما دے لینا تو ایک جوئے شیر لانے سے کم نہیں، ہم گل فروش کی تازہ نشو و نما دے، کو کچھ ایسی ہی کوہ کی کھینچتے ہیں! جناب محمود نور خان صاحب جی نے، علامہ ادارت کے "میر کا رواں" ہیں، اور گل فروش کا سرچوہ و درجہ بہترین لکھی کی کاوشوں اور عرق و زہریں کا فرہ ہے، ہم اپنے مجوزہ مفضل نقد کو اب بھی ملتی کرتے ہیں، بہت جلد گل فروش اپنے آگاہ پیشِ نبر کی صورت میں تازہ گل، کھلانے والا ہے، ہم اُس کے گلِ سخن بسباز سے اپنے دامنِ نگاہ کو اُسی وقت گل بدامن بنائیں گے؛  
یارِ ہندہ صحبت باقی؛

(۱-۱-خ)

(۲) (نام نہاد) تنویر، بی بی

چوڑا رسالہ جاتی ساز، صفحات ۱۰۰، صفحت ۱۰۰، کتابت و طباعت، دکانہ بدرجہ اوسط، لوح منصور و رنگین ست دو متن تصاویر آرٹ پریسز اور ادارت "مسرح" صاحب، چندہ پیر سالانہ - مرکب اشاعت، ہم عبدالنظر علی،

شعرا میں حضرت فطرت واسطی کا سیاب نیچرل شاعر ہیں، بشمولی نانی مرحوم پر گوری سران دل صاحب قہر، بی لے، کا مختصر مقالہ بلاشبہ ایک اجتہادی لب ولہجہ رکھتا ہے۔ تاہم شعبلی کے شاعرانہ مرتبے کے متعلق ان کا تقریر محض نظر ہے، اسی طرح مولانا حسین احمد صاحب کی ایک فرضی سیاسی قلم بازی پر شکم عارف صاحب کا احتساب ایک نیم حکیمانہ تنقید ہے۔ دیا مدہ بہنیں ہوتا: "مانشہ شیخ المہذبہ ممکن شہدہ دواہد سے بالترک زبردست مجاہد حق اور مجتہد فکر واقع ہوئے ہیں، عارف صاحب کو ذرا بہتر معرفت حقیقت کا ثبوت دینے کی ضرورت تھی؛ (۱-۱-خ)

### (۵) ہندوستان (مفتاد وار)

اداسہ اخباری ساز، ۱۶ صفحہ فضا، کاغذ و عام گٹ اٹ وغیرہ پاکیزہ، چندہ سالانہ سے دفتر ہندوستان، پیل روڈ، لاہور ہندوستان ایک جدید الاشاعت سیاسی و سماجی پرچم ہے، اس کا مخاطب غریب و عوام الناس کا طبقہ معلوم ہوتا ہے، تاہم وہ ایک عام مطالعہ کا بھی ہر دل عزیز سیاسی ارگن کہا جاسکتا ہے؛ اعلیٰ ادارت اور حلقہ مصنفین نگاران کی اکثریت، یونپ کے سہم کا مگر میں اور مسلم سوشلزم میں، جن کے سامعین اصولاً و عموماً مسلمان غریب و محروم ہیں؛ ہندوستان یونپ میں کا مگر سیاسی تحریک کو بار بار قیام رابطہ عوام مسلمین کا ممبر رہا ہے؛ اپنی زبان و بیان، انتخاب موضوعات، اخذ و تخیس اخبار و معلومات وغیرہ کے اعتبار سے وہ اپنے منصوبے میں کامیاب ہوتا نظر آتا ہے؛ خدا بخشیں گناہ؛ زیر نظر خبر میں شکیں حسن جذبہ کی نظم، دلی عید اشترائی ادب کا اچھا پارہ ہے؛ (۱-۱-خ)

### (۶) کاروان پنہ

مضامات مہم صفحات، کاغذ و کتابت و طباعت خاصی خوب۔

چندہ عہ سالانہ، پتہ: کاروان، گڈ پتہ، دفتر کاروان، بانکی پور۔ پنہ کاروان ایک خاصا کمزور پنہ بالائین ماہ نامہ معلوم ہوتا ہے؛ محضوں نویسی یا فاضلہ

نگاروں میں خواب ایک مسلم صاحب، خواب عبدالباقی صاحب، بی لے (ماجھی) اور پنا آخر قادی بی لے (آرن) قابل ذکر ہیں؛ کاروان کا یہ بین اختیاری نہر ہے؛ تاہم انقباط کی ایک حسن نفسانہ نظم راہ کش کی اس میں اشاعت، کاروان کے طرز

ماہ اول کو لے کرنے کا ایک ایسا طعن ہے جو نہ لکھ آشتی راہ و بہ منزل کا کئی

ایسے خواص و اکابر اجماع سے شریک ہیں؛ خود شہر تہنہ کی اندر تہنہ وہاں کے بہترین ادبی فکر کاروں کی قریات کو حاصل کرنے میں کامیاب ہوا ہے؛ چنانچہ حضرت شریف جناب عبدالحق صاحب دیا رکھی، اور جناب ہرمو خان شہنا، مالہ کوٹلی کے علمی و ادبی مقالے متاثر جزیں ہیں، خود سحر صاحب کی "مفتاد وار" نگار شریف ایک ادبی سرچھی کی برقی دم نشتر کاریاں ہوتی ہیں؛ "تاب مدیر" کے ترجمے اور شذریے، رنگ و روشنی کے دلچسپ مرکب واقع ہوئے ہیں؛ ہم حیرت و کج خیر مقدم پوری گنجش سے کرتے ہیں، اور اس کی درازی عمر کے لئے دعا گو ہیں؛ (۱-۱-خ)

### (۳) پیما، میرٹھ

درمیان کمالی قیامت، کاغذ و کتابت و طباعت پاکیزہ، مختار صفحات، متن متعدد و تراکٹ پیپر، چندہ سالانہ۔۔۔۔۔ شائع شدہ ادبی مرکز، میرٹھ۔

جناب مہتاب کی براہ راست ادارت میں، اور حضرت ساغر کی سیاسی سادشتیں، بادشہ سحر پیما، اکبر آباد کا سابق، پیما، اب ادبی مرکز، میرٹھ کی رہم رمدان کے اندر دوبارہ گردش میں آیا ہے، پیما پر بیت کی گردش میں، لیکن اس کا دور جاری، اور سرشار شعر و ادب ساغر کا صحافتی شریک، ہمیشہ یہی دور کرتا رہا کشت

حب تک پس چل سکے ساغر، ہے؛ ساغر کی مسرتیان مہتاب کے ہاتھ میں دو آتشہ کی شرارتوں کے نثار رکھی ہیں؛ پیما کے شذرائی جرعات اور پیما، ان سیکہ کی خرابات دور اول سے سبھی کچھ زیادہ شرابور ہے؛ یعنی "چھینے" تو پسوں میں نہا ہی دیتے ہیں؛ تاہم حضرت "سیاب" کو اب زیادہ مایوسی ہے اب بنانے سے کیا فائدہ؟ پیما کا شری حقہ بھی عمومی ادبیات کے تمام معرکوں و متداول شیعوں پر مشتمل ہوتا ہے، یہاں ہر رنگ و بو، اور ذائقہ و لذت و دوزن پائے ہیں؛ (۱-۱-خ)

### (۴) شہکار گورکھپور

مقامت، صفحات، کاغذ و کتابت و طباعت، درجہ دوم کی، ستورو رنگین نوع، متنوش مرتبہ سابق اسامین ادب شہکار، چندہ سے سالانہ، شہکار کا مہتمم رشید راہ ہے، اس کے محضوں نگار، کم و بیش بلا استثناء ایک مسئلہ پایہ ادبی رکھتے ہیں، اور موضوعات تحریر بھی عموماً اہم و توجہ پائے جاتیں؛

حسین بن جاناکس قدر آسان ہو گیا ہے

# میسور صندل سوپ

یہ چہرے کے رنگ کو تروتازگی، نرمی اور صحت آمیز رنگینی بخشتا ہے، اس کے مسامات میں اُتر جانے والے بالائی کے سے مالامال جھاگ

چہرے کی جلد کو تمام آلودگیوں سے پاک کر دیتے ہیں، کیونکہ میو

صندل سوپ میو کے شہرہ آفاق روغن کی آمیزش ہوتی ہے، اور یہی وجہ ہے کہ تمام حسین و جمیل خواتین میو صندل سوپ کا استعمال کرتی ہیں، اس لئے کہ اُنھیں یہ یقین معلوم ہو چکا ہے کہ یہ صابون اُن کے حسن و جمال کو برقرار رکھ سکتا ہے۔

میسور صندل سوپ ہر دوکاندار سے مل سکتا ہے  
گوئرنمنٹ سوپ فیکٹری ننگلو

# عروسی

یہ ایک نہایت کامیاب علاج ہے جو بعد روغن عروس کے ترتیب دیا گیا، مگر اس تہار میں صرف اتنا ہی اشارہ کافی ہے کہ مردوں کے تمام مخفی شکایات کا ہر موزم میں واحد علاج ہے، مخصوص اذکار و رفتہ فائدہ اُٹھائیں، اس لئے کہ ارنٹن تجربہ ہے، اس کے ساتھ چار چیزیں نرمی، نہایتی، بھلیدی، لعلی، اور دہراہ ہیں، جن کی تفصیل اور ترکیب استعمال حیدر پر ظاہر کی جاتی ہے، ایک سبب عروسی کا ہنہ بھر کو کافی ہوتا ہے، جس کی قیمت صرف ایک روپیہ بندرہ آئے ہے مگر یہ علاوہ معمول ڈاک، اکثر تین ہفتہ کا استعمال صحت کے لئے کافی ہوتا ہے۔

صاحب فرمائش نام و پتہ صاف اور خوش خط تحریر فرمائیں

المشہد  
شفاف خانہ رضویہ چاندنی محل دہلی

# آم کے آم گٹھلیوں کے دام

مر لیں کی شفا یابی کے لئے یہ نایاب رعایت رکھی ہے کہ ایک مرتبہ دوائی خانہ کی صداقت اور آرم بانٹھی، اس کا استعمال فرمائیں، مشک آمنت کے خود پوید نکھلار گوبید، محافظ حکم، حیات اللعالم، دافع خارش، تریاق جربان، انٹی بائیو، بستی مار، قاتل سوزاک، سفید آسمان، اکریتسل، دکن چیل، زوال، سعال، حین پوست، مشائی خضاب، موت، لڑا سیر معدل، دافع دورا، اکیر، ورس، ہجائے چشم معدل، جلاؤ نزلہ، رستی طلا، اور ایک عدد دوائی پاک دلی پختی قیمت صرف تین روپے علاوہ معمول

بصورت عدم شفا یابی، دوبارہ مفت کی جائیگی، گھڑی نہ خریدنے کی صورت میں قیمت ادویہ صرف عکس ہوگی، اور دوبارہ مفت نہ ملے گی۔

مینجر سیکل دوائی خانہ شمالی ضلع مظفرنگر

# شاعر کی راتیں

شاعر انقلاب نے چند راتوں کی مختلف کیفیتوں کو اپنے خاص وجد و آفرین اور کیفیت اور انداز میں بیان کیا ہے، جنہیں بڑے محکمہ شخص اپنے آپ کو اسی ماحول میں محسوس کر سکتا ہے۔ راتوں کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

|                  |              |                   |               |
|------------------|--------------|-------------------|---------------|
| سب سے پہلی رات   | برسات رات    | راز و دنیا کی رات | انفکار کی رات |
| اندھیری رات      | چاندنی رات   | جوانی کی رات      | تصورات کی رات |
| انفکات کی رات    | جدائی کی رات | اشکوں کی رات      | برسات کی رات  |
| دلہا کی رات      | خجندی کی رات | سرش رات           | سبکی ہوئی رات |
| تصورات کی رات    | بہمن رات     | پہلی ناگ کی رات   |               |
| قیمت صرف آٹھ آنے |              |                   |               |

کلیم بک ڈیو جینیٹنی نو اس نمبر ۴۔ دریا گنج، دہلی

## پیغمبر اسلام

خدا جو دو جہاں سرور کائنات آنحضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت اور رسالت پر شاعر انقلاب جو شمس آبادی کا وہ غیر فانی شہ پارہ جس کی رعیت و غفلت کے سامنے قہر کفر سرنگوں ہوتا ہے۔ ثبوت پیغمبری کے باب میں اس فانی شاہکار کے انوکھے استدلال مدلی تیر کی طرح آفریقہ جیسے جاتے ہیں اس کے انہی اہمات سے دماغ میں بزدلی اور سرایت کر جاتا ہے۔ اس کے دلائل قانع کے سامنے اور ادراک منطقی جھانٹنا معمول جاتا ہے۔ شاعر انقلاب پر جب ایک سرشاریت کا عالم طاری ہوا اسی وقت انھوں نے یہ نظم کہنا شروع کر دی، عالم، خود ہی میں چار روز کی ریاضت شاد اور کیسی قلب سے جو کچھ جاہل ہمارے وہی صوفی خفا سے پرستار کیا گیا۔ جب تک یہ نظم مکمل نہ ہوئی حضرت جوش نے کچھ کچھ بانہ پا اور خلوت سے باہر تشریف لائے قیمت صرف ۴۔

کلیم بک ڈیو جینیٹنی نو اس نمبر ۴۔ دریا گنج، دہلی

شاعر انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی

## چار پرانی تینصا

حضرت جوش نے ایک مدت ہوئی بار چھوٹے چھوٹے رسائل ملے کر لکھے تھے، لیکن ان کی شاعرانہ بنیاد نے اس کی اجازت نہ دی کہ انھیں شائع کر کے انفاق سے یہ چیزیں میری نگاہ سے گزر سکیں تو سب معلوم ہوا کہ ان کی قیمت غیر معمولی طور پر کم کر کے انھیں شائع کرنے کے ہاتھوں تک پہنچا دیا جائے۔

۱) جذبات فطرت { حضرت جوش کی وہ مسکرا کر انظم ہے جس میں مظاہر قدرت کی قدرت کی طرف سے شاعرانہ اردو کی قدرت میں یہ اہل کی گئی ہے کہ وہ بھائی روشن کو ترک کر دیں قیمت ۳۔ رعایتی ۲۔

۲) اوراق سحر کا مجموعہ ہے جس میں سحر خیزی کے محاسن بہت لطیف پیرایہ میں بیان کئے گئے ہیں قیمت ۴۔ رعایتی ۳۔

۳) آوازہ حق { مدیم المثال، ہیر اور جنگ حق و باطل کے رتبے بڑے سادہ حسین ابن علیؑ کی طنز ناطق اور صبر و استقلال کا ایک عظیم الشان مرقع اور آپ کی اخلاقی اور روحانی تعلیم کا ایک ہنایت درخشاں آئینہ ہے قیمت ۵۔ رعایتی ۳۔

۴) محاللات زریں { ادبی لطائف کا دلچسپ اور کارآمد مجموعہ ہے، قیمت ۱۱۔ رعایتی ۴۔

پورے سٹاک کی رعایتی قیمت ۱۰۔ محصول ڈاک ۳۔ روپی، پیٹنگلنے کی زحمت نہ فرمائیں۔ بلکہ ڈاک کے ٹکٹ بھیج کر طلب کریں۔

صلیہ کا پتہ

کلیم بک ڈیو جینیٹنی نو اس نمبر ۴۔ دریا گنج، دہلی

اور دوسرائے کی دنیا میں ایک نئے دور کا آغاز

## رسالہ ساربان لاہور

## ہمالیوں

۱۔ ہمالیوں - اتنا پابند وقت ہے کہ جنوری ۱۹۳۲ء سے لے کر جب یہ جاری ہو اسکا آج تک کبھی اس کی اشاعت میں ایک دن کی تاخیر بھی واقع نہیں ہوئی اور دو صفحات میں اس سے قبل ایسی باقاعدگی کی مثال نہیں مل سکتی۔

۲۔ ہمالیوں - آریئل جیٹس مینل محمد شاہدین صاحب ہمالیوں مرحوم جیٹس ہمالیوں پنجاب کی یادگار کے طور پر ایک متعلیٰ سرمایہ سے جاری ہے، اس لئے اس کے قاری بھی وضو سن کو برقرار رکھنے کے لئے کسی قسم کی کاروباری مصیبت مد نظر نہیں رکھی جاتی۔

۳۔ ہمالیوں - کا اخلاقی معیار اس قدر بلند ہے کہ ملک کا کوئی ادبی رسالہ اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اس میں شش ہفت روزہ، عوامی و تعادیر اور مغرب اخلاق مضامین اور نظموں کے لئے خلق گنجائش نہیں۔ یہ رسالہ بلا خطر خاتم کے ہمالیوں میں دیا جاسکتا ہے۔

۴۔ ہمالیوں - کی ادارت جناب سہیل بشیر احمد صاحب لی لے (اکسن) پیر پٹر ایٹ لا کے قابل ہمتوں میں ہے اس کی ترتیب میں مضامین کے بعض بلند معیار ہی کا خیال نہیں رکھا جاتا، بلکہ تنوع کا بھی اتنا خیال رکھا جاتا ہے کہ ہمالیوں کا ہر پرچہ مختلف قسم کے مذاق کے لوگوں کے لئے کھلا ہو جاتا ہے۔

۵۔ ہمالیوں - کے مضامین بعض نثر پر مبنی ہوتے ہیں بعض جگہ انتہا درجے کے دلچسپ بھی ہوتے ہیں۔ اس لحاظ سے ہمالیوں آپ اپنی نظیر ہے۔

۶۔ ہمالیوں - محبت زبان کے لحاظ سے صرف پنجاب بلکہ ہندوستان بھر کے سب سے ترین رسائل کی صف اول میں شمار ہوتا ہے۔

۷۔ ہمالیوں - میں بھی وادی تاریخی و ادبی مضامین، دلکش افسانے اور ڈرامے یا کچھ ناولیں اور ادبی مقالے، مشرقی و مغربی رسائل کے دلچسپ اقتباسات اور ملک کی موجودہ ادبی تحریکات کے متعلق ہنر پرست قلم کاروں کی جاتی ہیں۔

۸۔ ہمالیوں - ملک کے محکمہ ہائے تعلیم کی طرف سے منظور شدہ ہے، اور ہندوستان اور بیرون ہندوستان میں بے انتہا مقبول ہے۔

۹۔ ہمالیوں - کے کاغذ کتابت، لطافت اور تصاویر وغیرہ پر دل کھول کر درپہ عرصت کیا جاتا ہے۔

۱۰۔ ہمالیوں - کے ساگر و فہر اور دیگر خاص نمبروں کے لئے کوئی زائد قیمت نہیں لی جاتی۔

خفاکار - منیجر رسالہ ہمالیوں لاہور

چند سالہ پانچ روپے چھپنے آئے شش ماہی عین روپے، مع محصول ہے

رسالہ ساربان اردو میں ایک بلند پایہ ماہوار رسالہ ہے۔

جس میں ذہنی اصلاح و تہذیب کے مد نظر سے نئے امور و نظموں اور علمی مقالہ کے علاوہ انسانی زندگی سے تعلق رکھنے والے مسائل پر زبردست

فضا میں لکھے جاتے ہیں، ان وجوہات کی بنا پر ملک جبراً اور شاہر

قوم نے ساربان کو اردو رسائل کی دنیا میں ایک نئے دور کا

آغاز قرار دیا ہے۔ رسالہ ساربان میں عشق، غم، غریب یا ایک مضمون

وغیرہ کی تصاویر قطعاً شامل نہیں کی جاتی۔

چند سالہ تین روپے، نمونے کیلئے ہر کے ٹکٹ آنا ضروری نہیں

منیجر رسالہ ساربان لاہور

# ادبی دنیا

ملک بھر کے جادو نگار ادیبوں اور شعرا کے بہترین افکار — مشرق و مغرب کے بلند ترین مصوروں کے نظر و روشاہک  
۸۲ دلاؤ پر افسانے، مضامین اور نظمیں ۸۸ ہفت رنگ و یک رنگ تصاویر

قیمت صرف ایک روپیہ چار آنے علاوہ محصول

سالانہ خریداروں کو مفت

سالانہ چندہ پانچ روپے (حصہ) مع محصول لداک

آج ہی اپنا نام خریداروں کی فہرست میں درج کروا کر یہ بے نظیر تحفہ مفت حاصل کیجئے ————— سینجر ادبی دنیا لاہور

## ناظرین رسالہ کلیم

اگر آپ ادب اور ادبی خدمت کرنا چاہتے ہیں

اگر آپ تعلیم کی خوبیوں میں خاطر خواہ اضافہ دیکھنا چاہتے ہیں

اگر آپ ملک کے بہترین شعرا اور ادباء کے حوصلے بڑھانا چاہتے ہیں

اگر آپ اسی کتب کی مزدت کو محسوس کرتے ہیں جو ملک کی مزوریات کو

کو مد نظر رکھ کر لکھی گئی ہیں

اگر آپ اپنے علمی اور ادبی ذوق کو ترقی دینا چاہتے ہیں۔

اگر آپ اردو کو ہندوستان کی واحد زبان دیکھنا چاہتے ہیں

اگر آپ ماضی اور حال کے شعرا اور ادباء کا ستارہ کرنا چاہتے ہیں

اگر آپ کثرت پر بہترین اخلاقی اور ادبی کتب خریدنا چاہتے ہیں

تو یہ سب آپ کو برابر ملے گا۔  
کلیم بک ڈپو جنیتی نواسیہ بہرہ دہانچ دہلی کو یاد رکھئے

چند دن کے استیصال سے سفید بال جڑے گئے ہو جائیں گے

## بھنگرہ میرا مل

سر اور ڈاڑھی کے بالوں کو سیاہ اور دراز کرنے، گرنے سے روکنے، چمک پیدا

کرنے، جلد سے جلد نئے بال اُگلنے اور بالوں کا انبوہ پیدا کرنے میں کامیاب

تجربہ شدہ اور منظر روغن ہے۔ خواتین کے لئے بے پناہ اور نئی چیز ہے، ہم

اپنے دھوئے کے ثبوت میں یہ عرض کریں گے کہ آزمائش کے لئے اولاً صرف ایک

مہینہ استعمال کیے لئے دیکھا جائے، اور استعمال سے قبل اپنے بالوں کی لمبائی

ناپ لی جائے، پھر چند روز کے بعد پانچ کی جائے، اتنا کافی ہے کہ ہمارا شہر

غلام ثابت نہ ہو گا، اور تحریر کے مطابق ہی خوبیاں پائی جائیں گی۔

بائیں خیال کہ ہمارا دماغ اپنا اشتہار خود ہی بن جائے فی الحال قیمت لاگ

کے برابر رکھی ہے۔ قیمت فی ادھا ۱۲ تین ادھے علاوہ ٹیکس ۵ روپے

کے لئے۔  
انڈین اسٹور، بریلی

# نقش و نگار

شاعر انقلاب حضرت جوش ملیح آباد

کی وجہ آفرین نظموں کا مجموعہ جوشمند رجہ ذیل البواب پر مشتمل ہے

(۱) نگار خانہ (۲) غمخیزیاں (۳) تاثرات (۴) مطالعہ نظر (۵) نسیم  
ہر نظم اپنی مکمل، مرتعہ اور کیفیات شعری میں ڈوبی ہوئی ہے، اور اس کے سحر کن نغمے، دل و دماغ کے لئے ایک منقش نمونہ اور روح کے لئے ایک غصہ

سور کا باعث ہوتے ہیں، لکھائی چھاپی لغتیں اور دیدہ زیب ہے

قیمت غیر مجلد ایک روپیہ آٹھ آنے۔ مجلد دو روپے (۶)

کلمہ بک ڈپو۔ جینیوا اس نمبر۔ دریا گنج، دہلی سے شگائیے

# شعلہ و شبنم

شاعر انقلاب حضرت جوش ملیح آباد

کی ہر جوش اور کیفیت اور نظموں کا مجموعہ ہے، جو آپ کو آتشکدے کی شعلہ افشانیوں، اسلامی شان و حریت کے خون کھولادینے  
والے واقعات، بادہ سر جوش کی سستیوں اور گلہ بانگ فطرت کے رُوح پر دہنوں سے لطف اندوز ہونے کا موقع دے گا،

شاعر انقلاب کا یہ لافانی شاہکار غیر مطبوعہ کلام سے مرصع ہے

کتاب مبلکہ ہے اور نہایت خوشنماگر دپوش سے آراستہ ہے

قیمت صرف تین روپے کلمہ بک ڈپو۔ جینیوا اس نمبر۔ دریا گنج، دہلی سے شگائیے

اردو زبان کا بلند پایہ وار زوال ترین ماہوار

# شیر رسالہ

ماہ اکتوبر کے پرچم میں مندرجہ ذیل مضامین ملاحظہ فرمائیں  
۱. واقعات و واردات (اساتیل حاضرہ پر پیشہ ور) (۲) ترکی تاریخ کا ایک غیر  
عرفت صفحہ (ایک نجیب تاریخی اضافہ) (۳) دو شیعہ مسلمانوں کے ایک معرکے ناول کا  
مسلل ترجمہ (۴) مشہور اسلام و دنیا کے اسلام کی بڑی بڑی شخصیتوں کے  
عجب و سبق آموز حالات زندگی (۵) سراسر دوزخ گاہ اسلام (ایک قابل فہم  
اور بھاری ہاریرہ) (۶) دنیا کے ان کو کیا ہوا (سیاسیات پر پراپک  
عجب بحث) (۷) انگلستان میں تحریک عوامی (ایک دلچسپ انگریزی ناول  
اردو ترجمہ) (۸) سلطان صلاح الدین ایوبی کی نذر (۹) ابن خلدون  
عبدالرحمن کے مشہور ترین مورخ کی سوانح حیات) (۱۰) مشہور و معروف  
نگریزوں کے ہندوستان کے متعلق متولے (۱۱) سبق (ایک نہایت ہی  
عجب اضافہ) (۱۲) حاضرہ بیت المقدس (تاریخ عروج و زوال اہم کا  
ایک درد انگیز اضافہ) (حضرت مولانا ابوالکلام آزاد کے قلم سے) (۱۳) سلطان  
زالدین دکنی (۱۴) بدوی محبت (ایک دلچسپ تاریخی مضمون) (۱۵)  
بہد حاضر و گزشتہ (۱۶) حصہ نغمہ  
شیر، براہ راست پیشہ ساز پر شائع ہوتا ہے۔ ہر سالہ صفات  
باعث و کتابت نہایت اعلیٰ، ٹائٹل ہیچ رنگین، اعلیٰ دلائی کاغذ کا  
ہوتا ہے۔

چند سالانہ صرف ایک روپیہ

نہ نہ منفعت

منیجر رسالہ شیر لاہور

# پیام سلیم

بچوں اور بچیوں کا با تصویر ماہوار رسالہ

یہ رسالہ محض بچوں کی خاطر جاری کیا گیا ہے، اس میں ان کی دلچسپی کی ہر چیز ہوتی  
ہے، اچھے اچھے اور مٹے دار قصے، کہانیاں، سفید اور دلچسپ معلومات، نکتے  
سفید، لہجہ اور بلاک کی اچھی تصویریں وغیرہ وغیرہ۔ مضمون اسے پڑھنے  
کے بعد افسوس کوئی دوسرا شغل تلاش کرنے کی ضرورت نہ ہوگی، پچھلے سال  
سے مضمون کا سلسلہ بھی شروع کیا گیا ہے۔ ان مضمونوں کو غیر معمولی قبولیت  
حاصل ہوئی ہے۔ ایک آنکھ بھی پیام برادری کے نام سے کھلی گئی ہے۔ اس  
آنکھ کے ذریعہ ان کے لئے نئے نئے دوست فراہم کرنے کا انتظام کیا جاتا  
ہے، تاکہ مکتبہ نشینوں میں وہ ایک دوسرے کی مدد کر سکیں۔ اسی خیال سے  
اس کا چندہ بھی صرف دو روپے آگے آئے رکھا گیا ہے۔ اسی چندہ  
میں سالانہ بھی دیا جاتا ہے۔ پس منکر شاید تعجب ہو کہ ہندوستان کی کوئی  
دوسری زبان اب تک پیام تعلیم (جس سالانہ نہ پیش کر سکی۔  
فوسر آخری بار بن جائے تو سالانہ مفت ملے گا، ورنہ  
۱۲ روپے بھی کرنا پڑے گا۔ سالانہ ۲۵ روپے اکتوبر کو شائع ہوگا۔

مکتبہ جامعہ۔ قریب باغ نئی دہلی

# اس کو ضرور پڑھے

خط و کتابت کرتے وقت خریداری نمبر ضرور لکھیں، اور جواب طلب امور  
کے لئے ایک آنے کے ٹکٹ ارسال فرمائیے۔ پرچہ نہ ملنے کی اطلاع ہر پچھنے  
کی دس تا دس تک آجانی چاہیے۔ ورنہ پرچہ نہیں ارسال ہوگا۔ موزن کے  
لئے سالانہ نو آنے کے ٹکٹ ارسال فرمائیے۔ منیجر علم دہلی

# شوشعر کاسٹ

جوش، جگر، اعصر، حسرت، تیر، درد، غالب، موت، و آغ  
(کے)

ایک ایک سو بہترین اشعار

ہر شخص کو ہر شاعر کا سب کلام پڑھنے اور اس کا شاعری کے شعلے رائے قائم کرنے کا موقع نہیں ملتا ہے۔ اسی خیال سے یہ سلسلہ جاری کیا گیا ہے۔ ہر کتاب میں دو درجہ جدید یا دور قدیم کے ایک مت ز شاعر کے تمام مکتوبہ اور غیر مکتوبہ کلام سے منتخب کر کے بہترین شوشعر جوئے گئے ہیں۔ ساتھ ہی سراسر احاطہ اور کلام پر مختصر تبصرہ کیا گیا ہے۔ باوجود اختلاف مذاق کے نصف سے زیادہ اشعار آپ کو اپنی پسند کے میں گئے۔

جیسا ساڑ، کاغذ، گنت، طباعت دیدہ زیب، سرورق خوشنما ہیں پر ہر شاعر کی تصویر بھی ہے۔

قیمت فی کتاب چار آنے  
منیجر کلیم بک ڈپو، حسینی نو اس نمبر ۱۰ دیان گنج پٹی

دیئے صحافت کا اہوار علی ادبی، طبعی "مکتوبہ رسالہ"

## رہنمائے صحت، لکھنؤ

نمونہ مفت

طب اور حفظ صحت کے معلومات کا خزانہ، تجربات و اسرار سینہ فنیطیات کا گنجینہ ملک کی جبری بیڑوں اور دواؤں کی زمانہ آئینہ و اوقات کی تحفہ مرقع، صنفی معلومات Science of Science جسکی امرض کے قدیم و جدید افکار کا بہترین مجموعہ جھکائے سلف کے علمی فنی کارناموں کا خوشنما المم، ملک کے شاہیر (ابن قلم کے اسافوں و ادبیات سے مستفید و نو و آرٹ کی تصاویر سے مزین، کتابت و طباعت دیدہ زیب، ہائٹل پیچ و مضرب، عمدتوں کے لئے بہترین ہدایت نامہ، بچوں کی صحت کا محافظ، ادبی ذوق رکھنے والوں کے لئے دلچسپ علمی تفریح، چند سالہ لاٹھی طہ منجر نہانے صحت و کموریر اسٹریٹ لکھنؤ سے طلب فرمائے



# کیش سنگھارا میرا نیل

بالوں کو لمبے سیاہ، نرم اور چمکدار کرنے میں لاثانی ہے، خوشبو و عمدگی میں اپنا ثانی نہیں رکھتا، ہزار نیل ہائیں امیر

سعودی عہد حکومت، نجد و حجاز سے خوشنودی کا سٹریٹکٹ حاصل کر چکا ہے۔



لاہور نمائش

کیمیکل سیکشن بلاک (ڈی) میں تشریف لاکر ملاحظہ کریں

یکماہن سنگھ موہن سنگھ گولڈ میڈلسٹ پرفیومر و کمپوں ڈیولپمنٹ (پرائیویٹ) لمیٹڈ، لاہور

ریشک منیر

پھولوں کا سینٹ  
ایک بہترین تحفہ ہے





حکومت چین کی مرکزی نگرا نی کمیٹی کا شاندار دفتر

بِنَامُ قُوَّتِ وَحَيَا

# کادھہ

۱۰

آگے گانہ جانے کب زمانہ اپنا  
قدرت بلا ہے مجھ کو صغیر حکیم  
سلا نہ چنداں؛ چھروپے  
ششماھی چنداں؛ تین روپے اکٹھا

منظور شدہ  
ڈاکٹر انعام  
ریاستہائے میو، پیٹالہ و حیدر آباد (دکن)

آگے کئی صدیوں ہے فناء اپنا  
بہروں کو سنائے جا ترانہ اپنا  
چندہ سہ ماہی، دوروپے  
قیمت فی پرچہ، نو آنے

## جلد ۱۱

بابتہ ماہ فروری ۱۳۸۸ء

| نمبر شمار | عنوان                    | مضمون نگار                            | نمبر صفحہ | نمبر شمار | عنوان                    | مضمون نگار                        | نمبر صفحہ |
|-----------|--------------------------|---------------------------------------|-----------|-----------|--------------------------|-----------------------------------|-----------|
| ۱         | اشارات                   | مدیر                                  | ۹۰        | ۱۲        | بہو (نظم)                | چشم بیک آبادی                     | ۱۳۹       |
| ۲         | وفاق ہند                 | ادارہ کلم                             | ۹۵        | ۱۳        | اے خندس آب آجا (نظم)     | جناب ذاب جعفر علی خان صاحب آرٹکری | ۱۴۰       |
| ۳         | شہ کی سیاسیات عالم       | جناب عبدالعزیز صاحب بشی بی کام        | ۹۶        | ۱۴        | پیام اقبال اور کثافت     | جناب رازی صاحب                    | ۱۴۱       |
| ۴         | مسکراؤں کے رہبر (نظم)    | جناب بشی صاحب اکبر آبادی              | ۱۱۲       | ۱۵        | اسد، الگ کتاب کثافت      | جناب کثافت صاحب                   | ۱۴۶       |
| ۵         | کاشمی انتم اور سوشلزم    | جناب پنڈت جواہر لال صاحب بہرو         | ۱۱۵       | ۱۶        | ہندوستانی قومیت          | جناب نعمانی شعلی صاحب بہرو پال    | ۱۵۳       |
| ۶         | دعس (نظم)                | جناب بشی ملک صاحب                     | ۱۲۵       | ۱۷        | آج کچھ کھایا نہیں (نظم)  | جناب رضا صاحب نقوی                | ۱۵۶       |
| ۷         | سراج داروں سے خطاب (نظم) | جناب محسن صاحب اعظم گڑھی              | ۱۲۶       | ۱۸        | گستاخ شیعان              | جناب وجہارت علی صاحب سندیلوی بیٹے | ۱۵۸       |
| ۸         | تکاش محاش                | جناب بھول چند صاحب                    | ۱۲۷       | ۱۹        | طوائف سے خطاب (نظم)      | جناب کیت صاحب تقانی امر دہری      | ۱۶۰       |
| ۹         | یاد دوست (نظم)           | جناب سائر صاحب قدوائی ایڈیٹر شہ پریمی | ۱۳۱       | ۲۰        | رقار وقت                 | ادارہ کلم                         | ۱۶۱       |
| ۱۰        | تقدیر نفس (نظم)          | جناب سراج احمد صاحب پٹنوی             | ۱۳۲       | ۲۱        | شاعر (نظم)               | جناب محمود رازی صاحب ٹکٹ          | ۱۶۶       |
| ۱۱        | انسنے کی تخلیق           | جناب سرفراز ارادہ صاحب                | ۱۳۳       | ۲۲        | یہ نلکے کے لئے ہے۔ (نظم) | چشم بیک آبادی                     | ۱۶۸       |

(جو چشم بیک آبادی پر منسلوب پبلشر نے محبوب المطابع برقی پریس دہلی میں چھپوا کر دفتر سلاطین پریس لاہور میں دہلی سے نکالیں)

# اشتراک

## سال نامہ

بعض احباب نے شکایت کی ہے کہ "یکم" کا سال نامہ کیوں نہیں نکالا گیا، حالانکہ شکایت یہ کرنا چاہئے تھی کہ سوگ نامہ کیوں نہیں نکالا گیا۔

سالنامہ نکالنے جس کا مالک آزاد، اور جس کی قوم آسودہ حال ہو — سالنامہ نہ نکالے جس کا ہر فرد اُس کے ملک اور اُس کی قوم کے لئے ایک تازہ ہنارت لانا، اور ایک نئے فتح باب کا فہرہ سناتا ہو۔

میں حیران ہوں، اور اپنی قوم کے جذبہ غیرت کی افسردگی پر شرمندہ بھی کہ ہمارے مدیر کس منہ سے سالنامہ نکالنے کا ارشاد کیا کرتے ہیں۔

اول تو سو سو سال سے ہم ہندوستانیوں کو محکومی کے علاوہ، کوئی دور کا بھی تعلق نہیں کہ ہم اُس کی پہلی جنوری کو یومِ شہن قرار دیں، —

اِس کے علاوہ ہمارے سیاسی اور اُس کے نتیجے میں اقتصادی حالات اس ہولناک حد تک تاریک اور ڈراؤنے ہیں کہ ہمیں تو روز کے موقع پر شادیاں بٹانے بجائے کہ عوض ماقم کرنا چاہیے، ماقم کرنا چاہیے اس بات کا کہ

ہم اب تک عیسوی و ذلیل ہیں۔

ان دنوں کو جس لہذا سال سے بیمار ہیں، تہواروں کے موقع پر آئندہ بہاتے بھی دیکھا جاتا ہے کہ انوس سے ساتھ رہی جی بی سی گزر گیا، اور ان ہفتوں کو جمعہ دنوں سے نامزد چھ کر رہے ہیں، ہر منسلک کے زمانے میں یہی نام کرتے دیکھا جاتا ہے کہ

اب کی بھی دن بیمار کے رو نہیں گزر گئے

## مَدِی

لیکن خدا جانے ہماری صحافتی برادری کو پہلی جنوری کو کیا دولت پیدا مل جاتی ہے کہ وہ بڑے بڑے پانوں پر سانے سے نکال کر جشن مناتے ہیں اور اپنے قلیل وسائل معاش کو بڑی طرح مجروح کر کے غلغلے سے غلغلے تر بننے چت جاتے ہیں۔

کیا تو روز کے موقع پر کسی پرانے بیمار کو کبھی یہ فخر مسرت بلند کرتے دیکھا گیا ہے کہ خدا کا شکر ہے کہ آج میرے مرض کا بار ہواں سال شروع ہوا ہے؟ اور کیا یہ ایک حقیقت تسلیم نہیں ہے کہ محکومی، دنیا کے تمام ملک امر آفرین کی ماں ہے؟ اور کیا جنوری کی ہر پہلی تاریخ یہ اعلان نہیں کرتی کہ اسے ہندوؤں

آگاہ ہو کہ ہماری غلامی کی عمریں آج ایک سال کا مزید اضافہ ہو گیا ہے؟ اور کیا اس موقع پر ہمارا جشن منانا گویا یہ الفاظ دیگر یہ اعلان کرنا نہیں ہے کہ خدا

کالا لاکھ شکر ہے کہ ہم اب تک غلامی میں گرفتار اور غلامی کی جھنجھٹوں سے بھگتا رہیں؟

جس طرح جہاں ہمیشہ بچپن کی ماں، کو تو ال کا نام سُنا کر کانپنے لگتی ہے،

باض اسی طرح جب دیکھ کر اکیسویں کی رات کو میں بستر پر دراز ہوتا ہوں تو انتہائی لہجائی کے ساتھ غور کرتا رہتا ہوں کہ کل صبح کس وقت آزاد قوموں پر

چھنے والا آفتاب مشرق سے طلوع ہوگا، تو میں کیا منہ سے کر اُس کے سامنے جاؤں گا — اسی اُدھرت میں کروٹیں لیتے لیتے جب سو، یا یوں کہنے کو چاہیے

ہو جاتا ہوں تو ایسے ایسے ڈراؤنے خواب دکھائی دیتے ہیں کہ اللہ کی پناہ — کیا دیکھتا ہوں کہ کوٹھو لنگا کے دھارے، نیلے اور سانپ کی طرح

ایک دوسرے سے گتے ہوئے ہیں، پانچ بجے، اور دھوئیاں دونوں



یہ ظاہر فرمایا ہے کہ آپ سیاست کے ایسے ماہر ہیں کہ خط میں جو وجوہ بیان کئے گئے ہیں وہ سب لغو ہیں، اور آپ نے جو رائے قائم کی ہے وہ مزدہی ماننے کے قابل ہے۔

میں اس کے جواب میں آپ سے تو نہیں، قارئین، کلیم، کی خدمت میں درخواست کروں گا کہ وہ ہر باطنی فرما کر جویریہ کے کلیم، کو خط فرمائیں جس میں دونوں خط لائے گئے ہیں، اور رائے قائم فرمائیں کہ مندرجہ بالا عبارت آراء کی کس ذمہ کے منطقی کانٹے پر تولی جا سکتی ہے، اور اسے میرے جواب سے کیا ارضی یا آسمانی تعلق ہو سکتا ہے۔

میرے مدراسی شام دوست، اگر آپ براڈ مائن تو اس مندرجہ بالا عبارت میں آپ نے جو دو علمی غلطیاں کی ہیں ان سے بھی آپ کو آگاہ کر دوں۔ آپ نے تحریر فرمایا ہے "گویا کہ" حالانکہ "گویا کہ" بعد کا فہم بیان کی ضرورت نہیں، اس کے بعد آپ نے تحریر فرمایا ہے "وجوہات" حالانکہ "وجوہات" نہیں، بلکہ "وجوہ" ہے۔

اس کے بعد آپ ہر باطنی فرما کر تحریر فرماتے ہیں کہ حضرت آپ مدہوش ہیں گاگڑس کے نشے میں اور یہ نشہ بغیر روشنی کے نہیں اتر سکتا میں اس کے متعلق اس سے دیا وہ کچھ اور عرض نہیں کروں گا کہ اس کے یہ معنی ہیں کہ آپ مجھے دھمکی دے رہے ہیں، اور دھمکیاں دینا مردوں کا شیعہ نہیں۔

پھر آپ نے تحریر فرمایا ہے "وقت آ رہا ہے انشاء اللہ تعالیٰ آپ مجھے منافق راہ راست کو تسلیم کر لیں گے" اس جملے میں آپ نے پھر مجھے دھمکیاں دی ہیں، اور اسی کے دوش بدوش، اسلام کے مقدس پیغمبر کی روش کے خلاف جو حقیقی منافقوں کے واسطے بھی منافق کا لفظ استعمال نہیں فرماتے تھے، آپ نے بے دھڑک مجھے منافق کہہ دیا ہے۔ آپ اسلام کے مدعی ہیں، اور سنت سے اس طرح گریز فرماتے ہیں، کیا یہ عبرت و حیرت کا عمل نہیں؟

آپ نے منافق کہہ کر مجھے سب سے ذلیل مسم کی گالی دی ہے، لیکن میں اس کے جواب میں آپ کی شان کے خلاف ایک حرف بھی نہ بولتا ہوں، آپ کی لفظ میں "محمد" ہوں، اور آپ اپنی نظریہ میں ہیں، ایک "محمد" اور ایک "مومن" کے معیار باخلاق کا یہ بین فرق عصر حاضر

ہونے کا لائنس مجھے دیا جا سکتا تھا، جس کے یہ معنی ہیں کہ آپ خاک کو نہایت ہی حقیر سمجھتے ہیں۔ معلوم نہیں آپ نے خاک کو کس علمی تحقیقات، یا کس روحانی مسکاشے کی بنا پر اس قدر حقیر سمجھ رکھا ہے۔

اسلامی روایات کی روش سے ہمارے جد امجد حضرت آدم بھی خاک کے پتے پتے تھے، اور اسی وجہ سے جب شیطان کو سجدہ آدم کا حکم دیا گیا تو اس نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ یہ (آدم) انہی سے بنا ہے، اور میں آگ سے، میں اس کے اثرات ہوں، اور کوئی اثر نہ، اور کوئی سجدہ نہیں کر سکتا۔

خاک کی حقارت کے متعلق آپ ہیں، اور اہل میں کس قدر وحدت خیال ہے۔ اس پر غور فرمائیے۔

اب رہی آپ کی یہ نصیحت کہ میں مغرور رہوں۔ سو میری سمجھ میں یہ بات کسی طرح نہیں آتی کہ آپ مجھے کس بنا پر مغرور تصور فرماتے ہیں۔ جو چیز آپ کے مشاہدے میں کبھی نہیں آئی ہے، آپ اسے تسلیم کیونکر کر سکتے ہیں، اور جب سرے سے کسی بات کے تسلیم کرنے ہی کا کوئی قرینہ موجود نہیں ہے تو تو اس بات کے باب میں پند و نصائح کیوں کر کھولا جا سکتا ہے؟

میرے مدراسی دوست، آپ کے اہل نصیحت آمیز و عبرت انگیز پھر سے مجھے وہ لطف حاصل ہوا جو صرف اس وقت حاصل ہوتا ہے جب شاہ صاحب "سائیں جی" جہانگاہ عذاب قراہ روست سے دھمکا دھمکا کر بھجیر خیرات وصول فرماتے ہیں۔ پیسے تو لفرہ لگایا جاتا ہے ج

"خاک کا پتہ ہے تو، کل خاک میں مل جائے گا" اور پھر "بابا مولانا کیلکے" اور آخر میں کچھ اللہ کے نام پر۔

معاف فرمائیے، آپ کا لفظ دیکھتے ہی میں خدا کا مصنون "صاحب گلی" تھا، اور اذکار ہو گیا تھا کہ اس کے کاتب صاحب کس ذہنیت کے بزرگ ہیں، چنانچہ لفظ خاک کہتے ہی جب اس عوائض کو سنا "نفرے" آپ کا دعویٰ باطل، فیصلہ کن کتب خط مدراس "پر نظر پڑی تو میرے اذانے کی پوری پوری تصدیق ہو گئی۔ اور پھر جتنا جتنا میں آپ کے مکتوب گرامی کو پڑھتا گیا۔ میرے اذانے کی تصدیق پر تصدیق ہوتی چلی گئی۔

سب سے پہلے آپ تحریر فرماتے ہیں کہ "آپ نے مدراس کا خریدار کا خط لائے فرما کر اپنے خیالات ظاہر فرمائے ہیں، گویا کہ خط لائے کر کے آپ



اور کوئی منہ نہیں رکھتا، اور اسے ترکِ محبت سے دُور کبھی کوئی تعلق نہیں۔

چونکہ تمام اعمال کی بنیاد ہوتی ہے نیت پر، اور میں جانتا ہوں کہ میری نیت بخیر ہے، اس لئے مجھے اس کا یقین ہے کہ آپ میرے اس جواب سے ہرگز کوئی بُرا اثر نہ لیں گے۔

آخر میں آپ کی آگاہی، اور اپنے ضمیر کی تسکین کی خاطر میں اس قدر اور عرض کر دینا مناسب سمجھتا ہوں کہ آپ کے لب و لہجے سے میرے شعور و شائستگی کو جو صدمہ پہنچا ہے، میں اُسے سچے دل سے معاف کرتا ہوں۔

آپ یہ خیال نہ فرمائیں کہ میں نے معاف کر کے کوئی بڑا کام انجام دیا ہے، یا نعوذ باللہ آپ پر کوئی احسان کیا ہے، بلکہ اسے یوں سمجھیں کہ میں معاف کر دینے پر مجبور تھا۔ ماحولِ دورانت کی دشمنیوں میں جکڑے ہوئے دردمندان کو معاف کر دینے کے سوا اور جادہ کار ہن کیا ہے؟

یقین فرمائیے اگر کوئی مجھ پر قاتلانہ حد بھی کرے، اور اگر میں اتفاق یا سخت جانی سے بچ جاؤں، تو اس حالت میں بھی ہنایت خندہ پیشانی سے اُسے معاف کر دوں گا، اور معاف کر دینے کے بعد یہ خیال نہیں کر دوں گا کہ میں نے غلطی پر کوئی احسان کیا ہے، یا یہ کہ میں نے کوئی معجزہ اخلاقی سرخشا ہے، بلکہ میں یہ سمجھوں گا، اور میرا یہ سمجھنا قطعی درست ہو گا کہ میں نے مجبور انسانیت کے ساتھ انصاف کیا ہے، اور انصاف سے زیادہ کچھ نہیں کیا۔

میں ہوں جناب کا نیا زمند

جوش

وہ جوش جو ہر ہدایت کے سامنے مرسلِ مخرج کر دینے کو روحِ انسانی کی سعادت سمجھتا ہے۔

کہیں لگائی کھانے پر آمادہ ہوں؟

برادرِ من، فرض کر لیجئے کہ آپ نے جو کچھ میرے متعلق لکھا ہے وہ درجِ درجہ ہے، اور میں واقعی سخت گراہ و منافق انسان ہوں۔ لیکن اُن تمام عیب کے باوجود جو میری ذات میں ہیں، پھر سب میں آپ کا بھائی ہوں۔ کیا آپ اپنے بھائی کو گالیاں دینا پسند فرماتے ہیں؟

اگر میں غلط راستے پر ہوں تو مجھے راہِ راست پر لائے، گالیوں سے نہیں، محبت سے، سختی سے نہیں نرمی سے، اور نفرت سے نہیں بلکہ دُجائی و تالیفِ قلب سے۔

آپ کے سامنے ایک ایسے شخص کی تباہک سیرت موجود ہے جس سے بہتر انسان پر آج تک آفتاب نہیں چمکا ہے، یعنی محضائے عجب کا لافانی فلسفی اور اسلام کا مقدس پیغمبر۔ وہ پیغمبر جس کی زبان اور جس کے ہات سے کسی کا فتنہ کو کبھی کوئی معمولی سا صدمہ بھی نہیں پہنچتا۔ جو دشمنوں کے واسطے دعا میں کرتا تھا، اور غاصبوں کو معاف کر دیتا تھا۔ اور جس کی مبارک ہستی صرف سکین کے واسطے نہیں، بلکہ عاقلین کے واسطے رحمت تھی۔ آپ ایک ایسے سراپا رحمتِ بے سرو کے مقلد ہوتے ہوئے یہ کیوں گوارا فرماتے ہیں کہ آپ کے کسی خیال یا فعل سے کسی کے دل کو آزار پہنچے؟

میرے بھائی، اگر میرے کسی لفظ یا جملے سے آپ کو تکلیف پہنچی ہو تو میں دستِ بستہ معافی چاہتا ہوں، میرا دل بغض و عناد سے پاک ہے میں نے جو کچھ لکھا ہے نیک نیتی سے لکھا ہے،

مجھے اس کا اعتراف ہے کہ میرے خط کے بعض حصوں میں غلطی کا عنصر آگیا ہے، مگر یقین فرمائیے کہ یہ غلطی غلطی، ایک سُن کر گزرتا بات کے علاوہ

قطب  
بزدلوں کو دُور سے چھاننے کے لئے  
سچی کی بجائے جالیوں و دھندلی شبِ بختاب  
جب طرح انسان کی سیرت اپنے لئے  
شکرِ کرب کا مانی نہیں بلکہ غیابِ حاجی و حاجی  
چھلپے کے دُشمن کو دُشمن کا پناہ بار بار  
غلطیوں پر تارنا ہے طرحِ تنم کے تیر  
یونہیں دُشمنِ ناک عیال کی اندھیری شب  
آرمی کے قلب کو رورہ کے ڈرتا ہے شبِ  
چرخ

## وفاق ہند!

(سلسلہ رفتار و وقت)

قانون ہند کی دستاویز عظیم کا باب وفاق، شاہ انداز سیاسی شہساز کا بہت الغزل، واقع ہوا ہے۔ جسے برطانوی سیاستمدار کے ساز و آوازاں اب مستقبل قریب میں اپنے فسون گرانہ لہجہ و آہنگ میں پڑھنا چاہتے ہیں، اور اچھی ایک ایک تان سے ذوق آشنایان موسیقی انگلستان پر وضہ و قص غلامی کو دینا چاہتے ہیں۔ لارڈ کوئین اور لارڈ کریمسٹن (عروش لندن کے تازہ نریمان فرخ ہندوستان) ایسی مجوزہ تماشائے تفریح کے ایشی کے نعلب کرنے، اور اس تنگ و مترق فلوں کے متوقع شاہدین و سناں کے شمار و اشتباہ کی پیمائش کرنے کے لئے ہمارے ملک میں تشریف فرما ہوئے ہیں!

اسے آمدت باعث آبادی ما!

لارڈ کوئین اداوند اندر برہمن نے اک چٹاک خطاب میں فرمایا کہ انھیں آج تک ایک ہندوستانی بھی ایسا نہیں بلا جو وفاقی کے اصول کا مخالف ہو! — مضمت یا لارڈ صاحب! اس طرح میں بھی آج تک ایک برطانوی ایسا نہیں بلا جو مقبول اصول وفاق، اور سرود و رسوائے عالم ہندوستانی وفاق کو، غریب سیاسی کے دوست و وفات سمجھتا ہو! —

مرحبا تفریح لذت کہ جو اس لئے کہا میں نے یہ جاننا کہ گویا یہ بھی سہہ ملیں ہے! کیا لارڈ کوئین کے عجیب واد میں اس سے زیادہ نظر غریب کوئی نہ کہ سمجھنا یا نہیں! — ہر جہان میں کہ ان طفل تسلیوں کے لہجے کے ساتھ جب ہمارے خواب خرگوش لارڈ صاحب بالقاء، پنڈت جاسر لال تہر و اور پنڈت پنڈت ایسے سامری شمن بجا دیوں سے ملاتی ہوتے ہوں گے تو ایسے چراغ پا ہوتے ہو گئے! برداں دام بر مرغ و گرنہ کو عتقا را بلند است آستان!

اگرچہ در پردہ ایسے ایسے عقلاؤں اور شہسازوں پر ڈورے ڈالنے کی ریشہ دوآلیاں جاری ہیں، تاہم ان عقلاؤں شاطر کا پیام اطمینان یہ ہے کہ ہم کسی سیاسی شمن کے سفیر نہ کہیں آئے ہیں! — ابی استغفر اللہ! کنگ شنگے میں بھلا کیسے یہ ریشہ مبارک ہیں!

”وفاق“ برطانوی منیسہ کاری کا وہ قاتل تحریہ“ تفاق و شفاق ہے

جس پر ہماری نرم ترین شکوہ سنجی یہ ہسکتی ہے کہ

تو برائے واصل“ گردن آمدی؟“ بارائے فصل“ گردن آمدی! دور بینان کا گلوں مدت سے جانتے تھے کہ مغرور برطانوی ہندی و فزیت کا آخری خط وفاق“ دہلی ریاستیں ہوں گی! بلوان و الیان ہندو اس شاہانہ سب سکندری کا گویا سب بٹنا دھتا! یہ خشت اول بھی چند ان رات“ نہ رکھی گئی! تاہم برطانوی دولت مشترکہ اقدام کے خاناوہ ضلکا کے قصر کا کما اب اس دیوار قبضہ کو گنیل کے ادب خریا“ تک پہنچانے کے درپے ہے! اگرچہ یہ کس قدر ہلاک فزیت وفاق گل“ بلبل کے کاروبار میں یہ خند ہائے گل! خوش فہم مہرین انگلستان نے شاید بھجوا کہ کانگریس کی“ ماہی بے عقل“ نام نہاد صوبائی آزادی کی شہرت کے چوگے کو مع کانٹے کے ٹکل گئی! اس اب وقت ہے کہ“ فیڈریشن“ کا دام سخت“ بھی جنش میں لایا جائے، اور حریت کے“ سوز دلی روانہ“ کو جوکر“ اصلاح“ ذہنت (Reformist mentality) کی“ ہوس گیس“ کے اندر سرورک دیا جائے! —

دلک پہ پائی دامان نچھ می لرزد!

مگر برطانوی ماہرین سیاسیات و معاشیات کو معلوم ہونا چاہیے کہ عموماً کا کھجور“ قانون ہند“ کا آخری شریعہ میں تھا جس کے بعد اس شجر اصلاحات کو اڑھانے سے جو پھل بھرتے گا اس پر اقصیات کا قانون تفیل حاصل“ عائد ہوگا! پھر جو حکم کا استعمال، جانبا زبان ملک کے لئے اٹھا ملین مطلوبہ پیام جنگ ہوگا! —

عید نظارہ ہے شمشیر کا عریاں ہونا!

”فیڈریشن“ عبارت ہے ہندو حکم مابقت کے منقضی المیاد مکمل کے بعد، برطانوی ہندوستان اور ہندوستانی ہندوستان کے درمیان رقابت کے اک دوزخ فتن کے افتتاح سے ہستم ظریفی یہ ہے کہ اس پنجہ کشی کشتی کا نام رکھا گیا ہے“ مصافحہ و معلقا“ —

خون سیریزند و خنہ سیاخا ہست!

فیڈریشن کا نظام اپنے چوڑے شرائط و ضوابط کی طبع زبان حال میں، اک تقدہ بندی ہے، اک طوط برطانوی شطرنجی شہ، دالین ریاست کے دنیا نوسی استبداد و اقلیت داران و زمینداران کی دہشت انگیزی، برطانوی سرمایہ دارمی و ہندوستانی ماہنجی کی گلوگری، کشاکش و مافخر اور بستی

واحد آباد کی کشنی حرفت کی زنجیر انگنی۔۔۔ اور دوسری طرٹ قومی  
بیداری و نظر بازی، غلامان ریاستہائے ہند کی زنجیر چٹانی۔۔۔

کاشتکاران و مزارعین کی خرات فانی و استعارت  
پیشگی، ہندوستانی محرومین و مضعوفین کی قوت لایوت طلبی، جھونپڑوں  
کی دستکاری کی بجائی دگاوش جانبری۔۔۔ کے درمیان !! جٹ  
مہندار کھسیلاب فنادیش است!

پھر پرنسپل اینڈ پرائیویٹ کے باہم یہ دینی قرآن السعدین اس  
قسم کی سیاسی شادی، ہوگی جس میں دھن خیرے، برس بند ہرا پاک  
سولہ کاسن کی تصویر جمال ہے اور جناب نوشہ، چشم بد دور، میں اک نو  
سالہ پیر قوت کے پیکر جلجل !! جٹ  
مبارک مبارک، سلامت سلامت!

لارڈ لوٹین از دو اج سیاست کی نکاح خوانی کے گنتی ہی خوش  
الحان قاضی "کیوں ہوں، ۱۵ اور ۹۰ کے درمیان کی خطیب حبیب علامہ قابل  
پلی ہندی ہے!۔۔۔

سخا ہم نہ مانے کہ اس حور و دیش بے منتہا بہ سر پہنچت ریشیں!  
ہمارا خیال ہے کہ اس مسئلہ کو اتنا تاریک و یکسر ہی شاید لارڈ لوٹین  
نے پریاک کے گنگا جمن کے سنگم کے اک سادھو "ہمارا ج سے دو دو شبد  
پل کر، اپنا غم غلط کرنا چاہا! سادھو جی پور سے اہل جنت معلوم ہوتے ہیں!  
آپ نے روشن ترین میو بریدی کی مبارک ترین ہندوستانی سحر کیا ہے "جین  
کو" کلک "کاسیاہ ترین فتنہ قرار دیا! ہمارے دیوتا سرور سادھو جی  
پراگرتھی "جیجودی" نہ ظاری ہوئی تو کلک کے سب سے کالے کلک  
کے نیچے کے کش مذہبی میں وہ اپنی اس غالی تاریک جانی کے مقدم حق کو  
فراموش نہ کر جاتے!۔۔۔

فتنے سب ج بھی قیامت کے لیکن آگے بہتر رہی قامت کے!!  
لارڈ لوٹین کے ہم سیاحت لارڈ سیویل کا ورجو سوجی کی  
خاص مذاکرے کی بنا پر قابل ذکر ہے! مشرعی، وائی، پٹنا مٹی نے لارڈ موصو  
دیے اذکارن رکنین شعلہ لبرلزم کی موجوں میں گھٹتی لبرلزم کی  
جو تعریف بیان فرمائی اس میں شخصی ملکیت کو اس مذہب سیاسی کا اول

کلر، طیب" بتایا! مگر یہ شاید ہندوستانی "لجھی دہوی" ہی کے مندر کا سنگ  
بنیاد تھا! چنانچہ لبرل لارڈ سیویل نے بقال فطرت چٹائی جی کو فوراً لٹو دیا،  
اور اس اہم حقیقت کو لے لٹا دیا کہ "انگلستان کا جدید العہد لبرلزم اس  
در پستہ خود کا ہی کو اک لغت یقین کرتا ہے! بجائے اس کے وہ کھیل  
بستے اطماعیہ میں معاشی توازن و مجلسی مساوات کا قائل ہے! لارڈ موصو  
نے مزید فرمایا کہ "لبرلزم کے عصری نظریے کی رو سے امریکن پریزیڈنٹ  
روز ویٹ کا چہا و خلافت اکا بر سر پائی "لبرلزم" ہی کا اک روشن فکر  
جلوہ ہے!"

یہ سب کچھ کیا ہے اگر سرگرم و کیمونزم کی، زیر نقاب جیہ شری،  
اک "بیعت رضوان" نہیں ہے؟!۔۔۔ سیاسیات واقعات و بات کی دنیا  
میں سرگرمی و وہ مقبول و محبوب مشرب بنتا جاتا ہے جو "لیڈر علی الدین گلہ"  
کا پرچم اڑانے والا ہے! اکا بر برطانیہ پھر کس منہ سے "سود ویٹ روس" پر  
تبرجی کرتے ہیں! جٹ

منکرے بودن و ہر گاہ ماستاں زلیقن!

## قطعہ

جیسے موڑ کی گریزاں روشنی سے راہ میں

نصف لمحے کے لئے ظلمت پہ چھا جاتا ہے نور

سردی آلام کے مارے ہوئے انسان کو

یونہیں چھو جاتی ہے دم بھر کے لئے موج مفر

(جوش مع آبادی)

# ۱۹۳۷ء کی سیاست عام

عبدالرحیم شبلی، بی. کام

مکمل فتح حاصل کی۔ ستمبر ۱۹۳۷ء میں سادو تھو پنورین ریلوے پر ایک بھاری کوبہانہ بنا کر سمجور یا میں اپنے اقدامات وسیع کئے۔ اور اب شمالی چین پر پورا تسلط جا لیا ہے۔

چین پر جاپان کے اس جارحانہ اقدام کی وجوہات تلاش کرنا کوئی مشکل بات نہیں۔ جاپان کی آبادی روز بروز بڑھ رہی ہے، لیکن وسائل خوراک اسی نسبت سے ترقی نہیں پاتے، اس کی وجہ کچھ تو یہ ہے کہ جاپان میں طریقہ فطرت ہندوستان کی طرح تعامل دقیقاً نوسہ ہے۔ اور انکشافات عصریہ سے بالکل روشناس نہیں ہوا، اور دوسرے یہ کہ جاپان کے لوگ ضرورت سے زیادہ قومیت پسند واقع ہوئے ہیں۔ اور وہ یہ برداشت نہیں کر سکتے کہ ان کو کسی وقت غیر ملکی چاول، لکھنا پڑ جائیں، انکشاف کی گئی تھی کہ میکسیکو وغیرہ کے چاول جاپان بھیجے جائیں، لیکن ان کا غیر مقدم نہ لیا گیا۔

یہ حال جاپان کی آبادی مسئلہ (آغا ز عمر جدید) سے اس وقت تک سرگتہ ہو چکی ہے، لیکن وسائل خوراک تعامل دہی ہیں، اس وجہ سے جاپان کو ضرورت محسوس ہوئی کہ وہ اپنی ملک کو وسیع کرے، اور کوئی قریب ترین علاقہ اپنے ساتھ متحد کرے تاکہ ایک طرف تو اس کی بڑھتی ہوئی آبادی کی کھیت ہو جائے اور دوسری طرف اس کو اپنی مصنوعات کے لئے ایک نفع بخش منڈی مل جائے،

اس خیال کو پیش نظر رکھتے ہوئے جاپان کی یہ خواہش عرصے سے تھی کہ کسی طرح سمجوریا کے علاقے پر قبضہ حاصل کر لیا جائے۔ یہ علاقہ زراعت کے

زمانے کی بکلی تیزی سے گھوم رہی ہے۔ گزشتہ سالوں کی طرح ۱۹۳۷ء بھی گزر گیا، لیکن اپنے پیچے بعض ایسی یادداشتیں سمجور گیا ہے جو وقت کی ریت پر نہایت گہرا اثر ڈالیں گی۔

اس مضمون سے جہاں یہ امر مقصود ہے کہ واقعات عالم فطرت بیان کرنا ہے وہاں اس سے یہی بھی فرض ہے کہ قارئین کو اندازہ ہو سکے کہ سیاست عام کس مرحلہ تک پہنچ چکی ہے، تاکہ ان کے لئے موجودہ منتشر اور عالمی اضطراب کے عوامل کا سنجیدہ کرنا آسان ہو۔

## مخاصمت چین و جاپان

۱۹۳۷ء میں جاپان نے اپنے اس پروگرام کو قریب مکمل کر لیا کہ شمالی چین کے باغی صوبوں یعنی چاہار، یونان، شان سی، شان ٹنگ اور ہونگشی کو نامین کی حکومت سے آزاد کر کے یا تو براہ راست اپنے قبضے میں کر لیا جائے اور یا ان کو خود مختاری دے کر اپنی کٹنگی بنالیا جائے۔

در اصل چین اور جاپان کی مخاصمت کوئی نئی نہیں ہے، سب سے پہلے ۱۸۹۵ء میں جاپان نے کوریا کو متنازعہ فیہ علاقہ بنا کر چین پر ایک

ملے اس مضمون کے لئے اگرچہ میں نے زیادہ تر انگریزی اخباروں اور ام کی اور بر ملائی رسائل و جرائد پر اقتدار رکھا ہے لیکن رسائل جامعہ دہلی اور پرتاپ لاہور کے بعض نہایت قابل فزرات بھی میری رہنمائی کے لئے کم مینڈ ثابت نہیں ہوئے۔

شبلی

لیٹا سے نہایت اُمید افزہ ہے، ابھی تک اس میں صرف کھارڈ اور ایکڑ زمین زیر کاشت ہے، اور قریباً چار کھارڈ ایکڑ ایسے فیروزہ و عروج و ترقی ہیں نہایت عمدہ کاشت ہو سکتی ہے،

اس علاقہ کی سب سے اہم پیداوار مٹر ہے جس کی مختلف اقسام تمام یورپ میں انسان اور حیوان کی خوراک اور چارے کے لئے استعمال ہوئی ہیں، ۱۹۳۷ء میں جو وہ کروڑ من غلہ بیکار پیدا ہوا۔ جس پر چند کاشت کے لحاظ سے سچواریا کے زمیندار کاربن منت ہے، لیکن اس کی عمدگی اور فروختی کا باعث جاپان کی تجارتی اور کیمیاوی تدابیر ہیں۔

گیہوں، آرد اور چاول اس ملک کی دیگر زرعی پیداوار ہیں، جو اگر کوشش کی جائے تو زیادہ مقدار میں کاشت کی جا سکتی ہیں، مثال میں ایک وسیع علاقہ ایسا ہے جو کل ہی کل ہے اور جو بہترین مخزن ثابت ہو سکتا ہے،

دوسرے یہ علاقہ معدنیات کے لحاظ سے بھی مہربان ہیں، اس وقت جاپان انجیل کی ضروریات ریاستہائے متحدہ امریکہ اور ڈچ الیٹ انڈیز سے برادر کرتا ہے، اور مشینری وغیرہ بھی امریکہ اور برطانیہ سے منگواتا ہے، لیکن اگر وہ یہ تمام اشیاء سچواریا اور شمالی چین سے حاصل کر سکے تو دول یورپ کے مقابلہ کا اُسے ڈر باقی نہیں رہتا۔

اس لحاظ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ سچواریا اور شمالی چین کے ساتھ جاپان کی دلچسپی بجائے فوجی ہونے کے زیادہ تر تجارتی و صنعتی ہے، اگر آج بھدوں اپنی روٹی کی برآمد جاپان میں بند کر دے، یا اسلحہ کیلئے سے وہاں ذرہ بھر بھی اٹھن نہ جائے یا طیارے ڈرنے سے انکار کر دے یا امریکہ اقتصادی لحاظ سے قطع تعلیق کرے تو جاپان بالکل بے دست و پا ہو جائے، اسی خطرے کے ازالے کے لئے جاپان اپنی مملکت کو حسین کرنا چاہتا ہے، تاکہ جہاں تک ممکن ہو سکے وہ کافی بالذات رہے۔

جاپان کے خطرے کی ایک اور وجہ یہ بھی ہے اور وہ ایشیا میں دبی طاقت کا دوسرا اقتدار پذیر ہونا ہے، روس نے سنہ ۱۹۱۷ء میں ایک اقتصادی چنجال پر وگرام بنایا تھا جس کی مدد سے وہ اپنے جدید و جدید مشینری کی کو ایک دم بارداشت تک پہنچا ناچا رہتا تھا، اور اس طرح اس کی خواہش تھی کہ وہ نہ صرف اقتصادی طور پر فروخت ہو جائے بلکہ اُس کے ذریعے

وہ سیاسی اقتدار بھی حاصل کرے۔ یہ اسکیم سنہ ۱۹۱۷ء میں مکمل ہوئی، اور ارباب سیاست کا خیال ہے کہ روس اب اس قدر محکم بنیادوں پر کھڑا ہو چکا ہے کہ اگر ساری دنیا بھی اُس کا مقابلہ کرنا چاہے تو اُس کو نقصان نہیں ہو سکتا۔ سب سے نزدیکی حکومت جس کو روس کی برصغیر میں طاقت کا خطرہ ہو سکتا ہے وہ جاپان ہے۔ روس نے بعد ازاں دوسرا پروگرام شروع کیا تھا، جس سے اُس کے آخر میں ختم ہوا ہے، اور جس کی حیرت انگیز ترقی جاپان کے لئے سہاواں روح ثابت ہو رہی ہے، اُدھر روس نے رائس سائبرین ریوے کی پٹری دوسری بنائی ہے، اس لئے جاپان کو ہر دم ہی فکر لگ رہی ہے کہ اگر روس کی تمام تجارت مکمل ہو گئی تو اُس کا کیا حشر ہوگا۔ مزید برآں جاپان کے ایک جیسے کا خیال ہے کہ جاپان کو مشرقی بعید میں وہی امتیازات حاصل ہونا چاہیے جو جنوبی امریکہ میں ریاستہائے متحدہ امریکہ کو حاصل ہیں، یعنی جس طرح دول یورپ نئی دنیا کے کسی علاقے پر بغیر متحدہ امریکہ کی رضامندی کے قابض نہیں ہو سکتا، اور نہ وہاں آراغی خرید سکتا ہے، اسی طرح حکومت جاپان کو بھی یہ اختیار مل جائے کہ وہ مشرقی بعید کے کسی علاقے میں یورپی طاقت کو داخل نہ ہونے دے۔ شمالی چین کی فتح بھی اس اقتدار کو حاصل کرنے کی ایک بھید ہے، اُدھر چین کی طاقت دو چاروں میں بڑھ ہوئی تھی جو اب ایک مشترک دشمن کے مقابلے میں محاذ قائم کر رہی ہیں۔ ایک چینی اشتراکی جماعت ہے، اور دوسری جیانگ کا شیخ کی جماعت کو من مانگا۔ پیلے تو یہ دونوں جماعتیں ایک ہی تھیں، اور سن یاٹ سین نے عینی نسبت اجتماعی کے لئے جمہوریت، قسمت، اور اشتراکیت کے جو اصول سرگاز مرٹ کے لئے وہ ان دونوں کا دستور العمل بنے، ۱۹۲۷ء سے ۱۹۳۷ء تک یہ دونوں عناصر ہم آہنگ رہے، لیکن سنہ ۱۹۳۷ء میں اُن کے ایک سربراہ رودہ قائد جیانگ کا شیخ نے شنگھائی کے ساہوکاروں سے ساز باز کر کے نانکن میں اپنی حکومت قائم کر لی، اور کمیونزم کو یکسر ختم کرنے میں ایٹری چوٹی کا زور لگا دیا۔ کمیونسٹ جماعت بہت کچھ بگڑ گئی، مگر پھر دن بعد پھر اُسی، اور فوکیان اور کائی گنگ کے صوبوں میں اپنی محدود حکومت قائم کر لی، اور اپنے زیر اثر کافی وسیع علاقہ لایا۔ حتیٰ کہ وہ نانکن کی حریف حکومت بھی چاہنے لگی۔

مغرب کی طرف۔ ایک جنوب مغرب کی طرف اور ایک جنوب کی طرف تھی، مقصد یہ تھا کہ شمالی چین کے پانچ صوبوں پر جن کا مجموعی رقبہ چار لاکھ مربع میل اور آبادی ساڑھے سات کروڑ ہے اُس کا قبضہ ہو جائے۔ یہ علاقہ مندرجہ ذیل نقشے سے واضح ہو سکتا ہے۔

اس جنگ کو روکنے کے لئے حرب معمول دیگر اقوام نے ہاتھ پاؤں مارنا شروع کئے، لیکن کفن دزدانِ چند کی جمعیت سے زیادہ کی توقع کیے ہو سکتے تھے، مگر دولِ تسہ کی کانفرنس کی گئی جس میں چند مذہب رکھنے والے بزرگ و بزرگ پاسبان کئے گئے، لیکن نتیجہ وہی: ج

جاپان نے اس کانفرنس کا مقابلہ کیا اور اعلان کر دیا کہ وہ کسی صورت میں بھی غیر ملکی مداخلت برداشت نہ کرے گا۔

آخر اسے اپنے مقاصد میں کامیابی ہوئی، اور اس وقت اُس کے قبضہ میں شمالی چین کے پانچ صوبے آگے ہیں۔ جو چین کی کل اراضی کا چوتھہ ہیں، اس علاقہ میں چین کی ریلوں کا ۸۰ فیصدی، غیر آباد زمینوں کا ۸۰ فیصدی، لوہے کی کانوں کا ۸۰ فیصدی، جنگلوں کا ۸۰ فیصدی، اور تجارت کا ۸۰ فیصدی حصہ ہے، علاوہ ازیں اُس نے شمالی چین کا دارالخلافہ نانکن بھی فتح کر لیا ہے، اور ابھی معلوم نہیں کہ اُس کی کرکسی ہوسنا کی کہاں کہاں جا کر ختم ہو!

جاپان نے چین کے ارد گرد کے جزایروں پر قبضہ بھار کر باہر سے آئے والی امداد کو روک دیا، جس کی وجہ سے چین جاپان کا زیادہ دیر تک مقابلہ نہ کر سکا۔

علاوہ ازیں جاپان نے شنگھائی کے بین الاقوامی علاقہ پر بھی تسلط جما لیا ہے، جس کے دوسرے معنی یہ ہوں گے کہ شنگھائی کی بندرگاہ جو اس وقت دنیا میں تیسرے نمبر پر ہے جاپان کے ہاتھوں میں چلی جائے گی اور اور اس کے ساتھ ہی وہ معمولی چلی جو یہاں سے حاصل ہو کر تاتسا اب جاپان کو ملے گا۔

انگریز یہ تو خاموش تھے، لیکن اب چونکہ ان کے مالی مفاد و منافع خطر میں پڑ گئے، اس لئے انھوں نے بھی احتجاج میں حصہ لیا، دراصل بات یہ ہے کہ انگلستان نے چین کو کرودوں پونڈ قرضے پر دے ہوئے ہیں، اور ان کا

باوجود اس رقابت کے جب تسہ میں جاپان نے مغرب پر یورش کی تو کیمونسٹ جماعت نے اتحادِ قومی پر آمادگی ظاہر کی، مگر نانکن کی حکومت اپنی قوت کو برابر ان کی گوشائی اور بردباری میں صرف کرتی رہی، یہ سرخ فوجیں قومی عدت کی خاطر جاپان سے اپنے طور پر لڑتی رہیں، لیکن نانکن گورنمنٹ ان کے منصوبوں کو خاک میں ملانے پر تکی ہوئی تھی، چنانچہ تسہ میں اُس نے کیمونسٹ سردار فنگ کو گرفتار کر کے قتل بھی کر دیا۔

بعد ازاں کیمونسٹوں نے نانکن گورنمنٹ پر جاپان کے خلاف ایک متحدہ اتحاد قائم کرنے کے لئے بہت زور دیا، اور تقریباً تمام چینی فوجان اور طالب علم بھی اس اتحاد کے پرزور حامی تھے، جہاں تک کافی شجاک نے طالب علموں کے مظاہروں کو بڑی سختی سے دبانے کی کوشش کی، لیکن اس غیر جانبدار لوگ اور بھی تحریک اتحاد کے حامی ہو گئے۔

آہستہ آہستہ یہ تحریک بہت پھیل گئی، اور جنرل کافی شجاک کے حامی کو سن مانگ، بھی اُس کی موافقت میں نظر آئے گئے، اور بالآخر تسہ میں جاپان کے خلاف سب ایک جہت سے متوجہ ہو گئے۔

جاپان کے کاروباری آدمی چین سے اُلجھنا نہ چاہتے تھے، اور اسی وجہ سے انھوں نے تسہ کے ناگہانی انتخاب میں جنرل بیاشی کی حکومت کو جو فوجی اقتدار کی نشاندہ تھی، شکست دیدی، لیکن پھر بھی نئی وزارت میں فوجی عنصر کافی با اثر رہا۔ اور چونکہ برطانیہ یورپی سیاست کے جھیلوں میں گھسنا ہوا تھا اور امریکہ کے لئے اکیلے میدانِ جنگ میں کوئی آسان نہ تھا، اس لئے جاپان نے سوچا کہ شمالی چین پر قبضہ کرنے کا یہی بہترین وقت ہے

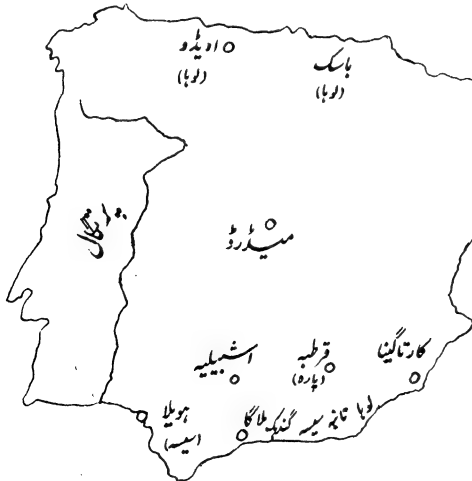
اور دوسرا اتفاق سے، رجلائی تسہ کو ایک معمولی سا حادثہ پیش آگیا، اور وہ یہ تھا کہ ہیک دو کی بین الاقوامی آبادی کے اندر تین جاپانی تاجروں پر آٹھ مرتبہ گولیاں چلائی گئیں، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک جاپانی مر گیا اور دوسرے زخمی ہوئے، یہ کوئی ایسی بات نہ تھی جس کا فیصلہ مختلف ملک پر قبضہ کرنے اور دنیا کو جنگ کی خوریزوں میں مبتلا کرنے سے ہی ہو سکتا تھا، لیکن ملوکیت پرستی اپنے اعراض و مقاصد کی تکمیل کے لئے ہمارے ہی دھونڈا کرتی ہے، چنانچہ جاپان جہیلے ہی بھجوا ہوا تھا اس حادثے کو اصل سبب بنا کر شمالی چین پر حملہ آور ہوا۔ اور ایک جاپانی فوج پی لینگ کے شمال



منافع پر اثر ہوا، اس لئے وہ براؤن وخت ہو گئے اور جنرل مولانا اور جنرل فرنگی کی سرکردگی میں اسموں نے حکومت کے خلاف غلامیافت بلند کر دیا۔

اب چونکہ ایک طرف مہ دور تھے اور دوسری طرف سرمایہ دار اس لئے فاسٹسٹ (اٹلی - جرمنی) اور شوکٹ (روس، فرانسیسی حکومتوں) نے بھی ان کی ہمدردی کرنا شروع کر دی، اور اپنے اپنے "الٹیر" اسپین میں بیس دئے، اور اس طرح پریہ مبارزت محض خاندان جی "ز رہی، بلکہ بین الاقوامی محاربہ بن گیا۔

در اصل بات یہ ہے کہ اسپین میں بہت سی وہ چیزیں مل سکتی ہیں جو جنگ کے لئے ضروری ہیں، اور اس مقدار میں مل سکتی ہیں کہ نہ ایٹا لیمہ کو حبشہ میں نصیب ہوں گی۔ نہ جرمنی کو اپنی نوآبادیوں میں ملتی تھیں۔ مثلاً لوہا کثرت سے اویڈو کے قریب، ونگو کے زواح میں اور بانسک کے صوبہ میں دستیاب ہوتا ہے، صوبہ ہویٹا میں یورپ کی سب سے اچھی تانبے کی کانیں ہیں، آلمن میں بارہ مٹا ہے، اور اس کے قریب ہی بہت چھتا سیرہ۔ ان کے علاوہ بہت سی اور معدنیات اس جزیرہ نمائیں حاصل ہوسکتی ہیں۔ نقشہ حسب ذیل ہے۔



روس اور چین کے درمیان منگولیا کے متعلق یہ کھینچ تان جاری تھی کہ شائع کیے کے بعد جاپان نے بھی وہاں اپنا حق جتان شروع کر دیا۔ آخر کار فیصلہ یہ ہوا کہ جاپان بیرونی منگولیا پر اور روس مغربی منچوریا پر قابض رہے، جب جاپان نے بعد ازاں اپنے ہاتھ پاؤں پھیلائے شروع کئے۔ تو چین نے منگولیا کی آزادی میں معتد بہ کی واقع کرنا شروع کر دی، اور قبائلی علاقوں کو اپنے ہاتھ بیلے عبور میں بھیج کر لیا۔ لیکن چونکہ منگولیا کی آزادی سے جاپان کو بہت فائدہ پہنچ سکتا تھا، اس لئے وہ منگولوں کو آزادی حاصل کرنے کی بار بزرغیب دیتا رہا۔ بالآخر ۱۹۱۱ء میں موقع پا کر اندرونی منگولیا نے اعلان کر دیا کہ وہ جاپان کے زیر سایہ ایک خود مختار ریاست بن کر رہے گا۔ اس سے جاپان کو کوکند، لوہا اور تیل حاصل کرنے میں آسانی ہوئی وہاں اس سے اس کو یہ فائدہ بھی ہوا کہ وہ چین کے باطل سر پر بیچ گیا، اور روس کی پورش سے پناہ لینے کے لئے ایک درمیانی علاقہ بات لگیا ہے۔ ہندوستان نے چین کے مظلوم ملک سے ہمدردی کی خاطر جاپا کر جاپانی مال کا مقابلہ کیا جائے، لیکن ہندوستان کی ردی کے جو ابھی مقابلہ کے خوف سے یہ سہل سٹڈے نہ چڑھ سکی۔

در اصل مقابلہ کی خاطر ضروری تھا کہ تمام ملک اس پروگرام پر عمل کرتے، لیکن افسوس ہے کہ قومی خود غرضیوں نے اس تجویز کو ذریعہ نالانے دیا۔ جاپان اپنی دولت کے لئے مترسار غیر ملکی تجارت پر انحصار رکھتا ہے۔ پس اگر اقوام عالم متحدہ طور پر جاپان کا تجارتی مقابلہ کرتے تو اس کو گھنٹوں کے بل گرانے کا جتنا مشکل نہ تھا۔

## اسپین کی خانہ جنگی

اسپین میں پہلے شاہی حکومت تھی، لیکن جمہوریت پسندوں کے بے پناہ جذبہ کے تحت شاہ آلفارو کو تخت سے اتار جانے پر مجبور کیا گیا اور ملک میں لوگوں کی، لوگوں کے ذریعہ، لوگوں کے لئے حکومت قائم کر دی گئی۔ لیکن جب سے اشتراکی پارٹی برسر اقتدار آئی ہے ملک میں ایک خونخوار دور شروع ہو گیا ہے،

اشتراکی پارٹی نے مہ دوروں کے اوقات کار کم کرنے اور اتریں بڑھانے وغیرہ کے پروگرام پر عمل کیا، لیکن اس کا چونکہ سرمایہ داروں کے

ہست میں جرمی اور انہی کی ایک مشترکہ کمیٹی نے ان ذخائر سے فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کیا تھا۔ ان دنوں حکومت سربراہ داروں کی بھی چنچہ اٹھی اور جرمی کو خوب مراعات دی گئی تھی۔ جیجی کو فیصلہ کیا گیا کہ اسپن میں جرمی آب و دوزوں اور ہوائی جہازوں کے لئے گیمیا دی جائے تیل بنایا جائے۔ اور ان کے مستقر بھی وہیں قائم کئے جائیں۔

لیکن آخر سیاسیات کا رخ پٹا اور اسپن میں انقلابی جماعت کو اقتدار حاصل ہوا، چونکہ جرمی اور انہی کو خطرہ پیدا ہوا کہ اس تبدیلی سے ان کا پروگرام کمٹیا میں پڑ جائے گا۔ اس لئے انہوں نے ملک میں بغاوت پھیلانے کی کوشش کی اور وہ بہت حد تک اس میں کامیاب ہوئے، چونکہ جرمی کو اسپنی مراکش میں کچھ مراعات حاصل تھیں اس لئے جب جنرل فرینک نے بغاوت کو کڑی کی تو شرعاً ہی میں اعلان کر دیا کہ مراکش کی تمام کالوں پر ہمارا قبضہ ہے۔ پڑائی مراعات سب منسوخ کی جاتی ہیں۔ اور انگلینڈ میں ایک اسپنی نام کی کمیٹی قائم کی جو دراصل جرمی ہی تھی اور مراکش کی تمام کالوں کا اسے اجارہ دیدیا، جرمی نے ان کالوں سے بہت فائدہ اٹھایا اور وہاں سے کچھ تپالے جا کر اس نے اسپن کو دھڑا دھڑا اسٹھما سکے، اور خود بھی اسٹھ سازی میں ترقی کی۔

علاوہ ازیں جرمی نے گیمیا کے ٹین اور وگیک کے لوہے پر بھی اپنا حق جمایا۔ اور اسی ٹنگ سٹن اور وٹا ڈیم کی کالوں پر نظر بھی پڑتی کہ ایلٹا کے رٹا کار بھی اسپن پہنچے، اور ان کالوں کے علاوہ بعض دیگر کالوں پر بھی قبضہ کر لیا۔

دیگر ممالک نے اسپن کے معاملے میں غیر جانبدار رہنے کا فیصلہ کیا اور وہاں رٹا کاروں کی برآمد کو روکنے کے لئے ایک عدم تجارت کمیٹی قائم کی جو اسپن کے سوا اصل کی لگائی کرتی رہی اور جس نے اٹلی اور جرمی کو مجبور کر لیا کہ وہ اپنے اپنے رٹا کار واپس بلا لیں۔

چنانچہ پہلی تو مولینی نے عدم مداخلت کمیٹی کے فیصلہ کی پروا نہ کی۔ لیکن جب فرانس نے دھمکی دی کہ اگر مولینی رٹا کاروں کی واپسی کے مسئلہ کو آسان نہ بنا دے گا تو اسے اپنی پیر جینز کی سرحد کھولنا پڑے گی۔ اسپن کے سرکار کو مالی اور مسلح امداد حاصل ہونے لگی، اور جنرل فرینک کو کامیابی معرکہ خیز میں پڑ جائے گی، تو اس نے وعدہ کر لیا کہ وہ

آئندہ اسپن میں کوئی رٹا کار نہ بھیجے گا۔ اور اس فیصلے کے سوا اس کے پاس کوئی چارہ بھی نہ تھا، کیونکہ اگر وہ فرانس کی دھمکی کی پروا نہ کرتا تو اسپن کی حکومت کو فرانسوی امداد کا مقابلہ کرنے کے لئے اسے باغیوں کو مالی امداد دینا پڑتی۔ لیکن اس کے لئے اس کے پاس گنجائش نہ تھی، جہش کی جنگ نے اس کا پیسہ بھی کھم کھال دیا ہے، اور اب اسے بجٹ میں پے در پے خسارے ہو رہے ہیں، اگر ششہ سال (۱۳۳۵ء) اس نے دس فیصدی نیا ٹیکس بھی لگا دیا تھا، اور لگائے کو پورا کرنے کے لئے دیگر ذرائع سوچے جا رہے ہیں، اندرین حالات مولینی باغیوں کی امداد کیسے کر سکتا تھا، اور ان انٹرنیشنل کمیٹی کے فیصلے کو ماننے کے سوا اس کے پاس کیا چارہ تھا؟

عدم مداخلت کمیٹی نے یہ بھی فیصلہ کیا کہ اسپن میں ایک کمیشن بھیج جائے جو رٹا کاروں کی صحیح تعداد معلوم کرے، مولینی نے اس تجویز کو کبھی تسلیم کر لیا۔ لیکن جنرل فرینک نے اس کو ماننے سے انکار کر دیا، مگر اس پر بھی وادہ ڈالا گیا۔ اور مولینی کی رٹا مندی کے بعد وہ زیادہ دیر تک اس تجویز کی مخالفت نہ کر سکا۔

عام خیال یہ ہے کہ دونوں کی مخالفت کا ایک ہی مقصد تھا اور وہ یہ کہ جتنی جلدی ہو سکے اسپن کے زیادہ سے زیادہ علاقے پر قبضہ کر لیا جائے، چنانچہ اس مقصد میں وہ بہت حد تک کامیاب بھی ہوئے۔

تادم سحر (وسط و مشرق) یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ اسپن میں غیر ملکی رٹا کاروں کی صحیح تعداد کتنی ہے، لیکن جو کچھ اخباروں وغیرہ کی رپورٹوں سے ثابت ہو سکا ہے وہ یہ ہے کہ اس وقت اسپن میں ایلٹا، جرمی اور پرتگال کے سپاہی لڑ رہے ہیں، لیکن ان کو کسی طور سے بھی وائٹیر یا رٹا کار نہیں کہا جاسکتا، کیونکہ وہ باقاعدہ طور پر فوجی ہیں، ہاں اسی وائٹیر اگر آئے ہیں تو آئرلینڈ سے، وہ جنرل آڈوئی کے تحت لڑ رہے ہیں، اور ان کی تعداد تین ہزار کے قریب بتائی جاتی ہے، جرمی کے قریب چالیس ہزار آدمی اسپن میں باغیوں کو امداد دے رہے ہیں، ایلٹا کے صحیح تعداد معلوم نہیں، لیکن روم کے ایک اخبار نے لکھا تھا کہ اس وقت اسپن میں اٹلی کے چالیس ہزار وائٹیر لڑ رہے ہیں،

گیدو انجیرا کے مقام پر لڑائی میں جو کائنات ہاتھ آئے ان سے

علاقہ بڑھ گئی ہے، جو برطانیہ کے لئے سوہان روح ثابت ہو رہی ہے کیونکہ سندھ اس کے لئے شہرگ کا حکم رکھتا ہے۔ مالٹا کا برطانوی سترمسٹر کے صرف ۶۵ میل دور ہے۔ اور اس فیصلہ کو ایلایہ کے گولوں سے لے کر ہونے والی چھانچہز میں منٹ میں لے کر سکتے ہیں۔ مالٹا کی بندرگاہ کا وہاں بہت تنگ ہے۔ اس میں جہاز آسانی کے ساتھ آج نہیں سکتے۔ بندرگاہ کے اندر ان پرشوں کا ہوائی بیڑہ بڑی آسانی سے حملہ آور ہو سکتا ہے چنانچہ جنگ میں کے موقع پر یہ بات ظاہر ہو گئی کہ برطانیہ مالٹا میں اپنا بیڑہ نہیں رکھ سکتا۔ اسی لئے وہ اسکندریہ چلا گیا، جہاں وہ اعلیٰ ہوائی جہازوں کی پہنچ سے مستحکم ہوا۔

یہ خطرہ ابھی تک ذہن میں ہی تھا کہ بحیرہ روم میں آنے جانے والے جہازوں پر حملے ہونے لگے۔ صرف برطانیہ کے کوئٹیس جہاز ان محلوں کا نشانہ ہوئے۔ فرانس اس بحری قوتی سے گھرا تھا، اور روس کا بھی ایک جہاز ترکی ساحل کے قریب ایک آب و دو زکشی کا نشانہ بن گیا۔ ترکی حکومت نے بیان کیا کہ کچھ دنوں سے ساحل کے آس پاس ایک آبدوز کشتی دیکھی جا رہی ہے لیکن اصل حملہ آور کاپتہ نہیں، عدم مداخلت کا نفرنس کی قراردادوں کی دوسے کسی مشکوک چار سے چھپر چار کرنے کی اجازت نہ تھی، بلکہ اس کی اطلاع کا نفرنس کو دینا پڑتی تھی۔

فرانس اور برطانیہ اپنے جہازوں کو خطہ میں دیکھ کر کبھی خاموش رہ سکتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے فوراً ایک کا نفرنس بلائے کی تجویز کی، جو نیٹو (سوئٹزرلینڈ) کے مقام پر ہوئی، اور نیٹو کا نفرنس کے نام سے موسوم ہے، ابھی کا نفرنس کے انعقاد کا انتظام ہو رہا تھا کہ روس کے ساتھ مندرجہ اقد پیش آیا، روس نے ایلایہ کو مود الزام بھڑایا، ایلایہ نے انکار کیا، روس نے اور زیادہ شد و دس الزام کو پیش کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایلایہ ناراض ہو گیا، اور اپنے حلیف جرمنی سمیت کا نفرنس میں شامل ہونے سے انکار کر دیا۔

کا نفرنس نے مفید کیا کہ سندھ ری راستوں کی نگہانی کی جائے اور جنگی جہازوں کو اس امر کی اجازت دی گئی کہ وہ جگہ جگہ سے دیں، اٹلی عہدہ رہا۔ صرف فرانس اور برطانیہ نے دیکھ بھال کا تمام بار اپنے ذمہ

معلوم ہوتا ہے کہ فاشسٹ گریڈ کونسل نے سچا ہزارہ الیٹر اسپن بھیجے، انہارڈو کے نائنڈوں کی رپورٹ ہے کہ اعلیٰ فرج کی تعداد دو لاکھ سے کم نہیں۔ حکومت اسپن کا یہ کہنا ہے کہ وہ اس وقت کم از کم تھی ہزار اعلیٰ سپاہی ہیں اس سے اب کم ہو چکا ہے کہ اسپن میں حکومت کی طرف سے کئے گئے غیر ملکی - رم کا ناز ہے، باغیوں کے اعلان کے مطابق وہاں کم از کم اڑتیس ہزار غیر ملکی ہیں، لیکن ٹائمز کے نمائندہ نے کہا ہے کہ وہاں میں اور پینس ہزار کے درمیان اشتباہ ہیں۔ فرانس کے سرحدی افسروں کا بیان ہے کہ جب سے اسپن کی خانہ جنگی شروع ہوئی ہے، وہاں سے بارہ ہزار والیٹر گزرے ہیں۔ اس کے علاوہ اگر فرض کر لیا جائے کہ تین چار ہزار آدمی بحری راستہ سے وہاں گئے اور دو ایک ہزار چھپ چھپا کر پہنچ گئے تو بھی یہ تعدادیں ہزار سے زیادہ نہیں بنتی۔

اب سوال یہ ہے کہ ان غیر ملکی والیٹروں کو وہاں کیسے بلایا جائے؟ اس کا فیصلہ عدم مداخلت کو بھی کچھ مزہ لکھیں ہی کرے گا۔ لیکن فی الحال جبکہ اس بات پر ہے کہ آیا فریقین کے برابر برابر کے آدمی واپس کے جائیں یا اگر باغیوں کے پانچ جامی واپس لے جائیں تو سرکار کا صرف ایک، جرمنی اور اٹلی اول الذکر تجویز کے حامی ہیں، اور روس دوسری کا۔ اور دراصل سارے کے سارے غیر ملکی واپس بلانے کا صرف یہی طریقہ ہے کہ دوسری تجویز پر عمل کیا جائے۔

بھرا دوا کی دوسری صورتوں کو روکنے کا سوال ہے، اس کے فیصلے کے لئے سب کمیٹین کے فیصلے کا انتظار ہے۔

در اصل جب تک کہ فیصلہ صادر ہوگا اسپن کے طاوت میں کافی طرح کا ڈی جابگی ہوگی، و دوول عالم زیادہ تر باغیوں کی ہی حامی معلوم ہوتی ہے۔ جرمنی اور اٹلی نے تو جنرل فرینکو کی حکومت کو پیسے بھی منظور کر لیا تھا، اب انگلستان نے بھی فیصلہ صادر کر دیا ہے کہ مستنوخ علاقہ میں قارتی سہمہ مقرر کئے جائیں گے۔ جا جان اور دو تین سچھٹے سچھٹے یورپی مالک نے بھی جنرل فرینکو کی حکومت کو منظور کر لیا ہے۔

بحر روم کا میدان کارزار

جب سے ایلایہ نے حبش کو فتح کیا ہے، اس کی بحیرہ روم میں طاقت

مسمیٰ یہ ہیں کہ اسپین اور فرانس کی اکثر کی حکومتیں مغرب پر سے ناپید کر دی جائیں گی۔ اور بہت جلد یہ ڈکٹیٹر روس کی ہمتی ہوئی طاقت کے خلاف صفت آرا ہو جائیں گے۔

ایک خیال یہ بھی ہے کہ سولینی، ہرٹلر سے انگریزوں کے خلاف امداد کا غالب تھا، لیکن ہرٹلر نے انکار کر دیا۔

ہادی النظر میں یہ بات کچھ عجیب سی معلوم ہوتی ہے کہ وہ جرمنی جس کی سلطنت کا بیشتر حصہ انگریزوں نے لے لیا اور تجارتی بحال سے بھی اس کو نقصان پہونچا آج کس حالت انگریزوں کی حالت پر کمر بستہ ہو سکتا ہے، لیکن اگر ہم یہ جان لیں کہ جرمنی جس طرح بھی ہو سکے فرانس سے اپنی شکست کا بدلہ لینا چاہتا ہے اور انگریز خود بھی فرانس کی روز افزاں ترقی سے خائف ہیں تو ہمیں یہ سمجھنے میں کوئی دشواری پیش نہ آئے گی کہ انگریز آج کونسا جرمنی کو اپنے ساتھ ملانا چاہتے ہیں اور جرمنی کیوں ان کی دوستی کا دم بھرتا ہے،

اسی اصل کے پیش نظر لارڈ ہائیٹس (سابق لارڈ اردن وائسرائے ہند) نے ہرٹلر سے ملاقات کی، اگرچہ اس ملاقات کو کبھی "ذاتی" اور "ذاتی" قرار دیا گیا، لیکن تاڈنے والے سی قیامت کی نظر رکھتے ہیں، سمجھنا اور طبقہ جاتا ہے کہ اس ملاقات کے پس پشت بھی ایٹلو جرمن اتحاد کا نظریہ تھا، جو فرانس کی طاقت کو دبائے کے لئے اب ضروری ہو گیا ہے۔

پھر یہ قیاس آرائی بھی کی جاتی ہے کہ جرمنی "معاہدہ لوکارنو" کی بجائے ابک نیا معاہدہ چاہتا ہے، اور وہ بھی انگلستان کے ساتھ دو مل جرمنی کا خیال ہے کہ بجائے اس کے کہ زیادہ ٹھکوں کے درمیان معاہدے ہوں بہتر ہے کہ صرف دو ملک آپس میں عہد و پیمان کر لیا کریں تاکہ نیشنلزم آسانی رہے۔

## مواعید و مواثیق

سیاسی ملاقاتوں کے علاوہ سیاسی معنی مواثیق و مواعید بھی لکے گئے ہیں جس سے چند ایک کا ذکر کیا جاتا ہے۔

۱۔ فرمیر کوہر وان دین ٹراپ (جرمنی) کا وٹس کاناؤ (ایٹالیا) اور سربیر دنا (جاپان) کے درمیان ایک معاہدہ ہوا۔ جس کا مقصد تھا

۱۔ اور فیصلہ کیا کہ اگر ٹیٹرک ہونا چاہے تو اس کو ہر وقت اجازت ہے۔ بحیرہ روم کا مسند حل کرنے کے لئے برطانیہ سرعت کے ساتھ اپنے جنگی پروگرام کو مکمل کر رہا ہے، لیکن اس کے بالمقابل ایٹالیا بھی غافل نہیں ہے — وہ بھی اپنے بحری بیڑے کو دوگن بلکہ گنا کر چکا ہے۔

برطانیہ کو یہ بھی خیال ہے کہ اگر جرمنی بحال بحیرہ روم سے اس کا اقتدار اڑھ لگا تو وہ افریقہ کے شعبے سے ہو کر پرانا بحری راستہ اختیار کرے گا۔ اس طرح اس کا خیال ہے کہ خرچ بھی زیادہ نہ ہوگا۔ کیونکہ نہر سوئز کے محاصل جواب دینا پڑتے ہیں، اس راستہ پر دینا نہ پڑیں گے۔ دوسرے فاصعے کی رفتار زیادہ کر کے پوری کی جاسکتی ہے، تیسرے جنگ کے زمانہ میں ہمیں کہ جو رقم خرچ جاتی ہے وہ بھی بچ جائے گی۔ آخر میں برطانیہ جہاں بحیرہ روم میں اپنا اقتدار برقرار رکھنے کی پوری کوشش کر رہا ہے، وہاں اس کے ذہن میں متبادل راستے بھی ہیں۔

## سیاسی ملاقاتیں

سلسلہ میں یورپ کے اکثر ممتاز سیاستدان ادھر ادھر باہمی باہمی ملاقاتوں پر اسرار انگلیوں اور سیم اعلانات کرنے میں مصروف رہے، ان میں سے اہم ملاقاتیں ایک طرف سولینی اور ہٹلر اور دوسری طرف لارڈ ہائیٹس اور ہٹلر کی تھیں۔

سولینی اور ہٹلر پہلے ایک دوسرے کے دشمن تھے، کیونکہ ہٹلر جرمن ازم میں یقین رکھتا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ان تمام ملک کو جن میں جرمنی کے لوگ رہائش پذیر ہیں پرشیا کے سائے تلے لانا چاہتا ہے، لیکن سولینی یہ ہرگز برداشت نہیں کر سکتا۔ اسی وجہ سے ہٹلر اور سولینی کا آپس میں تیل اور آگ کا تعلق تھا، لیکن واقعات کے جوہر درجمان نے ان متخاصم ذہنیت کے مالک ڈکٹیٹروں میں اتحاد و یکجہالت کی روح پیدا کر دی ہے اور اسی وجہ سے سلسلہ میں ہرٹلر سولینی سے ملاقات کرنے کے لئے روکھا گیا، اور گزشتہ سال میں سولینی ہرٹلر سے ملنے آیا۔

ملاقات کی نوعیت کو پوشیدہ رکھا گیا ہے، لیکن کہا جاتا ہے کہ اس کے نتیجے میں دو ماوراء برنل کے درمیان ایک معاہدہ قرار پایا ہے جس کی دوسرے یورپ میں پوشہ زم کا قلع قمع کیا جائے گا، اور اس کے دوسرے

کر دیا ہے۔

ایک معاہدہ اٹالیہ اور یوگوسلاویا کے درمیان ہوا۔ اگرچہ اٹالیہ کا یوگوسلاویا کے ساتھ وہی تعلق تھا جو جرمنی کا پولینڈ کے ساتھ۔ لیکن روس کے مقابلے میں اپنی قوت کو محفوظ رکھنے اور وسطی یورپ میں اپنی سیاست کو مضبوط بنانے میں دوں پر کھرا کرنے کی غرض سے پولینڈ کو یہ کڑوا گھوٹ پینا پڑا۔ دراصل پولینڈ بحیرہ اڈریائیٹک پر جو اٹالیہ اور یوگوسلاویا کے درمیان ہی اپنا اقتدار قائم کرنا چاہتا ہے، اسی غرض کے لئے اُس نے بعض بندرگاہوں پر قبضہ چاہا اور البانیہ کو اپنے سایہ عاطفت میں لیا۔ اور اب اسی لئے یوگوسلاویا سے اُس نے ایک معاہدہ کیا ہے۔ اس کا فائدہ یہ ہو گا کہ برطانیہ وسطی یورپ میں اٹالیہ کا مقابلہ نہ کر سکے گا۔ اور ریاست بلقان میں جرمنی کا بڑھتا ہوا اثر اُسے کوئی نقصان نہ پہنچ سکے گا۔

وسطی یورپ میں اقتدار بڑھانے کے لئے پولینڈ کی نظر عربی ممالک پر بھی ہے۔ چنانچہ اُس نے مین پرنگاہ التفات ڈالنا شروع کر دی ہے، اور اسلام لازمی اور مسلم پر فوڈی کے ڈھونگ کے سایہ تلے اسے پیچھیں بڑھا رہا ہے۔

پیش آمدہ جنگ کے خوف سے اسلامی ممالک بھی آپس میں دشمن اتحاد جوڑ رہے ہیں، چنانچہ معاہدہ سعد آباد اسی کا ایک شاخشاہ تھا۔ ترکی، افغانستان، ایران اور عراق نے آپس میں عہد کیا ہے کہ وہ سیاسی خطرات کے وقت ایک دوسرے کے دست راست ہوں گے۔ برطانیہ اس معاہدہ سے خوش ہے، کیونکہ وہ جانتا ہے کہ مسلم ممالک اٹالیہ کے زخموں میں نہ آئیں گے۔ بلکہ اس کا مقابلہ کرنے کے لئے برطانیہ کا ہی ساتھ دیں گے، اور یہی چیز ہے جس کی اُسے آجکل تلاش ہے۔

پھر جاپان نے بھی اٹالیہ سے یہ معاہدہ کیا کہ وہ مشرق سے روٹی لینے کی اجازت دے گا، اور اس کے بدلے میں وہ اُس کی ہر ممکن امداد کرے گا۔ وسطی یورپ میں اٹالیہ نے یہی فیصلہ کر لیا کہ لیگ آف نیشنز کا مطالعہ کیا جائے، اور برطانیہ، بلغاریہ، البانیہ، جاپان اور جرمنی کی مدد سے ایک متحدہ غیر ملکی لیگ قائم کی جائے۔

کرنڈہ یقینوں کا مالک مل کر دنیا سے روسی کیوزم کو ناپید کرنے کی کوشش کریں گے۔ دراصل اس مطلب کا ایک جہد نامہ ۱۹۳۷ء میں جاپان اور جرمنی کے درمیان ہوا تھا۔ لیکن اب اٹالیہ نے بھی اس میں شامل ہونا منظور کر لیا ہے۔

جس دن یہ معاہدہ ہوا اسی دن ساؤنگھا ڈا (اطالوی سفیر لندن) نے اٹالیہ کے ایک اخبار میں لکھا تھا کہ اس معاہدہ کا عملی جامہ پہنانے کے لئے میں کرو۔ آدمی اور جس لاکھوٹن کے بکری بیڑے موجود ہیں۔ ان الفاظ سے صاف ظاہر ہے کہ یہ یقینوں کا مالک پُر امن نہیں رہنا چاہتے، بلکہ اپنے مفاد کی تکمیل کے لئے وہ گوئے اور بارود کا استعمال بھی بڑا نہیں سمجھیں گے۔

ایک اور معاہدہ جرمنی اور پولینڈ کے درمیان ہوا جس کی روسے قرارداد پاک وہ ایک دوسرے کے ملک کی اقلیتوں کے تمدن اور اخلاق کو کوئی نقصان نہ پہنچائیں گے۔ اس معاہدے کے ذریعہ جرمنی اپنے دو حریفوں، روس اور یوگوسلاویا کے درمیان ایک دیوار کھڑی کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ کیونکہ پولینڈ کی ایک سرحد پر روس ہے اور دوسری پر یوگوسلاویا۔ اور بہت ممکن تھا کہ روس یوگوسلاویا سے جرمنی کے خلاف کوئی ساز باز کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے لیکن اب یہ امکان بھی جاتا رہا۔

جرمنی اور پولینڈ کے اتحاد کی یہ میں ایک اور راز بھی ہے اور وہ یہ کہ جہد نامہ ورسائی کی روسے جو نئی ریاستیں بنائی گئی تھیں اُن میں ایک پولینڈ بھی ہے۔ اب جہاں پولینڈ کے لوگ یہ چاہتے ہیں کہ اُن کی آزادی برقرار رہے وہاں فرانس کی بھی یہی مرضی تھی، اور اس سلسلے میں اُس کی کچھ مالی امداد بھی کرتا رہا۔ لیکن جب ہر ہٹلر برسرِ اقتدار آیا تو اُس نے تادمِ دنیا بند کر دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فرانس پولینڈ کی مالی امداد نہ کر سکا۔ اس سے پولینڈ کے لوگ براہِ فروخت ہو گئے اور کچھ اُمعوں نے سوچا کہ ہٹلر کے مقابلے میں فرانس کی دوستی اُمعوں ہنگی پڑے گی۔ چنانچہ اُمعوں نے فرانس کے منتقل اپنا نقطہ نگاہ بدل لیا، اور ہٹلر سے معاہدہ کر لیا۔ اس وقت فرانس کے ساتھ اُن کا تجارتی معاہدہ ہے، لیکن وہ بھی براے نام۔ کیونکہ ۱۹۳۷ء کے معاہدہ نے اُسے بھی ناکارہ

## تقسیم فلسطین

ہر ملنے پر برسرِ اقتدار آتے ہی جرمنی سے یہودیوں کو نکالنا شروع کر دیا۔ اب ان کو کہیں سر چھپانے کی جگہ درکار تھی۔ مجبوراً وہ اپنے پرانے دن فلسطین کی طرف راغب ہوئے۔ کچھ استعمار پسند انگلستان نے ان کی مدد کی۔ عرب پیسے ہی برطانوی انداز سے تنگ آئے ہوئے تھے۔ ان کو دبانے کے لئے یہودیوں کو ان پر مسلط کر دینے سے بیترکونی تجویز نہ تھی، لارڈ بالفور نے پیسے ہی اعلان کر دیا تھا کہ فلسطین یہودیوں کا گھر ہے، اور وہ یہاں آکر آباد ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ یہودی دھڑا دھڑ فلسطین میں آئے لگے، عربوں نے جب دیکھا کہ ان کی قومیت پر کھنڈا چل رہا ہے تو انہوں نے مدد سے احتجاج بلندی، معاملہ معین توتیق میں ڈالنے کی غرض سے برطانیہ نے ایک شاہ کی پیش مقرر کر دیا جس کی دسٹ سٹری میں پورے ایک سال لیدر پورٹ شائع ہوئی۔

اس رپورٹ کی زد سے فلسطین کا ذرخیز اور اہم ترین ساحلی علاقہ یہودیوں کو دیا گیا۔ عرب نمونی سے بجز علاقہ کی طرف دھکیل دئے گئے اور بیت المقدس خود سفیر برطانیہ کی تحویل میں رہا۔

عربوں پر یہ کیا کسم پٹا کہ ان کے ملک کے اس طرح سے حصے بخرے کر دئے جائیں۔ لیکن غضب بالائے غضب یہ ہے کہ ساحل کا تمام عمدہ علاقہ ساری ذرخیز زمینیں اور بہتر خود قبلاً اولیٰ بیت المقدس کا شہر ان سے چھین لیا گیا۔ یہ ہے عرب کی ان دغا کشیوں کا صلہ جو انہوں نے اپنیوں کو جھوڑ کر غیر دوس سے روا رکھیں۔ خود ہی کشن کا اعتراف ہے کہ جنگ عظیم میں اتحادیوں کی کامیابی کو عرب اپنی مکمل آزادی سمجھے ہوئے تھے، اور یہی دلولہ ان کو جنگ میں ہمت دلا رہا تھا۔

اور حق یہ ہے کہ برطانیہ نے سر بہتری یسویہن کے ذریعہ شریف حسین سے یہ نچتر معاہدہ کیا تھا کہ جنگ کے بعد عربی ممالک کی جس میں بغداد سمجھا، عراق، دمشق شامل تھے آزادی تسلیم کر لی جائے گی۔ فلسطین ترکی حکومت میں شامل تھا اس لئے لازماً اس کے سنی یہ تھے کہ فلسطین بھی آزاد ہوگا، لیکن انہیں کہ استعمار پسندوں کی پرانی سیاست کام آئی اور معاہدات حوالہ طاق نسیان کر دئے گئے۔

شریف حسین کو جرمنی نے عرب کی مکمل آزادی کا یقین دلانے کے بعد برطانیہ اور فرانس کے درمیان کچھ عہد و پیمان ہوئے، اور انہوں نے شمالی عرب یعنی شام و عراق کا علاقہ خلیفہ اپنے درمیان تقسیم کر لیا۔ عربی کے متعلق ہے ہر کہ وہ ترکی حکومت سے عہدہ کر کے آپس میں کسی ایک یعنی فرانس، برطانیہ یا روس کو دیا جائے۔

سٹارٹسٹک کسی کو اس معاہدہ کی اور خصوصاً حصہ دوم کی کاؤں کاں خبر نہ ہوئی، لیکن آخر گھر کے عہدید روس نے انکا ڈھما دیا۔

اپنی دونوں یعنی ذریعہ شریف میں برطانیہ نے یہودیوں سے بات چیت شروع کی، اور اس کا نتیجہ اعلان بالفور کی شکل میں رونما ہوا جس میں فلسطین کو یہودیوں کا قومی گھر تسلیم کیا گیا اور وعدہ کیا کہ انگریز ان کو وہاں آباد ہونے میں ہر ممکن امداد دیں گے۔ اس کے ساتھ ہی فلسطین کی غیر یہودی آبادی کو یہ یقین دلایا گیا کہ ان کے مذہبی اور معاشرتی حقوق بالکل محفوظ ہوں گے۔



یہودی آبادیاں  
رہنیں

ایک طرف نفلین میں قتل و غارت کا بازار گرم ہے تو دوسری طرف جزیرہ عرب، شرق اردن، شام، عراق اور ایران میں برطانیہ کی اس حکمت عملی کے خلاف احتجاج کیا جا رہا ہے۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ برطانیہ کب تک گولہ و بارود کے ذریعہ عربوں کو شاہی کمیشن کا فیصلہ ماننے پر اصرار کرتی ہے،

### معاهدہ مصر و برطانیہ اور اس کے بعد

۱۹۳۶ء میں مائٹرو کا فرانس کے فیصلہ کے مطابق غیر اقوام کو مصر میں جو مراعات حاصل تھیں وہ منسوخ کر دی گئیں۔ انگریزوں سے ایک معاہدہ ہوا جس کی رو سے وہ ہر سو سو پر کم انکم میں برس تک اپنی فوج کے ساتھ رہیں گے اور مصر کو جمعیت الاقوام کا ایک باقاعدہ رکن تسلیم کر لیا گیا۔ اس تیز کوئی حقد نہیں نشین کرنے کے لئے میں مصر کی تاریخ مراعات کا مطالعہ کرنا پڑے گا۔

مرعاتی نظام کی ابتدائی اثر کی خلف کے عہد میں ہوئی، جنہوں نے مخصوص عیسائی حکومتوں کو اپنے ملک میں لیجن دفاعی آزادیاں تو از سر نو فراہمیں، پیسے تو یہ تو از سر نو صرف تجارت تک محدود تھیں، لیکن جب عثمانی سلطنت کمزور ہو گئی تو ان حقوق کی نوعیت بدل گئی۔ ترکوں کی ہر شکست کے بعد ہر فاتح قوم مراعات میں اپنے لئے ایک نئی دفعہ کا اضافہ کر دیتی تھی، اور حکومت کو اسے مجبوراً منظور کرنا پڑتا۔

بعد کو یہ حقوق صرف تجارتی ذریعے بلکہ عدالتی امور پر بھی عادی ہو گئے۔ غیر ملکی لوگ اپنے مقدمات کے فیصلے کے لئے عہدہ عہدہ عدالتوں کا مطالبہ کرنے لگے، اور ان کی پشت پر ان کی حکومتیں ہوتی تھیں۔ اگر کوئی عثمانی حکومت کا فرد غیر ملکی پر بات بھی اٹھاتا تو اس کی حکومت کے پڑے باب مالی پر دباؤ ڈالنے کے لئے آہو تھتے تھے۔ اس کے علاوہ عثمانی حکومت غیر ملکیوں کی رضانندی کے بغیر نہ تو کوئی نئی اقتصادی پالیسی بنا کر سکتی اور نہ کوئی ریل گاڑی تک بنا سکتی تھی۔

جنگ عظیم کے بعد خود ترکیہ میں تو یہ مراعات منسوخ کر دی گئیں لیکن چونکہ مصر اب ترکیہ سے عہدہ تھا، اس لئے برطانوی اقتدار کے فیل نہیں کا یہ فیضان، بڑی فیاضی کے ساتھ جاری رہا۔ بلکہ ۱۹۳۶ء میں ایک معاہدہ کے ذریعہ ان مراعات کی مدت غیر محدود و عرصہ کے لئے برعادی گئی۔

مصر میں ایک طبقہ ان غیر ملکی ہتکنڈوں کے خلاف تھا، لیکن فرمانا

مسرٹا لائڈس جی نے بھی جو اس وقت برطانیہ کے وزیر اعظم تھے، انکیشن کے رد پر دستبریک کر بیوی رہناؤں نے برطانیہ سے وعدہ کیا تھا کہ اگر اتحادی نفلین میں یہودیوں کے قومی وطن بنانے میں غلطی نہ ہو تو وہ اپنی تمام تر کوشش اتحادیوں کی حمایت میں صرف کر رہے گئے۔

بہر حال اگر نفلین کی موجودہ تقسیم کی گئی ہے تو وہ برطانیہ کے ان مواعید و موافقت کی بنا پر ہے جو جنگ عظیم کے دوران میں یہودیوں سے کئے گئے۔ لیکن اگر یہ یوحنا جائے کہ کیا وہ ہے کہ انگریزوں نے یہودیوں کے معاہدات کو توڑ دے کر دیئے لیکن عربوں کے موافقت کو رد کر دیا، اعتبار نہ سمجھا تو اس کی وجہ ہم سوائے اس کے کچھ نہیں بتا سکتے کہ ملکیت حوالہ کی یہی نقاشا تھا۔

در اصل نفلین کا ساحل بحرہ روم کی ایک زبردست دیوار ہے جسے برطانیہ کسی صورت میں بھی دست کش نہیں کر سکتا۔ حقیقت یہاں کی سب سے بڑی بندرگاہ ہے، اور روز بروز اس کی اہمیت بڑھ رہی ہے، عراق سے تیل کے باپ کی چوڑائی نفلین سے گزرتی ہے اس کا خرچ بھی یہیں ہے، اور فی نفلین کی ریلوں کا مرکز بھی ہے۔ علاوہ ازیں برطانیہ نے ایک ہوائی مستقر توڑ دیا، ہر بار کھلے اور دوسرا تھیلہ کی سرزمین پر قائم کیا جائے گا۔ انفرن نفلین کی عسکری سیاحی اور اقتصاد کی اہمیت ایسی ہے کہ برطانیہ اس سے اپنا انتداب ہرگز اٹھانے کے لئے تیار نہ ہوگا، اور علی الخصوص اب جبکہ بحرہ روم میں اس کے اقتدار کو ضعف پہنچ رہا ہے نفلین کا ساحل اس کی ہمدون کا آخری سہارا ہوگا۔

شاہی کمیشن کی رپورٹ سے عربوں میں قدرتنا بجا پید ہوا۔ اور وہ پیسے سے بھی زیادہ یہودیوں اور انگریزوں کا متبادل کرنے لگے، حتیٰ کہ مسٹر اینڈرو ڈیمنی ان کے سب سے محفوظ ذریعہ کے، لیکن برطانیہ نے فیصلہ کیا کہ عربوں کی اشتعال انگیز نئی کو نہایت سختی سے دبا دیا جائے، چنانچہ گورنر فوج نے اپنی طاقت استعمال کی۔ تمام نفلین پر فوجی قبضہ ہو گیا، محبس اعلیٰ توڑ دی گئی، اور اس کے ارکان قید و بند کی نذر ہوئے۔ ہر وہ گزری کا حاکم تاشا کی جانے لگی، جس کے قبضہ سے آتشیں ہتھیار نکلتا، اس کو فوراً حوالہ دار کر دیا جاتا، انکیشن میں منفی نفلین کو سبھا گیا پڑا۔ وہ فرانس میں پناہ گزین ہوا تو برطانیہ کے اشارہ پر پلٹ کر بند کر دیا گیا۔

ہیں۔ الجھڑاؤ پر اس کا سو برس سے زیادہ عرصے سے قبضہ ہے۔ اس طویل مدت میں فرانس کی حکمت عملی یہ رہی ہے کہ اہل جزائر کو اپنی زبان، مذہب، قومیت اور تمدن سے بلیکا نہ کر کے انہیں حقیقی معنوں میں فرانس کا غلام بنادیا جائے۔

اس تجویز کو پائے تکمیل تک پہنچانے کے لئے اُس نے عربی زبان کی ترویج و تدریس پر پابندیاں عائد کر دیں۔ نام نہاد "علماء" اور "صوفیاء" کی حوصلہ افزائی کی گئی۔ تاکہ "روشن خیال" نوجوان اپنے سخی شدہ مذہب سے متنفر ہو جائیں اور نئی نہیں مذہب سے عاری اور فرانسیسی تمدن کی دلدادہ بن کر نکلیں۔ جزائری عربوں کی قومیت کو فنا کرنے کے لئے یہ چال چلی کہ جو جزائری اپنی قومیت کو چھوڑ کر فرانسیسی قومیت اختیار کرنا اُس کے ساتھ خاص رعایتیں ملحوظ رکھی جاتیں، جس کے دوسرے معنی یہ ہوتے کہ اب وہ بجائے اسلامی شریعت کا پابند ہونے کے فرانسیسی قوانین کے تحت آگیا ہے۔ اور اس طرح ہر فرانس کا خیال تھا کہ اسلامی ثقافت اور عربی تمدن باطل فریت و نابود کر دیا جائے گا۔ علاوہ ازیں اہل جزائر کو فرانسیسی بنانے کے لئے عیسائی مشنریوں سے کام لیا جانے لگا۔ اور جہاں اسلام کی تبلیغ کو روک دیا گیا وہاں عیسائیت کی ترویج کی گئی۔

اگر معاند یہاں تک ہی رہتا تو شاید الجھڑاؤ میں آج اپنی بے اطمینانی نہ پھیلتی۔ لیکن اس کے علاوہ فرانس نے ساحل کی زرخیز زمینیں عربوں سے چھین کر فرانسیسی آبادکاروں کو دے دیں۔ تجارتی صنعت و حرفت اور دولت آفرینی کے تمام ذرائع پر قبوہ دی اور فرانسیسی ملین کر دیئے۔ اور جزائری ایک مزدور بن کر رہ گیا۔ ان سب باتوں کا ردِ عمل عز دہری تھا جو اب "شورش" کی صورت میں رونما ہو رہا ہے۔ اسی طرح مراکش میں بھی "شورش" سے فرانسیسی اقتدار کا قہر ہے، وہاں اگرچہ "سلطان مراکش" نام کو باقی ہے۔ لیکن دراصل سب کچھ فرانسیسی ہائی کنٹرول کے مات میں ہے۔

جنگ عظیم کے بعد اہل مراکش نے آزادی کے لئے کوشش کی۔ لیکن ان کو آرمی میں لوہا کر اس تحریک کو سختی سے کچل دیا گیا۔ مراکش میں دوسلوں کے مسلمان آباد ہیں، ایک تو عرب ہیں

وقت کے سامنے کسی قوم کو مارنے کی جرات نہ ہوتی تھی۔ آخر اتفاق سے حبش اور اطالیہ کی آپس میں جھگڑی۔ مصر نے اس نازک وقت سے فائدہ اٹھایا۔ ملک میں پرتائیں ہوئیں۔ قلباً، نے مدارس چھوڑ دئے۔ گوئی چلی، چند ایک مرے، نتیجہ یہ نکلا کہ انگریزوں نے مصری پریشیوں کو رام کرنے کی کوشش کی، مسئلہ سے قبل والا دستور بحال ہو گیا۔ وفد پارٹی برسر اقتدار آئی، برطانیہ سے معاہدہ ہوا۔ جنابا سے کے بعد یورپی مراعات کا خاتمہ کر دیا گیا۔ برطانوی دخل اندازی بہت حد تک کم ہو گئی۔ اور مصر کو جمہوریت کا کام میرا کر دیا گیا۔

معاہدہ مصر و برطانیہ کے روح رواں کس پاس و وفد پارٹی کے لیڈر ہیں۔ لیکن ملک کے اکثر لوگ (خصوصاً علماء) اُن سے راضی و خستہ ہیں کہ کیوں انہوں نے برطانیہ سے معاہدہ کیا۔ مکمل آزادی حاصل کیوں نہیں کی، چنانچہ وفد پارٹی کے خلاف شورش کھڑی ہو رہی ہے۔ اداکل دسبر میں سمس پاسا پر ہینر لوٹوں نے جو معاہدہ کے خلاف ہیں حملہ بھی کیا تھا۔ اور عام خیال یہ ہے کہ وفد پارٹی اب زیادہ دیر تک برسر اقتدار نہیں رہ سکتی۔

شاہ فاروق جو اب مصر میں حکمران ہیں عوام میں بہت ہر دل عزیز ہیں۔ سمس پاسا کو ان کی یہ ہر دل عزیز ہی ایک آنکھ نہیں سمجھتی، شاید وہ مسولینی اور ہٹلر کی طرح ڈکٹیٹر بننا چاہتا ہے، لیکن بادشاہ اور عوام اسے یہ اختیار دینے کے خلاف ہیں۔

الغرض مصر اگرچہ اب برطانیہ کا کٹ پتلی نہیں رہا۔ لیکن آپس کے جھگڑوں سے غیر اقوام کو طعنہ دینی کام شروع دے رہا ہے اُدھر سویٹزرلینڈ پر اپنی دو فوجیں بھیج کر رہا ہے۔ داؤدی نیل قریب کرنے کی خواہش مسولینی کے دماغ میں اس قدر جاگزیں ہے کہ خطرہ پیدا ہوتا ہے کہ مصر کا سبھی کہیں وہی حشر نہ ہو جو آج سے ایک سال قبل حبش کا ہو چکا ہے اور اس طرح پردہ آسمان سے گر کر مجرمین دمک جائے۔

## فرانسیسی نوآبادیات میں شورش

جب سے مسولینی نے حبش کو فتح کیا ہے شمالی افریقہ کے عربوں میں ایک ہجبان پیدا ہو گیا ہے، اور وہ آزادی کے لئے بات پاؤں مار رہے ہیں۔ فرانس کے شمالی افریقہ میں مراکش اور الجھڑاؤ دونوں مقبوضات

## فرانس میں بادشاہت کے لیے بھین

نپولین کی گرفتاری کے بعد فرانس میں جمہوریت قائم ہو گئی تھی۔ مگر وہ چند ہی سال رہی، اس کے بعد نپولین سوم آیا۔ اس نے تمام دنیا کو فتح کر کے نپولین اول کی طرز حکومت بحال کرنا چاہی، لیکن بد قسمتی سے اُن دنوں جرمنی میں لہارک چانسلر تھا۔ جو نپولین سوم سے کہیں زیادہ مدبر اور سیاست دان تھا۔ چنانچہ مشہور میں نپولین سوم کے خواب پریشان ہو گئے اور وہ انگلستان جا کر فوت ہو گیا۔

اس کے بعد حکومت جمہوری کا آغاز ہوا۔ جو آج تک قائم ہے، لیکن کبھی کبھی وہاں ایسے اشخاص پیدا ہو جاتے ہیں جو اپنے آپ کو نپولین کی اولاد کہتے ہیں۔ اور تخت و تاج واپس مانگتے ہیں۔ چنانچہ ستمبر میں فرانس کے ٹولیک ڈی گائی نے اعلان کیا کہ وہ فرانس کے امپری بادشاہ لائی کے خاندان میں سے ہے۔ اس لئے تخت و تاج اُسے واپس ملنا چاہئے۔ علاوہ ازیں فرانس میں آج کل عام بے چینی بہت بڑھ رہی ہے۔ اس کی وجہ سیاسی اور اقتصادی دونوں ہیں۔ مئی ۱۹۳۷ء میں میونسپل کے ٹین کا واقعہ ہوا جس میں کئی وزرا بھی شامل تھے۔ آخر حزب سازش کا انکشاف ہوا تو وزارت کو مستعفی ہونا پڑا۔ اُس وقت فرانس میں مسٹر پائیس وزیر اعظم تھے۔ اپنے قومیوں نے اس معاملہ کو دبانے کی کوشش کی۔ مگر یہ اتنا اہم تھا کہ دب نہ سکا۔ چنانچہ دوسری وزارت آئی۔ لیکن فاشسٹوں نے اس کو تو کوہ پات سے نہ جانے دیا، اندھی بھوک مر کر کالے خلافت پر و گیلڈز لڑا۔ بد قسمتی سے وہ حکومت پر قابض نہ ہو سکے۔ اُس وقت سے لے کر حزب اختلاف اور حزب المطالبین میں خوب لے دے ہو رہی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ بین الاقوامی حالات نے بھی اپنا اثر کیا اور ان دونوں پارٹیوں کے اختلافات کی غلیج وسیع سے وسیع تر ہوتی گئی۔

آج یہ حالت ہے کہ ایک برٹشٹ حکومت برسرِ اقتدار ہے، مگر فاشسٹ برادر اُس کو ناکام بنانے برتنے ہوئے ہیں۔ چنانچہ اس سال ایک سازش کا جو فاشسٹوں کی طرف سے کی جا رہی تھی انکشاف نہ ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ اس کے لئے کئی ماہ سے تیاریاں ہو رہی تھیں۔ خیر کئی امداد

جو زیادہ تر ساحلی علاقوں میں اقامت گزین ہیں اور دوسرے بربر ہیں جو اندرون ملک اور پہاڑوں میں رہتے ہیں۔

عرب بیشتر تعلیم یافتہ ہیں، عربی اُن کی مادری زبان ہے۔ لیکن بربر عربی زبان اور اسلامی ثقافت سے ایک حد تک بیگانہ ہیں، فرانس نے بربروں کو عربوں کے خلاف اُگسا اور اُنہیں عربی زبان، اور اسلامی مذہب سے بالکل علیحدہ کرنے کے لئے اُن میں "بربری قومیت" کا خیال پیدا کیا۔ اُن کی مادری میں عربی زبان کی درسگاہیں بند کر دی گئیں اور مسلمان و اعلیٰوں اور مدرسوں کو بربروں تک پہنچنے سے روک دیا گیا۔ اب تاک بربر اسلامی شریعت کے تابع تھے، لیکن فرانس نے شرعی عدالتیں منسوخ کر کے فرانسیسی قانون نافذ کیا، اور جزائر کی طرح عیسائیوں کو ملک بھر میں پھیلا دیا۔

ان سب اقدامات کا نتیجہ یہ ہوا کہ اہل مراکش میں بے چینی بڑھ گئی، ان اصلاحات کو نہ صرف عرب بُری نگاہ سے دیکھتے ہیں بلکہ خود بربر بھی اُن کے خلاف ہیں۔

مراکش کی اس صورت حال نے اسپین کی غارتگری کی وجہ سے اور بھی نازک صورت اختیار کر لی ہے۔ مراکش عرب دیکھتے ہیں کہ اُن کے پڑوسی اسپینی مراکش کے باشندے فرانکو کی فوج میں دھڑا دھڑ بھرتی ہو رہے ہیں۔ لیکن وہ ہنوز فرانسیسی غلامی کی رنجیدگی میں مستعد ہیں، اور مسولینی عربوں پر خاص عنایات و نوازشات کی پارسش کر رہا ہے جس سے مراکش کے عربوں کو اور زیادہ شعلہ ہے۔ شمالی افریقہ کے عرب ہر ملہ سے نفرت محسوس ہیں، کیونکہ وہ یہودیوں سے تنگ آئے ہوئے ہیں، اور ہٹلر کی یہودی دشمنی زبان زدِ حلق ہے۔

یہ اہل چل سرٹ مراکش اور الجزائر تک محدود نہیں، بلکہ اس کا اثر ٹونس میں بھی ہے۔ وہاں کلہ شہور شاہ عبدالعزیز آتش لہی ایکسٹری کی جلاوطنی کے بعد واپس ٹونس پہنچ چکا ہے اور ملک کی مردہ تحریک میں از سر نو جان بڑ گئی ہے۔

فرانسیسی حکومت نے ان جھگڑوں کا تصفیہ کرنے کے لئے ایک کانفرنس بلائی ہے۔

سننے پر آمادہ ہو جائیں گے۔ دو سال کے بعد ہماری بات پر غور کرنے لگ جائیں گے۔ تین سال کے بعد وہ یہ بھی سوچنے لگ جائیں گے کہ اس مطالبہ کو کیسے پورا کیا جائے؟

جو لوگ ہر ملکی طبیعت کو سمجھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ ہر ملکی بائیں بنانے والا نہیں بلکہ وہ نہایت عملی آدمی ہے، اُس نے اپنے ملک میں خاص اسی غرض کے لئے ایک ملکر بنایا ہے جس کا انچارج برطانوی کابینہ سفیر وان رہن ٹراپ ہو گا۔ اس ملکر کا مقصد صرف لڑا با دیات کی دلچسپی ہو گا۔ اور یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ ہر ملکی یا سو لینی اپنے ارادوں کی تکمیل کے لئے کیا ذریعہ اختیار کیا کرتے ہیں۔

اس وقت کی ملکات میں جو جرمنی کا ساتھ دینے کے لئے تیار ہیں، اٹلی اور جاپان تو پہلے ہی اُس کے ہم آہنگ ہیں۔ فرانس کے فائشٹ بھی اُس کے مطالبہ سے ہمدردی رکھتے ہیں۔ بلجیم کی ڈیگرل پارلی اُس کے ساتھ ہوگی، پرتگال، آدھا اسپین اور پولینڈ کا کافی حصہ اُسے امداد دے گا۔

اب افریقہ میں بھی اُس کے حامی پیدا ہو رہے ہیں۔ مثلاً ساؤتھ افریقہ کی حکومت کے وزیر سر ڈی ڈالٹر نے اس مطلب کا ایک اعلان بھی کیا تھا۔ پس جب بہت سے ملکات اور لوگ جرمنی کی پشت پر ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ اپنا مطالبہ نہایت زور سے پیش نہ کرے۔

سننا جاتا ہے کہ لارڈ بیلی ٹیکس نے ہر ملکر سے ملاقات کے وقت انگلستان کی طرف سے کہا کہ اگر جرمنی دس سال تک اپنی لڑا با دیات کا مطالبہ نہ کرے تو اُس کے عوض انگلستان اسے مرکزی یورپ میں اپنی پہلی ملکیت مانگنے میں کوئی رکاوٹ حاصل نہ کرے گا۔ اس سے فرانس اور مرکزی یورپ میں قدرتنا تشویش برپا ہو گئی، فرانس کے دو وزرا انگلستان گئے اور برطانوی وزرا سے ملاقاتیں ہوئیں۔ ملاقات کے بعد اعلان کیا گیا کہ دونوں ملکات کے سفاد یکساں ہیں۔ جس سے خطہ بھی بہت حد تک دور ہو گئی۔

## بلجیم کی غیر جانبداری

سارا کنوینشن کو ہر ملکر نے منجھ سے یہ وعدہ کیا کہ وہ آئندہ اُس کی غیر جانبداری کی قدر کرے گا۔ بلکہ اگر کسی اور ملک نے اس پر حملہ کیا تو

یہی نیا ہوتی نظر آتی ہے۔ اس سلسلہ میں کسی ملکر کا مشیاء ہو میں اور ہم۔ لیکن مشیاء نہیں لیں وغیرہ بہت سا جگہ کا سامان برآمد ہوا ہے۔ ایک فٹسٹر سٹیم سائٹ وزیر علم کے گھر کا بھی دستیاب ہوا تھا۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت سی چیزیں ملی تھیں جن سے صاف پتہ چلتا ہے کہ یہ سازش ایک وسیع پیمانے پر مرتب کی گئی تھی۔ اس سازش میں حصہ لینے والوں کو لگیو لارڈز یا (لقاب پوش) کہا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں بہت سی گرفتاریاں ہوئی ہیں جن میں محمد و گیلز میں کے فائشٹوں کا لیڈر کرنل ڈی ولگ بھی تھا۔ اس شخص نے فرانس میں بعض خفیہ سوسائٹیاں بنائیں جن میں سے

اور

مشہور ہیں۔ ان کا کام بادشاہت کو واپس لانے کی کوشش کرنا ہے۔ فرانس میں مخالفین اشتراکیت کی بہت سی آہنیں ہیں۔ لیکن باوجود کوشش کے یہ اب تک مجتمع نہیں ہو سکیں۔ ورنہ شاید ان کو اپنے مقصد میں کامیابی حاصل ہو جاتی۔

## جرمنی کا نوآبادیات کے لئے مطالبہ

جرمنی کئی سال سے دماغ جنگ کی چھینی ہوئی نوآبادیات کی دلچسپی کا مطالبہ کر رہا ہے۔ لیکن جس شد و مد سے اُس نے یہ سعادت میں اٹھایا اُس کی مثال شاید کسی پہلے سال میں نہ مل سکے گی۔

آج سے پانچ سال قبل جرمنی کے سابق چانسلر وان بان نے کہا تھا کہ معاہدہ ورسائی پر ہر صورت نظر ثانی کی جائے گی۔ اور اس میں یہ ترمیم ضرور ہوگی کہ جرمنی کی نوآبادیات واپس کی جائیں۔

اس کے دو سال بعد ہر ملکر نے اپنا شروع کیا کہ عالمگیر امن کے لئے ضروری ہے کہ جرمنی کی نوآبادیات واپس کی جائیں۔ اُس وقت کسی نے بھی خیال نہ کیا کہ معاہدہ حد تک پہنچنے والا ہے۔ لیکن ہر ملکر اور اُس کے رفقاء کی تعداد کا مجموعہ دو دھان اقوام عالم کے لئے یقیناً فکر انگیز ہے۔

سترہ میں ہر ملکر نے ایک تقریر کی جس میں صاف طور پر کہہ دیا کہ ہم اپنی نوآبادیات کی دلچسپی کا مطالبہ کسی بند نہیں کر سکتے۔ ہم اُسے ہر سال بند سے بلند تر آوازیں پیش کرتے رہیں گے۔ حتیٰ کہ دول عالم اُس کو سبزو محمد، محمد، محمد اُس نے کہا۔ ایک سال کے بعد لوگ ہماری بات

وہ اس کی مخالفت کرے گا۔

سیاسیات یوروپ میں بلجیم کی حیثیت کو سمجھنے کے لئے یہ جانا چاہیے کہ یہ ملک فرانس اور جرمنی کے درمیان واقع ہے۔ بدیں وجہ جب تک یہی فرانس اور جرمنی کے درمیان جھگڑا اٹھتا ہے تو اس کا نقصان بلجیم کو مزور ہو جاتا ہے۔ بلجیم کو کئے۔ لوہے اور فولاد کا مشہور مخزن ہے۔ علاوہ ازیں یہاں سکے بنیادہ حربت اور روپی بھی کافی مل جاتی ہے۔

یہ اس کی اس اہمیت کا بھی نتیجہ ہے کہ دنیا کی اکثر بڑی بڑی لڑائیاں اس کے میدانوں میں لڑی گئیں۔ چنانچہ وائرل و پروٹین۔ کورٹرائی۔ بلین جیم۔ اور پیرس کی جنگیں اسی جگہ پر ہوئی تھیں۔ پس اگر بلجیم کو ہندوستان کا پانی پت کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

۱۹۱۴ء کے صلح نامے کے مطابق بلجیم کو آزادی حاصل ہوئی۔ وہاں کے رہنے والوں نے اپنی نازک پوزیشن کو جانچ لیا، اور اُنہیں محسوس ہو گیا کہ وہ وزیر دست ملکوں کے درمیان ہیں۔ اس لئے خیرِ اسی میں ہے کہ وہ غیر جانبدار رہیں۔ اسی نظریہ کے مطابق ۱۹۱۹ء تک وہ کسی جنگ میں شریک نہ ہوئے۔

چونکہ بلجیم نے انگلستان وغیرہ کے ساتھ معاہدات کیے کہ وہ اسکی غیر جانبداری کی قدر کر سگے، اس لئے جنگِ عظیم کے موقع پر انگلستان نے فرانس اور جرمنی سے قول مانگا کہ وہ بلجیم پر چڑھائی نہ کریں گے۔ فرانس نے فوجت وعدہ کر دیا۔ لیکن جرمنی نے صاف انکار کر دیا۔ کیونکہ اس کی اہل غرض بلجیم کے راستے فرانس پر حملہ کرنا تھا۔ جب مقدمہ آیا تو بلجیم نے جرمن فوجوں کو اپنے ملک میں سے گزرنے کی اجازت نہ دی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جرمنی نے بلجیم پر دھاوا بول دیا۔ اور اس کی حفاظت کے لئے انگلستان بھی جرمنی کے خلاف ہو گیا۔

جنگ کے بعد بلجیم نے پھر اپنی غیر جانبداری کے لئے دیگر ممالک سے اقرار لیا۔ لیکن جب سے ہر ہٹلر برسرِ اقتدار آیا ہے بلجیم کے خطرات اُس بھی بڑھ گئے ہیں، اسی لئے اس نے ہر ہٹلر سے اپنی غیر جانبداری کی قدر کرنے کا معاہدہ کر دیا چاہا اور وہ اس مقصد میں بہت حد تک کامیاب ہوا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ہر ہٹلر ایسا ڈکٹیٹر اپنے وعدہ پر قائم رہے گا؟

بلجیم میں اس وقت جمہوری حکومت ہے، اور وزیر سے پہلے اس وزیرِ مملکت وینزی لینڈ تھا۔ اس جمہوریت میں ایک فاشسٹی پارٹی بھی ہے، جس کا لیڈر ڈیگزل ہے۔ یہ وینزی لینڈ کا سخت دشمن ہے، اور ہر وقت اس کو گرانے کی کوشش میں لگا رہتا تھا۔ یہاں تک لذت آئی کہ مسٹر وینزی لینڈ نے اس کے ساتھ ایک آخری فیصلہ کرنے کا ارادہ کر لیا۔ چنانچہ انتخابات ہوئے۔ جس میں ڈیگزل کی ہری طرح شکست ہوئی۔ لیکن ڈیگزل نے بہت نہ ہاری۔ اور وینزی لینڈ پر یہ الزام لگایا کہ وہ اپنی وزارت کے ایام میں نیکل تنک ۳۰۰ پونڈ سالانہ حاصل کرتا رہا ہے۔ پارلیمنٹ میں عدم اعتماد کی تحریک پیش ہوئی۔ لیکن ڈیگزل کو صرف ۴۳ ووٹ ملے، اور وینزی لینڈ کو ۱۳۴۔

اگرچہ وینزی لینڈ کو بھاری اعتماد حاصل ہوا۔ لیکن اس نے ایسے ذمہ دار جگہ پر قائم رہنا مناسب نہ سمجھا۔ چنانچہ اس نے اپنا استعفیٰ داخل کر دیا۔

استعفیٰ کے بعد بلجیم کے بادشاہ لیوپلڈ نے وین ڈیگزل کو دعوت دی کہ وہ وزارتِ مملکت کرے۔ لیکن اس نے انکار کر دیا۔ پھر ہینری ڈی مان کو جو ایک اشرافیہ ہے اور گزشتہ وزارت میں وزیرِ مالیات رہ چکا ہے، یہ عہدہ دیا گیا۔ لیکن لیوپلڈ نے اس کے ساتھ تعاون کرنے سے انکار کر دیا جس کی وجہ سے اس کی وزارت زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکی۔ بعد ازاں یہ کام ہینری لٹ وڈر وزیرِ زراعت کے سپرد کیا گیا۔ لیکن وہ بھی ناکام رہا۔ لہذا آجوز کی گئی کہ ایک مشترکہ وزارت قائم ہو لیکن یہ بھی نہ ہو سکا۔ بعد ازاں مسٹر سپاکر کو جو سپریم کورٹ کا جج تھا، وزیرِ مملکت بنا دیا گیا۔ لیکن اسے بھی کامیابی نہ ہوئی۔

اس کے بعد مسٹر لیوپلڈ نے سوچا کہ بہتر ہوگا اگر چند دن تک اس مسئلہ کو نہ چھیڑا جائے تاکہ لوگ اطمینان سے اس پر غور کر سکیں۔ چنانچہ وہ پانچ روز کے لئے انگلستان چلا گیا۔ وہاں سے واپس آکر اسے سابق لبرل وزیرِ مملکت ہال جانسن کی ترتیب وزارت کا کام سپرد کیا۔ لیکن وہ بھی ابھی چند دن کی کوشش کے بعد ہار چکا کہ مہدیو گیو۔ کیونکہ آئین کیوں نے اس کی مخالفت کی۔

ان حالات سے ظاہر ہے کہ بلجیم میں خانہ جنگی ہو رہی ہے۔ وزیرِ مملکت

اور اس مقصد کے وہ تعمیری پروگرام کا حامی ہے۔ چنانچہ اس نے پانچواں اقتصادوی پروگرام اسی غرض کے بنائے ہیں۔ روس میں موجودہ دور دہشت کے خلاف عام بے چینی پھیل رہی ہے اور لوگ آمریت سے اٹھائے ہیں۔ ان کا مطالبہ از سر نو سٹھائے قائم کرنے کا ہے، اور کوئی بعید نہیں کہ کسی وقت موجودہ حکومت کو عاتقہ الناس کے اسی مطالبہ کے سامنے جھکنا ہی پڑے۔

## آئرلینڈ کا نیا دستور

آئرلینڈ مدت سے اپنی آزادی کے لئے کوشاں ہے۔ بدیں وجہ وہاں کے واقعات ہندوستان کے لئے علی الخصوص وجہ مہی ہیں۔ جولائی ۱۹۴۸ء میں آئرلینڈ کے عام انتخابات ہوئے۔ ڈی ولیر اور ان کی گزشتہ وزارت کے اکثر اراکین بغیر مغلوب ہو گئے۔ لیکن انہوں نے یہ دہاکہ ڈھکی دھرائی کہ سیاسی جماعت نیا نیشنل کو اتنی اکثریت حاصل نہ ہو سکی کہ وہ بغیر کسی دوسری جماعت کی امداد کے حکومت کا کاروبار چلا سکے۔

کل ۱۶ نشستیں تھیں، جن میں سے ۶۹ ڈی ولیر کی پارٹی کو ملیں اور باقی ۶۹ دیگر پارٹیوں کو۔ ڈی ولیر اگر اپنی وزارت قائم کرنے کے لئے کسی دوسری جماعت کے ساتھ مل کر حکومت چلا سکتے ہیں۔ لیکن حیرت یہ ہے کہ پارٹی کو سیاسی اعتبار سے قطعاً کوئی شغف نہیں ہے، بدیں وجہ شاید ڈی ولیر کی پارٹی زیادہ ویرانہ پر برسرِ اقتدار نہ رہ سکے۔ اور دوبارہ چناؤ لانا پڑے۔

عام انتخابات کے ساتھ ساتھ آئرلینڈ میں نئے دستور اسامی پر قوم کی رائے حاصل کی گئی تھی۔ اور قوم نے بڑی بھاری اکثریت کے ساتھ اسے منظور کیا۔

اس دستور کا سب سے بڑا خاصہ یہ ہے کہ اس میں بادشاہ یا سلطنت برطانیہ کا نام تک نہیں لایا گیا۔ اس دستور کی اہم دفعات کا خلاصہ یہ ہے۔

ملک کا نام EIVE ہو گا۔ ریاست کا حاکم اعلیٰ "صدر" کہلائے گا۔

ایک ہر دہائی آزاد رہے گا۔ لیکن وہ اپنے وقار کی خاطر مستعفی ہو چکا ہے۔ ڈیولر کا خیال ہے کہ وہ خود وزیرِ اعظم بنے گا۔ کیونکہ غالباً وہ جرمنی کی شہ پر پانچ رہا ہے، لیکن سوال یہ ہے کیا اشتراکی فرانس کے "ڈنٹ" پاپولر کی امداد حاصل نہ کر سکیں گے؟

## اسٹیلن کی ٹراشکی دشمنی

شہر میں ہم سرور اخباروں میں پڑھتے رہے ہیں کہ روس میں آج اتنے آدمیوں کو لگی کاٹھن نہ بنا دیا گیا، اور آج اتنے آدمی بھانسی کے تختے پر لٹکا دئے گئے۔

بات دراصل یوں ہے کہ روس کا موجودہ ڈکٹیٹر جوزف اسٹیلن لینن کے دستِ راست ٹراشکی کے سخت خلاف ہو چکا ہے، اور ملک میں جو کوئی بھی اس کی حامی نظر آتا ہے اس کو موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا ہے، کچے میں مرنے سے پہلے لینن نے اپنی بھری جاکھیاں سے صاف الفاغانیں کہا تھا کہ میری وفات کے بعد اسٹیلن کو روس کا ڈکٹیٹر بننے دینا۔ اسٹیلن اس وقت کیونسٹ پارٹی کا سیکریٹری تھا، جب اسے اس بات کا علم ہوا تو اس نے گورچکا کی طرح درغلز کا تمام کاغذات جھین لئے۔ اور لینن کی وفات کے بعد سب سے پہلا کام یہ کیا کہ اس کے حامیوں کو چن چن کر اپنے ملک سے باہر نکالنا شروع کر دیا۔ ٹراشکی اس کا سب سے بڑا دشمن تھا۔ علاوہ ذاتی عناد کے ان کے درمیان اصولی اختلاف بھی تھا۔ چنانچہ جب اسٹیلن برسرِ اقتدار آیا تو اس نے ٹراشکی کو نہ صرف غدار قرار دیا بلکہ وہاں بھی کر دیا۔ اس کے تمام اصولوں کو خلاف قرار دے قرار دے دیا جس کا مطلب یہ تھا کہ ٹراشکی کے حامی بھی روس میں زندہ نہیں رہ سکے۔

ٹراشکی کوئی معمولی آدمی نہ تھا۔ روس کا انقلاب زیادہ تر یہی شخص کا مرہونِ منت ہے۔ چنانچہ اس کے حامی بھی کم نہ تھے، لیکن لینن نے ان کو ڈھونڈ لیا۔ ڈھونڈ کر باہر نکال دیا اور خود تختہ دار پر چڑھا دیا۔ اسٹیلن اور ٹراشکی کے درمیان اصولی اختلاف یہ ہے کہ یہ چاہتا ہے کہ انقلاب عالمگیر ہو اور تمام ممالک یک وقت اشتراکیت پسند بنا دئے جائیں۔ لیکن وہ پہلے روس کو کمیونزم کا مکمل نمونہ بنانا چاہتا ہے

قبول کر لے گئے۔

جدید دستور اساسی کے پہلے تین ماہ میں چونکہ کانگریسیوں نے عہدے قبول نہ کئے تھے۔ اس لئے رجعت پسندوں کی عارضی وزارتیں قائم کی گئیں۔ جنہوں نے کانگریسی پروگرام کی نقیص اتارنا چاہیں۔ لیکن قومیت پسندی کے اس بڑھتے ہوئے سید میں ان کی بیل منڈ سے نہ چڑھ سکی۔ اور جب کانگریسیوں نے قبول وزارت کا فیصلہ کر لیا تو انہیں مستعفی ہونا پڑا۔

پچھلے کانگریسی منسٹری صرت چھ صوبہ جات میں بسکی۔ لیکن بالآخر صوبہ سرحد میں بھی قائم ہو گئی۔ گو یا ستیہ میں کانگریس سات صوبہ جات میں برسرِ اقتدار رہی۔

کانگریسی وزارتوں کے سامنے بہت سا کام پڑا ہے۔ جن کو بایں تکلیف تک پہنچانے میں ہی ان کی کامیابی یا ناکامی کا راز مضمر ہے۔ مثلاً بیکاری کو دور کرنا، تعلیم پھیلانا، شہری حقوق کی حفاظت۔ قیدیوں اور نظر بندوں کی رہائی۔ رعایا اور راجہ کے درمیان بے تفریقیت، بھائی اور بھائی کے درمیان بہتر صلہ و وصل کے ذرائع۔ زمینداروں اور کاشتکاروں کے درمیان بہتر صلہ و دیانت، سدھار۔ ترک مسکرات۔ اور صنعتی بھارتی و زرعی ترقی کے وسائل سونپنا، وغیرہ

ظاہر ہے کہ ان سب کاموں کے لئے کثیر مقدار میں روپیہ درکار ہے۔ لیکن زرگری اور محامل وغیرہ کے شعبہ جات، مرکزی گورنمنٹ کے ہاتھ میں ہیں۔ اسی طرح فوج اور بڑے بڑے افسروں کی تنخواہوں میں کاٹ کر کے جو بچت ہو سکتی تھی وہ بھی کانگریسی وزیروں کے اختیار میں نہیں ہے۔ اگر وہ قرضہ اٹھائیں تو اس کے لئے بھی اول تو ایسی کا طریقہ نظر رکھنا ہوگا اور دوسرے اس باب میں بھی گورناروں اور جنرل کی خوشنودی شرط ہے۔

اس سبکی اور بے بسی کے باوجود کانگریسی وزراء نے بہت کچھ کیا ہے اور اس کی قدر کرنا محض تعصب واری ہے۔ مثلاً کانگریسی صوبہ جات میں سیاسی قیدیوں اور نظر بندوں کو رہا کر دیا گیا ہے۔ اخباروں اور تعزیرات پر سے پابندیاں اٹھائی گئی ہیں۔ ابتدائی تعلیم اکثر جگہ لازمی کر دی گئی ہے۔ ترک منیتاں کے قوانین پاس ہو رہے ہیں۔ انڈیجینز کو

آس قوم براہ راست سات برس کے لئے منتخب کیا کرے گی۔ یہ صدر ڈیل DEIL یعنی دارالمنہوین کے اجلاس طلب کرے گا۔ اسے براہ راست کرے گا۔ قوانین پر دستخط کرنے، سزاؤں کا معاف یا کم کرنا مثیل آرمی کی اعلیٰ کمان اپنے ہاتھ میں رکھنا وغیرہ بھی اس کے فرائض ہوں گے۔

ڈیل کا انتخاب سنا سب نمائندگی کے اصول پر براہ راست ہوگا۔ ہر عامل بالغ کو حق رائے فہم دہی حاصل ہوگا۔ سینٹ (ایا ایوان اعلیٰ کے ساٹھ رکن ہوں گے وغیرہ ذاکم۔

## ہندوستان میں آئین جدید کا تجزیہ

سلسلہ میں غیر مالک میں اور بھی بہت کچھ ہوا۔ لیکن چونکہ وہ بہت ادا بہت یا عام محسوس نہیں ہے، اس لئے ہم اسے چھوڑتے ہیں اور اپنے دس کی طرف آتے ہیں۔

اچرل سلسلہ سے ہندوستان میں نیا دستور اساسی نافذ کر دیا گیا۔ چونکہ انتخابات میں کانگریسی کثیر تعداد میں کامیاب ہو کر آئے تھے۔ اس لئے قدرتی طور پر سوال یہ پیدا ہوا کہ آیا انہیں وزارتیں قبول کرنا چاہئیں یا نہیں۔ اشتراکیت پسندوں کا خیال تھا کہ عہدے قبول کرنے سے ہم اسپیرلٹیشن کے کل پرنسپل بن جائیں گے۔ اور اسی طرح پرگورنمنٹ کے ہماری جنگ کا اصل متغیر فوت ہو جائے گا۔

دوسری طرف اعتدال پسند یہ کہتے تھے کہ بالکل نہ ہونے سے کچھ تو بہتر ہے۔ ہمیں اپنے دس کی خدمت کا جس قدر بھی موقع ملے اس سے فائدہ اٹھانا چاہئے۔ نیز اگر ہم عہدے قبول کر لیں گے تو عوام کانگریس کی طرف زیادہ مائل کر سکیں گے۔ اور آئندہ ہمیں آئین جدید کے مشبہ فیڈریشن کو ستر و کرنے میں آسانی رہے گی۔

پہلے اس جھگڑے کے تصفیہ کے لئے کانگریس کا ایک خاص اجلاس تمام دہی منعقد ہوا۔ اور بہت کچھ لے دے کے اجد ہوتا گاڈھی کا یہ اصول منظور ہوا کہ عہدے صرت اسی صورت میں قبول کئے جائیں۔ اگر گورنر کانگریسی وزراء کے لائحہ عمل میں عدم مداخلت کا یقین دلا دیں۔ گورنروں نے اس بارے میں اصرار کیا۔ لیکن آخر دائرے ہند نے کچھ گول مول کی تقریر کی۔ اور کچھ جہاں گاڈھی جھکے۔ اور آخر کار عہدے

بحث نہیں ہو سکتی۔ بہر حال اسلامیان ہند کو سامنے یہ مسئلہ بار بار رکھا جا رہا ہے، اور ستم ظریفی یہ کہ ”مولوں“ سے بھی اس کے متعلق فتوے پوسچے جا رہے ہیں کہ شاید عجول چوک کہیں کا نگریں اور مسلم لیگ کا قرآن مجید اور احادیث و تفاسیر میں ذکر آیا ہو! —————

اکتوبر میں مسلم لیگ کا ایک سالانہ اجلاس مشرقِ جناح کی زیرِ صدارت لکھنؤ میں منعقد ہوا تھا جس میں ایک تو نعلب العین تبدیل کیا گیا، اور دوسرے وظائف کی سخت مخالفت کی گئی۔

دو دنوں عہدے انہی ذات میں نہایت خوب تھے، لیکن کانگریس میں شمولیت کے راستے میں کیا چیز مانے ہے، اس کا جواب اربابِ مسلم لیگ نے سوائے اظہارِ ذاتی پر خاش اور عناد کے سما حل کچھ نہیں دیا۔ زیادہ سے زیادہ مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ اور اندفاع کا خیال ہے، لیکن یہ بات ابھی قابلِ تصنیف ہے کہ کانگریس کی اکثریت اگر بغرض محال ”اسلامی حقوق“ پر چھاپا رہا بھی دے تو مسلم لیگ عیادہ رہ کر انہیں محفوظ کیسے رکھ سکی؟

کے عہدے اڑا دئے گئے ہیں۔ وزراء اور اراکین اسمبلی کی تنخواہوں اور معاوضوں میں اگر نقد رکھی واضح کی گئی ہے، اور ان کا شمار سادگی اور خوش اخلاقی قرار پایا ہے، مزید برآں پولیس کو حملہ کیا گیا ہے کہ وہ پبلک کے ساتھ مظلومانہ کی بجائے خادمانہ سلوک کر دیں۔ نیز مصنفی، ذرا اعلیٰ اور بیکاری کو دور کرنے کا پروگرام زیرِ عمل لایا جا رہا ہے جس کو پیشینہ کے لئے ظاہر ہے کہ ابھی ایک عرصہ درکار ہو گا۔

الغرض کانگریسی ہوجبات میں کافی کچھ ہو چکا ہے اور بہت کچھ کے لئے متجاویزِ ضروری ہیں۔ ان کی حالت کم از کم پنجاب، بنگال اور سندھ ایسے رحبت پسند منصوبوں سے بہتر ہے۔ جہاں ابھی وزارتوں کا نشانہ نہیں غالب ہے کہ وزراء ملک اور عامۃ الناس کی طرف توجہ نہیں کر سکتے۔

آئین جدید کے نفاذ کے بعد ایک اور ضروری مسئلہ جو عوام کے سامنے لایا گیا ہے یہ ہے کہ آیا مسلمانوں کو کانگریس کے ساتھ اتحاد عمل کرنا چاہیے یا مسلم لیگ کے ساتھ۔

یہ تو ایک رائے کا سوال ہے، اس لئے اس مضمون میں اس پر

## مسلمانوں کے رہبر

نظاقت ہے نہ ذہنت ہے نہ ایاں  
سیاست زادہ سرِ مایہ داران  
جہاں ٹکرائے ہیں انجیل و قرآن  
سیاست جن کی ہے آیاتِ فرقان  
ذرا بڑھو آئے دو حرفِ قرآن  
کر سن گئے تازہ یہ آئینِ مسلمان؟  
کبھی ہند دسے ہیں دست و گریباں  
جو دمیعیں خواب میں بھی تیغِ عریان  
یہی ہیں پیرو فاروقِ دیشان

وہ آتے ہیں مسلمانوں کے رہبر  
جنوں پروردہ علمِ سرنگی  
اُسی منزل پہ یہ پیدا ہوئے ہیں  
امارت جن کی ہے ریاستِ حق ہے  
سمجھئے معنی تو حیدر ان سے  
ذرا بھوائے حق بات ان سے  
کبھی انگریز کی خدمت میں عرضی  
نہ نکلیں عمر بھر کو کھٹی سے اپنی  
یہی ہیں رہبرانِ قومِ حیدر

یہی ہیں گمسلمانوں کے رہبر  
ہے کا فر جو رہے اب بھی مسلمان

# گاندھی ازم اور شوینزم

پنڈت جواہر لال نہرو

گاندھی جی ایک محبوبہ انداز ہیں، اور میرا خیال ہے کہ سب بڑی شخصیتیں کسی حد تک ایسی ہی ہوتی ہیں، سا لہا سال سے میں انھیں میں ہوں کہ آخر اس تمام محبت اور لطف کے باوجود جو انھیں مغربوں کے ساتھ ہے وہ کیوں ایسے نظام کی حمایت کرتے ہیں جو خود وہی لوگوں کو انھیں بناتا ہے اور پیسہ نہیں لگتا ہے؟ اس کی کیا وجہ ہے کہ وہ عدم تشدد کی اس قدر جوش و خروش سے متعین کرتے ہیں اور اسی کے ساتھ ایک ایسے سیاسی اور -حاشیہ نظام کے حامی ہیں جس کی بنا دہر و تشدد پر ہے، لیکن شاید یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ وہ اس نظام کے حامی ہیں۔ اصل میں وہ ایک تہ کے راجہ فیسے کے قائل ہیں، لیکن چونکہ راجہ ریاست کا قیام ابھی بہت دور ہے اور اس کا آسانی سے تصور بھی نہیں کیا جاسکتا، اس لئے وہ چار دھانچا موجودہ نظام کو قبول کرتے ہیں۔ میرے خیال میں سماجی نظام کو تشدد کے ذریعے سے بدلنے پر انھیں جو اعتداعن ہے وہ محض وسائل تک محدود نہیں ہے۔ اس لئے کہ وسائل سے قطع نظر کر کے اس نظام کو بدلنے کا ایک ایسا نصب العین مقرر کیا جاسکتا ہے جو مستقبل قریب میں عمل ہو سکے۔ کبھی کبھی وہ اپنے آپ کو اشتراکی کہتے ہیں، لیکن وہ اس لفظ کو ایک خاص معنی میں استعمال کرتے ہیں جو انھیں کے ذہن میں ہیں، اور ان کی اشتراکیت سوسائٹی کے اس معاشی نظام سے کوئی تعلق نہیں، جو بالعموم اشتراکیت کے نام سے مشہور ہے، ان کی تقلید میں بہت سے متنازع

کا گاندھیوں نے بھی اس لفظ کا استعمال شروع کر دیا ہے، اور اس سے ان کی کڑی مراد: ایک تہ کی انسانی ہمدردی ہے۔ سیاسی اصطلاحوں کا یہ بہم استعمال انھیں حضرات کے لئے مخصوص نہیں، بلکہ بہت بڑے بڑے آدمی ان کے سامنے برطانیہ کی نیشنل گورنمنٹ کے وزیر اعظم کی مثال موجود ہے، میں جانتا ہوں گاندھی جی اس موضوع سے ناواقف نہیں ہیں۔ انھوں نے معاشیات، اشتراکیت، بلکہ مارکس کے فلسفے پر بھی متعدد کتابیں پڑھی ہیں، اور اس پر دوسروں سے بحث اور تنازعہ خیال کر چکے ہیں، لیکن میرا روز بروز یہ خیال ہوتا جاتا ہے کہ اہم معاملات میں عقل و دماغ بجائے خود ہوا کی کچھ زیادہ رہنا ہی نہیں کر سکتے۔ ولیم جیمز نے لکھا ہے: "اگر تمہارا دل نہ چاہے تو یقیناً تمہارا دماغ تمہیں کبھی قائل نہیں کر سکتا، جذبات ہمارے تصور زندگی پر حاوی ہیں اور دماغ پر حکومت کرتے ہیں، ہماری گفتگو خواہ وہ مذہبی ہو یا سیاسی یا معاشی، اصل میں جذبات اور وجدان پر مبنی ہوتی ہے، جیسا کہ

۱۔ اپنے ایک پیام میں جو دست پسند اور اتحادی پارٹی کی متحدہ آئین کو جس کا جلد چھوٹے میں اڈہنگ میں ہوا بنایا گیا تھا، سر ریمز نے سکاٹلینڈ فرماتے ہیں: "زمانے کی مشکلات ہر قدم کو سخت ہونے اور ایک مرکز پر جمع ہونے پر مجبور کر رہی ہیں۔ یہ حقیقی اشتراکیت ہے۔ یہ حقیقی قیمت بھی ہے۔ بلکہ یہ حقیقی انفرادیت بھی ہے۔"

سلسلہ میں لکھا تھا کہ آخر میں مجھے یہ کہنا ہے کہ اگر کافروں کے مالک حق پر نہ ہونے کے باوجود وجہیت جائیں تو اس کا سبب یہ نہیں ہوگا کہ مزدوروں کے عدسے زیادہ اولاد دیتی ہے۔ بلکہ یہ کہ مزدور کسی چیز میں بھی ضبط نفس سے کام نہیں لیتے۔ اگر مزدوروں کے اولاد نہ ہوتی تو ان کے لئے ترقی کا کوئی محرک نہ رہتا۔ اور وہ مزدوری بڑھانے کے لئے کوئی ایسی دلیل پیش کرسکتے جس کا ثبوت آسان ہو۔ کہا ان کے لئے شراب پینا۔ جو اکیلنا۔ تباہ کن مینا منوگا ہے؟ یہ کوئی جواب نہیں کہ کافروں کے مالک بھی یہی سبب حرکتیں کرتے ہیں۔ اور پھر یہی غالب رہتے ہیں۔ اگر مزدور سرمایہ داروں سے بہتر ہونے کا دعویٰ نہیں کرسکتے تو انہیں دنیا کی ہمدردی چاہئے کہ کیا حق ہے کہ یہی سرمایہ دارانہ کی تعداد میں اور اضافہ ہو۔ اور سرمایہ داری کو اور قوت حاصل ہو جائے؟ ہم سے کہا جاتا ہے کہ جمہوریت کی حمایت کرو، اس لئے کہ جب اس کا دور دورہ ہوگا تو دنیا کی حالت بہتر ہو جائے گی۔ یہ نہ کہ ہم انہیں برائیوں کو جو سرمایہ دار اور سرمایہ داری کی طرف منسوب کی جاتی ہیں بہت بڑے پیمانے پر پیدا کر دیں؟

جب میں اس کو پڑھ رہا تھا تو فاختہ کش انگریز کان کنوں، اُن کی بیویوں اور بچوں کے آگے ہوتے چہرے میری آنکھوں میں پھر گئے۔ جن کو میں نے مشرق کی گرمیوں میں بے بسی کی حالت میں ایک ایسے خوشنما نغمہ کا مقابلہ کرتے دیکھا تھا جو انہیں کھلے ڈال تھا۔ گاندھی کے میان کردہ واقعات بھی صحیح نہیں ہیں۔ اس لئے کہ کان کن مزدوری میں اضافے کا مطالبہ نہیں کر رہے تھے۔ بلکہ اس لئے لڑ رہے تھے کہ ان کی مزدوری کم کر دی گئی تھی۔ اور وہ کام کرنے سے ہٹا دئے گئے تھے۔ بہر حال اس وقت میں اس سے کوئی بحث نہیں اور نہ اس سے عرض ہے کہ کان کن مزدور ضبط و ضبط کے طریقے استعمال کریں یا نہ کریں۔ اگرچہ اس میں شک نہیں کہ صنعتی جھگڑوں کو حل کرنے کے لئے یہ ایک غیر معمولی تجویز ہے۔

میں نے گاندھی جی کے جواب سے یہ ٹکڑا اس لئے نقل کیا ہے کہ یہ اندازہ ہو سکے کہ مزدوروں کے مسائل اور ان کے معیار زندگی کو بڑھانے کے بارے میں ان کا نقطہ نظر کیا ہے۔ یہ نقطہ نظر اشتراکیت بلکہ سرمایہ دارانہ

شرہنہار کے لہا ہے انسان جو ارادہ کرے وہ کر سکتا ہے۔ مگر ارادہ اس کے اختیار میں نہیں؟

جنرل ایفریقہ کے ابتدائی دور میں گاندھی جی کے خیالات میں ایک عظیم انسان جنید بنی واقع ہوئی جس نے انہیں سیدت ترکی اور ان کا سارا تصور زندگی بدل دیا۔ اس وقت سے ان کے خیالات ایک خاص بنیاد پر قائم ہو گئے ہیں، اور ان کا دماغ نئی باتوں کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہے۔ جو لوگ نئی تجویزیں پیش کرتے ہیں ان کی باتوں کو وہ بہت صبر و سکون اور توجہ سے سنتے ہیں، لیکن اس کچھ کے باوجود وہ اخلاقی ظاہر کرتے ہیں، کہنے والے کو یہ خیال ہوتا ہے کہ وہ ایک ایسے شخص سے گفتگو کر رہا ہے جس کے دل کا دروازہ بند ہے، وہ اس مفہوم طے سے بعض خیالات پر قائم ہیں کہ ان کے علاوہ اور تمام باتیں اُن کو غیر اہم معلوم ہوتی ہیں۔ دوسرے ضمنی معاملات پر زور دینے سے اس بڑے کام میں غلط پڑتا ہے جو ان کے پیش نظر ہے۔ جب انسان ایک بنیادی خیال پر رہے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ دوسرے مسائل خود بخود ہم آہنگ ہو جائیں گے، اگر مقامات میں صحیح تو نتیجہ یقیناً صحیح ہوگا۔ یہ میرے نزدیک ان کے خیالات کی اصل بنیاد ہے، وہ اشتراکیت خصوصاً کسیت کو شیعہ کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ اس لئے کہ یہ سحر کیسے تشدد سے وابستہ ہیں۔ مبعوثوں کی جنگ کے الفاظ بھی سے ان کو تشدد اور لڑائی کی پڑاؤتی ہے۔ اور اس لئے انہیں اس سے نفرت ہے۔ وہ یہ بھی نہیں جانتے کہ عام لوگوں کا معیار زندگی ایک مقررہ عدسے بڑھتے ہوئے۔ اس لئے کہ بلند معیار زندگی اور فرصت سے اندیشہ ہے کہ لوگ پیش پستی اور گناہ میں مبتلا ہو جائیں گے۔ یہی کیا کم بڑے کہ سوتڑے سے خوش حال لوگ میں پرست ہو گئے ہیں۔ یہ ادھی برابری کا کہ ان کی تعداد میں اضافہ کیا جائے۔ ہشتاد میں انہوں نے ایک خط لکھا تھا جس سے اس قسم کے تنازعہ اٹھنے کے باوجود ہیں۔ یہ ایک خط کا جواب تھا جو کوٹنے کی بڑی ہڑتال کے زمانے میں ان کے پاس انکسٹن سے خط آیا تھا۔ نتیجے والے نے لکھا تھا کہ اس معاملے میں مزدوروں کو شکست ہو گی کیونکہ ان کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ اور انہیں چاہیے کہ ضبط و ضبط کا طریقہ استعمال کر کے اپنی تعداد کو کم کریں۔ گاندھی جی نے اپنے جواب کے

کہ اُنھیں کیسی زندگی بسر کرے اور اسی کے ساتھ پوری کوشش کر لے کہ جہاں تک ہو سکے اس کی سطح پر پہنچ جائے، جمہوریت پسندی کا دعویٰ کر سکتا ہے تو میں یہ دعویٰ کرتا ہوں:

اس مسئلہ کے خاتمہ سے غالباً سو دو زمانے کا کوئی جمہوریت پسند یا سرمایہ دار یا اشتراکی اتفاق نہیں کرے گا۔ سب اس کے کہ یہ بات میسر ہو اور نامناسب ہے کہ ہم عام لوگوں سے اپنا رشتہ بالکل منقطع کر لیں، اور اپنے تعلقات اور بلند تر میاں زندگی کی تلاش ان بے شمار آدمیوں کے سامنے کر دیں جو ادنیٰ سے ادنیٰ عزت کی چڑیوں کے بھی محتاج ہیں۔ البتہ ایک ایسا شخص جو قدیم مذہبی نقطہ نظر رکھتا ہے شاید کسی حد تک اس سے متفق ہو اس لئے کہ یہ دونوں اپنے جذبات کے اعتبار سے اُنھیں سے وابستہ ہیں، اور ہر چہ یہ کہ اُنھیں کے نقطہ نظر سے دیکھتے ہیں اُنھیں اس کی زیادہ فکر ہے کہ کیا ہو چکا ہے، بہ نسبت اس کے کہ کیا ہو رہا ہے اور کیا ہونے والا ہے، ان لوگوں میں جو نفسیاتی حیثیت سے اُنھیں سے وابستہ ہیں، اور ان میں جو مستقبل پر نظر رکھتے ہیں ذہن آسمان کا فرق ہے، قدم زمانے میں عام لوگوں کی معاشی سطح کو بلند کرنے کا خیال بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ غریبوں کا دوجہ لازمی تھا۔ مٹی سے مبروت مسند آدمی اُس زمانے میں سماج کے روح رواں تھے، اور ان کا ہونا نظام دولت آخری کے لئے ضروری تھا۔ اس لئے اخلاقی معلوں، مصلحوں اور اہل دل نے ان کے وجود کو جائز رکھا لیکن اسی کے ساتھ اُنھیں یہ تلقین کرتے رہے کہ ان کے حاکمیت جہاں کی بھی اُن پر کچھ تھی، وہ غریبوں کے امانت دار ہیں، اُنھیں خیرات کرنا چاہئے، چنانچہ خیرات کا شمار ان بڑی نیکیوں میں ہونے لگا جن کی مذہب نے تاکید کی ہے، گاندھی جی بھی ہمیشہ اس نظریے پر زور دیتے ہیں کہ رام بھارہ بڑے بڑے زمیندار اور سرمایہ دار غریبوں کے امانتدار ہیں، اُن سے پیسہ بہت سے مذہبی آدمی بھی کہتے آئے ہیں۔ ہاپے اعظم نے یہ اعلان کیا ہے امیروں کو یہ سمجھنا چاہیے کہ وہ خدا کی طرف متوجہ نہیں ہر امر میں۔ اور اس کی دولت کے خزان اور قاسم ہیں اور خود حضرت مسیحؑ نے غریبوں کی خدمت ان کے سپرد کی ہے۔ ہندو دھرم اور اسلام عام عقیدہ یہی ہیں۔ یہ دونوں امیروں کو خیرات کی تاکید کرتے ہیں جس کی قیاس میں یہ حضرات مسند سجدہ و صوم خانے بناتے ہیں، اپنی وافر دولت

کے نقطہ نظر سے بھی کوہل دور ہے۔ یہ اگر کہا جائے کہ سائنس اور صنعتی تغیر آج شخص کے کمانے پینے اور رہنے کے معقول بندوبست کر سکتی ہے، اور اُن کے معیار زندگی کو بہت بلند کر سکتی ہے، بشرطیکہ مستقل حقوق رکھنے والے اس میں مداخلت نہ کریں، تو اُس سے اُنھیں کچھ زیادہ دھمپی نہیں ہوتی۔ کیونکہ وہ لوگوں کے معیار زندگی کو ایک خاص حد سے آگے بڑھانے کے قابل ہی نہیں۔ چنانچہ اشتراکیت سے جو امیدیں ہیں وہ اُن کے لئے کوئی کشش نہیں رکھتیں۔ بلکہ اُن کے نزدیک سرمایہ داری بھر سہی ایک حد تک قابلِ برداشت ہے۔ اس لئے کہ وہ میٹل پرستی کے لگہ لگہ ایک محدود سے دائرے میں محدود رکھتی ہے۔ اُنھیں ان دونوں میں سے ایک کو پسند نہیں۔ لیکن فی الحال وہ سرمایہ داری سے تنہا رہے ہیں، ان کے یہ انتہی بڑی نہیں۔ اور سرمایہ ایک امر واقعہ کی حیثیت رکھتی ہے جس کے وجود سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

مکن ہے کہ میں یہ خیالات اُن کی طرف منسوب کرنے میں غلطی کرتا ہوں۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اُن کے ذہن کا عام رجحان یہی ہے۔ اور اُن کی نظریہ و تحریر میں ہیں جو اُنھیں اور جمہوریت کی نظر آتی ہے اس کی وجہ مل میں یہ ہے کہ اُن کے خیال کی بنیاد دہی دوسری ہے، وہ یہ نہیں چاہتے کہ لوگ روز افزوں آرام و آسائش اور فرصت کو اپنی زندگی کا مقصد قرار دیں، بلکہ اُن کی تعلیم یہ ہے کہ ہم اپنی اخلاقی زندگی کو سدھارنے کی فکر کریں۔ بڑی مادیوں کو ترک کریں، خواہشات کو کم کرتے رہیں۔ اور اس طریقے سے اپنی انفرادی اور روحانی اصلاح کریں۔ اور جو لوگ عوام کی خدمت کرنا چاہتے ہیں اُن کا کام یہ نہیں ہے کہ اُن کی مادی زندگی کی سطح کو بلند کریں۔ بلکہ وہ اُن کی سطح پر آئیں۔ اور سادی حیثیت سے اُن کے ساتھ سیل جول پیدا کریں۔ اگر ایسا کیا گیا تو لازمی طور پر عام لوگوں کی سطح زندگی کی قدر بلند ہو جائے گی۔ یہی گاندھی جی کے نزدیک حقیقی جمہوریت ہے۔ اُس بیان میں جو اُنھوں نے "مارکسزم سے کوئی شائبہ" کیا تھا، وہ لکھتے ہیں کہ بہت سے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ میری مخالفت کرنا بے کار ہے۔ اس کے برعکس اگر کسی کی نہیں جیتی۔ میرے جیسے پیدا کرنے جمہوریت پسند کے لئے یہ انگشت باعثِ شرم ہے، اگر وہ شخص جس نے اپنے آپ کو غریب سے غریب لوگوں میں گمپا دیا ہے جس کی یہ آرزو ہے

میں سے تانے کے پیسے اور چاندی کے روپے غریبوں کو خیرات کرتے ہیں، اور سمجھتے ہیں کہ ہم بڑے نیک اور دین دار ہیں۔

دنیا سے قدیم کے مذہبی نقطہ نظر کی ایک نمایاں مثال بابائے عظیم یسوع مسیح کا مشہور فرمان "یرم لزام ہے" جو مسیحی عقائد میں جاری کیا گیا تھا۔ وہ جدید مسیحی حالات کا استدلال کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "غرض مصیبت ہونا اور تکلیف اٹھانا لازماً ان کی قسمت میں لکھا ہے، انسان چاہے جتنی کوشش کرے۔ کوئی طاقت اور کوئی تدبیر ان کی زندگی کو اس درد و الم سے نجات دلائے گا۔ کامیاب نہیں ہو سکتی۔ جو اُسے ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہے، جو لوگ اس کے خلاف دعویٰ کرتے ہیں اور مصیبت زدوں کو یہ امید دلاتے ہیں کہ انہیں ربّ العالم سے نجات مل جائے گی، اور دائمی راحت و عشرت نصیب ہوگی۔ دھوکا دے رہے ہیں، اور سبز باغ دکھا رہے ہیں، اور ان کے یہ جھوٹے وعدے اور زیادہ اتری پیدا کر دیں گے۔ انسان کی فلاح اسی میں ہے کہ وہ دنیا کو اُس کی اصلی حالت میں دیکھے، اور ان مصیبتوں کا علاج کہیں اور تلاش کرے۔"

آگے چل کر بتایا جاتا ہے کہ یہ کہیں اور کا اشارہ کدھر ہے؟ اس دنیا کو نہ تو ہم اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں اور نہ اُس کی صحیح قدر کر سکتے ہیں۔ جب تک اس زندگی کا سماخ نہ رکھیں جو آنے والی ہے اور ہمیشہ ہمیشہ قائم رہے گی۔ جس حقیقت عظمیٰ کا سبب خود فطرت ہیں دیتی ہے وہی عیسائی مذہب کا عظیم الٹن عقیدہ ہے جس پر مذہب کی بنیاد قائم ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ ہماری اسی زندگی اُس وقت شروع ہوگی جب موجودہ زندگی ختم ہو جائے گی۔ خدا سے نہیں اس دنیا کی کوئی باقی چیزوں کے لئے نہیں پیدا کیا ہے بلکہ اُن انسانی چیزوں کے لئے جو ہمیشہ رہنے والی ہیں، اُس نے اس دنیا کو ہمارے لئے عارضی جلا وطنی کی جگہ بنایا ہے، نہ کہ ہمارا حقیقی وطن۔ روپیہ، پیسہ اور دوسری چیزیں، جنہیں لوگ اچھا اور پسندیدہ سمجھتے ہیں، خواہ ہمارے پاس اخلاقیات سے ہوں یا باطل نہ ہوں، جہاں تک ہماری ابدی راحت و مسرت کا تعلق ہے کوئی اہمیت نہیں رکھتیں۔۔۔۔۔"

یہ مذہبی طرز خیال اُس قدیم زمانے سے وابستہ ہے جب موجودہ مصیبتوں سے نجات پانے کا صرف یہی ایک راستہ تھا کہ آنے والی زندگی

کا سہارا ڈھونڈنا چاہئے۔ لیکن باوجود اس کے کہ حالات بدل گئے، اور انسان کی مادی خوش حالی کی سطح اتنی بڑھ گئی جو زمانہ قدیم میں انسان کے خواب و خیال میں بھی نہ آسکتی تھی، لیکن ماضی کے خیالات اب بھی ہم مسئلہ ہیں۔ اب زیادہ زور چند سہم روحانی قدروں پر دیا جاتا ہے۔ جن کے جاننے کا کوئی پیمانہ نہیں۔ کیونکہ عیسائی ہمیشہ بارہویں اور تیرہویں صدی کے خیال میں گمن رہتے ہیں۔ (یہ وہی زمانہ ہے جسے لوگ عہدِ نظر کہتے ہیں) اور اُسے عیسائیت کا عہدِ زریں سمجھتے ہیں۔ جب اولیا کا دور دورہ تھا۔ عیسائی فرماؤا صلیبی لڑائیاں لڑنے کو مجاہد کرتے تھے۔ اور گرفتار کرنے کے بڑے بڑے گرجے تعمیر ہو رہے تھے۔ اُن کے خیال میں یہ زمانہ بھی عیسائی جہوت کا تھا۔ جو پیشہ وروں کی انجمنوں کے ماتحت ترقی کے اس درجے پر پہنچ گئی تھی جس پر نہ صرف اس سے پہلے کبھی پہنچ سکی اور نہ اس کے بعد؟ مسلمان بڑی حسرت سے ابتدائی عہدِ خلافت کی "اسلامی جہوت" اور اس دور کی حسرت انگیز فتوحات کو یاد کیا کرتے ہیں۔ اسی طرح ہندو بھی ویدوں کے عہد اور رامائن اور مہا بھارت کے زمانے کی دھن میں رہتے ہیں اور رام راج، کا خواب دیکھنا کرتے ہیں۔ مگر تاریخ ہمیں یہ بتاتی ہے کہ اس عہدِ ماضی میں لوگوں کی بہت بڑی تعداد انتہائی مصیبت کی حالت میں زندگی بسر کرتی تھی، اور اُسے پرستِ بھگوان اور زندگی کی کوئی ترین غزوات بھی مسرت نہیں مل سکتے تھے۔ بلکہ یہ کہ جھوٹے سے حکمران ملکہ کو، فرصت اور فراغت حاصل ہو۔ لیکن جہاں تک زندگی کا لطف اٹھانے سے اور لوگوں کا تعلق ہے یہ تصور کرنا دشوار ہے کہ وہ سوائے قوتِ لاموت کی جدوجہد میں لگے رہنے کے اور کچھ کر سکتے تھے۔ اُس شخص کے لئے جو بھوکا مرنے والا ہو گئی تھی کہ مدنی اور روحانی ترقی ممکن نہیں۔ اُسے تو بس ایک ہی فکر ہوگی۔ کہ کسی طرح کھانے کو روٹی مل جائے۔

صنعتی دور اپنے ساتھ بہت سی برائیاں لایا ہے۔ جن پر فخر ہمارے نظر پڑتی ہے۔ لیکن ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ مجموعی طور پر دنیا میں خصوصاً ان حصوں میں جہاں صنعت کو سب سے زیادہ فروغ ہوا ہے اُس نے مادی خوش حالی کی ایک ایسی بنیاد قائم کر دی ہے جس سے لوگوں کی بہت بڑی تعداد کے لئے مدنی اور روحانی ترقی آسان ہو گئی ہے۔ ہندوستان اور دوسرے محکوم ملکوں میں جہاں اس کے کوئی آثار نظر نہیں آتے اس لئے

اور اس سے کوئی فائدہ نہیں حاصل ہو سکتا۔ غرض ذاتی ملکیت کا تخیل جو لعین لوگوں کے نزدیک دنیا کے بنا دی شجیت میں ہے، ہمیشہ تبدیل ہوتا رہا ہے، ایک زمانے میں غلام بھی املاک میں شامل تھے، اور یہی حال عورتوں اور بچوں کا تھا، اس کے علاوہ جاگیر دار ہر لوہن کی شب عروسی کا، سڑکوں، مندروں، کشتیوں، ٹپوں، مفاد عامہ کی چیزوں کا، زمین اور ہوا کا مالک تھا۔ جاہل اور آج بھی پائے والوں کی ملک سمجھے جاتے ہیں۔ حالانکہ لعین لوگوں میں ملکیت کے حقوق کا قانون محدود کر دئے گئے ہیں، جنگ کے زمانے میں برابر حقوق ملکیت میں دست اندازی کی جاتی ہے۔ املاک روز بروز غیر می صورت اختیار کرتی جاتی ہے۔ مثلاً کھیتی کے لئے، اعتبار وغیرہ، جیسے جیسے ملکیت کا تصور تبدیل ہوتا جاتا ہے۔ حکومت کی مداخلت بڑھتی جاتی ہے، رائے عامہ برابر جاہل اور نادانوں کے لاحدود حقوق کو محدود کرنے کا مطالبہ کرتی رہتی ہے، اور قانون اس مطالبے کو پورا کرتا رہتا ہے۔ طرح طرح کے بڑے بڑے محمول لگائے جاتے ہیں، جنہیں ایک طرح کی منطقی سمجھنا چاہیے۔ اور اس طرح مفاد عامہ کی خاطر حقوق ملکیت کو ہوتے جاتے ہیں۔ مفاد عامہ کا خیال سپک پاسی کی بنیاد دینا جاتا ہے۔ اور کھیتی کے حق نہیں ہے کہ سودا کار کے خلاف کوئی کار کرے۔ خواہ اُس کی غرض اپنے حقوق ملکیت کا تحفظ ہو، اور پورانے زمانے میں تو اکثر لوگ حقوق ملکیت سے محروم بلکہ خود دوسرے کی ملکیت تھے۔ آج بھی یہ حقوق صرف تھوڑے لوگوں کو حاصل ہیں، ہم مستقل حقوق کا ذکر بہت سنئے آئے ہیں۔ لیکن آج کل ایک نیا مستقل حق اور تسلیم کر لیا گیا ہے، اور وہ یہ ہے کہ ہر مرد اور ہر عورت کو یہ حق ہے کہ زندگی رہے، محنت کرے، اور اپنی محنت کا پھل پائے، ان نئے نظریوں کی وجہ سے املاک اور سرمائے معدوم نہیں ہو جاتے، بلکہ بہت سے لوگوں میں تعمیر ہو جاتی ہیں، اور ان کے چند اشخاص کے ہاتھ میں جج ہو جاتے ہیں اُن اشخاص کو دوسروں پر جو اقتدار حاصل ہو گیا تھا اُسے سماج اُن سے واپس لے لیتی ہے، گاندھی جی کے پیش نظر افراد کی باطنی، اخلاقی اور روحانی اصلاح ہے۔ اور اس کے ذریعے سے وہ خارجی ماحول کو تبدیل کرنا چاہتے ہیں، انکی تعلیم یہ ہے کہ لوگ بری عاداتوں اور لڑکوں کو ترک کریں۔ اور پاکباز بن جائیں۔ وہ اس پر بھی زور دیتے ہیں کہ جماعت اور شراب اور تباہی کے استعمال سے پرہیز کیا جائے۔ ممکن ہے اس بارے میں اختلاف رائے ہو کہ

کہ ہر شے ترقی سے فائدہ کی جگہ نقصان پہنچا ہے، یہیں صنعتی نظام نے خوب لوٹا ہے، اور ہر لحاظ سے یعنی مادی اعتبار سے بھی۔ اور اس سے زیادہ متدفق اور روحانی اعتبار سے ہماری حالت پہلے سے بھی بدتر کر دی ہے۔ لیکن تصور صنعتی نظام کا نہیں بلکہ بدیسی حکومت کا ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ ہندوستان میں نام نہاد و مغربیت نے اس وقت تو نظام جاگیر واری کو اور منظم کر دیا ہے، اور ہماری دشواریوں کو حل کرنے کے بجائے انہیں اور زیادہ شدید بنا دیا ہے۔

لیکن یہ ہماری بدیسی ہے اور اس سے متاثر ہو کر ہمیں آج کل کی دنیا کے دیکھنے اور سمجھنے میں غلطی نہیں کرنی چاہئے۔ موجودہ حالات میں امیروں کا دوجہ سماج کے نظام دولت آفرینی کے لئے ضروری اور نہ سب نہیں رہا۔ امر کا طبقہ باطل بیکار رہے، اور اکثر اس کی وجہ سے رکاوٹیں پیدا ہوتی ہیں۔ اسی طرح مذہبی پیشواؤں کا یہ پرانا تشدد بھی اب بالکل بے معنی ہو گیا ہے کہ امیروں کو خیرات کی تمغین کی جائے، اور غریبوں کو قناعت کی، صبر و شکر کی، لکھنا مشاوری اور نیک طبعی کی۔ ان کے وسائل اور ذرائع اس قدر وسیع ہو گئے ہیں کہ وہ دنیا کے مسائل سے اچھی طرح نبٹ سکتے ہیں۔ امیروں سے بہت سے لوگ صریح طور پر طبعی بن گئے ہیں اور ایک منطقی طبقہ کا وجود نہ صرف ترقی کی راہ میں رکاوٹیں پیدا کرتا ہے، بلکہ اس کی وجہ سے وسائل دولت ضائع ہوتے ہیں۔ یہ طبقہ اور وہ نظام جو اسے پیدا کرنے کا ذمہ دار ہے، کام کو اور دولت آفرینی کو روکتا ہے، اور دوجہ طرح سے بیکاری کو بڑھاتا ہے، یعنی ایک توان لوگوں کی بہت افزائی کرتا ہے جو اوروں کی محنت پر بسر کرتے ہیں، دوسرے بہت سے مزدور ہا کو کام سے محروم رکھتا ہے، اور فنا کرنے پر مجبور کرتا ہے، خود گاندھی جی نے کچھ عرصہ لکھا تھا، "ان لوگوں کے سامنے جو سب کوں مرتے ہیں اور بے کار ہیں۔ خدا صرف ایک ہی شکل میں ظاہر ہو سکتا ہے، یعنی کام کی اور روٹی کی شکل میں۔ خدا نے انسان کو اس لئے پیدا کیا تھا کہ محنت کر کے روٹی کما لے اور یہ کہا تھا کہ جو لوگ غیر محنت کے کھاتے ہیں وہ جو رہیں"

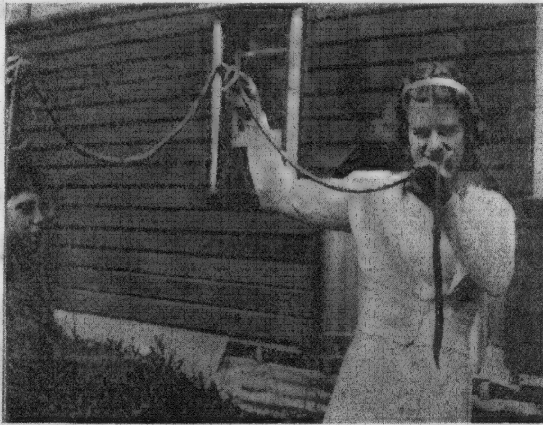
دنیا نے جدید کے پیچیدہ مسائل کو سمجھنے کے لئے اُس وقت کے قدیم طریقوں اور اصولوں سے کام لینا جب ان مسائل ہی کا دوجہ نہ تھا اور ان کا ذکر دنیا لوسی الفاظ میں کرنا ممکن نہیں پیدا کرتا ہے، اور

دستدلی سی امید کہ سہارا میں کوئی بہترین درسیانی طریقہ خود بخود نکل آئے گا۔ جس میں ماضی اور حال کے سب طریقوں کی خوبیاں جمع ہوں گی۔ مزدورت اس کی ہے کہ ماضی کی تفصیل کی جائے۔ علاج تجویز کیا جائے۔ اور اسے عمل میں لانے کی کوشش کی جائے۔ بالکل یقینی بات ہے کہ قومی اور بین الاقوامی حیثیت سے ہم موجودہ حالات پر قائم نہیں رہ سکتے۔ یا تو ہمیں پیچھے ہٹنا ہے یا آگے بڑھنا ہے۔ بلکہ سچ پوچھنے تو پیچھے ہٹنے کا جواب کوئی سوال ہی نہیں ہے، بلکہ گاندھی جی کی اکثر کارروائیوں سے یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ وہ ہمیں اُس محدود قومی حیثیت کی طرف واپس لے جانا چاہتے ہیں جس میں نہ صرف قوم اور قوموں سے بلکہ ہر گاؤں اور گاؤں سے معاشرتی حیثیت سے بے نیاز ہو۔ بس قدم زمانے کی سماج میں ہر گاؤں ایک مستقل معاشرتی حیثیت رکھتا تھا، اپنا کھانا کپڑا اور دوسری ضرورت کی چیزیں خود ہی پیدا کرتا تھا۔ ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں معیار زندگی بہت ہی پست ہوتا ہے، میں سمجھتا ہوں کہ گاندھی جی یہ حالت صرف عارضی طور پر چاہتے ہیں۔ کیونکہ مستقل طور پر تو یہ عمل ہی نہیں سکتی، بعض ملکوں کی بڑی بڑی آبادیوں کا اس صورت میں زندہ رہنا دشوار ہو جائے گا۔ اور وہ یہ ہرگز گوارا نہ کریں گی کہ عسرت اور فاقہ کی زندگی کی طرف لوٹیں۔ ممکن ہے کہ ہندوستان جیسے ذرا معنی ملک میں جہاں ہمارا موجودہ معیار زندگی بجا سہل ہے۔ یعنی صنعتوں کی ترقی سے عام لوگوں کی حالت کسی قدر بہتر ہو جائے۔ لیکن اور دنیا کی طرح ہم بھی دنیا کے دوسرے ملکوں سے وابستہ ہیں اور میرے خیال میں اُن سے قطع تعلیق کرنا بالکل ناممکن ہے۔ اس لئے ہمیں ان مسائل پر بڑی دنیا کے نقطہ نظر سے محدود قومی حیثیت کا کوئی سوال ہی نہیں، اور میں تو ذاتی طور پر اُسے ہر پہلو سے ناپسند کرتا ہوں۔

پھر پھر کہ ہم اسی چیز پر چوبچ جاتے ہیں جس کے سوا اس مسئلے کا اور کوئی حل نہیں۔ یعنی ایک اشتراکی نظام کا قیام۔ پہلے قومی دھارے کے اندر اور پھر ساری دنیا میں۔ جس میں دولت کی پیدائش اور تقسیم ریاست کی لگائی میں مفاد و مامور کے لحاظ سے کی جائے۔ یہ انقلاب کس طریقے سے ہونا چاہیے۔ یہ ایک جگہ کا سوال ہے۔ لیکن یہ بات بالکل واضح ہے کہ جس چیز میں ایک پوری قوم بلکہ ذریعہ انسانی کی بھلائی ہو وہ محض اس وجہ سے نہیں روکی جاسکتی کہ کچھ لوگ جو موجودہ نظام نے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اس تبدیلی کے مخالف

ان میں کوئی چیز زیادہ بڑی ہے اور کوئی کم۔ کیا اس میں کوئی شبہ ہو سکتا ہے کہ انفرادی نقطہ نظر سے بھی، اور اس سے زیادہ سماجی نقطہ نظر سے ان ذاتی کمزوریوں سے بدرجہا بہتر، لالچ، خود غرضی، زبردستی، انفراد کا ذاتی نفع کے لئے جھگڑنا، مہربانوں اور جماعتوں کی وحشیانہ کشمکش، ایک طبقے کا دوسرے کو بے دردی سے لوٹنا اور کھانا، قوموں کی ہولناکی اور انیاں ہیں، ظاہر ہے کہ گاندھی جی ان تمام ذلت آفرین جھگڑوں سے اور ہر قسم کے تشدد سے نفرت کرتے ہیں۔ لیکن کیا یہ چیزیں آج کل کی بزدلی سماج کی فطرت میں داخل نہیں ہیں۔ جس کا قانون یہ ہے کہ زبردست کمزور کو سستائے، اور جس کا عمل اس پرانے متعلقہ ہے جس میں طاقت ہو وہ جیتیں لے۔ اور جو کمزور سکے وہ رکھے۔ نفع کی خواہش آج کل لازمی طور پر لڑائی جھگڑا پیدا کرتی ہے۔ اور سارا نظام انسان کی غارتگرانہ جبلتوں کی سرپرستی کرتا ہے، اور اُسے اُن سے کام لینے کا پورا پورا موقع دیتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ وہ بعض پسندیدہ جذبات کو بھی ابھارتا ہے، لیکن اس سے کہیں زیادہ انسان کے کینے جذبات کو وہ تقویت دیتا ہے، کامیابی کے معنی یہ سمجھ جاتے ہیں کہ دوسروں کو نیچے گرا کر اُن کی جگہ لے لی جائے، جب ہماری سماج ایسے ارادوں اور حصول کی محنت افزائی کرتی ہے، ہمارے بہترین آدمی اُن کی طرف کھینچ جاتے ہیں۔ تو کیا گاندھی جی یہ امید کر سکتے ہیں کہ اِس ماحول میں انسان کی اخلاقی میلان متعقد حاصل کر لیں گے؟ وہ لوگوں میں خدمت کا جذبہ پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ چند افراد کو ستارے کرنے میں انھیں ضرور کامیابی ہوگی۔ لیکن جب تک سماج ان لوگوں کو جو دوسروں کو لوٹ کر ترقی کرتے ہیں کامیابی کا نمونہ بنا کر پیش کرے گی۔ اور ذاتی نفع کی خواہش کو عمل کا محرک قرار دے گی۔ اُس وقت تک بہت بڑی اکثریت اسی راہ پر چلتی رہے گی۔

لیکن یہ مسئلہ محض اخلاق اور فلسفہ اخلاق کا نہیں ہے، بلکہ آج کل کے عملی اور ضروری مسائل میں سے ہے۔ دنیا بھر میں نکل رہا ہے، اور اس نکل کو کسی نے کسی طرح حل کرنا ہے۔ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ ڈاکٹس کے مکار کی طرح ہاتھ بہا ہتھ رکھے بیٹھے رہیں، کہ کچھ نہ کچھ ہو ہی رہے گا اور نہ منفیاندہ طرز اختیار کرنے سے کام چل سکتا ہے کہ میرا یہ داری۔ اشتراکیت، اور اشتہائیت وغیرہ کے خواب پھوٹوں کی نکتہ چینی کرتے رہیں۔ اور اس



دنیا کا سب سے بڑا زین کا کپڑہ جو ڈویڈے یاس کی وادی میں  
پایا گیا ہے۔ اس کی لمبائی بارہ فٹ ہے۔



وہ نفسیاتی تبدیلی ہے، کما دی نے کسی حد تک اس فصل کو دور کیا جو شہر اور دیہات میں پیدا ہو گیا تھا، اس نے اوسط طبقے کے تعلیم یافتہ لوگوں کو کراؤں سے قریب تر کر دیا۔ اس لباس کا پٹنے والوں اور دیکھنے والوں پر بہت گہرا نفسیاتی اثر پڑتا ہے، اوسط طبقے میں کما دی کے رواج سے سادگی آگئی ہے، خود نوشت اور بد ذاتی کم ہو گئی ہے، اور عام لوگوں سے میل جول کا احساس پیدا ہو گیا ہے، اوسط طبقے کے لوگ اب نہ تو لباس کے معاملے میں امیروں کی نقالی کی کوشش کرتے ہیں، اور نہ سستی پر نشان پہنے ہیں ذلت اور شرم محسوس کرتے ہیں، بلکہ سچ پوچھنے تو یہ لوگ کما دی کے لباس کو خاما خاما دھار کھتے ہیں، اور ان لوگوں کے مقابلے میں جواب بھی رشیم اور اسٹین پین کرنا کرتے ہیں، اچھی وقت کا احساس رکھتے ہیں۔ غریب سے غریب لوگوں میں بھی یہ خود داری اور وقار کا احساس پیدا ہو گیا ہے، کما دی پہنے والوں کے بڑے معمول میں یہ پہچاننا مشکل ہو گیا ہے کہ کون غریب ہے اور کون امیر، اور اس سے ہر آدمی کے جذبہ کو ترقی ہوئی۔ اس میں سب سے پہلی کم لوگوں تک پہنچنے میں کانگرس کو کما دی سے بڑی مدد ملی۔ اس کو لوگ قومی آزادی کی وردی سمجھنے لگے۔

ظول کے مالوں کے اس رجحان کو سمجھ کر اسے مال کی قیمت بڑھانے چلے جائیں۔ کما دی ہی نے روکا ورنہ پیسے ان کی دنگ تمام مروت بے لگاؤ خصوصاً لنگا شائر کے مقابلے کی وجہ سے ہوا کرتی تھی۔ اور جب بھی یہ مقابلہ بند ہوا مثلاً جنگ عظیم کے زمانے میں تو کپڑے کی قیمتیں ہندوستان بھر میں غیر معمولی طور پر بڑھ گئیں، اور ہندوستانی ظول نے کروڑوں روپیہ کمایا۔ سو دیکھ کر کھربا اور بدیشی مال کے بائیکاٹ کی تحریک سے آگے چل کر ان ظول کو بڑی مدد ملی، لیکن کما دی کی تحریک کا یہ اثر ہوا ہے کہ قیمتیں اب اتنی زیادہ نہیں بڑھ سکتیں۔ ان بولوں نے (اور جاپان نے بھی) کما دی کی ہر دلعزیزی سے نامزد خانہ آٹھایا۔ اس قسم کا موٹا کپڑا لٹا کر کیا لوگوں میں اور ہاتھ سے کئے اور ہاتھ سے بنے کپڑے میں دیگر کڑا شکل تھا، اگر اب کوئی غیر معمولی صدمت پیدا ہو جائے، مثلاً جنگ چھڑ جائے، جس سے پہلی کپڑے کی درآمد بند ہو جائے تو غالباً ہندوستان کے بول کے مالک خربہ اردوں کو آنا نہیں لوٹ سکیں گے مگر اس مسئلہ سے کئی سال تک کوئی سبہ، کما دی کی تحریک اس کو روکے گی۔ اور کما دی کی ٹیکس میں کچھ کٹاؤ

ہیں۔ اگر سیاسی یا سماجی ادارے اس تبدیلی کی راہ میں حائل ہیں تو ان کو مٹا دینا چاہیے۔ ان چیزوں کی خاطر ایسے مفید اور پسندیدہ متعقد کو قرون کرنا سمیت بڑی فداکاری ہوگی۔ ممکن ہے کہ دنیا کے عام واقعات کسی حد تک اس قسم کی تبدیلی پیدا کرنے میں، یا اس کی رفتار کو تیز کرنے میں مدد دیں، لیکن جب تک ملک کے لوگوں کی بہت بڑی اکثریت رامنڈ نہ ہو جائے یہ انقلابی شکل بھی سے ہو سکے گا۔ اس لئے ان لوگوں کو سمجھا کر اپنا خیال بنانا ہے۔ ایک جموں کی جماعت کی سازش اور تشدد سے کام نہیں چل سکتا۔ ظاہر ہے کہ میں اس بات کی کوشش کرتی جا رہی ہوں، کہ ان لوگوں کو بھی اپنا خیال بنالیں۔ جو موجودہ نظام سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ مگر یہ بہت بعد کا وقت ہے کہ ہم ان میں سے کچھ زیادہ لوگوں کو قائل کر سکیں گے، کما دی کی تحریک، یعنی ہاتھ سے کاٹنا اور بننا، جس سے گاندھی جی کو خاص شوق ہے، ایک ایسی چیز ہے جو دولت آفرینی کے انفرادی طریقے کو تقویت بخشتی ہے۔ اور جس قبل منشی ہمد کی طرف واپس بے جاتی تیز اور جس قبل منشی ہمد کی طرف واپس بے جاتی ہے، آج کل کے کسی اہم مسئلہ کو ان طریقوں سے حل کرنا ممکن نہیں ہے، بلکہ ان سے ایک ایسی ذہنیت پیدا ہو جاتی ہے جو ترقی کی سب راہ میں حائل ہو سکتی ہے۔ سہر سہ میں اس بات کو تسلیم کرتا ہوں کہ ایک وقتی اور ماضی تہذیب کی حیثیت کو اس تحریک سے بہت فائدہ پہنچا ہے، آئندہ بھی اس وقت تک پہنچا جائے گا جب تک خود حکومت ذہنی اور منشی مسائل کا کوئی معقول حل نہ نکال کر لے گی، جو وسیع پیمانے پر سارے ملک میں جاری کیا جاسکے۔ ہندوستان میں اس وقت لاکھوں کروڑوں بے روزگار ہیں، جن کا کوئی ریکارڈ نہیں، اور اس سے بھی زیادہ کثرت سے وہ لوگ ہیں جو دیہاتی علاقوں میں سال کے ایک حصے میں بیکار رہتے ہیں، حکومت نے بے روزگاری کو دور کرنے یا بے روزگاروں کی آمد کو روکنے کی کوئی کوشش اب تک شروع نہیں کی ہے، اس لئے معاشی حیثیت سے کما دی کی تحریک نے ان لوگوں کی تھوڑی بہت مدد کی جو بالکل بے روزگار ہیں، یا جو کچھ عرصے بیکار رہا کرتے ہیں، چونکہ یہ ترقی خود اپنی کوشش سے ہوتی ہے، اس لئے ان لوگوں کی خود داری بڑھ گئی، اور ان میں خود اعتمادی کا احساس پیدا ہو گیا ہے، اگر عمل میں جو نایاب تبدیلی ان لوگوں میں پیدا ہوئی ہے،

ہے کہ تنواری سی مدت کے اندر بہت پھیل جائے۔

ان تمام فوائد کے باوجود جو اضعاف وقت ہندوستان کو کھادی کی تحریک سے حاصل ہیں میرے خیال میں یہ بعض عارضی چیز ہے۔ لیکن یہ کہ بعد میں بھی ایک نئی تحریک کی حیثیت سے باقی رہے، تاکہ اس مدت میں جو ایک اعلیٰ معاشی نظام کے اختیار کرنے میں لگ جائے گی، اس سے کام چلنا رہے، لیکن آئندہ ہماری اصل کوشش یہ ہوگی کہ ذرا عظمیٰ نظام کی از سر نو تشکیل کی جائے۔ اور صنعت کو ترقی دی جائے، اس سے کوئی فائدہ نہیں کہ آراہمی کے نظام میں دفع الوقتی کے لئے چھوٹی موٹی تبدیلیاں کی جائیں، اور طرح طرح کے کمیشن مقرر ہوں، جن پر لاکھوں روپیہ صرف ہو اور وہ کچھ اوپری چیزوں کی اصلاح کر دیں۔ ہمارا نظام آراہمی دیکھتے ہی دیکھتے مٹیہ رہا ہے اور موجودہ صورت میں دولت کی پیدائش اور تنہم بڑے پیمانے پر معمول طریقے سے کام کرنے میں حائل ہے، جدید جد کے حالات کے لحاظ سے بغیر اس بنیادی تبدیلی کے کام نہیں چل سکتا چھوٹی چھوٹی زمینیں اسامیوں کو پائے کا طریقہ ختم کر دیا جائے۔ اور اس کی جگہ مستقل طور پر آباد رہا ہی کے اصول کے مطابق اجتماعی کاشت شروع کی جائے تاکہ کو محنت سے زیادہ پیداوار ہو سکے۔ زراعت ہماری ساری آبادی کبھی نہیں کھپا سکتی۔ بڑے پیمانے پر کاشت کرنے سے (جیسا کہ گاندھی جی کو اندیشہ ہے) زراعت کا کام کرنے والوں کی تعداد کم ہو جائے گی، باقی لوگوں میں سے شاید چھوٹی گھریلو صنعتوں میں کھپ جائیں۔ مگر ان کی بہت بڑی تعداد کو بڑے پیمانے کی اشتراکی صنعتوں اور سماجی خدمت کے کاموں میں لگانا پڑے گا۔

یقیناً بعض علاقوں کو کھادی کی تحریک سے تنواری بہت مدد ملی ہو لیکن اسی کامیابی میں جو اس کو حاصل ہوئی ہے خطرے کا بھی عنصر موجود ہے، یعنی یہ تحریک ایک ذوال پیر نظام آراہمی کو ہمارا دے رہی ہے، اور اسی حد تک ایک بہتر نظام کے قیام میں تاخیر پیدا کر رہی ہے۔ اس کا اثر اتنا زیادہ نہیں کہ اس سے کوئی نمایاں فرق پیدا ہو لیکن یہ رجحان اس میں بہر حال موجود ہے کہ انوں یا کاشتکار زمینداروں کو زمین کی پیداوار کا جو حصہ ملتا ہے، وہ اس کے لئے بھی کافی نہیں کہ سب سے ترقی یافتہ ترین ملک پر وہ چھوٹے گئے ہیں، اسی پر قائم رہ سکیں۔ اس لئے ان کو اپنی فعلی آمدنی میں

اضافے کی اور صورتیں تلاش کرنی پڑتی ہیں، ورنہ لگان یا لگداری کی ادائیگی کے لئے اور قرض لینا پڑے گا، اگر انفرادی طور پر بعض کاشتکاروں کی آمدنی میں اضافہ ہو جائے تو اس سے زمیندار یا حکومت کو اپنا مطالبہ وصول کرنے میں مدد ملتی ہے، جو شاید معمولی حالت میں نہ وصول ہو سکتا۔ اگر یہ ادھر کی آمدنی کچھ زیادہ ہو تو لگان آٹا ہی اور بھاریا جاتا ہے، موجودہ نظام کے تحت کاشتکاروں کی آمد محنت اور لگائیت بخاری کی کوشش سے اصل فائدہ زمین کے ملک ہی کو پہنچتا ہے، جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، ہنری جارج نے اپنی کتاب "ترقی اور غربت" میں اس مسئلے پر بھی بحث کی ہے اور بہت سی مثالیں دی ہیں، جو زیادہ تر آئرلستان کی ہیں۔

دیہی صنعتوں کو دوبارہ زندہ کرنے کی جو کوشش گاندھی جی کر رہے ہیں وہ اصل میں کھادی کے پروگرام کی توسیع ہے۔ اس سے ذریعہ پر ضرر فائدہ ہوگا، جس میں سے کچھ کم پین مستقل ہوگا، مگر زیادہ تر محض وقتی۔ اس سے دیہاتیوں کی موجودہ تکلیفوں میں کچھ کمی ہو جائے گی اور ہماری تہذیب کے بعض خوشنامتوں سے جوٹ رہے تھے محفوظ ہو جائیں گے۔ لیکن جہاں تک کہ اس کا مقصد لگوں کی ادھنی نظام کی مخالفت ہے۔ اس میں یہ تحریک کامیاب نہیں ہو سکتی۔ گاندھی جی نے حال میں پہنچا، میں دیہی صنعتوں پر ایک مضمون لکھا ہے۔ اس میں فرماتے ہیں: "لوگوں کو رواج دینا اُس وقت مفید ہوتا ہے جب کام بہت ہو، اور کرنے والے تھوڑے ہوں۔ لیکن جب ضرورت سے زیادہ آدمی کام کرنے کے لئے موجود ہوں، جیسا کہ ہندوستان میں ہے، تو یہ چیز مضرت ثابت ہوتی ہے۔ ہمارے سامنے یہ مسئلہ نہیں ہے کہ لاکھ لاکھ آدمیوں کے لئے جو دیہات میں رہتے ہیں، فرصت کا وقت نکال جائے، سوال یہ ہے کہ ان کے خالی وقت کو جو سال میں چھ بیٹھنے کم نہیں کسی طرح کام میں لگایا جائے؟" یہ اعتراض کچھ فرق کے ساتھ ان تمام ملکوں پر وارد ہوتا ہے جو بے روزگاری میں مبتلا ہیں۔ لیکن اصل میں وقت کام کی کمی کا نہیں ہے، بلکہ یہ ہے کہ منافع حاصل کرنے کے موجودہ نظام کے تحت آجروں کو کام میں خاطر خواہ نفع نہیں ہوتا۔ کثرت سے ایسے کام موجود ہیں جو پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ آؤ اور ہمیں کروڑوں شلہ ملوں اور کم لاؤں کی تعمیر، آبپاشی کی سہولت، حفاظت، صحت، طبی وسائل، صنعت و حرفت اور برقی قوت کی ترقی۔ سماجی اور تمدنی خدمات۔ تعلیم اور ان میسوں ضروری اشیاء

کے وسائل ہمارے پاس ہوں تو میں نہ صرف بنیادی صنعتوں کی بلکہ ایک نہایت ترقی یافتہ صنعتی نظام کی ضرورت ہے۔ آج کوئی ملک جو صنعتی حیثیت سے ترقی یافتہ نہیں ہے۔ حقیقی معنوں میں آزاد ہے۔ اور نہ ہی مرنے کی طاقت رکھتا ہے، اب مشکل یہ ہے کہ ایک بنیادی صنعت کی مدد اور ٹیکل کے لئے دوسری بنیادی صنعتیں درکار ہیں، اور پھر کھن بنانے کی صنعت ضروری ہو جاتی ہے۔ جب یہ بنیادی صنعتیں قائم ہو جائیں تو سہ لازمی طور پر دوسری صنعتیں بھی پھیل جاتی ہیں۔ غرض یہ سلسلہ کسی طرح روکا نہیں جاسکتا۔ اس لئے کہ نہ صرف ہماری مادی اور مدنی ترقی بلکہ ہماری آزادی کا بھی اسی پر انحصار ہے، جو جن بڑے پیمانے کی صنعت پہنچتی جائے گی چھوٹی چھوٹی دیہاتی صنعتوں کو اس کا مقابلہ کرنا دشوار ہوتا جائے گا۔ اشتراکی نظام میں تو ان کے لئے پھر بھی کچھ موقوف ہے۔ مگر نظام سرمایہ داری میں ان کی مطلق گنجائش نہیں۔ اشتراکی ریاست میں بھی وہ گھریلو صنعتوں کی حیثیت سے باقی رہ سکتی ہیں، جن میں وہ چیزیں تیار ہوتی ہیں جو بڑے پیمانے پر تیار نہ کی جاسکتی۔

کانگریس کے بعض لیڈر صنعت کی ترقی سے خوف زدہ ہیں، ان کا خیال ہے کہ صنعتی ممالک کی تمام موجودہ مشکلات اور پریشانیوں بڑے پیمانے پر مال تیار کرنے کی وجہ سے ہیں، لیکن یہ صورت حال کے متعلق ایک عجیب غلط فہمی ہے۔ اگر عام لوگوں کو کسی چیز کی ضرورت ہو تو اس میں کیا بُرائی ہے، کہ وہ کافی مقدار میں تیار کی جائے؟ کیا لوگ اس کو بیچ دیں گے کہ خواہ ان کی ضرورت پوری نہ ہو۔ لیکن بڑے پیمانے پر چیزیں تیار نہ کی جائیں؟ واقعہ یہ ہے کہ دولت آفرینی کے طریقے میں کوئی خرابی نہیں بلکہ تعجب دولت کا موجودہ نظام بہت ناقص اور بھل ہے، ایک اور مشکل جس کا دیہی صنعت کے حامیوں کو سامنا کرنا ہے یہ ہے کہ ہماری زراعت دنیا کی منڈی کی پابند ہے، کسان اس پر مجبور ہے کہ انہی چیزوں کی کاشت کرے جن کی بازار میں مانگ ہے، اور وہی چیزیں

کی فراہمی جس کی لوگوں کو سخت ضرورت ہے۔ ہمارے یہ کروڑوں آدمی آئندہ پچاس سال تک سخت محنت کرتے رہیں۔ تب بھی کام ختم نہ ہوگا۔ لیکن یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب کام کی محرک قوت کی خواہش نہیں بلکہ سماجی ترقی کی خواہش ہو۔ اور سماج کی تنظیم مفاد و عامر کو پیش نظر رکھ کر کی جائے۔ روس کی سوریہ لینن میں اور چائے جو نقصان پہنچا۔ لیکن وہاں بے روزگاری بالکل نہیں ہے، ہمارے یہاں لوگ کام نہ ہونے کی وجہ سے بے کار نہیں ہیں۔ بلکہ اس وجہ سے کہ ان کے لئے کام کرنے کی اور مدنی اصلاح و ترقی کی کوئی سہولت فراہم نہیں کی جاتی۔ اگر بچوں سے کام لینا بند کر دیا جائے ایک معمولی عزم کا لازمی نتیجہ کا بندہ دست ہو جائے تو ان کے مزدوروں اور بے روزگاروں کے دھرم سے غافل ہو جائیں گے۔ اور مزدوروں کی منڈی کئی کروڑ آدمیوں کے ہوجھ سے بھکی ہو جائے گی۔

گاندھی جی نے اس بات کی کوشش کی کہ کامیابی کے ساتھ کی ہے کہ چرنے اور تنگی میں اصلاح اور ترجیح کی جائے اور ان کی قوت بڑھا کر بڑھائی جائے، یہی تو ادارہ داروں کی ترقی دینے کی کوشش ہے۔ اور اگر یہ ترقی اسی طرح جاری رہی دہشت مکن ہے گھریلو صنعتوں میں بھی بھکی کی قوت سے کام لیا جائے گا۔ تو شائع کی خواہش پھر نمودار ہو جائے۔ اور اس کی وجہ سے وہی چیز پیدا ہوگی جس کی ضرورت سے زیادہ پیداوار اور بے روزگاری پکڑے ہیں۔ اگر دیہی صنعتوں میں جدید صنعتی طریقوں سے کام نہ لیا گیا تو وہ ان ضروری مادی اور مدنی اشیاء کو بھی تیار نہیں کر سکتیں، جو ہیں اس وقت درکار ہیں، اور پھر وہ کلوں کے ساتھ مقابلہ کیوں کر کریں گی؟ کیا ہندوستان میں بڑی بڑی کلوں کے رواج کو روکنا مفید ہے۔ اور فرض کیجئے کہ مفید ہو تو کیا یہ ممکن بھی ہے؟ گاندھی جی نے بابا یہ کہا ہے کہ وہ سرے سے کلوں کے مخالف نہیں ہیں۔ بلکہ ان کا یہ خیال معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت ہندوستان کے لئے ان کا استعمال ناموزوں نہیں۔ پھر میں یہ سوچتا ہوں کہ کیا بنیادی صنعتیں مثلاً لوہے اور فولاد کی صنعت یا اس سے کم درجے کی صنعتیں جو پہلے سے موجود ہیں مثلاً ماکھنیا؟

یہ بات صرف کسی طور پر نامکن ہے، جب ہمارے یہاں نہیں۔ پل، نقل و حمل کے وسائل وغیرہ موجود ہیں، تو یا تو ہم یہ چیزیں خود پیدا کریں یا دوسروں کے محتاج رہیں۔ اس کے علاوہ اگر ہم چاہتے ہیں کہ ملک کی حفاظت اور طاقت

۱۔ ہر چہ ریاست کو سردار اور بھائی پٹیل نے سہما سہما ہمیں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ حقیقی اشتراکیت دیہاتی صنعتوں کی ترقی پر موقوف ہے، ہم اپنے ملک میں وہ بہتری پیدا کرنا چاہتے ہیں جن کی کوئی بڑے پیمانے کی پیداوار کی وجہ سے پیدا ہو سکتی ہے؟

رہے ہیں۔ لیکن کیا ماضی کی راہ قلعہ سدود نہیں ہو چکی ہے؟ ایک طرف تو وہ راہ کی تلاش میں مصروف ہیں اور دوسری طرف پڑاؤں کے نیچے کچے آثار جو ترقی کی راہ میں حاصل ہیں۔ مثلاً ویسٹ ریکسٹن، بڑی بڑی زمینداریاں اور تعلقات داریاں اور موجودہ سرمایہ داری کا نظام۔ ان سب پر اپنا دست شغف رکھے ہوئے ہیں۔ کیا امانت داری کے اس نظریے کو عقل تسلیم کر سکتی ہے کہ ایک فرد کو غیر محدود دولت اور اختیارات دے دئے جائیں۔ اور پھر اسی سے یہ توقع کی جائے کہ وہ اس کو مفاد عامہ کے لئے استعمال کرے گا؟ کیا ہم میں سے بہتر سے بہتر لوگ بھی اخلاقی میل کے اس درجے پر پہنچ گئے ہیں کہ ان پر اس طریقے سے اعتماد کیا جاسکے؟ افلاطون کے فلسفی بادشاہ بھی شکل ہی سے اس بوجھ کو اٹھانے کے قابل ثابت ہوتے۔ اس کے علاوہ کیا دوسروں کے لئے یہ اچھا ہو گا کہ یہ فیض، مافوق الانسان ان پر مسلط کر دئے جائیں۔ لیکن دنیا میں تو کوئی مافوق الانسان ہے نہ کوئی فلسفی بادشاہ، یہاں تو ناقص انسان بستے ہیں۔ جو یہ سمجھتے ہیں کہ ان کے ذاتی مفاد میں اور ان کے خیالات کے پیچھے میں ساری قوم کا سہلہ ہے، اس خیال کی بدولت خاندانی شرافت اور دولت کا اقتدار ہمیشہ کے لئے قائم ہو جاتا ہے، جس کے نتائج ہر طرح ہلکے ثابت ہوتے ہیں۔

میں پھر یہ کہوں گا کہ اس وقت میں اس مسئلہ پر غور نہیں کر رہا ہوں کہ سماجی نظام کی تبدیلی کس طرح عمل میں آئے، اور اس کی راہ میں جو رکاوٹیں ہیں وہ کیونکر دور کی جائیں۔ جس سے یا خیالات پر اثر ڈالنے کے ذریعے سے تشدد سے یا عدم تشدد سے، اس پہلو سے میں بعد میں بحث کروں گا۔ مگر یہ حال تبدیلی کی ضرورت کو تسلیم کر لینا چاہئے، اور اس کو صاف الفاظ میں بیان کر دینا چاہئے۔ جب تک سیاسی اور فنی رہنما اس بات کو وضاحت کے ساتھ نہیں سمجھتے اور صاف صاف بات

رکے جو اور لوگوں میں ہیں۔ قیمتیں گھٹتی جاتی ہیں۔ اور اس کا اپنا معرکہ لگان یا مال گذری نقد کی صورت میں ادا کرنا پڑتی ہے۔ اس لئے کسی نہ کسی طرح اس کو یہ رویہ فرہم کرنا پڑتا ہے یا کم سے کم وہ اس کی کوشش ضرور کرتا ہے۔ اس لئے وہ ایسی چیز پاتا ہے جو اس کے نزدیک زیادہ سے زیادہ قیمت میں فروخت ہوگی۔ وہ ان چیزوں کی کاشت نہیں کر سکتا جن کی اس کو خود ضرورت ہے۔ تاکہ وہ اور اس کے ہال نیچے کم سے کم کھانے کے معاملے میں دوسرے کے محتاج نہ رہیں۔

حال میں اجناس خورد و خوراک اور دوسری چیزوں کی زرخیز قیمتیں یکبارگی گر جانے کی وجہ سے لاکھوں کسلاؤں کو خصوصاً صوبہ متحدہ اور بہار میں مجبورانہ گھنے کی کاشت کرنی پڑی۔ باہر کی شکر محصول لگ جانے کی وجہ سے شکر کے کارخانے رسائی میں نہ گول کی طرح پیدا ہو گئے، اور گنے کی مانگ بہت بڑھ گئی۔ لیکن بہت جلد سب طلب سے کہیں زیادہ ہو گئی، کارخانوں کے، لاکھوں نے بڑھی ہے جی سے کسلاؤں کو نقصان پہنچا کر دیا، اور گنے کی قیمت گر گئی۔

ان تمام امور اور ان کے علاوہ اور بہت سی باتوں کی وجہ سے یہ مناسب ہے اور نہ ممکن ہے کہ ہمارے ذہنی اور صنعتی مسائل محدود ملکی مصنوعات کے مطابق حل کئے جاسکیں، اور یہی صورت ہماری قومی زندگی کے ہر پہلو کی ہے۔ ہم سب اور جذبات انگیز فقروں میں پناہ نہیں لے سکتے، بلکہ ہمیں زندگی کے واقعات کا سامنا کرنا ہے اور ان سے اور ان سے مطابقت پیدا کرنا ہے۔ تاکہ ہم تاریخ کی بساط کے شاطر بنیں۔ اس کے ہر بن کر نہ جائیں۔ پھر مجھے اس مجموعہ اعتماد یعنی گاندھی جی کا خیال آجاتا ہے۔ باوجود اپنی تیز فہمی اور مظلوموں کے جوش حمایت کے وہ کہیں اس زوال پذیر نظام کی حمایت کرتے ہیں۔ جو موجودہ مصیبت اور اسراف کا ذمہ دار ہے، یہ نتیجہ ہے کہ وہ اس مصیبت سے نجات پانے کی راہ ڈھونڈ

لے۔ لیکن لندن کی گول میز کانفرنس کے جلسے میں گاندھی جی نے فرمایا تھا: سب سے بڑی بات یہ ہے کہ کالگریس اپنے اصل مقصد کے لحاظ سے ہندوستان کے کرداروں کے دباؤ پر فائدہ کش فریبوں کی مانند ہے، جو ملک کے طول و عرض میں سات لاکھ لاکھ آدمی پھیلے ہوئے ہیں۔ چاہے وہ برطانوی ہند کے ہوں یا ہندو ہند کے۔ جن جن گروہوں کی افواہیں کالگریس کے نزدیک قابل حمایت ہیں۔ ان میں سب پر مقدم ان بے داناؤں کی خدمت ہے۔ اکثر افواہیں ایک دوسرے سے ملکر ہی نکلتی ہیں۔ اگرچہ کچھ ایسا ہر مختلف گروہوں کی افواہیں ملتا رہیں تو میں نے دھمک لیا کہ ہوں کہ کالگریس ہر گروہ کی افواہیں کو ان کرداروں کے دباؤں کی خدمت پر قربان کر دے گی۔

ہیں کرتے۔ اس وقت تک وہ یہ توقع کیے کر سکتے ہیں کہ کسی شخص کو انہیں خیال  
 بنائیں گے۔ یا لوگوں میں وہ ذہنیت پیدا کر سکیں گے جس کی ضرورت ہے۔  
 اس میں شک نہیں کہ واقعات خود سب سے بہتر معلم ہوتے ہیں۔ لیکن اگر  
 ان واقعات کی صحیح اہمیت کو ظاہر کرنا ہے اور ان سے مناسب کام لینا  
 ہے تو اس کی ضرورت ہے کہ ہم خود انہیں سمجھیں اور دوسروں کو سمجھائیں۔  
 کبھی کبھی میرے احباب اور رفقاء میری باتوں سے چڑھ کر پوچھتے ہیں  
 کہ کیا آپ نے کسی کوئی کرم انہیں نہیں، مخیر نہیں کیا، نیک نیت اور بامروت  
 سرمایہ دار اب تک نہیں دیکھا؟ بینک میں نے ایسے لوگ دیکھے ہیں، بلکہ  
 میں خود اُس طبقے سے ہوں جو زمینداروں اور دولتمندوں سے مل جوں  
 دکھتا ہے۔ میں خود ایک نمونے کا بورژوا ہوں۔ اسی ماحول میں میری  
 تربیت ہوئی، اور اسی کیے خیالات نے ابتدا میں مجھے متاثر کیا۔ بعض  
 اشتہالیوں نے مجھے پیچھے پور بورژوا کہا تھا، اور بالکل ٹھیک کہا تھا، غالباً  
 اب وہ مجھے اپنے گنہگاروں سے تو بڑھ کر دالا بورژوا کہیں گے۔ لیکن

لے اس طبقے کا شہری

لے اس طبقے کا شہری

## دعا

جنوں فتنہ سامان و بیاک دے  
 یہ دشت و جبل تنگ و تاریک ہیں  
 مجھے باہ و انجسم کا ہمراہ ذکر  
 جو سو پر دوں میں حسن کو دیکھ لے  
 البتہ گریبانِ صد چاک دے  
 انہیں وسعتِ ہفت افلاک دے  
 نظامِ محبت کا ادراک دے  
 نظر پاک دے او بیاک دے

ہر اک صید کو یہ سعادت کہاں  
 جسے چاہے وہ عیشِ فتراک دے

## سرمایہ داروں سے خطاب

اے غلامِ عیش و عشرت سود خوار سی تا بہ کے  
 آگئی تجھیں بتا کیونکر درندوں کی یہ خور  
 دیکھ غافل بند ہونے ہی کو ہے بابِ حیات  
 ننہائے کیف بھر دے غلمِ پرور سا زمین  
 کچھ غریبوں کی بھی حالت کا تجھے احساس ہے  
 چمن سے سوتا ہے تو بستر پہ چا در تان کر  
 اس کی عسرت نے بنایا ہے تجھے سرمایہ دار  
 کوششیں کرتا ہے کیا کیا دانے دانے کے لئے  
 یہ ہے وہ سلطان جو مٹی سے لیتا ہے خراج  
 اس نے دامن کو زمین کے موتیوں سے بھر دیا  
 ایک ٹوہ ہے نشہ فرعونیت میں چڑ رہے  
 تو ہے دولت مند اور یہ مفلس و نادار ہے  
 تیرے ارمانوں کے گلشن میں بہار آیا کرے  
 اس کی آنکھوں میں ہیں آنسو تیرے ہونٹوں پر بھی  
 وہ ترا گلیں محل اور اس کا یہ چہرہ کا گھر  
 سرنگوں عسرت سے یہ، دولت پہ تو بے در ہے  
 تیرے گھر میں روشنی سبکی کی آتی ہے نظر  
 کھا رہا ہے مست ہو کر تو پہاڑوں کی ہوا

اے کرم ناسنا سرمایہ دار سی تا بہ کے  
 لگ گیا ہے تیرے لئے مظلوم انسان کا اہو  
 زندگی محبوب ہے تو سیکھ آدابِ حیات  
 لوح پیدا کر خدا کے واسطے آواز میں  
 فاقش اہل وطن کا بھی تجھے کچھ پاس ہے  
 یہ ہے کس عالم میں تجھ کو کیا بھلا اس کی خبر  
 تو زمینداری کا مالک اور یہ مفلس کا شکار  
 ہر نفس روتا ہے دم بھر سکرانے کے لئے  
 کھیت اس کا ملک ہے اس کا خزانہ ہے اندج  
 تخم ریزی کر کے قدرت کے حوالے کر دیا  
 ایک یہ بھائی ترا عسرت زدہ مزدور ہے  
 صاحبِ عزت ہے تو اور یہ ذلیل و خوار ہے  
 اس کی کشت آرزو کیا یوں ہی مہجبا کرے  
 تیرے چہرے پر سرت، اس کے رخ پر بکسی  
 تیرا قصہ زحمت اس کا بوسیدہ کھنڈر  
 یہ مصیبت آشنا تو رنج و غم سے دور ہے  
 کام تار بکی میں دیتا ہے اُسے داغِ جگر  
 مر رہا ہے ایک مفلس دیکھ بے آب و غذا

پاک عورت ہے تکیہ سیرت اگر ناپاک ہے  
 تلف ہے اس جینے پہ ایسی زندگی پر ناک ہے

# تلاش معاش

## پھول چمنہ

کے بعد وہ کھڑکی تک آئے — کہاں جاؤ گے؟ — ”کانپور — ڈیڑھ روپیہ — رفیق نے ایک پر حسرت نظر دار دام بڑھا دئے — کاش اس کا یہ قرض جلد ادا ہو جاتا۔ اس نے طے کر لیا کہ اپنی مزدوری کے پیسے تین روپڑی میں سے چھپا کر قرض ادا کر دے گا۔

گاڑی آنے میں ابھی دیر تھی۔ وہ بیٹ پر بیٹھ کر بہر خیالات میں غرق ہو گیا۔ رات کو انہیں خیالات نے اُسے دیر تک جکھائے رکھا تھا اس وقت وہی اُسے تنہائیاں دے کر سو جانے پر مائل کرنے لگے۔ اُنہیں کا سکون مدد کر رہا تھا۔ آخر اُس نے آنکھیں بند کیں اور بیٹھے ہی بیٹھے ایک جھمکی بٹنے لگا۔ اس کے کانوں میں گھنٹی کی آواز پہنچتی۔ اس نے آنکھیں کھولیں۔

گاڑی آ رہی تھی وہ کھڑا ہو کر بیٹھنے لگا۔ دور! بدیت دور! پشیموں پر انہیں اُس نے ایک قوی پہل دی کہ طرح تیزی سے اُٹا دکھائی دیا۔

گاڑی ٹکی۔ وہ ایک ڈبے میں داخل ہو گیا۔ ڈبے کے اکثر سفر بچوں پر آنکھیں بند کے دراز تھے کون جانتا ہے کہ وہ سوتے تھے یا جاگ رہے تھے، کیونکہ یہ وقت سوتے کا وقت نہیں۔ گرمیوں کا زمانہ! سات بجے دیر ہو چکی تھی۔ سوتھلے کریش بہتوں کو گرم کر رہی تھیں۔ ڈبے بھی گرم ہو چکا تھا۔ خدا

جانے یہ مسافر کیوں زیادہ سے زیادہ جگہ اپنے قبضے میں رکھنا چاہتے تھے۔ اُسے جب کوئی جگہ نہ ملی تو مجبوراً کھڑا رہا۔ یعنی آدمی تو مزدورت سے چو گئی جگہ لیں اور ایک کو کھڑے رہنے کی تکلیف گوارا کرنی پڑے۔ ..... بہ ادا کی کسی

جب دیہات میں کوئی ذریعہ معاش نہ نکلا تو رفیق نے بزرگوں کی رائے سے مجبور ہو کر شہر کا رخ کرنے کا ارادہ کیا۔ بیوی کی جذباتی گرز بہی تھی۔ مگر ساتھ ہی ساتھ لوگوں کے ملنے سننے کی تاب نہ رہی تھی۔ آخر ایک صبح سو رہنے سے پیسے ہی وہ گاؤں کے ایک چھوٹے سے اسٹیشن کی طرف روانہ ہو گیا۔ اسٹیشن اُس کے گھر سے کوئی تین میل کے فاصلے پر تھا۔ راستے میں اُسے کئی ہم وطن ملے۔ اور ہر ایک نے اُس سے کہاں؟ کا سوال کیا۔ جس کے جواب میں وہ کبھی تو چپ رہ جاتا اور کبھی قسمت آزمائے کہہ کر حدیث سے آگے بڑھ جاتا۔ اُس کے چہرے پر حسرت برس رہی تھی۔ اور اس کا دل دُوب رہا تھا۔ اس کے باوجود اُسے اُمید کی ایک موم ہرم میں کرن دکھائی دے جاتی۔ وہ سوچتا کہ تھوڑی کشتش سے محکم کسی کار خانے میں جگہ مل جائے گی۔ اور چند مہینوں کے بعد میں گھر والوں کو سونہ دکھانے کے قابل ہو جاؤں گا۔ یہی خیال تھا جس کے سہارے اُس کے قدم اُٹھتے چلے جا رہے تھے۔

اُس کا دماغ اس کے مستقبل پر روشنی ڈال رہا تھا۔ اس کے بڑے اس کو اسٹیشن سے قریب تر کئے چلے جا رہے تھے۔ آخر کار اس کے خیالات کو منتشر ہو جانا پڑا۔ وہ ٹکٹ گھر کی کھڑکی پر کھڑا ہو گیا۔ گاڑی ابھی نہیں آئی تھی۔ ٹکٹ باور رجسٹر پر سر جھکا کر کچھ لکھ رہے تھے۔ اس کی جھمکی دیکھ کر ان کی نظر میں اوپر اٹھیں وہ دہرے ہوئے۔ دس منٹ انتظار کرنے

نے سوچا نہیں اور اگر سوچا بھی ہو تو صرف سوچا ہی۔

گھڑی جی۔ دیر تک وہ گھر کی سے بھاگتا رہا۔ چرائی یا دین اندی چلی آہی تھیں۔ اگر میں کبھی واپس نہ آسکا۔۔۔ یہ خیال پیدا ہوتے ہی اُس کی آنکھوں میں آنسو سر آئے۔ اتنے میں کسی نے اُسے مخاطب کر کے کہا۔ "سبیا کھڑے کیوں ہو۔ آؤ مجھے جاؤ۔ اس نے دیکھا تو پاس ہی بیٹھا ہوا ایک بڑھا اس کے لئے جگہ خالی کر رہا تھا۔ اُس نے آنسو روکے اور اُس کے پاس بیٹھ گیا۔

"کہاں جاؤ گے بابو؟ بڑے نے سوال کیا،

"کچنر" یہ کہہ کر وہ تھوڑی دیر چپ رہا جیسے بڑے کی طرف سے کسی سوال کا منتظر ہو۔ بڑھا چپ رہا تو اُس نے کہا۔ "اور تم؟ بابا" "سبیا ہیں تو غبور اترنا ہے" بڑھا یہ کہہ کر اس کے چہرے کو غور سے دیکھنے لگا۔ اسے بابو یہ آنسو کیسے؟ کیا گھر چھوڑتے ہو معلوم ہوتا ہے؟ مگر ان تمام کو بعد واپس لائیں۔ یہی جی بپتے پہل توکری کرنے لگا تو بڑا دکھ معلوم ہوا۔ گھر والی کو رونا دیکھ کر میں بھی رو دیا۔ پر جی کو اگر کے گھر سے نکل پڑا۔ دو سال بعد کوئی دوسروں کے لکڑیوں والے دیکھ کر ہنساں ہو گئے۔ گھر والی تو اسے خوشی کے رو پڑی۔ تب سے طبیعتی باڑی کرتا ہوں۔ بہت محنت کرنی پڑتی ہے۔ کراپے سبگوں کی آنند سے دن بیت رہے ہیں۔ کچنر کیا لڑکری کرنے جا رہے ہو؟

"ہاں بابا"

"محنت اور مہربے کام کر دے تو ان میں آنند ہی آنند رہے گا۔ پیسے بڑے دیکھتے پڑیں گے۔ وہاں کوئی گھر دار ہے یا بس پرانا ہی کے بہار سے جا رہے ہو؟

"کوئی نہیں۔ بس اللہ مالک ہے"

"یقین نہ آؤں کسی سجد میں بیٹھنا۔ وہاں کے لاکھ کچھ خدمت کرتے رہنا۔ پڑھتے بھری جگہ دیدیں گے"

یہ سوال فطرت کے لئے کہ میں اپنی رائیں کہاں بسر کروں گا، بہت طبع تھا، اپنے لڑکے ہم سفر کی رائے اُسے بہت پسند آئی، وہ اچھل پڑا۔ اس نے شکر ہے اور کرنا جا۔ مگر الفاظ ڈالے، زبان نے ساتھ نہ دیا۔ کچھ کہنا چاہتا مگر انک ایک لڑک کرنا۔ بڑی کوششوں کے بعد

اس کے منہ سے صرف اتنا نکل سکا۔ "یہ تو سبک ہے"

وہ دیر تک چپ رہا۔ بڑھا کچھ سوچ رہا تھا، اور وہ بھی۔ وہ اب پیسے کی طرح ناامید نہ تھا۔ اُس کا دل انگلوں سے بھر گیا تھا۔ اُس کے دل نے اس کے سامنے خیالی تصویریں پیش کر تی شریں کر دیں۔ یہی تصویریں اس نے اپنے آپ کو دیکھا کہ مغرب کی نماز کے بعد ایک سجد میں بیٹھا دلخیز پڑھ رہا ہے۔ لوگ ایک ایک کر کے چلے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ سجد نماز کے سے خالی ہو جاتی ہے۔ دلخیز جلدی سے ختم کر کے وہ پیش نماز صاحب کے قریب پہنچتا ہے۔ اُن کو سلام کر کے کچھ عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہے، جو وہ بخوشی دے دیتے ہیں۔ وہ ان سے کہتا ہے کہ قبل میں یہاں تلاش معاش کے سلسلے میں دور دراز کا سفر کر کے آیا ہوں۔ میرے لئے جانے قیام کا کوئی بندوبست نہیں۔ میری مالی حالت بہت اتر ہے۔ اگر جناب اجازت دیں تو اس سجد میں قیام کروں۔ جناب کی دعا و فتوح خدمت کرتا رہوں گا، اور آپ کا احسان کبھی نہ بھولوں گا۔

وہ اُسے بہت خندہ پیشانی سے اجازت دیتے ہیں۔ رات کا کھانا بھی اپنے ہی ساتھ کھاتے ہیں۔ صبح ہوتی ہے اور وہ سجدے نماز پڑھ کر برآمد ہوتا ہے۔

دوسری تصویر جو اُس کی آنکھوں کے سامنے پیش ہوتی ہے ایک بیل کی ہے کہ وہاں وہ ایک بیٹھ میں کھڑا ہے۔ بیٹھ کو ہوتی ہے اور وہ کوڑا ایک کوٹ پہن چنے ہندوستانی صاحب کے سامنے پاتا ہے، اُن سے وہ کسی مز دور کی جگہ کی درخواست کرتا ہے، اور وہ بخوشی قبول کی جاتی ہے۔ شام کو اُسے دو بھر کی مزدوری ملتی ہے۔ وہ شادان و فرحان سجد میں پہنچ کر مولوی صاحب کے آگے رقعیت چمکا دیتا ہے۔ وہ سگین و آفرین کہہ کر اُس کا دل بڑھاتے ہیں۔

وہ آنکھیں بند کر کے اسی طرح کے خیالات کی خواہش میں غفلت کرنے لگا یہاں تک کہ فقیر کے لپٹن اس کا ہمدرد بڑھا بغیر اس کے شانے ہلانے اُسے خیر باد کہہ گیا۔ اس کی آنکھیں پھر بھی نہ کھلیں۔ غنودگی زیادہ عاری ہوئی اور وہ بڑے کی خالی کی ہوئی جگہ پر قابض ہو گیا۔ اب تک وہ بیٹھ کر سوتا تھا، اب کچھ لیٹ کر اور کچھ بیٹھ کر سونے لگا۔ گاڑی جلدی۔ وہ اب بھی سوتا تھا۔ اس کی آنکھوں کو کبھی کبھی کھل جاتا تھا، پھر بھی اُسے سونے میں مڑا رہا تھا۔



کہے۔۔۔۔۔ ایک مسلمان کو اپنے گھر میں پناہ دینا تو درگزر خدا کے گھر میں بھی پناہ لینے سے محروم رکھتے ہیں۔ اگر کہیں غلطی سے کوئی لائق گھر پر چلا جاتا تو شاید جو قوں یا ڈنڈوں سے خاطر کرتے۔۔۔۔۔ خدا غارت کرے! ان موزوں کو۔

اُسے اپنے ارد گرد کی ساری چیزیں اپنے غلات نظر آرہی تھیں۔ ساری دنیا اُسے دشمن معلوم ہو رہی تھی۔ سڑک پر چلتے چلتے لڑکھاتا تو ٹھک بنانے والوں کو کوستا۔ کسی کہے سے ٹرا جاتا تو اُسے ٹھکے مارتا۔ اس کی حالت بالکل چڑچڑے ہوئی کی سی ہو رہی تھی۔ اگر کوئی قسمت کا مارا اس وقت اس سے ہمدردی کا اظہار کرتا۔ تو وہ اُسی پر برس پڑتا۔ اسی وقت اُس نے سوچا کہ یہ ساری آفت اس بدستی کی رائے کی لائی ہوئی ہے کچھ بُرا ایسا بھی اُسے کہا مگر معاف خیال آیا کہ اُس نے تو میری بھلائی ہی کے لئے بھلا تھا اس میں اُس کی کیا خطائ تھی۔ اسے اپنی یہ حرکت بہت بُری معلوم ہوئی، اپنے اوپر لعنتیں بھیجیں۔

انہیں خیالات میں محو وہ دیر تک چلتا رہا۔ جب بازاروں سے نکل کر وہ ذاتا ریاک حصوں میں پہنچا تب اُسے ہوش آیا۔ سوچنے لگا اب کیا کروں۔ سانسے اُنکے پارک تھا۔ خیال آیا کیوں نہ اسی میں لیٹ رہوں، یہاں اس ٹھکی باتیں نہیں۔ یہ بات پیسے ہی وماغ میں کیوں نہ آئی۔

پارک کی ٹنڈی ٹنڈی گھاس بہت آرام دہ معلوم ہوئی۔ لیٹ گیا، کچھ دیر تک لیٹا رہا۔ خیال آیا کچھ کھا یا نہیں، بھوک معلوم ہونے لگی۔ اُسٹھا تو بہر طرٹ ہوا عالم تھا کسی آدمی کی شکل نہ دکھائی دی۔ کچھ گھبراہٹ معلوم ہوئی۔ آبادی کی طرف چلا۔ تنہو سی ودر گیا تھا تو خیال آیا، اگر اس وقت کھانے کو کچھ نہ ادر سونے کو کوئی جگہ نہ ملی تو رات بھر لوہی مارا مارا پھر دوں گا۔ بہتر ہے کھانا نہ کھاؤں۔ یہیں سو رہوں۔ پیسے بھی بچ رہیں گے۔ واپس آکر کچھ لیٹ رہا۔ نگینیں بند کر لیں، سرتکا تو تھا ہی، جلد فید آگئی۔

صبح جب سورج نہ ستایا، اور دھوپ ناقابل برداشت ہوئی تو مجبوراً انگلیں مٹا ہوا اُٹھا کچھ دُور چل کر ایک نل پر سنبھ ہاتھ دھویا۔ ایک آدمی سے بل کا راستہ پوچھ کر اُدھر چل پڑا۔

مٹیوں، بھٹات، لوگوں سے پوچھتا، آخر کار بل تک پہنچا ہی گیا۔ اتنی اونچی اور مضبوط دیواریں، اور اتنی عظیم الشان عمارت اس نے

آدھوں نے نگینوں سے دیکھی۔ وہ سمجھا کہ کوئی مسند و مسند پوچھ رہے ہوں گے جدی ہے جائیں گے۔ یہ سوچ کر وہ ریٹھا رہا۔ مگر وہ دیر تک نہ بیٹے۔ یہ دیکھ کر وہ آگے کھسکا کہ قرب بیٹھے۔ مولوی صاحب نے چونک کر کہا: "کے آپ کو کوئی ضروری کام ہے؟" وہ سٹ پٹا گیا: "نہیں۔۔۔۔۔ موزی کام" اس نے خود کو بھالنے ہوئے کہا: "تو نہیں۔۔۔۔۔" پوہی کچھ عرض کرنا تھا:

"فرمائیے۔۔۔۔۔" جدی بولے۔ فرصت کم ہے:

اس نے ڈرتے ڈرتے کہنا شروع کیا: "مسافر ہوں، اس شہر میں لوہی کی تلاش میں آیا ہوں۔۔۔۔۔"

"چاہتے کیا ہیں آپ؟" مولوی صاحب کے نمیشینوں میں سے ایک نے کہا۔

"رہنے کا کوئی ٹھکانا نہیں۔ اگر آپ اجازت دیں تو رات کی رات (؟)

مسجد میں پڑ رہوں۔"

"چہ خوش! مسجد کوئی مسافر خانہ تو ہے نہیں کسی سرائے میں تشریف لے جائیے۔"

اس جواب کی اُسے کبھی خواب میں بھی امید نہ تھی۔ یہ سن کر جیسے اس پر بجلی گڑبڑی۔ خانہ خدام اور ایک رات کی پناہ نہ ملے! وہ کچھ نہ کہہ سکا، اس کا منہ کھلا کھلا رہ گیا اور نظریں ان تینوں پر جم گئیں۔ وہ اپنی جگہ سے ہٹنے کے قابل بھی نہ رہا۔

ایک وہ شخص جو اب تک خاموش تھا اس کی یہ حالت دیکھ کر بولا آپ کوئی دوسرا انتظام کریں:

"بہتر! کہہ کر وہ اُٹھا اور مسلمان "علیم" کہہ کر باہر نکلے لگا تو کلاں میں آدا آئی: "بہتر! مسافر!"

ان الفاظ نے مجموعہ کے ذہنوں پر رنگ پاشی کی۔ اور دل چلن چلن ہو کر آنکھوں سے نکلا۔ دنیا اس کے حق میں کس قدر ظالم تھی جہاں وہ اتنی امیدیں کر رہا تھا۔ وہاں کی یہی ہی منزل نے اُس کے قدم اُٹھا ڈئے۔

۔۔۔۔۔ آہ یہ مولوی جو رات یہ چار پائی پر تن کے آرام سے سوئے گا۔ مجھے زمین پر پڑ رہنے کی بھی اجازت نہ دے سکتا تھا۔۔۔۔۔ اچھا سمجھا۔۔۔۔۔

بد معاش سمجھا۔۔۔۔۔ دنیا داسے کتنے بد گمان ہیں۔۔۔۔۔ مسجد میں سو رہے ہوں گے اور سچے ہی ایک جس کی چری کا ڈر ہو۔۔۔۔۔ یہ ہیں دین کے

ہے، بالواسطہ میں بیٹے ہیں۔

وہ تائے ہوئے راستے پر ہو گیا۔ دفتر کے سامنے پہنچ کر اہو گیا۔  
 باو—جن کی خیالی تصویر اس نے ایک ہندوستانی "مصاب" کی بنائی تھی۔  
 "نیکل ہڈت" "دعوتی ہاندے" کرسی پر بیٹھے تھے، اُسے دیکھ کر ہلے "کیا چاہیے؟"  
 "لاکری کی تلاش میں آیا ہوں؟"

"سعادت کیجئے آپ کے لائق ہمارے پاس کوئی کام نہیں: یہ کہہ کر وہ  
 کچھ نکلنے لگے۔

رفیق حیرت سے ان کا منہ تک رہا تھا وہ کچھ کہنا چاہتا تھا مگر سمجھ میں  
 نہ آتا تھا کہ کیا کہے۔ کچھ کہنے کے لے اب بے ہی تھے کہ "ہڈت نا باتے اُسے  
 گھورا۔۔۔ جیسے پولیس والا کسی مشتبہ ملزم کو۔۔۔ اور وہ سر جھکائے جدھر  
 سے آیا تھا اسی طرف چلا گیا۔

اور شرار کو اخبار میں یہ خبر شائع ہوئی کہ لنگہ میں ڈوب کر ایک  
 نوجوان نے خودکشی کر لی۔

پہلے کبھی نہ دیکھی تھی۔ دیر تک آنکھیں بھاڑ بھاڑ کر اُسے دیکھتا رہا۔ اس نے  
 دیکھا کہ لوگ آتے ہیں اور ایک طرف کو پھٹے جاتے ہیں۔ قیافہ گنت ہے کہ یہ  
 مزدور ہیں، اور اسی کارخانے میں کام کرتے ہیں۔ اس نے ان سے کچھ پوچھنا  
 چاہا لیکن زبان نے ساتھ نہ دیا۔ دیر تک یوں ہی کھڑا رہا۔ اتنے میں ایک  
 سس خراش سٹی پینے لگی۔ ٹانواں اسی کارخانے میں۔ اس نے لوگوں کو جلدی جلدی  
 بڑھتے ہوئے دیکھا۔ شاید یہ کام پر پہنچ جانے کی سیٹی تھی۔

اس نے دیکھا کہ موقع ملتا جا رہا ہے۔ بہت کڑے اوروں کے ساتھ  
 ہو گیا۔ ایک دروازہ دیکھا ہی دیا کہ ہانے والے اسی پر کھڑے تھے۔ قریب  
 پہنچ کر اس نے دیکھا کہ ایک شخص کھڑا ہر آدمی سے ایک ٹکٹ طلب کرتا  
 ہے۔ اور اسے لے کر اُسے اندر جانے دیتا ہے۔ مجبوراً وہ رک گیا جب  
 سب اندر داخل ہو چکے تو اس سے پوچھا۔ کیا میں یہاں ڈکری لی سکتی ہوں؟  
 "مزدوری کیجئے گا؟"  
 "جو جیئے؟"

جو کہیدار نے اپنے ساتھی سے کہا۔ انہیں باوجود جے پاس پہنچا دو؟  
 ساتھی نے سوچا کہ پتہ بتا دینا بہتر ہے، اور بولا۔ "اوسر جے جانے۔ وہاں خبر"

## یاد دوست

زمین ہے آسمان تک نفلتوں کی حکمرانی ہے  
 فضائے دہر میں تاریکیاں کر ڈٹ بدلتی ہیں  
 سینہ ناگن کے آگے گل چراغ بزم عالم ہے  
 ہر اک برگ و شجر پر سننا ہٹ کا تسلط ہے  
 بسا آب و گل پر اک جو بد کیف طاری ہے  
 مگر تو ہے کہ ایسے میں سبھی محکوم یا آتا ہے  
 لٹیں شانوں پہ ڈالے لیے شب کی جوانی ہے  
 ہوائے تندیں خاموشیاں پیہم فصلتی ہیں  
 تجلی کو اک سرسبز مصروف ماتم ہے  
 صدا میں جھینگروں کی جھینگہا ہٹ کا تسلط ہے  
 جہاں میں نیند کی دیوی کا فیض عام جاری ہے  
 سرور و کیف بن کر میرے دل پر چھائے جاتا ہے

مری بزمِ تخیل میں تری تصویرِ رقصاں ہے  
 مری تاریک دنیا تیرے جلوؤں سے فروزاں ہے

# مقلین قفس

ہم قفس رو نہ بہت شکوہ صیا د نہ کر  
میں سمجھتا ہوں کہ تو عیش گستاں سے ہے دُور  
پھلی آزاد یوں کا دھیان جب آتا ہے تجھے  
تجھے یاد جب آتے ہیں گستاں کے تجھے  
مٹا کبھی پھر لوں کے بھڑٹ میں نشین تیرا  
شاخ گل پر کبھی کتنی مٹتی جاتی تیسری  
سب یہ سب یہ بجا سب یہ بھی اسب یہ سب  
میں نے ناگ قفس تیرے لئے ہے حبس  
زندگی خاک تری باغ میں ہوتی مٹی لبر  
روز بڑھتا تھا تجھے اک نہ اک افتاد سے کام  
خوف شاہ میں سے نکلتی مٹی نہ آواز تری  
کسی گوشے میں لگائے تھا کوئی جال کہیں  
آشیانہ تھا ترا وقت اڑنے کے لئے  
کبھی عرصہ کبھی آندھی سے تھا بالاجھک  
پیٹ کی ٹھک میں عالم تھا پریشانی کا  
رات دن کام تھا محنت سے شغف سے تجھے  
غور و غور کہ پہلی کوئی آزادی ہے  
اب یہاں دیکھ کہ ہے کس قدر آرام سے تو  
نہ یہاں برق کا کھٹکا نہ خزاں کی کامش  
ہا وہ باران کے مصائب کی تجھے فکر نہیں  
نہ یہاں جال کا دھڑکا ہے نہ شہباز کا ڈر  
دانے دانے کے لئے اب نہیں زحمت سمجھو  
یہ مشقت ہے نہ محنت ہے نہ حیرانی ہے

آہ و عماد غلط کی برباد نہ کر  
سمجھ کو اس قید بلا سے رہائی منظور  
ہجر احباب جن سخت سستا ہے تجھے  
خواب آئے ہیں نظر قبل درساں کے تجھے  
اور اب خانہ صیا د ہے مسکن تیرا  
اب ہے محبوب قفس زمزمہ خوانی تیری  
پھر بھی بیکار ہے اس طرح سے رہنا ترست  
پھر بھی جو اس یہاں ہے وہ ہے گلشن بحال  
نہ دنیا نہ رنجا نہ غم تھا تجھے آٹھ پہر  
جو بگائیں سے، کبھی فطرت صیا د سے کام  
ہر گز مٹی تاک میں تھا چکل شہباز تری  
کوئی عیشا تھا کترنے کو پر و بال کہیں  
جسم نازک یہ ترے تیرے بڑے کے لئے  
کوئی جز برق نہ تھا لو جھنڈا لا سمجھو  
کبھی دانے کا تھا خلیان بھی پانی کا  
کوئی مطلب ہی نہ تھا عیش فراغت سے تجھے  
مجھے حیرت ہے کہ تو کس لئے فریادی ہے  
مطمن کلفت صیا د و غم دام سے تو  
چین سے گوشہ عزت میں ہے بے رنجش  
صرصر و خار کے آلام کایاں ذکر نہیں  
نہ یہاں تیرا دکان و قدر انداز کا ڈر  
بن گیا ہے قفس اک آئے رحمت سمجھو  
پھر بھی نالاں ہے جو تو یہ تری نادانی ہے

شکر کر میری طرح کاٹ دے آرام سے دن  
ورنہ گزریں گے بہت کلفت و آلام سے دن

# افسانے کی تشکیل

مولینا آد اوصا بری

واقعات کے تاثر کا خیال رکھا جاتا ہے۔ کرداروں کی مناسبت، افسانہ کے اجزاء کے تناسب، واقعات کے مناسبت و مدارج، اور زاویہ بیان سب کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔

عملی تشکیل کے دوران میں افسانہ نگار کو یہ امر ہر وقت ہنسنے پید کرنا ہے: اس اصول کے پیش نظر وہ ہر اس جزوی چیز کو جو پلاٹ میں شامل کی جاتی ہے۔ پیچھے خوب اچھی طرح نظر اٹھان و مکیا ہے کہ آیا یہ افسانے کے لئے ضروری ہے یا نہیں؟ آیا اس سے افسانے میں کوئی حقیقی اضافہ ہوتا ہے یا نہیں؟ اور آیا اس جگہ کے لئے بالکل مناسب رہ گا یا نہیں جو اس کے واسطے افسانے کے پلاٹ میں نکالی گئی ہے۔

ہم نے اوپر تک سے کم ذرائع کی ترکیب استعمال کی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ افسانہ نگار افسانے میں کم سے کم ضروری کردار رکھے، کم سے کم واقعات دکھائے اور کم سے کم وقت اور زیادہ سے زیادہ محدود مکیا میں افسانہ تیار کر دے۔ اگر دو کرداروں سے کام چل سکتا ہے تو تین کردار استعمال کرنا بے ضرورت ہے۔ اگر تاثر کی تخلیق کے لئے صرف ایک وقوعہ درکار ہے تو افسانہ نگار کو اسی ایک وقوعہ تک رہنا چاہیے۔ اگر ایک ہی مقام پر افسانہ تمام ہو سکتا ہے تو اسے کئی مقامات پر پھیلائے کی کوئی ضرورت نہیں۔ مگر حالات، کردار، واقعات وغیرہ میں زیادہ سے

تشکیل، افسانہ نگار کی جزئیات متین کرنے کا نام ہے۔ افسانے کے حسن اور سچائی کا جتن دار و مدار پلاٹ کی عکاسی پر ہے افسانہ نگار کی خوبی پر سبھی ہے جس طرح پلاٹ میں معمولی سی خامی رہ جائے پر تمام افسانہ خراب ہو جاتا ہے۔ اسی طرح تشکیل میں نقص باقی رہ جائے تو افسانے کے اجزاء کی مناسبت اور اس کے وقعات میں فرق آ جاتا ہے۔ خاک تیار کرنا اگر ایک فن چیل ہے تو خاکے میں جزئیات آرائی کرنا بھی ایک آرٹ ہے تشکیل افسانے کے خاکے میں جزئیات کی جگہ متین کرنے کا دوسرا نام ہے۔ اس میں افسانہ کی جزوی باتوں کی طرف توجہ دی جاتی ہے۔ موسم، کمرے کے دروازے، کھڑکیاں وغیرہ بہت سی معمولی چیزیں تشکیل کے وقت زیر غور آتی ہیں تشکیل کو پس کرنا بالکل بوجھنا درست نہیں بلکہ کٹنے سے قبل افسانے کے پلاٹ میں جن معمولی معمولی باتوں کو دخل کرنا ضروری ہوتا ہے ان کے تعین کو تشکیل کہا جاتا ہے، ہر جزوی بات کے وجود کے جائز میں وجہ ڈھونڈنی جاتی ہے۔ ہر فقرہ، ہر حادثہ یا ہر وقوعہ، ہر کردار، ہر بیان، ہر قول کے مستحق یہ دیکھا جاتا ہے کہ آیا وحدت تاثر سے ہم آہنگ ہے؟ اور آیا اس کو وہ مناسبت مل جائے گی ہے یا نہیں، جہاں وہ زیادہ سے زیادہ موثر ثابت ہو گا۔ اجزاء اس طرح ملائے جاتے ہیں کہ افسانہ کی عمارت میں بعد اپن پیدا نہیں ہونے پاتا ہر جزو اتنا ضروری اور برمل معلوم ہونے لگتا ہے کہ اگر اسے اس کی جگہ سے ہٹا لیا جائے تو افسانے میں کسی بات کی کمی نظر آنے لگے۔ تشکیل میں سلا

وہ صرف پس منظر کا کام دینے یا دفعا پیدا کرنے کے واسطے پیدا کئے جاتے ہیں ایسی صورتوں میں ان کی تخلیق اور تعمیر برکوتی خاص توجہ صرف نہیں ہوتی۔ یا تو ان کی ایک جگہ ہی جھلک دکھادی جاتی ہے، یا صرف اوپری طور سے تذکرہ کر دیا جاتا ہے یا ان کا ایک ہلکا سا عکس دکھا دیا جاتا ہے۔ بعض افسانوں میں اضافی کردار صرف جزئیات کی تکمیل کے لئے لائے جاتے ہیں۔ کبھی ایک کہانی بیان کرنے والے کی ضرورت ہوتی ہے جس کا خود کہانی کے واقعات میں کوئی حصہ نہیں ہوتا۔ عرض صدا ہا طریقوں سے امدادی کرداروں سے کام لیا جاتا ہے۔ ہر افسانہ کی جداگانہ ضرورت ہوتی ہیں۔

بعض اوقات افسانے میں ایک معاون کردار کا اس لئے بھی اضافہ کر دیتے ہیں کہ اس سے نفسی مضمون کو تقویت پہنچتی ہے، مثلاً مرکزی راوی کی حوصلوں کو واضح تر کرنے کے لئے مولیٰ نیاز فقہری نے شہید آزادی میں حیدر رضا کا کردار پیش کیا ہے۔

کرداروں کا واقعات سے قریبی تعلق ہوتا ہے۔ اس لئے اب ہمیں افسانے کے وقوعات کی طرف توجہ کارڈن پھرنا چاہیے۔ افسانے کا یہ اصول ہے کہ ہر جزو کسی نہ کسی طرح افسانے کے عمل اور اس کی حرکت کو آگے بڑھاتا ہے اور افسانے کو اس کے متعین انجام سے قریب تر کرتا ہے۔ اس سے ایسی جزئیات پیدا ہوتی ہیں جن سے افسانہ مکمل ہوتا ہے۔

انہی جزئیات کے صحیح انتخاب اور مناسب استعمال پر بڑی حد تک افسانہ پس منظر اپنے مقابل کے کردار کی خصوصیات کو آگے و رکھن میں توفیق پزیر ہوتا ہے۔

وقوعات کے تین مصنف ہیں۔ مثال سے کسی چیز کو واضح تر کرنا، عمل میں تیزی پیدا کرنا، اور جذبات کی آگاہی کا سامان پیدا کرنا۔ یہ ضروری نہیں کہ ایک افسانہ میں وقوعات کا ایک مصنف ظاہر ہو۔ ہر کہانی میں عمل اور جذبات ایک ساتھ نمودار ہوتے ہیں۔ اس سے عمل کے وقوعات اور جذباتی وقوعات اکثر پہلو پہلو ایک دوسرے سے وابستہ دیکھے جاتے ہیں۔

مثالی وقوعات بہت کم دیکھے میں آتے ہیں اور وہ افسانے لئے بنیادی طور پر ضروری بھی نہیں ہوتے وقوعات عمل البتہ افسانے کے لئے جان۔ کا حکم رکھتے ہیں۔ جذباتی وقوعات کو اس طرح ترتیب

زیادہ کفایت بخاری برتتے وقت ایک بات فراموش نہیں ہونی چاہیے۔ وہ بات یہ ہے کہ افسانہ کی کفایت زیادہ سے زیادہ موثر طریق پر پڑھنے کے لئے زمین نشین ہوجانی چاہیے اگر تاثیر کے حصول کے لئے کفایت بخاری سے دست بردار ہونا پڑتا ہے تو افسانہ نگار کو چاہیے کہ بے تعلق اس سے دست کش ہو جائے تشکیل کے معاملہ میں ایک بڑا اہم حل طلب مسئلہ افسانہ نگار کے سامنے یہ ہوتا ہے کہ حصول تاثیر اور کفایتی ذرائع کے درمیان توازن کیونکر قائم کیا جائے۔

ہر افسانہ میں چند کردار ایسے ضرور ہوتے ہیں جو پلاٹ کی حرکت کے لئے ضروری نہیں ہوتے، مگر تشکیل کے لئے ضروری عناصر کا حکم رکھتے ہیں انہیں معاون کردار کہتے ہیں کیونکہ ان سے پلاٹ کو نشو و نما دے کر افسانے کو تکمیل تک پہنچانے میں مدد ملتی ہے، اکثر انہیں تقابل کی عرض سے پیش کیا جاتا ہے تاکہ مرکزی کردار کی بعض اچھی یا بری خصوصیات اور بھی اجاگر ہوجائیں۔

اگر مرکزی کردار غیر معمولی کی طرح مبالغہ ہوتا ہے تو امدادی کردار عام رجحانات کے حامل دکھائے جاتے ہیں تاکہ مرکزی کردار کی غیر معمولیت اور بھی زیادہ نظر آئے۔ اگر مرکزی کردار کے کیڑے پڑیں ہر بضایہ زیادہ ہوتی ہے تو اس کے مقابل نیک امدادی کردار رکھ کر اس کی طینت کی جزئی کو اور بھی جھکا دیا جاتا ہے۔

بعض اوقات ایک کردار کو دوسرے کردار کی فضا سے بعد بالکا کے پس منظر اپنے مقابل کے کردار کی خصوصیات کو آگے و رکھن میں توفیق پزیر ہوتا ہے۔ اور اگر تاریک میں تو تاریک تر کر کے دکھاتے ہیں۔ کبھی اس پس منظر کے مقابل ایک کردار کو صرف ناپا جاتا ہے، یوں بلند ترین روشنیوں اور عمیق ترین تاریکیوں پڑھنے والے کے سامنے لائی جاتی ہیں۔

تاہم کرداروں کا تنہا مصنف تقابل ہی نہیں ہے یہ اصل کو زیادہ سے زیادہ کفایتی ذرائع برتے جاتے ہیں، اس امر کا مقتضی یہ ہے کہ وہ اور طریقہ بھی ہے ایک دوسرے سے اس طرح وابستہ ہوجاتے ہیں جیسے کہ پلاٹ کے تاریک دوسرے سے چسپاں کر دئے جاتے ہیں، کیونکہ ان کی ہر ایک سے افسانہ کی تشکیل کا عمل مکمل پڑ رہا ہوتا ہے۔

بعض اوقات معاون کرداروں میں انفرادیت باطل نہیں ہوتی،

دینے سے کہ وہ وقعات کے درمیان آجائے۔ اس لئے کہ مسلسل کن تسلسل کو توڑا جاسکتا ہے۔ یہ سوال ہوسکتا ہے کہ اس طرح بار بار دلچسپی کو اٹکے اور مدہم کر دینے سے آیا اس لئے کہ وحدت باثر کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔

ایک سو فی صدی شال سے اس سوال کا تفسیعی جواب دیا جاسکتا ہے۔ فرض کرو ایک شخص پہاڑ پر چڑھ رہا ہے۔ وہ منظر چو پہاڑ کی چوٹی سے نظر سکتا ہو اس کو اسی وقت نظر آئے گا جب وہ پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ جائے گا۔ مگر اس دوران میں بھی تو جب وہ اوپر کی طرف گامزن ہے چنانچہ اسے ایسی چیزیں نظر آئیں گی جو اس کی نظروں کے لئے "حجبت نظر" ثابت ہوں گی، بالکل ہی صورت اس کی ہے۔ جذبات کی ہر تازہ ایک ہٹ ڈاؤں نظر کو وسعت دیتی ہے۔ مگر حالات کا پورا اندازہ اس لئے کہ غلط عروج پر پہنچنے کے بعد ہی نصیب ہوتا ہے، عمل کے لحاظ سے اس لئے برابر اپنے ارتقاء کی شان زائل کرتا رہتا ہے۔ ان تمام شان زائل نقطہ عروج ہی پر ہوتا ہے۔ درسیان کی نازک لمحات شاہراہ ارتقاء پر سنگسنگ راہ بن جاتے ہیں۔ ہر نازک لمحہ اپنے پیشرو کی نسبت کسی قدر بلند تر سطح پر ہوتا ہے۔

اس لئے کہ ان نازک لمحات کے درمیان دلچسپی میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی چاہئے، کیونکہ تادم قائم رکھتے ہوئے یہ ضروری نہیں کہ ہر بار کسی بندھی پر پہنچنے سے قبل ایک شخص کسی دلدلی میں آئے۔

دوسرے ٹاپ کا وقوعہ یعنی شالی وقوعہ بھی ذہن ہی سے اپیل کرتا ہے۔ تصویعی مثالوں سے اس لئے کہ جذبات دکھ بڑھ جاتی ہے۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ شالی وقعات سے صرف اس لئے کہ واقعات کی گہرائی تک پہنچنے والے کے ذہن کو لیجانا معقول ہوتا ہے۔ واقعات کو مجسم کر کے وہ انہیں یاد دہانہ شکل دیدیتے ہیں۔ اکثر اس طرح کسی کردار کی کئی تصویریں کھینچی جاتی ہیں۔ کبھی کبھی اس لئے کہ موضوع پر شالی وقعات سے نئی تصویریں پڑ جاتی ہیں۔ ان کے ذریعے پڑھنے والا شروع تک بالکل ایک نئے راستے سے پہنچتا ہے۔ اس طرح ایک اضافی واقعہ کے علم میں آجائے سے تاثیر وار اثریں بھی اضافہ ہوجاتا ہے۔

جذباتی وقعات کا واسطہ اس لئے کہ عمل کو ترقی دیتے ہیں۔ وہ اس کی فضا بناتے ہیں۔ اسے ایک مخصوص رنگ دیتے ہیں اور پڑھنے والے میں جذباتی ہمدردی برانگیختہ کرتے ہیں۔ ان سے کیفیات کی تخلیق بھی کی جاتی ہے۔ کبھی

کبھی ان سے کہانی میں فوری مزاج کی چمک پیدا ہوجاتی ہے۔ مگر ان وقعات کا مصرت کچھ بھی ہو اس بات کا خیال رکھنا چاہئے کہ جہاں تک وحدت باثر کا تعلق ہے یہ اسے کسی جز کا نقصان نہ پہنچائیں۔ ہر جذبہ باقی وقعات تنہا ہی وجود پذیر ہوسکتے ہیں۔ مگر مادمہ عمل یا مثال کے وقعات سے منتہی کر دئے جاتے ہیں۔

اس لئے کہ تخیل کے دوران میں یہ بھی خیال رکھنا پڑتا ہے کہ عمل کردار اور فضا کو مناسب اثر بخش جائے۔ مگر اس میں شدت نہ ہو۔ کسی وقوعہ کے بیان، یا کسی کردار کی تصویر کھینچنے میں بہت سی جزوی اور غیر اہم تفصیلات دی جاسکتی ہیں۔ ان کا مصرت صرف یہی ہوتا ہے کہ تاثیر میں گہرائی پیدا ہو۔ مولانا یار فخری نے داستان حسن و عشق کے خفیہ ورق میں جو تصویفات کاغذ سے ماخوذ ہے قلوبطرح کا کردار پیش کرتے وقت درجنوں جزوی اور غیر اہم تفصیلات پیش کی ہیں اسی طرح قلوبطرح کے عمل کی فضا بڑی مرتعش کی ہے۔ شاید اس سے صنعت کی غرض قلوبطرح کا کشاں کشاں منظر پیش کرتا ہے۔ ہر وقت اس کے "رادعا" میں کردار نگاری کو بہت کم گنجائش دی گئی ہے، یہاں عمل پر زیادہ زور ہے اور جس حد تک ضروری ہے کہ کردار کی تصویر بھی عمل کی جھانکوں میں ہی سے دکھائی گئی ہے کبھی کبھی نمایاں کردار یا عمل اور بھی زیادہ نمایاں بنانے کا یہ طریقہ استعمال کیا جاتا ہے کہ اس لئے کہ صحت چند تصویفات الفاظ کلہ کر آگے بڑھ جاتا ہے۔ مگر اس وقت جب پڑھنے والا تفصیلات کا متوق ہو، بیانی اختصار سے پڑھنے والے کی توجہ فوراً کردار یا عمل پر مرکوز ہوجاتی ہے۔

تخلیق اثر کے لئے بعض اور ذرائع بھی استعمال کئے جاتے ہیں۔ تہنہ دیکھا ہوگا تخلیق سارے میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جب کسی کو کسی خاص شعر یا مصرع پر وجد آجاتا ہے تو موسیقار اس کی گار بار دہرہراتے ہیں، اور اس کے اثر میں اس لئے ہوتا جاتا ہے، ہر باجربہ پسندیدہ شعر یا مصرعہ دہرا جاتا ہے صاحبہ وجد کے دل و جگر میں ہر گھسی اٹھتی ہے۔ بعض اس لئے ہیں بھی یہی کشاکش استعمل کیا جاتا ہے۔ امریکن اس لئے کہ انڈیا گرائن پوز جو اس لئے نگاری کا ہوا آدم سمجھا جاتا ہے اس ترکیب کا بڑا دلدادہ اور بہت خرگشتہ۔ مختلف اس لئے ہیں یہ ترکیب مختلف طریقوں سے استعمال کی جاتی ہے بعض دفعہ نثر یا موضوع پر زور دیا جاتا ہے بعض اوقات جسے وہی اشارات



کوئی ایک زاویہ اختیار کرنا پڑتا ہے۔

۱۱) ایک ایسا شخص جس کا افسانہ سے قریب یا دور کا تعلق نہیں ہے افسانہ بیان کرتا ہے۔ یہ ڈھنگ بہت قدیم سے مروج ہے۔ اس میں چند خامیاں ضرور ہیں۔ یعنی بعض اوقات بیان اور اسصیت کے معاملہ میں افسانہ میں گنجلک آجاتی ہے مگر اس ڈھنگ سے پڑھنے والوں کو ایک بڑی آسانی یہ رہتی ہے کہ وہ ایک ہی وقت میں وہ سب کچھ دیکھ لیتے ہیں جو مختلف مقامات پر اور مختلف اوقات میں ہوا ہے اس ڈھنگ سے وہ دونوں میں چھپے ہوئے خیالات اور پوشیدہ رجحانات سے بھی باخبر ہو جاتے ہیں، اور کسی صورت حال یا کردار کا تجزیہ بھی کر سکتے ہیں۔ اس بیانی زاویہ سے یہ آسان ہو جاتا ہے کہ ہر کردار کو بے لاگ اور بغیر جانبدارانہ طور پر پیش کیا جاسکے۔ پڑھنے والا اس زاویہ سے بیان کئے ہوئے افسانوں میں اپنی تمام توجہ واقعات پر مرکوز کر دیتا ہے، اور بیان کرنے کے وجود کو بالکل فراموش کر جاتا ہے۔ بعض افسانوں کے لئے یہ غیر جانبدارانہ زاویہ بیان ناگزیر اور لازمی ہوتا ہے۔ وہ اس ڈھنگ کے سوا اور کسی ڈھنگ سے بیان ہی نہیں کئے جاسکتے۔

۱۲) کوئی ایسا شخص افسانہ بیان کرتا ہے جو خود واقعات میں حصہ دار نہ چکا ہے یا جس نے افسانہ کو وقوع پذیر ہوتے دیکھا ہے، اس ڈھنگ سے واقعات کے بیان میں بہت مصفا پیدا ہو جاتی ہے، یہ فطرت انسانی کا خاصہ ہے کہ ہم ان لوگوں کی زبان سے کسی واقعہ کو سننا زیادہ پسند کرتے ہیں جو یا تو حادثہ میں شریک تھے یا اس وقت جبکہ حادثہ وقوع پذیر ہوا ہو وہاں موجود تھے۔ اس صورت میں افسانہ بیان کرنے والا ہمارے ایک واقف کار کی سی حیثیت حاصل کر لیتا ہے اور افسانہ اصل معلوم ہونے لگتا ہے بالخصوص ایڈیٹیو پنچرا کے افسانہ مز کڑی کرداروں کی زبان سے بیان کر ڈالے جاتے ہیں تو بہت ہی زیادہ لبریز اسصیت معلوم ہونے لگتے ہیں۔ البتہ ان صورتوں میں جب ایڈیٹیو پنچرا کا انجام خنزیر ہو یا ایڈیٹیو پنچرا کا انجام مہر ہو کی موت پر ہوتا ہو۔ یہ ڈھنگ بیکار ہو جاتا ہے۔

افسانہ عمل میں یہ ڈھنگ زیادہ کامیاب ثابت ہوتا ہے۔ مگر افسانہ کردار کے لئے بہت غیر موزوں اور نامناسب ثابت ہوتا ہے

صورتوں میں ترتیب وقوع تو ڈھکی جاتی ہے اور افسانہ نگار اپنے اوپر انہیں ترتیب دیتا ہے۔ کسی واقعہ کو جرتربیب وقوع کے لحاظ سے آگے ہونا چاہیے متعین کیجئے کہ جتنا ہے اور کسی کو چھپے دکھانا چاہتا ہے آگے لے آتا ہے۔ تاہم اکثر و بیشتر افسانوں میں ترتیب وقوع کے مطابق واقعات بیان کئے جاتے ہیں۔ اکثر افسانوں کو ابواب میں تقسیم کر دیا جاتا ہے یا تو ایک طویل سطر پہنچ کر یا ایک حصہ کو دوسرے حصے سے جدا کر دیتے ہیں یا نفلے یا سہول وغیرہ درمیان میں لا کر ناولہ پیدا کر دیا جاتا ہے یا (۱) (۲) (۳) وغیرہ سے فرق ڈال دیتے ہیں۔ ہر چند بعض مستند افسانہ نگاروں کے افسانوں میں اس وضع کی تقسیم نظر آتی ہے۔ مگر فی اعتبار سے اس تقسیم کی معقولیت کا کوئی جواز نظر نہیں آتا۔ اس صورت میں جب نظر میں مکمل تبدیلی یا مسلسل خیالات میں مکمل انقطاع ہو اس قسم کی تقسیم قابل درگزر ہے۔ ایسی جگہوں پر فرق ڈالنے سے افسانہ کی مجموعیت پر بڑا اثر نہیں پڑتا۔ برخلاف اس کے اگر اس تقسیم سے متعدد صحت مختلف زمانوں کا کھداجدا کر کے دکھانا ہو تو ظاہر ہے کہ اس سے افسانہ کی حرکت پر بڑا اثر پڑتا ہے اور اس وقت یہ تقسیم نہ صرف بیکار بلکہ خلوات قاعدہ بھی ہوتی ہے۔

۱۳) مختلف زمانوں کے وقوع و عام طور پر ایک فقرے یا چند الفاظ سے تجزیاتی ظاہر کیا جاسکتا ہے اور اکثر افسانوں میں اس کی بھی حاجت نہیں ہوتی کیونکہ وقوعوں کا فرق ظاہر کرنا ضروری ہی نہیں معلوم ہوتا۔ اگر کوئی افسانہ ابواب یا تقسیم ہوئے بغیر ہی تحریر ہو سکتا ہے تو اسے ابواب میں تقسیم کرنا سخت غلطی ہے بلکہ دیکھا تو گیا ہے کہ جن کہانیوں میں وقت ظاہر ضرور معلوم نظر آتا ہے وہ بھی ایسا کرنے سے بے اعتبار حرکت کر رہ جاتی ہیں۔ کیونکہ وہ پڑھنے والے کے ذہن کو دھمیلے پر مائل کرتی ہیں۔ اگر افسانہ ڈیٹیز رشتہ واقعات کا فاصلہ طے کرنے پر مہر نہیں ہے تو وہ پڑھنے میں گھبراہٹ کیوں محسوس ہوں افسانہ پارہ پارہ ہو جاتا ہے اور جو افسانہ ٹکڑے ٹکڑے ہو کر پڑھا جائے وہ وحدت نامہ کار کا حامل نہیں ہو سکتا اور نہ پڑھنے والے کے ذہن پر واحد تاثر مرتب کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

۱۴) افسانہ نگار کے سامنے یہ بھی ایک مل طلب سوال ہوا کرتا ہے کہ افسانہ کو کیا شکل دی جائے۔ یعنی کس قسم کا بیانی زاویہ لیا جائے۔ فہم اور سلیقہ اس مسئلہ میں بہترین رہنما ہوتے ہیں۔ عموماً قلیل کے بیانی زاویوں میں سے

چونکہ مرکزی کردار اپنی ذاتی صفات اور خصوصیات کو خود اپنی ہی زبان سے واضح کرتا ہوا کچھ اچھا نہیں معلوم ہوتا، اور جب ایک کردار اپنی گفتگو اور اپنے عمل سے ظاہر ہوا افسانہ بے لطف رہتا ہے۔ اس لئے اگر افسانہ نگار میں بیان کا یہ ڈھنگ اختیار بھی کیا جاتا ہے تو اس طرح مرکزی کرداروں کی گفتگو کردار کی زبان سے افسانہ بیان کرایا جاتا ہے۔ اس طرح کردار نگاری کا حق بھی ادا ہو جاتا ہے اور واقعات کی وضاحت کا بھی۔

(۳) بعض اوقات ان لوگوں سے جو افسانہ کے واقعات میں حصہ لے رہے ہیں خطوط کے ذریعہ افسانہ بیان کرایا جاتا ہے یا ڈائری میں واقعات کے اندراج سے افسانہ تحریر کیا جاتا ہے۔ یہ طریق بہت کم استعمال ہوتا دیکھا گیا ہے، اور اس کا استعمال بہت دشواری ہے۔ تفصیل اس اجمال کی یوں ہے کہ خطوط میں عموماً جہاں تہاں کی درجنوں باتیں ہوتی ہیں اگر مخاطب اور صاحبِ مکتوب میں بے تکلفی ہے یا دوسرے لفظوں میں فنی احتساب اُن کی اس وضع کی آزادی سبب کر لیتا ہے۔ ان خطوط میں کوئی ایسی بات درج نہیں ہو سکتی جو کسی دُسی اعتبار سے افسانہ کا جز بننے کی صلاحیت نہ رکھتی ہو، اور پھر اس باندی کے ساتھ ہی خطوط میں اصلیت کی جھلک بھی ہوتی چاہئے۔ خطوط کے ذریعہ افسانہ بیان کرنے میں ایک مزید دشواری یہ ہے کہ افسانے کی تدریجی ترقی اور محسوس قائم رکھنی مشکل ہوتی ہے۔ اگر کل خطوط ایک ہی شخص نے لکھے ہیں تو ہر خط میں یہ سبب ظاہر کیا جانا ضروری ہوتا ہے کہ گذشتہ خط کا مخاطب نے کیا جواب دیا۔

ڈائری کا یہ طریقہ بھی اسی قسم کی مشکلات کا حامل ہے۔ خطوط تو ہر حال کسی نہ کسی مخاطب کو خطاب کر کے لکھے جاتے ہیں۔ اس لئے ان میں ضرور کچھ نہ کچھ دلچسپی ہوتی ہے۔ مگر ڈائری کا طوق اس لحاظ سے اور بھی زیادہ غیر مناسب ہوتا ہے۔ کیونکہ تنہا ایک ہی شخص ڈائری لکھتا ہے، اور جو کچھ لکھتا ہے کسی کو خطاب کر کے نہیں لکھتا۔

دہم، ایسی صورت میں جب افسانہ بیان کرنے والے نے افسانہ کسی دوسرے سے سنا ہو تو وہ افسانہ در افسانہ ہو جاتا ہے۔ پیسے دو تین پیر میں ایک نم کتابیانہ تعارف ہوتا ہے اور پھر یہ دکھایا جاتا ہے کہ ایک شخص (عام طور پر بہت اصرار کے بعد) ایک کہانی شروع کرتا ہے جو اس نے اپنی بگڑی سے سن رکھی ہے یا جس کے واقعات اس کی

موجودگی میں وقوع پذیر ہوئے ہیں یا جس میں وہ خود بھی بطور معاون کردار یا مرکزی کردار شریک رہا ہے یہ طریق اور بھی کم طریق سے استعمال ہوتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ یہ طریق بیان بہت ہی قدیم ہے۔ اطالوی زبان میں یوگاسیو کے درجنوں افسانے اس طریق پر ہیں۔ انگریزی زبان میں چارٹرس نے اس طریق کو کئی کئی طرح استعمال کیا ہے۔ ہماری اردو زبان میں تیرا من دہلی نے چار درویش اسی پیرائے میں لکھا ہے۔

یہ لکھنا ضروری نہیں معلوم ہوتا کہ افسانہ کا کمال، یہ ہے کہ پڑھنے والا اُسے اصل سمجھے۔ تفصیل کی تمام جزئیات کو اس طرح آراستہ کرنا چاہئے کہ وہ سمجھ بے اصلیت معلوم ہوں۔ آخر اسی وقت ہوتا ہے جب یہ پڑھنے والا افسانے کو اس قدر اہل سمجھ لگے کہ اُسے شبہ ہو جائے کہ یا تو یہ واقعہ کہیں ہو چکا ہے یا ہو رہا ہے۔ اگر پڑھنے والے کو افسانہ پڑھتے وقت یہ محسوس ہونے لگے کہ اُسے اہل ذہنی کا شکار بنا یا جا رہا ہے تو وہ متغیر ہو کر افسانہ پڑھنے سے رکھ دے گا۔ بعض اوقات اپنی چونچ کی بنا پر دیو پری کے افسانے بھی اصل معلوم ہونے لگتے ہیں، اُن میں بعض خصوصیات ایسی ہوتی ہیں کہ قوتِ تخیل ان لوٹ ہو جاتی ہے، اور بندہ دُشمنوں کی طرح اُن کی رفتار کے ساتھ ساتھ چلنے لگتے ہے۔ پختہ عو کے لوگ بلحاظ دیو پری کے افسانوں میں اتنی دلچسپی نہیں پاتے جتنے بچے۔ اس کی ایک مروجہ وجہ ہے، مٹوس حقیقتوں کی سنگین دنیا سے تادیر تعلق رکھنے کی وجہ سے پختہ عو کے لوگوں کی قوتِ تخیل کم ہو جاتی ہے۔ خیالی دنیاؤں میں پہنچ جانے کی قوت اُن میں نہیں رہتی۔ انھیں دیو دیو کی لڑائیوں، اژدہوں کے مارے جانے، اور دیوتاؤں کے زیرِ کعبے جانے میں چنداں لطف نہیں آتا۔ کیونکہ وہ سمجھ لگتے ہیں کہ اس حقیقی دنیا کے دیو دیو کا جن سے دن رات واسطہ پڑتا ہے اسی دنیا کے آدمیوں کے ہاتھوں مارا جاتا ہمارے لئے زیادہ مفید اور باعثِ دلچسپی ہے۔ پختہ عو کے مرد اور عورتیں دلوں اپنی اس قابلیت پر فخر کرتے ہیں کہ وہ غلط اور صحیح میں تمیز کر سکتے ہیں۔ اس قسم کی باتیں کہ ایک ہوائی قالین آیا اور وہ شہزادے کو اڑا کر پریوں کی حسین سرزمین کی طرف لے گیا، اُنھیں مجھول اور بے معنی معلوم ہوتی ہیں، جب تک اُنھیں یہ خیال دے دے کہ افسانہ خیالی واقعات پر مبنی

ہے تو وہ افسانہ در افسانہ ہو جاتا ہے۔

دہم، ایسی صورت میں جب افسانہ بیان کرنے والے نے افسانہ کسی دوسرے سے سنا ہو تو وہ افسانہ در افسانہ ہو جاتا ہے۔ پیسے دو تین پیر میں ایک نم کتابیانہ تعارف ہوتا ہے اور پھر یہ دکھایا جاتا ہے کہ ایک شخص (عام طور پر بہت اصرار کے بعد) ایک کہانی شروع کرتا ہے جو اس نے اپنی بگڑی سے سن رکھی ہے یا جس کے واقعات اس کی

گھٹی ہے، غرض کسی چیز کو دیا جاتا ہے کسی کو؟ مہاراجا تاجپے اور حقیقی واقعات کو حقیقی رکھتے ہوئے بھی ایسا بنا سوا کر پڑھنے والوں کے آگے پیش کر دیا جاتا ہے کہ انہیں افسانہ نگار کی ذرت نکلا، اور علویہ تخیل کا معترف بننا پڑتا ہے۔

مگر یاد رہے کہ حقائق تخیل کا مزدورت سے زیادہ گہرا رنگ چڑھانے سے ان کے اثر میں کمی ہو جاتی ہے۔ حقائق اپنی کجائی کے اعتبار سے اول آخر حقائق ہی رہتے ہیں۔ مگر وہ موثر نہیں ہوتے۔ انہیں تاثیر کا حامل بنانے کے لئے مزدورت ہوتی ہے کہ ان کا رشتہ سپونڈکسی ایک چیز سے لگایا جائے جو عام انسانی تجربہ سے ڈانڈے ملائے ہوئے ہو وہ کوئی ایسی چیز ہوئی چاہے جس سے عام انسان واقفیت رکھتے ہوں۔

افسانہ میں اصلیت کی جھلک پیدا کرنے کے لئے یہ ضروری نہیں کہ افسانہ نگار خود کو دو قوعات اور طول طویل بیان کا پابند کرے۔ ایسی جزئیات بھی چوائے ان میں سماجی منظر کشی کی گئی ہوں موثر ہوتی ہوں۔ جاسے وقوف اور وقت کے جردی اشارات سے بھی افسانہ میں اصلیت کی جھلک پیدا ہوتی ہے۔ کہ دار کے منہ میں بھی ایسے فقرے رکھے جاسکتے ہیں۔ جو افسانہ کو واقفیت کا رنگ دیدیں حقیقی واقعات یا ہنگامی ساخت کی طرف کبھی کبھار ہلکا سا اشارہ کر دینے سے بھی اصلیت جھلکے لگتی ہے۔

ہے اور اس کا نگین حقائق سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ وہ اس کوسپی کے ساتھ کے لئے تیار نہیں ہوں گے۔ (اور یہ بھی اس وقت جب وہ پڑھنے پر آمادہ ہوں) چنانچہ حقیقت پسندانہ نگار صرف اپنی واقعات پر اپنے افسانہ کی بنیادیں رکھتے ہیں جو نہ صرف حقیقی معلوم ہوں بلکہ کسی بحث کے حقیقی نتیجہ بھی کر لئے جاسکیں۔

مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ افسانہ جو بہ زندگی کا چرہ ہونا چاہئے چاکلر دست سنگتراش جس طرح اپنے تخیل سے پتھر کے ایک ٹکڑے کو ایک دل کش اور حسین صورت میں تبدیل کر دیتا ہے، اسی طرح ایک ماہر فن افسانہ نگار ایک حقیقی واقعہ کو زبان اور خیال کے رنگ دے کر کچھ بنا دیتا ہے وہ واقعات کو حقائق کے جہوم میں سے جدا کر کے ان پر اپنے تخیل کا جا دو کرتا ہے اور دیکھتے دیکھتے میں وہی سنگین رہے رگ و گیاہ اور خشک واقعات سچائی اور حسن کے ایک دل آویز مرقع کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔

کبھی کسی شخص کے کیرکڑے کسی قابل غور پہلو کو اہمیت دے کر انا بلند کر دیا جاتا ہے کہ پڑھنے والا ایک لمحہ کے لئے گہری سوچ میں پڑ جاتا ہے کہ انہی ہی غیر اہم خصوصیت کو دار کو بھی اس قدر سبق آموز بنا دیا جاسکتا ہے، کبھی کسی ایک واقعہ کو اس کے جردی علاقے سے علیحدہ کر کے کچھ اس طرح پیش کیا جاتا ہے کہ جو لوگ اس پر غور کرتے ہیں۔ ان کے دلوں پر چوٹ کی



نہ میگوئوں کا وہ گلشن رہا، نہ لالہ رہا  
نہ کوئی دفتر آداب کا رہا نسخہ  
نہ سوز و ساد کا قائم رہا مقولہ کوئی  
نہ اہل عیش کے وہ و لفریب سخن رہے  
نہ زاہدوں کا وہ زہد ہزار سالہ رہا  
نہ کوئی مصحف انداز کا رسالہ رہا  
نہ علم و عقل کا باقی کوئی مقالہ رہا  
نہ اہل درد کا وہ جاگہ از نا لہ رہا

حرم کیفیت میں تارین رخسار بن کر  
رہا تو حضرت ساقی کا اک پیالہ رہا

# اے نیند بس اب آجا

منفس کی کافی ہے، قیدی کی رہائی ہے کچھ وصل نہیں ظالم - یہ شام جدائی ہے  
 اے نیند بس اب آجا، اے نیند بس اب آجا  
 جلتی ہیں مری آنکھیں بلکیں میں شہر گویا اُٹھتا ہے دھواں دل سے، ہے آنچ نظر گویا  
 اے نیند بس اب آجا، اے نیند بس اب آجا  
 یکساں ہے گرم تیرا - جب سائے زمانے پر پھر کیوں اُتر آئی ہے، اک میرے ستارے پر  
 اے نیند بس اب آجا، اے نیند بس اب آجا  
 ہر سانس کے پہلو میں پیکار ہے کھلتا ہے ہر لحظہ کھلتا ہے - ہر آن کھٹکتا ہے  
 اے نیند بس اب آجا، اے نیند بس اب آجا  
 حواں کا یہ عالم ہے، خاک اُڑتی ہے سینے میں جینا ہے جو نام اس کا، کیا لطف ہے جینے میں  
 اے نیند بس اب آجا، اے نیند بس اب آجا  
 تکلیف ذرا فرما، احسان ترا ہو گا ہوں بند مری آنکھیں - افسانہ سننا ہے  
 اے نیند بس اب آجا، اے نیند بس اب آجا  
 تو بالمش و بسترے، میں خاک پر سوؤں گا آرام تجھے دوں گا، انعام تجھے دوں گا  
 اے نیند بس اب آجا، اے نیند بس اب آجا  
 ہے میرے شہتال میں، خاموشی و تاریکی سامان ہے راحت کا، اور سبج ہے پھولوں کی  
 اے نیند بس اب آجا، اے نیند بس اب آجا  
 اب بھی جو نہیں آتی، آنچھ کو دکھا دوں گا ہے عکس مرے دل میں، جن چاند کے ٹکڑے کا  
 اے نیند بس اب آجا، اے نیند بس اب آجا  
 آرام کا دشمن ہے، اور جانِ تنہا ہے میں جس کا تیا ہوں، دل جس نے تیا ہے  
 اے نیند بس اب آجا، اے نیند بس اب آجا

# پیام اقبال اور کشف

رازی

اس ضمن میں چونکہ بعض واقعات کا ذکر مزدوری ہو گا، اور واقعات میں نام لینا ناگزیر ہو جاتا ہے۔ اس لئے ان مقامات میں کسی شخص کی ذاتی مخالفت مقصود نہیں، موافقت ہے تو اصولی، اور مخالفت ہے تو اصولی۔

جناب کشتان کو شکایت ہے کہ ”اسلام کی دوسلگی سے اُن کے دماغ اقبال کے اشرب میں مزید وسیع و آفاقی پیدا ہوتی جاتے تھے، اور برادران وطن کی طرف سے بجائے شکایت ہائے دُکھ کے پُر جوش ترخاں یہ تین وصلی ہونے کے اسباب پیدا ہونے لگتے تھے، لیکن گزارش یہ ہے کہ علامہ دیالیک مسلمان ملک یہ وسیع و آفاقی ہی تو برادران وطن کے لئے شکایت ہائے دُکھ کا باعث بنتے ہیں۔ آپ حبیب ملک اپنی نگاہوں کو عمارتِ مآنا کے مندر کی چار دیواری تک مقید رکھئے۔ جب تک آپ اس کنویں کے سینڈ گک بنے رہے، برادرانِ وطن آپ سے راضی، آپ کے خدا سے راضی۔ لیکن جو بھی اپنے نگاہوں کو وسعت دی اور اس کنویں کے باہر خدا کی مخلوق کو سبھی انسانیت کا درجہ دیا۔ یہ منہ لبور کے بیٹے گئے، اور اس میں دراصل اُن کا تصور بھی نہیں، جو قومِ نوبع انسانی کو چاروں دروں میں تقسیم کر چکی ہو اور ان چار دروں کے باہر کے انسان اُن کے نزدیک ٹیکس ہوں، جو قوم اپنے ملک کی چار دیواری کو بھی اقتضائے عالم کے حدودِ لغور سمجھتی ہو، جس قوم کو اپنے ملک سے باہر ایک انسان بھی ایسا نہ لے جو زبان۔ مذہب جو تہذیب، تمدن، معاشرت میں ان سے مماثلت رکھتا ہو۔ اس قوم میں وسعتِ تقریب کیجیے بڑی

جون۔ جولائی ۱۹۲۷ء کے حکم میں جناب کشتان کا ایک مضمون بعنوان اقبال اور پیام اقبال شائع ہوا ہے جس میں انھوں نے علامہ اقبال کے خلاف یہ جرمِ عظیم عاید کیا ہے کہ انھوں نے اپنے شاہینِ خیال کو وطن پرستی کے نفس سے نکال کر عالمگیر انسانیت کی فضا سے لبد میں بال کش ہونے کی اجازت کیوں دی ہے۔ صاحبِ مضمون نے وادین کی کثرت سے حسنِ طرزِ آئینِ رب و لہجہ اور وطن و فتنہ کی بھروسے جس رکاکت کا ثبوت دیا ہے، وہ کسی طرح بھی ان تین موضوع کے شایانِ شان نہ تھا۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ صاحبِ فن متعید نگاری کے مبادیات سے بھی نا آشنا ہیں۔ اور ان میں ہنوز نفسِ موضوع اور ذاتی جذبات کو الگ الگ رکھنے کی صلاحیت بھی پیدا نہیں ہوئی۔ اس لحاظ سے تو یہ مضمون چند ان التفات کے قابلِ نہ تھا، لیکن چونکہ انھوں نے سند ایسا چمکا رہا ہے جو آج اسلامی نقطہ نگاہ سے خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اس لئے مزدوری سمجھا گیا کہ جناب کشتان نہیں، تو کم از کم حکیم کے حلقہ میں جن لوگوں کی بعیرت تعصب کی نذر نہیں ہو چکی اُن کے سامنے حقیقت یہ نقاب کر کے رکھ دی جائے۔ تاکہ سعید و صوفی ان قسم کی ابد فریبیوں کے شرکاء نہ ہونے سے بچ سکیں۔ چونکہ جناب کشتان کا مضمون علامہ اقبال کی شاعری کے متعلق نہیں بلکہ اس پیغام کے متعلق ہے جو دولتِ اسلام کے نام دے رہے ہیں اس لئے اس مضمون کے جواب میں بھی علامہ موصوف کی شاعری نہیں بلکہ ان کے پیغام سے ہی بحث کی جائیگی۔

کو محض اس لئے بدل دینے پر مصر ہو کہ وہ زبان قرآن کے رسم الخط میں لکھی جاتی ہے۔ اور جس کے لئے تحریک آزادی کا قہر عظم۔ پورا نہیہ سورج و فیض کے منصوبے چھوڑ کر محض اس بات کو اپنا نصب العین حیات بنائے کہ اردو کی جگہ ہندی۔ ہندوستانی، ملک کی زبان ہو جائے، پھر جس قوم کے قلوب کا ترجمان مسلمانوں کے تہذیب و ثقافت کے متعلق اس قوم کے عقائد کا ترجمان مسلمانوں کے لئے یہ تہذیب و ثقافتی وارثیہ اور کھڑے ہو جائے۔ کے سوا اور ہے ہی کیا، تو فرمائیے کہ اس قوم کا استیلا جارجیا قوم پرستی یا تہذیب نہیں تو اور کیا ہے۔ ذرا انہماک کے پوجاریوں کے پاؤں میں قوت آجاتی دیکھیے، پھر دیکھیے کہ یہ قوم پرستی کیسا پیرپہ بدلتی ہے۔

پھر اقبال کے خلاف یہ سنگین جرم عائد ہوتا ہے کہ وہ یہ آرزوئیں رکھتا ہے کہ میں مجاز میں مردوں۔

بس یہ ہے اصل سبب اقبال کے خلاف بغینہ و عناد کا۔ ان کو یہ لگتا نہیں کہ اقبال کا ہندوستان سے محبت کیوں نہیں، بلکہ یہ احساس نہیں نہیں لینے دیتا کہ اُسے مجاز سے محبت کیوں ہے۔ اقبال کے خلاف ”حُبِ علی“ نہیں بلکہ بغضِ معاویہ ”کام کر رہا ہے۔ اقبال مجاز میں مرنا چاہتا ہے کہ اس کے نزدیک مجاز ہی وہ خطہ زمین ہے جہاں کسی کو نزع الہامی کی چرہ دستیوں سے پناہ ملی سکتی ہے اور جہاں کی خاک کے ذروں میں اس کو ہونے سے اضطراب و تشویش میں سکون پیدا ہو جاتا ہے۔ باقی رہا یہ کہ اس خاک پاک (ہندوستان) میں اتنے اتنے بڑے اکابر اسلام استراحت فرما رہے ہیں تو فرمت کے وقت کبھی ان بزرگان اسلام کے حالات پڑھئے اور دیکھیے کہ انھیں خاک مجاز سے کس درجہ عشق تھا، باقی رہا دل کا ساحل، سو یہاں پیچھے ہمیشہ ہونے لگا کہ جناب کشت شاہ غیر مسلم ہیں، کیونکہ یہ باور کرنے کے لئے دل مانتا ہی نہیں کہ اقبال کے خلاف لاکھ اعتراض کئے جاتے۔ لیکن ایک مسلمان اُن کا، اس عید کی تحقیر کس طرح کر سکتا ہے کہ ”آرڈو وارم ک میسرم در مجاز“ جس شخص کو دشتِ مجاز سے اس قدر نفرت ہو۔ خدا کا رے کہ وہ پردہ اٹھ جائے کہ بعد مسلمان نظر آئے۔ اقبال اُن ان کے ساتھ ہر ایک مسلمان کا قلب رنگت ان عرب کے ذروں سے کہتا ہے، اور یہ شخص جذباتی ہے، پھر نہیں بلکہ عقلاً بھی یہی ہونا چاہیے، کہ جو قوم اپنے مرکز سے جھوٹ جاتی ہے، نہ ہو جاتی ہے۔

اور چونکہ وہ خود ایسے تنگ نظر واقع ہوئے ہیں اس لئے وہ اپنی لوگوں سے خوش ہوتے ہیں جو وہ ان جیسے تنگ نظر ہوں۔ اقبال یا ہر وہ مسلمان جن کی نگاہ کے سامنے قرآن ہو۔ ان حضرات سے خراجِ تحسین کیسے حاصل کر سکتا ہے۔ وہ قرآن جو اُسے یہ پیغام دے کہ ”مستادوں سے آگے جہاں اور بھی ہیں۔ اور جو فطرت کی عالمگیر وحدت کو یوں بے نقاب دیکھنے کو۔“ لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرے کا دل چیریں۔ باقی رہا یہ کہ اقبال نے وہ طریق عمل کیوں نہ اختیار کیا جس سے برادرانِ وطن کی تحسین حاصل ہوتی، تو معاف لہذا فرمائیے۔ ایسے طرزِ عمل کی اقبال (کیسی سچے مسلمان سے تو توقع نہ کیجئے کہ وہ برادرانِ وطن، یا دنیا میں کسی انسان کی مدح و تحسین کی خاطر ایمانِ فرشتی کر دے۔

بروایں دام را پیشِ دگر نہ  
کہ غنقا را غنماست آستِ یار

جناب کشت پھر فرماتے ہیں کہ اقبال نے اپنی اس وسیع الشربہ کو اپنے داعیات کا رنگ دے کر اسلام کے نام سے پیش کر دیا۔ مجھے علم نہیں کہ کشت صاحبِ مسلمان ہیں یا غیر مسلم جس ادا سے اُنھوں نے ادب، عقلمند اور انبیاءِ کرام (علیہم السلام) کے نام لکھے ہیں اس سے تو وہ مسلمان ہی معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن اگر وہ مسلمان ہیں تو اسلام سے اس قدر ناواقفیت موجبِ تاسف ہے۔ اُنھیں اتنا بھی علم نہیں کہ جو پیغامِ علامہ اقبال دے رہے ہیں وہ کس قرآن کی تفسیر ہے۔ ان کے اپنے داعیاتِ قلب اور ذہنی رجحانات نہیں ہیں۔ اس کے متعلق درادوات سے آخر میں عرض کیا جائے گا۔

پھر فرماتے ہیں کہ اقبال نے جو کہا ہے کہ ”ان تاذہ خداؤں میں بُرا سب سے دھن ہے، جو میر جن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے“ وہ یورپی کی جارجیا قوم پرستی کو تو ایسا کہہ سکتے ہیں جس کا معنی نامِ تہذیب اور تہذیبی ہے، ہندوستان کی قوم پرستی کے خلاف انھیں ہرگز ایسا نہیں کہنا چاہئے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ میں قوم کے منصوبے یہ ہیں کہ ہندوستان کی نو کروڑ آبادی کو یا تو ان کے اندر جذب ہو کر رہنا ہوگا یا کہیں ہجرت کر جانا ہوگا۔ جو اس قدر کٹر آبادی کے مخصوص تمدن، کچھ (ثقافت) تہذیب کو یکسر مٹا دینے کا تہیہ کر رہی ہو۔ جو قوم ایک اچھی خامی رائے اُن وقت زبان

یاد اند رکھتے ہو تو سمجھا لیں اس کے کہ وہاں یہ کہہ کر کہ ہمارا کوئی مفوض متدن ، کوئی مفوض تہذیب نہیں ۔ یہ کہہ کر کہ ہاں حضور! مجاہد فرماتے ہیں ہم پہلے ہندو ہی اور اور بعد میں مسلمان ہیں ۔ ذلت کی زندگی بسر کرتے کرو ۔ اس وقت قرآن تم پر فرض کر دیتا ہے کہ ایسے وطن کی خاک کو پاؤں استحقاق سے ٹھکرا کر انہی کی دلچسپی زمین میں نکل جاؤ کہ ہر ملک ملک ماست کہ ملک خدا کے ماست ۔ اگر کثات صاحب کے سامنے کہیں "تلاش حق" کی بجائے قرآن کریم ہوتا تو ان کو نظر آ جاتا کہ اس وقت جب کہ قرآن کریم نے ہجرت کا حکم دے رکھا تھا جس مسلمان نے اُس وطن و ملک کو نہ چھوڑا اُس کے متعلق کسی بھی سخت وعیدیں آئیں مسلمانوں کو کس طرح حکم دیا گیا کہ ایسے لوگوں کے ساتھ ہوتا رہا کوئی دیکھ نہیں جن پر شاہد وطن کی محبت دین کی عورت کے مقابلہ میں غالب آگئی ہے ۔ یہ ہے جناب کثات! اقراں کریم کی تعلیم ۔ اب خود فرمائیے کہ اس تعلیم کے حامل جناب پی اکرم کیا یہ ارشاد فرما سکتے تھے کہ "حب الوطن من الایمان" اس کے بعد ارشاد دے کہ اقبال کی یہ نہ سمجھو کہ وہ ایک بے خطر شخص ہے ، نہیں ، وہ ایک علمبردارانہ خطرہ ہے ۔

اس میں شبہ نہیں کہ اقبال (یعنی وہ پنہام جو اقبال مسلمانوں کو دے رہا ہے ، اور جسے دوسرے غفلتوں میں قرآن کہا جاتا ہے) ایک علمبردارانہ خطرہ ہے ۔ آج ہی خطرہ نہیں ، ازل سے خطرہ چلا آ رہا ہے ، اور اب یہ سنگ خطرہ رہے گا ۔ لیکن یہ خطرہ ہمیشہ کسی بواکب و بوجہل کے لئے ہے کسی صبر و فادوی کے لئے کوئی خطرہ نہیں ۔ پتہ نہیں جناب کثات! یہ خطرے کی گھنٹی کن کی طرف سے بجا رہے ہیں ۔ ذرا مکمل کر بات کیوں نہیں کرتے ۔ اقبال اتنی ایک بڑا خطرہ ہے ، اب خطرہ حیدر آباد بارہ فرعون کے ساحروں کے لئے مٹا گیا خطرہ تھا ، یا جیسے سنگدہ مزدوروں کے قیصر خلیل خطرہ تھا ۔

پھر اپنے دعوے کے ثبوت میں کثات صاحب فرماتے ہیں کہ دیکھو یہ انہی خطرناک ساحر کے مولانا محمد علی مرحوم جیسے قوم پرست کا ایمان زندگی کے آخری لمحوں میں جمعیں کر لے گی ۔ اور آج سڑم علی علیہ جنات کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر اسے بھی اپنے پیچھے لگا لیا ۔ غیبت ہے کہ آپ نے اتنا تو ان لیا کہ کہ اقبال جو یہ کہتا ہے کہ ۔

در دشت جزینی من جبریل زبلی صید  
بزداں کبکد اور ، اے بہت مردانہ

اور پھر کہ میں جناب کثات سے پوچھ سکتا ہوں کہ عبارت ماما کا مندر بنانے کے لئے بنارس ہی کیوں تجویز کیا گیا ہے ؛ یعنی یا پشاد میں یہ مندر کیوں نہ تعمیر ہوا ۔ یہ ہندوستان کی متحدہ قومیت کا دیو ہی دواہ دیدوں کے استحقاق میں جا کر کیوں بنا ۔ یہ سب کچھ جناب کثات کے نزدیک مین ایمان ، اور دشت حجاز سے محبت کفر ۔

میری نگاہ شوق پر اس درجہ غفلت

اپنی نگاہ شوق کی کچھ بھی سزا نہیں ہے

پھر فرماتے ہیں کہ "ہاں یہ دی حب وطن تھا جو مومنانہ کی زبان پر تن الایمان تھا" کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ حب الوطن من الایمان " حدیث کی کوئی کتاب میں آیا ہے ۔ جائے اور اپنے ساتھ تمام وطن پرست علماء کو بھی بلائیے اور پھر ثابت کیجئے کہ یہ کوئی حدیث ہے فاقو بھانک ان کسندہ صنادیقین ، جس شخص کی مذہبی واقفیت کا یہ حال ہو کہ وہ ایک عربی کے جیسے کہ حدیث سمجھ بیٹھے ، اس کے متعلق اس سے زیادہ اور کیا کہا جائے کہ تامل و سخن گفتہ باشد ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہاں ، ایک بات جناب کثات نے البتہ پتہ کی گئی ۔ فرماتے ہیں کہ نبی اکرم نے شبہ ہجرت میں فرمایا تھا کہ "لے مکہ مجھے تو برا بڑھاتا" لیکن کیا کوئی تیرے فرزند مجھے تیرے دامن میں رہنے نہیں دیتے" اقبال کو کب ہندوستان عزیز نہیں ۔ وہی ہندوستان جس کے متعلق وہ "۱۹۰۷ء میں نہیں ۔ بلکہ ۱۹۳۷ء میں کہتا ہے کہ ۔

خادو کی امیدوں کا یہی خاک ہے مرکز اقبال کے اشکوں سے یہی خاک ہے سیراز چشمہ و پردوں سے اسی خاک سے رنگن یہ خاک کہ جس کا خزن رزہ درنا

لیکن باری ہر گز وہ آج ہندوستان کی خاک کے بجائے دشت حجاز میں چاہا وہ وطن ہے تو یہی کہے ہوئے کہ "اے بھارت ماما تو بہت عزیز ہے ، لیکن تیرے سورا پھوت یہاں کسی ملیش کو دیکھنا گوارا نہیں کرتے" اگر جناب کثات واقعات کو اپنی نگاہیں میں ایک سے نہ دیکھتے تو اس واقعہ ہجرت میں ، جسے وہ وطن پرستی کی تائید میں پیش کر رہے ہیں ۔ وطن اور دین کی صحیح سمجھ پر روشن نظر آ جاتی ۔ واقعہ ہجرت ہی ہے تو بتایا ہے کہ اگر کبھی ہمارے دین اور وطن میں آویزش ہو جائے ۔ اگر وطن کی سنبھری زنجیریں ہمارے دین کی آزاد سی چھینے پر آمادہ ہوں ، تو اس وقت اگر تم اپنے دین ، یعنی اپنے مفوض متدن و مفوض تہذیب کے تحفظ کا

جناب کا نام یاد مشورہ سر آنکھوں پر۔ غالب ایسے ہی موقعہ کے لئے کہہ گیا ہے کہ

ہوئے تم دوست جس کے اسکا دشمن آسمان کیوں ہو

بندہ لازمًا اقبال اپنے لندن۔ پھر۔ مذہب کو اس لئے الگ نہیں رکھنا چاہتا کہ اسے ڈر ہے کہ یہ مقابلہ میں آکر پیچھے ہٹ جائے گا۔ بقا و فلاح کے تالان کے تحت طاقتور سے دبا کرنا ہو جائے گا۔ وہ تو اس لندن کو خدا کا آخری پیغام قرار دیتا ہے کہ جب تک اس کا خدا نڈھ ہے یہ لندن بھی زندہ رہے گا۔ وہ تو اس لندن کو کھٹ سے سخت چٹان کے ساتھ ٹکرا دینے کے لئے تیار ہے۔ نہیں! وہ تو زندگی ہی اس ٹکرا دینے میں سمجھتا ہے، اس کی تعلیم تو یہ ہے کہ

میارا بزم بر محل کو آں حبا تو اے دنگا کی نرم خیز راست  
بدر یا غلط و بد جرحس در آویز حیات جامہ والی اندر شیر راست  
لیکن اُسے ڈر اس بات کا ہے کہ جو سینے آج اس لندن دتہذب

کے حامل ہیں اُن کے قلوب میں وہ جذبہ ایسا نہیں ہے جو اس لندن کی حفاظت کے لئے سرکنا کے لئے اُنہیں تیار کر دے۔ تہذیب و مدن کی حفاظت ان کے حاکمین کی قوت ایسا ہی کے سلطان ہو کر رہی ہے۔ وہ ڈرتا اس لئے ہے کہ اس تہذیب و مدن کا مدعی روٹی کے ٹکڑے کے عوض شہر کے چند نفروں کے عوض، برادران وطن کی تکمیل و مدح کی خاطر اپنی اس متاع گراں بہا کو بلا درینہ بھینچا جا رہا ہے۔ وہ اس لئے ڈرتا ہے۔ نہ کہ اپنی متاع کے کمزور و کمزور ہونے کی وجہ سے ڈرتا ہے۔ آپ خود فرماتے ہیں کہ ”پھر اگر ہم میں کچھ جان ہے تو دوسروں کے ساتھ گھٹ ملنا نقصان وہ نہیں ہو سکتا۔ بالکل بجا ارشاد ہے، لیکن رونا تو سی کا ہے کہ ہم میں وہ جان نہیں رہی جس سے اس لندن کی حفاظت کر سکیں۔ جان ہوتی تو پیسے ہندی بعد میں مسلمان“ کا ہندو ڈانڈ نعرہ باندھیں گے۔ جان ہوتی تو اچھا بھلا سلام علیکم چھوڑ کر یہ بات یاد مکر ڈانڈوت کیوں کیا جاتا۔ اقبال بھی جان پیدا کرنا چاہتا ہے، اور جب تک جان پیدا نہیں ہوتی خطرہ کی آگ میں کودنے سے روکتا ہے۔ دل میں غلغلہ کا سا ایسا پیدا کیجئے پھر دیکھئے یہی اقبال آپ فرد کی آگ میں اپنے ہاتھوں و مکمل دیتا ہے یا نہیں نہ

بالکل سچ کہ آج کثیر تعداد ہندو ترہان القرآن کو اپنے محبوب و حق

وہ کاجوں کے بکار لوٹوں کو اکثر گیت کی مزعورہ جنت کے چھلا دے دیکھا کہ پیچھے نہیں لگتا۔ شیر کبھی چوہوں کا شکار نہیں کرتا ہے

پھر ارشاد ہے کہ ”اقبال میں ایک غالی قسم کا ثقافتی تعصب پایا جاتا ہے: یعنی وہ اگر اسلام، مسلم، ملت اسلامیہ، اسلامی مدن وغیرہ پر لکھتا ہے تو مذہب تعصب کے تحت لکھتا ہے۔ کون سمجھائے کہ حضور تعصب اور معصیت میں بڑا فرق ہے۔ اقبال جو کچھ لکھتا ہے اسلامی معصیت کے تحت لکھتا ہے جو میں اسلام ہے، روح اسلام ہے، ایک قابل فخر مذہب ہے۔ تعصب اسے کہتے ہیں کہ جس میں عدل کا رشتہ ہاتھ سے چھوٹ جائے اور دوسرے پر ظلم روا رکھا جائے۔ اور جو اقبال قرآن میں یہ کچھ پڑھتا ہے کہ:-

لا یخبر منکم مشران قوم کسی قوم کی دشمنی نہیں اس بات پر آمادہ نہ کرو  
الا تعد لو۔ اعدا لو! کہ تم عدل کو ہاتھ سے چھوڑ دو۔ ہمیشہ عدل کرو  
وہ تعصب کے کبھی قریب بھی آ سکتا ہے

اس کے بعد کثرت صاحب دراکل کھیلے ہیں، اور اپنے اصلی رنگ میں آنا شروع کیا ہے۔ فرماتے ہیں شاعر کھٹ ہے کہ وہ چیزوں میں سے ایک کہ مضر و خیر باد کہہ دے، یا اپنے مذہب کو یا اپنے مسلک شاعری کو، دونوں سے وابستہ رہنا غلو و منافقت کا ایک نہایت غیر شاعرانہ نیز ایک نہایت غیر دیندارانہ سمجھن مرکب ہو گا۔

اب بات ہوئی نا تمکین۔ اب پتہ چلا نہ کہ آپ کی چاہتے ہیں اس قسم کی شاعری جو مذہب کی قیمت پر حریزی جائے جناب کثرت اور ان کے ہم لڑاؤں کو مبارک، جنہیں پتہ ہی نہیں کہ مذہب کہتے کس کو ہیں۔ اقبال نے تو دنیا کو دیکھا کہ ایک مسلمان جب روح اسلام کو اپنے اندر جذب کر لیتا ہے تو کس طرح ادب، شعر، فلسفہ، حکمت، سیاست، اس کے پاؤں چومتے ہے۔

اس کے بعد پھر ایک دلچسپ بحث آتی ہے، جس میں نہایت بلند ہنگی کے ساتھ اعلان ہوتا ہے کہ اقبال جب ملت اسلامیہ کو کھٹ کا پیغام دیتا ہے تو وہ دوسروں کی قوتوں سے ڈرتا ہے۔ وہ جب اپنے پیچھے کو الگ رکھنے کی تجویز کرتا ہے تو اس لئے کہ اسے خوف ہے کہ دوسروں سے مل کر یہ کچھ نہ کچھ کرنا ہو جائے گا اگر وہ اپنے اسلامی پیچھے کو مضبوط سمجھتا تو پھر ایسے اختلاط سے ڈرتا کیوں!

آپ کو خالد بن ولید کا یہ قول تو یاد رہا کہ اگر میرے گھوڑے کے سم ذرا درست ہوتے تو پھر اور تاشا دکھاتا لیکن یہ واقعہ آپ کو کیوں یاد رہنے لگا تھا کہ جب بھی خالدؓ حضرت عمرؓ کے سامنے شایوں کے لباس میں آئے تو اسے تعلیم الشان فاتح غلغلہ بطل حرب کے علوم ثبت کی کوئی پرواہ نہ کرتے ہوئے حضرت عمرؓ نے کہہ دیا کہ خالد ابھی سے اپنے شعارِ ملت کو ترک کر کے فردوس کی وضع قطع اختیار کر لی۔ اور اس وقت تک ان سے بات نہیں کی جب تک وہ عربی لباس میں سامنے نہیں آئے۔ کیا خیال ہے آپ کا کہ اس مہندسے دارلہی، اور کھڑے پاجامے کے نخر کا، کہ جسے آپ کے قوم پرست ایسے فخر سے اٹھاتے پھرتے ہیں، حضرت عمرؓ کی بارگاہ سے کیا جواب تھا: یا اگر خالدؓ کا مذہبی ٹوپی پیے، ہاتھ باندھ کر کسکا رکھتے ہوئے سامنے آتے تو ان سے کیا سلوک ہوتا؟

اس کے بعد اقبال پر اعتراض ہے کہ وہ کیونزد کا مخالف کیوں ہے حالانکہ یہ وہ نظریہ ہے جس کے ذریعہ ملت فرخ زمین پر پہلی جنت ارضی قائم ہوئی:

اشترکیت دنیا میں ایک عرصے سے موجود تھی، کسی قوم پرست مسلمان کو خیال نہ آیا کہ اس جنت ارضی، اس فردوسِ گمشدہ سے جہنمِ زارِ ہند کو متعارف ہی کرادیں، لیکن اب جو صدر کا ٹکس بیکار و بچو الٰہی کے پہلانے کا ایک کھلوا نہ روس سے لے آئے تو یہ حضرات بھی گئے اشترکیت کا گیت گائے۔ اقبال کو اشترکیت پر اعتراض یہ ہے کہ برسراوتِ شکم وارد اسکا۔ اس کے جواب میں جناب کشاف کی تفتیشِ امتی سنے اور جی بھر کر وا دیجئے، فرماتے ہیں کہ اگر یہ معنی ہے تو یہ براہِ عمل سنگین تر صورت میں جناب صدیق اکبرؐ کے مسلک پر پڑتا ہے: کیوں کہ انھوں نے زکوٰۃ نہ دینے والوں کے خلاف جہاد کیا تھا۔

کہتے ہیں کہ عقل کی کوئی نہ کوئی آخری حد ضرور ہوتی ہے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ حیات کی کوئی آخری حد نہیں ہو سکتی۔ اور جناب صدیق اکبرؐ کے اس عمل سے اشترکیت کی مسند لانا اس کی زندہ دلیل ہے۔ فرماتے ہیں کہ وہاں سارا نظام اسلام ہی زکوٰۃ — شکم — پر معنی تھا: زکوٰۃ اور شکم کو مروت بھنا یا تو اس بات کا اُمنہ وار ہے کہ جناب کشاف اقبال کے مسادہٴ شکم کے ٹکڑے کو سمجھے ہیں نہیں، یا امین پتہ ہی نہیں کہ زکوٰۃ

مسئلے کی چیز بنائے ہوئے ہیں۔

لیکن میں چاہتا ہوں کہ لکھنا کا اہلِ لہجہ بھی تو اسی اہلِ کلام کا لکھا ہوا ہے، کسی ہندو کے گھر سے اس کا بھی تو کوئی پرچہ نکال کر بتائیے، ترجمان القرآن کو مہندو محض پڑتے ہی نہیں بلکہ اس کے اقتباسات کے ترجمے بھی اپنی زبان میں شائع کرتے ہیں۔ اگر آپ نے بات چیدوی ہے تو آئیے یہ داستان بھی سننے جائیے کہ یہ کس جذبہ کے ماتحت ہوتا ہے۔ مولانا آزاد نے اپنے ترجمان القرآن میں سارا زور اس بات کے ثابت کرنے میں صرف کر دیا جو کہ نجات و سعادت محض اسلام کے ساتھ ہی دالبتہ نہیں بلکہ ہر ایک مذہب کا پرستار خدا پرست اور نیک عملی کی زندگی سے ایسے ہی نجات حاصل کر سکتا ہے جیسے کوئی دوسرے مذہب والا۔ ترجمان القرآن جلد اول کی اشاعت کے محوڑے عرصے بعد ہمارا تاکہ مذہبی جی نے دہلی کے جامعہ علیہ اسلامیہ کے ہال میں گھوم دیا اور اہل میں فرمایا کہ میں ایک عرصے سے خیال کرتا تھا کہ اسلام نجات کو محض اپنے تاک ہی محدود نہیں رکھتا ہوگا، بلکہ دوسرے مذاہب کے اتباع میں بھی نجات کا قائل ہوگا۔ لیکن مجھے اس خیال کی تائید نہ ملتی تھی اب جو مولانا آزادؒ نے ترجمان القرآن لکھا تو اس سے میرے خیال کی تہذیب تائید ہو گئی۔ چنانچہ ہم نے ان کی اس کتاب کے محزوری حصول کا ترجمہ گجراتی میں بھی شائع کیا ہے، اور اس کہنے کا مطلب یہ تھا کہ مسلمان جب غیر مذاہب میں تبلیغ اسلام کرتا ہے تو اس بنا پر کہنا ہے کہ آؤ ہمیں نجات کا راستہ بتائیں۔ حالانکہ نجات تمام مذاہب میں یکساں ملتی ہے۔ لہذا مسلمان کی تبلیغ محض ایک آؤ ہے۔ ورنہ وہ دراصل اس پہلے اپنی تعداد بڑھانا چاہتا ہے، اور یہ کیسے سیاسی غرض ہے۔

اب سمجھو آپ کو مولانا آزادؒ کے ترجمان القرآن کو کیوں ہندو اپنے محبوب و محترم مسئلے کی چیز بنائے ہوئے ہیں۔ اس سے وہ ثابت یہ کرتے ہیں کہ مسلمان تبلیغ میں مذہب کی آڑ لیتا ہے۔ ورنہ اس کا منقہ محض سیاسی ہے۔ ہندو اگر اپنا تمام زور اس بات میں صرف کر دیں کہ کسی طرح اچھوت اقوام مردم شمار کیے کہ جس طرح ان پانچاں ہندوؤں کے خانے میں گھو ایں تو یہ تمام سچی مذہب اور انشیت کی ہمدردی کہلا میں۔ اور اگر مسلمان دوسروں کو صرف متفقہ کی طرف لانا چاہے تو کیسے سیاسی غرض قرار دی جائے۔ یہ ہیں آپ کی وطنیت و قومیت کے مظاہرے۔

یورپ کی غلامی پر رضامند ہو اتو  
محکوم کو لکھتے تھے کہ یہ لوہے کے نہیں ہر  
وہ محکوم کے اہام کو بھی درست نہیں سمجھتے۔  
محکوم کے اہام سے اندھ جبانے  
غارت گرا قوام ہے وہ صورت چٹانیز  
مٹی کے

ہو اگر قوت فرعون کی در پردہ مریہ

قوم کے حق میں ہے لعنت وہ حکم الہی

اب ظاہر ہے کہ جب علامہ اقبال آزادی کا ایسا کھلا کلام درس  
دے رہے ہیں تو وہ ہندوستان کو کیسے غلام دیکھ سکتے ہیں۔ یہ تو نہیں  
سکتا کہ مسلمان آزاد ہو جائیں اور ہندوستان غلام رہے۔ لیکن یہ تو  
ہوسکتا ہے کہ ہندوستان آزاد ہو جائے اور مسلمان غلام رہے،  
اور جو تیرہ برادران وطن کے ہمارے سامنے ہیں ان سے یہ شبہ یقین  
کی حد تک پیوٹج رہا ہے کہ ہندوستان کی آزادی کا مفہوم یہ ہے کہ مسلمان  
کے آقا کا نام بدل جائے، اور اس جدید غلامی میں اس کی یہ حالت ہو جائے  
کہ اپنے مخصوص تمدن و مذہب کی الگ حیثیت بھی قائم نہ رکھ سکے۔ علامہ  
اقبال یہ نہیں دیکھ سکتے۔ وہ ایسی آزادی کے تخیل کو دام فریب سے نیاؤ  
وقت نہیں دیتے۔ وہ آج بھی برلا کہتے ہیں کہ

ملاؤ جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت

نادان سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

وہ ہندوستان میں صرف سجدے کی آزادی نہیں چاہتے،  
بلکہ اسلام کی آزادی چاہتے ہیں، اور یہ ظاہر ہے کہ اسلام کی آزادی  
اس روش سے تو حاصل نہیں ہوسکتی جس پر آپ کی قومیت پرستی، تحریک  
آزادی کے علمبرداروں کے جواہر سہیل جلی جاہری ہے۔

یہ تو محتاج کثافت کی غلط فہمیوں کا ازالہ، لیکن میں تو اس  
فہم کو بہت مختصر کر دینا چاہتا ہوں۔ میں نے جہاں جہاں اقبال لکھا ہے  
اُس سے سمجھو پیام اقبال ہے، اور میرے نزدیک یہی پیام اسلام ہے!  
تو اب مسلمانہ الزام ہے، یہاں کہ آیا اسلام، یعنی قرآن، موجودہ قومیت  
پرستی اور اشتراکیت کا مؤید ہے یا مخالف! اس کے لئے میں جناب کثافت

کیا ہوتی ہے۔ ورنہ ذکاوت کا مساوات شکم کینا اگر قرآن کا مضحکہ اڑانا نہیں تو  
اور کیا ہے۔ حضور! ذکاوت کا مفہوم یہ ہے کہ شخص کی جائداد اور اموال کو  
اس کی ذاتی ملکیت سمجھائے۔ اور اس ملکیت میں اختلاف مدارج کو جائز  
رکھا جائے اور اس کے بعد ان مالکان جائداد و اموال سے ذرا ذکاوت بطور  
ٹیکس وصول کیا جائے۔ یہ ہے اسلامی نظریہ ذکاوت۔ بھلا فرمائیے کہ اس کو  
روس کی اشتراکیت یعنی مساوات شکم سے کیا تعلق پیلے

اب آئیے آپ کو ایک جھکا اس اقبال کی دکھاؤں جس کے خلاف  
جناب کثافت نے اس قدر زور اٹھا ہے۔ کثافت صاحب ہندوستان  
کی تحریک آزادی کے مداحوں میں سے نظر آتے ہیں۔ لیکن یہ تحریک وہ ہے  
جس کے متعلق ابھی تک یہ فیصلہ نہیں ہو سکا کہ اس کا بالآخر نفع بعین  
کیا ہے۔ آج تک کوئی شخص سواراج کے معنی بھی متعین نہیں کر سکا۔ اس کے  
برعکس اقبال کو دیکھئے کہ کس قدر واضح الفاظ میں غلامی کی لعنت کے خلاف  
جہاد کرتا ہے۔

اقبال سب سے بڑا شکوہ جو خدا سے کرتا ہے وہ یہ ہے، ج

لیکن مجھے یہ کیا اس دیس میں تو نے

جس دیس کے بندے ہیں غلامی پر رضامند

پھر وہ محکوم و آزاد کا فرق کس قدر دشمن لیکن پر زور الفاظ میں بیان کرتے  
ہیں۔

آزادی کی ایک آن ہے محکوم کا ال سال کس درجہ گراں سیر ہیں محکوم کے اوقات  
آزاد کا ہر لحظہ پیام ابدیت محکوم کا ہر لحظہ نئی مرگ مناجات  
آزاد کا اندیشہ حقیقت سے سوار محکوم کا اندیشہ گرفتار خرافات  
وہ ایسے مذہب اور ایسے مدعیان مذہب کو جو مسلمانوں کو غلامی پر رضامند  
بناتے ہیں، دور سے سلام کرتے ہیں، وہ لوگ جو

کرتے ہیں غلاموں کو غلامی پر رضامند

تاویل مسئلوں کو بناتے ہیں بس نہ

دوسری جگہ لکھتے ہیں

ان غلاموں کا یہ مسلک ہے کہ ناقص ہے کتاب

کہ مسکھاتی نہیں قیموں کو غلامی کے طریق

دیکھئے وہ کس حسرت و تاسف سے یہ نگاہ کرتے ہیں کہ

مطابق فیصلے کے لئے تیار نہیں ہیں تو سچہ سچہ نیچے کو آپ کو سنان لکھانے کا کس حد تک حق بنتا ہے؟ دو مفلوک میں بات تم ہو جاوے گی، اور خود پہل جانے کا کہ کوئی راہی؟ اور کوئی فریب میں مبتلا ہے؟ ورنہ اقبال کا نام لے لیا کرتا اسلام کا مضحکہ اڑانا کہاں کا اسلام ہے؟ میں نہیں طوطی کہ وفایت کے حامیوں میں سے کوئی ہے چنانچہ قبول کیا؟  
تو ادعوا شہد اء کر من دون الله ان كنت صا دقین ! اللہ

کو، اور ان کے ساتھ ان کے تمام مسلمان قوم پرست حضرات کو لکھا کھلا پہنچ دیتا ہوں کہ ان میں سے کوئی بھی آگے بڑھے، اور قرآن کریم سے یہ ثابت کر دکھائے کہ یہ دو فلاں تحریریں، یا انہیں سے کوئی ایک، قرآن کریم کے مطابق ہے؛ اور میں ثابت کروں گا کہ یہ دو فلاں تحریریں کس قرآن کریم کے مخالف ہیں؛ اس کا سناں کے لئے قرآن سے بڑھ کر اور کوئی حجت نہیں ہو سکتی اور اگر آپ حضرت قرآن کے

## استدراک منجانب کشف

یہ بھی سمجھ میں نہ آیا کہ "داوین" طرز وطن کے "تیر و سنان" کیونکر بن جائے ہیں؛ البتہ اپنی ہی ریش مبارک کے "تنگوں" کی فٹس کے لئے تو اپنا ہی مہون منت ہونا چاہیئے! — ہاں کثرت کسی ایسے "فن تہذیبی" سے یقیناً آشنا نہیں جس کا کلمہ اولیٰ "تَحْرِیْضُ الْکَلْبِ عَنْ مَوَاضِعِهِ" ہو۔  
منجانب "رازی" اپنے مقالے کی شان استیلا کے متعلق فرماتے ہیں کہ اُس میں موافقت ہے تو اصولی، اور مخالفت ہے تو اصولی! —  
غالب یہ اُسی طایفہ خود مستانی کی آواز ہے کہ "البغض فی اللہ والمحب فی اللہ" — کیوں نہ! ان کا پاکیزان لغوی و لہجاری کے لُغْن کے لئے بھی خدا ہی ذمہ وار ہے؛ مبارک ہو ان بزرگوں کو اپنا "لُغْن" اپنی؟  
(۲) "مبارت ناما کے کلامِ محبت و عقیدت کا طعن مہیو ہے؛ آپ کی "ارض مقدس" اور تربت المقدس" اسی خُصْبِ دینی و وطنی کے "عربی جاتے ہیں ہیں تو کیا ہیں؛ پھر کٹوں کے مینڈکوں کی آپ کے ہاں بھی کمی نہیں؛ انسان احمق کہتے ہیں؛

حال دنیا سے بے خبر ہیں آپ گو تقدس تاب بیشک میں؛  
شیخ جی پر یہ قول صدق ہے — جاہ و مہم کے آپ مینڈک ہیں؛  
اقوام کی عام باریوں کو کسی ایک قوم سے وابستہ کر دینا خود ادا باری ہے؛ — "ایضاً قوم من قوم، بعضی ان لیکن خبر منہم؛  
علامہ اقبال کی ستارہ شامی، افلاک و کائنات کی حدود و تحوّل

پائی، قلب ذرہ کی "سر جری" و غیرہ غیر اگر ہماری زبان نہ کھلوائے جائے تو اچھا ہے؛ — اَلْهَرْتَا اَلْهَرْتَا فِیْ بَیْنِ دَاوُدَ یَحْیٰی مَوْنٌ، وَهُمْ یَتَوَلَّوْنَ مَا لَا یَعْلَمُونَ

منجانب "رازی" کا مستقلاً بالاعتماد کسی قدر تاخیر کے ساتھ مثالی کیا جا رہا ہے۔ اس اشارہ میں بہت سے دوسرے معنائیں تھے جن کا حتمی اندوئے ترتیب و موصل مقدم تھا؛ خود ہم اقبال پر اپنی تنقید کو اپنی ناگزیر مداخلتوں کی وجہ سے جاری نہ کر سکے، اگرچہ ذریعہ بحث افتتاحی خط میں اس کے آئندہ اجزاء کے یہ مسلسل نکالنے کا وعدہ کیا گیا تھا؛ اب جب کہ خود ہم کو بھی اس موضوع کی طرف بازگشت کرنے کی غالب فرصت ملنے والی ہے۔ ہم حضرت "رازی" کے مضمون کو اشاعت کیلئے رہا "release" کر کے اپنے اس مژدہ مذکر سے کا دوبارہ آغاز کرنا چاہتے ہیں؛ ازیر استدراک مضمون کے متن میں جا بجا ترمیم دے گئے ہیں، اور انہی کے حوالے سے ہم "رازی" صاحب کے شکوک کا دفعہ — یا بالقصہ خط فقیر ہی اور کتبچہ کا ازالہ — کرتے ہیں؛

۱) ایک درجہ قابلِ رجحان ہے کہ کثرت کے اعتراضات کا جواب بجز اس کے ممکن نہیں ہے کہ آپ اُس کے نقطہ نظر کو پیچے در پیچہ کر لیں، اور پھر اس متیر شدہ خیال کو بدھت مضحکہ بنائیں؛ ہم نے کہیں نہ اقبال کے شاہنشاہِ تمکین "اسی کوئی سب سے پرک" "اڑائی ہے ذرا" کے "بال جبریل" کی کسی "کائنات پائی" کی شکایت کی ہے؛ ہماری عرض و معروض تو صرف اتنی تھی کہ؛

تیرے لب پر ہے حدیث تمام و معروضہ و معین

لیکن اپنے ہی دہن کے نام سے واقف نہیں؛

کون کہتا ہے زمین و آسمان تیرا نہیں سب چہاں تیرا گوہر ہوتا تیرا نہیں؛











## ہندوستانی قومیت

نعمان شغل بھوپالی

بلکہ اس مسئلہ کا حل تلاش کرنے سے قبل ایک اور سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ قوم کس طرح بنتی ہے؟ اور قومیت کیا ہے؟ لہذا ضرورت اس امر کی ہے کہ فقیر طریقہ پر پہلے اس کو سمجھ لیا جائے۔

### اجزائے قومیت

بعض علماء سیاست کا خیال ہے کہ، قیام قومیت کے لئے چند اجزاء ضروری ہیں، مثلاً وحدت زبان۔ وحدت نسل، اور وحدت مذہب وغیرہ، لیکن دنیا کی موجودہ تاریخ قومیت کا جواب اس کے برعکس ہے، یعنی ان تمام باتوں میں سے کوئی ایک بھی ایسی نہیں ہے جو تعزیر قومیت کے لئے لازمی اور اساسی کہی جاسکے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ اور اسی قسم کے تمام امور کسی گروہ یا ملک کے لئے قیام قومیت میں زیادہ سے زیادہ معاون ہو جائیں۔ لیکن حقیقت و اہمیت سے ان کو کوئی تعلق نہیں۔

کیا تمدن دنیا میں کوئی ایک جگہ بھی ایسی ہے جہاں صرف ایک نسل کے لوگ آباد ہوں؟ ان کی زبان ایک ہو؟ اور مذہب وغیرہ بھی ایک ہی رکھتے ہوں؟ اور کیا ایسے ہی مختلف اجزاء کے ساتھ قریب قریب تمام ممالک قوم "نہیں بن چکے ہیں؟ اگر کہیں زبان ایک ہے تو مذہب میں اختلاف ہے، کہیں مذہب ایک ہے تو زبانیں ایک سے زیادہ ہیں اور کسی جگہ یہ دونوں باتیں ہیں تو نسل ایک نہیں ہے۔

اقوام عالم کے زوال و عروج کی تاریخ ہم کو بتاتی ہے کہ ارتقاء سیاسی نام ہے اتحاد قومی کا، یعنی جب ملک عوام کی فرسودہ ذہنیوں کو بدل کر ان میں سیاسی شعور نہ پیدا کیا جائے، قومیت کی روح بھونک کر ان کے سینوں کو نہ گرمایا جائے، انقلاب کے دروازے کھٹکھٹائے نہیں جاتے، اور نہ غلامی کی زنجیریں ٹوٹ سکتی ہیں۔

جب آزاد کی راہ میں ہندوستان کی مجلس قومی (کانگریس) کی لازوال قربانیاں اور عوام سے براہ راست رابطہ اتحاد پیدا کرنے کی ان تنگ کوششیں اس وقت عوام کے جمود و غفلت کو دور کر کے ملک میں بیداری کی فضا، ہموار کر چکی ہیں، لیکن فرقہ پرستی ہندوستانی قومیت کی راہ کا بھاری پتھر بنی ہوئی ہے۔ ہندوستان کا موجودہ دور صرف عوام کے سیاسی شعور کی بیداری کا دور ہے، جس میں اطمینان بخش مرکزیت نہیں پائی جاتی۔ لیکن مستقبل اپنے آغاز میں ایک ایسے ذہن جھد کی پرورش کر رہا ہے، جو قومیت کا عنوان پائے گا۔ کیونکہ موسم کی تبدیلی بتا رہی ہے کہ افراط و تفریط کی یہ بدلیاں بھی بہت جلد چھٹ جائے والی ہیں، اور قومی اتحاد و یکجہائی کے آفتاب کی منیا پاش کر میں نوادر ہو کر آزادی کے خوش انجام انقلاب کا دامن جھٹکا دینے والی ہیں۔

اس صحبت میں ہم کو دیکھنا یہ ہے کہ وہ کون سے عوامل ہیں جو ہندوستانی قومیت کی تعمیر میں مائل ہو رہے ہیں، لیکن یہ بحث یہاں سے شروع نہیں ہوتی

ہوتے ہوئے بھی قومیت کا رشتہ رب سے زیادہ مقدس رشتہ سمجھا جانے لگتا ہے، اور یہی چیز آگے مل کر ان کی سیاسی، تمدنی، اقتصادی و معاشرتی ترقیوں کے لئے سنگ میل بنی جاتی ہے۔

## جرمنی اور امریکہ کی قومیتیں

انیسویں صدی عیسوی سے پہلے جرمن قوم کیا تھی؟ تمام ملک چھوٹی چھوٹی متعدد ریاستوں میں تقسیم تھا، جن میں کوئی وحدت قومی نہیں پائی جاتی تھی، اور ان میں جن جنگ بھی رہتی تھی، ان ریاستوں میں سب سے زیادہ طاقتور ریاست پریشیا تھی، جرمن قوم کی ترقی کا مؤسس اولیہ پرنس ہسارک اس انتشار کو اجتماع میں بدل دینے کا سب سے زیادہ اذہ تھا۔ ان مختلف گروہوں کو ایک مرکز پر لانے کا خواب ایک مدت سے دیکھ رہا تھا، اس کی دو برین نظروں کے سامنے آہنے والی طاقت و تباہی پوری عریانیوں کے ساتھ کھڑی تھی، اور وہ جانتا تھا کہ ملک کا یہ انتشار و داخلی نزاع جرمنی کو کمزور کر کے کسی دوسری طاقتور قوم کو ان پر مسلط کر دے گا، اس لئے وہ چاہتا کہ یہ مختلف گزایاں کسی تیزبینی میں تپ کر ایک مضبوط زنجیر بن جائیں، اور اس کے نزدیک جرمنی کے اس داخلی اتحاد و تنظیم کی صحیح تعبیر جنگ تھی، چنانچہ اس نے مختلف طریقوں سے فرائض کو بھرنا کر جنگ کے امکانات پیدا کر لئے اور سنہ ۱۸۷۱ء میں پوری جرمن قوم کے لئے جنگ کا مشترک خطرہ سامنے آگیا، جس کے دھبے کے لئے پورا ملک ایک مشترک خیال و وحدت متعدد کے زیر اثر تنظیم کی ایک صف میں آگیا، جرمنی کے نظام اجتماعی و ارتقا، مدنی میں آج جو اتحاد قومیت نظر آ رہا ہے وہ نتیجہ ہے اسی تنظیم کی جنگ کا جو عرف و ادب سیاسی ہسارک کی پیدا کردہ تھی، امریکہ نے جب تک اپنی قومیت کا جھنڈا بلند نہیں کیا کسی طرح برطانوی غلامی سے نجات نہیں پائی، لیکن جب اس نے قومیت کا ہتھیار سمجھ لایا تو غلامی کی تمام گزایاں ایک ایک کر کے کاٹ کر رکھ دیں۔

## تعمیر قومیت کی دو بنیادیں

ضمنی قومیت، دفاع و حفاظت کا دوسرا نام ہے، جو اکثر و محو

تصدد و تپ و غیرہ میں مختلف مذاہب کے پیرو مل کر اپنی قومیت بن چکے ہیں، انگلستان اور امریکہ میں زبان انگریزی استعمال کی جاتی ہے، حالانکہ دونوں الگ الگ دو قومیں ہیں، اور نسل و مذہب کے مختلف اجزاء سے مرکب ہیں۔ پھر سوئیٹزر لینڈ میں جرمن، فرنگ اور سوس تین زبانیں بولی جاتی ہیں، اور نسل بھی ایک نہیں ہے، لیکن کیا اس بنا پر کوئی کہہ سکتا ہے کہ سوئیٹزر لینڈ کے باشندے ایک قوم نہیں ہیں؟ اسی طرح یوگوسلاویا، کناڈا اور مشرقی یورپ وغیرہ میں متحد و مجید اختلاف نسل و مذہب پایا جاتا ہے۔ جدید ترکی قومیت کی زبان ایک ہے، اور مذہب و نسل ایک سے زیادہ ہیں، مگر کیا یہ اختلافات ان کی قومیت کا راستہ روکے ہوئے ہیں؟ معلوم ہوا کہ یہ تمام امور جزوی اور فزوی ہیں، اور حقیقت و اصلیت ان کے علاوہ کچھ اور ہی ہے۔

## اصلیت و حقیقت

پہرہ اصلیت کیا ہے جس کے ایسے کسی ملک کا کوئی گروہ قوم نہیں بن سکتا؟ وہ اہم اور بنیادی اصلیت اتحاد خیال اور اشتراک مقصد ہے۔ جس کو واضح الفاظ میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ کسی ملک کے لوگوں کا ایک دوسرے کو ہم قوم سمجھنا اور سیاسی مقاصد میں ایک ہو جانا ہی قوم بنانا ہے، خواہ وہ مذہب، زبان اور نسل وغیرہ میں ایک دوسرے سے مختلف ہی کیوں ہوں؟

یہ وحدت قومی زیادہ تر اس وقت اُبھرتی ہے جب ملک کے تمام باشندوں کے لئے خطرہ مشترک ہو، کیونکہ یہ اصول ہے کہ جب سیلاب آتا ہے یا کوئی اور بلاتنازل ہوتی ہے تو کھل کے تمام جانور اس کے دھبے اور اپنی چاہ کے لئے تمام دزدگی و ہیبت کو بھول کر ایک ہو جاتے ہیں، اسی طرح جب کسی ملک کے لئے خطرہ مشترک ہو تو اس کے دفاع کی خاطر تمام داخلی نزاعات ختم ہو جاتے ہیں، ملک کا انتشار و اختلاف ٹٹ کر ایک مرکز پر آ جاتا ہے۔ سیاسی مفاد و قومی نصب العین میں اشتراک و اتحاد پیدا کیے جاتا ہے، اور کل افراد اپنے کو قوم کا ایک فرد سمجھنے لگ جاتے ہیں، پھر ایک مرتبہ وحدت قومی کے نشے سے سرشار ہو کر کسی قیمت پر اس مضبوطی کو توڑنا گوارا نہیں کرتے، زبان و مذہب وغیرہ میں اختلاف

مشکلات گھر کو خرفزدہ ہو جاتی ہے "وطنیت" "قومیت" "داخلی اتحاد" "قومی اتفاق" یہ تمام الفاظ محکوم خرفزدہ پرستوں کو سفید کاغذ پر چبے ہوئے بہت اچھے معلوم ہوتے ہیں، لیکن ان کی دینا سے عمل میں ان الفاظ کی کوئی قیمت نہیں رہتی، گویا قومیت کا رنگ الگ کے نزدیک ایک قسم کی روحانی شاعری ہوتا ہے جس سے مرث لغزینہ طبع اور گرگزی محفل کا کام لیا جاسکتا ہے، پھر ان خود غرض سیاسی رہنماؤں، ریاکار اخلاقی مصلحوں اور جاہل مذہبی سندنشینوں کی اس شوم نفسی اور اخلاقی موت پر تو ماتم کی بھی کوئی گنتی نش نہیں رہتی جبکہ وہ تشکیلی قومیت کو "اصول انسانیت" "قواعد اخلاق" اور "تعلیم مذہب" کے بھی خلاف تیار کر اس پر بحث و عمل کو "انسانی" اور "اخلاقی" اور "مذہبی جرم" قرار دیتے ہیں۔

ہندوستان بھی برطانوی اقتدار کے زیر اثر، "افترقی" و "افتراق" کے ایسے ہی دوسرے گزر رہا ہے، مجلس قومی کی سعی قیام قومیت کو، غلامانہ ذہنیت ہندوستانی حالات کے منافی خیال کرتی ہے، کیونکہ اس سرزمین پر آریں منگول، افغان، عرب وغیرہ مختلف نسل کے لوگ آباد ہیں، مختلف معاشرتی ہیں، ہندو مذہب میں اور آروہ، ہندی، گجراتی، پنجابی، سندھی، پنجابی وغیرہ لا تعداد زبانیں بولی جاتی ہیں، حالانکہ اس اور ہندو جکاہوں کو دنیا کے انداز میں سے کوئی ایک چیز کسی حیثیت سے بھی، تعمیر قومیت میں حاصل نہیں ہوتی، اس موقع پر یہ بات بھی سمجھنے کے قابل ہے کہ روس بھی مذہب و معاشرت اور زبان و نسل کی برقوقی کے لحاظ سے ہندوستان ہی کا نمونہ ہے، کیونکہ وہاں اسلام، عیسویت، بدھ مت وغیرہ مذاہب ہیں، منگولین، چینی، عربی، روسی وغیرہ نسل آباد ہیں، اورغوی، روسی، فارسی، ترکی، چچی وغیرہ زبانیں بولی جاتی ہیں، جب یہ تمام اختلافات روس میں قومیت کے اجراء ہو سکے ہیں تو ہندوستان میں اجراء قومیت کیوں نہیں ہو سکتی؟

### مذہبی تعصب

پھر وہ کونسی رکاوٹ ہے جو ہندی قومیت کو ابھرنے سے روکتی ہے؟ ادنیٰ تدبیر سے یہ بات سمجھ میں آسکتی ہے کہ وہ سب سے بڑی رکاوٹ ہندوستان کا مذہبی تعصب ہے، اس نفس مذہب پر حملہ نہیں کر رہا ہو بلکہ میری مراد مذہبی تعصب و تنگ نظری سے ہے، یہاں کے باشندوں

میں وجود میں آتی ہے، یا تو خطرہ جنگ کے دفعہ کے لئے اور یا اجنبی مکرانوں کے چبڑا، استبداد سے رہائی پانے کے لئے، جس کی بہترین مثال جرمنی، امریکہ، فرانس، اٹلی اور پولینڈ وغیرہ ہیں، بغیر قوم بنائے کسی ملک نے نہ تو ترقی کی ہے اور نہ غلامی سے نجات پائی ہے، اور تعلیق قومیت کے لئے دیکھی طرح کی فلسفیانہ سوچ گمان کی ضرورت ہے، نہ قومیت کی نفسیاتی تشکیل کی، بلکہ غلامی کی ذلت اور سستی کے ادبار کا احساس ہی تعمیر قومیت کا بنیاد بن جاتا ہے۔

### ہندوستانی غلامیت اور قومیت

ہندوستان غلام ہے اور جب کسی ملک کی غلامی پر ایک طویل مدت گزر جاتی ہے تو لوگوں کے دلوں سے احساس قومیت فنا ہو جاتا ہے۔ اور علمبردارانِ حرب کے لئے احساس قومی کی بیداری میں سخت مشکلات ہو جاتی ہیں، کیونکہ ملک کے باشندے خرفزدہ پرستی کی لغت میں مبتلا ہو کر چبڑا استبداد کی گہرائی کو زیادہ سے زیادہ طاقتور بنا رہتے ہیں، بالواسطہ معاشرت کے خورگ ہو جاتے ہیں۔

۱۰۔ اپنی اقتدار اپنے مقبوضات کے لئے سب کچھ گوارا کر سکتا ہے، لیکن اس کو کسی عنوان برداشت نہیں کر سکتا، غلاموں میں قومیت کے عناصر تشکیل پائیں، چنانچہ مختلف طریقوں سے ملک کے داخلی اتحاد پر کاری ضربیں لگائی جاتی ہیں، جس سے خرفزدہ افادات کے شعلے بھڑک اٹھتے ہیں، اور قومیت، جو ملک کے لئے بہتر لڑیٹھ کی ہڈی کے ہے، ہر جگہ سر ہٹی رہ جاتی ہے۔ اپنی اقتدار کے زہر سے غلاموں کی ذہنیت اس درجہ سمسوم ہو جاتی ہے کہ وہ خرفزدہ پرستی کو بھی اپنی لغات حیات کا حصہ سمجھنے لگتے ہیں، اپنے سیاسی، معاشرتی، اقتصادی، مذہبی اور تمدنی غرض تمام مسائل و محلات کا تصفیہ خرفزدہ انداز اصول پر کرنے لگتے ہیں، اور ملک و قوم کی یہی تخریب، قوائے استبداد کی تعمیر بن جاتی ہے۔

غلام ذہنیت اتحاد قومی کے مفاد سے تو مکر نہیں ہوتی، لیکن اپنے لئے یہی چیز اس کو سب سے زیادہ ناممکن نظر آتی ہے، اس کو جب بھولا ہوا ابنِ باد دلا یا جائے تو وہ خود بخود اپنے لئے لعینارتیں

## اسلامیائے ہند اور وقت کی ضرورت

سب سے زیادہ حیرت و تعجب تو اسلامیائے ہند پر ہے جن کے مذہب نے نہ صرف اہل وطن سے حسن سلوک اور حب وطن کی بار بار تاکید کی ہے بلکہ انسانیت اور وطنیت کا وہ بلند ترین نصب العین پیش کیا ہے جو دنیا کے تمام مذاہب و اقوام کے لئے تعلید و عمل کا نمونہ ہے۔ ایک سچے مسلمان کے لئے جنسیت انسان ہونے کے تمام کرہ ارضی وطن ہے اور دنیا کے تمام باشندے اُس کے اہل وطن، لیکن انسانیت و اخلاق کا یہی سب سے بڑا علمبردار جب سرزمین ہند پر نمودار ہوتا ہے تو ہونا نماز و روزہ کے امتداد میں حب وطن اور مین الا قوامی اخلاق کے تمام مذہبی اصول فراموش کر دیتا ہے، جو مذہب کے غایت اصلی اور ایمان کی بنیادیں ہیں۔ انھوں نے ہندی مسلمان نے چند رسوم کے ادا کرنے کے بعد مسلمان ہونا تو چاہا لیکن انسان ہونا نہیں چاہا۔ حالانکہ اس کو معلوم ہونا چاہیے کہ "اسلامیت" نہ انسانیت و دو خداگانہ چیزیں نہیں ہیں، اسلام دنیا کو چند رسوم کا پابند بنانے کے لئے نہیں آیا، بلکہ انسان بنادینے کے لئے آیا تھا۔

مذہبی تنگ نظری و معصیت نے ہر جگہ قومیت کی راہ میں روٹے اٹکائے ہیں، ترکی جب تک تنگ نظریاؤں اور جاہل صوفیوں کے ہاتھ میں کھینٹا رہا اس کی قومیت کے رستے بڑھتے گئے، ہر اصلاح و تجدید کے خلاف بغاوت کی جاتی رہی۔ ہندی قومیت بھی فی الحال اسی جاہل و معصیت کا شکار ہو رہی ہے اور ترکی کی طرح ہندوستان کو بھی اب خود ساختہ و جاہل مذہبی رہنماؤں کے اقتدار کو جلد از جلد ختم کر دینے کے لئے ایک مصلحتی کمال کی ضرورت ہے تاکہ مذہبی تعصب و تنگ نظری کی اس چٹان کو کاری ضربوں سے پاش پاش کر کے قومیت کو اُجھرنے کا موقعہ دیا جائے۔ جس کے بعد انقلاب اور آزادی کی منزل کچھ دیر یا دور نہیں رہ جاتی۔

## اطلاع

چونکہ رب العالمین ہرگز بڑی جینے کی سچی تاریخ کو شائع نہ ہوتا ہے، اس لئے ہرچہ مذہب کو اپنے اطلاع، اتاریکے تک پھیل جاتی جائے ورنہ بعد میں تفسیل نہیں کی جا سکتی۔ منبر

پر غلط طریقے پر مذہبی رنگ بیت چھایا ہوا ہے اور مسیحا کہ یہاں کے بعض قوم پرست علماء سیاست کا خیال ہے، اس کی وجہ مرث یہ ہے کہ ہندوئی عوام کی ذہنی تربیت اب تک بجائے قومی اور سیاسی بنیادوں کے ہر حق کے متعصب و تنگ نظر مذہبی پیشواؤں کے زیر اثر ہوتی رہی ہے، اور وہ ہر چیز کو اسی عینک کے وعدے و شیشوں کی مدد سے دیکھنے کے عادی ہو گئے ہیں، خلافت اور سنگٹن، تبلیغ اور سدھی، گائے اور بگا، مسجد و مندر، اذان و ناقوس، اس قسم کی سحر کیس خالص مذہبی ہونے کے باعث عوام کے تعصب و جوش مذہبی، کو جس قدر جلد پر انگیزہ کرتی ہیں اس جوش و کوشش کا عظیم شہر قومی سحر کیوں میں نظر نہیں آتا۔ "اسلامیت" نہ بدویت، "اسلم" کچھ "ہند و ہندیہ" اور زبان، "ہندی زبان" یہ اور اسی قسم کے تمام مسائل جو اس وقت ہندوستان میں قیام قومیت کے اہم عوامل سمجھے جا رہے ہیں، و حقیقت باطل فراموش ہیں، اور اصل محرک صرف مذہبی تعصب ہے جس کے زیر اثر یہ تمام سوالات پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ زبان کا مسئلہ جو اس وقت سب سے اہم بنا ہوا ہے اور جس سے ہندوستانی قومیت پر کاری ضرب لگ رہی ہے، یہ بھی بے اساسی لے سکتا ہے، اگر مذہبی معصیت کا پردہ چاک کر دیا جائے۔ جاہ پسند و فرقہ پرست لیڈروں اور تنگ نظر و متعصب مذہبی پیشواؤں نے اپنے اقتدار کے تحفظ کی خاطر عوام کو مختلف مصلحتوں میں تقسیم کر کے ہر گروہ کو دوسرے سے بے گناہی نہیں بنایا، بلکہ بیگانگی کے علاوہ مذہب کے نام پر ان کے مابین نفرت و عداوت کی طبع بھی حاصل کر دی ہے، حالانکہ تعصب و تنگ نظری اور نفرت و عداوت کو روج مذہب سے کوئی واسطہ نہیں، اور کوئی مذہب بجز وسیع القلبی، خدمت خلق، اور تہذیب نفس کے، وحشت و پسمیت، و درندگی و خونخواری کی تعلیم نہیں دیتا۔

جب مختلف مذہبی فرقوں کا سیاسی، اقتصادی، معاشرتی، ہر طرح کا مفاد ایک ہی سرزمین سے وابستہ ہے تو ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ مذہبی واداری کے علاوہ ان میں قومی اور وطنی ارتباط کے رشتے کو بھی بہت زیادہ اہمیت و استواری حاصل ہوتی، لیکن و احسنا کہ یہاں مذہبی رواداری ہے، نہ قومی اور وطنی ارتباط کا علاوہ۔

# آج کچھ کھایا نہیں

شام آئی، واں کھٹے باب حرم درہائے دیر  
تازگی سے رُوح کی کلفت بدلنے کے لئے  
جانفراہ رسات، بادِ سرد اٹھلائی ہوئی  
آسمان نیلگوں پر کالی کالی بدلیاں  
نجششِ موسم سے تھی نناک بادِ برنگال  
گلِ خانِ سیمبر تھے موڑوں میں یوں رواں  
اہلِ ذرستہ فیتی بدبو میں لیسے ہوئے  
ہوٹکوں میں ہر طرف اک شورِ ناولش تھا  
الغرض ہر شے میں تھی اک لکشی اک زندگی  
سچی زمیں سے آسمان تک تازگی ہی تازگی

ناگیاں اک ناواں مزدور آیا سامنے  
گلجے کپڑے شکستہ ولولے، چہرہ اداس  
دست و پاشل، چشم و ابرو ضعف میں ڈوبے ہوئے  
دفتا کا نیا، رُکا، بھٹرا، بھٹرا گر پڑا  
سر میں چوٹ آئی، لہو زنجھوں سے جاری ہو گیا  
یہ تاشا دیکھنے دو چار بے فکرے بڑے  
کوئی یہ کہنے لگا یہ ہے شرابی کی سزا  
کوئی کہتا تھا کہ شاید یہ ہے مرگی کا اثر  
چند کھون تک وہ بیہوشی کے عالم میں رہا  
”یہ ہوا کیا؟“ ایک نے پوچھا جو بیٹھا تھا قریں  
وہ نقاہت سے یہ بولا ”آج کچھ کھایا نہیں“

# گستاخ شیطان

وجہ امت علی سندیلوی بی اے

آدمی ہوں، آپ دعا کریں۔

مولوی صاحب۔ انشاء اللہ۔

مستفد۔ حضور اب تو فاتے کرتے کرتے جان پر بن آئی ہے، اب

آپ بھی کچھ زور لگا دیں۔

مولوی صاحب۔ (ہاتھ اٹھا کر) رازق تم پر اپنے رزق کے دروازے

کھول دے۔

مستفد۔ حضور میں نے خود خدا سے بچر دعا مانگی، بہت نذر و نیاز

کی، لیکن کچھ بھی نہ ہوا۔

مولوی صاحب۔ واسطے کی ضرورت ہے۔ اُس مہو و حقیق کی بارگاہ

عالی تک ہر کہ دمہ کی سٹوڑی ہی رسائی ہے (بارگاہ کی عظمت و جلالت

کے خیال سے مولوی صاحب کو ایک جھرجھری معلوم ہوئی) جل جلالہ !

مستفد۔ میں نے سجا کہ شاید خدا صرف امیروں کی دعا سنتا ہے

جو بلاؤں و دروسے پر نذر و نیاز دلائیں۔ جو اپنی دعاؤں کی قبولیت کے لئے

بزرگوں کے وسیلے حاصل کر سکیں۔

مولوی صاحب۔ (تیز ہو کر) خاموش، یہ کیا کفر کہتے ہو۔ خدا تو

ہر ایک کے لئے ہے، خواہ وہ امیر ہو یا غریب۔

مستفد۔ پھر وہ غریبوں کی سنتا کیوں نہیں؟

مولوی صاحب۔ دیکھو وائزۃ ایمان سے خارج ہوئے جا رہے

ہو۔ اُس کی شہیت میں چون و چرا کی گنجائش نہیں۔ اُس نے ہر ایک کی جدا جدا

صبح کا سہانا وقت تھا، رات کی گرمی سے دیر تک جاگی ہوئی، دنیا

ابھی خاموش تھی اور سورج کی پہلی کرنیں شرماقتی بجاتی ہر بندگی کی پیشانی

چوم رہی تھیں۔ نماز اور تلاوت سے فارغ ہو کر مولوی ابن القدوس صاحب

اپنے مکان کے کٹا وہ صحن میں ایک قالین پوش چکی پر گاہ دیکھ کا سہارا

لئے کھٹے کھٹے میٹھے میٹھے کش کھینچ رہے تھے، اپنے مہربان بارگاہ میں حاضر

ہونے کے بعد وہ ایک عجب سکون و کیف سے سرشار تھے، اس وقت

دنیا کی ہر فکر سے بے نیاز وہ اپنے سینے میں کچھ ایسی نمٹنڈک محسوس کر رہے

تھے کہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس میں دل کے عوصن ایک ہرٹ کا ڈھیلا

دھڑک رہا ہے، کھٹے کھٹے میٹھے خوشگوار کش مولوی صاحب کی انگلیں

بند کئے دیتے اور وہ کچھ ایسا لطیف محسوس کرتے گویا جنت میں حوریں اُن

کے ہاتھ پیر اور سر دبا رہی ہیں۔

آہٹ ہوئی۔ مولوی صاحب نے سر جڑاٹھا یا تو ایک بڑھانہ

ڈال دیا اور لامعتہ جس کے مصوم چہرے سے شوق و خضوع کی شامیں

نکل رہی تھیں، نہایت مودبانہ ایک روپیہ بندر لے ہوئے کھڑا تھا۔

”اس کی کیا ضرورت ہے“ کہہ کر مولوی صاحب نے ازارا

غز باہر وری نذر قبول کر لی۔ اور روپے کو تکیے کے نیچے رکھ لیا۔ مستفد نے

مولوی صاحب کے ہاتھ پیر جوئے اور اُن کے پاس ہی زمین پر بھیج لیا۔

مولوی صاحب، گیوں کیسے آئے کیا کام ہے ہمارا۔

مستفد۔ حضور میں بہت ہی گنہگار ہوں، اور بہت ہی غریب

تقدیر بنائی ہے، اور اُسے ہر ایک کا جدا جدا امتحان مقصود ہے۔  
 معتقد۔ تو پھر جو کچھ تقدیر میں ہے وہ ہٹ نہیں سکتا۔  
 مولوی صاحب۔ (جو شیعہ عقیدت سے اپنی داڑھی پکڑ کر کہیں کھینچ نہیں  
 معتقد۔ تو پھر آپ لوگ دعائیں کیوں مانگتے ہیں۔  
 مولوی صاحب۔ (خفا ہو کر تم جاہل ہو اسے سمجھ نہیں سکتے؟  
 معتقد۔ انسان وہی کرتا ہے جو اس کی تقدیر میں لکھا ہوتا ہے؟  
 مولوی صاحب۔ بیشک خدا تعالیٰ کی مرضی کے بغیر ایک پتہ تک ہل  
 نہیں سکتا۔  
 معتقد۔ تو پھر یہ ہمارے گنہ پہنے ہی سے ہماری قسمت میں لکھے  
 ہوتے ہیں۔  
 مولوی صاحب۔ بیشک  
 معتقد۔ اور کچھ ہماری قسمت میں لکھا ہوا ہے اگر وہ ہم نہ  
 کرتے تو ہم خدا کی حکم عدولی کرتے۔  
 مولوی صاحب۔ حکم عدولی کے کیا معنی۔ خدا کے حکم بغیر ہم کچھ کہہ  
 نہیں سکتے۔  
 معتقد۔ پھر ہمارے گناہوں کی سزا کس کو ملے گی؟  
 مولوی صاحب۔ تم کو اور کس کو؟  
 معتقد۔ میں نے تو جتنے گناہ کئے ہمیشہ مجبور و ناچار ہو کر کئے۔  
 مولوی صاحب۔ (خفا ہو کر) چپ رہو تم۔ بڑے اے وہاں  
 مجبور و ناچار ہو کر گناہ کئے والے۔

معتقد۔ غریب کا مذہب تو روٹی ہے، آپ کے قاتلان میں  
 چوری ناجائز اور بھوکے کے قاتلان میں چوری جائز ہے، آپ کے قاتلان  
 میں مبر و لشکارہ اور بھوکے کے قاتلان میں جھین بھینچتے۔  
 مولوی صاحب۔ مذہب سب کے لئے ایک ہے۔  
 معتقد۔ اور یہی اس کی کمزوری ہے۔  
 مولوی صاحب۔ (خفا ہو کر) دور ہو تم شیطان۔ بھانے چلے ہو بھوکہ،  
 تدبر و تفکر شیطانی شے ہیں، جن سے مذہب کی طرف سے شک و شبہات  
 پیدا ہوتے ہیں۔ درغلائیے ہیں!  
 معتقد۔ (طنز سے) جی نہیں آپ تقلید و تعصب سے اپنی مذہبی  
 بنیادیں مضبوط کرتے رہئے!  
 معتقد نے بڑے خطرناک طریقے سے مولوی صاحب کی ڈاڑھی  
 کو گھورا۔ مولوی صاحب کچھ سمجھ گئے اور ذرا ہنسی اٹھائی۔ آنکھ کھل گئی۔ اس  
 صحن میں دھوپ پھیلی ہوئی تھی، حد بل چکا تھا۔ مولوی صاحب آنکھ مٹتے  
 ہوئے آنکھ کھڑے ہوئے۔  
 "کجوت شیطان درغلانے چلا تھا ہیں، خدا کا شکر ہے کہ میں اپنے  
 باپ دادا کے مذہب پر قائم رہا ہوں"  
 مولوی صاحب نے احتیاطی ٹیکہ اٹھا کر دیکھا کہ شاید تذر کار دوسرے  
 اُس کے نیچے ہوا لیکن وہ گستاخ شیطان اپنے ساتھ ہی لیتا چوکیا تھا۔  
 دیکھی نہ آپ نے بے ایمانی!!

معتقد۔ پھر آخر کیلئے فاقے کرتے کرتے مر جائیں، مذہب روٹی دگا۔  
 مولوی صاحب۔ روٹی خدا دیتا ہے، ممبر کو نہ شکر کرو۔ ہر حال  
 میں اس کے سامنے رستہ ختم نہ رکھو۔ ہر بات میں اس کی نصیحت پر قائل رہو۔  
 معتقد۔ (ٹھٹھکے میں) مہرے کو سب ہی مارتے ہیں۔ مذہب غریبوں  
 کو یہی سکھاتا ہے کہ ممبر کو نہ شکر کرو۔ مذہب امیروں کو کیا سکھاتا ہے؟  
 مولوی صاحب۔ یہی کہ ممبر کو نہ شکر کرو۔ غریبوں سے ہمدردی کرو۔  
 معتقد۔ تو بس مذہب امیروں کے لئے ہے، جو ممبر کو نہ شکر کریں۔  
 مولوی صاحب۔ لعنت اللہ، کیا کہنے ہو تم۔ مذہب تمام خلق اللہ  
 کے لئے ہے۔

فصل  
 بنیادیں کا سلسلہ ہے، اور سب کے اپنے اپنے  
 پڑی ہیں اس طرح بننے پر کڑی نگاہ  
 وقت گزرتا ہے جس میں کتاب غم کھٹے ہوئے  
 آوازوں سے چننے کی آواز جا بجا فغاں  
 (چلش)

# طوائف سے خطاب

اے طوائف! اے حسین رازِ علم رنگ و بو  
ہیں گنہگارِ لذتیں تیرے لب سے نوش میں  
تو کہ ہے، تاریک و صعبہ دامنِ آفاق پر  
معصیت کے دلوے پہناں اداؤں میں تری  
لے حجابانہ بھی تو جلوہ گر ہے بام پر  
اد بھی تاریک خلوت میں نظر افروز ہے

کس قدر پیارا ہے اپنی نساہت سے تو  
سیکڑوں فتنے مچلتے ہیں تری آغوش میں  
برق بن کر کوندتی ہے خرمنِ اخلاق پر  
بیوفائی کی جفاکاری و فداؤں میں تری  
برق ہنس ہنس کر گراتی ہے دلِ ناکام پر  
جس جگہ ہے تو غرض اک برقِ عالم سوز ہے

دل کو دامِ گیسوئے پچاں میں کس لیتی ہے تو  
یہ تری نازِ آخری تہ کی تہ ہے  
قابلِ لعنت ہے تیرا غم بھی تیرا عیش بھی  
شاہکار، ادیس کی صنعت کا تیری ہست و بود  
اوجہم کی حیس دیو سی نظر پر درِ چٹیل  
راج ہے ظلم و سنگاری کا تیرے دس میں

بے وفاناگن گلے مل مل کے ڈس لیتی ہے تو  
شامِ جس کی شامِ غم ہے، تو وہ صبحِ عید ہے  
نوش میں اپنے چھپا رکھے ہیں تو نے فتنے بھی  
عالمِ انساہت کو ننگ ہے تیرا وجود  
نوجوانی سیکڑوں کی مٹ گئی تیرے طفیل  
موت کی رہبر ہے گویا زندگی کے کہیں میں

منہ جتی ہے تو سرِ بازار اپنی زندگی  
زلفِ مشکیں کی سیاہی، عارضِ زیبا کا نور  
آنکھ کی مستی، شرہ کی تیغ، ابرو کی کساں  
ہمکناری کی فنا، خود نمائی کی ترنگ  
منہ جتی ہے اپنا جو بن، منہ جتی ہے اپنا راز  
مذہبِ انساہت کی عصمت و پاکیزگی

زندگی، یعنی شباب و شوق کی تابندگی  
قد کی رعنائی لبوں کا رس و محبت کا سورد  
جسمِ نازک کی بچک، کیفِ آفریں انگارائیں  
کستی کی شوخیاں، اُمتی جاتی کی اُمتنگ  
اپنی فطرت کی بلندی، اپنے دل کا سوز و ساز  
اور نساہت کا جو ہر روح کی دوشیزگی

تیری فطرت خود ہی تجھ سے برسرِ پیکار ہے  
رحمِ گر اپنی طبیعت پر کہ وہ بیزار ہے

# زقار وقت

ادارۂ کلیم

## کانگریس اور لیگ

نیشنل کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان بہتر تعلقات کی کالی کی پوراک  
سلسلہ منبانی ہوئی ہے، حسب معمول ساتی، اس مرتبہ بھی پیام صبح کے ابلاغ کا  
سہرا بنڈت جو اہر لال نہرو ہی کے سر ہے: نزاع پسند و جدل شیوہ مسٹر جناح  
کو یہ فتح، اور عالی ظرف و عاشقی طلب بہرہ کو یہ شکست، مبارک ہو! اج  
بیانک ماسپر انداختیم گر جنگ سرت!

جو اہر لال، ماشاء اللہ رزم کا جری قلب مریدان ہے، اور نرم  
کی دل گد اختہ شمع محفل! اسے  
مٹانہ زندگی میں سیرت، فلاں پیداکر شبنان محبت میں حریر و پریاں ہو جا:  
انراض ماک و دن کی بن المل کشیدہ تعلقات کی فنا میں چکار دیں  
کے ساتھ اگر کچھ کلیاں بھی چٹکیں تو وہ بھی نعلی و جاہر، ہی کے پنچہ مرجان کی  
ٹھکری سے: اج  
صلیٰ اس عقدہ ہم اذ روئے نگار آخر شد:

نواب صاحب مجتہدی اور نواب محمد اسماعیل خاں صاحب اور متحدہ  
دیگر اکابر مسلم لیگ نے کانگریس پریسیڈنٹ کی اس شاخ ذریعہ کو اسی طرح  
قبول کیا جیسا کہ کل جزاء الاحسان الا الاحسان کا شیریں تقاضا تھا:  
ربانیدی مرا از مشرب لیکنی چو پیو دی پیایے جام سے را!  
لیکن معلوم ایسا ہوتا ہے کہ یہ نہرو کو صوفی العدر نواب صاحب  
مسلم لیگ کی سیاست کے دشمنی گوشوں سے واقف ہیں ذلیگ پر پریسیڈنٹ  
کے وکیلانہ بہتکندوں میں رواں: چنانچہ اول الذکر بزرگوں نے پنڈت  
جو اہر لال نہرو کے پیام محبت و اخوت کا جواب اس کی قدرتی صدائے باؤشت  
کی صورت میں دیدیا، اور مسٹر جناح کے فن گریز سے کام نہ لیا جس کا ایک شہکار  
خود پیرمنان نے اپنے بیان کچھ زبان میں پیش کیا ہے: اج

بسیار سفر باید تا پختہ شود خامی:

چنانچہ مسٹر جناح نے سر کسید ہو کر سب سے پہلے اک ہمت کی ضرورت  
کا اعلان کیا، اور دوسرے پہلی پیوچ جانکی اک شہرہ قابل کا: کیا پچ ہم الے  
ہی بہادر واقع ہوئے ہیں کہ اگر ناگہانی طور پر ہم سے کوئی ہمارے مطالبات پوچھ  
بیٹے تو ہم اپنے جواب اس بکارنے کے لئے اک پورے ہفتہ عشرے کا وقت مانگیں، اذ  
اک بصیحت نفس و شبات عقل جواب دینے کے لئے پہلے اپنے گھر پیوچ جان حاضر  
قراردین: کیا مسٹر جناح اپنے مشہور پنڈت و ستان ہر انکات اسی طرح بھول گئے  
جس طرح کہ پریسیڈنٹ و کس اپنے شہرہ افغانی (Fourteen  
months) نذر قعر دارستانی کر چکے تھے: ہم لیگ پر پریسیڈنٹ اور سب کے بزرگوں کا دراز  
عدالت و چہر کی کو ان کی حاضر زامانی اور بدیہ گئی پر مبارکباد دیتے ہیں: اج  
پسینا لوچھے اپنی حبس سے:

کیا آل انڈیا مسلم لیگ کا سالار کاروان اور اسلامی ہندوستان کے  
سیاسی و ثقافتی مستقبل کا محافظ و صورت نگار اس محکمہ خیر و قابل رحم و فراموشی  
کی نظر واقع ہوا ہے جس کا انگریزی سپرائز انہاریہ پایا جاتا ہے کہ وہ خود نہیں  
جانتا کہ وہ۔۔۔ کیا چاہتا ہے:۔۔۔ حضرت جناح کے لئے اب شاید یہ مقام  
فنا و فراموشی کچھ زیادہ دور نہیں کہ سے

ہم وہاں میں جہاں سے ہم کو کبھی کچھ ہماری خبر نہیں آتی:  
قربان جائے مسٹر محمد علی جناح کے اس قول کے کہ کانگریس بھی بتائے  
کہ وہاں لوں کو کیا دینا چاہتی ہے، گو یا خود ہمارا کوئی مطالبہ یا تقاضا نہیں  
جو کچھ ہے آپ کے علیحدہ داد کا معاملہ ہے! بالفاظ دیگر راضی برضا سائین  
کے خٹے کا حسین بھلی کی فیاض کا: غرت ہے: کیا یہی ہے مسٹر بزرگوں سل ناہی بہت  
کے ان علم ارشاد و بلند بانگ مطالبات و تحفظات کا جن کی تکرار کو شہرہ ہمارا  
بزرگ علم ہند کوٹھ رہا ہے، اور جن کے دروس مسٹر جناح کا مینہ اسلام آئینہ آل ہند  
آئینہ بنا رہا ہے!! سے











ترکستان، روسی علاقہ نمونہ ملک ۲۷ ہزار میل طویل اک اہم ریلوے لائن  
تمام مکن سرعت و عجلت کے ساتھ تعمیر ہوئی بخیر ہوئی ہے! یہ گویا ایلین  
چائینیز ریلوے کا نعم البدل ہوگی، اور موت و حیات کے اس معرکے میں  
چین کی نادر پشت پناہ ثابت ہوگی! بہر حال چین کا پیام رزم و ہزم جاپان  
کو یہ ہے:۔

اگر صلح خواہی، سخا بہیسم جنگ  
دگر جنگ جوئی، نہ بینی درنگ (۱-۱-خ)

کے ایک ایک شب و روز کا ہر مصارت جیسا کہ شکن بننے والا ہے اس کا  
اندازہ کچھ اس بات سے کچھ کہتا رہ جاپانی میزبانہ میں صرف مطالبات  
جنگ کی مدد گزشتہ سالوں کے پورے پورے بجٹ کی میزبان کل کے برابر  
واقع ہوئی ہے! مع

ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا!  
ایک چیز اس ڈرا ہے میں اس کی نئی تعمیر و ترتیب کی پیام برین کر  
آئی ہے! چین کے جدید عارضی مستقر حکومت، چون کیونگت، براہِ مہج

## شاعر

مجت کی نظر ہوں میں، حدیثِ مجتبر ہوں میں  
سکوتِ شام صحرا میں، تلاطمِ زار دریا میں  
میں اک شوریدہ سر ہوں، مست ہو درجِ ازل مجھ میں  
سری جادو بیانی آنکھ کے جادو جگاتی ہے  
مکتا ہوں مزاجِ عشق کو آئینِ خود داری  
میں اک آتشکدہ ہوں، زندگی کے سوز پہناں کا  
میں اک بانگِ درائے کارواں ہوں یعنی شاعر ہوں  
مجت کی نظر ہوں، ترجمانِ حالِ دل طرزی  
نہ باند انِ محبت، مانگ لیں میری زباں مجھے

# یہ نظر کس کے لئے ہے؟

اے زگر جان! یہ نظر کس کے لئے ہے؟  
 اے زہرہ جینوں کے لئے پیکِ ہزینیت!  
 اے تجھ کو بے عمر مری شامِ بلا کی  
 اے سایہِ کاکل میں جھپکتے ہوئے عارض  
 اے قامتِ بالا و بلند، اے قدموزوں  
 اے دیدہء پُرور و اے زگرِ مخمور!  
 اے عارضِ ناشتہ و رُوئے عرقِ آلودہ!  
 اے تجھ پہ فدا چمکِ خورشیدِ جہاں تاب  
 اے زانوئے کونین کی دیرِ سینہ تننا!  
 اے حُسنِ رُخِ روشن و اے جلوہء کاکل!  
 اے تیرے قدم پر سرِ خُوبانِ سرافراز  
 اے گیسوئے آشفته و اے کاکلِ برہم  
 اے خود سے اُلجھتی ہوئی بدستِ جوانی  
 یہ شعلہ، یہ بجلی، یہ شہر کس کے لئے ہے؟  
 پیغامِ فرتح و ظفر کس کے لئے ہے؟  
 یہ زلفِ رستا کیسے کس کے لئے ہے؟  
 ظلمات میں یہ آنکھ کس کے لئے ہے؟  
 یہ سرو، یہ شاخِ گلِ تر کس کے لئے ہے؟  
 چھلکا ہوا یہ ساغرِ زگر کس کے لئے ہے؟  
 یہ شہدِ شبنم، یہ شکر، کس کے لئے ہے؟  
 رُخ پر یہ تبسم کا اثر کس کے لئے ہے؟  
 قرباں تری زلفوں کے یہ کس کے لئے ہے؟  
 یہ ہوشِ ربا شامِ حشر کس کے لئے ہے؟  
 یہ نازیہ و زویدہء نظر کس کے لئے ہے؟  
 یہ عمرِ سیما و خضر کس کے لئے ہے؟  
 ہر سالس میں یوں زیر و زبر کس کے لئے ہے؟

اے شوخ! کبھی جوش سے اس نظم کی ضد پر

یہ پوچھ کہ تو خاکِ بسر کس کے لئے ہے؟

# عروسی

یہ ایک نہایت کامیاب علاج ہے جو بعد روغن عروس کے ترتیب دیا گیا مگر  
اٹھتا رہیں صرف تباہی اشارہ کافی ہے کہ مردوں کے تمام غمی شکایات کا بہتر  
میں واحد علاج ہے مخصوص ازکار رفتہ فائدہ اٹھائیں اسلئے کہ ارزاں تجربہ ہے  
اس کے ساتھ چار چیزیں موی، نباتی، کلیدی، لعلی اور سہراہ ہیں جن کی یہیل  
اور ترکیب استعمال خریدار پر ظاہر کی جاتی ہے، ایک سیٹ عروسی کا بہتہ  
سہرہ کو کافی ہوتا ہے جس کی قیمت صرف ایک دپہرہ آئے مقرر ہے ملاؤ  
محصول ڈاک، اکثر ترین ہفتہ کا استعمال صحت کے لئے کافی ہوتا ہے۔  
صاحب فرمائش نام و پتہ صاف و خوش خط تحریر فرمائیں

شفابخانہ رضویہ چاندنی محل دہلی

# ناظرین سالہ کلیم

اگر آپ ادب اردو کی خدمت کرنا چاہتے ہیں۔  
اگر آپ کلیم کی خبریوں میں خاطر خواہ اضافہ دیکھنا چاہتے ہیں  
اگر آپ کلیم کے بہترین شعراء اور ابداء کے حوصلے بڑھانا چاہتے ہیں  
اگر آپ ایسا کتب کی ضرورت کو محسوس کرتے ہیں جو کلیم کی ضروریات کو پورا  
رکھ کر کلیم گئی ہوں  
اگر آپ اپنے علمی و ادبی ذوق کو ترقی دینا چاہتے ہیں۔  
اگر آپ اردو کو ہندوستان کی واحد زبان دیکھنا چاہتے ہیں  
اگر آپ اصنی اور حال کے شعراء اور ابداء کا مقابلہ کرنا چاہتے ہیں  
اگر آپ کلیمیت بہترین اخلاقی اور ادبی کتب خریدنا چاہتے ہیں۔

کلیم بک ڈپو، جینتی نواس نمبر ۴۰ دریا گنج دہلی سے فرمائش کیجئے



# کلی



کا بہترین سامان  
کفایت کے ساتھ

جھلی کا سامان۔ پامداری اور ارزائی

انسولیٹر، سوچ، روز وغیرہ یعنی بجلی کے چینی مٹی کے ساز و  
سامان کے باب میں اس کی کواٹھی سب اہم چیز ہے اور گورنمنٹ  
پورسلین فیکٹری مائے سوارم بنگلور کی بنائی ہوئی چیزوں  
میں یہ خوبی ہے کہ وہ عالی و باغ انجینئروں کے علم اور

تجربے کا پچھڑ ہوتی ہیں

گورنمنٹ پورسلین فیکٹری

مائے سوارم، پورٹ آفس بنگلور



مارگر کے ڈونایاب تنھے

کیش سنگار ستر ایل

رشک منیر (پتھوں کا نیٹ)

کابین سنگھ موہن سنگھ میڈلسٹ پرنسپلز لٹرر قائم شدہ ۱۸۹۶ء



# ادبی دنیا

لک بھر کے جاوونگار ادیبوں اور شعرا کے بہترین افکار مشرق و مغرب کے بلند ترین مصوروں کے نظر افروز شاہکار  
۸۲ ولاؤیز افسانے مضامین اور نظمیں ۸ لمبے ہفت رنگ و یک رنگ تصاویر

قیمت صرف ایک روپیہ چار آنے، علاوہ محصول ڈاک

سالانہ خریداروں کو مفت

سالانہ چندہ پانچ روپے (حصہ مع محصول ڈاک)

آج ہی اپنا نام خریداروں کی فہرست میں درج کرا کر یہ بے نظیر تحفہ مفت حاصل کیجیے

منیجر رسالہ ادبی دنیا لاہور

# ہمایوں

## بھنگرہ میر اسماعیل

سر اور ڈالہی کے بالوں کو سیاہ اور دراز کرنے، گرنے سے روکنے، بھنگرہ میر اسماعیل نے جلد سے جلد نئے بال اگائے اور بالوں کا انبوه پیدا کرنے میں کامیاب ہوئے۔

تجربہ شدہ اور بے نظیر روغن ہے، خواتین کے لئے بہا اور نئی چیز ہے ہم اپنے دعوے کے ثبوت میں یہ عرض کریں گے کہ آڈائٹس کے لئے اولاد میں ایک ہفتہ استعمال کے لئے لٹکا یا جائے، اور استعمال سے قبل اپنے بالوں کی لمبائی نام کی جائے پھر چند روز کے بعد جانچ کی جائے، انکا کافی ہے کہ ہمارا اشتہار غلط ثابت نہ ہوگا اور تحریر کے مطابق ہی خوبیاں پائی جائیں گی۔

ہاں خیال کہ ہمارا روغن اپنا اشتہار خود ہی بنی اسکا قیمت لاگت کے برابر نہیں ہے، قیمت فی ادون ۱۲ ارتن ادونے کی کٹنگ ۵ ہر

نئے کا پتہ - انڈین اسٹور، بریلی

(۱) ہمایوں - اتنا پابند وقت ہے کہ جزیری مسئلے سے لے کر احباب یہ جاری ہو اسکا آج تک کبھی اس کی اشاعت میں ایک دن کی تاخیر بھی واقع نہیں ہوئی اور مصحف میں اس سے قبل ایسی باقاعدہ مثال نہیں مل سکتی۔

(۲) ہمایوں - آرمیل جسٹس میان محمد شاہدین صاحب ہمایوں مرحوم بیچ ہائیڈرو پمپ کی یادگار کے طور پر ایک مستقل سرمایہ سے جاری ہے۔ اس لئے اس کے ظاہری و معنوی حسن کو برقرار رکھنے کے لئے کسی قسم کی کاروباری مصیحت مد نظر نہیں رکھی جاتی۔

(۳) ہمایوں - اخلاقی میاں اس قدر بند ہے کہ ملک کا کوئی ادبی رسالہ اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اس میں فحش اشتہارات - عواہل تصاویر اور

مغربی اخلاق مضامین اور نکلوں کے لئے قلعہ گنجائش نہیں، یہ رسالہ بلا خطر خواتین کے ہاتھوں میں دیا جاسکتا ہے۔

(۴) ہمایوں کی ادارت جناب میاں بشیر احمد صاحب فی لے (اکسن) بیرسٹریٹ لاکے قابل ہاتھوں میں ہے اس کی ترتیب میں مضامین کے محض بلند معیار ہی کا خیال نہیں رکھا جاتا، بلکہ تنوع کا بھی انشا خیال رکھا جاتا ہے کہ ہمایوں کا ہر پرچہ مختلف قسم کے مذاق کے لوگوں کے لئے یکساں جاذب توجہ ہوتا ہے۔

(۵) ہمایوں کے مضامین محض نراز معلومات ہی نہیں ہوتے، بلکہ انتہا درجے کے دلچسپ بھی ہوتے ہیں، اس لحاظ سے ہمایوں آپ اپنی نظیر ہے،

(۶) ہمایوں - محبت زبان کے لحاظ سے نہ صرف پنجاب بلکہ ہندوستان بھر کے مستند ترین رسائل کی صف اول میں شمار ہوتا ہے۔

(۷) ہمایوں میں میاں دہلی، تاریخی و ہندی مضامین، دلکش افسانے اور ڈرامے، پائیزہ نغمیں، مزاحیہ مضامین، مشرق و مغرب کی رسائل کے دلچسپ اقتباسات اور ملک کی موجودہ ادبی تحریکات کے متعلق بنیاد پر قیمت، اطلاعات شامل کی جاتی ہیں۔

(۸) ہمایوں - ملک کے محکمہ تعلیم کی طرف سے منظور شدہ ہے، ہندوستان اور بیرون ہندوستان میں بے انتہا مقبول ہے۔

(۹) ہمایوں کے کاغذ کی قیمت - لطاعت، اور تصاویر وغیرہ پر دل کھول کر دیا ہوتا ہے۔

(۱۰) ہمایوں کے سالگرہ نمبر اور دیگر خاص نمبروں کے لئے کوئی ذمہ داری نہیں لی جاتی۔

چند سالانہ پانچ روپے چھ آنے، ششماہی تین روپے مع محصول ہے

خاکسار - میجر رسالہ ہمایوں لاہور

# پیغمبر اسلام

خاتمہ دو جہاں سرور کائنات حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت اور رسالت پر شاہ عبدالغنی شہ پارہ شیخ آبادی کا وہ غیر فانی شہ پارہ جس کی رفعت و عظمت کے سامنے قصر کفر سرنگوں ہوتا ہے، شہادتِ پیغمبری کے باپ ہیں اس لافانی شاہکار کے، ان کے مستدلال دل میں تیر کی طرح اترتے چلے جاتے ہیں اس کے انبی الہیات سے دعا میں یزدانی اور سرایت کرتا ہے، اس کے دلائل قاطع کے سامنے ادراکِ شقیق چھٹا بھول جاتا ہے شاعر انقلاب پر حبیب کی شہادت کا عالم طاری ہوا اسی وقت انہوں نے یہ نظم کہنا شروع کر دی۔ عالم تجریدی میں چار روز کی محنت شائد اور کمیوں کی قلب سے جو کچھ حاصل ہوا صرف وہی مضمون دلاس پر سحر برکائیگا، جب تک یہ نظم مکمل نہ ہوئی حضرت جوش نے نہ کچھ کھایا نہ پیا اور نہ غفلت سے باہر تشریف لائے۔

فحیت صحیفہ آٹھ لکھے کلیم کپڑو دریا گنج دینی سوچا



اسماں ادب کے افق پر ستارہ صبح کی تابانیاں لئے ہوئے پوری شان کے ساتھ ہویدا ہو گیا ہندستان بھر کے آتش فشاں شعلہ کی بلند پایہ نظمیں آپ کی روح پر انبساط طاری کر دیگی۔

ایک ہی پرچے میں، بیک وقت مسکرائیں اور آنسو..... فقیہ اور آئیں..... مسرت و غم معرکہ آرا علمی ادبی مقالات

دلنوازا اور دل گدازا فسانے۔ وہاں آفریں اور کینٹ آفریں، ہزاروں آفریں اور دشت زرا آپ دیکھیں گے

سانا کے ماہر مضمون، ہزاروں سہولتیں ایک شاہکار کی حیثیت رکھتی ہے مشرق و مغرب کے مشہور مصوہوں کی شاہکار تصویریں جو آپ کے دل و دماغ پر جسد کی کیفیت طاری کر دیں گی

ماہر مجازی ضخامت ۵۰ صفحات، ان تمام خیر کے باوجود قیمت صرف ایک روپے

آپ سالانہ مزاحیم ادا نہ فرماتے محال کرنا پاتے ہیں، آج تین پیسے چار آنے (چھ) میٹر خریدارین جائیے

رسالہ کلیم کے لئے ہر جگہ دیانتدار اور محنتی ایجنٹوں کی ضرورت ہے

## نقش و نگار

## شاعری راتیں

شاعر انقلاب نے چند راتوں کی مختلف کیفیتوں کو اپنے خاص وجد آفرین اور کیفیت آور انداز میں بیان کیا ہے، جنہیں پڑھکر ہر شخص اپنے آپ کو اسی ماحول میں محسوس کرنے لگتا ہے۔ راتوں کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

سرت رات      پرست رات      رازدندان کی رات      انظار کی رات  
اندھیری رات      چاندنی رات      چراغ کی رات      تصورات کی رات  
انفحات کی رات      جدائی کی رات      اشکوں کی رات      برسات کی رات  
ربودگی کی رات      بجزوی کی رات      سرشار رات      سبکی ہوئی رات  
تصورات کی رات      یچمین رات      چابن ناگ کی رات

قیمت صرف آٹھ آنے  
کلیم بک ڈپو، جنتی نواس نمبر ۱۰ - دریا گنج وہلی سے ملگائیے

شاعر انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی کی دہدہ آفرین نکلون کا مجموعہ (۱) نگار خانہ (۲) غزلیات (۳) تاثرات (۴) مطالعہ و نظر (۵) غیب ہر نظم اپنی جگہ مکمل، مرتب اور کیفیت شعری میں ڈوبی ہوئی ہے، اور اس کے سحر کر نئے، دل و دماغ کے لئے ایک مستقل سکون اور روح کے لئے ایک خاص سرور کا باعث ہوتے ہیں لکھنا، چھپانی، لکھیں اور دیدہ زیب ہے قیمت

غیر مجلد ایک روپیہ آٹھ آنے (۶) مجلد دو روپے (۷) کلیم بک ڈپو، جنتی نواس نمبر ۱۰ دریا گنج وہلی سے ملگائیے

## شعر

حضرت جوش ملیح آبادی کے تمام مضامین اور غیر مطبوعہ کلام سے منتخب کئے

## شعر

دئے گئے ہیں، ساتھ ہی سوانح حالات اور کلام پر مختصر تبصرہ لیا گیا ہے باوجود اختلاف مذاق کے نصف سے زیادہ اشعار آپ کو اپنی پسند کے ملیں گے  
جلدی ساز، کاغذ کتابت، جاعت دیدہ زیب، سرورق خوشنما جرج ہر شاعر کی تصویر بھی ہے  
قیمت صرف چار آنے

کلیم بک ڈپو، جنتی نواس نمبر ۱۰ دریا گنج وہلی سے ملگائیے

## شعلہ و شبنم

شاعر انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی

(کی) پر جوش اور کیف اور نغموں کا مجموعہ جو آپ کو تشدد کے شعلہ افشانیوں، اسلامی شان و حریت کے خون کھول دینے والے واقعات، باد و سر جوش کی سرستوں اور گلہاگبار فطرت کے روح پرور نغموں سے لطف اندوز ہونے کا موقع دیتا  
شاعر انقلاب کا یہ لافانی شاہکار غیر مطبوعہ کلام سے مرتب ہے کتاب مجلد ہے اور نہایت خوشنما گرد پوش سے آراستہ ہے

قیمت صرف تین روپے (۲) کلیم بک ڈپو، جنتی نواس نمبر ۱۰ دریا گنج وہلی سے ملگائیے

۱۷۷

۱۷۸

وڈائیں جگایا میں جا نہیں

جل جلال

جمیلان

نوجیون

خارش خشک و تر داؤ گنگ پھوڑے پھنسی مرنی  
وانے جھانسی کبل جھانے سزاک۔ آنکھ کھلی  
خونی انساں پرص۔ اور بدنام۔ غرض کس جھون سے  
بدا ہوئے والی تمام بیاریوں کے لئے نہایت  
خیر ہے قیمت فی شی ۱۲ قرض  
پندرہ آئے

جران کیلئے اس سے بہتر کوئی دوا نہیں۔ جبران  
کی موت کو تو جگر کی چاہئے کیونکہ رفت رفتہ جوش  
بہت کم کر دیتا ہے اور تمام اعضاء سے ریس نکال  
ہو جاتا ہے۔ جبران بیاہو یا کرانا جمیلان ہر  
مات میں اکثر ثابت ہوتی ہے قیمت  
فی شی ۱۲ قرض چار روپے آٹھ آئے

طرز و اشرا

یہ طلاء آن لوگوں  
کیلئے ہر جن میں  
سستی اور جوش  
کی کمی پائی جاتی ہو  
اس کے استعمال  
سے پہلی رات میں لٹ  
ٹا ہوتا ہے مسلسل  
استعمال سے کمزوری  
سستی۔ رگ اور  
جھول کی غریبان  
دور ہو جاتی ہیں۔  
نہایت مفید ہے  
قیمت فی شی ایک  
واش بارہ آئے۔

طبیعت

اُن لوگوں کیلئے  
جو اپنے اعتدالی  
طبی غریب کر چکے  
ہیں اور خطہ کایوں  
نئے نہیں کسی قابل  
ہیں رکھتے۔  
طبیعت نئی زندگی  
کا حکم رکھتا ہے جھون  
کی کمی ملائی کوئی  
اور کوئی دور جاتی  
ہے۔ اور لوگوں سے  
ماہہ اور مٹا ہوا  
اور طاقت حاصل  
ہوتی ہے قیمت فی شی  
۱۲ قرض چار روپے

مسخ الملک کیم خاں نصاریں اعظم کل خاص عطیہ  
طاقت اور زندگی کیلئے ہر تھیر سے بڑھ کر  
جاٹے کاموسہ مضایع نہ کیجئے

نوجیون باہ اور مردانہ قوت کے لئے ایسی عجیب ثابت ہوتی ہے کہ دنیا  
کی کوئی مقوی دوا اس کے مقابلہ میں پیش نہیں کی جاسکتی۔ اسکی چند خواہشیں  
قیامت پر اگر فوجی ہیں۔ اور انسان اپنے اندر وہ طاقت وہ جوش اور وہ بہت  
محسوس کرتا ہے جو اس کے خیال میں بھی نہیں ہوتی۔ کیونکہ یہ بعد ممسک اور  
بعد مقوی ہے۔ اور وقت پر پشیمانی سے بچالیتی ہے۔ بہت خون بہا کرتی ہو۔  
تمام اعضاء و طاقت دیتی ہے۔ ایک شیشی ایک سال تک اثر رکھتی ہو۔  
ان نوجیوں کے مقابلہ میں قیمت بہت کم ہے یعنی

۳۴ قرض کی قیمت

سات روپے آٹھ آئے

نوٹ :- پہلے ایک قرض صبح دو روپے کے  
ساتھ کھائیں جب عادت ہو جائے تو  
روزانہ دو قرض استعمال کریں

حب مسک شکی

یہ گویاں وقت پر پشیمانی سے بچتی ہیں سرعت کی  
شکایت باطل دور ہو جاتی ہے تمام مہم جوئی  
کی چیزوں سے پاک ہیں باقی بدولت آن لوگوں کی  
جہاں تندرستی کی وجہ سے اور جو تندرستی کو وقت  
پر بلا خواہ وہ مالی حال کی بدقسمت شکی  
مال کی ایک روپیہ

قرص عجیب

آج تک دنیا میں نہایت اعتدال اس سے بہتر  
دوا دریافت نہیں ہوئی عرصہ دراز کی شکایت جلد  
خود کار میں جاتی رہتی ہے۔ رقت و سرعت میں  
کرتی ہے۔ ایسی بھی دوا ہے کہ سو فی صدی  
کامیاب ہوتی ہے قیمت فی شی ۱۲  
قرص بارہ آئے۔

مینجر ہستانی دوا اس کے پو پو پو پو

۱۷۹

۱۸۰

ذہنی اور سیاسی انقلاب

پیغامِ مبشر کا

کلم دہلی

ذیرِ اداس

شاعر انقلاب جوش ملیح آبادی

اگر واقعی آپ کی یہ دلی آرزو ہے کہ۔  
(۱) آپ کے وطن عزیز کو پنڈتوں اور طاؤں کے فساد سے نجات مل جائے۔

(۲) انقید و رسوم کی عمارت پر حریت فکر و آزادی خیال کا پھر براہ راست لگے،

(۳) ہندو مسلم انسان "ہن کر اپنے اتحاد کے ذریعے سے ایک زندہ ہندوستانی قومیت کی بنیاد ڈال دیں۔

(۴) اور ہندوستان، غلامی کے طوفانی لہجے کو جس سے شیطان تک پناہ مانگتا ہے، اپنی گردن سے اتار کر ہدایت کے ستارے کی طرح دکھائے۔

تو

پہلی قیمت میں کلم کے خریدار بن جائے

پتہ یہ ہے  
مینجر رسالہ کلم، جینی ٹوائس، دیا گنج دہلی

علمی، ادبی، تاریخی، سیاسی، مذہبی، اصلاحی، معلومات کا بے بہا تجزیہ

ماہنامہ تنویر بمبئی

مدیرہ نگر

عالمگیر انسانی محبت اور اخوت کا پیغامبر!

آزادی وطن کا علمبردار!  
مذہب کے دامن پر انسانوں کے لگائے ہوئے دھبوں کو پاک کر کے نکالو!

اور صحیح مذہب کا مبلغ

عورتوں کے حقوق کا زبردست محافظ!

مردوں کا سچا خیر خواہ!

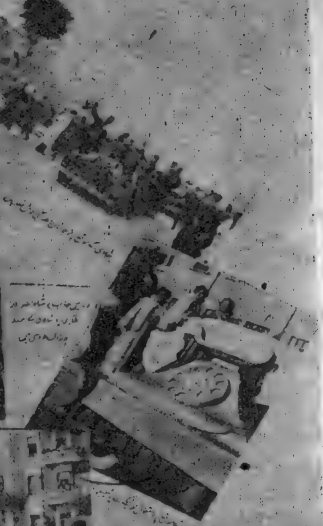
اور نئی نسلوں کے لیے ایک بہترین رہنما! اصناف کی حقیقی اور بلند ترین خصوصیات کا حامل!  
جو اپنے دلچسپ اور سبق آموز افسانوں، دلکش اور انقلابی ڈراموں سے ملک کی بکری کی بھڑکی ہوئی معاشرت کی اصلاح کر چکا، اپنی روح پرور و نفیس اور پریش مضامین سے قوم اور نئی نسلوں کی زندگی کی روتھ چھو گیا۔ اور ملک میں ہمکاری پیدا کر چکا۔ اپنے تاریخی علمی معلومات میں بنی بہا اضافہ کر چکا۔ اور ملک کے حق پر علم کا مآدان ہو چکا۔  
گو اس رسالے کا قلمراں انتظام اور مالیاتی حوالین کے ہاتھوں میں رہے گی۔ تاہم عورتوں، بچوں، مردوں اور ہر مذہب و ملت کی نفع دہر و کھیلے وقف ہو گا۔

قیمت دہنی پچھم۔ رسالہ یہ ہے۔ ۲ روپے تک بھوکھنور طلبہ غلامی جو معاشریان کی تصدیق کر چکا  
مینجر۔ ماہنامہ تنویر۔ پتہ دیا گنج دہلی۔ بمبئی۔

آپ اپنی تجارت کو ترقی دیا چاہتے ہیں

تو رسالہ کلم میں ضرور اشتہار دیں

# نبرد بی فاروق شاه صحرای شادی





بَنَام قُوَّت وُجْہَا

# کلام

آگے گانے جانے کب زمانہ اپنا  
قوت سے ملا ہے محکو صد حریف حکیم  
پہلوں کو منائے جاتر انہ اپنا  
منظور شدہ  
ستماھی چندہ، دورو پے  
ڈاکٹر انارکلی  
ششما چندہ تین روپے آٹھ آنے  
ریاستہائے میور، پیالہ وحید آباد دکن  
قیمت فی پرچہ، نو آنے

## فہرست مضامین بابتہ ماہ مارچ ۱۹۳۸ء

| صفحہ نمبر | مضمون                     | نکاح | صفحہ نمبر | مضمون                              | نکاح |
|-----------|---------------------------|------|-----------|------------------------------------|------|
| ۱         | اشعار                     | ۱۶۸  | ۱۴        | الغزیرہ رٹوہ رڈ ٹینس               | ۲۲۲  |
| ۲         | چونچ آباہی                | ۱۵   | ۱۵        | میاں دروڑے جو (نظم)                | ۲۲۵  |
| ۳         | نہ ہمارے جہاں انگریزوں کا | ۱۶   | ۱۶        | جناب محمد حسام الدین خان صاحب فوری | ۲۲۷  |
| ۴         | ایک خط                    | ۱۹۱  | ۱۶        | جناب عطاء اللہ صاحب پاوی           | ۲۲۹  |
| ۵         | ہندی اردو کے سوال کا جواب | ۱۹۳  | ۱۸        | جناب مجید امجد صاحب لیٹے           | ۲۳۳  |
| ۶         | انے چاند (نظم)            | ۲۰۴  | ۱۹        | دو ارجین پر ایک طائر (نظم)         | ۲۳۴  |
| ۷         | شعلاتی حکومت              | ۲۰۵  | ۲۰        | الطاف شہیدی کی شادی پر (نظم)       | ۲۳۶  |
| ۸         | عمر خیام                  | ۲۱۱  | ۲۱        | جوش ملیح آبادی                     | ۲۴۱  |
| ۹         | سرد و قعر (نظم)           | ۲۱۲  | ۲۲        | جناب مژدہ احمد اشرف صاحب تھاری     | ۲۴۲  |
| ۱۰        | پیشانی                    | ۲۱۳  | ۲۳        | جناب الطاف شہیدی صاحب              | ۲۴۳  |
| ۱۱        | تعلیم و بہارت             | ۲۱۵  | ۲۴        | تاج و ایمان (نظم)                  | ۲۴۴  |
| ۱۲        | محبت اور بہائی نعت        | ۲۱۹  | ۲۵        | رقبہ و وقت                         | ۲۴۵  |
| ۱۳        | نوائے جمی (نظم)           | ۲۲۱  | ۲۶        | نفس و نظم                          | ۲۴۶  |
|           |                           |      | ۲۷        | اشعار                              | ۲۴۷  |

(چونچ آباہی پر نظم، ششما چندہ صاحب، الملاح جی پی پریس، دہلی میں چھپوا کر دفتر سدا ولیم دہلی گلیاں پرچہ نمبر ۱۱)

# اشتہار

مدیر

## جماعت ہائے خوف

انسان قرائن و علامات سے اُن باتوں کو پتا چلا لیتا ہے جو اُس کی نگاہوں سے پوشیدہ ہوتی ہیں۔

تفکر کے معنی یہی ہیں کہ دو یا دو سے زائد امور معلوم کو اس طور سے مرتب کر لیا جائے کہ تیسری غیر معلوم چیز کا علم خود بخود حاصل ہو جائے۔ جب ہم کسی کے دروازے پر اٹھ کر ایک بہت بڑا انبار دیکھتے ہیں تو ہم یقین ہو جاتا ہے کہ یا تو اُس شخص کے وہاں کوئی دعوت تھی، یا لنگ جاری کیا گیا تھا، یا وہ ایک بہت بڑے خاندان کی روزی کا کفیل ہے۔

اسی طرح جب ہم کسی مقام پر گھونٹوں اور چوبوں کا ہجوم دیکھتے ہیں تو ہم یقین ہو جاتا ہے کہ کہیں قریب ہی کوئی نئے کالعدم ضرور ہو چکا ہوگا۔ یا جس وقت ہم کہیں محفروں وغیرہ کی کثرت دیکھتے ہیں تو ہم یقین ہو جاتے ہیں کہ وہ مقام گندہ اور مرطوب ہو گا۔

یاجب ہم پولیس کے ایک دستے یا آگ بجھانے والے آہن کو سرعتِ تسم کسی طرف جاتے دیکھتے ہیں تو ہم یقین ہو جاتے ہیں کہ کسی جگہ بد امنی، اور آتش زدگی کا فتنہ ضرور برپا ہو گیا ہے۔

اسی طرح جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ کسی مقام پر لڑائیوں رائے بہاؤوں، بادلوں، سروں اور راشٹ آرہوں کا اجتماع ہو رہا ہے، تاکہ سیاست میں عنقریب کوئی نہ کوئی وطن

فرزینی و برادر کشی کا نیا فتنہ برپا کیا جانے والا ہے۔

بعینہ یہی حال ہندو ہما سیمانہ اور مسلم لیگ کا ہے۔ اِن دونوں جماعتوں میں جن میں حکومت لڑا لڑیٹھ کا رواں درکارواں داخل ہو رہا ہے، حکمرانی کے حقوق حاصل ہیں، تو آلوں اور راشٹ آرہیلوں کو۔ اور اِن دونوں جماعتوں کی روج رواں ہیں، وہ حضرات جو ملک کی مجموعی قوت کو توڑ کر خود کا بھیرنا چاہتے ہیں۔

یہ دونوں جماعتیں مذہب اور تمدن کا نام لیکر ہندوؤں اور مسلمانوں کے دلوں میں ایک دوسرے کی طرف سے خوف و نفرت کے جذبات شعل کرتی رہتی ہیں۔

خدا جانے ہم ہندوستانیوں کی عقلوں کو کس کی نظر کھائی ہے کہ ہم کوئی موٹی باتیں بھی نہیں سمجھتے۔

یہ بات دس ہزار باتوں اور دس ہزار شخ اور پانڈوں سے زیادہ بڑی ہے کہ ہندوستانی کی خطاب یافتہ جماعت اگر دنیا میں کسی سرزمین سے محبت نہیں کر سکتی ہے تو وہ وطن اور صفت وطن کی سرزمین ہے۔

اور یہ حقیقت دس ہزار آفتابوں اور دس ہزار مہتابوں سے زیادہ روشن ہے کہ کوئی اسی، اپنی رعیت کے کسی فرد کو اُس وقت تک خطابتیں دے سکتا جب تک کہ خود کو اپنی مطالعے کے بعد اُسے حق یقین کی حد تک اس کا علم نہیں ہو جاتا کہ اس شخص کو خطاب دیا جا رہا ہے وہ شخص پیدا اسی وطن فرشتہ، اور ماورِ زاد غدار ہے، اور اس حد تک وطن فروش و

میں یوں پل کے ایک ہنرمیں رات کے وقت پہنچا، جہاں یہ معلوم ہوا کہ کس مندر جناح کا جلوس نکلے والا ہے، چنانچہ صبح ہوئے ہی میں اُس مندر پر پہنچ گیا، جدھر سے جلوس نکلے والا تھا۔

وہاں پہنچ کر سب سے پہلے تو میں نے یہ دیکھا کہ ہندوؤں کی دو ٹیمیں بندھیں، اور دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ ہندوؤں نے محض اس خوف سے دوکانیں نہیں کھولی ہیں کہ کہیں ارباب جلوس اُن پر حملہ کر کے اُن کی دوکانیں نہ لوٹ لیں، اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ ہندو مسلمان سے، اور مسلمان ہندو سے کس درجہ خوفزدہ بنا دیا گیا ہے۔

غالبہ کہ آدمی جس سے ڈرتا ہے، اُس سے محبت نہیں کر سکتا، اور اسی حقیقت کو پیش نظر رکھتے ہوئے سبھا بھوجوں اور لیگیوں نے ہندوؤں کو مسلمانوں سے اور مسلمانوں کو ہندوؤں سے دہشت زدہ بنا دیا ہے تاکہ اُن کے درمیان محبت کے پیدا ہونے کا کوئی امکان ہی باقی نہ رہے۔ میں ابھی اس مسئلے پر غور ہی کر رہا تھا کہ ایک مسلمان نے دوسرے مسلمان سے پکار کر کہا کہ آج جواہر لال اور چٹھہ مر گیا ہے، اُن کی لاشیں تھوڑی دیر میں گزرنے والی ہیں۔

یہ سن کر مجھے جس قدر صدمہ ہوا اس کی شرح نہیں کر سکتا۔ میں نے اپنے دل میں کہا کہ لیگ نے مسلمانوں کے پاک ٹیپوں کو کس قدر جی بھر کے ٹکڑبٹا دیا ہے، اور ایک جواہر لال اور چٹھہ کو زیادہ ہمارے بنانے کے عوض، انہیں یکس عورتوں کی طرح برا بھلا کہنے اور کسنے کی عادت میں کس چالاک کے ساتھ مبتلا کر دیا ہے۔

اس حقیقت سے آپ مجھ سے کہیں زیادہ واقف ہوں گے کہ کونسنے والے کی ذہنیت کیا ہوتی ہے، اور کونسنے والا طاقت سے کس درجہ محروم ہو کر رہتا ہے۔ اور کونسنے والی جہاں اپنے میں شدت کے ساتھ بھجائی ہوئی ناخلاقیت محسوس کرتا ہے۔ ہمارا آدمی تلوار کے ذریعے سے دشمن کا کام تمام کر دیتا ہے، اور بڑول چونکہ تلوار بھول نہیں سکتا، اس لئے کوس کوس کر ہی اپنا جی ٹھنڈا کر لیتا ہے۔

خدا اور حضرت اقبال کو خبر دو کہ مسلم لیگ نے اُن کے شاہین بیچے، کو آپ اس قدر بڑول بنا دیا ہے کہ "ذرا" پر حملہ کرنے کے عوض، اب اسے بددعا میں دینے لگا ہے، حالانکہ شکار اُس کی سب سے بڑی عبادت ہے۔

خدا رہے کہ حکومت کے ایک اہل سے اشارے پر اپنی تمام قوم، اپنے تمام خاندان، اور اپنے تمام مال و جان کو تیر تیج کر کے بھیجنا نہیں سکتا، اور بھگتا تو بڑی بات ہے وہ حکومت پر تمام گھبراہٹ قربان کر کے فخر محسوس کر سکتا ہے۔ اور کیا آپ کو معلوم نہیں کہ ہندو ہما سبھا، اور مسلم لیگ میں انہیں خطاب یافتہ، شرفنا، کو اقتدار حاصل ہے؟ اور کیا آپ ان گنڈوں اور گورنروں کے لاڈلوں، ان ڈپٹی کمشنروں اور ڈپٹی کلکٹروں کے چہتوں، ان تحصیلداروں اور تھانیداروں کے جگر گوشوں، اور ان ہندو کالونیوں اور چیرسیمین کی آنکھوں کے تاروں سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ یہ اعراض کے بندے، یہ تن آسایوں کے غلام، اور یہ موڑوں، مہروں میں کڑیوں بننے والے گوشت کے سانس لیتے ہوئے سڑے لوتھرے اپنے ملک کے واسطے کوئی قربانی کر سکیں گے، اور آزاد می کی جنگ میں آپ کا بات بنانے کا خواب تک دیکھ سکیں گے؟

اگر آپ کے دل میں ان خطاب یافتہ حضرات اور ان خطاب یافتہ حضرات کی نمائی برائی، ہندو سبھا، اور مسلم لیگ کی طرف سے اہل سا بھی شین خلق موجود ہے تو میں آپ کو مزہ دے سکتا ہوں کہ مندرجہ ذیل دو باتوں میں سے ایک تو ضرور ہی آپ کے اندر موجود ہے، یعنی یا تو آپ کے دلیں کھوٹ ہے، یا آپ کی عقل میں فتور ہے۔

اگر نصیب دشمن آپ کے دل میں کھوٹ ہے، تو میں بھاریہ کی جہنم رکھتا ہوں، اگر آسمانوں سے بھی آوازیں آنے لگیں گی کہ "ہندو ہما سبھا" اور مسلم لیگ، ایک سرب و فریب ہے، پھر بھی آپ نہیں مائیں گے، اور خدای کی قسم کہ تیر کچھ بھی آپ نہیں مائیں گے۔

اور اگر آپ کی عقل میں فتور ہے، لیکن کامل فتور نہیں ہے تو میں آپ سے مایوس نہیں ہوں۔ کیونکہ ان دو دنوں جماعتوں کا قریب اتنا ٹکڑا ہوا ہے، اور ان دو دنوں جماعتوں کے مداری اس درجہ پرہیز ہیں کہ مجھے یقین ہے کہ آپ مجھ سے آج نہیں توکل ضرور ہی اتفاق فرمائیں گے۔

لگے ہاتھوں ایک جلوس کا حامل اُن جیسے جس کے دیکھنے کا ایک ہفتہ ہوا کہ مجھے شرف حاصل ہوا تھا۔ یہ جلوس چونکہ لیگ کے قائد اعظم، اور لیگی مسلمانوں کے "فخریت" حضرت جناح کا تھا۔ اسی وجہ سے میں اس موقع پر اس کا تذکرہ نامناسب نہیں سمجھتا ہوں۔

میں ایک خان بہادر کا سب سے پیٹے لشکر یہ ادا کیا، اور اُس کے بعد فرمایا  
”مسلمان بنو“

یہ ترتیب بہت اچھی تھی، یعنی ”خان بہادر“ پیٹے اور مسلمان بنو“ بعد  
گو۔ کیونکہ لیگ میں اسلامی حفاظت کے لئے کھڑی ہوئی ہے، وہ اسلام  
”خان بہادر“وں ہی کے ذریعے سے اُس تک پہنچا ہے۔  
اور یہ بھی آپ کو معلوم ہے کہ یہ لیگ والا اسلام جو ”خان بہادر“وں کی  
وساطت سے لیگ تک پہنچا ہے، ان ”خان بہادر“وں پر کہاں سے  
نازل ہوا ہے؟

مدینہ منورہ سے؟ نہیں، ہرگز نہیں۔ ہجر کہاں سے؟ وہاں ہال سے!!  
لیکن پریشان دماغیوں نے عرصہ ہندو سمجھا ”ادرسلم لیگ“  
کو دیکھ کر میں خوش ہونا چاہئے، کیونکہ جبکہ اُس طرح کیا جا چکا ہے،  
ہر دور انقلاب میں ایک ”جماعت خوف“ کا رونا ہونا ایک طرف تو ایک  
لازمی اور قدرتی امر ہے، اور دوسری طرف اس بات کی روشن دلیل ہے  
کہ اب انقلاب کی کمائی پورے طور سے کھلنے کے قریب آچکی ہے۔

ہر دور انقلاب میں جب اخبار کا اقتدار اپنی بقا کی تمام تدبیروں  
سے مایوس ہو کر گھبراہٹ کے عالم میں بات پاؤں مارنا شروع کرتا ہے تو  
اُس کی اس حرکت مذکورہ سے ایسے افراد اور ایسی شخصیات پیدا ہوجاتی  
ہیں جو اخبار کے قدم جانے کی خاطر ملک کے طول و عرض میں اپنے اپنے  
ذہب و متدین کی آڑ لگا کر باہمی خوف و نفرت پیدا کر دینے کی سلطنت  
کی سب سے بڑی نمک حلائی اور خدا کی سب سے بڑی عبادت سمجھتی ہیں،  
لیکن یہ یاد رکھنا چاہئے کہ ایسی جماعتیں دیر تک زندہ نہیں رہا کرتیں  
— ان کی کھیل کود آئی ذہنی ہو اکر رہتی ہے۔ یہ سقڑی دیر پانا قدرتی  
پارٹ ادا کر کے ہمیشہ کے لئے فنا ہوجاتی ہیں،

دوستو! گھبراؤ نہیں، یہ جماعتیں ہمارے سیاسی افق پر ایک پل بھی  
رہنے والا نہیں ہیں۔ اس وقت ہندوستان کی دنیا کی  
سیاست میں رات کے تین بج چکے ہیں۔ تاریکیاں اڑی چوٹی  
کا زور لگا رہی ہیں کہ ٹورکنا میں داخل ہونے دیں۔ مگر انتخاب  
آزادی سے کہ اُبھرنا ہی چلا رہا ہے، اور تاریکیوں کے چہرے نفی ہوتے  
چلے جا رہے ہیں۔

کرشن بھگوان کا واسطہ کہ جناب مونجے کو کوئی اطلاع دو کہ ہمارے جانے اُن کی ذہنیت  
سوداھی کو اس قدر بڑل بنا دیا ہے کہ اب وہ آل اورنگ زیب کے خوف سے  
دو کاٹیں نہیں کھول سکتی ہے۔ حالانکہ وہ کاٹناری اُس کا سب سے بڑا ایسا ہے۔  
جب کسی ملک میں انقلاب ہونے والا ہوتا ہے تو تاریخ میں بتاتی ہے  
کہ اُس وقت پر وہاں انقلاب کی آخری ضرب سے پہلے ایک جماعت رونا  
ہوتی ہے جس کے اعمال و اقوال ایسے ہوتے ہیں کہ بجا طور سے اُسے جماعت  
خوف کا لقب دیا جاسکتا ہے، اور جیسا کہ انقلاب فرانس کے موقع پر چچا  
ہے، ”اس جماعت خوف کا نئے دے کے صرف یہی کام ہوتا ہے کہ وہ لوگوں  
کو انقلاب کے نتائج سے ڈراتی، اور ایک گروہ کو دوسرے گروہ سے خوف  
دلا کر جھوٹ ڈال دیا کرتی ہے۔“ — چنانچہ سجد اللہ کہ ہمارے  
دور انقلاب میں بھی ”سبھا“ اور ”لیگ“ دو جماعتیں خوف پیدا ہونے لگی  
ہیں، جن کا یہ واحد فریضہ ہے کہ وہ ہندوؤں کو مسلمانوں سے، اور مسلمانوں  
کو ہندوؤں سے ڈراتی ہیں۔ — اور ایک دوسرے کو تباہ  
سمجھ نہ ہونے دیں۔ تاکہ غلامی کی عمر، دروازے و راز تر ہوتی چلی جائے،  
ہاں تو میں جیسے ذکر کر رہا تھا — کوئی دس یا گیارہ  
بے مسٹر جناح کا محسوس جن کی کشت پر رہنمائیواروں کا پھر اٹھا، جو راہ پر  
اگر لڑکا، جیسا متعدد گھنوں نے اُن کی خدمت میں ایڈریس پڑھا کر سنا ہے۔  
ہر ایڈریس میں مسٹر جناح کا شکریہ ادا کیا گیا تھا کہ اُنہوں نے عین  
اُس وقت جب کہ برادرانِ وطن ہیں بھڑک جانے والے تھے، ہم حکومت  
کے چٹے سے چٹے لایا۔

مسلمانوں کی کسی برق و آتش سے کھینچنے والی مرقوم اور یہ کہے کہ  
مجھے ہندو نکل جانے والا تھا! اور اُس کے ساتھ شکر یہ ادا کرے مسٹر جناح  
تھا کہ اُنہوں نے اُسے موت کے چہرے کے اندر سے کھینچ لیا!

مسلمان، اور مسلمان حکومت سے بچانے والے کون؟ مسٹر جناح!!  
بسوخت عقلِ ذہیرت کہ میں چوڑا بھی است

اس کے بعد مسٹر جناح، جو خان بہادروں ”اور“ خان صاحبوں کے  
صفت میں لکھ کر تک ڈوبے ہوئے تھے۔ تغیر کے لئے کھڑے ہوئے، اور عترت  
کے کاٹنوں سے یہ خبریں جاسے گی کہ قائد اعظم کی زبان مبارک جو پہلا  
لفظ نکلا وہ ”خان بہادر“ تھا، یعنی اُنہوں نے اپنی عزت افزائی کے سلسلے

عکس گارہی ہیں کہ ہے  
مژدہ اسے دل کہ مسیحا نفی می آید  
کہ زانفاس خوشش بوسے می آید

انوس ہے ہمارے بزرگوں پر کہ وہ سیاسی رات کے بارہ بجے  
ہی دنیائے رخصت ہو گئے اور خوش قسمت ہیں ہم کہ ہماری رات دھل  
جلی ہے اور رسی کا کائنات رات کے تین بج کر آگے کی طرت گزر چکا ہے  
اور بے گئی ہوئی رات کی دے پاؤں چنے والی خاک ہو ایں

# شامِ رخصت

تجسسِ رخصت کی وہ شام اشک افشاں ہائے ہائے  
وہ مرے سینے میں سیلِ آب و آتش، الاماں  
وہ مرا عشقِ گل افشاں، رشتہ برپا حیف حیف  
وہ تب غم سے مری آنکھوں میں سُرخ، انیثا  
وہ مرے اطوار میں اندازِ سیلِ بے پناہ  
وہ بُدائی کی ہوا کے تیز جھونکے، وائے غم  
اس طرف اُسجھی ہوئی موجِ حیاتِ کینفس  
اس طرف تاریکی شامِ مرلیضانِ کہن  
یاں چکنے ہی پہ برقِ نالہ دردِ افسریں  
وہ اُداسی، وہ فضا کے گریہ ساماں ہائے ہائے  
وہ ترے چہرے پہ موجِ برق و باراں، ہائے ہائے  
وہ ترا حُسنِ جواں، سرورِ گریباں، ہائے ہائے  
وہ پسینے سے ترے رُخ پر چراغاں، ہائے ہائے  
وہ تری آواز میں آنتارِ طوفاں، ہائے ہائے  
وہ جوانی کا چراغِ زیرِ داماں، ہائے ہائے  
اُس طرف کبھر ہے موجِ گیسے تاباں، ہائے ہائے  
اُس طرف اندوہ صُبحِ سوگواراں، ہائے ہائے  
واں برسے ہی پر اجرِ چشمِ حیراں، ہائے ہائے

ہائے ہر اک تارِ نظر، زنجیرِ پائے عافیت  
 ہائے ہر اک موجِ نفس، دیوارِ زنداں، ہائے ہائے  
 یاں لبوں پر خُشبو، آہِ تنگ جاں، و انصیب  
 حُسنِ دیدار، یاں ہر آن بیتاب و شدید  
 حُسنِ نظارہ، و اں بہم پر افشاں، ہائے ہائے  
 یاں لرزتا ساغر و برِ غم و تہمت، الحذر  
 حُسنِ چمکتی سی نگاہِ مستندہ ساماں، ہائے ہائے  
 یاں کفِ پاچوم لینے کی بھجی سی آرزو  
 حُسنِ لعلِ گیرِ ہی کا شرمایا سا اراں، ہائے ہائے  
 میں سراپا سا زعشرت، اور رہنِ بزمِ غم  
 تمنا تے و لولوں کی آگ، اور تیرا جگر  
 کاکلوں کی چھاؤں میں اور رُوئے نگیں، الاماں  
 وہ مری نظروں میں کچھ کہنے کی حسرت، وائے شوق  
 اللہ اللہ آنکھوں ہی آنکھوں میں یہ کہنا ترا  
 جوشِ بے سیرِ دل ہو اجاتا ہی ویراں، ہائے ہائے

اے فغاں بربِ ترم، اے خزاں برکتِ بہارا  
 جوشِ تیرے دل کی ویرانی کے قرباں، ہائے ہائے

# سرسشت

اٹھا ساغر کہ انسان کُشتہ آلام ہے ساقی  
 نہ جانے نوعِ انسان کیوں اجل سے خوف کھاتی ہے  
 حقیقت کیا سمجھ میں آسکے اشیائے عالم کی  
 سناؤں سازِ حکمت کے ترانے کس توقع پر  
 صداقت آج بھی پوشیدہ ہے اولادِ آدم سے  
 اُدھر یہ قول ہم نے شرح کر دی ہے حقائق کی  
 اُدھر تکمیل دیں گا ہو چکا ہے دعویٰ مُحکم  
 اُدھر شدت کے ساتھ اعلان ہو اتنا نعمت کا  
 کہا جاتا ہے مجھے زندگی انعامِ قدرت ہے  
 شکایت کیا کسی خوں ریز چنگیز و ہلا کو کی  
 عمل کا رشتہ ہے جب دستِ احوال و وراثت میں  
 یہ ربط ہے، یہ نئے، آگے خدا کا نام ہے ساقی  
 اجل کہتے ہیں جس کو زحمتِ یک گام ہے ساقی  
 فقط اک شکل ہے ساقی، فقط اک نام ہے ساقی  
 کہ اب تک نوعِ انسان بندہ اوہام ہے ساقی  
 دروغِ مصلحت آمیز اب بھی عام ہے ساقی  
 اُدھر اب تک وہی ابہام کا ابہام ہے ساقی  
 اُدھر ایساں تھا جیسا خام، اب تک غام ہے ساقی  
 اُدھر ہر سانس اب تک نہر کا اک جام ہے ساقی  
 سزا کیا ہوگی اُس کی، جس کا یہ انعام ہے ساقی  
 خود اپنا دل ہی جب خوں ریز و خون کشام ہے ساقی  
 تو پھر کیوں آدمیت مُوردِ الزام ہے ساقی

جسے کہتے ہیں عرفِ عام میں تخلیقِ انسانی      یہ کس آغاز کی سعی زبوں انجم ہے ساقی  
وہاں بخشا گیا ہے میرے دل کو ذوقِ آزادی      جہاں موج ہوا تک مُرغِ زیرِ دام ہے ساقی  
تبسمِ اک بڑی دولت ہے میں بھی اس کا قایل ہوں      مگر یہ آنسوؤں کا ایک شیریں نام ہے ساقی  
جسے اربابِ مذہب باوہ توحید کہتے ہیں      وہ آبِ صاف بھی افشردہٴ امنام ہے ساقی  
خروشِ گریہ ہی حاملِ ہنسیں غمہائے پنہاں کا      یہاں تو ساز کے پردے میں بھی کہرام ہے ساقی  
لڑکپنِ ضد میں روتا تھا، جوانی دل کو روتی ہے      نہ جب آرام تھا ساقی، نہ اب آرام ہے ساقی  
متنائیں جگاتی ہیں، ناکامی سُلّاتی ہے      نہ اپنی صُبح ہے ساقی، نہ اپنی شام ہے ساقی  
بڑی دریا دلی کے ساتھ ہر خوںِ ریز طاقت کو      مشیت کی طرف سے اذنِ قبلِ عام ہے ساقی  
یہ کس کی ہُمہرِ ہیبتِ ثبت ہے گیتی کے سینے پر      کہ ہر ذرہ ازل سے لرزہ بر اندام ہے ساقی

ادب کر اس غراباتی کا جس کو جوش کہتے ہیں

کہ یہ اپنی صدی کا حافظ و خیام ہے ساقی

جوشِ ملیح آبادی

# مذہب اور اس کے اجتماعی اور انفرادی اثرات

جاتا ہے۔

مذہب خالص عقولیت ہے، اس میں شیرازہ بندی کی قوت یا صلاحت اسی وقت تک ہے جب تک لوگوں کی خیالی آزادی کو مستحضر رکھا جاسکے۔ مذہب کی مرکزیت کو قائم رکھنے کے لئے مزدوری ہے کہ اس کی روایتی صورت کو کبھی قائم رکھا جائے، اور عقولیت کو دخل نہ دیا جائے، اس کے تمام عقول عقل کو بات پر ایمان کامل ہو، اور اس لئے مزدوری ہے کہ مذہب کی پشت پر حکومت بھی ہو، جب مذہب کے ساتھ حکومت باقی نہیں رہتی تو مذہب میں پراگندگی پیدا ہو جاتی ہے۔ اور شیرازہ بکھر جاتا ہے۔ مذہب میں اصلاح کے نام سے رخنہ پڑنے لگتے ہیں اور ہر شخص اپنے اپنے خیالات کے مطابق بارودک ٹوک سٹے نئے فرقی پیدا کرتا رہتا ہے۔ یہ کہنا غلط ہے کہ مذہب کی پابندی ہوتے ہوئے حکومت ہاتھ سے نہیں جاسکتی۔ تاریخ گواہ ہے کہ قوموں کے عروج و زوال کا سبب ہمیشہ مذہبی ترقی یا انحطاط نہیں ہوتا۔ اور اگر بالفرض حکومت مذہب کا ساتھ دیتی ہے تب بھی آزادی رائے کو کب تک سلوک رکھا جاسکتا ہے۔ آمد و رفت کے ذرائع کی توسیع، دوسری قوموں کے ساتھ میل جول، دنیا میں علوم و فنون کی ترقی، یہ سب ایسی چیزیں ہیں کہ تدریج ذہن و فکر کو ردایات کے بارے میں سکھوٹ کر دیتی رہتی ہیں۔ اور عقولیت کا طلسم کا آخر ٹوٹ کر

مذہب کا تعلق جہاں تک اخلاق سے ہے وہ باطل انفرادی ہے لیکن محض اخلاقیات کا نام مذہب نہیں ہے۔ علاوہ اخلاق کے مذہب میں مخصوص عقائد اور رسومات بھی شامل ہیں۔ ان عقائد اور رسومات کے متعلق ہم اگلے چل کر بحث کریں گے۔ سر دست ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ ان عقائد اور رسومات کی مختلف لوگوں میں یکسانیت ان کی اجتماعی قوت کا باعث سمجھی جاتی ہے کیونکہ مذہب کی یکسانیت اتحاد اور اشتراک مقاصد کی ایک صورت ہوتی ہے۔ یعنی مذہب مشترک مقاصد کی ایسی تشکیل ہے، جو تمام ملکی اور ملی استیارات سے بالا تر ہوئی ہے اور مذہبی برادری کا دائرہ وسیع اور ہم گیر ہوتا ہے (خصوصاً تبلیغی مذاہب کی صورت میں) اور اس لحاظ سے خیالی طور پر یہ دائرہ مادی تعصبات سے بری ہوتا ہے۔ ہندوستان میں مذہب ہمارے کچھ کاجڑ و غم ہے، چنانچہ مذہب کا فنا ہونا ہماری قومی زندگی کی فنا کے مرادف خیال کیا جاتا ہے۔ اور اہل مذہب کا خیال ہے کہ ہماری اجتماعی قوت کا انحطاط مذہب کے انحطاط کا نتیجہ ہے۔ ہم آج اسی خیال کو تنقیدی نظر سے جانچنا چاہتے۔ قومی زندگی کے انحطاط اور ضعف کا سبب زیادہ تر یہ ہوتا ہے کہ افراد میں اجتماعی مقاصد کے لئے اشار اور قربانی کا جذبہ فنا ہو جاتا ہے، جس کی وجہ مذہبی ہے اعتقادی نہیں ہوتی، کیونکہ مذہب کا تعلق زیادہ تر عقائد اور عبادات سے سمجھا

ظاہری اور باطنی کا سب سے بڑا فرق یہی ہے۔ ایک اور مثال سائنس کے باطنی تعلق کی علم النفس ہے۔ یعنی دماغ کے ظاہری افعال کے باطنی پیو۔ غرض تجربہ اور شاہدہ موجودات کے علم کے لئے ناگزیر ہے۔ اور اگر کوئی ایسا وجود ہو جو عالم محسوس سے مادہ پرے تو اس کے وجود کو بے گناہ سمجھا کر ازم انسان کے علم دہم سے بالاتر ہے جس کو کجا طور پر ناقابل علم کہا گیا ہے، سائنس کسی بات میں تعلیم کی مدعی نہیں ہے۔ اور جس طرح کسی بات کا قطعی انکار غیر سائنٹیفک چیز ہے۔ اسی طرح بغیر کافی ثبوت کے اس کو تسلیم کر لینا بھی ویسا ہی غیر معقول سلک ہے۔ جو سائنس کی نظر میں ایک نردا حکم سے کم نہیں۔

ایک قدیم اور عامانہ طریقہ استدلال اس باب میں یہ چلا آ رہا ہے کہ مصنوعی چیزوں میں سے کسی شے کی مثال دے کر یہ سمجھایا جاتا ہے کہ جس طرح لازمی طور پر اس کا کوئی صانع ہے، اسی طرح کائنات کا بھی کوئی صانع ضروری ہے۔ لیکن مصنوعات کی مثال قدرتی چیزوں پر مطبق نہیں ہوتی۔ یہ دلائل طرح کی چیزیں حیا کے الفاظ سے ظاہر ہے۔ اپنے مفہوم میں یہی ایک دوسرے سے بالکل مختلف بلکہ متضاد ہیں، اور اس لئے جو بات ایک کے متعلق کہی جا سکتی ہے۔ ضروری نہیں کہ دوسری کے متعلق بھی صادق آئے، مصنوعی چیزوں میں بنائے جانے کا مفہوم اور تصور لازمی طور پر سرچرچا ہوتا ہے۔ قدرتی چیزوں کو مصنوعی مان لینا گویا نین اسی بات کو فرض کر لینا ہے، جو موضوع بحث میں ہے۔ بحث میں محض صورت گری ہوتی ہے، مادہ مطلق نہیں بنایا جاتا۔ یہ بھی سہم ہے کہ کوئی چیز دراصل فنا نہیں ہوتی۔ صرف اس کی صورت و شکل تبدیل ہو جاتی ہے، یعنی اُس کی مخصوص افادیت ذائل ہو جاتی ہے۔ اس لئے اصل کائنات حادث نہیں ہے۔ اور اس لحاظ سے خالق کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ کسی چیز کی توجیہ اگر فوقی حادث سبجی یا قوت کی مداخلت کے ذریعے کی جائے تو عقلی تسلیم اُس کو باور نہیں کرتی۔ قدرتی چیزوں کی توجیہ قدرت ہی کے ذریعے ہوئی جائے، مثلاً درخت سے سیب ٹوٹ کر زمین پر گرتا ہے۔ اگر اس کی توجیہ یہ کی جائے کہ اُس کو دلو یا پری توڑ کر زمین پر پھینک دیتے ہیں تو یہ عقلی تسلیم کے نزدیک قابل قبول نہیں۔ البتہ اگر کشش ثقل کے ذریعے اس کی توجیہ کی جائے تو ایمان نہ ہو جاتا ہے۔ قدرتی چیزوں کے متعلق یہ دریافت کیا جاتا ہے کہ فلاں چیز کی

رہنما ہے۔ اور مذہب کی اجتماعی قوت اس کی مقبولیت ہی میں منحصر ہے۔ انسان کو خیالی آزادی ملی اور مذہب میں تفرق پڑا۔ پھر مذہب بجائے لوگوں کو متحد کرنے اور ایک مرکز پر لانے کے اقتدار اور شد و کد کا باعث ہو جاتا ہے۔ اور اس کی اجتماعی حیثیت فنا ہو جاتی ہے۔

ہم ابھی کہہ چکے ہیں کہ مذہب مخصوص معتقدات اور رسومات سے عبارت ہے۔ ان معتقدات میں سب سے اہم اور بنیادی عقیدہ خدا کا ہے، دوسرے حیات بعد المات کا عقیدہ اور معنی کی سزا اور جزا۔ ان عقائد کے تحت مختلف قسم کی عبادتیں اور رسومات ہیں۔

ہم سب سے پہلے معتقدات کو لیتے ہیں۔ پہلا عقیدہ خدا کا ہے۔ یعنی ایک ایسی عظیم الشان اور فوق العادت ہستی کا وجود کائنات سے مادہ ہی ہے۔ ایسی ہستی کے اثبات کا مسئلہ ہنوز عقدہ لایحل ہے۔ کہا جاتا ہے کہ سائنس کے ذریعہ اس کا ثبوت ہم پہنچنا باعث ہے۔ کیونکہ سائنس عالم ظاہری ہی سے سروکار رکھتی ہے، لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسا عالم باطنی جو اس اور اور ایک سے مادہ، ہوا، اس کا وجود دوسلے ایک منفرد عنصر کے اور کیا ہو سکتا ہے۔ جو ذرائع قدرت نے اور ایک کے عطائے ہیں اور ان کی وساطت سے جو کچھ ہم معلوم کر سکتے ہیں اس کے علاوہ کسی چیز کا فرض کرنا اگر بالظنیت ہے تو بالظنیت ممکن ایک دایرہ ہے۔

ظاہر اور باطن کا امتیاز غلط فہمیوں کا موجب رہا ہے۔ سائنس ہر اس چیز سے سروکار رکھتی ہے جس کی اثر اندازی کا کسی طرح سے اندازہ ہو سکے، اور یہی وجود کے معنی ہیں۔ سائنس وجود کی ظاہری اور باطنی کیفیت کی تحقیق کرتی ہے۔ چنانچہ ذرہ کی اندرونی ساخت کا جو اس نے حال میں بتا دیا ہے وہ یقیناً اس کی باطنی حقیقتات ہی ہے۔ مثلاً ذرہ میں مرکز اور اُن کے گرد برق پاروں کی مختلف فاصلوں پر گردش اور اس میں نکل کا ہونا وغیرہ وغیرہ۔ اگر بالظنیت سے مطلب ایسی شے ہے جس کا اور ادراک جو اس کے ذریعہ نہیں بلکہ عقل کے ذریعہ ہو، تو ظاہر ہے کہ جو کچھ بھی اس ترقی یافتہ زمانے میں سائنس کے ذریعے علی نقشہ ہونے ہیں وہ سب عقل ہی کی رہبری کا نتیجہ ہیں ورنہ محض حواس کے ذریعے جو کچھ معلوم ہو سکتا ہے وہ وہی ہے جو قدیم زمانے کے لوگوں کو معلوم تھا اور آج بھی بے علم لوگوں کا علم حواس ہی تک محدود ہے، ہمارے نزدیک

مذہب عام عقیدہ مقبول و معمولی ہے۔

اور اس کی شخصیت کا تصور بہت قدیم ہے، جو کئی ہزار دہائیوں کی صورت میں اب تک چلا آ رہا ہے، اور سب سے بڑے ایک دہائی کا تصور بھی اسی ذہنیت کی ارتقائی صورت ہے۔

اس زمانے میں جب کہ علمی تحقیق نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ قوت اور مادہ دو علیحدہ علیحدہ اور غیر جس چیز یا چیز ہیں۔ جیسا کہ پہلے خیال کیا جاتا تھا بلکہ وہ ایک دوسرے میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ تو ایسی صورت میں قوت کے عمل کے لئے کسی ذات کی ضرورت نہیں ہے۔ بلکہ قوت خود خدا اپنا عمل آپ ہے، بہر حال کائنات سے مادہ خدا کا تصور بے معنی ہے۔

خدا کی تصور کی ابتدا انسان کے اس دور سے ہوئی جب کہ ذہن انسانی عالم غلویت میں تھا۔ وہ فطرت کے غلبہ انشان مظاہر کی توجہ نہ کر سکتا تھا سوائے اس کے کہ ان کو فوق الہوت سستی سے منسوب کرے۔ مینٹاں کی جمل، پیڑ اور دریا اس کو موعوب کرتے تھے، اور اس کی بجا رگی اور غمخ کا اعتراف پیش کی صورت اختیار کرتا تھا۔ چنانچہ آج تک بھی قدیم مذاہب میں درخت، پتھر اور دیو یا کی پوجا ہوتی ہے۔ فطرت کے یہ ہولناک مناظر گرم ملک میں عام تھے۔ اس لئے مذہب کا چرچا ان ہی ممالک میں زیادہ رہا۔ مذہب کا توہم پرستی کے ساتھ تعلق ہونے کا مزید ثبوت یہ ہے کہ جنگ بھی جہاں حیات زیادہ اور طرح کی روشنی کم ہے، وہاں مذہب کا دور دورہ زیادہ ہے۔ مذہب ایک غلیظ چیز ہے اور غلیظ چیزوں کو تاریکی میں زیادہ فروغ ہوتا ہے، کیونکہ تعورات کے لئے اس حالت میں زیادہ گنجائش ہوتی ہے۔

دوسرا عقیدہ حیات بعد المات کا ہے۔ اس عقیدے کا اخصدار بھی اس مغرورہ پر ہے کہ رُوح جسم سے کوئی علیحدہ چیز ہے جو عارضی طور پر جسم سے مل جاتی ہے اور اس کے فنا ہو جانے پر بخود باقی رہتی ہے، لیکن جس چیز کو رُوح یا حیات کہا جاتا ہے۔ وہ جسم ہی کی ایک مخصوص استرہائی کیفیت یا حالت کا نام ہے جو خاص حالات میں رونما ہوتی ہے۔ یہ طبی چیز ہے۔ چنانچہ وہ مادی اثرات سے متاثر ہوتی رہتی ہے۔ مثلاً نازی ہوا۔ عمدہ غذا وغیرہ سے وہ خوش ہوتی ہے اور برعکس چیزوں سے وہ غمگین ہوتی ہے۔ رُوح کا مراح جب خراب ہو جاتا ہے تو ادویات سے اس کی اصلاح کی جاتی ہے۔

ہوتی ہے یہ نہیں ہو چکا تھا کہ اس کو کون کتا ہے۔ کشش ثقل یا کیمیا کی برقی قوت کے متعلق یہ سوال پیدا نہیں ہوتا کہ ان کو کس نے بنا یا پیدا کیا۔ یہ سوال مصنوعات ہی کے متعلق پیدا ہوتا ہے، جو چیز فنا نہیں ہوتی اُس کے پیدا ہونے کا بھی سوال نہیں ہوتا۔ وہ خود بخود ہے جس طرح خدا کے ماننے والے خدا کے متعلق کہتے ہیں۔

غرض زیادہ سے زیادہ جو بات خدا کے وجود کے متعلق کہی جا سکتی ہے وہ یہ ہے کہ ایک عالمگیر قوت کائنات میں کام کر رہی ہے جو اصل کائنات ہے، اور اسی کا نام خدا ہے۔ مگر اس صورت میں اس کا کائنات سے علیحدہ یا مادہ ہونا تصور نہیں ہو سکتا۔ کہا جا سکتا ہے کہ قوت کائنات میں شامل ہے۔ مگر وہ ذات جس کی قوت ہے کائنات سے مادہ ہے مگر ذات سے مادہ الیاد وجود ہے، جو صفات یا کیفیات کا محل یا قوت کا ماخذ ہو۔ یعنی کوئی (Concrete) چیز جو عارضی یا مستقل طور پر از خود قائم رہ سکے۔ دوسرے الفاظ میں ذات لازمی طور پر کوئی مادی چیز ہونی چاہیے، کیونکہ ذات اور صفات کا اصلی فرق مادی اور غیر مادی ہوتا ہے۔ لیکن لوگ رُوح کو بھی عمل قرار دیتے ہیں۔ مگر یہ بات خود متنازعہ فیہ ہے کہ رُوح کوئی علیحدہ وجود ہے یا نہیں۔ جس کی بحث ابھی آگے آنے والی ہے، اور جو چیز متنازعہ فیہ ہو اس کو مثال کے طور پر یا دلیل کے طور پر پیش نہیں کیا جا سکتا۔ غرض ذات کے تصور میں مادہ کا عنصر ہونا ضروری ہے۔ اور وہ کائنات سے مادی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قدیم زمانے میں مختلف قوتوں کو جن مختلف ذائقوں سے منسوب کیا جاتا تھا، وہ دونا مختلف مادی پیکر کھینچتے تھے۔ کسی کے متعدد دوسرے تھے، اور کسی کے بیشتر ہاتھ پاؤں وغیرہ وغیرہ۔ یہ چیز چاہے دوسرے نقطہ نظر سے کتنی ہی مضحکہ خیز معلوم ہو مگر اس میں خیالی مطابقت ضرور سمجھی۔ ذات کا ایسا تصور جو غیر مادی ہو اس کا عمل کے منافی ہے۔ جو ذات کے تصور پر مجبور کرتا ہے صفات کے لئے ذات کو اسی لئے ماننے کی ضرورت ہوتی ہے کہ صفات غیر مادی ہونے کی وجہ سے از خود قائم نہیں ہیں، اور ایک مادی وجود کو بطور محل کے چاہتی ہیں، اور اگر ذات بھی کوئی ایسی ہی غیر مادی چیز ہو تو ذات کا اعتقاد پورا نہیں ہوتا۔ پھر صفات کے دوسرے آگے بڑھنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ چنانچہ قوت کو کسی ذات سے منسوب کرنے کا ٹھیل

اور ترکیب کا نتیجہ ہیں، اور یہ دماغ خود جوانی دماغ کا ارتقا ہے، اور یہ تمام مسئلہ قرین قیاس بھی ہے، اور نہ کائنات کی ہدایت کے لئے بے شمار مختلف چیزیں یا مافی پڑیں گی، اور اس کثرت و ہجوم سے عقل سلیم گریز کرتی ہے۔ اس حاصر مسئلے کے متعلق ہم تعلیم کی دوسری اشاعت میں مسئلہ جبر و اختیار کے تحت میں مفصل بحث کر چکے ہیں، جس کا اعادہ یہاں ضروری نہیں معلوم ہوتا۔

تیسرا عقیدہ عاقبت کی سزا اور جزا کا ہے۔ یہ حیات بعد المات کے عقیدے کے ساتھ وابستہ ہے، اس لئے اس کی عینہ بحث کی ضرورت نہیں۔ مگر بعض مذاہب میں سزا اور جزا کے عقیدے کی تو جہتہ مناسبت کے ذریعہ کی گئی ہے، اور یہ ایسا مسئلہ ہے کہ اس پر خاموشی سے گزر جانا ایک ناگوار گناہی ہے۔ تناسخ کے بموجب ہر انسان کو متعدد بار جہنم لینا پڑتا ہے اور بے شمار زندگیوں میں سے گزرنے پڑتا ہے، اور ہر آئندہ زندگی کی نوعیت گزشتہ زندگی کے اعمال کے لحاظ سے ہوتی ہے۔ گو یا ہر ایک آتما اپنے کرموں کی سزا اور جزا کھینچنے کے لئے متعدد جہم اور دنیاوی زندگی اختیار کرتی رہتی ہے، تا آنکہ کائنات حاصل ہو جائے۔

اس نظریے کی واقعیت ہمیشہ تشہ نہوت رہے گی۔ کیونکہ عام طور پر انسانوں کو اپنی گزشتہ زندگیوں کی یاد ملتی ہوتی نہیں رہتی۔ شاید نادر جو کبھی کوئی مثال اس قسم کی سننے میں آتی ہے تو وہ ذوق قطعی طور پر قابل ذوق اور نہ اس مسئلہ کی حمایت کے لئے کافی۔ کیونکہ ایک دو آدمیوں کو نہیں بلکہ تمام انسانوں کو کلا استغناء گزشتہ زندگی کی یاد ہونی چاہیے خصوصاً جب کہ نفس یا روح فنا نہیں ہوتی، یہ کہنا کہ چند در چند وجہات سے ہر انتقال کے بعد گزشتہ یاد باقی نہیں رہتی، ایک ایسا عذر ہے، جس کو خوش عقیدگی کے سوا اور کیا کہا جاسکتا ہے۔ اگر کہا جائے کہ اس سے مسئلہ کی صداقت میں فرق نہیں آتا تو ہم کہتے ہیں کہ آخر اس صداقت کا اور ثبوت ہی کیا ہے، بظاہر یہ مسئلہ بنی نوع انسان کی لمبی عدم سادگی کی اخلاقی توجیہ کے طور پر اختراع کیا گیا ہے، کیونکہ انصافاً فطرت کی یہ عدم مساوات ناروا ہے۔ مگر اول تو طبی قوانین کے عمل کی اخلاقی توجیہ تلاش کرنا مذہبی تعصب ہے۔ دوسرے خود اس توجیہ میں بھی نہ انصاف باقی رہتی ہے، کیونکہ کسی کو ایسے اعمال کی سزا دینا جن کے ارتکاب کا

حیات کی مخصوص شان جو اس کو غیر ذی روح چیزوں سے ممتاز کرتی ہے نہویا بالیدگی ہے، اور کو نہ نہیں جانتا کہ بالیدگی کے لئے غذا اور کاہ ہے، چنانچہ مسلسل فائدہ کشی کی حالت میں روح ختم ہو جاتی ہے۔

اگر روح کوئی فرضی چیز نہیں ہے اور وہی چیز ہے جو اجسام میں پائی جاتی ہے، تو روح کا جسم سے علیحدہ تصور نہیں ہے جس طرح کیفیات غیر مادی ہونے کی وجہ سے اپنے وجود کے لئے ایک محل چاہتی ہیں جس طرح صفات کے لئے ذات کا ہونا ضروری ہے۔ اسی طرح روح کے لئے جسم کا ہونا ضروری ہے۔ جان کے ساتھ جاندار کا تصور لازمی ہے۔ اگر کہا جائے کہ روح محض زندگی کا نام نہیں ہے، بلکہ وہ اس سے کچھ زیادہ چیز ہے تو وہ زیادہ چیز نفس یا ذہن کا عنصر ہے، جو دماغ کی مخصوص ساخت کا نتیجہ ہوتا ہے۔ موجودہ بحث میں روح سے مراد وہ شے ہے جو جاندار کو بے جان سے متمیز کرتی ہے، جو انسان اور نباتات میں مشترک ہے، اور یہ لازمی طور پر طبی چیز ہے، یعنی ایک استمراری کیفیت جو جسم ہی سے متعلق ہوتی ہے، اگر جسم کے تلواریں سے پاک آن لکڑے کر دئے جائیں تو وہ بھی ختم ہو جاتی ہے جس کا ثبوت یہ ہے کہ وہ متفرق لکڑے اپنی اپنی جگہ پھرتے ہیں۔ روح کا رد ہونا اور ذرا ل ہو جانا طبی نظام کی صلاحیت یا تخریب کا نتیجہ ہے۔ اگر جسم سے کوئی عینہ چیز ہے تو سمجھ میں نہیں آتا کہ دو ایسی چیزوں میں یکساہت اور اتفاق۔ اتحاد اور اتصال کیونکر ہو سکتا ہے، جو مختلف اجزاء ہوں، جو دنیاوی اور آسمانی طور پر مختلف ہوں۔ جن میں کوئی شے اصلاً جزو مشترک نہ ہو۔ بلکہ بعد از شرفین ہو کیا کوئی ایسی مثال اس دنیا میں موجود ہے جہاں دو چیزوں کا اختلاف اصلی اور حقیقی ہو اور ان میں اتحاد یا اتصال پایا جائے۔ جو چیزیں بھی مثال کے طور پر پیش کی جاسکیں گی، ان میں یہ بات ضرور مشترک ہوگی کہ وہ مادی ہیں۔

بے جان مادے اور جاندار اجسام کی قدیم لغری یا *organs* اور *an-organism* کی صدف کس جدید علمی حقیقت کی روستے ذائل ہو چکے ہیں، اس کے یہ سنی ہیں کہ مادہ اور حیات ایک ہی چیز کی ارتقاء منزلیں ہیں، اور نہ صرف یہ بلکہ اغلب ہے کہ نفس بھی اسی سلسلے کی کڑی ہے۔ یعنی انسانی زندگی، نباتی زندگی اور حیوانی زندگی کے سلسلے کی ترقی یا نشہ صورت ہے، اس کے قوائے عقلی اس کے مادی دماغ کی مخصوص ساخت

ہر آپس میں کٹ مرنے والی بات ہے۔

اس کے علاوہ مذہبی ذہنیت کے آدمیوں میں آزادی فکر منقود ہوتی ہے۔ یورپ میں جب تک حکومت میں کلیسا کا اقتدار رہا، ترقی نصیب نہیں ہوئی، ہر ایک علمی تحقیق جو بائبل کی تعلیم سے اختلاف رکھتی تھی گردن زدنی تھی۔ علوم و فنون کی ترقی کے لئے آزادی خیال لازمی شے ہے۔ مگر مذہب اس کو ایک خاص نفع نظر سے پہنچے نہیں دیتا، اور یہی وجہ ہے کہ مذہب کو کماحقہ قائم رکھنے کے لئے حکومت درکار ہے، اور اگرچہ اس طرح اس کی مرکزیت قائم رہتی ہے اور اجتماعی قوت ضائع نہیں ہونے پاتی، مگر حکومت کے فنا ہوتے ہی اجتماعیت کا شیرازہ بکھر جاتا ہے۔ جس اجتماعیت کی بنیاد لوگوں کی آزادی رائے کو تسلیم کر کے رکھی جائے وہ کب تک قائم رہے گی۔ ہمارا مقصد اس تمام بحث سے یہ بتانا تھا کہ مذہب کے دونوں پہلو یعنی اجتماعی قوت اور انفرادی اصلاح یا اخلاقی حالت قابل اطمینان نہیں۔ نہ اس کی مرکزیت موثر اور دیر پا ہے، نہ اس کے ماتحت انسان فی اخلاق صحیح معنوں میں اخلاق کھلانے کا شئی ہے۔

اشتراک مقاصد کی بنیاد کسی ایسے اصول پر ہوئی چاہے جو کسی حالت میں شکست بخو سکے۔ اور ایسی چیز کسی گروہ کی اقتصادی ضروریات ہیں، مگر ظاہر ہے کہ مذہب کو اقتصادیات سے ازلی مخالفت ہے، مختلف مذہبی قوتیں ہمیشہ اقتصادی ترقی کی راہ میں رکاوٹ بنے رہے۔ اقتصادیات کا تعلق انسان کی مادی ضرورتوں سے ہے اور مذہب کا تعلق (ہنام بنیاد) روحانی ضرورتوں سے، جن کی تشریح کی جا چکی ہے، اور یہ واقعہ ہے کہ مذہب ابتدائی طور پر جن ممالک میں شروع ہوا، وہاں قدرت کی نیا صفی سے پریٹ اور تن کی ضروریات اور زندگی کی عام کشش شدید تھی، شاہد ہندوؤں میں لنگا اور جن کا علاقہ اپنی سرسبز و شادابی کے باعث جنت نشان تھا، اور یہی مذہب کا گہوارہ تھا۔ جن ممالک میں زندگی کی کشش زیادہ ہے وہاں مذہب براۓ نام ہے۔

مذہب کی حمایت میں اس کی انفرادی حیثیت کے متعلق ایک بات یہ کہی جا سکتی ہے کہ حکومت کے قوانین اور ضابطے انسان کی پراپرٹ زندگی کی اصلاح سے ہمیشہ قاصر رہے ہیں۔ یعنی اس کی اخلاق کی درستگی کا ذریعہ نہیں لے سکے، اور اس لئے تہذیب اخلاق کا ذریعہ مذہب ہی ہو سکتا ہے اس کے

اُسے مطلق علم نہیں، نہ تو اخلاق اور انصاف وہ ہے اور نہ اس کا کوئی فائدہ، کیونکہ ہم اپنے گناہ کی نوعیت سے مطلع ہی نہیں ہوتے۔ یہ کہنا کہ علمی کی بنا پر اعمال کے لازمی نتائج سے بچ نہیں سکتے، سراسر ہٹ دھرمی ہے، کیونکہ جس چیز کو ثابت کرنے کی ضرورت ہے اُس کی فرض کیا جا رہی ہے۔ سوال اصل میں اعمال کے کرنے یا نہ کرنے کا ہے، ان کے نتائج کا نہیں ہے۔ نتائج کے مسئلہ میں جو انسانی مکافات معسر ہے وہ فطرت کے طبعی قوانین کے عمل کے مقابلے میں کوئی بہتر حل پیش نہیں کرتی، اور اس لئے طبعی قوانین کے ہوتے ہوئے اس نئے قانون کے اختراع کی کیا ضرورت ہے، جب کہ ہماری دشواری بدستور باقی رہتی ہے۔

عقائد کے بعد مذہب میں عبادت کا درجہ ہے، عبادت کا تعلق خدا کے بنیادی عقیدے سے ہے اور اس عقیدے کے بطلان کی صورت میں عبادت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، بعض لوگ کہتے ہیں کہ عبادت بہر حال اچھی چیز ہے، اگر خدا نہیں ہے تو ہمارا اس سے کیا راجح ہے، اور اگر خدا ہے تو یہ چیز آئندہ زندگی میں کام آنے والی ہے، اور اس لئے اس کے نہ کرنے سے کرنا بہتر ہے۔ لیکن یہ بھی ایک روحانی غرض عقیدہ کی ہے، در نہ یہ ظاہر ہے کہ اگر خدا ہے یہی تو ہماری عبادت سے اس کو کوئی نفع نہیں پہنچتا۔

اہل مذہب میں عام طور پر یہ عقیدہ ہے کہ خدا ہماری عبادت اور قربانی سے راضی ہوتا ہے ورنہ اس کا تہرنا نال ہوتا ہے ہم دعاؤں کے ذریعے ہونے والی باتوں کو روک سکتے ہیں، اور عبادت کے ذریعہ خدا کو راضی کر کے اپنی کار براری کر سکتے ہیں۔ گویا عبادت ایک تم کی خوشنما ہے۔ اور قربانی ایک تم کی رشوت، جن کے ذریعے خدا کو پہلایا اور پہلایا جا سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان چیزوں میں اگر کوئی مفاد تصور تھا تو اس کا تعلق انسان ہی سے تھا، یعنی عبادت سے فرد تنی پیدا ہوا، اور قربانی سے ایثار کا جذبہ پرورش ہوا، اور ان اخلاقی صفات سے اپنا جس جس کو فائدہ پہنچے۔ مگر یہ امر واقعہ ہے کہ نتائج کے لحاظ سے نبی کے فائدے کے اکثر اور بیشتر نقصان پہنچتا ہے۔ عبادت کرنے والوں میں بکثرت رواداری کے اپنے جس جس کے ساتھ تعصب پایا جاتا ہے، اور جو شخص جس قدر مذہبی جوش رکھتا ہے اس میں اُسی قدر تنگ نظری دیکھنے میں آتی ہے۔ لہذا ماثرا اندہ عبادت کے طریقوں میں خفیت سے اختلافات

معنی یہ ہیں کہ جب تک دنیاوی حکومت اور سیاست کے علاوہ ہر جگہ خیر و ناظر موجود اور اس کے سامنے آئندہ زندگی میں اپنے نفعیت ترین اعمال بلکہ شہوت اور اراادوں کی جو ادبی اور اس کی عقوبت پر اعتقاد ہو۔ انسان کی ہر ایویٹ زندگی کو درست نہیں کیا جاسکتا۔ ہم کہتے ہیں کہ مکمل انسان کے ابتدائی دور اور قرون وسطیٰ میں مذہب کی اہمیت اور اس کی عزت و کار کردگی کا اعتراف ناگزیر رہے اور قدرت کے ارتقائی عمل نے اسی واسطے مذہب کو اس وقت رونما کیا۔ اس زمانے کے لوگوں کا ان باتوں پر صدق دل سے اعتقاد تھا یعنی اور ان کو ایسے محرکات کی ضرورت بھی تھی۔ لیکن جہاں جہاں انسان پر انفرادی حیثیت سے وہ دور گزر چکا اور تہذیب و تمدن جب اس درجہ پر پہنچ گیا جہاں نیکی کا ارتکاب یا بدی سے اجتناب کے لئے محض یا تنوید کے محرکات سے انسان بے نیاز ہو جائے اور نیکی کو نیکی کی خاطر اختیار کیا جائے اور بدی سے انسان کی مہذب فطرت خود بخود متغیر ہو، اور مذہب کے بڑھ جانے سے انفرادی اعمال کی اچھائی اور برائی کا معیار ان کی سوشل اہمیت کی بنا پر قرار پائے تو ایسے دور میں مذہب خود ماضی کی ایک یادگار اور صنعت کا تہرکہ بن کر رہ جاتا ہے، کیونکہ وہ اپنا کام کر چکتا ہے، اور اس کا دور ختم ہو لیتا ہے۔

یہ واضح رہے کہ کسی دور میں کسی جماعت کے تمام افراد کی حالت تہذیب کے لحاظ سے سادی و درجہ کی نہیں ہوتی۔ اس لئے مذہب کی ضرورت یا عدم ضرورت کا سوال اجتماعی نہیں ہونا چاہیے بلکہ انفرادی ہونا چاہیے۔ تمام افراد کو ایک ہی لائسنس سے ہانکنے کی کوشش کرنا ایک خطہ ہے۔ مذہب کو اجتماعی سرگرمیوں کے لئے مرکز بنانا کوئی مستحکم اور محفوظ پالیسی نہیں ہے، جب زندگی کی کشش زیادہ شدید ہو تو مذہب کا دخل تک ایک بے وقت کی آگنی ہے۔ اگر کہا جائے کہ مذہب خاص طور پر ایسے ہی وقت کام آنے والی چیز ہے، وہ عسرت اور تنگی معائب اور آلام کو خندہ پیشانی کے ساتھ برداشت کرنے کے قابل بناتا ہے اور آدمی یا دنیاوی اعتبار کو حقیر اور عارضی سمجھ کر اس کی طرف سے استغناء پیدا کر کے ایک اعلیٰ اور شریک روحانی نعم البدل کے لئے راضی کر کے دنیا اور اس کی آسائشوں کو ٹھکرانے کے قابل بنا دیتا ہے۔ لیکن سوال اس حالت کے برداشت کرنے کا نہیں ہے، بلکہ اس کو رفع کرنے اور بہتر بنانے کا ہے، اور مذہب معیار کا بنایا جا چکا ہے دنیاوی

اور سے محسوس اور سرکار نہیں رکھتا، بلکہ رکاوٹ ہی پیدا کرتا ہے۔ اس کے بیشمار مضامین و لایا ہی، اس کے قہرات اور دب سے زیادہ اس کا آئندہ فکر و خیال کو مستحکم رکھنا یہ سب چیزیں اقتصادی ترقی کی راہ میں حائل ہیں آزاد خیال فکر کے بغیر علوم و فنون کی ترقی معلوم، یورپ میں صنعت و حرفت کی ترقی شیشوں کے دور سے شروع ہوئی۔ اور شیشوں کا دوران علوم و فنون کا نتیجہ تھا جو شہادت الٹا سے شروع ہوا جب کہ کلیسا کی گرفت سے آزادی ملی۔ آج بھی دنیا میں وہ ممالک جہاں مذہبیت زیادہ ہے، یعنی اقتصادی سیاسی اور تمام دیگر مقاصد پر مذہب مقدم سمجھا جاتا ہے، وہاں چالان زیادہ ہے اور ترقی ترقی متغیر ہے، ایسے ممالک عموماً زراعت پیش ہیں یا (Personal Service) یعنی برہمنی ہائے کا شغل رکھتے ہیں، ان کی تجارت بھی عام اشیاء کی ہی محدود ہوتی ہے۔ وہ صنعتی ممالک کے لئے ایک لقمہ ہیں اور جو سوشل سٹیٹ دولت پیدا کر سکتے ہیں، وہ دیگر ممالک کی نذر کر دیتے ہیں، مگر اس مغلبی میں جی اپنے مذہب کے خیال میں گمن ہیں۔

ان تمام باتوں کے باوجود جو بھی جاچکی ہیں ہندوستان میں عیسے ملک میں ہم مذہب کو ترک کرنے کی صلاح نہیں دیتے، کیونکہ مذہب بیان کی آب و ہوا میں ہے اور علوم و فنون اور تہذیب و تمدن کی ترقی کے لحاظ سے یہ ملک بہت پیچھے ہے۔ ہم صرف یہ بتانا چاہتے ہیں کہ مذہب کو اجتماعی حیثیت نہ دی جائے، اس کو خالص انفرادی یا شخصی چیز سمجھنا چاہیے، اس طرح اس کی پاک حیثیت رفع ہو کر خالص ہر ایویٹ یا سوشل حیثیت باقی رہے گی، اور اس حیثیت میں جہاں تک ہو سکے اس کے عبادت اور پرستش کے پہلو پر زیادہ زور نہ دیا جائے، بلکہ تہذیب اخلاق کے پہلو پر زور دیا جائے جو کام کی چیز ہے، اگر جو خیالی طور پر عبادت گذاری تہذیب اخلاق کے منافی نہیں ہے بلکہ اس کی ممد و معاون ہے، اور پیدا افلاق ہی کے استحکام کے لئے معصیت عبادت پر ابتدائے زور دیا گیا ہو، اور عبادت کو قائم کرنے کے لئے حیات بعد الحیات اور آخرت کی سزا اور جزا اور ایک بزرگ و ہر ہستی کے سامنے جو ادبی کے عقائد کی تعلیم دی گئی ہو، لیکن اول تو عیسے ہم دیکھ چکے ہیں، ان چیزوں کی کوئی عقلی اساس (rational basis) نہیں۔ دوسرے یہ کہ عقائد و عبادت کے

# ہندی اردو کے سوال کا محض نظریہ

اور شمالی ہندی کی اصلی زبان  
(جو ترقی پسند اردو ہندی کی دوسری کانفرنس منعقدہ آباد میں ۱۹۲۷ء کو بڑھائی)

ہیتے ہوئے صاف صاف نظر آئے۔

زبان کے مسئلے پر آج تک بہت کچھ لکھا جا چکا ہے، اور گویہ  
مضمون بھی خالصتاً مسئلہ زبان پر ہی ہے، لیکن اس مضمون میں ہم یہ بتانا  
چاہتے ہیں کہ زبان کا مسئلہ عوام کا مسئلہ ہے، خاص کا نہیں ہے، اور  
وہ ادبی زبانیں جو اردو اور ہندی کہلاتی ہیں شاید ہی کبھی ایسے سے کوئی  
زبان عوام کی زبان بن سکے، لیکن اس وقت تک دونوں نہیں ہیں، بلکہ عوام  
کی زبان وہ زبان ہے جو دیانے منہج اور دیانے زبدا کے درمیانی ملک  
کے اُن دیانت میں بولی جاتی ہے جو صوبہ جات پنجاب، آگرہ، اودھ، بہار،  
بہار اور راجستھان میں واقع ہیں، اور یہ وہ زبان ہے جو اپنے متعلقہ علاقوں  
کی زبانوں یعنی گجراتی، پنجابی اور مرہٹی سے بھی بالکل غیر مانوس نہیں ہے،  
چونکہ اس کے بولنے والے زیادہ تر دیانت میں ہی رہتے ہیں، اس لئے  
اُسے شمالی ہندی کی دیانتی زبان کہنا چاہیے، گو شہروں کے رہنے والے  
اُسے گوارہی یا گنورواہ کہتے ہیں۔

اس زبان کی طرف اگرچہ آج تک کسی نے سہول کر بھی توجہ نہیں دی ہے،  
لیکن وہ اندھوادلی شان آہستہ آہستہ پیدا کرتی رہی ہے، جنہوں  
کتاب میں اس زبان میں لکھی گئی ہیں، جن میں دیانتی گیت، منظوم قصے، مہجن وغیرہ

تمام ہندوستان میں چند سال سے ایک ایسی تڑپ پیدا ہوئی ہے  
جس کی مثال پچھلے سو سال میں نہیں ملتی۔ ملک کی یہ تڑپ چونکہ غیر ملکی استعمار  
سے بچنے کے لئے ہے، اس لئے ہندوستان کی تاریخ میں یہ دور اپنی مثال  
آپ ہے، ایک طرف آزادی خواہوں کی دلولہ انگیز کششیں ہیں کہ ملک کو  
آزاد کر لیں، دوسری طرف غیر ملکی استعمار اور اُس کے لاتعداد وحشیہ ہیں، جو  
ایسی ہر ممکن رکاوٹ پیدا کرنا چاہتے ہیں، جس سے آزادی خواہوں کو اپنے مقصد  
میں ناکامی ہو، اور وہ ایسے مختلف فیہ مسائل پیدا کرتے ہیں جس میں لوگ الجھ  
کر رہ جائیں۔ کہیں حقوق کے تعینے کا سوال ہے، کہیں مذہبی تحفظ کا غلغلہ ہے،  
اپنی مختلف سوالات میں سے ایک سوال کچھ عرصے سے زبان کے متعلق چھڑ گیا  
ہے، کہ ملک کی زبان اردو ہوگی یا ہندی؟ رفع شرکے طور پر زبان کے لئے  
ایک مشترکہ نام یعنی ہندوستانی اچھٹا رکھا گیا۔ لیکن متعدد عامل نہ ہو سکا۔  
بہت سے رحبت پسندوں کو ہندی ادب کی ہستی خطرے میں نظر آئی اور  
غور ہو گیا کہ ہندوستانی کے معنی بھی ہندی کے ہیں۔ جس پر اردو زبان  
کے بھی خواہ ایک ساتھ جلائے گا اور وہ زبان کو فنا کرنے کی سازش ہے۔  
اور پھر ہندی اور اردو کی بحث چھڑ گئی، جس کا سب سے افسوسناک پہلو  
یہ ہے کہ اس بحث اور اُس کے ہنگامے میں بڑے بڑے مستند وطن پرست





میں اب آؤں بوجھ ڈرا تھو شیرا باندی لوں بوائے حال سب کہنڈن تیرا  
جواب رنگا چار کا

دو ہا

رائی چڑھ مکن میں دیکھن لگی ہمار اتنے میں ہورن آگیا گھوڑے پر اسوار  
چو بلو لہ

گھوڑے پر اسوار دیکھ رائی چڑھائی ہو کے گری بیہوش گری دھرتی پے آئی  
اڑ گیا سارا رنگ بڑی چڑی کھائی ہو کے سبھن تیری باندی کو بلوائی  
جواب رائی کا باندی سے

دو ہا

باندی توں بچے کون ہے یہ اسوار ذرا مت مار کرے دیر تو ملدی لاؤ بکار

چو بلو لہ

جلدی لاؤ بکار ذرا مت دیر لگاوت راجہ ہے یہ کون منے من صورت بھگوت  
بن دیکھے ہنیں مین جیسا رہا لپا دے باندی ست دیر کرے ہلا کر کہیں نہیں لاد

(ماخوذ از سانگ من دن مسند علی کش ساکن ٹاڈا ریالوہا)

جواب راجہ کارانی سے

چو بلو لہ

بھوجن سبکد نے دیا کہ بھجری نڈی پر پائی  
رائی تجھے ترسی دیکھ اس مالک نے بھجوائی  
تم ان دونوں بھون لو میں ہنا کر آجاؤں یہیں  
چلو صبر کرو من سوچے ہمارے ایک ایک بٹ آئی

دیکھا سنو من دلکان لنگا لے پر سیرے دھیان

جواب رائی کا

چو بلو لہ

ایک ایک بٹ آؤں تو کروں بھون کے تیار  
نڈی پر مرد مل رہا سو دھک رہی انگار

کیوں انہی میں بھون لوں میں بنا گ لپا میں ان کو بھونتی تم جلدی آجاؤ سردار

سنو پیر بھاراج رہے ڈیو دھپ پر پیرا بن رائی کے حکم کام نہیں بھون تیرا  
لے ذات کے شہزادہ من سے خبر کے حضرت سے شادانی خوشی ملے مگر ملے نام رائی کا ملے بانی ملے ڈیو دھپ سے دروازہ ملے اندر ملے دھپ سے پتلے

چو بلو لہ

جہاں چلن اک رہتی نارجات بھیناری نام حبیلی  
چو بن میں سہارا نارکی دو توں آنکھ کھینکی  
چو بن ہنڈا وہ اُس نے موہا بولی بول رسیلی  
ہر دم پاس راکھتی اپنے بنیں جانے دیتی دہلی  
ملکتا لی

گھر بھرت ہے آئی سہی دھلی دکنو اپنی  
پایا نہ مین شہزادہ اہلکار سردار ہلا کر کیا تھادہ

جواب نائی کا

دو ہا

کھٹت سہنے مل گئے دھن میری سرکار  
ٹیگٹ دیک رہی تیغ سد اکھم کھجرت

چو بلو لہ

سد اکھم گھجار پیلے پو توں پست پائی  
حاکم ہو سردار دوار پر پڑیو روز بد منائی  
سکنت ہزاروں کوس میں تیری رہی تیغ سوائی  
دوسر درگاہ تک راج رہے یوں کہتا سن نائی

(ماخوذ از سانگ پورن مل مسند رام لعل ساکن فوارنج پٹی)

سوال پنڈت کا دربان سے

دو ہا

ہم پنڈت سے دیس کے دیکھا شہزادہ کس راجہ کاراج ہے سن تو ڈیو دھپ بان  
کس رائی کے محل میں ہم کو نام تانا گرہ ہورت گھری لا بھ کچھ یہاں چپا

جواب دربان کا پنڈت سے

سیالکوٹ پہ شہر ہے سن بھائی کاراج ان اولاد سے کمل میں سن بیر بھاراج

دو ہا

سنو پیر بھاراج رہے ڈیو دھپ پر پیرا بن رائی کے حکم کام نہیں بھون تیرا  
لے ذات کے شہزادہ من سے خبر کے حضرت سے شادانی خوشی ملے مگر ملے نام رائی کا ملے بانی ملے ڈیو دھپ سے دروازہ ملے اندر ملے دھپ سے پتلے



(ماخذ از سانگ سیوت معصنہ عیسیٰ خاں ساکن فرخ نگر، مصلح گوڑگاؤہ)

دو ہا

مالک تجھے مناؤں، دوسرے تیرا دھبیاں  
راؤ رسالو گڈھ تھی ان کا کروں بیان  
مالک میں تجھے وہاں تو ہی نہیں کاڈ  
سیلا کی میں لیا نکھوں ہت جو ہار کاڈ  
کار بج میرے سار دیو نیامری بندھا ہے  
تو ہی کرے گا ہار تو کرتا سر جن ہار ہے

راگنی

مناکے سر جن، ساردا، تنہیکو دھاروں چہ  
ہر دے آن سہرا دے بھائی، بھر دھل میں تجھے منائی، تو ہی آ کر مشے من بھائی  
من کی سنگٹ کاٹ چن میں نہیں ڈاؤں گی  
جس نے تیرا سر کن، جی پہنچا پر چا دیا، میں نے آ کر مشے تیرا لیتا  
کارچ دیو ساردا، تیرے کن کاؤں گی  
ہر سار جو کو تیرا سہارا، عیسیٰ خاں نے چن اُچارا، کھیلے سانگ بھر پور ہمارا  
فرخ نگر میں بیٹھ بھوائی تجھے مناؤں گی

بجن

اُٹھ گیا باغن کا مالی کون کرے رکھو اتلی  
چھوڑ گئی گچیا من مائی، جاؤں کیں لیں باغن خاک میں مل گیا، اچھائی کی چٹنی  
وہ تو نا توڑن دیا دوائی، کون کرے رکھو اتلی، گچیا باغن کا مالی  
جلا کیوڑہ، موتیا جیسے گیا وہ ٹوکٹ  
چن رکھو اتلی من مائی کے گئے، کو کو سب کو  
چٹنی کا یا بہت دکھوں نے پالی کون کرے رکھو اتلی، گچیا باغن کا مالی

منہ جز ہا فوڑوں کے پیش کرنے سے ہمارا ایک مقصد تو یہی ہے  
کہ اس زبان میں فارسی و عربی و ہندی کے الفاظ بہت کثرت سے ہیں۔ یہ  
ادب بات ہے کہ غلط سے اُن کی شکلیں بدل جائیں، جیسے پنجاب کے ادب  
اپنے کلام اور مسامین وغیرہ میں وہ عربی و فارسی الفاظ اسی طرح لکھیں  
جس طرح وہ بولتے ہیں تو بعینہ اسی طرح اُن کی شکلیں بھی بدلی نظر آئیں گی  
اس صورت میں بعض تعلق کو "تعلک" اور محض کو "نافل" لکھ کر پڑے گا۔

یہ ہے کہ زم، نازک، شہ، جیٹہ، شہ، وقت، لکھ، لکھ، سر، شہ، آتی، ہر، فٹ، چھائی، کو، شہ، نجر، انڈا، باقی، آخر، شہ، پرائی، عورت، شہ، ہوتی، ہیں، شہ، جانے، ہیں، شہ  
منہ، شہ، مر جاؤں، کا، شہ، لکھ، آڈا، پر، وہ، شہ، ہے، شہ، دونوں، شہ، ہوں، لکھ، کچھ، شہ، سبھا، یو، پورے، کچھ، شہ، دم، نکال، کر، شہ، ددر، کر، لکھ، گی، شہ، کر، شہ، دم، شہ، شہ، کا، وں۔  
شہ، غیر، دیا، شہ، لکھ، سہارا، شہ، یا، شہ، شہ، و، شہ، نکال، شہ، یا، شہ، شہ، خوبروت، شہ، زمین، شہ، درخت۔

ٹیک

ترسی نرم کلائی تھے، اری گال گورے انگلی چڑھان  
بتاکس جات کی پستری۔ ہم نے ٹوٹ لاکے شستری  
نارنا عمر میں اتری، رے لگاتے برس بند ہواں  
گال گورے انگلی چڑھان  
ترے پر عاشق ہو رہے، اوت ہم پالی چورے  
ہاتھ تیرے گورے گورے، رے انکھیاں میں گال ایاتیں ل  
گال گورے انگلی چڑھان  
نار دیکھی جب تین آتی تھے، اارے دھاکست اب چھاتی تھے  
مار دیا بھانجن سحر پاتی تھے، تیرے ہنسنے کے بھول کڑوا  
گال گورے انگلی چڑھان

جواب گڈا سے کا

دو ہا

پڑنا ہی ہوں تیں بری مت رانی سے کر پو پیار  
عشق بُرا اس عجب میں ٹھٹ جیاں سُن گھر بار

ٹیک

مت کرے بات پنواڑے  
گڈا سا۔ ہووے بری عشق کی مار، مت کرو میرے سے تم پیار  
سُن پچنی میں دھار کلا رے کی

مت کرے بات پنواڑے کی

پالی۔ میں مر جیا نکال گلی گھوٹ، کرے مُند او پر کی اوت  
تیں ماری سے چوٹ دگاڑے گی

مت کرے بات پنواڑے کی

گڈا سا۔ مت کرو میرے سے سبب، عشق ہوتا ہے بُرا نکھیل  
سُوتلے پچیا سبب لکھاڑے کی

مت کرے بات پنواڑے کی

کے بچے میں جکڑا رہے تھے منظم انقلاب، یا غیر منظم بغاوتیں اور خانہ جنگیاں،  
موجودہ حالات کا لازمی نتیجہ صاف صاف یہی نکلتا نظر آ رہا ہے، انقلاب  
جو لوگ ملک میں برپا کریں گے اور ان کے دل اور بادل دیہات سے  
اُٹھیں گے ان کی زبان ہی دیہاتی ہوگی، اور یہی دیہاتی اردو ادا  
ہندی کے وقت ضائع کرنے والے نیز ملک میں فتنے برپا کرنے والے  
بہل مباحث کا خاتمہ کر دے گی۔

جہاں تک ہندی زبان کا تعلق ہے ہم اس کام کو کسی دوسرے  
اپنے ہندی ادیب بھائی کے لئے چھوڑتے ہوئے اردو کے متعلق یہ غور  
کرنا اور جانچنا چاہتے ہیں کہ تیرہ دہائی کی زبان سے دیہاتی زبان کو کتنی  
قرابت یا دوری حاصل ہے، اس بات کی جانچ کے لئے مندرجہ ذیل تیر  
کے اشعار ضرور ہماری رہ نمائی کرتے ہیں۔

دل کی ویرانی کا کسب اندہ کر رہے یہ نگر سومرتبہ لوٹا گیا  
پتہ پتہ بوٹا بوٹا حال ہمارا کیا جانے ہے  
جانے نہ جانے گئی نہ جانے باغ تو سارا بچو  
جھکی کچھ کہ دل میں جھکی کچھ، بی ٹانگ کہ دل میں کچھ کچھ

یہ جو لاگ ملکوں میں اٹکی ہے، نہ پھری میں ہے نہ لگا میں  
گئے دن ملک کی باندھنے کے اب انگلیں رہتی ہیں دو دو پہر بند  
میں نہ آتا باغ میں اس بن محبو مل پکار لاتی ہے  
عہد جوانی درود کا ٹاپری میں میں انکھیں موند  
میں رات بیت تھے جاگے، صبح ہوئی آرام کا

ہوگی شہر شہر رسوائی اسے مری موت تو سبھی آئی  
دل وہ لگ نہیں کہ پھر آبا دہ کے بچنا دے، شہنہ ہو سیتی اجاڑ کر  
یہ بھی میرتبہ خبر جو روتا رہے گا تو بس یہ کہہ کہ سوتا رہے گا  
قالی کے شہنہ زمانہ سمس کے چند بند بھی یہاں درج کئے  
جاتے ہیں۔

بڑے اُن یہ وقت آکے بڑے لگے اب وہ دنیا میں بس کہ بڑھنے لگے اب  
بھرے اُن کے میٹے اُڑنے لگے اب بنے ستے وہ جیسے بڑھنے لگے اب  
بہن، بھتیجاں مل گئیں لہلہا کر  
نکلتی نکلتی ایک عالم یہ چھا کر

اور بھوپال والے یہاں، کہ یہاں، حیدرآباد والے قتیہ کو خیمہ کھیں گے،  
اسی طرح باغ کو باگ، شہر کو شہر، عاشق کو عاشق، دیہات والے  
بوٹے ہیں، صرت فرق یہ ہے کہ وہ جو بوٹے ہیں وہی کھیتے بھی ہیں، اور  
دوسرے اب نہیں کرتے۔ پھر ان الفاظ کی کثرت جو ہر جگہ بھاشا میں  
مل کر اُس کو اردو زبان کہلاتے ہیں، اس دیہاتی میں بھی اسی طرح ہے،  
جس طرح روزمرہ کی بولی جانے والی زبان اردو میں ہے۔

آزادی وطن کے تصور کو عام اور رائج کرنے کے لئے ہمارے  
ملک میں آج بڑی جدوجہد ہو رہی ہے، اور تمام اہل الرائے اس حقیقت کو  
تسلیم کرتے ہیں کہ جب تک ہندوستان کے دیہات اس جدوجہد میں سر  
گرم حصہ نہ لیں گے، ملک میں جس انقلاب کے برپا کرنے کے وہ آرزو مند  
ہیں نہ ہو سکے گا۔ نیز یہ کہ وہ اس جدوجہد میں اس وقت تک حصہ نہ لیں گے  
جب تک وہ ہندوستان کے ملکی استعمار اور اس کے اقتصادی و سماجی  
مسائل کو نہ سمجھیں گے اور ان کی حقیقت سے پوری طرح آشنا نہ ہو جائیں  
گے۔ اس لئے انقلاب پسند، صلحین، اور ہر قسم کے ترقی پسند خیالات  
کے لوگ، مجبور ہیں اور آئندہ اور زیادہ مجبور ہوں گے کہ دیہاتوں میں  
پہنچ کر ان مسائل، اور ان مسائل سے سیدھا سادہ دیہات کا  
تعلق ان پر واضح کیا جائے، اُس وقت ان کی حقیقت معلوم ہوگی  
کہ دیہات والے جو زبان بوٹے ہیں، اس کو وہ نہیں جانتے یا بہت  
کم سمجھتے ہیں، لیکن وہ خود جو زبان بوٹے اور لکھتے ہیں خواہ وہ اردو  
ہو یا ہندی، اس کو اہل دیہات سمجھنے سے قاصر ہیں، اس کا علاج ہو سکتا  
ہے کہ وہ یہ بتائیں کہ تمام شمالی ہند کے دیہاتیوں کو ہندی یا اردو  
پڑھنا اور سمجھنا سکھانے کا پلے کام کیا جائے، تاکہ وہ ہمارے ادیبوں  
کی زبان سمجھ لیں، لیکن غاہر ہے کہ موجودہ حالات میں اس علاج سے  
جلد کوئی نتیجہ نہیں نکل سکتا، ممکن ہے اور سو دو سو سال کی کوشش کے بعد  
ہم اس کوشش میں کامیاب ہو سکیں، مگر اُدی تو یہ اندیشہ ہے کہ اس وقت  
تک ہماری موجودہ ادبی زبانیں یعنی اردو و ہندی کہاں تک اور ناقابل  
فہم بن چکی ہوں گی، دوسرے ملک کے جو اقتصادی و سیاسی حالات  
آج کل ہیں، ----- ان کا  
یہ انتضا باطل نہیں ہے کہ یہ ملک اور تو کچھ پچاس برس بھی بغیر ملکی استعمار

یقیناً ان اشعار سے ہم اس نتیجے پر نہیں لگے کہ دیہاتی شاعری کے پیچھے بیان کے ہونے نغزوں اور سرور و محالی کے اشعار میں زبان کے لحاظ سے صرف اس قدر فرق ہے کہ جو ایک دیہاتی اور شہری کی روزمرہ میں آج بھی ہے، لیکن وہ ایسا فرق نہیں جس سے کوئی یہ کہہ سکے کہ یہ دو مختلف زبانوں کا کلام ہے۔ بلکہ کیا اقبال اور دوسرے شعرا کے کلام کو دیہاتی زبان سے وہی نسبت باقی رہ گئی ہے جو سرور و محالی کے کلام کو ہے۔ چنانچہ چند اشعار حضرت اقبال کے بھی ملاحظہ ہوں۔

کبھی اسے حقیقت منظر نظر آلباس میں مجاز میں  
کہ ہزاروں عجبے تپ رہے ہیں مری جبین نیاز میں  
تجھے کیا بتا یے ہم نشین ہیں موت میں جو مزا ملا  
نہ ملامت و حفر کو بھی وہ نٹ طعمر دراز میں

زمانہ آیا ہے بے جا بے جا کا عام دیدار یا رہو گا  
سکوت متا پردہ وار جس کا وہ راز اب آشکار ہو گا  
دیا بر مغرب کے رہنے والو خدا کی بستی دکھان نہیں  
کھرا ہے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زہر کم عیب رہو گا

محل ایسا کیا تعمیر غری کے تخیل نے تصدیق جس پر حیرت غازیں و غازی  
فضائے عشق میں تعمیر کی اُس نے فوایدی میسر جس سے انھوں کو ہر تباہی و تباہی  
فنائن نمشب شاعری کا بارگوش ہوتی ہے گراں ہے شب پر تنوں کو کھو کی آسماں تابی  
دیکھتا کیا ہوں کہ وہ پیگ جہاں پایا خضر جس کی سیری میں ہے مانند سحر رنگ شبا  
کہ رہا ہے مجھ سے لے جوئے اسرارانی چشم دل وا ہو تو ہے تقدیر عالم بے تبا  
حضرت اقبال کے ان اشعار سے ہم خود اس نتیجے پر نہیں لگے کہ شاعر  
کوشش کر رہا ہے کہ عام فہم سلیس زبان میں اہل ریاضی کے خود عوام کی زبان کو  
سخت اور پاکیزہ بنانے کے بجائے بے خبر خواص کی زبان کو سبھی (جو عوام سے  
بالکل دور ایک علیحدہ طبقہ بن گیا ہے) عوام کی زبان سے دور کیا جائے، لیکن  
یہ کوششیں ہر گز خوش آئند نہیں ہیں، وہ وقت بہت جلد آئے گا جب عوام  
و خواص میں اقتصاد کی یک رنگی کے سبب معاشرتی برتری اور تفوق کا خاکہ  
ہو جائے گا، تو اس وقت طبقہ خواص کی وہ سب یا دگاریں بھی فنا ہو جائیں گی  
جو عوام سے اُن کو دور کئے ہوئے ہیں۔

کے ٹیٹا اگر اب اوغیب کراتی ہو داں سے نظرساری دنیا  
چڑے اس پر پھراک خردمند دانا کد قدرت کے دھلک کا دیکھے تماشا  
تو قوموں میں فرق اس قدر پائے گا وہ

کہ عالم کو زیر و زبر پاے گا وہ  
دہ دیکھے گا ہر ہزاروں جہن داں بہت تازہ تر صورت باغ و صواں  
بہت اُن سے کتر پہ سر سبز خداں بہت خشک اور بے تراوت لگاں  
نہیں لائے گو برگ دبار اُن کے پودے  
نظر آئے ہیں ہر بنا ر اُن کے پودے

پھر اک باغ دیکھے گا اجڑا سراسر جہاں خاک اڑتی ہے ہر سو برابر  
نہیں تازگی کا کہیں نام جن پر ہری ہنسیاں جھڑکیں جن کی جل کر  
نہیں بھولی، پھل جن میں آئے کے قابل  
ہوئے رُوح کہ جس کے جلانے کے قابل

جہاں آگ کا کام کرتا ہے باران جہاں آگے دیتا ہے زو ابر نیساں  
ترد سے جو اور ہوتا ہے ویراں نہیں راس جس کو خزاں اور بیدار  
یہ آواز پیچیدہ دیاں آرہی ہے  
کہ اسلام کا باغ ویراں بھی ہے

اگر کان دھر کر نشیں اہل عبرت تو سیوں سے تے تاب کشید و تربت  
زین، موکو، بن، پچول ریت اور پرت یہ فریاد سب کر رہے ہیں جسرت  
کہ کل فخر متا جن سے اہل جہاں کو  
لگا اُن سے عیب آج ہندوستان کو

گڈریے کا وہ حکم بردار گستا کہ بھیلوں کی ہر دم ہے رکھال کوتا  
جو ریلوئیں ہوتا ہے پتے کا کھڑکا تو وہ شیر کی طرح بھرتا ہے بھیہرا  
جو انصاف کیجے تو ہے ہم سے بہتر  
کہ غافل نہیں فتن سے اپنے دم بھر  
ایک غزل کے یہ دو شعر بھی سنئے:-

کھیتوں کو دے لو پانی اب پہر رہی ہے گنگا  
کچھ کرو تو جو اناں آستھی جو انبیاء ہیں  
علم و ہنر بڑے کی گرم میں ہوں تو جا میں  
گر یہ نہیں تو بابا وہ سب کہاں ہیں



اور آخر کار اس کا مطلوب چھوڑ کر کے درخت کے نیچے اُسے سوتا ہوا پا جاتا ہے۔ چھوٹکا درخت رگستان میں علاقوں میں بولے سے ملتا جلتا ہوتا ہے جو کال میں بہت پھلتا ہے، اب دیوے چھوٹکے سے غماص ہو کر ایک دو ہا کھتا ہے۔

دو ہا

جنگل کے رے چھوٹکا تری جڑا جانیو پاتا ل  
تو نیچے ڈھولا ملا، تو سلیو کال دو کال  
"یعنی اسے جنگل کے چھوٹکا تیری جڑیں پاتا ل تک جانیو غیب ہوں  
تیرے نیچے ڈھولا جی مل گئے، خدا کے ہمیشہ خط دے خط پہن سون غیب  
کرے؟"

میوات کا تیسرا ٹکڑے ٹکڑے میوات کا میوات گورڈ کا ڈھ کا رہنے  
والا ایک الیہ شاعر ہے۔ لیکن اس کا کلام بالکل ہلکا ہے الیہ شاعر  
مختلف ہے۔ اپنے باپ اور بھائی کے مرے کے بعد کہتا ہے۔

دو ہا

بھائی مرے تو بول گئے، پتا مرے پت جانے  
سند سوتا جانیو رے کئے ماوین مرے مانے  
"یعنی اگر بھائی مرے تو خاندان کا زور ٹوٹ جاتا ہے، اور  
اگر باپ مرے تو خاندان کی آبرو کم ہو جاتی ہے، لیکن اسے لکھتے ہیں  
دن ماں مر جانے تو ساری دنیا منساں سمجھیں؟"  
بٹیا عالم سکرات میں ہے بے قرار باپ کس طرح اس کا اٹھار  
کرتا ہے۔

دو ہا

تختہ تو ڈھیلے ہوئے چرخین لاگی کبیریل  
گدھے کے گھیرے ہوئے رے کئے کوئی پیر دوپہر کے پھیل  
کہتا ہے کہ تختہ یعنی جسم تو ڈھیلے ہو چکا اور بیکس ڈھیلے ہو کر بولنے  
لگی ہیں (یہ اشارہ سانس کی آواز کی طرف ہے) اسے لکھتے قلعہ بھر چکا ہے  
اور پیر دوپہر میں سر ہونے والا ہے؟  
آخر قلعہ سر ہو جاتا ہے۔

بھئی تو بیکس پڑے، منڈے پڑے انظار  
اہرن میں کھر کا نہیں بنے ککے گئے ہمار

اس میں کامیابی ہوئی تو سہر کوئی وجہ نہیں کہ آج اس سہر زبان میں شعر نہ کہا جاسکے  
جس میں فارسی عربی الفاظ کی بھی آمیزش ہو۔

اب رہا یہ سوال کہ دیہاتی زبان سے ملتی جلتی صاف زبان میں بند  
پردازی کی گنجائش نہیں۔ اس کا جواب ہم چند دیہاتی زبان کے بند خیال شعرا  
کے مندرجہ ذیل کلام سے دیتے ہیں۔

شہنشاہ اکبر کے ہند کا میواتی شاہو سدا آند جو موضع آکڑہ منیع  
گورڈ کا ڈھ کا باشندہ ہے۔ اپنے مودوں چک مل میو کے جو دو کرم کی کس  
انداز میں مستائش کرتا ہے۔

دو ہا

اندہ کی اور چک مل کی نت بنت کیجے آس  
اندہ برے چار بیٹے چک مل برے ہارہ ماس  
شاعر کہتا ہے کہ دنیا میں دو مختار ہیں اندہ بارش کا دیوتا اور دوسرا  
چک مل جن سے ہر دم امید رکھنی چاہیے۔ مگر دونوں میں فرق یہ ہے کہ اندہ  
صرف ہار بیٹے پرست ہے اور چک مل کی بارش جو دو کرم بارہ بیٹے ہیں،  
عین حق پرست گورڈ کا ڈھ کا دوسرا میواتی شاعر ہے جس نے ڈھولا  
کو نظم کیا ہے۔ ڈھولا جو جن کے بیٹے کی شادی پیدا نش سے پہلے ہی چک مل کی  
آئی تھی کہ ایک مالی کی لڑکی ریوے سے عشق ہوا اور بڑی خوشامدوں اور  
قول و قرار کے بعد شادی بھی ہوئی۔ ریوے کے عشق میں مدتوں ڈھولا جی  
اپنی اصلی مانگ کو بھولے رہے۔ آخر جب وحیان آیا تو ریوے سے چپ کر  
پہل دیں کی راہ لی۔ ریوے جو خود ڈھولا جی پر فریفتہ تھی ڈھولا جی کے نقاب  
میں ان کے اوٹ کے نقش پابروا نہ ہوئی، شدت کی گرمی نے آخر بہت  
پرست کر دی، اب شاہو اس کے منہ سے یہ دو ہا کھلاتا ہے۔

دو ہا

فیروں تو من سے نہیں، روؤں تو لاج بھی مروں  
پیارے کے کونج کی میں چن چن گو د ہی بھروں  
تینی چاؤں تو وہ من نہیں سکتے، روؤں تو شرم آتی ہے۔ بہتر یہ ہے  
کہ پیارے کے نقش ہاکی من سے ہی چن چن کر گود بھروں؟  
اس کے بعد جذبہ شوق پھر بہت بندھا ہوا ہے، اور وہ پھر مل پڑتی ہو

میں اگر آگ لگ جائے تو سمجھا لوں، لیکن خواہشات کی آگ کس طرح بجھاؤں، جو گوشت پرست مل جانے کے بعد بجھ رہی ہے، اسے میرے دوست، اے کیسے جیتے ہیں، جن کے دل میں ہر وقت خواہشات پیدا ہوتی رہتی ہیں؟  
مومن انکھیر نوح دہلی کا شاعر انت کمال مندرجہ ذیل سخن میں شاعرانہ استعارات سے کس لاف کے دردناک مصائب بیان کرتا ہے اور کہتا ہے کہ پریش کے متعلق یہ خیال کہ وہ ہماری ان مصائب سے خلاصی کرے گا اس وقت پیدا ہوتا ہے جب ہم مایوسی ہر طرے سے ہوجاتی ہے، اور کسان اس وقت بھی مشتتب ہی رہتا ہے

بجھن

ٹیک۔ مرے ہم کیوں نا دکھیا دین کس

جب چوڑے دھکے بال ہمارے اور اُمنڈ رہے  
کوئی برا نہیں جو انھیں ہمارے، اُمنڈ اُمنڈ کر کھنڈ رہے  
گرج گرج کر شور مچا دیں سس سس کر ہم ڈر نہ لگے  
دھک دھک دھک دھک کے سہ سے بنا موت ہم مرن لگے  
جب کوئی نہیں سہارا دیکھ، دھیان ہری کا دھرن لگے  
شاید رکھنا کرے ہمارے دین بندھو بھگو ان

مریں ہم کیوں نا دکھیا مرے دیں کسان

اس کلام سے جو سننے اور خوارے ہے، ہمارے ادب اندازہ لگائے  
ہیں کہ سہل نگاری بلند خیالی کے لئے روک نہیں بن سکتی آخر تبر و محاک کے لئے  
بھی تو وہ روک رہیں سکتی۔ ہیں یہ مکر و عنف کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ  
جو ادب لمبہ خواص کے لئے مخصوص کیا جا رہا ہے اندیشہ ہے کہ اس کا اثر  
بھی وہی نہ ہو جو قصبات کے ڈوم ڈھار لوں کا ہوا ہے کہ آج جب دولت  
اُن کے بجاؤں کے ہاں سے رخصت ہو گئی ہے اور وہ غریب ہو گئے ہیں  
تو وہ بچا ہے بھی بھیک مانگتے در بدر پھر رہے ہیں اور کوئی اُن کا پرسان  
حال نہیں۔

سید مظہری فسرید آبادی

مئی آرڈر سمجھو اسے اصحاب اپنا پورا نام و پتہ مئی آرڈر خادم کی کوپن پروفورم دیکھو

کہتا ہے کہ بھئی یعنی ہم سرد ہو چکا، اور وہ آگ جو اسے گرم کرتی  
میں بج چکی ہے، اہرن (یعنی نہیں) میں اب کچھ تم کی کھٹ کھٹ کی آواز  
نہیں آرہی ہے۔ خدا جانے لوہار کتنے ٹوسے سے جا چکے ہیں؟  
حسن کھٹکی منٹ مفلخرنگر کا شاعر جس کی کھٹکیاں بہت شہوہیں،  
دلی آکر حق خریدتا ہے، جتنا بھی میں تازہ کرتا ہے، اب ذرا اس کی واردات  
کئے،

دلی شہر سے حق لینا پیسے دینے سٹھی بھر  
جنا جی میں گلا دینا حق بچا دو لڑیں پڑ  
آگ ڈھاک کے کٹے بنائے کٹ اٹھتی ہے نیلوفر  
حسن کھٹکی کھٹا کر اجانے اب کے حق پھر بھی بھر  
دوسری کھٹکی کھٹے۔

آدمی رات نگر پر آئی تو بھی مٹی جاتی ہے  
حسن کھٹکی کھٹا کر اجانے موت بھی کوئی ہے  
برج کا شام گرم کھٹکے مائے حق کو بُرا سمجھتا ہے اس کی وجہ وہ بنا  
کر کے انہیں پرکھتا ہے کہ کھٹکے نہیں سکتا۔

نکلتے سے خرم کئی تو نیم دھرم گئے چھوٹ  
ناچ بچ تبا کو لینا گئی جینے کی چھوٹ  
گئی پینے کی پھوٹ آگ کو کھیر گھر ڈوٹ  
جا گھر جاوے وہی نارسیہ زکرا بوسے  
کہیں گرم کھٹکے رائے کرم کے کھٹکا  
جان جائے تو جائے جھبی جھوٹے کھٹکا

یہی شاعر ایک اور کھٹکی میں بیان کرتا ہے، کہ خواہشات کی  
غلامی موت کی نشانی ہے۔  
آگ لگی تن جو ان میں تو دوں لاگی بجھا  
جو ان میں مل جائے رہے پھر کی کھٹکی  
وہ تل کیسے جیوں جن کو نت بیلے پھینا  
کہتا ہے کہ تن جو ان (وہ درخت جس کی لکڑی آگ کو بہت جلد پکڑاتی ہے)

# اے چاند!

اے چاند تیرا چہرہ کیسا اتر رہا ہے؟ تجھ پر بھی کوئی شاید بیدار کر رہا ہے  
 ماندے تھکے مسافر، عازم ہے تو کہاں کا سنان راستوں سے تنہا گزر رہا ہے  
 نقش قدم نہیں ہے، یہ رنگِ ناتوانی: ہے آفریں کہ پھر بھی گرم مغر رہا ہے  
 کرنیں نہیں ہیں تیری، ہیں آنسوؤں کی لڑیاں بکھرا رہا ہے موتی اور دل بکھرا رہا ہے  
 بے خواب تیری آنکھیں ہیں منتظر کسی کی محوِ خبر رہا ہے گوبے خیمہ رہا ہے  
 خاموشیوں میں تیری گفتار کا ہے عالم کس کا جالِ رعنا پیشِ نظر رہا ہے  
 عاشق ہے تو بھی شاید میری طرح کسی پر محزونِ دول گرفتہِ جورات بھر رہا ہے  
 آ، تیرا غم بناؤں، مجھ سے نہ بدگماں ہو

میں تیرا راز داں ہوں، تو میرا راز داں ہو

تیرے دیار میں بھی کیا جرم ہے محبت وہ جان کے ہیں دشمن جو دل کا مدعا ہیں  
 معدوم ہے وہاں بھی کیا رسم و نوازی آزار کے ہیں درپے جتنے بھی ڈل رہا ہیں  
 خواہش تو یہ کہ اُن سے کوئی کرے محبت دل لے چکے تو ہر دمِ آما و دُحُف ہیں  
 ابر و کا یہ اشارہ، ہم تیرے، تو ہمارا آنکھیں نہ بھر ملائیں، اس درجے و فائیں  
 یا شوخیاں کہ جن سے شوخی پسند مانگے یا مثلِ غنچہ کیسراک سپیکر حیا ہیں  
 دیکھو تو اُن کو دیکھو، چاہو تو اُن کو چاہو خوش چشم و خوش ادا ہیں، پر تہر ہیں بے لایا ہیں  
 سمجھے ہوئے ہیں خوبی، عاشق کا دل دکھانا اس طرز اس ادا کے تیرے بھی آشنا ہیں

غمِ آشنائے دل ہے، سن لے مرافقا

دُکھ درد کی کہانی، بیدار کا فناء

اے چاند تیرا چہرہ کیسا اتر رہا ہے!

اشرف الہنوی

# شیطان کی حکومت

م - ح

شیطان تاج کیانی سر پر کئے موتیوں میں گندھی ہوئی ردا و دوش پر ڈالے نو دار ہوا۔ طاغوت نظریں جھپکائے، ٹھٹھکی ہوئی کمانوں کی طرح ڈوہرے ہو گئے پھپھپائییاں، گھینگھمکے، سارباں، پانچے اور گاڈن گھنٹوں کے پاس سے دولوں ہاتھوں کے سہارے پھیلا کر انڈے پر بیٹھے والی مرغیوں کی طرح، زمین دوڑ ہوئیں، اور شہنشاہ کے گردن ہلا کر سلام لینے پر سنبھل کر کھڑی ہو گئیں، انہیں نے تخت پر بیٹھے ہوئے ہاتھ کے اشارے سے سب کو بیٹھ جانے کا حکم دیا، اور سب گردن جھکائے، اپنی اپنی نشست پر بیٹھ گئے۔

طاغوتوں میں سے ایک جس کے چہرے بھر پر بال ہی بال تھے، لگجس کی چند یا سیکڑوں برس کے مڑے کی کھوپڑی کی طرح سپید و صاف تھی، اٹھ کر اہو گیا،

شہنشاہ نے پوچھا: وزیرِ فہم، کیا تمام ملک کے عائد واکبر و حکام آگئے؟

اُس نے دستِ بستہ عرض کی: جہاں تباہ: سب حاضر ہیں؟

شاہی حکم ہوا کہ ایک ایک کر کے رپوڑیں پیش کی جائیں۔

وزیر نے سب سے قریب والے ابلیس کی طرف دیکھا، اس نے اپنی جگہ سے عیوہ ہو کر پہنچے تو شہنشاہ کو ایک سجدہ لفظی کیا، پھر سیدھا کھڑا ہوا۔

لبِ خسروی کو بخش ہوئی، کہو تباہ سے مالک کی کیا حالت ہے، لارڈ ڈیول؟

لارڈ ڈیول نے بیوی نے انداز سے گلے صاف کر کے کہا: جہاں تباہ: اچھے خوف

ہے کہ جو خیر میں شہنشاہ والا ہوں، اسے جہاں تباہ مسرت سے نہ سن سکیں گے۔

مضامین اب کے چہرے پر بگی سٹیشن پر لگی، سارے دربار کی ہر چیز پر سیاہی

شیطان دربارِ ساجہ برامتا، یورپ و ایشیا، امریکہ و افریقہ، روم و شام، چین و جاپان، ہر جگہ، ہر ملک اور ہر خطے کے ابلیسوں اور طاغوتوں کے عائد واکبر، رؤسا و امرا، لیڈر اور گورنرز کی زرنگار پر بڑی رعوت و جعفر سے تھکن تھے، کسی کا چہرہ ہاتھی کا سا تھا تو کسی کا مور کا سا اور کسی کا بھالو کا سا تھا تو کسی کا گڑے کا سا۔ مگر بائیں صورت ہر ایک مرغِ ذہن بناتا، اٹلس و جریڈیم جیم، الماس و گہر زینت دست و گلو!

ان سے تھوڑی بلندی پر، مگر باطل مقابل، جین سے حسین مرجینوں کی قطار در قطار بیٹھی تھی، ہر ایک کی آنکھوں میں ہلاکی لگاوت، ہر ایک کے لبوں پر سکھرن سکھارٹ اور ہر ایک کی بوٹی بوٹی پھرتی ہوئی، غمزہ و دادا پس پشت کھڑی مروجہ مینائی کر رہی تھیں، اور نفسانیت و ابلیسی لبوں میں ہستادہ طر پاشی میں مشغول تھیں۔

نیچے بیٹھے ہوئے طاغوت استیں لچائی ہوئی نظروں سے دیکھتے اور اشاروں ہی اشاروں میں جانِ نزاری کا یقین دلاتے تھے۔ مگر وہ ان کا ہیولی دیکھ کر کبھی طنز سے ہنستی، کبھی شہنی سے آنکھیں مارتی اور کبھی حقارت سے اپنا سین ٹھینکا دکھا دیتی تھیں!

اتنے میں بیچ میں سب سے بلندی پر رکے ہوئے سونے کے قریح تخت کے پیچھے کا زرد تار پردہ ہلا۔ حاجب نے تین بار مینا کا رنگ گجھی فرسٹ پر عصا مارا۔ پھر آواز دی: نگاہ رو بردو! خداوندِ زمین و زمان حضور شاہِ عالم! سامانِ سر و قد تسلیم کے لئے کھڑا ہو گیا، پردہ ہٹا اور آبِ انبساط،







جاتے ہیں جن کا ذکر کرتے ہوئے مالک کے سسے میں کیا ہے۔

مسٹر ڈالر کا چہرہ سُرخ ہو گیا۔ مگر قبل اس کے کہ وہ کوئی جواب دیں کامیونٹ سٹینڈنگ اُٹھ کھڑا ہوا، اور کہنے لگا۔ عالی جاہ! مجھے ڈالر کے خیالات سے اتفاق ہے اور ڈالر کے جس خطرے کا اظہار کیا ہے وہ یقینی امر یکہ میں موجود ہے۔ مگر میرے فوری دوست مسٹر ڈالر نے اس طرح دلوں پر سکہ چار کیا ہے کہ سارے جذبات اخوت و مساوات و حریت بجائے ہیں نقصان پہنچانے کے خاص ہمارے اُکھا بن کر رہ گئے ہیں۔ اور حضور اس کا یقین رکھیں کہ مستقبل قریب میں ہی نہیں بلکہ مستقبل بعید میں بھی امریکہ کی ساری جنگیں محض تجارتی جنگیں ہوں گی اور اس کا مقصد انسانیت کا فروغ نہ ہوگا، بلکہ صرف حصول زراعت اور اپنے لئے منڈیاں بنانا۔ کامریڈ اپنی جگہ پر سکہ اُڑا اور لاڈ ڈالر کے حمل اور نقصان ہو کر میٹ ہو گئے۔

مسٹر ڈالر نے جوش سے کہا۔ حضور! کامریڈ کی تقریر کے بعد مجھے کچھ کہنے کی ضرورت باقی نہیں رہی، میں صرف اتنا عرض کروں گا کہ مالک امریکہ میں سرکاری فتح کا ذمہ دار ہیں اور حضور کے اقبال سے ابھی صدیوں ہماری فتح ہو کر رہے گی!“

شیطان نے خوش ہو کر کہا۔ شاباش! شاباش! بھیکو پی جیتے دے لے تیرہ پسند ہیں۔“

مسٹر ڈالر نے جھلک کر سلام کیا اور اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔

وزیر اعظم نے کھڑے ہو کر آدھری مہر لکھنی نصیحت پاشا:۔

ایک عفت اُٹھ کھڑا ہوا، جس کی صورت باطل بڈاگنے کی سی تھی، اُس نے تعلیم سے دہرے ہو کر کہا۔ آب الشیاطین: میں حضور کی پرورش سے مغربی ایشیا کا حاکم ہوں، ساری روان کی رپورٹ میں سوائے افسوسناک دنیا کے بیان کے اور میں کچھ نہیں پیش کر سکتا۔ میں بیت خائف ہوں کہ میں سوائے ایک خاص امید کی جھلک کے جس کا ذکر میں بعد میں کروں گا اور کوئی امید اپنے مقاصد کی تعلیم کی نہیں پاتا زکی میں مسئلے لال کی پالیسی، ایران میں رعناہ پہلو کی پالیسی، مصر میں خاص پاشا کی پالیسی ہمارے اقتدار کا سرسخت کر رہا ہے، پھر یہ جو اسلامی مالک میں اتحاد و اتفاق کے ميثاق و معاہدے ہو گئے ہیں انہوں نے ہماری کارروائیوں پر ضرب کاری لگا دی ہے، اخوت اسلامیہ اور عام ہمدردی کا خیال بڑھتا جا رہا ہے، اکثر مذہبی پیشوا جو ہمارے خاص کارہارہ ہیں، روز بروز ان تمام مالک میں شک کی نظروں سے دیکھے جاتے

سرشار ہے۔ کہنے کے لئے ان مالک میں حریت و آزادی، اخوت و مساوات سب کچھ ہے۔ مگر میں سرکار کو یقین دلاتا ہوں کہ یہ سب میری محبت کے نتائج ہیں۔ اس دعوے کے ثبوت میں صرف دو باتیں مثلاً پیش ہیں۔ ان مالک میرے دوسرے میں صرف دو شہروں کی عام زندگی پر غور کرنا کافی ہوگا۔ ایک تو شکاگو، دوسرے سین فرانسسکو، اگر ان دونوں شہروں کے واقعات نقل کی فہرست تیار کی جائے تو یہ امر واضح ہو جائے گا، کہ حصول زر کی ہوس میں جتنے خون امریکہ کے ان دو شہروں میں ایک سال کے اندر گئے جاتے ہیں اتنے اس مدت میں مشرق و مغرب کے اکثر پورے پورے مالک میں نہیں واقع ہوتے، دوسری بات جو اپنے دعوے کے ثبوت میں پیش کرنے والا ہوں وہ ان مالک کے جھگڑوں کی حالت ہے، حضور سے پوچھنا نہیں کہ ایک زمانہ میں ہمارے گردہ کا ایک ہیٹ بڑا دشمن اس نام نہاد جہوریت کا صدر رہ گیا تھا اور اس نے غلامی کے سارے ذریعہ مسک کا خاتمہ کرنا چاہا، اول تو حضور کے اقبال سے ہم نے ایک خانہ جنگی کے ذریعہ اس مسئلہ کو اتنی طوالت دی کہ لاکھوں جانیں گئیں، اور پھر جب ہمیں شکست ہو گئی تو ہم نے سفید فاموں کے دلوں میں جذبہ غنا و سخاوت کو اس طرح مشتعل کیا کہ وہ ایک خفیہ انجمن، کھڑکھلاں کے نام سے قائم کرنے پر مجبور ہوئے۔ حضور کے خادم کو اس بات کا فخر ہے کہ وہ انجمن اب نکمہ اپنی پوری طاقت کے ساتھ قائم ہے۔ گو وحشی غلام کے لفظ سے نہیں یاد کئے جاتے مگر حقیقت میں سفید فام قومیں انھیں غلاموں سے بدتر سمجھتی ہیں، اور کھوکھلاں کے والے اس سے باطل اسی طرح کا سلوک کرتے ہیں جس طرح کا سلوک شکاری جنگی جاؤر کے ساتھ کرتے ہیں، جہاں تباہی میں زیادہ تفصیلات میں نہیں جانا چاہتا، مگر سرکار کو اس کا یقین دلانا چاہتا ہوں کہ جب تک اس ناپائیدار کسلہ ان مالک والوں کے دلوں پر ہے اُس وقت تک آدم کے خدا کی ساری قوتیں ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں!“

لاڈ ڈالر نے اپنی جگہ پر کھڑے ہو کر کرنی ہوئی آواز میں کہا۔ حضور عالی مجھے افسوس ہے کہ میرے دوست مسٹر ڈالر نے غالباً اس دربار کی فضا سے متاثر ہو کر تصویر کا صرف ایک ہی رخ پیش کیا ہے وہ اس عام جذبہ ہمدردی و انسانیت و مساوات کو نظر انداز کر گئے جو جدید امریکہ میں روز بروز متاثر ہے اور جس سے اسی طرح کے خطرات پیدا ہوتے۔

اور اُس کی ایک جماعت سے جس کو لوگ کانگریس کہتے ہیں، کسی مذہک برہما تھا، مگر ہم نے اس کی قوت میں جھوٹ اور احمیت کا سوال پیدا کر دیا ہے، ہندو ہمسایہ اور مسلم لیگ کی کسی دو متعصب جماعتیں کھڑی کر دیں، پھر ان کانگریسوں کو بھی ایسا پسند دیا ہے کہ انہوں نے حکومت کے لالچ میں ذاریں قبول کر لیں، اب وہ بھی کسی طرح بس ہی نہیں سکتے۔ پھر جعفر کی دعا سے اس ملک کے اکثر ہندو پنڈت اور مسلمان مولوی ہمارے خاص آلا کار ہیں۔ جب کہنے مسجد کے سنگے باجہ بجانے اور کمرے کی جگہ گائے کی قربانی پر گھر جلا دے جائیں، عورتیں بے عصمت کر دی جائیں اور بچوں کی ٹانگیں پکڑ کر انہیں پتھروں پر باطل اسی طرح مار دیا جائے جس طرح دھوبی اپنے پٹے پر کپڑے دھو دیتے ہیں، اُن دنوں یقین رکھیں جب تک ہمارے دل میں پنڈت اور مولوی موجود ہے اس وقت تک ہم کو آدم کا خداذیر نہیں کر سکتا، ہم اُن میں آپس میں دوستی جوڑنے دیں اور نہ بھائی چارہ، وہ ہمیشہ ایک دوسرے کو کافر اور ملعون ہی کہیں گے! اور ہمیشہ ہندوگان حضوری کی جیت ہوگی!

شیطان ہمارے خوشی کے تحت سے اُٹھیں پڑا، سارا عمل اس طرح ہلنے لگا کہ جیسے زلزلہ آیا ہو۔ میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے دیکھا کہ مولوی صاحب مجھے جھنجھوڑ کر جگا رہے ہیں کہ "اُسٹو مان ز پڑھو۔" میں نے کہا "لا حول ولا قوت۔" اور وہ کمرے سے جلدی سے بھاگے۔ اور پاپ کے نیچے جا کر دھنوک کر گئے!

شیطان کی شہنشاہی سے جس طرح  
میلانی پھیلنے کی شہنشاہی سے جس طرح  
سلحہ تالاب کی لپٹنے میں علتیں بار بار  
نہیں ملنے کی لپٹنے میں علتیں بار بار  
نہیں ملنے کی لپٹنے میں علتیں بار بار  
نہیں ملنے کی لپٹنے میں علتیں بار بار  
نہیں ملنے کی لپٹنے میں علتیں بار بار  
نہیں ملنے کی لپٹنے میں علتیں بار بار  
نہیں ملنے کی لپٹنے میں علتیں بار بار  
نہیں ملنے کی لپٹنے میں علتیں بار بار

گئے ہیں اور حریت و آزادی کے نعروں نے ہماری آوازوں کو دبا دیا ہے۔۔۔۔۔  
شیطان نے گریچ کر چھپا۔ اسے میاں کوئی اچھی خبر بھی سننا ڈگے یا شروع سے آخر تک روکنے ہی جاؤ گے! پاشا ہنگو پیچھے ہٹ گیا، اس کے زرد چہرے سے پسینے کے قطرے ٹپکنے لگے، وہ کانپتی ہوئی آواز سے بولا۔ "بھئی چہا تباہ! امید کی ایک جھلک ضرور ہے، ابھی تک باوجود کوششوں کے یہ تمام مالک یورپین مالک کے اثر و نفوذ سے باہر نہیں ہیں، نہ تو مصر آزاد ہے، نہ حجاز آزاد ہے، نہ شرق اردن اور نہ عراق دین، ہر جگہ ہمارے آدمی کام کر رہے ہیں، اور لاڈ ڈیول اور کین فرسٹ کی مدد سے ہیں اب تک بڑی بڑی امیدیں ہیں، مصر میں ابھی ہم نے محاس پاشا کا تختہ الٹ دیا، ہم نے فلسطین میں ایک بیگہ ہمارا کھا ہے، انسان پھیر اور مکمل کی طرح ہمارے جارے ہیں اور ہم یقین ہے کہ اگر سرکاری اقبال ہمارے شامل حال رہا تو قیمت بھی جلد ہم عرب کے رقبہ تانوں کو اتنی فتن سے بچھ کر ایسا سرسبز و شاداب مزارعہ بن کر دیں گے جس میں طاغوتیت و عفریتیت ہی کی گھنٹی بلبھائے گی!" شیطان بولا "خیر تیرے انکاش شوقی کی صورت تو سوچی، تم اطمینان رکھو کہ مابودلت و اقبال کی پوری طاقت و قدرت بہت دیر سرکچستی اور ہٹاری اسکیم کو کامیابی کا جا رہا ہے، تم نے سوچ دیا۔"

پاشا نے جب کہ سلام کیا، اور اپنی جگہ پر بٹھ گیا۔

وزیر اعظم نے آواز دی۔ "بھائی پنڈت رادن جی!"

ایک دو سیاح کھڑا ہوا، چہرہ اس کا بالکل باقی کا سا تھا، ہاتھ بال چا پانی لکھولوں کے سے اور پاؤں میں عورتوں کے سے۔ وہ لکھڑا ہوا جو اٹھ اور تختہ شاہی کے سامنے مسجد میں گر پڑا، پھر اٹھ کر چار زانو ہو کر بیٹھا گیا، منہ کر بولا۔

"رادن کے اُن داتا ہماری رپورٹ سرکاری اقبال سے نفی خفیہ کی ہے۔ ہمارے پوری ایشیا میں سرکاری کارخانے ہیں، ہم نے چین میں آگ لگا رکھی ہے۔ روزانہ کئی ہزار آدمی ہمارے جاتے ہیں، جوان عورتیں، بیوہ اور چھوٹے بچے قہر میں ہیں۔ اور یہ وہ لوگ کر رہے ہیں جن کا مذہب ہے کہ انہاں پر مو دھرا، بربت میں آج تک سب سے بڑا لالچ نہیں ہو سکا ہے، آپس کی دھوکھی جاری ہے، اور ایشیا کا تاج ہندوستان تو خاص اپنا گھر ہے وہاں کی سرکار تو ہماری اسکیم کی پابندی ہے۔ البتہ کچھ خطرہ ایک نوکے سے بننے سے

# عن خیام

## مدن مراری لال سکینہ

اب رہا فخر جبریل کا انگریزی ترجمہ اس کے متعلق یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ جناب عطار اللہ صاحب نے شاید بہت ہی سلی نظریے اس کو دیکھا ہے ورنہ وہ اس قدر سخت الفاظ کا جبریل کا ترجمہ سب سے زیادہ بھل اور ناقص ہے۔ استعمال نہ کرتے، حیرت تو یہ ہے کہ وہ جبریل کے ترجمے کے بھل ہونے کی دلیل یہ پیش کرتے ہیں کہ جبریل نے ترجمہ نہیں کیا ہے بلکہ خیام کے خیال کو اپنے الفاظ میں ادا کیا ہے۔ وہ شاید نہیں جانتے ہیں کہ ایک زبان کی تصنیف کے ترجمے دوسری زبان میں جو کامیاب ہوئے ہیں، وہ ترجمے کے اسی بڑے اصول کے ماتحت کہ مترجم مصنف کے خیال کو اپنی زبان میں ادا کرے، اور یہ اصول اس وقت تو بالکل ناگزیر ہوتا ہے جب مترجم کو ایک غیر زبان کے شعر کو اپنی زبان کے شعر میں ترجمہ کرنا منظور ہوتا ہے۔ میں کہہ چکا ہوں کہ فارسی زبان کے شعر کا ترجمہ صرف اردو زبان ہی کے شعر میں ایسا ہو سکتا ہے کہ وہ لفظی بھی ہو اور اصل شعر کے اثر کو بھی قائم رکھے۔ اس لفظی ترجمے کے سخت اصول کو دوسری زبانوں کے مترجمین پر غائب کرنا غلطی ہے، جناب عطار اللہ صاحب کا یہ کہنا ایک مدعا صحیح ہے کہ یہی وجہ ہے کہ یورپ نے خیام کو خوش آؤ کہا، ورنہ اگر صرح معنی میں ترجمہ ہوتا تو شاید اسے وہ مقبولیت نہ حاصل ہوتی جو اس وقت ہے۔ مگر ان کے کہنے کا انداز یہ ہے کہ گو یا فیروز جبریل نے خیام کے ساتھ بڑی بے وفائی کی جو اس کو ایک بالواسطہ شکل میں اپنے وطن والوں کے سامنے پیش کر دیا، اگر جناب عطار اللہ صاحب کا یہ خیال کہ فیروز جبریل نے خیام

جناب عطار اللہ صاحب پانوی کا مصنفون جو رباعیات خیام کے ترجموں کے متعلق کچھ کہے، اگر کتب میں مشائخ ہوا ہے میری نظر سے گذرا، مصنفون کا خاص متعجب جناب آغا فخر علی بیگ قزلباش مشاعرہ ملی کے رباعیات خیام کے اردو ترجمے کی تشریف ہے۔ جناب آغا شاعر کے ترجمے کی خوبیوں سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا اور یہ بھی ممکن ہے صبا کہ جناب عطار اللہ صاحب کا خیال ہے کہ وہ رباعیات خیام کے سب سے بڑے مترجم کہے جانے کے مستحق ہوں کیونکہ محض یہ ہے کہ تینا ہر اعتبار سے اچھا ترجمہ ایک فارسی شعر کا اردو زبان میں ہو سکتا ہے اتنا اچھا کسی دوسری زبان میں نہیں ہو سکتا، لیکن ایسی حالت میں کہ جب دنیا کی تمام زبانوں میں متعدد ترجمے رباعیات خیام کے ہو چکے ہیں بغیر کسی تحقیق کے جناب آغا شاعر کو رباعیات خیام کا سب سے بڑا مترجم کہنا انصاف کی بات نہیں ہے۔ جناب عطار اللہ صاحب نے شاید اتنا کافی سمجھا کہ اگر وہ فیروز جبریل کے انگریزی ترجمے اور جناب کاظمی پریاگی کے اردو ترجمے کو گرد کر دیا، تو جناب آغا شاعر کا سب سے بڑا مترجم ہونا ثابت ہو جائے گا۔ جناب کاظمی پریاگی کا اردو ترجمہ جس کے متعلق جناب عطار اللہ صاحب کا خیال ہے کہ وہ بہت مشہور ہے "میری نظر سے ابھی تک نہیں گزرا، لہذا کوئی رائے نہ فی نہیں کر سکتا، البتہ ان کی دو رباعیاں جو جناب عطار اللہ صاحب نے اپنے مصنفون میں نقل کی ہیں ان سے جناب کاظمی پریاگی کے ترجمے کے ناقص ہونے کا اندازہ ہوتا ہے۔"

سے متاثر ہو کر کبھی گئی ہیں جو صرف تخلص کے ایڈیٹن میں موجود ہیں ۲  
رباعیوں میں خیام کی جھلک پائی جاتی ہے، ۳ رباعیاں عطار کی رباعیوں  
کا ترجمہ ہیں، اور ۴ رباعیاں خیام کی رباعیوں سے متاثر ہو کر کہی گئی  
ہیں، مگر حافظ کا رنگ غالب ہے۔

جناب عطار، اند صاحب ایک رباعی کے متعلق جس کا ترجمہ فطریہ  
نے کیا ہے لکھتے ہیں کہ ترجمہ کو یہ بھی نہیں معلوم کہ یہ رباعی خیام کی نہیں،  
بلکہ کچھ الفاظ کی تبدیلی کے ساتھ مولانا روم کی رباعیات میں پائی جاتی  
ہے۔ ترجمہ یہ نہیں کہتے کہ اس رباعی کا مولانا روم کی طرف منسوب ہونا ممکن  
ہے۔ مگر جناب عطار، اند صاحب کو یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ فطریہ  
نے اپنے ترجمے کے واسطے ایک قدیم رباعیات خیام کے نسخے کی مدد لی  
تھی، جس کی تاریخ کتابت ۸۶۷ھ ہے، اور جو ایک مدت سے اسکندریہ  
کی لبریری لائبریری میں محفوظ ہے۔ اس نسخے میں ۱۲ رباعی نمبر ۱۲۱ پر  
پائی جاتی ہے، اس کے علاوہ یہ رباعی دو اور رباعیات خیام کے قدیم  
نسخوں میں موجود ہے، جو پیرس کے کتب خانے میں محفوظ ہیں، اس کے  
علاوہ ایک بات یہ بھی قابل غور ہے کہ خیام کی کسی رباعی کا کسی دوسرے  
شاعر کی رباعیوں میں غلطوایا یا جانا بھی محض اس امر کی کافی دلیل کس  
طرح ہو سکتی ہے کہ وہ خیام کی رباعی نہیں ہے!!

کو ایک بگڑی ہوئی شکل میں پیش کیا ہے تو مجھے اُن سے اتفاق نہیں ہے،  
اس وقت میرے سامنے مسٹر نکیش آدو داتار پٹھی فائنٹل سکرٹری ایچ  
ای ۱۱ سچ نظام کوونٹ کامرٹی زبان میں ترجمہ رباعیات خیام کا موجود ہے،  
اس میں مترجم نے خیام کو خالص ہندی لباس میں پیش کیا ہے۔ مثلاً جہاں خیام  
دنیا والوں کو اسے دوست و خطاب کرتا ہے وہاں مترجم خیام کی بات کو  
کرشن کے منہ سے اُودھو کو سناتا ہے، جناب عطار، اند صاحب یہ  
اس قسم کے ترجمے سے تو نفرت ہی کریں گے، کیونکہ داتار صاحب فطریہ  
سے بھی دو ہاتھ آگے بڑھ گئے ہیں، میرے خیال میں ان دونوں ترجموں  
نے اپنی اپنی زبان کے لئے بڑی خدمت کی ہے، اُنہوں نے ترجمے کی غرض  
کو سمجھ کر کام کیا ہے۔

ان تمام باتوں سے قبلہ جناب عطار، اند صاحب کا یہ خیال  
بھی تو غلط ہے کہ ترجمہ لکھ کر ایک رباعی بھی ایسی نہیں لے گی جسے خیام کی  
رباعی کا صحیح ترجمہ کہا جاسکے۔ اُنھلستان کے شہر ممقن ایڈوڈ میرن  
امین نے فطریہ لکھ کر خیام کی رباعیوں سے مقابلہ کر کے یہ بات  
لے لی ہے کہ فطریہ لکھ کر ۱۰۱ رباعیوں میں سے ۹۴ رباعیاں خیام کی  
رباعیوں کا نقلی ترجمہ ہیں، ۴ رباعیاں ایسی ہیں جن میں خیام کی ایک  
سے زیادہ رباعیوں کا مفہوم شامل ہے۔ ۲ رباعیاں خیام کی اُن رباعیوں

## سرود و قص

غضب ہے آج بھی اپنے مینستیان بیل  
خبر نہیں ہے بچار دل کو اس حقیقت کی  
یہ چیزیں شراب میں جائز نہیں مگر اس وقت  
کبھی سچی فکد کشائی کبھی صفت آرائی  
کبھی سچی کام روائی کبھی سچی عدل گری  
ولیکن اب کہ وہ مرد و جہاں کشا و عظیم

سرود و قص کو مسلم یہ کر رہے ہیں حرام  
علوم دین میں ہیں ہر چند وہ بلند مقام  
جہاں میں جبکہ مسلمان کو تھے ہزاروں کام  
کبھی سفاخر طلب صلح و دوستی کا پیام  
کبھی سچی فکر دادائے خاطر ایام  
ہے انقلاب زمانہ سے دشمنوں کا غلام

سرود و قص سے دل کو اگر نہ بہلائے

تو کائے کیسے غلامی کے تمنغ و دست ایام

شبید ابن علی

# پشیمانی

وجاہت سندیلوی، بنی اے

ہم لوگوں کی دوستی اور محبت کو اپنی خوشنکشی نکھاروں سے نہ دیکھ سکے گی، کیا ایسا نہ ہوگا؟ نہیں مزدور ہوگا غرور، ابھی میری زندگی کے، جوانی کے، بہت سے بچپنے دن اور بہانی راتیں باقی ہیں۔

قلعت نے اطمینان کی ایک سانس لی۔ اور انگڑا اٹھتے ہوئے پاس ہی ایک طرف پر بیٹھ گئی، اس نے اپنے ننھے سرخ ریشمی ردائ سے اپنی پشیمانی کا پسینہ پوشیا اور آنکھیں سجا ڈراں کو روشن بنانے کی کوشش کی۔

اب مجھے کیا فکر ہے! کچھ نہیں، لیکن۔۔۔۔۔ میں پریشان کیوں ہوں۔ میرا دل دھڑکنے کیوں ہے۔ میں اس کی دھڑکن روکوں گی۔ میں قبضہ لگاؤں گی۔ میں پانڈو بکاؤں گی۔ میں گاؤں کی مجھے فکر کیا ہے؟ کیا میرا مزہ مجھے حامت کرتا ہے۔ کیا میں اپنی کڑوری پر تادم ہوں؟ شاید ہاں، لیکن؛ لیکن؛ اس زمانہ چاندنی رات کی داستان تو میری کتاب زندگی میں سب سے افسانہ لکھی ہوئی ہے۔ رشاب کے مت لحات کی اُس یاد کو تو میں اب بھی اپنا سب سے زیادہ عزیز خزانہ سمجھتی ہوں، کیا میں ان۔۔۔۔۔ لحات کو واپس حاصل کر کے لے اپنا سب کچھ دینے کے لئے تیار نہیں۔ کیا میں نامد ہوں، نہیں نہیں ہرگز نہیں۔ کیا میرا مزہ مجھ کو حامت کرتا ہے؟ ان فردوسی لحات کے لئے تو میرا دل چلا جاتا ہے! پھر میں کیوں پریشان ہوں۔ پھر کیوں میرا دل دھڑکے! کیا گناہ کے خوف سے؟ کیا میں نے گناہ کیا؟ نہیں میں نے گناہ نہیں کیا! میں نے قربانی کی؟ میں نے کس کا گناہ کیا؟ میرے گناہ سے کسی کو کیا نقصان پہنچا؟ میں نے قربانی کی، قربانی اُس کے لئے، آہ کاش کہ میں اس کے لئے

جائزوں کی شام کی برصی ہوئی تاریکی تھی۔ سائے چمن میں درختوں پر عجب ستارہ نما چھایا ہوا تھا۔ برصی ہوئی سیاہی میں وہ کچھ معلوم ہوتے۔ کھلی ہوئی کڑکی میں قلعت ایک سبز چادر اور اسے کھڑی ہوئی تھی۔ کمرے میں کچھ کی بڑھی مٹن کے اسٹ ہلکار کے قدم چوم رہی تھی، اور کمرے کی بہت کچھ کی اور خوبصورت نشینا اور سامان چمکا چمکا کر اس کو بخور مندر عقیدت پیش کر رہی تھی، قلعت تنہا تھی، اور اپنے خیالات میں غفلان!

وہ سوچ رہی تھی، لیکن پانڈو کی برصی ہوئی تاریکی زیادہ سیاہ تھی۔ یادہ تاریکی۔۔۔۔۔ جو اس کے سینے میں گھسی تھی!!! آگ آگ سیرم کیا کہہ رہی تھی، وہی پانڈو والی کا قصہ، کیا اُسے معلوم ہے۔ نہیں۔۔۔۔۔ شاید۔۔۔۔۔ وہ مجھے بتا رہی تھی؟ اتنی سنے مجھے کیوں گھڑکی دے۔ وہ پہلے تو کبھی اس طرح بات بات پر خفا نہ ہوتی تھیں؟ لیکن آج نہیں کیا معلوم، کسی کو کیا معلوم؟ یہ میرا خوت ہے، میں بہادر ہوں گی، میرے راز سے کوئی نہیں واقف؟ کوئی کیوں واقف ہونے لگا؟ کیا اُس نے کسی سے کہہ دیا؟ کیا یہ ممکن ہے؟ نہیں نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ راز صرف میرے ہی سینے میں محفوظ رہے گا! اگر وہ خود کسی سے کہہ دے؟ تو کیا میں انکار نہیں کر سکتی؟ لیکن ایسا نہیں ہو سکتا۔ آسمان پھٹ پڑے، زمین نشی ہو جائے، سمندر اُٹھ پڑیں، لیکن ایسا نہیں ہو سکتا۔ وہ میرا ہے، بالکل میرا! اس کا کاروبار دو جہیز میں ختم ہو جائے گا۔ پھر وہ میرے پاس آجائے گا۔ آجائے گا! آجائے گا! آجائے گا! پھر میرا شہاب اس کے آغوش میں چمکے گا! وہ میرا ہوگا میرا! ہم اندھی سوسائٹی کو کھانے کے لئے شادی کر لیں گے پس پھر یہ بڑا



# تعلیم دیہات

محمد ضیاء الاسلام بی. ایس. سی. پانی پتی

تعلیم دیہات کا مسئلہ ہماری ترقی کے نقطہ نگاہ سے اتنا ضروری ہو گیا ہے اور روز بروز بڑھتا جاتا ہے کہ اس پر ہر اس شخص کی توجہ ہونی چاہیے جو دیہات میں اس تاریکی کو جو عام لوگوں پر طاری ہے دور کرنا چاہتا ہے اور اس طرح ہر دیہات کے بھائیوں کو قومی زندگی میں وہ حصہ دینا چاہتا ہے جس کے وہ مستحق ہیں، اور جو ملک کا قافلہ ان کو دے چکا ہے، لیکن جس کو وہ شاید ابھی تک صحیح طور پر استعمال کرنا نہیں جانتے۔

آج کل معمولی گاؤں میں عموماً پرائمری درجہ جارتک کے اسکول ہیں، اور بڑے گاؤں میں مڈل اسکول ہیں جو ڈسٹرکٹ بورڈس کے زیر انتظام ہیں۔ ان مدرسوں میں، ہندی، اردو اور جغرافیہ پڑھایا جاتا ہے، کہیں کہیں انگریزی اور کچھ مکمل شناخت بال یا ہالکی بھی رائج ہیں۔ پھر سنڈی بھی کبھی مدرسوں میں داخل نصاب ہے، تعلیم کتابوں کے ذریعہ دی جاتی ہے، جو تقریباً ہر سال بدلتی رہتی ہیں، اور جن کے چناؤ میں عموماً ذاتی اغراض و مقاصد اور ذاتی تعلقات بڑا حصہ رکھتے ہیں۔ دستکاری، ذرا سی تعلیم اور فارمگ وغیرہ ایک فیصدی اسکولوں میں بھی داخل نصاب نہیں ہیں، دیہات میں جو تعلیم عموماً دی جاتی ہے اس کا سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ وہ زندگی کے شعبوں میں کارآمد نہیں ہوتی، اور نہ دیہاتی زندگی کے شعبہ نصاب تعلیم میں داخل ہیں نہ اس طرح جو

فیلج درسیان میں حائل ہے وہ بہت وسیع اور خطرناک ہے بہر حال جو وہ تعلیم سے بچوں میں تعلیمی محسوس پیدا نہیں ہوتی، جس کی وجہ سے ایک بڑی تعداد درجہ چار تک بھی نہیں پہنچتی اور درسیان میں ہی مدرسہ چھوڑ کر گھر لوٹ جاتی ہے۔ مگر تعلیم کے غیر دلچسپ ہونے کا دوسرا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ اسکول سے نکلنے اور دیہاتی زندگی میں داخل ہونے کے بعد مدرسوں میں جو پڑھا لکھا تھا وہ رفتہ رفتہ دماغ سے زائل ہو جاتا ہے، اس کی ذمہ داری کچھ فوٹر تعلیم پر ہے اور کچھ ان ذرائع کے میسر نہ ہونے پر جن کی وجہ سے جو تعلیم مدرسوں میں تھی ہے ان کی تکمیل گھر پر ہو سکے، گاؤں میں نہ کتب خانے ہیں نہ اخبار مل سکتے ہیں، اس لئے ان لوگوں کی دیہاتی زندگی اور تعلیم میں کوئی رشتہ باقی نہیں رہتا۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کم از کم ۳۰ فیصدی ایسے لوگ جنہوں نے درجہ چار بھی پاس کر لیا تھا دس بارہ سال بعد حساب کتاب نہیں لکھ سکتے اور اپنے لگان وغیرہ کا حساب بھی پڑواری یا اسکول کے ماسٹر صاحب سے لگھواتے ہیں۔

گاؤں کے مدرسوں کے استا و پرنسپل سے بہت معمولی قابلیت کے ہوتے ہیں۔ اس میں ان بچاؤں کا تو کوئی تصور نہیں، لیکن ان کا اثر ہماری دیہاتی زندگی پر غلط فہم طور پر چھاپا نہیں پڑتا، ان کی دماغی نشوونما اگر ہو رہی ہے تو بہت معمولی، ان میں عام طور پر نہ دلولہ ہوتا ہے نہ جوش جس نغمہ میں وہ رہتے ہیں وہ اس کی ذمہ دار ہے، نہ ان میں قوت عمل ہوتی ہے نہ جوش خیال جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہمارے گاؤں کے مدرسہ جن میں زندگی کی تڑپ پائی جانی

ملے اس متن کو کچھ معدول، انڈیا، ریڈیو دہلی، نیشنل سروس، رڈمرسٹری کو نشر کیا گیا تھا۔

ہو جائے۔ اور وہ بھی اپنی تعلیم سے اپنی زندگی کو بہتر اور زیادہ کارآمد بنا سکیں۔  
اس کے لئے ہم کو طرز تعلیم میں تبدیلی کی لازمی ہے، انصاف تعلیم میں تبدیلی  
ضروری ہے، اور اسناد دہ لئے بھی اسے ہی ضروری ہیں جتنا طرز تعلیم اور اسناد  
تعلیم کی تبدیلی۔

پہلا قدم لڑکے لڑکیوں اور بالوں کے لئے ایک ابتدائی تعلیم کلاسی  
قرار دیا جانا ہے، اگر ہم چاہتے ہیں کہ ترقی و بہتائی زندگی کے ہر شعبہ میں نمایاں  
ہو تو ہم کو بالوں کو سبھی تعلیم دینا اور ان کو لڑکوں کا کارآمد نگر بنانا لازمی  
ہے۔ اسی طرح لڑکیوں اور عورتوں کی تعلیم پر بھی زور دینا گویا ترقی و بہتائی کے  
سلسلے میں ایک خاص خدمت انجام دینا ہے، لڑکے لڑکیوں اور بالوں کے  
لئے ابتدائی تعلیم کو ضروری بنانے کے واسطے کافی محنت کی ضرورت ہے لیکن  
یہ دیکھتے ہوئے کہ ترقی و اصلاح و بہتائی کا کوئی پروگرام بغیر ابتدائی تعلیم کے  
جبر ہے اور لازمی قرار دے جانے کے ممکن ہی نہیں ہے، اسید ہے کہ جو صوبے  
بھی گرام سدھار کو ایک زندہ اور کارآمد اسکیم کی صورت میں دیکھنا چاہتے  
ہیں ان کو بہت کر کے یہ کام نہایت ناگزیر ہے۔ لیکن یہ کہ لوگ اس بات کو  
نا پسند کریں، لیکن مخالفت اگر ہوگی تو دفعی ہوگی اور سوتوڑے عرصے میں ختم  
ہو جائے گی۔ یہ کام مبتا بڑا اور عظیم الشان ہے اس کو دیکھتے ہوئے ابتدائی  
جبر یہ تعلیم کو کوئی دشوار یا دقت طلب اور نہیں سمجھنا چاہیے۔

تعلیم مند دوستانی میں یا اس زبان میں جو ملک کے علیحدہ علیحدہ حصوں  
میں بولی جاتی اور بھی جاتی ہو دے جانے کے متعلق کو کوئی سوال ہی پیدا نہیں  
ہوتا، اس موضوع پر بحث کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ مادری زبان میں  
تعلیم ابتدائی دے جانے کے فلاحات شاید ہی کسی کوئی آواز بلند کی گئی ہے،  
طرز تعلیم — *Direct method* اور *Indirect method* —  
کی بڑی کمی محسوس کی جاتی ہے، گرام سدھار کی تعلیمی اسکیم میں *Indirect method*  
اور *Direct method* کے علاوہ کوئی اور طرز بھی استعمال نہیں  
کیا جاتا چاہیے۔ ہر سرگرمی اسکول کے ساتھ ایک چھوٹا سا فارم ہیل اور گائے  
ہونے سے علی تعلیم دی جا سکے گی، اور تعلیم کے عملی اور پریکٹیکل اصول کام میں لائے  
جا سکیں گے جس سے تعلیم کی بنیادیں مضبوط اور یادگار ہو سکیں گی۔

بالوں کے لئے چھ ہفتہ کی سماجی و فرائض کی بنیاد پر تعلیم کا فرض  
ہے اگر آدھیں ایک صاحب جن کا نام سرگرو وال ہے، اور پنجاب میں ہو گا،

چاہئے ان میں غیر مردہ و مغلطے ہیں۔ یہ پاس مدرسوں میں شاید ایک پڑچوش  
استاد دہلے کے ٹرینڈ اسٹاڈن کا کاب نمبر پڑھا ہے، لیکن ٹرینڈ اسٹاڈن  
میں بھی وہ بات نہیں پائی جاتی جو دیہاتی تعلیم کے لئے ضروری ہے، یعنی جوش  
عمل اور تخیل۔ جو ٹرینڈ ان کو ملتی ہے وہ ان کو کتے میں پڑھانے کے لئے  
شاید زیادہ موزوں کر دیتی ہو، ورنہ اس کے علاوہ اس کا کوئی اثر ان پر  
نہیں ہوتا۔

ہم تعلیم بالغان کی طرف تو کبھی متوجہ ہی نہیں ہوتے اور اگر ہوتے بھی تو  
مشکلات ایسی ہیں کہ تعلیم بالغان کی کوئی اسکیم قابل عمل نہیں ہو سکتی۔ دیہات  
میں لڑکیوں کی تعلیم پر کوئی توجہ دینا بھی بالکل غیر ضروری سمجھا جاتا ہے، لیکن ترقی  
و بہتائی کی ہر اسکیم میں اس مسئلہ کو جو محنت و حیثیت حاصل ہے اس سے کسی کو انکار  
نہیں ہو سکتا۔ چھوٹی لڑکیاں بچوں کے ساتھ اسکول جاتی ہیں، لیکن سوتوڑے  
بہی دوزن ہیں وہ مدرسہ چھوڑ دیتی ہیں، اور اس کے بعد ان کو تعلیم جاری رکھنے  
کا کوئی ذریعہ نہیں رہتا۔

انسانی معاملات میں بھی وہ ترتیب نہیں ہے جو ہو جانی چاہیے۔ مثلاً  
استادوں کا فقر و غار پر کسی خاص اصولوں پر ہو لیکن عموماً اس میں سفارش،  
ذاتی تعلقات اور مذہبی تعصب کو بہت دخل ہوتا ہے، استاد و معلم کی بڑی  
کی سیاسی کا شکار ہوتے رہتے ہیں اور پارٹیوں کے آلاکار بنائے  
جاتے ہیں۔ بتا دہ کی تلوار ان کے سر پر ہمیشہ چلتی رہتی ہے جس کی وجہ سے نہ تو  
کوئی اسکیم پورے طور پر کارگر ہو سکتی ہے اور نہ اسکولوں میں ذاتی اثر جس کی مدد  
میں ضرورت ہے، کام میں لایا جا سکتا ہے، پھر دیہاتی اسکولوں کی تعلیمی پالیسی  
عموماً ایسے لوگوں کے ہاتھ میں ہے جو خود اس کی ضرورت یا سے ناواقف ہیں۔  
اور جو لوگ اس سے واقف ہیں اس سے تعاون عمل کے خواہشمند نہیں۔ اس  
پالیسی کا جو نتیجہ ہو وہ ظاہر ہے کہ تعلیم پر باوجود لاکھوں روپے صرف ہونے  
کے دیہات میں جو حالت دس سال قبل تھی اب بھی صورت حال اس سے  
زیادہ دلی خوش کن نہیں ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا کیا جائے کہ ترقی و اصلاح و بہتائی  
میں معنوں میں ہو سکے اور جا رہے دیہاتی جو دیہات میں رہتے ہیں اور جا رہے  
لئے اپنی محنت سے کاشتکاری میں عموماً کام کرتے ہیں ان کو کسی ہماری  
طرح معاملات سمجھنے اور ان کو عمل کرنے میں ملے۔ دینے کی صلاحیت پیدا

اور بی بی میں پیسہ پامیں اس قسم کی اسکیمیں وضع کی جارہی ہیں۔ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ کوئی مکمل ڈھائی اسکیم ایسی بن چکی ہے جو عام طور پر رائج ہو سکے، لیکن جو کام انہیں کیا جا چکا ہے وہ کافی امید افزا ہے۔ اب ہمارے ماہرین تعلیم کو کچھ بے تحاشیہ پرکھنے میں لگنے اور تعلیم کے بیج وسیع سطح پر بکھرتے کرنے کے لیے چھ مہینے کی ڈھائی اسکیمیں وضع کرنے کی کوشش کرنی چاہیے اور اپنی تمام تر توجہ اس طرف مبذول کرنی چاہیے۔ اگر ہمارے ماہرین تعلیم اس طرف توجہ کریں تو ایسی اسکیمیں بن سکتی ہیں جو دیہات میں ابتدائی تعلیم کی صورت میں بالعموم تک پہنچانی جائیں، تاکہ ان کو کمیٹی لکھنا پڑھنا اور حساب وغیرہ رکھنا آجائے، ایسی اسکیموں کی ضرورت اس لیے ہے کہ گاؤں کے بالغ مرد اور عورت تھوڑے ہی عرصے میں اس قابل ہو جائیں کہ ان کو زرعی معاملات کی تعلیم دی جاسکے۔

بالوں کے مدرسوں میں تفریح اور تعلیم دونوں ہونے چاہئیں تاکہ بالغ مرد اور عورتیں آسانی سے ابتدائی تعلیم کے مراحل طے کر سکیں، ان کو دھڑھاننا مذہب نامعلوم ہو بلکہ مشرق سے شام کو مدرسوں میں جا کر تعلیم بھی حاصل کر سکیں اور اس کے ساتھ ساتھ ان کی تفریح بھی ہوتی رہے۔ یہ سوال باقی رہتا ہے کہ استاد کہاں سے ملیں گے، اور یہ سوال اپنی خاص نوعیت کی وجہ سے بہت ہی اہم ہے، اگر اسکیم صوبہ میں ہی رائج کی جائے تو تیز رفتاری سے استادوں کی ضرورت پڑے گی، آج کل تعلیم یافتہ طبقہ میں بیکاری پھیلی ہوئی ہے جس کی وجہ سے بہت لوگوں کو پریشانی ہے، اس اسکیم کے چلانے کے لیے استاد اس طبقہ سے لے جائیں گے، اس سے بیکاری بھی کم ہوگی اور ترقی دیہات کے لیے ہم گاؤں کو تیار رہی کر سکیں گے، کیونکہ جب تک گاؤں والے یہ نہیں کہہ سکتے کہ گرام سہولت کار کی اسکیموں کا کیا مطلب ہے تب تک وہ ان پر عمل نہیں کریں گے اور اگر بالوں کی خواہش نہ ہو تو اس پر عمل کیا بھی تو وہ جوش اور دلوراس میں ہونگا جس کے بغیر ترقی دیہات کا کام ہی نہیں سکتا۔

تعلیم یافتہ لوگوں کا دیہات کے مدرسوں میں کام کرنے سے ایک طرف تو گاؤں والوں کا حوصلہ بڑھے گا، وہ اس بات کو سمجھیں گے کہ ان کے شہر والے کا رہنے والا بھائی ان کے ساتھ دلی مہم دہی کرنا چاہتا ہے اور دوسری جانب تعلیم کا نام ماحول بدل جائے گا۔ تعلیم یافتہ بلکہ رلوگوں کو اس اسکیم میں کام کرنے سے قربانی کرنی پڑے گی۔ لیکن ہمارا خیال ہے کہ وہ اس

اور بی بی میں پیسہ پامیں اس قسم کی اسکیمیں وضع کی جارہی ہیں۔ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ کوئی مکمل ڈھائی اسکیم ایسی بن چکی ہے جو عام طور پر رائج ہو سکے، لیکن جو کام انہیں کیا جا چکا ہے وہ کافی امید افزا ہے۔ اب ہمارے ماہرین تعلیم کو کچھ بے تحاشیہ پرکھنے میں لگنے اور تعلیم کے بیج وسیع سطح پر بکھرتے کرنے کے لیے چھ مہینے کی ڈھائی اسکیمیں وضع کرنے کی کوشش کرنی چاہیے اور اپنی تمام تر توجہ اس طرف مبذول کرنی چاہیے۔ اگر ہمارے ماہرین تعلیم اس طرف توجہ کریں تو ایسی اسکیمیں بن سکتی ہیں جو دیہات میں ابتدائی تعلیم کی صورت میں بالعموم تک پہنچانی جائیں، تاکہ ان کو کمیٹی لکھنا پڑھنا اور حساب وغیرہ رکھنا آجائے، ایسی اسکیموں کی ضرورت اس لیے ہے کہ گاؤں کے بالغ مرد اور عورت تھوڑے ہی عرصے میں اس قابل ہو جائیں کہ ان کو زرعی معاملات کی تعلیم دی جاسکے۔

بالوں کے مدرسوں میں تفریح اور تعلیم دونوں ہونے چاہئیں تاکہ بالغ مرد اور عورتیں آسانی سے ابتدائی تعلیم کے مراحل طے کر سکیں، ان کو دھڑھاننا مذہب نامعلوم ہو بلکہ مشرق سے شام کو مدرسوں میں جا کر تعلیم بھی حاصل کر سکیں اور اس کے ساتھ ساتھ ان کی تفریح بھی ہوتی رہے۔ یہ سوال باقی رہتا ہے کہ استاد کہاں سے ملیں گے، اور یہ سوال

اپنی خاص نوعیت کی وجہ سے بہت ہی اہم ہے، اگر اسکیم صوبہ میں ہی رائج کی جائے تو تیز رفتاری سے استادوں کی ضرورت پڑے گی، آج کل تعلیم یافتہ طبقہ میں بیکاری پھیلی ہوئی ہے جس کی وجہ سے بہت لوگوں کو پریشانی ہے، اس اسکیم کے چلانے کے لیے استاد اس طبقہ سے لے جائیں گے، اس سے بیکاری بھی کم ہوگی اور ترقی دیہات کے لیے ہم گاؤں کو تیار رہی کر سکیں گے، کیونکہ جب تک گاؤں والے یہ نہیں کہہ سکتے کہ گرام سہولت کار کی اسکیموں کا کیا مطلب ہے تب تک وہ ان پر عمل نہیں کریں گے اور اگر بالوں کی خواہش نہ ہو تو اس پر عمل کیا بھی تو وہ جوش اور دلوراس میں ہونگا جس کے بغیر ترقی دیہات کا کام ہی نہیں سکتا۔

تعلیم یافتہ لوگوں کا دیہات کے مدرسوں میں کام کرنے سے ایک طرف تو گاؤں والوں کا حوصلہ بڑھے گا، وہ اس بات کو سمجھیں گے کہ ان کے شہر والے کا رہنے والا بھائی ان کے ساتھ دلی مہم دہی کرنا چاہتا ہے اور دوسری جانب تعلیم کا نام ماحول بدل جائے گا۔ تعلیم یافتہ بلکہ رلوگوں کو اس اسکیم میں کام کرنے سے قربانی کرنی پڑے گی۔ لیکن ہمارا خیال ہے کہ وہ اس

ان مدرسوں میں آئیں گے اور تعلیم حاصل کریں گے۔ بالآخر ان کے مدرسے رات کو چھوٹے چاہیں اور ان میں ریڈیو اور لائوڈ اسپیکر لگا کر دن بھر کی خبریں، موسم کا حال اور زراعت کے متعلق گھر گھر باتیں ان کو بتلائی جانی چاہیں جس سے ان کی عمومی تعلیم بھی ہوتی رہے گی اور ان کا دائرہ معلومات وسیع ہوتا جائے گا۔

تعلیم دیہات کی اسکیم کو حتمی بنانا یا جس کے انتہائی اس سے زیادہ فائدہ ہو سکتا ہے، کچھ روپیہ تو گورنمنٹ سے ہمیشہ ملتا رہے گا اور کچھ روپیہ لوکل بورڈس سے، روپیہ ملنے کے یہ دو ذریعہ ہی ہیں، لیکن ان کے علاوہ ہم چاہتے ہیں کہ سفوف کے زمانہ کا پرانا دستور جس سے سجدوں اور مندروں کو زمینیں دی جاتی تھیں وہ دوبارہ رائج کر دیا جائے اور ہر سرکل میں کچھ زمین بطور معافی اس سرکل کی تعلیم دیہات کے کام کے لئے دیدی جائے، اس کی تمام آمدنی سرکل کے مدرسوں میں تقسیم ہو جائے گی۔

اس کے علاوہ دستکاری کے مدرسوں کی بنائی ہوئی چیزیں گورنمنٹ کو لازمی طور پر خریدنی چاہئیں، اور یہ روپیہ مدرسوں میں تعلیم کے لئے دینا چاہئے، ان چیزوں کو بازاروں میں بیچنے کا کام گورنمنٹ ایکسیسز کر سکتی ہیں، اور یہ کوئی مشکل امر معلوم نہیں ہوتا۔

یہ ایک مختصر سا خاکہ تعلیم دیہات کی اسکیم کا ہے جس پر عمل کرنے سے ہمارے گاؤں والے، اپنی بھلائی اور بُرائی کی باتیں سمجھ سکتے ہیں، اور ایک بہتر زندگی بسر کر سکتے ہیں۔ یہ کام آسان نہیں ہے، لیکن کرنے کے قابل ضرور ہے۔

جائیں زیادہ معلومات ان کو دی جاسکتی ہیں، لڑکیوں کی تعلیم میں کچھ توادر کے مضامین اور ان کے علاوہ کچھ اور

Domestic Economy

Hygiene

Domestic Science

First Aid

Maternity and Child-care.

بھی پڑنے چاہئیں جس کی ضرورت کچھ لکھنا لا حاصل معلوم ہوتا ہے۔

Domestic Economy, Hygiene,

Domestic Science, First Aid,

Maternity اور Child-care.

میں بس گاؤں کو مرکز بنا کر ہر مرکز پر ایک ایک ماہر رہ سکتے ہیں اور وہاں ان شعبوں میں تعلیم دے سکتے ہیں، اس کے علاوہ بالوں کی تعلیم کا انتظام کرنا اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ لڑکے اور لڑکیوں کی تعلیم کا، ہم یہ تو چاہتے ہیں کہ یہ لڑکے اور لڑکیاں مرد اور عورت ہو کر میسر اور زیادہ کارآمد زندگی بسر کریں، لیکن اس کے ساتھ ہی ہم سوچو کہ پلو کو بغیر پانی کے نہیں چھوڑ سکتے، تعلیم بالغان کے سائنٹفک اصولوں پر ہم کو کاربند ہونا ہے، اور ان سے فائدہ اٹھانا ہے، اول تو ایسی اسکیم تمام بالغ غرضوں اور غرضوں کے مدرسہ میں عمل میں لائی جائیں اور اس کے بعد اوپر کا کورس آہستہ آہستہ ان کو پڑھایا جائے۔ یہ ایک دن کا کام نہیں ہے، لیکن طرز تعلیم کو زیادہ موثر اور دلچسپ بنانے سے لوگ خود بخود

بگ گائے آلام پچھاتا ہوں  
سے لے کے زنا تمام پچھاتا ہوں  
دنیا مجھے سنے خوار کہے پچھاتا ہوں  
وہ عالم میں جاوے پچھاتا ہوں  
خداوند پچھاتا ہوں

قلعہ  
رات جاوے چاند جھڑکے  
نہن نشینوں سے آ رہا ہے نظر  
فرنگیہ کیسے چشم عاشق میں  
جیسے روتے لگاؤ دشت سحر  
جوش

حصہ لیکن شروع کیا جو ۱۹۳۵ء میں شائع ہو کر ملک میں بہت زیادہ مقبول ہوا۔ ایک آرڈن (مؤنٹین کی سب سے زیادہ مقبول نظم ہے، ۱۹۳۶ء میں شائع ہوئی، جس کو اس نے صرف دو ہفتہ میں لکھا تھا، اس کی شہرت ملک میں اس قدر پھیلی کہ چاروں طرف سے لوگ اس کی ملاقات کو آتے ان لوگوں سے بچنے کے لئے اس نے ایک قطعہ زمین مشاعرہ میں بمقام حسیہ (خرد لیا اور ایک مکان، نہ ان کے سو گاما، دو ماراکا، تارکات، ۱۹۳۵ء۔۔۔ گلا)

والد کے انتقال پر لوگوں نے اسے ایک گرجا کا پادری مقرر کر دیا ستمبر ۱۹۳۳ء میں دینا سے اس کے دوست سیم کے موت کی خبر آئی، اس غناک واقعہ سے اسے بڑی تکلیف ہوئی، جس سے وہ قریب دس سال تک بالکل خاموش رہا، لوگوں کو یہ خیال ہوا کہ شاید اس کے شعراء جذبات بالکل دفن ہو گئے، لیکن اس دلداز واقعہ سے اس کے ذہنی قوت کی پرورش عم کے دامن میں براہر ہوئی رہی، اور اپنے خیالات کو قلمبند کرتا رہا جس میں عم کے پروردہ فنون کے ساتھ مسرت سے امید کا بھی ترانہ

## نوابے حسی

وہ بے دلی سی محبت میں دل پر چھائی ہے  
ناب لال ستم ہے ناب خیال کرم  
مذاق کو چہ نشینی نہ آستان بوسی  
نہ وہ جنون محبت ہے اور نہ رسوائی  
کہاں وہ ذوق تصور کہاں وہ لطف خیال  
نہ آہ نیم شبی ہے نہ گریہ سحری  
اب اضطراب تناسل ہے سکون دل کو  
مرے خیال میں تو ہیں ہے جوانی کی  
گناہ شوق کی توفیق دے خدائے عشق  
نکال مجھ کو نہ اپنی خدائی سے باہر  
کچھ ایسے عالم بیگانگی میں ہوں بسمل  
کہ جیسے جان بھی اپنی نہیں پرانی ہے

# الفریڈ لارڈین

علیم الدین خاں عظمیٰ

(ٹیکسیر اور ٹین کے) نام سے ہندوستان کا تعلیم یافتہ طبقہ واقف ہے، لیکن ٹین کے نام سے ابھی ہمارے کان زیادہ آشنا نہیں ہیں۔ ہندی میں تو اس کا مختصر سا تذکرہ موجود ہے، لیکن اردو زبان میں ابھی اس کی کمی ہے، میرے کہنے کا یہ مقصد نہیں ہے کہ اردو میں اس کا نام و نشان نہیں ہے، ہے لیکن دُعا ہے کہ اس میں اس مختصر سے مضمون میں ٹین کی زندگی کا ایسا خاکہ کھینچا جاسے جو کہ ناظرین کے سامنے ایک تصویر آجائے۔

الفریڈ لارڈین، انیسویں صدی کا ممتاز انگریزی شاعر، لکھنؤ کے ایک گاؤں سامرس بائی ( ) میں ۱۸۶۲ء میں پیدا ہوا۔ اس کا تعلق ٹین کے اس خاندان سے تھا جو ابتدا میں ڈیفنس ( ) تھے، اور انگریزوں کے شمالی حصہ میں سکونت پذیر تھے۔ اس کا باپ ڈاکٹر خارج کلین ٹین ( )

سامرس بائی کا پادری تھا، اور اس کی ماں کوئٹہ ( ) کے پادری کی لڑکی تھی۔ شائع ٹین کوئٹہ کے گرامر اسکول میں ابتدائی تعلیم کی غرض سے بھیج دیا گیا۔ لیکن تین سال کے بعد اسکول کی سخت زندگی سے تنگ آکر گھر واپس آیا اور اپنے والد بزرگوار سے جو روشن خیال اور تعلیم یافتہ آدمی تھے سات سال تک تعلیم حاصل کی۔ فروری ۱۸۷۷ء میں اس کا داخلہ ٹرنٹی کالج ( )

گمبرج میں ہو گیا، جہاں اس نے تین سال تعلیمی مسہ جاری رکھا۔ یونیورسٹی کی تعلیم سے اسے خاص دلچسپی نہ تھی، وہ سکون اور مسرت کا جو یا تھا، لیکن اسے درس کی کتابوں میں نہ پاسکا۔ اس کی ذہانت سے ہر شخص کو یہی اُمید تھی کہ وہ یونیورسٹی کا ایک ہر ہمار طالب علم ہوگا، لیکن سوائے ایک سہرے تنے کے جو اس نے ٹیکسیر ( ) پر تعلیم

کھینے میں یونیورسٹی کے چانسلر سے بطور انعام حاصل کیا تھا، اور کوئی امتیاز کی خصوصیت نہ حاصل کر سکا۔ لیکن اس کی زندگی کا قیمتی زیور اور اس کی شاندار زندگی کے سازگار درست کرنے والا اسی کیمبرج کی چہار دیواری میں ملے۔ اس کی تعلیم کا جملہ ارتقہ سہری سلیم ( )

کے دوستانہ تعلق ہی میں پہنچا تھا، ان کے دوستانہ تعلقات کو کبھی پانچ سال ہوئے تھے کہ سلیم ( ) کو موت کی خاموش فینڈ سونا

پڑا۔ اس سہرے زمانے کے ختم ہوتے ہی ٹین کی زندگی میں ایک عظیم انقلاب آیا۔ اس کی رگ رگ سے پُر درون فنی جاری ہو گئے۔ ان کے دوستانہ تعلقات

کافی مضبوط تھے، اور ۱۸۷۷ء میں ٹین کی چھوٹی بہن ایسی ( ) سہرے سے منسوب ہو گئی۔ ۱۸۷۸ء میں دو لڑکے یورپ کا سفر کیا، دوسرے ممالک کے تمدن، تہذیب اور قدرتی مناظر کا جو گہرا اثر ٹین پر پڑا اس کی شانہ سہری سے نمایاں ہے۔ فروری ۱۸۷۸ء میں اس کا باپ سخت بیمار پڑا اور ٹین کو کوفرس واپس بلایا، اسی سال ماہ مارچ میں اس کے والد کا انتقال ہو گیا اور ٹین کو کیمبرج سے قطع تعلق کرنا پڑا۔

حصہ لکھن شروع کیا جو ۱۸۵۴ء میں شائع ہو کر ملک میں بہت زیادہ مقبول ہوا۔ ایک آرڈن (جو ٹینس کی سب سے زیادہ مقبول نظم ہے، ۱۸۶۲ء میں شائع ہوئی، جس کو اس نے صرف دو ہفتہ میں لکھا تھا، اس کی شہرت ملک میں اس قدر پھیلی کہ چاروں طرف سے لوگ اس کی ملاقات کو آتے ابن لوگوں سے بچنے کے لئے اس نے ایک قطعہ زمین مشاعرہ میں بمقام تمسیر خرید لیا اور ایک مکان جو اکثر نوچم گرامیں ہالہ ہا کرتا ہشتادہ میں وہ گھنٹیا کے مرز میں مقیم ہو گیا اور اس کی صحت خراب ہوتی گئی۔ نئی نفلوں کی ترتیب اور نئے بچوں میں اشعار کہنے کی اس نے کافی کوشش کی، لیکن موت اتنی خراب ہو چکی تھی کہ اس سے محنت نہ پہنچتی تھی اور آخر کار تو برکتہ ۱۸۶۷ء میں اس دارفانی سے رخصت ہو گیا۔

## ٹینس کی اندرونی زندگی

لوگوں کا عام خیال ہے کہ شعرا کی زندگی عوام سے مختلف ہوتی ہے یعنی ان میں چند اخلاقی خامیاں، جیون، پریشانی، وحشت یا انہم کی لغو چیزیں ہوتی ہیں کسی حد تک تو یہ خیال صحیح ہے لیکن ٹینس کی زندگی عوام کے اس خیال سے بالکل آزاد ہے۔ اس کی شاعری اس کی زندگی کا سچا آئینہ ہے، جس میں اس کے اندرونی جذبات کا صحیح عکس پڑتا ہے۔ ایک شخص کی بیرونی زندگی اتنی خوب نہیں ہوتی جتنی کہ اس کی اندرونی زندگی کا مطالعہ ہوتا ہے، کیونکہ ایک انسان کا کیریکٹر اس کے تمام ادعاات اور خامیوں کا راز اس کے جذبات میں پنپا ہوتا ہے، ٹینس کی بیرونی اور اندرونی زندگی میں ایک خاص مطابقت ہے یا یوں تصور کیجئے کہ دو سائزہیں جن میں سے ایک ہی نیم کا ٹکڑا نکلتا ہے، اس کی پوری زندگی میں صرف ایک مرتبہ اس مطابقت میں فرق نظر آتا ہے اور وہ لمحہ ہمیں کی موت ہے، اس کے علاوہ اس کی تمام عمر ایک سچے انسان کی صحیح تصویر ہے۔

اس کے اخلاق کی سب سے بڑی خوبی صداقت تھی، اس کی گنگو اور مل اس کے ضمیر کی سچی ترجمانی کرتے تھے، یعنی اسے سخت لغزت تھی۔ وہ بہت ہی باجس اور کم سن آدمی تھا، اس کا دل بچوں کی طرح دنیائی آکائونڈ سے پاک تھا، اس کی طبیعت خلوت پسند تھی اور خاص خاص اصحاب سے

والد کے انتقال پر لوگوں نے اسے ایک گرجا کا پادری مقرر کر دیا ستمبر ۱۸۳۷ء میں دیتا سے اس کے دوست تھامس کی خبر آئی، اس غنک واقعہ سے اسے بڑی تکلیف ہوئی، جس سے وہ قریب دس سال تک باطل خاموش رہا، لوگوں کو یہ خیال ہوا کہ شاید اس کے شاعرانہ جذبات باطل فنت ہو گئے، لیکن اس وگلدز واقعہ سے اس کے ذہنی قوت کی پرورش غم کے دامن میں برابر ہوتی رہی، اور اپنے خیالات کو قلمبند کرتا رہا جس میں غم کے پروردنوں کے ساتھ مسرت اور امید کا بھی ترانہ موجود تھا، انٹون کی وہ قیمتی لڑیاں جو اس نے قائم یا "میں برونی تھیں، ۱۸۵۰ء میں "ان ہیویرم" کے نام سے انگریزی ادب کے حوالہ کیا، جو انگریزی شاعری میں صداقت اور محبت کا ایک مایہ ناز شہسپارہ ہے۔ ۱۸۵۱ء صرف اس کی شاعرانہ زندگی کے لئے اہم نہ تھا، بلکہ اس کی شادی بھی اسی سال ہوئی تھی اور در دوسرے (

کی موت پر ملک اشعار کا سہرا بھی اسی کے سر پہرا ہشتادہ میں اس نے ٹیوٹھم میں سکونت اختیار کی اور ملک اشعار کی حیثیت سے عملی خدمت میں بھی حصہ لینے لگا۔ قوم پرستی اور حب الوطنی کے سیٹھے راگ وہ ہمیشہ سناتا رہا، حب الوطنی پر اس نے جو نفلیں کہی ہیں اس میں ڈیو لیک آف ویٹکن کی موت پر جو نظم لکھی گئی اور ۱۸۵۷ء میں شائع ہوئی، سب سے زیادہ متاثر ہے۔

اسی زمانہ میں اس کی زندگی میں ایک نیا انقلاب ہوا اور وہ دنیاوی ہنگاموں سے گھرانے لگا، پرسکون زندگی کی تلاش میں ماہ نومبر ۱۸۵۷ء میں نیرنگ ٹیوٹھم میں جو جزیہ وائٹ پر واقع ہے چلا گیا اور وہاں جانے سے اس کا یہ فضا نہ تھا کہ وہ دنیا سے قطع تعلق کرے اور اپنی قیمتی خدمتوں سے ملک اور ادب کو محروم کر دے بلکہ اس کا یہ خیال تھا کہ تبدیل آب و ہوا اور دیہات کی زندگی سے اس کے جذبات ست شکنہ ہوں گے اور ملاقاتیوں سے جھٹکارا پاکر شاعری کی خوبصورت پھلاری کو محنت کے ساتھ رنگ برنگ کے پھولوں سے آراستہ کر سکے گا۔ ۱۸۵۷ء میں آکسفورڈ یونیورسٹی نے اسے ڈاکٹری کی ڈگری دی، اور اسی سال ماؤڈر (

شائع ہوئی۔ ۱۸۵۸ء میں "آئڈلس آف دی کنگ کا پہلا

مور ہے تے، ٹینس کبھی ملکی کاموں میں حصہ لینا پڑا، لیکن وہ اپنی تعلیم کو علیٰ حق نہ پہناتا، ملک کی ضرورت، آزادی، فلاح، حب الوطنی اور عورتوں کے حقوق کو اپنی نگاہوں کے ذریعے سے لوگوں کو سناتا رہا۔ وہ ترقی کا خواہاں تھا لیکن انہیں اگر اس نے خود حصہ نہیں لیا تو کسی لوگوں کو ترقی کے راستے دکھاتا رہا، اس کی حب الوطنی انگلیں نہ پھاڑی اور ملکی فوجات ہی تک محدود رہی، وہ ہمیشہ یہی چاہتا تھا کہ انگلینڈ کی فوج کا فی مضبوط ہو اور دوسرے ملکوں کو فتح کر سکے۔ اس کو سلطنتِ جہوریہ سے زیادہ محسوس ہوتی، وہ ہمیشہ امر، کی سلطنت (د) کا خواہاں تھا۔ غربت کا نقشہ اس نے اپنی نگاہوں میں بہت کم کھینچا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے غریبوں کا زیادہ خیال نہیں کیا۔ عورتوں کے حقوق، ان کی تعلیم کا اس نے کافی چرچا کیا جس کی شہادت نظم "شاہزادی" (۱) سے ملتی ہے۔

### ٹینس بحیثیت شاعر

ٹینس فطرتِ حقیقت اور انسان کا سچا مترجم تھا اس کے خیالات اور تصور کی پاکیزگی قابلِ تحسین ہے۔ اس کی نکتہ شناس نگاہوں نے فطرت اور زندگی کا ہر پہلو سے گہرا مطالعہ کیا تھا جس کی جھلک اس کی شاعری میں ملنا ہے، بچوں کی بھولی بھالی زندگی سے اسے بڑی محسوس ہوتی، ایک آرڈن (۲) میں بچوں اور زندگی کے ہر ذینہ کو اس تسلسل سے دکھایا ہے جس کی نظیر ملتی مشکل ہے۔

### اسلوب بیان

کسی شاعر کے کلام کا مطالعہ دو طرح سے کیا جاسکتا ہے ایک تو اس کے کلام کی ترتیب اور دوم "مواد" مواد میں غیر فانی صداقت اور ترتیب میں موزونیت کا ہونا ضروری ہے، ٹینس میں یہ دونوں خوبیاں ایک وقت پائی جاتی ہیں، اس کے کلام میں مادہ اور الفاظ کے ساتھ ساتھ واقعات اور جذبات کا پہلو بھی مد نظر رکھا گیا ہے، اگر وہ روزمرہ پر زیادہ زور دیتا ہے تو دوسری طرف انسان کی ہستی اور زمانہ کی نیکیوں کا بھی خیال ہے اس کی شاعری کی سب سے بڑی خصوصیت سادگی "سچی جیو اس کے طرز اور مواد دونوں میں پائی جاتی ہے، دقت اور گہم موضوع سے وہ ہمیشہ پرہیز کرتا، تشبیہ و تمثیل سے بھی اہم لیتا ہے، لیکن اسی حد تک کہ موزونیت، مٹا

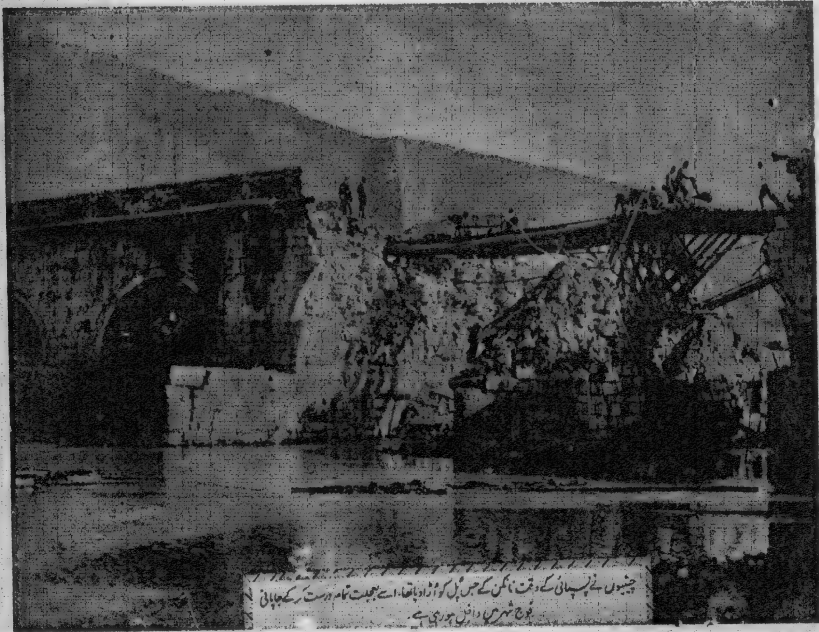
ہدایت اخلاق سے متا تھا، اس کا دل بہت ہی نازک اور درد روم تھا، غیبت اور شکایت سے اسے سخت اُٹھیں ہوتی تھی "زندگی" اور "انسان" سے اسے بڑی محسوس ہوتی اور وہ ہمیشہ یہی چاہتا تھا کہ انسان اپنی زندگی مسرت اور آرام سے گزار سکے وہ اپنی نگاہوں کے ذریعے سے خود بصورتِ زندگی کا نقشہ پراپریشن کرتا رہا۔ ہر انسان میں کسی نہ کسی طرح کی خامی ضرور ہوتی ہے، ٹینس بھی انسان ہی تھا اس میں بھی چند خامیوں کا پایا جانا ضروری تھا، نفاذ دوسرے وہ بہت خوفزدہ رہتا تھا، اکثر وہ متفکر اور غمزدہ رہتا، اس کے دل میں طرح طرح کے سہم خیالات اُٹھتے جس سے وہ خود پریشان ہو جاتا، لیکن اس کے علم اور تفکر میں بھی اُمید کی جھلک رہتی۔

### ٹینس اور مذہب

ٹینس کی زندگی، خیالات اور کارناموں پر سب سے زیادہ اثر مذہب کا پڑا، اس کی ہر نظم میں مذہب کا بے قشور و نظر آثار ہے اور اس لحاظ سے اسے ایک مذہبی شاعر بھی کہہ سکتے ہیں، لیکن اس کے یہی نہیں ہیں کہ وہ کسی مذہبی اہلر یا پادری کی طرح مذہب کے دقت پسندانہ پرکھو دیتا تھا یا مذہبی جھگڑوں میں حصہ لیتا تھا بلکہ اس کی شاعری اور جذبات میں مذہب کا جوش اور عقیدت موجود تھی، یہ جوش اور عقیدت اس کی شاعری میں مفاہیم کے تار و پود سے ہے، جس قسم کا مضمون ہوتا ویسا ہی مذہبی جوش یا رنگ رہتا۔ اس کی شاعری مذہبی جھگڑوں سے پاک ہے اور یہ ایک ایسی صفت ہے جو اس کی شاعری کو متاثر کر دیتی ہے۔ فن شاعری میں اگر معمولی جھگڑوں اور مذہبی تعصب سے کام لیا جائے تو وہ فنا کر (۱) آرت نہیں کیا جاسکتا۔ شاعری کا فن (۲) محبت، صداقت، حسن، مسرت، اور اُمید میں پنہاں ہوتا ہے نہ کہ مذہب کے معمولی جھگڑوں میں، صحیح معنوں میں ٹینس کسی خاص مذہب کا پیروکار نہ تھا، لیکن خدا کا متفق تھا اور خالق و مخلوق کے راز سے بھی واقف تھا۔

### ٹینس کا سیاسی نقطہ نظر

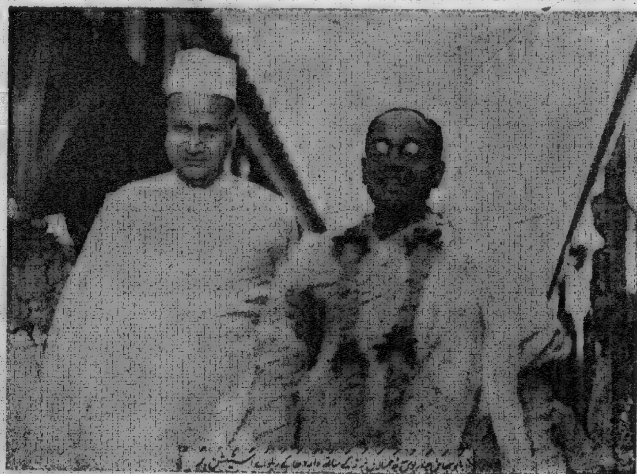
ہر شاعر اپنے زمانے کا مصور ہوتا ہے اور جو رنگ اس کے ماحول کا ہوتا ہے وہ خود اختیار کرتا ہے اور اپنے شاعرانہ انداز میں لوگوں کو سناتا ہے ٹینس انیسویں صدی کا شاعر تھا، جب کہ انگلینڈ میں طرح طرح کے انقلاب



پیشوں نے سہیلی کے وقت، مکن کے سر پر کوڑا دیا تھا اسے بحالت تمام درست کر کے چابی  
نوع شہر میں داخل ہو رہی ہے۔

ر. س. اکلیم دہلی

یکم مارچ ۱۹۳۸



اور سادگی قائم ہے اور حسنِ کلام کو نقصان نہ پہنچے، وہ اپنے کلام کو طرح طرح کے زیورات اور رنگ برنگ کے پھولوں سے مزین کرتا، لیکن شوخی کے پہلو سے باطل دور رہتا تھا، اس کے کلام میں اتنی صفا فی ہے کہ زندگی کے ہر پہلو پر غور کرتے ہوئے بھی کسی کو خیالات کے تسلسل سے بے چین نہیں کرتا۔ انسان اور فطرت کے معمولی جذبات کی سبھی تصویر اس خوبی سے لکھنی ہے کہ گویا کسی معمولی چیز کو کھجیا

جاتا ہو اور داد و تحفہ کا کہیں نام تک نہیں، قدرتی مناظر کے پیش کرنے میں اسے یہ طبعی حاصل تھا، اس کی تحریر میں ایک خاص شان پائی جاتی ہے، جو وطن ( ) کے کسی طرح کم نہیں، اور یہ شان ایسی ہے جس سے اس کے قلوب کی صفا فی، اس کے کلام کی صداقت، اس کے خیالات کی بلندی کا انہار ہوتا ہے۔

## بہادر و بڑے چلو!

بہادر و بڑے چلو کبھی نہ پیچھے تم مہٹو رہے یہ بات دھیان میں  
وطن میں رہ کے قید ہو چلو چلو بڑے بڑھو بڑے بڑھان میں

بہادر و بڑے چلو

بہادر و بڑے چلو

وطن پر اپنی جان دو

وطن پر اپنی جان دو

بہادر اور مرد ہو کمی نہ جہد میں کرو نہ آنے پائے دل میں غم خدا کا تم پہ ہے کرم  
دکھا دو اپنے جوش کو بگڑ گئے ہو اب بنو کہ تم ہو اشرف الامم جلد میں پاؤ گے ارم

بہادر و بڑے چلو

بہادر و بڑے چلو

وطن پر اپنی جان دو

وطن پر اپنی جان دو

ہنیں ہے محض شاعری

یہ نظم قوم ہے کھری

دکھا دو شانِ جیدی

سکھاتا ہے بہادری

قومِ محبتی شہری

وطن پر اپنی جان دو

بہادر و بڑے چلو

## دھوکا؟

محمد حسام الدین خاں غوری

کی ایک لہر دوڑ گئی اور جب جنازہ نکلا تو کون بے درد و متاع جس کی آنکھوں میں آنسو نہیں چمک رہے تھے۔ دینا ناتہ نہایت ہی دقیق العقب تھے، وہ کسی کی آنکھوں آنسو دیکھنے کی تاب نہ رکھتے تھے۔ آہ! آج ہزار ہا غریب ان کے رورہے تھے، آنکھوں سے عقیدت و محبت کا دریا بہہ رہا تھا، لیکن دینا ناتہ کو اس کی پروا نہ تھی۔

دینا ناتہ کا قتل ایک عداوت کا سبب بن گیا تھا، اور ان کے قتل کے جانے کی کوئی وجہ سمجھ میں نہ آتی تھی، پولیس کی تحقیقات میں صرف اتنا ثابت ہوا کہ دینا ناتہ کے قتل سے کوئی ایک ہفتہ پہلے یعنی والد آباد میں آئی۔ وہ دیوانہ کی طرح ہلکی باتیں کیا کرتی تھی، اس کی مسموم اور دلکش صورت اور قابلِ رحم حالت پر لوگوں کو ترس آجاتا تھا، کوئی کھانا کھلا دیتا، کوئی پیسہ دوپیسے دیتا، اسی طرح اس کی زندگی بسر ہو رہی تھی۔

دینا ناتہ کے قتل سے ایک دن پہلے دیندار کی بیٹی پر تمباکو اس کی حالت پر رحم آگیا اور اس نے کئی ساڑھی جو تار تار پر مٹی مٹی بدلا دی، وہی نیلی ساڑھی قید میں بھی اس کے جسم پر تھی، اس سے زیادہ کوئی بات معلوم نہ ہوئی، 'مٹی کون ہے؟ کہاں سے آئی ہے؟ اس نے دینا ناتہ کو کیوں قتل کیا؟ یہ ساری باتیں کوئی نہیں جانتا تھا، گو اکثر لوگوں کا خیال تھا کہ کئی دیوانہائی ہے۔ اور اس نے حالت دیوانگی میں یہ حرکت کی، لیکن تعجب ہے اکثر لوگوں نے عدالت میں بیان دیا کہ اس کے حواس بالکل درست ہیں؟

کتنی اس کا نام تھا، اس میں ایک ایسی کشش تھی جو دیکھنے والوں کو زبردستی اس کی طرف کھینچ لیتی تھی، ایک مرتبہ اس پر نظر پڑ جانے کو بار بار دیکھنے کو جی چاہتا، اور بار بار دیکھ کر سب کو کئی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ کس کھانڈے حسین ہے، ساؤ لارنگ، کنٹی بیچر، دراز ناگ، بڑی بڑی سیاہ آنکھیں جن میں صدیوں کا غم پوشیدہ معلوم ہوتا تھا، ہلکے ہونٹ، کشادہ پیشانی اور لاغر جسم جو شاید کبھی گداز ہو گا۔

اس قتل کا مقدمہ چلا گیا تھا، لوگوں کا خیالی ہے کہ مٹی نے حالتِ جنون میں ڈاکٹر دینا ناتہ کے سینے میں چھرا بھونک کر انھیں ہلاک کر ڈالا۔ تین سال ہوتے ہیں کہ دینا ناتہ کا تباہ و آوارہ باد میں ہوا۔ وہ ایک کامیاب اور تجربہ کار ڈاکٹر تھے، انھوں نے اس قلیل مدت میں جو شہرت و ناموری حاصل کی وہ شاید کسی ڈاکٹر کو نصیب ہوئی ہوگی۔ وہ غریبوں کے سچے ہمدرد شریف اور نیک نفس انسان تھے، مجھے بھی دو بار مرتبہ ان سے ملنے کا اتفاق ہوا تھا، ان کی باتوں میں کچھ ایسی صداقت اور علامت ہوتی جو مخاطب کے دل کو سحر کر لیتی تھی، انھوں نے شادی نہیں کی تھی، اور یہ عجیب بات تھی کہ جب کوئی ان سے شادی کا تذکرہ کرتا تو وہ نہایت افسردہ و طول ہوجاتے تھے۔ گذشتہ دو بائیس انھوں نے غریب کس دن کا جس قدر دلچسپی کے ساتھ مفت علاج کیا تھا، اس سے ہر شخص کو ان سے دلی عقیدت پیدا ہو گئی تھی۔ شہر کا بچہ بچہ ان کے نام سے واقف تھا، ان کی موت پر سارے شہر میں غم



پرانی کو دیکھ کر کہا،

”تم جا اپنے پڑوس کے ڈاکٹر کو بلاؤ، میں بچے کو سنبھالتا ہوں۔“

پس منکر ڈاکٹر کے پاس دوڑی گئی، اس وقت شاید رات کے

دس بج چکے تھے، راستہ باطل مسان تھا، جب میں ڈاکٹر کے دروازے پر

پہنچی تو ڈاکٹر صاحب برآمدے میں بیٹھے کسی کتاب کا مطالعہ کر رہے تھے۔

میں کچھ کہے بغیر بیچوں پر چڑھ گئی۔ میری آہٹ پا کر وہ چونکے اور پھر

حیرت سے مجھے دیکھ کر بولے: ”کیوں مٹی؟ تم یہاں، اتنی رات گئے، کیا بات

ہے؟“

میرا نام ان کو کس طرح معلوم ہوا تھا، میں نہیں جانتی اور نہ اس وقت

مجھے ان کی زبان سے اپنا نام سنکر کوئی تعجب ہوا۔ شاید میں نے اس پر

عز ہی نہیں کیا، میں جواب دینا چاہتی تھی، لیکن آواز حق میں نہیں رہی

تھی۔

”میرا بچہ ڈاکٹر صاحب میرا بچہ بیمار ہے، ذرا آپ مل کر دیکھیے“ میں

اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکی۔ وہ تنہا میری طرف دیکھ کر کچھ سوچتے

رہے۔ پھر اٹھ کر کمرے میں چلے گئے اس وقت شاید مکان میں کوئی نہ تھا،

وہ اکیلے تھے، وہ اپنے کمرے کے اندر ہی سے بولے۔

”ہاں تو مٹی تھا رسے بچے کو کیا ہو گیا ہے؟“

”کچھ معلوم نہیں ڈاکٹر صاحب اس کا جسم کو ٹوٹی طرح دھاک رہا ہے۔“

میں نے غم سے تھرتا ہوا آواز میں کہا۔

”اچھا میں ابھی جاتا ہوں، آج صبح ہی بہت ہے، تم ادھر اندر آ جاؤ۔“

میں کمرے میں چل گئی۔ ڈاکٹر صاحب نے مجھ کو کچھ ایسی نظروں سے دیکھا کہ میرا

دل دھڑکنے لگا، ”ان کی آنکھوں سے شہوات نیک رہی تھی۔ میں وہاں سے

بھاگ جانا چاہتی تھی کہ ڈاکٹر نے میرا ہاتھ پکڑ لیا، اس وقت میری روح کانپ

گئی، شدت خوف سے میرے جواس مٹھل ہو گئے، کچھ کہہ نہیں سکتی، اس کے

بعد کیا واقعات پیش آئے اور میں کب تک ڈاکٹر کے کمرہ میں رہی کچھ یاد نہیں

جیگرے باہر نکل آئی تو معلوم ہوا کہ میں گناہ کی دنیا میں دھکیل دی گئی ہوں، ایک

غریب عورت کے پاس اس کی عصمت ہی سب سے زیادہ قیمتی ہے جو تھی ہے جس

کے ہمارے وہ زندہ رہتی ہے جب وہی اس سے چھن جائے تو پھر اس کے

پاس کیا رہ جاتا ہے۔ آہ اگلی گناہ کی رات کو میری زندگی برباد ہو گئی۔

جس وقت میں کمرے سے باہر نکلی تو میرے شوہر بچہ کو لیے دروازہ

پر کھڑے تھے۔ ان کا سارا جسم تھر تھرتھکا رہا تھا۔ ”مٹوں نے مجھے دیکھ لیا،

اس وقت کیا کر رہی تھی مٹی۔“ مختصاً بے ہوش ہو گیا تو میں گھبرا کر

میں سے آیا ہوں۔“

میں چاہتی تھی کہ اپنے بچہ کو گود میں لے لوں، لیکن اس معلوم ہوا

کوئی بچے سے کھینچ رہا ہے اور کہہ رہا ہے ”گھٹا رعورت اس معلوم کو ہاتھ نہ

لگا۔“ میرے منہ سے ایک چیخ نکل گئی، اور میں دیوانہ کی طرح بھاگی، میں

بھاگ رہی تھی اور میرے کانوں میں آواز آرہی تھی ”مٹی! مٹی! جیسے جیسے آواز

آتی تھی میں اور دوسرے بھاگتی جاتی تھی۔ اس کے بعد کچھ معلوم نہیں کیا ہوا۔

کہاں کہاں پہنچتی پھری، لیکن جب یہاں پہنچی تو ایک دن وہی ڈاکٹر مجھے

نظر آیا جس نے میری زندگی کو برباد کر ڈالا تھا، میرا خون کھونٹے لگا اور میں نے

اسی وقت قصائی کا چمڑا لیکر ڈاکٹر کے سینے میں بھونک دیا۔ بس اس کے

بعد کچھ ہوا نہ تھا وہ ہوا اور کچھ ہوا نہ ہے وہ ہو کر رہ گیا۔“

”بچے ہوئے مٹی کے چہرے پر ایک لمحہ کے لئے فحاشا نہ مسرت کھیل

گئی، لیکن میت جلد بھرا نسر دلی غائب آگئی۔“

میں نے کہا، لیکن ہمارے لئے اہل دائرہ کی جائے تو امید ہے کہ تم

بچ جاؤ گی۔“

مٹی نے اعتراض کیا۔ ”لیکن قید میں سسک سسک کر مرنے سے بچنا

کے تختہ پر مرنا کہیں بہتر ہے۔“

مجھے اس کا کوئی جواب نہ سوجھا مٹی نکال کر سر اٹھا کر بولی۔

”صرف ایک بات مجھے ڈک دے رہی ہے، لیکن ہے میری آنکھوں

کو دھوکا ہوا ہوا اور یہ ڈاکٹر جن کو میں نے قتل کیا وہ ڈاکٹر نہ، جس نے میری

زندگی برباد کر دی۔“

کیم کا مطالعہ

آزادی، دحریت و مساوات کا جذبہ پیدا کرتا ہے

# سعی نامشکو

عطارد اللہ پالوی

میں لا کر حضرت شوق نیروی کے اس قول پر مہر توشتی ثبت کرنا چاہتے ہیں کہ

”کلیک غلط العالم نصیح نا درواز غلط العوام آئندہ دفتر سے در

بر دو مضمون نہ نکالنا تا جبے خبری غلط العالم غلط العوام راستہ لیتا

پندارند“

اس بات کا مزید ثبوت یہ ہے کہ آپ نے تحقیق اصلاح ”مطبوعہ قدیم (گیا) کے

ختم ہوتے ہی ایک اعلان شائع فرمایا ہے، جس میں فرماتے ہیں کہ

”جون، اکتوبر، نومبر ۱۹۲۵ء اور اگست ۱۹۲۶ء کے قیام کی

مزدور ہے، اگر کسی صاحب کے پاس بر جاردوں نے یا انہیں

کوئی بھی برادر اسے دروازہ طور پر یا قینا دینا چاہیں تو چھو کر

اطلاع دیں نہایت مشکور ہوں گا“

پیر کلیف اردو زبان میں لفظ مشکور کے سنی شکر گزار استعمال ہونے کے

متعلق حضرت رضا قاسم نے مختلف قسم کی بحثیں کی ہیں، سب سے پہلے رسالہ اردو

لئے غلط العوام اس غلطی کو کہتے ہیں جو عوام اپنی جنات دے گی کے سبب کرتے ہیں، اور ان کے

وہ بات قابل سہ نہیں خیال کی جاتی، مثلاً ”شکر کے معنی میں مشکور“ وغیرہ (عطارد اللہ)

لئے ”غلط العالم“ اس غلطی کو کہتے ہیں جو عام لوگ جان کر کہے بھی کرتے ہیں یا بالفاظ دیگر

وہ غلطی جسے بالافتاح قاسم زبان ادبی اور سندھ ادبیوں نے اپنے کلام میں استعمال کیا ہو۔

مثلاً ”ادب کی“ ”بھنگی“ ”نارنگی“ وغیرہ وغیرہ (عطارد اللہ)

ذیل کا مضمون کہ قدرکن گستر پیٹلے ہوتے ہے، مگر اس سے میری

مراد حاشا و حاشا جناب رضا قاسم صاحب کی تنقید نہیں بلکہ اس کے ذریعہ

محض اصلاح و نظر ہے کہ وہ اردو زبان کے مستقر و حادہ و سانی

کو وہ معنائیں نہ عنایت فرماتے جائیں جو ایک مرتبہ کی دیگر

رسالے میں شائع ہو چکی ہیں، کیونکہ اس سے رسالے کی قدر و قیمت کم

ہو جانے کا اندیشہ ہے (۲) لفظ مشکور کو بعض شکر گزار یا کسی

”غلط العالم“ لفظ کو صحیح و مستقیم کہنے کی منہ کر کے زبان کو

موجود نہ کیا جائے۔ عطارد اللہ پالوی

رسالہ ”بکرم“ (دہلی) کے نامبر نمبر ۱۲ میں منظر دور کے مشہور اہل قلم جناب رضا قاسم

صاحب مختار کا ایک مضمون بعنوان ”تحقیق اصلاح“ شائع ہوا ہے، جو اردو زبان

کے متعلق ہونے کی وجہ سے خاص طور پر قابل ذکر اور لائق مطالعہ ہے، صاحب

موصوف کا یہ مضمون سب سے پہلے رسالہ ”ندیم“ (گیا) کے اپریل نمبر ۱۹۲۵ء

میں میری نظر سے گزرا تھا، اب اس مرتبہ ”بکرم“ میں شائع ہوا ہے۔ اس میں

مشتبہ ہیں کہ بعض مفید مضامین ایسے ہوتے ہیں، جن کی افادہ و حیثیت یا غیر

”معمولی“ پسندیدہ گی کے لئے اے بار شائع کرنے کی دعوت دینی ہے، اور وہ ہر

مرتبہ شائع ہو کر کچھ نہ کچھ فائدہ بھی پہنچاتے ہیں، مگر جہاں تک میں نے غور کیا

”تحقیق اصلاح“ میں کوئی ایسی خوبی نظر نہیں آئی جو اس کی مکرر اشاعت

کو قابل تحسین قرار دے۔ بجز اس کے کہ صاحب موصوف لفظ ”مشکور“ کو ”شکر گزار“

کے معنی میں زبردستی لکھ کر ایک ایک غلط العوام لفظ کو ”غلط العالم“ کی صفت

کے لئے دینی اور لکھنؤ کی زبان مستدامی مانتی ہے۔

ایسی صورت میں مختار صاحب موصوف کا صرف غلط الفاظ کی چند مثالیں پیش کر کے یہ کہنا کہ جس طرح وہ صحیح تسلیم کئے جاتے ہیں اسی طرح ہر وہ غلط لفظ صحیح ہے جو اردو زبان میں رائج ہو گیا ہے، صحیح اور فصحی نہیں ہے۔ صاحب موصوف نے تو صرف چار پانچ ہی مثالیں پیش کیں ہیں، حالانکہ اردو زبان سے ہزاروں الفاظ ایسے پیش کئے جاسکتے ہیں جو اصل زبان سے علیحدہ ہو کر اردو میں باطل دوسرے معنوں میں مستعمل ہیں۔ مگر چونکہ ان کا شمار غلط الفاظ میں ہے لہذا وہ ان الفاظ کے مقابلے میں نہیں پیش کئے جاسکتے جو "غلط العوام" کے تحت میں آتے ہیں۔ بلکہ بقول پروفیسر تاجہ رفیعہ اور مستند ادبا کا استعمال سند صحت و فصاحت ہے۔ جو غلط یا مبینہ زبان کے لٹریچر میں استعمال ہوا ہے۔ وہ صحیح ہے اور جو غلط استعمال نہیں ہوا وہ بے حال غلط رہے گا چاہے اس کی صحت میں آسمان وزمین کے قلابے ہی کیوں نہ ملا ڈالے جائیں۔

## دوسری بحث

مختار صاحب موصوف کی دوسری بحث یہ ہے کہ لفظ "مشکور" بھی اور غلط الفاظ کی طرح اردو میں یعنی "مشکر گزار" استعمال ہوتا ہے لہذا وہ اس معنی میں اب عمومی نہ رہا، بلکہ اردو بن گیا اردو اس معنی میں صحیح ہے جو اردو زبان میں رائج ہو چکا ہے۔ "سپر آگے چل کر عبد الاحد پر اعتراض کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:-

"تجربہ کہ قابل اصلاح کار نے نہ معلوم کن اصولوں کی بنا پر غلط مشکر کا استعمال زبان اردو میں احسان کے معنی پر غلط نظر آیا ہے۔"

لہذا بہتر ہوگا کہ ان اصولوں کو بتانے کے لئے عرض اردو زبان کے نامور شاعر و ادیب حضرت علامہ عتیق احمد جوہی کا وہ قول نقل کر دوں جو رسالہ شاعر (آگرہ) کے دسمبر ۱۹۷۷ء میں شائع ہوا ہے اور جس میں بتایا گیا ہے کہ لفظ "مشکور" کا استعمال "مشکر گزار" اور شاعر کے معنوں میں کیوں اور کس طرح غلط ہے۔ وہو لہذا:-

"ایک صاحب جو ادب اردو میں نمایاں مرتبہ رکھتے ہیں انھوں نے ایک خط میں مشکر کہنی مشکر گزار استعمال کیا، اس پر جناب

بابت ماہ جنوری ۱۹۷۷ء کا ایک اقتباس پیش کرتے ہوئے ثبوت میں غلط کو متفقہ حقہ، تادورہ اور سبک وغیرہ کی مثالیں پیش کی ہیں، اور ان کی شرح مرحوم کی اس بحث کو پیش کیا ہے جو "الفاظ" اور "تجلیک" وغیرہ کے معنی "آب حیات" سے نکل کر سینکڑوں جگہ نقل ہو چکی ہے، اور ان سب کے بعد مولانا شبلی نعمانی مرحوم کی وہ عبارت نقل کی ہے جن میں مولانا مرحوم نے "مشکر گزار" کی جگہ پر "مشکور" لکھ کر لفظ "مشکور" پر بحث کرنے والوں کے لئے ایک شاہراہ تیار کر دی ہے، لہذا آئیے ان دلائل کا تجزیہ کر کے دیکھا جائے کہ حضرت رضا قاسم کے دلائل کس حد تک درست ہیں۔

حضرت رضا قاسم صاحب کی بحث کے تین اجزاء حسب ذیل ہیں، اور ہیں دیکھنا یہ ہے کہ ان تینوں کا تجزیہ ہمیں کس نتیجے پر پہنچانا ہے۔  
(۱) اردو زبان میں اکثر و بیشتر ایسے الفاظ نظر آتے ہیں جو اپنی زبان سے علیحدہ ہو کر اردو میں باطل دوسرے معنوں میں مستعمل ہیں اور وہ صحیح تسلیم کئے جاتے ہیں۔

(۲) لفظ "مشکور" بھی ان ہی الفاظ کی طرح اردو میں مشکر گزار کے معنی میں مستعمل ہو گیا ہے، اس لئے اسے غلط سمجھنا غلطی ہے۔  
(۳) مولانا شبلی نعمانی مرحوم نے اسے اسی معنی میں استعمال کیا ہے۔

## پہلی بحث

اردو زبان نام ہے ایک ایسی زبان کا جو تمام زبانوں کے مختلف الفاظ سے مل کر بنی ہے۔ لیکن جب ہم دوسری زبانوں کی تحقیق کرتے ہیں تو ان میں بھی غیر زبانوں کے بیشتر الفاظ ایسے ملتے ہیں جو مبہوم، غلط اور تباہ کے ساتھ ساتھ صورت شکل میں بھی بدل گئے ہیں۔ اس لئے اردو زبان میں بھی جو الفاظ دوسری زبانوں کے آئے ہیں، وہ یقینی جمل گئے ہیں اور یہ بھی قطعی درست ہے کہ اکثر و بیشتر الفاظ محض غلط طریقے پر اردو میں مستعمل ہو گئے ہیں۔ مگر الفاظ الفاظ میں فرق ہے، چنانچہ خود مختار صاحب موصوف نے اپنے مضمون "ہماری زبان" میں لطافت زبان کے تحت فرمایا ہے کہ:

"جن الفاظ کو خواہ وہ کسی زبان کے ہوں اردو نے اپنا ایسے وہ بھیجے، مانے جاتے ہیں، اسی کا نام لگالی زبان ہے جس کو کہتے

سیاہ ابر کا بادی نے اعتراف کیا۔ اس اعتراف کے جو اب میں  
انہوں نے جو جو ذیل پیش فرمائے۔

(۱) شکر یعنی شکر گزار اور دوزبان کا تصرف ہے۔ اس کے اہل  
معنی تو ہیں وہ جس کا شکر ادا کیا جائے۔ مگر دوزبان میں اگر  
معنوی تغیر ہو گیا ہے جیسے۔

الف۔ لغویہ کنوئی میں تو اس کے معنی کچھ اور ہیں مگر اردو میں  
قبر کا لغویہ اور ہی معنی پر مشتمل ہے۔

ب۔ حقہ کنوئی میں ڈبے کے معنی پر ہے، اردو میں قیاس کو  
کہتے ہیں۔

ج۔ سرور کنوئی میں خوشی کے معنی ہیں۔ اردو میں نئے کے معنی ہیں

د۔ ریل انگریزی میں پڑی کو کہتے ہیں۔ اردو میں پڑی پر  
چنے والی گاڑی کو۔

جس طرح ان تمام الفاظ میں اردو نے معنوی تغیر کر لیا ہے  
اسی طرح شکر یعنی شکر گزار کو بھی سمجھنا چاہیے۔

(۴) ممنون دوسروں کی محبت رکھتے ہیں۔ مگر شکر سے بہت  
پہلے اور اب ہم دہلی قلم نے ان کا استعمال نامعنی میں کر لیا  
ہے اور اب کسی کو اس سے اجنبیت نہیں رہی۔

(۵) غلط و ضعیف مترجم محمد امین صاحب زیری مطبوعہ آگرہ  
خط نمبر ۳ میں ہے: ”آپ کی تکلیف فرمائی کہ بہت شکر ہوں۔“  
عوض تین تین باتیں ہیں جن سے شکر کو بھیجنا کہ اردو میں کسی  
تغیر نہ لایا گیا ہے۔

## میری گندارش

نبرد میں ممنون اور ہم دونوں کو قربانہ شکر سے بھی پہلے اہل علم نے

لے ثبوت میں دی جب شایں دی گئی ہیں جو حضرت رضا قاسم نے پیش کی ہیں۔ اس نے عجیب  
و غریب طاقت کہو جن سے بعض اوقات شبہ ہوتا ہے کہ کیا حضرت رضا قاسم صاحب بھی  
سیاہ صاحب کو جا ب دیا تھا؟ ممکن ہے کہ اردو کی صاحب چوں، اور یہ صرف اتفاق پر (دعا)  
تھے تیری ہے مراد علامہ پیش ہیں۔ احتیاطاً عرض کیا گیا۔ (علامہ راشد)

انہیں نامعنی معنی میں استعمال کیا ہے، بالکل بے مینا و بات ہے،  
اگر کوئی ممنون کے معنی منت گزار سمجھ لے تو یہ اس کی سمجھ کی  
نقصی ہے۔ مگر یوں کے معنی بھی گرد کرنے والے کے آج تک  
کبھی اردو میں متعارف نہیں ہوئے۔ لوگوں نے اسی غلط قیاس  
سے دھوکا کھا یا کہ جب یوں کہنا صحیح ہے کہ میں آپ کا ممنون  
ہوں تو یوں کہنا بھی صحیح ہوگا کہ میں آپ کا مشکور ہوں۔ حالانکہ

اول فقرے کے معنی میں وہ ہوں میں آپ کا احسان ہے اس میں  
معنوی مراد و مطلب صحیح رہتا ہے۔ مگر دوسرے میں معنی غلط مراد ہر جہت پر

### تصرف کی بحث

اب یہ دیکھنا ہے کہ آیا غلط شکر یعنی شکر گزار اردو زبان کا تصرف  
ہے یا نہیں؟ اس کو اردو سمجھنا چاہیے یا نہیں اور اس پر تصرف نافذ  
ہونے کے شرائط کا اعلان ہوتا ہے یا نہیں، کیونکہ اگر لغت نے  
غلط اور تصرف کی کو بیچانے کے لئے چند باتیں مقرر فرمائی ہیں تو صرف  
نافذ غلط کی سہاحت یہ ہے۔

(۱) کہ اسے قبول عام ماسل عام ہو یعنی عام لوگ بھی استعمال کرتے ہوں  
اور خاص لوگ بھی کسی کو اس سے احتراز نہ ہو۔ عام لوگوں سے مراد  
خواہ مذہب و اشخاص ہیں اور خاص لوگوں سے مراد صاحبان علم و فضل۔

(۲) اس کی تصدیق ممنون نے ہو یعنی کسی نے اس کو غلط نہ مقرر کیا ہو۔  
بہت سے اہل علم بھی کسی قاعدے سے ذہول، خلقت یا اور کسی  
قرب لکھا جائے کی وجہ سے کسی غلط کا اشتہار غلط کر بیٹھے ہیں،

یا کسی غلط کو اس کے معنی سے متاثر کر کے استعمال کر لیتے ہیں جیسے  
لفظ ثناءت کہ نیکو کہ نیکو بنا لیا، اور اس بات سے ذہول گیا  
کہ لغوی میں کوئی مادہ نہیں ہے، نیکو تو دن کی ایک معلیٰ بہت ہے۔

عرب و ثن کے وزن کے لغویوں میں اول کی داد کو آخر میں بنا کر لگاتے  
ہیں نیکو کہ نیکو بنا لیا، اور اس بات سے ذہول کی وجہ سے تھا۔  
مشابہتوں ثناءت لکھ گئے ہیں۔ سمجھ لیں اردو میں شکر بھی لکھ

لے اس میں شبہ نہیں کہ ثناءت نیکو سے بنا لیا گیا ہے اور اردو سے قاعدہ غلط ہے مگر  
سبکی کے علاوہ بھی اکثر لوگوں نے لکھا ہے۔ مثلاً مگر مراد آبادی فرماتے ہیں۔ ج  
مفت معصوم صفت حسن ثناءت دشمن

لفظ تصرف یا تصرف نہیں ہو سکتا، اس کے بعد اگر کوئی اہل قلم کے گا تو اس کی بقول چوک بھی جا بھیجے۔ قرع کا توفیق، حق، سرور اور قبل کو میں اور آپ خاص و عام سب نئے معنوں میں بولتے ہیں۔ کسی کو بھی ان کے بولنے میں تاخیر و اجازت نہیں، کلام اساتذہ اردو زبان میں بھی موجود ہیں۔ نہ کہیں ان کی تقلید ہوئی، اسی لئے یہ جیسا اردو لفظ بن گئے ہیں۔ مشکور کہ ان سے کوئی نسبت نہیں، اس فقرہ یا نہ لفظ کی شریں بھی پوری نہیں اتریں۔ بہر حال! پس نے زبان کو آشوب غلط سے بچانے کے لئے یہ چند سطریں عرض کر دی ہیں۔

یہ وہ خیالات ہیں جو اردو زبان کے ایک مستند ادیب اور شاعر نے ظاہر فرمائے ہیں، اور لفظ یہ کہ یہ چند سطریں، شائع ہوئی ہیں، الکبر آباد کے اُس جریدہ میں جس کے ایڈیٹر اُس وقت جناب بہت سب اب الکبر آبادی بقول حضرت تاجور نجیب آبادی اردو سے لکھی کے مالک تھے۔ دہلی کا مستند رسالہ ساتی عرض سے میرے پیش نظر ہے، اور اُس میں تمام زبانوں دہلی اصحاب کے معانی نشر و نقل شائع ہوتے ہیں، مگر کسی دہلی اہل قلم نے "مشکور" یعنی مشکور اور استعمال نہیں کیا، البتہ ایک مرتبہ مسٹر بیہم چند بیکٹھ باشی نے ساتی میں لفظ "مشکور" یعنی "مشکور گرا" لکھا تھا، منشی پرچند چند پابہ افشاں نگار کے لحاظ سے چاہے کچھ بھی بولا مگر وہ نہ تو مستند اہل قلم کہے جاسکتے ہیں اور نہ اہل زبان۔ پھر بھی قرینہ غالب ہے کہ منشی صاحب موصوف نے بھی بکول ہی سے لکھا ہوگا، ورنہ "پرچند" کے تقریباً سارے کارنامے میری نظر سے گزر چکے ہیں۔ بجز ایک مرتبہ کے (کوہ میں نے مشکور یعنی مشکور گرا نہیں دیکھا۔ لاہور اور لکھنؤ کے بھی رسالے میری نظر سے برابر گزرتے ہیں، مگر کسی جگہ لفظ "مشکور" یعنی مشکور گرا میری نظر سے نہیں گزرا۔ اسی صورت میں بقول خود حضرت رمضان قاسم صاحب کراچی اور لکھنؤ کی زبان مستند مافی جاتی ہے "لفظ مشکور کی کھمت میں نہ لکھنؤ کی مثال تھی ہے نہ دہلی کی، اور اس لئے خود ان کے الفاظ میں لفظ مشکور بالکل غیر مستند ہے۔

### تیسری بحث

تیسری بحث یہ ہے کہ مولانا شبلی نعمانی نے اسے اسی معنی میں استعمال

دیا ہوگا جیسے کہ فارسی لفظ پیشوا جس کے معنی بہرورد ہنکے ہیں، ذوق نے ان سے اسے اسے تہاؤ کے استعمال کے معنی پر استعمال کر لیا ہے۔ "پیشوا" کے گرجا کو ان ہی کے سیکھ جائے۔ "ذوق" کہ ذہول اور غفلت کی وجہ سے اگر کوئی کچھ لکھ جائے تو اُس کو خطا تصور کریں گے۔ (۳) جس لفظ کی تقلید کی گئی ہو اور اُس نے اس کے فضا اور بابتے خاصہ رو کر اُسے تسلیم کر لیا ہو۔ بالخصوص نے قول سے بھی تائید کر دی ہو۔ تو اب اس لفظ کے غلط ہونے پر گویا اجماع ہو گیا وہ ہمیشہ غلط ہی رہے گا۔

### لفظ مشکور پر یہ تینوں باتیں منطبق نہیں

(۱) اسے قول عام حاصل نہیں، خاص اس سے ہمیشہ محترم رہے ہیں۔ مستند شعرا کے دو ادیب و تصانیف ان معنی میں استعمال کے جانے سے خالی ہیں۔

(۲) اس کی تقلید مستولی ہے۔ غلط زبان چرچہ قدر لکھنؤ میں لکھی گئیں سب میں اس کی تقلید ہوئی۔ ذرا لغات تک میں یہ لفظ استعمال ہے۔ گو بہر زمانے کے لوگ بالافتق اسے غلط مننے چہ آتے ہیں۔

(۳) محال مرحوم نے اس کے معنی میں اس کی طرف سے اس کی تقلید کا چچا اعلان ہوا۔ اُن کے نام معاصرین نے اسے تسلیم کیا۔ نیران کے معاندین نے بھی جو ان کی جانب باتوں میں دیکھ نکالے گئے تھے، اس امر میں اُن کی تائید کی، ملاحظہ ہو، ازالتہ افلاطون نبوی، آفاقہ اتیمو شقیم وغیرہ اس زمانے کے اہل کمال و اہل زبان نے اسے غلط تسلیم کیا، کیونکہ جن کی ہون میں یہ کتبیں ہیں (دستور انصاف وغیرہ) ان پر ان کی تقریریں اور تائیدیں لکھی ہوئی ہیں۔ لہذا مشکور بمعنی مشکور گرا کے غلط ہونے پر سب کی مہر ہے، اور اس زمانے کے تمام مضامین زبان اردو کا اس کی تقلید پر اجماع ہے۔ اب یہ

(بقیہ جلد چھٹھی) اس کے علاوہ جناب خواجہ عبدالحمید صاحب نے مولف صاحب لغات نے بھی فقہت کی کھمت کو مان لیا ہے، خیال آئے کہ حضرت عبدالباری اسی نے بھی کچھ جگہ ثقافت لکھا ہے، اسی صورت میں اگر ثقافت کو صحیح دیکھیے تو بھی وہ اس قدر غلط نہیں ہے کہ اسے مشکور کے غلط لفظ کے متعاقب میں پیش کیا جائے۔ (علامہ اندر)

”شکور بھی اس موقع پر یقیناً غلطی سے لکھا گیا، ورنہ سارے خطوط میں ہی ایک جگہ کی قصص کیوں ہے؟ بہر کیف آخر میں صرف اسی قدر کہنا ہے کہ ”شکور کو معنی ”شکر گزار“ صحیح تسلیم کرانے یا باور رکھنے کی سعی ناشکور اردو ادب کے لئے حد درجہ نقصان دہ ہے۔“

کیا ہے تو اس کے متعلق ادھر ہی بحث ہو چکی ہے۔ اس لئے مزید ضرورت نہیں۔ البتہ اس قدر ضرور کہنا ہے کہ مولانا صرفت کو سبیل چوک سے سزا مرچاؤک سمیت بڑی نادانی ہے، مستحکم مرحوم نے اپنے ان ہی خطوط میں ”اے“ کو اکثر مرتعوں پر لکھا ہے جو قطعاً غلط اور خلاف اتفاق چھوڑے، اس لئے

## یہی دنیا

عشق پیتا ہے جہاں خونا بہ دل کے ایاغ  
جس جگہ لکھی گئی ہیں حسن کی تقدیر میں  
جس جگہ روٹی کے ٹکڑے کو ترستے ہیں مدام  
جس جگہ حق بات کہنے والے مردانِ خدا  
گھورتے ہیں جس جگہ ظالم لٹا رہیں سونٹ کر  
جس جگہ حب وطن کے جذبے سے ہو کر طیاں  
جس جگہ انسان ہے وہ پیکر بے عقل و ہوش  
جس جگہ یوں جہنم میں تہذیب کے پروردگار  
جس جگہ سختی ہے یوں مزدور کے دل کی فدا  
جس جگہ سرمایہ خنڈی شب میں ٹھہرے ہونٹ  
جس جگہ انسانوں سے تربیتی ہیں معصوم انکھڑیاں  
جس جگہ دہقان کو رنج و محنت کو کشش ملے

آنسوؤں کے تیل سے جلتا ہے الفت کا چراغ  
اہل دولت کی غلامی، جھڑکیاں اور دلتیں  
”سیم و زر کے دیوتاؤں“ کے یہ قسمت غلام  
موت کی پاتے ہیں شیدا یا باطل سے سزا  
لفظ آزادی ”جو آتا ہے کسی کے ہونٹ پر  
سُلی کی رسی کو ہنسر چومتے ہیں لوجواں  
لوچ کر کھاتے ہیں جس کی بوٹیاں مذہب فروش  
جس طرح مٹرتے ہوئے مردار پر مردار خوار  
فیکٹری کی چمینیوں سے جس طرح نکلے دھواں  
چومتی ہے روکے بیوہ کال سوتے لال کے  
جس جگہ کانٹوں سے زخمی ہیں گلوں کی پٹھریاں  
اور لوٹاؤں کے کتوں کو حسین پوشش ملے

تیرے شاعر کو یقین آتا نہیں، رب العلاء!

جس پہ تو نازاں ہے اتنا وہ یہی دنیا ہے کیا

# دیوارِ چین پر ایک طائرانہ نظر

اللہ اعلم بالصواب

دیوارِ چین دنیا کے سات عجائبات میں سے کیوں نہیں ہے؟

یہ ایک سوال ہے جس پر سنڈے دل سے غور کرنا چاہیے۔ بہتر سے مورخوں نے بال کی کمال نکال کر اس رازِ سرِ بستہ کے کھولنے کی کوشش کی ہے اور اس نیچے پر پینچے ہیں کہ چونکہ اس انتخاب کا سہرا بعدِ متوسط کے اس گروہ کے سر ہے۔ جو مغرب کے دان میں پھلے تھے، اس لئے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنے دہلیز کی چیزوں پر دوسرے دہلیز کو ترجیح دینا انسانی عادت کے خلاف سمجھا ہوگا اور حقیقت یہ ہے کہ ہر فرد کو انسانی اپنے دہلیز کے خارج کو بھی پرانے دہلیز کے گھڑا پر ترجیح دینے میں دریغ نہیں کرتا۔ ایک معقول وجہ اور بھی ہو سکتی ہے مگر یہ کہ ان حضرات نے اپنے انتخاب کا معیار مشاہدہ پر رکھا ہو۔ اور دوری کی وجہ سے دیوارِ چین کا تذکرہ ہی ہل چھوڑ دیا ہو۔

الغرض یہ حقیقت انہیں نہیں ہے کہ دیوارِ چین کی شانِ اوقاف اس بات کی متغیر کرتی ہے کہ اسے بھی دنیا کے سات عجائبات میں شمار کیا جادے۔ ورنہ اس حقیقت سے انکار کرنا آفتاب پر خاک، اڑنے والے مصداق ہوگا۔

چین بہت قدیم زمانے سے تہذیب کا گہوارہ رہ چکا ہے، اس کے دامن میں وہ صاحبِ اہل پچھلے پورے جن کے سامنے بڑوں کی دال نہیں لگی، ان میں سے ایک نامور تاجدار شہنشاہی، گڑ ماہی، یہ چین کا وہ حکمران ہے جس کے سرِ بادشاہت کا تاج رکھا گیا اور جس نے ایک ایسی غلامی

سلطنت کی بنیاد ڈالی کہ دو ہزار برس کے دوران میں کوئی بھی اس کا ایک بال بکا نہ کر سکا۔ اس کے شاندار دور کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر اس کو شاہِ ہفتِ اقلیم و ہفتِ کشور کہیں تو بے جا ہونگا۔ سکندر اور دارا کو اس کے درکار بان مہر امیں تو انصاف پر دوری سے بعد نہ ہوگا۔ مورخین اس شاہِ نامدار کی تعریف میں ایسے رطب اللسان ہیں جس سے واضح ہوتا ہے کہ اس کے شاندار دور کا ذکر کے بغیر دنیا کی تاریخ غیر مکمل رہ جاتی، بلکہ اس کی ناک ہی کٹ جاتی۔

انفصافِ باد و جو اس شان و شوکتِ جاہ و منصب اور کرد و فرما کے اس شاہِ بلندِ اخراج کو یہ خیال دامنگیر ہوا، کہ انسان آخِ کہاں سے آیا کہ اس لئے آیا اور اس کا انجام کیا ہوگا؟ ان تصورات میں بہت عجب ہوا، آخر کا جب کچھ بن نہ آئی تو دنیا بھر کے بچوں کے جھجکے کرنے کا حکم دیا، ایک بچہ غیر بچوں کی طرح حاضر دربار ہوا، یہ مسند ان کے سامنے پیش کیا گیا، کئی دن تک غور و خوض ہوتا رہا۔ تاریخوں کا وقت ہی دیکھا گیا، گزشتہ انسانوں کی زندگیوں کا مطالعہ کیا گیا، اور آخر کار اس نتیجے پر پہنچے کہ دنیا ایک سراب ہے، انسان فانی ہے، اس دنیا سے دوں میں کوئی انسان کتنا ہی بلند اقبال کیوں نہ ہو ایک دن موت کا مزہ مزہ دیکھنے لگے۔ یہ سنکر بادشاہ کے حواس باختہ ہو گئے اور میا خستہ ہو چھینے لگا کہ میرا کیا حشر ہوگا؟ تمام بچوں نے ایک زبان ہو کر کہا کہ شاہِ عالی منزلت! تیری موت قومِ حق کے ہاتھوں ہوگی۔ یہ اس وقت چین کی شمالی سرحد پر رہتی تھی۔

سکونت کرتا۔ اس خیال سے کہ کسی طرح بھی موت کے فرشتے کو میری قیامتگاہ کا پتہ نہ چلے۔

قسمت کا پٹا دیکھنے کے جب اُس کی موت کا وقت آتا ہے، تو خود اس کا بھائی دوران سفر میں اُس کو قتل کرتا ہے، وہ موت کا شکار ہوتا ہے۔ دیکھتا ہے مگر دنیا کی کوئی طاقت اس کو بچا نہیں سکتی۔ انسان کی زندگی کیا ہے، پانی کا ایک بلبل ہے۔ ہوا کا ایک ہلکا سا جھونکا آیا، اُد غائب۔ سچ ہے اور بالکل سچ کیا؟ یہ کہ اِذَا جَاءَ أَجْلُكُمْ لَا يَسْتَأْذِنُ سَاعَةً وَلَا يَسْتَقْدِمُ يَوْمَئِذٍ

بادشاہ کے مرنے کے بعد اس کا بیٹا تخت نشین ہوا۔ اُس نے اپنے والد کی موت پر وہ وہ کام کے کہ اگر انہیں مجنونانہ انداز سے تعبیر کریں تو صحیحاً نہ ہوگا۔

بادشاہ مقتول نے اپنی موت سے پہلے زمین کے نیچے ایک ہیٹ بڑا تختہ خانہ بنایا تھا۔ عام ہیٹ بائبل زمین کی طرح تھے۔ یعنی کہیں پہاڑ اور کہیں دریا بناتے تھے۔ جوت آسمان کی طرح بائبل نیلے رنگ کی بنائی تھی، اور اُس میں ایک ترکب سے ستارے ٹپکتے تھے۔ جن میں قدرتی ستاروں کی طرح جھک دمک موجود تھی۔ کہیں کہیں موم بتیاں نصب کی گئی تھیں۔ سنا ہے ان کی روشنی سو برس کے لئے کافی تھی۔

بادشاہ کے جاشین نے کافی مال و زر بادشاہ مرحوم کے ساتھ قبر میں دفن کیا، اور اپنے والد مرحوم کی روح کو خوش کرنے میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہ کیا۔

ہاں ایک تعجب انگیز بات رہ گئی۔ وہ یہ کہ جب بھی کوئی آدمی اس تختہ خانے کے اندر جاتا، اُس کو موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا۔ اس مصلحت سے کہ اس کاراز کسی پر افشا نہ ہو۔ یہ دیوار زمین کی مختصر داستان تھی جو کہ آج دنیا کے لئے عبرت ہے۔

## ضروری اطلاع

ہر شہر میں رسالہ کیم کے لئے دیانتدار کتب خانوں کی ضرورت ہے

یہ سنئے ہی بادشاہ نے علم جاری کیا کہ شمالی سرحد کو قوم ہنو سے خالی کر دیا جائے، اور اُن کے جو افراد ملک چین میں ہیں اُن کو تلوار کے گھاٹ اتار دیا جائے۔ ملک چین کے چاروں طرف حصہ بندی کی جاوے تاکہ کسی بھی ذریعہ انسان کو چین پر دھاوا کرنے کی جرأت نہ ہو سکے۔ فرمان شاہی بجا لایا گیا۔ ہزاروں افراد قوم ہنو کے بڑے بڑے دریدی اور بے رحمی سے قتل کئے گئے۔ بڑے بڑے گھرانے، نام کدے بن گئے۔ لکھی کو چن میں خون کے دریا بہنے لگے۔ ایک ماں کو بچانے کے لئے نہ معلوم کتنی جانیں لی گئیں۔ جب قوم ہنو کا ایک فرد بھی زندہ نہ بچا تو فیصل کی تعمیر شروع ہوئی۔ ملک چین کی وہ فیصدی آدمی نے اس کے بڑانے میں حصہ لیا، جنہوں نے انکار کیا، اُن کی ہڈیاں فیصل کے اندر چن دھکی گئیں۔ خانہ بنا کر بادشاہ نے اُن کے بچوں کو تہ تیغ کیا گیا، الغرض ایک کوہ پیکر دیوار بنا رہوئی، جس کی اینٹ اینٹ انسانوں کے خون پیئے سے جھی ہوئی ہے۔ جس کی بنیاد ان گنت انسانوں کی خواہجہ بن چکی ہے، ایک جان کو بچانے کیلئے تعداد جلاؤں کا خون کرنا کہاں کی انسانیت ہے۔ ایک گنت زار کو سرسبز کرانے کے لئے ہزاروں کا پال کرنا کہاں کا انصاف ہے۔ ایک نخل تنہا کو بار آور کرانے کے لئے ہزاروں کو بچی کے نذر کرنا کہاں کی خرافات ہے۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ یہ دیوار مجسم مرتع ہے اُن انسانیت کش اور دلخراش واقعات کا جنہیں سن کر دنیا خون کے آئینہ رو چکی ہے۔

یہ دیوار بحر چین کے قریب سے شروع ہو کر وسط ایشیا تک پہنچی ہے۔ اس کی کل لمبائی ڈیڑھ ہزار میل ادھیڑائی میں ڈنٹ اور سونٹائی، اٹھارہ فٹ یعنی چھ گز ہے۔ اس کی حفاظت کے لئے سو سو گز کے فاصلے پر ایک ایک برج بنایا گیا ہے، اس دیوار کی ادھیڑائی نشیب و فراز، دریاؤں اور پہاڑوں پر کیساں رکھی گئی ہے۔

بادشاہ نے موت کے ڈر سے نہ صرف یہ کام کیا بلکہ اپنے بچاؤ کے لئے خوراک ایک عظیم الشان عمارت کے بڑانے کا حکم دیا۔ سات لاکھ مرد روزانہ کام میں لگے رہے۔ چند دن کے اندر اندر ایک شاندار محل تیار ہو گیا۔ جس میں بے شمار کمرے تھے، بادشاہ روزانہ جہاں جہاں کمرہ میں

# الطاف مشہدی کی شاعری پر ایک نظر

خلیق قریشی، ہنسی، ہنس، لالچ

ابتداءً آفرینش سے لے کر انسان اپنی گونا گوں قوتوں کی وجہ سے ممتاز اور ممتاز رہا ہے۔ انسانی فکر کی بندی پرواز سے بڑا بار اخترامات کرم سے عالم وجود میں آئیں۔ لاکھوں محیر العقول کارنامے انسانی دست و بازو کے مرہون احسان ہوئے اور کروڑوں ایجادات نے ذہن آدم کے لامحدود قوتوں پر بہر تصدیق ثبت کی۔ علی الخصوص عہد حاضرہ، دماغ انسانی کی جولاہیوں کا اکل مرقع ہے۔ آج عصر آدمی کے قلم میں ایسے پروبال انسان ہنات مانتا دشوکت سے ہوا میں پرواز کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ سمندروں کے سینوں کو چیرتا ہوا ان کی اعواء گہرائیوں تک پہنچ جاتا ہے۔ دقت نظری اور طبع فکری کا یہ عالم ہے کہ سبوں، پتھروں اور سبوں کی ہیئت کیمیائی و ترکیبی معلوم کی جاتی ہے۔ مگر بالآخر ایک نقطہ ایسا آ جاتا ہے جہاں سائنس اور فلسفہ کی کوئیں لا حاصل اور بے سود نظر آتی ہیں۔ ایک سائنسدان یہ دیکھ سکتا ہے کہ بھول کی تخلیق اور ان کی تدریجی نشوونما میں کون کون سی قوتیں کام کرتی ہیں؟ ہنسی مادہ اور ترکیب عالم پر سرِ عامل بحث کو سکتا ہے، لیکن گل کی نکبت اور پیراٹل کی دلاؤ بڑی کو محسوس کرنا یا آس سے محفوظ ہونا یہ سائنس دان اور فلسفی کے بس کا سگ نہیں۔ اس منزل پر عقلی انسانی، اور ادراک پر شعری کوڑک جانا ہوتا ہے وہاں سے آگے لا سکاں کی منزلوں میں قدرت کے اندرون دل میں جانے کے لئے، تفریق فضول و جزاٹ رندا نا چاہئے۔ جو شعراء میں مقرر ہوتی ہے۔ اگر سائنس اور فلسفہ میں صفحہ عالم کے نقوش غائبی کو دیکھنے میں مدد دیتا ہے۔ تو شاعری

شاعری فی الاصل، دل کا غم، دل کی زبان سے بیان کرنے کا نام ہے۔ جسے قدرت اس قوت سے تصف کرے وہ شاعر کے نام سے پکارا جاتا ہے، اور چونکہ شاعر دل کی کیفیات کا ترجمان ہوتا ہے، اس لئے اسے عام آدمیوں سے عزت و وقار اور تعلیم کے مدارج میں متمتع کر لیا جاتا ہے۔ کسی قوم کے تمدن، اخلاق اور ادب کے ارتقا میں شاعری کی مساعی کو بہت زیادہ دخل ہے، بلکہ بیشتر شاعر اس غیر کا شمار ہوتا ہے، اور اس کا کلام وہ بنیادیں ہیں جن پر قومیت کا عظیم الشان قہر تعمیر کیا جاتا ہے۔ چنانچہ انہی اثرات کے زیر نظر حضرت جوش ملیح آبادی فرماتے ہیں کہ شاعر اپنی صدی کی بہترین تصنیف ہے، مثلاً کلام اپنے زمانے کا بہترین آئینہ ہوتا ہے، جس میں دنیا اور واقعات عالم کا انعکاس پوری آب و تاب سے چمکتا ہے، اور حقیقت میں آنکھ آس آئینہ میں سے تاریخ عالم اور تعمیر آدم کے مآخذ کا تجزیہ کر سکتی ہے۔

اس کے علاوہ شاعری بذاتِ خود تخلیقات اور احساسات کی زبان ہوتی ہے۔ چنانچہ ہرگز کا مقلد ہے کہ شاعری خیال و جذبات کی زبان جو ”نظارہ تو یہ ایک چھوٹا سا جلد ہے، لیکن معنوی اعتبار سے اس کی جامعیت میں کوئی شبہ نہیں کیا جاسکتا۔ یہ چار فغلوں کا مجموعہ ایک ایسا بیج جلد ہے جسے شاعری کی تشریح، پر حادی سمجھنا چاہئے، کیونکہ الفاظ جب جذبات اور تخلیقات کے ترجمان ہیں کر شعر کی صورت میں شاعر کی زبان سے نکلے ہیں، تو وہ واقعہً سامع کے دل پر نقش ہو جاتے ہیں، اور یہی شاعری کی جامع تعریف ہے۔

ہماری توجہ کو ہم عالم کی اصل خوبصورتی کی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ چنانچہ ایک بے کی رنگت، پھول کی نکبت اور نرناکت، بسمل کی لطافت، حسین اور مستحکم چہرہ کی ملامت، یہ سب ایسی چیزیں ہیں، جو دماغ کی آنکھ سے بین بلکہ دل کی آنکھ سے دیکھی جاتی ہیں۔ یہ دنیا ہے، جہاں شاعر اور صرشت شاعر پہنچ سکتا ہے، اور حقیقت یہ ہے کہ جہاں سباحت علمی اور تحقیق فلسفہ و مسائل میں دماغ کی کامرانی ہے۔ وہاں نظم و نظم عشق و محبت، سرور و انبساط کے لطیف جذبات محض شاعری کے ذریعہ ظاہر ہو سکتے ہیں۔

چنانچہ انہی امور کے تحت میں قابلہ شباب جناب الطاف شہیدی کے کلام پر دو نظریوں کے تحت روشنی ڈالنے کی کوشش کروں گا۔ الف۔ شاعری تکنیکی اور جذباتی دنیا۔ ب۔ شاعری قومی اور وطنی شاعری۔

سب سے پہلے ہیں یہ دیکھنا کہ شاعر کچھ کہتا ہے۔ واقعی جذبات سے متاثر ہو کر کہتا ہے۔ یا تقلید اور تفسیر میں اپنا "موضوع" پر اور کر رہا ہے۔ دور حاضرہ میں "غزل" کے خلاف بہت کچھ کہا جاتا ہے، اور چونکہ قومی انحطاط انتہا تک پہنچا ہوا ہے۔ اس لئے لوگ غزل۔ جذباتی شاعر کے نہیں بلکہ علمی پسند کے مستغفر ہیں۔ لیکن بالائیندہ غزل ہی ایک ایسی چیز ہے، جو رُوح انسانی کے آخری اور حقیقیہ تاروں کو لڑا دیتی ہے، جو حسیات لطیفہ کو بیدار کرتی ہے، جو دل کو بر ماتی ہے، اور رُوح کو تڑپاتی ہے، اس کے علاوہ اساتذہ ادا متقدمین نے اس میدان میں وہ وہ جو لائیاں دکھائی ہیں کہ کسی نوجوان شاعر کا اس پامال زمین میں قدم رکھنا بظاہر ناممکن نہیں تو شکل خود نظر آتا ہے۔ مگر جو طبیعتیں فطرتاً بیدار اور احساس جذبات کی مالک ہوں وہ لانا اس میدان میں خوش طبع کو دوڑاتی ہیں۔ چنانچہ ہمارے نوجوان شاعر حضرت الطاف شہیدی بھی غزلیں کہتے ہیں، اور ان کے کلام کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جذبات و احساسات کا ایک مواج دیا ہے جو شاعر کے قلم سے اشعار کی صورت میں بیٹھ جاتا ہے۔ شاعری بے ساختگی، عشق کی خود واریاں، جو ان عشق کے لائق لائبر ہیں، جو الطاف صاحب کے کلام میں بدرجہ اتم موجود ہیں۔

شاعر حقیقت میں نہایت کچھ ہی نہیں سمجھ سکتا ہے، اور انہی ان قوتوں کا اُسے احساس بھی ہے۔ چنانچہ الطاف صاحب کہتے ہیں کہ نظم میں تڑپتے ہیں مجھ سے ہزاروں میں جا ہوں تو ہر کہہ کو طوطا کر دوں

اور ہماری دنیا وسیع تر ہے، لیکن شاعری نگاہ میں نہ صرف اس دنیا کو محصور کر کے ہوئے ہیں۔ بلکہ ایک علیحدہ عالم بنا رہی ہیں۔ گراں کا نام جو شاعر نے "اُن" تک محدود ہے۔ ان مہذب نامک و عادی کے بعد مہذبائے مقصود کو ان الفاظ میں ظاہر کرتے ہیں کہ

بتا کر تبیں دل کی شان کی محبت ابھی پیار کرنے پہ مجبور کر دوں! محبت کی شان، اور اُس کے نتیجے میں یہ ہے ساختہ خدا حمدی شاعر کی منزل کو بہت رنجہ کر رہی ہے، ہاں اُس شاعری کو جس کا عشق سہمی اور خاکی ہو تا تھا، ایک اور جگہ فرماتے ہیں، اور غریب فرماتے ہیں کہ

گرئی بازارِ محشر ہے ہمارے چنگ میں محفلِ عالم کو تڑپائیں گے اپنے رنگ میں واقعی شاعر کی سستی کے سبھی کچھ ممکن ہے۔ شاعر قوم کا دیدار مینا، اور زبان گو یا ہے۔ قوم کا ہم مقام و کمال اُس کے قبضہ اختیار میں ہے محفلِ عالم کو جس طرح چاہے تڑپائے اس کے لئے جائز ہے۔

تو بہ اور تو بستی، اکثر و بیشتر خود کا موضوع کلام رہا ہے۔ اساتذہ سے لے کر سیدہ کوئی تک نے اور متقدمین کے عہد سے لے کر آج تک ہر شخص نے جس پر شاعر ہونے کا الزام لگایا گیا، ضرور اس مصنون پر مبلغ آزمائی کی، لیکن جس بے ساختگی اور لالچا یا لہذا سے الطاف صاحب نے اپنے اکثر اشعار میں اس مصنون کو نبھایا ہے۔ وہ کچھ انہیں کا حصہ ہے، کہتے ہیں کہ

وہ پر ہر مغان پر ڈھونڈتا ہوں مری ٹوٹی ہوئی تو بہ کہاں ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض شعرا نے اس مصنون میں کافی وقت خیال اور ندرت فکر کو کام لیا ہے۔ لیکن جناب الطاف کا یہ شعر بھی واقعی پوری کیفیت کا حامل ہے، ٹوٹی ہوئی تو بہ کو ڈھونڈنا اور وہ بھی "در پر چرخاں پر" اس تجاہل شاعرانہ کے حصہ ہے۔

ابتداء سے آج تک سنتے آئے ہیں کہ شاعر اپنے "اُن" سے بہت کچھ کہنا چاہتے ہیں، اور بعض اوقات مواقع بھی پیدا ہو جاتے ہیں۔ مگر جرات مند سکوت مطلق اختیار کر جاتی ہے۔ اور پھر بچا رنگی کا اعتراف کر دیتے ہیں بعض حضرات اس حقیقت کو لامری کو پہلے ہی پا جاتے ہیں۔ چنانچہ سیر تقی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ

کہتے تو بہ یہ کہتے وہ کہتے جو وہ آتا سب کہنے کی باتیں میں کچھ بھی نہ کہنا، مگر الطاف اس حقیقت کو سمجھتے ہوئے بھی اس بچا رنگی کا اعتراف کرتے

کینیات کا اندازہ کچھ اہل دل ہی خوب لگا سکتے ہیں۔ دیارِ محبت میں سجدے بچھا دیں" بولنا ہوا مصرعہ ہے۔  
دو فورہ دروسے جب بچپان کی آنکھیں ہر ایک زخم کے لب پر مرفاضانہ تھا  
داستانِ محبت کی ہمہ گیری اور درودِ الوت کی عالم نائی کا کیا  
دلغزب لیکن پڑا طریقہ ہے۔

مدیا کہ بیان کیا جا چکا ہے الطاف صاحب ماشار اللہ ایک  
نوجوان شاعر ہیں، اور غزل میں براہِ راست اپنے جذبات کی ترجمانی کرتے  
ہیں۔ اُن کے اشعار میں ہنرِ شرفی بھی، لیکن محبت کی تقدیس سے نا بد نہیں  
ہیں، اُنہیں اس امر کا خوب احساس ہے کہ محبت کی پاکیزگی کی اہم ترین چیز ہے،  
اس پر اُنہیں فخر ہے، اور سب کا فخر ہے، کہتے ہیں کہ  
فرشتوں کی فطرت سے پاکیزہ تر ہے تبسم کسی کا ہماری جو انی  
اپنی جوانی اور کسی کے تبسم کی تعریف کتنی لطیف اور عظیم الشان محبت  
کی حامل ہے۔ اسی غزل کا ایک اور شعر ہے کہ

زباں تو تک لگی تو محبت کا قفسہ سنا پڑا آسوں کی زبانی  
واقعی محبت کا تھنہ زبان اور صرف زبان کی قوتِ بیانیہ کے  
بیس کی بات نہیں۔ یہ آسوں کی زبان کے ذریعہ ہی اختتامِ خیر ہو سکتا ہے  
پسینہ آگیا کہ کئی گناؤں کی حسینوں پر  
جوانِ شانِ دل پہ لی زلفوں نے متوالی کی انگلی

کالی گٹھ ل، اور زلفوں کا تعلق مشہور اور عام ہے، مگر اس  
عام خیال کے اظہار میں بھی جذرت اور ارفع تخیل کا اظہار الطاف صاحب  
نے فرمایا ہے۔ وہ یقیناً قابلِ مدد داوے۔ شعر کیا ہے۔ الفاظ میں جان  
بھری ہے۔ زلفوں کی متوالی انگلی!۔۔۔ سبحان اللہ۔ بے نظیر لڑا جو  
اور کالی گٹھ ل کی حسینوں پر پسینہ اپنی خوبصورتیوں کا خود ہی بیان ہے۔  
گلام کی خوبصورتی میں تشبیہ اور تخیل کو بہت زیادہ اہمیت حاصل  
ہے۔ ان سے شاعر کے طبع تخیل اور تخیل احساس کا پتہ چلتا ہے، چنانچہ  
متقدم کے کلام میں التزامِ ان اصنافِ سخن کو جگہ دی گئی ہے۔ بلکہ ہر ایک  
شاعر نے اس میدان میں اپنے ہمعصروں سے گئے سبقت لے جانے کی  
کوشش کی ہے، اور دورِ حاضرہ میں چونکہ ادبِ اردو کے دائرے میں ہر ایک  
نئے اور ہر ایک جن کے گھماے شکستہ نہا گئے ہیں۔ جامِ مشرق میں بادِ شہزاد

ہوئے یہ یقین رکھتے ہیں کہ شاعری خاموشی نے وہ سب کچھ اُن سے کہہ دیا ہے  
چرکہ جانا چاہیے محبت سے

مجھے کہنے پر کچھ اُن سے الحاح وہ میری خاموشی سے خود عیاں ہے  
حسن کو بے نقاب کرنے میں شاعروں کو بہت سی تکلیف اور مصائب  
کا خوف دامگیر رہتا ہے، لیکن چلتی ہیں۔ آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں، پہاڑ  
ریزہ ریزہ ہو جاتے ہیں، مگر الحاح کے تاثرات ان سب سے زائل اور  
بے نظیر ہیں۔ اُن کا محبوب اپنی بے حجابی میں دنیا صبر کی تباہی کا سامان نہیں  
رکھتا، ہاں اُن کے لب سے کچھ رکھتا ہے۔ کہتے ہیں کہ

حسن کو بے نقاب کون کرے دل کی دنیا خراب کون کرے  
اہلِ نظر اندازہ لگا سکتے ہیں کہ شاعر کے احساسات کس قدر پاکیزہ  
اور نازک ہیں۔ دل کی دنیا خراب کون کرے کس قدر جمع اور واقعاتی  
کینیات کا حامل مصرعہ ہے۔

اور ایک دعا کی شان بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ

دعائیں منظر ہیں عاشقِ منظر کی آہوں میں  
دعائیں گردِ مٹی ہیں شاعری نگاہوں میں

آہیں تو اکثر آسمان پر زلزلے سے جا لیتی رہی ہیں، لیکن شاعری نگاہوں  
میں دعاؤں کا کردار لینا ذرتِ خیال کی انتہا ہے۔

جفاؤں اور وفاؤں کی مہمیت پر شعرائے زمانہ نے سیر حاصل نہیں  
کی ہیں اور کوئی پہلو اس میں نہیں چھوڑا، جو تعریف سے بچھا ہو۔ لیکن ہمارے  
نوجوان شاعر نے اپنے آزاد رنگ میں اُن کے تعلق ایک شعر کہہا ہے۔  
اور حقیقت ہے کہ کافی کہہ دیا ہے۔

اُن کی معذور داداؤں کو جفا کہتا ہوں اپنے گستاخِ ارادوں کو وفا کہتا ہوں  
اُن کی معذور داداؤں ہی جفا ہیں لیکن ہے ایسا ہی ہو۔ مگر عشقِ جوان  
کی وفا کو کوہِ عشق گستاخِ ارادے کہنا چاہیے۔  
ایک غزل کے چند اشعار ہیں۔

وہ آئیں گے، امید ہے، ہر پرسش نگاہوں میں اشکوں کی شمعیں جلا دیں  
زبانے وہ کس راہ سے ہوئے نکلیں دیارِ محبت میں سجدے سے سمجھا دیں  
ہر ایک شعر بجائے خود مدحِ اوکل ہے۔ علی الخصوص پہلا شعر شاعر  
کی امید اور اُس پر مبنی کا کتنی صمیم نقشہ ہے۔ اسی طرح دوسرے شعر کی لطیف

عالم میں سرمایہ اور مزدوری کی ایک حشر زرا جگ چھڑی ہوئی ہے، سرمایہ داروں نے ایک ایسا متحدہ محاذ قائم کر لیا ہے جو شب و روز بالواسطہ یا بلا واسطہ مشرق اور مغرب میں غریب اور مزدور کو تباہ و برباد کرنے پر تلا ہے۔ آج دنیا کی ہر طاقت اپنی مخالفت اور تحارب قوتوں کو مٹ دینے کے لئے کارپیرا ہے۔ گروڈن افلاک اب صرف ستم رسیدہ عشاق اور غزوہ مجہدوں کے لئے ہی بلائے جان نہیں، بلکہ ہر وہ سچے اپنے بقا اور احیا کے لئے سرگرم عمل ہیں، یقیناً دو دیا بد پر اس چرخ کے نیچے مٹ جانے والی ہے۔ مغربی حاکم میں چونکہ یہ دونوں قوتیں یعنی سرمایہ داری اور مزدوری بالمتقابل اور بلا واسطہ صفت آرا تھیں۔ اس لئے انہیں ملدی اس اٹل صداقت اور روشن حقیقت کا احساس ہو گیا کہ اگر قومیت اور وطن کے لئے کوئی نئی اور عظیم انسان بناد رکھی جاسکتی ہے تو وہ لازماً ان دونوں قوتوں میں سے ایک سچی کی تباہ شدہ بنیادوں پر کھڑی کی جاسکے گی، چنانچہ مختصر مہینوں میں اس میں آؤ آئیں، اور اس کا نتیجہ عالمگیر اتحادی اور یکجہی جگ ہے جس کے بے پناہ شعلوں سے آج ہر خطہ کے دامن امن کو اپنی لیٹیوں میں لے لیا ہے۔ ہندوستان محکوم ملک تھا اس اپنی تباہی اور سرمایہ داری کی خونخوار تجاویز کا ایک مدت کے بعد علم ہوا، کیونکہ

خواب سے بیدار ہوتا ہے ذرا محکوم اگر  
بچر سلا دیتی ہے اس کو طعن کی ساری  
مگر بالآخر ہندوستان محکوم کے خوابیدہ قسمت اور خفت و سخت  
انٹوں کو سبھی اس تلخ حقیقت کا احساس ہوا کہ سرمایہ دارانہ نظام تمدن کا قیام محض غریبوں کی شکستہ ہڈیوں کی بنیادوں پر ہی ہو سکتا ہے جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ ایک بے کس انسان نے فطرتاً اور کثرت رنج سے دردناک تنہا رہی، اور ہندوستان بھر کے غربت کدوں سے الامان، الامان کی صدا میں بلند ہوئی شروع ہو گئیں، مزدور کے اس درد سے تملانے والا کوئی شخص تھا، ہاں! یہ وہ انسان تھا جس کے دل میں قدرت نے تار سے جہاں کا درد، مصفر کیا ہوا ہے۔ اور وہ شاعر ہے رشاد کی دود میں اور حقیقت شناس نکلا ہوں پر سب سے پیسے سے صداقت واضح ہوئی، اور اس نے بنیاب ہو کر اپنے محکوم لیکن جسے سب بھائیوں کو بھیجھوڑنا شروع کیا چنانچہ ان جوان شہر کا ایک طبقہ قدرت نے لیا

بھی سوچو دے۔ لڑا بھڑکے اختلاط کی وجہ سے خیالات میں ہر اعلیٰ بھی پیدا ہو گئی ہے۔ اس نے خیالات کے طریق ابھاریں دست اور طرز تحریر میں جدت نڈا امور کا لازمی نتیجہ ہیں۔ چنانچہ عبدالحق حاضر کے شعر کے کلام میں یہ رنگ نہایت نمایاں اور واضح ہے، اب تشبیہات کی دنیا انہیں فرسودہ اور کھنڈ بناؤں پر آ پائیں، بلکہ دست مطالعہ اور اختلاط خیالات کی وجہ سے اس جن میں نئی نئی ہلکاریاں کی جاتی ہیں۔ حضرت جوش ملیح آبادی۔ جگر مراد آبادی، فانی بدایونی ایسے حضرات کے کلام کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جدید شاعری میں تشبیہات و تشکیلات نے بالکل نئے اور نہایت دلآویز طور سے جگہ حاصل کی ہے۔ جناب الطاف نے اس صنف سخن میں خوب ملیح آزمائش کی ہے۔ اور ایسی ہی نادر تشبیہیں پیدا کی ہیں کہ شاعر کی قوت مشاہدہ کا ہر صاحب ذوق کو اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ مثال کے طور پر جناب الطاف کے کلام میں سے چند ایک تعلقات پیش کرتا ہوں۔ اہل نظر ان کے محاسن کو خود کو دیکھ لیں گے، میں نہیں جانتا کہ مزید تشریح کی کوشش میں ان کی اہل دلآویزی کے ضائع ہونے کا باعث بنوں۔ فرماتے ہیں۔

سایہ انگن ہے فضا پر آج دیوانی کی شب  
جھلکاتے ہیں درو دیوار پر دریں چراغ  
رات کے پچھلے پہر جیسے وطن کی یاد سے  
مسکراتے ہیں کسی مجبور کے سینے کے داغ

گاری ہے ایک ٹپے پر کوئی آتش فوا  
زمزموں سے پڑی ہیں یوں ہوا میں  
بستر کا کام الفت کو دوزخ و درد سے  
جس طرح کر دیں شکن آلود شب کو کوئی

آری ہیں یاد غربت میں وطن کی جھٹیں  
گرہے ہیں شاہک سری آکھ سے بے آفتاب  
دفعہ جیسے ٹپا پڑے ہیں چٹا ابر سے  
بکلیوں کے ہاتھ سے گوندے ہوئے ٹکڑے کا  
دو شیرازہ مھر کے نگوں سے متاثر ہو کر لگتے ہیں

دلنشین تافوں سے یوں تمور ہے ٹھنڈی ہوا  
جیسے کچھ نیند میں ہلکی سی بارش کی صدا  
اب میں حضرت الطاف شہیدی کے کلام کے اس مختصر مضمون کی طرف  
آتا ہوں جس نے انہیں عصر حاضر کے دوسرے شعراء سے تمیز کیا ہے۔ آج فقہاً



شاعری جزو دہلیت از پتیر می جمع نہیں آتے ہے۔ چنانچہ اللغات خود

ایک نظم، تعارف، میں تحریر فرماتے ہیں۔ ہر  
سننے والے ہفت شاعری تو واقعتاً نہیں پتیری آنکھوں جیسی یہ تکت ہے بعض  
سیری تحریر میں بلکل آگ کا طوفان جو زر کے بندوں کے لئے جو موت کا سانس  
مور کا چین مرے انکار کی قندیل میں قدسوں کا قص میری عقل تغیل میں  
معیت زادے انکے کرتے توڑ دیا میں شکرگوں سے سیم و زر کے بت کا سر پہ دیا  
اس لاجوئی ہی میں اللغات کے کلام کو مقبولیت عام کے بلند مدارج  
مائل ہو چکے ہیں۔ چنانچہ مدت سے ملک کے متاثر جرائد، شاعر، زمانہ، حکم  
معارف، روان، ہائیوں، ادب، طبیب میں ان کا کلام ہمیشہ التزام سے  
شائع ہوتا ہے۔

کچھ علم و دین، اور اُس کے نظریات میں اپنی بیباکی اور بھاری کالاف  
احساس ہے، اور معترف ہوں کہ جب اللغات کا کلام میں نے تنقید کی اس روشنی  
میں دیکھنے سے پہلے تھی کہ ہے، مگر یہ ایک سلسلہ حقیقت ہے کہ جو پیغام پنجاب کا  
نوجوان شاعر اپنے اشعار میں ہیں دے رہا ہے، اُس پر قومیت اور وطنیت کی  
بند ترین عمارت کو قائم کیا جاسکتا ہے۔ اور وقت آئے والہ ہے کہ اللغات کا کلام  
نوجوانوں کے لئے شعل راہ ہو گا جس کی روشنی میں ملک اپنے پاکیزہ مقاصد  
اور منازل مقصود تک پہنچ سکے گا۔



کھینچ لو ان معیت کاروں کی جانی کا نور توڑ کر کھدو زرد دولت کے بندوں کا نور  
شکرگوں سے سیم و زر کے بت لادو غائب تب سرت کی چمک ہو دیدہ نناک میں  
کہنے پاؤں تھی نہیں ناک وہ کر شیخ زندگی موت کے سم سمجھوں گے اُلجھ کر ہو گئی  
ہیت لولیل نظم ہے۔ میں اسے نہیں ختم کرتا ہوں۔

شاعر فطرۂ آفاقی ہے، اور ماوراء وطن کو آزاد دیکھنے کا آزاد مند۔ اُس کی  
تلوار اُس کے لئے ہیں۔ جو مردہ اجسام میں روح حیات بھونک دیتے ہیں۔ اللغات  
ہند ہی مزدور اور محکوم کو دعوت دیتے ہیں کہ

برش میں آ، توڑ کر کھدے غلامی کی کند ڈال آزاد سی کے میدان میں ترقی کا سند  
آ، بدل دیں اندکے ہندی کی غلامی دوش لکھن پر نہیں بندوں کو کمرٹ جائے نصنش

آ، کسا کا نہ غلط ہی کو کر دیں ختم آج

آ، کہ دنیا سے منڈائیں جفاؤں کا ڈانچ

ایک اور ملکہ فرماتے ہیں

بھی ہو گیا نتیجہ کسوں کی آوازاری کا لکڑے ہو کے رہ جائے گاہت سرور ایسا  
ماتی مجلس دیکھتے ہیں۔ دل کے غم و اندوہ کے ساتھ ساتھ اُسے جن

علیہ السلام چنن نظر ہے مسلمانوں کی بے بسی اور ریاکاری کو دیکھ کر تڑپ

اُٹھتے ہیں۔ برلا کہتے ہیں

لب پر حسین، طوطی غلامی لکھی کذب اسلامو! خدا کو دینے کے فرب؟

مذہب نہارا خام ہے ایمان خام تر دنا نہیں حرام ہے، بہنا حرام تر

## انتظار

جس طرح لئے جن خون میں نبض کاہ و روح کو ہ روز شب اک لڑشیں سیم سے رہتے ہیں دو چار

کاہ کے دل میں چھتا ہے بلکہ رنگ و بو تابش خورشید و موج باد و باراں کا شرار

کوہ میں فراخوشی سے ناتراشیدہ صسم دعوئہ میں بُت تراشوں کی نظر دیوانہ دارا

یونہیں میر سے مضمل جو ہر مرے انسر و حرم

تیرے ہلکے سے تنم کے لئے میں بے قرارا

# شہیدِ محبت

مرزا محمد اشرف تاتاری

معنون بہ نام نامی مخلص سید محمود علی طرزی

نے اپنے کو اپنے محبوب کے ساتھ ختم کر دیا ہے۔ مگر۔ اس کے بعد اس شریف جذبے کو خود غرض مردوں نے دم نہ دیا۔

اس دم کی تکمیل کے ساتھ ایک طرف تو اپنی اور اپنے خاندان کی فرضی عزت و وابستہ تھی، اور دوسری طرف مظلوم بیوہ سے نجات پانے کا جذبہ بھی کارفرما تھا۔

اس دم کو جبراً بھی ادا کرنا پڑتا تھا۔ اگر ادا نہ کی جاتی تھی تو اس مظلوم کو ایسی حالت۔ ایسی صورت۔ ایسی زندگی اور ایسی طرز معاشرت میں رکھا جاتا تھا کہ وہ اور اس کی دیکھنے والیاں اس زندگی و صورت کو ترجیح دیتی تھیں۔ شادی اور خوشی کے مواقع پر اس کی شرکت تو کچھ اس کا نظر بڑھانا تک مخوس خیال کیا جاتا تھا، ہمہ مخفف صرف ایک وقت ادا ہوا تھا نا اس کو دیا جاتا تھا، کسی خوشی کا خیال کیا۔ بہن تک اس کے واسطے منع تھا، بال جو عورت کی محبوب زینت ہوتے ہیں۔ جڑے کاٹ دے جاتے تھے۔ سوٹے جھوٹے معمولی ایک دو کپڑے سال بھر کے لئے اس کو دیتے جاتے تھے کہ خود دھو کر پہن لیا کرے۔ کسی بچے کو اس کے پاس جانے کی اجازت نہ ہوتی کہ ایسا نہ ہو کہ اس کی بڑی شہرت کا پڑو اس بچے کی آئندہ زندگی کو تباہ کر ڈالے۔

اس طرح اس کی دیکھنے والیاں اس زندگی سے خوف لکھتیں، اور وقت پرستی ہو جانا بہتر جانتیں۔

الغرض سبھی کا شریف جذبہ رنقہ رنقہ خالص محبت کے انہار سے

سستی مرکب ہے، رت اور آبی سے۔ رنگ مراد ساتھ اور آبی سے مراد یہ یا اس کی۔

گد یا سستی ہونے والی یہ کہتی ہے کہ یہ میری محبت کا مرکز۔ میری زندگی کا گیارہ و مادہ۔ میرے تخیل کا مسکن۔ صرف یہ رہا ہے اور یہ میرے ساتھ اور میں اس کے ساتھ ابداً با دو تک رہیں گے۔

سستی سچی محبت کی یادگار ہے۔

اس کے بعد زمانے نے اس کو خود غرضی سے جاری رکھا۔ عورت نرم دل اور محبت والی ہوتی ہے۔ عورت کو اکثر سچی اور ناقابلِ برداشت محبت ہوا کرتی ہے۔

عورت کو قدرت نے جو مادہ سچی اور مستحکم محبت کا دیا ہے وہ مردوں میں کم پایا جاتا ہے۔

عورت محبت کی بنوکی۔ محبت کرنے والی۔ محبت کی غلام اور سب کچھ یہاں تک کہ خود اپنے کو محبت کی خاطر نسا کر دینے والی ہے۔

جب سے سستی کی رسم جاری ہوئی آج تک کبھی نہیں سستا کہ مرد بھی اپنی اس لطیف سستی کے ساتھ جسے وہ نہ صرف ہر چیز سے بلکہ خود اپنے سے اعلیٰ اور برتر کہتا رہا ہے۔ سستی ہوا ہو۔

محبت کے انتہائی شریف جذبے سے متاثر ہو کر بہت سی عورتیں

اُس نے جب وہ خلافت وقت کمرے پر چلا گیا، اور اپنے ایک دوست کے ساتھ اپنی دہشتہ کو مرنے لٹا دیکھ لیا۔ اُٹھی جوانی، جوانی کا عروہ۔ اس پر ہر طرح کا اعتبار، اس واقعے سے ریش پرست اثر ہوا، اور عورتوں کی طرف سے بدلتی ہو گئی۔

گراؤس کے بعض مخلص احباب نے سمجھا یا اور کہا کہ وہ اپنی بیوی سے محبت کرے۔ ریش کا دہاں اُس کی امید کے خلاف خیر مقدم ہوا تو اُس کے احساسات میں حرکت ہوئی اور اُسے اب محسوس ہوا کہ اُس کی شریک زندگی اور اُس کے بد اخلاق کے زمانے میں بھی اُس کی ایسی ہی نظر رہتی تھی جیسی آج ہے۔ اُس کو یاد آیا کہ وہ اگر کبھی رات کو سو یا م جب گھر گیا ہے تو اُس کی بیوی نے ہنسلر اُس کا خیر مقدم کیا ہے، اور بغیر کسی معلن یا شکایت کے اُس کو آرام پہنچایا ہے۔

اُس کو اب خیال ہوا کہ اگر وہ ساری رات گھر سے باہر رہا ہے اور صبح کو خود نادم سوایا ہے جب بھی اُس کی بیوی خندہ پیشانی سے پیش آئی ہے اور ہر ممکن خدمت کی ہے۔

ان خیالات کا اثر اُس پر روز بروز بڑھتا گیا، اگرچہ مردانہ تکبر اور شوہرانہ برتری کا لہجہ اپنے تصور کے بعد بھی مذاحت کی مشکل سے اجازت دیا کرتا ہے۔ مگر ایک دن جب وہ جنگ پر لپٹا ہوا اپنے سلوک اور اس نیک بیوی کے برتاؤ پر غور کر رہا تھا کہ اُس کی بیوی آئی اور یہ کہہ کر کہ آج آپ تھکے ہوئے معلوم ہوتے ہیں پہرہ باندھ لگی۔ شریف جذبات کا جام لہریز ہو چکا تھا، اُس میں حرکت ہوئی اور چھپک گیا، اُٹھا اور بیوی کو براہ جنگ پر بٹھایا اور دوتی ہوئی آنکھوں سے اُس کو دیکھا، اور ہاتھ جوڑ کر کہا میری محبت کی دیہ مجھے معاف کر دے۔

راما: یہ آپ کیا کرتے ہیں، آپ نے میرا کیا تصور کیا، یہ تو میرے کمرے کا پھل تھا کہ اتنے دن اور رات مجھے آپ کے انتظار میں رہنا پڑا۔ آپ تو جو آج ہاں وہی پیسے بھی تھے۔

ریش: نہیں میری دیہ نہیں، میں نے تو بہت ظلم کیا ہے۔ آج ہمارا عبرت ناکاری محبت مجھے نادم کر رہی ہیں۔

راما: اس دہائی کی بھی یہی آرزو ہے کہ آپ اپنے چروائی میں لگیں،

کوسوں دور ہو گیا، اور خود غرضی کی شکار گاہ بن کر رہ گیا۔  
شہنشاہ اکبر نے اس رسم کو ایک مذاک روکا، اس کے بعد بڑے گورنر نے اس کو قافلاً بند کر دیا۔ اچھا کیا، اور بہت اچھا کیا۔ کیونکہ فیصل اب مذہب محبت کا فعل تھا، ذہنی رہ گیا تھا، ورنہ مجبوری کا فعل نہیں، مگر اچھی چیز فنا نہیں ہو سکتی، اُس پر چاہے کتنا ہی گرد و غبار یا خود غرضی کی کچھ ڈال دی جاوے مگر کبھی نہ کبھی جب صحیح جذبات کا زور پڑتا ہے تو نمایاں ہو جاتی ہے۔

کھلتے میں، بیابان میں، مسیحا کا واقعہ محبت کے دربار میں زینت کسی پر ہمیشہ رونق افروز نظر آیا کرتے گا۔ اس خیال سے کہ پساندگان کے اخلاق فی نظر نظر سے اُن کے نام لینا مناسب نہیں، نام اور جگہ بدل کر وہ سن یون لکھا جاتا ہے۔ ریش کی بیوی رام دیوی کا واقعہ بھلا یا نہیں جانتا۔ ریش چندر، دھاکے کا رہنے والا الین پلے پاس پولیس میں بھرتی ہو گیا، ۲۶ سال کی عمر تھی (راما دیوی) سے جن کی عمر ۲۰ سال تھی شادی ہو گئی، رام کی تعلیم یوں تو زیادہ نہ تھی مگر گھر کے کام کا ج خط پتر لکھنے، اخبار، قصہ، کہانی کی کتابیں پڑھ لینے کے لئے کافی تھی،

فسانہ اکثر پڑھتی، اُس میں سندی اور حافظہ کے اشعار کا ترجمہ پڑھا، ان کا جھک لگا اور بنگلے میں ڈھونڈ ڈھونڈ کر اُن کے کلام کا ترجمہ پڑھتی اور لطف لیتی۔

شادی کے بارے میں اُس کا تخیل اُس زندگی کا فضا جس کی فضا میں اُس کا خیالی شوہر اُس کے خیالات کی ترجمانی کرے، جو خیالات اور جذبات اُس کی موجودگی اور عدم موجودگی میں پیدا ہوں وہ اُن کا ذکر کیا کرے۔ ریش کا زمانہ ابتدائی زندگی میں ذرا عاشقانہ گزرا تھا، اُس کے دوستوں میں ہری شنکر، یعقوب علی اور ام لال خصوصیت رکھتے تھے، ان تینوں کی رنگین طبیعت نے ریش کو بھی اپنے رنگ میں رنگ لیا اور ان چاروں کی محبت کا اصلی رنگ جب یہ سب جمع ہوتے تب معلوم ہوتا۔ ریش ایک فرم میں اُس وقت نوکرتھا اور ایک جگہ پڑھایا کرتا اس طرح اتنی روپیہ کے قریب کما لیتا، اور اس ظاہری محبت کی ٹیپ ٹاپ میں خرچ کر دیتا۔

ریش کی قسمت اچھی تھی کہ وہ اپنی دہشتہ پر ہر طرح اعتبار رکھتا تھا اور اُس کو وفا کا پتلا اور غلوں کا ٹمبہ جانتا تھا۔ مقرر یہ کہ ایک دن

جا کر علاج کریں۔

راما اگرچہ بیمار نہ تھی، مگر بالکل سفید ہو گئی تھی اور ہر لمحہ رامیش کے پاس پہنچی۔ اور خدمت کرتی تھی۔

کلکتہ میں اگرچہ دواہ مختلف علاج کئے، مگر مرض میں بجائے کمی زیادتی ہی ہوتی گئی۔

آخر ایک روز کلکتہ کے بڑے ڈاکٹروں کو بلا یا اور ان سے مشورہ کیا۔ ڈاکٹروں نے بخوبی اور بجز معائنہ نہ کیا۔ اور شفقتاً یہ کہا کہ مریض کا ایک جوت کا پمپ پھر لگا لیا گیا ہے اور دوا زخمی ہے۔ علاج کرو اور احتیاطاً رکھو۔ ممکن ہے کہ کام ہو جاوے، اور ایک نسخہ تجویز کر دیا، جس کا استعمال کیا گیا، مگر مریض کا فائدہ نہ ہوا۔

پھر ایک ماہ کے بعد دوبارہ اور دو بڑے ڈاکٹر بلائے گئے اور انہوں نے بخوبی دیکھ کر مریض کو علاج بتایا، اگرچہ اس کی احتیاطی کمی لگی کہ ڈاکٹروں کا فیصلہ راما کو نہ معلوم ہو۔ مگر کسی نہ کسی طرح اس نے بھی سن لیا۔ راما کی حالت خود ہی گری ہوئی تھی اور وہ ہر وقت رامیش کی خدمت کرتی تھی۔ یہ سن کر اس کی حالت اور بھی خراب ہو گئی۔

لاما چند روز چپ چاپ رہی اور کھانا اور سونا اور کم ہو گیا۔ راما کو رات کے کسی حصے میں ٹوہرے بات چیت کرنے کا موقع مل جاتا تھا۔

ایک شب جب سب سو رہے تھے اور اس روز رامیش ظاہراً بہت بہتر معلوم ہوتا تھا، برسی میاں میں اس طرح گفتگو ہوتی۔

راما۔ اس وقت ہم سے جوڑنے والے سنار میں جکڑیہ وقت چلا ہے کہ میں تم سے دل کی باتیں کروں۔ میرے جسم اور جان کے مالک اس دنیا میں ہوتا رامیش ساتھ صلہ قائم ہو جاوے گا۔ پر میرے سر سے ہم دونوں دعا کریں گوشت جسم میں پھر آپ کو اور تمھیں ایک دوسرے سے ملا ہو کر کے۔

رامیش۔ ہاں مجھے اپنی زندگی کی اب امید بہت کم ہے، میرے بعد میں جاتا ہوں کہ تم کو بہت تکلیف ہوگی۔

راما۔ راما کی زندگی ہمارے ساتھ وابستہ ہے۔ راما اس وقت کے لئے زندہ ہو گئی کہ آپ کو اپنے سانسے جاتے ہوئے دیکھے۔ راما کے مالک راما کی نظر میں فقط آپ ہیں۔ سنسنی مجھے کہ راما میں یہ طاقت نہیں کہ اس وقت کا اپنی نظر سے دیکھ سکے، جب آپ آتے ہو تو راما جاوے ہوں گے اور

ہے پر میری زندگی ان کے ہاتھوں ہو۔

رامیش۔ ایسا نہ کہو۔ تم کو ن ہو۔ مجھے اب خبر ہوئی کہ کبھ سوئے کو میں نے سنی ہیں ڈال لی تھی۔ اور نہیں بچا تھا۔ رامیش اب بتا رہا ہے اور ہمیشہ ہتھابھی رہے گا۔

راما۔ یہ سبھی بھاگ۔ اس سے زیادہ اور کوئی نعمت میرے لئے نہیں ہو سکتی۔

خوفن دونوں گئے لی گئے۔

راما کے بول تو کئی جیسے ہوئے، مگر زندہ کوئی نہ رہا۔

رامیش پولس میں ذکر ہو گیا تھا، اس کا تباہ و برباد پور میں ہو گیا، جہاں کئی سال تک دونوں خوش و خرم رہے۔

رامیش کو ایک دفعہ سرکاری کام سے دو ایک دیہات میں جانا پڑا اور وہاں دس روز رہا۔ پانی وہاں کا بہت خراب تھا، رامیش بخار سے کرایا، مزدوری علاج کیا گیا۔ رامیش کو آرام تو ہو گیا مگر بخار آدھیں آدھیں آہی جاتا تھا۔ اس دوران میں پھر رامیش کو ایک رات دن بگل میں رہنا پڑا۔ جہاں پانی میں بھیگ گیا، اور سردی لگ گئی۔ اور بخار پھر آنے لگا۔ اس مرتبہ ۲۴ روز برابر بخار رہا اور سامنے بہرین خدمت کی۔ خدا خدا کر کے رامیش کو آرام ہوا اور سامنے لٹا کوئی اور برہنہ بھلائے۔

یوں دیکھنے میں تو رامیش اچھا تھا۔ مگر حرارت اس کو آتی رہتی تھی اور بچنے میں ایک دو مرتبہ بخار بھی ہو جاتا تھا۔ مگر دیر بھی ہو گیا تھا، اور بچک بھی کم ہو گئی تھی۔ مگر کام کی زیادتی کے سبب اس کو خدمت نہیں ملتی تھی۔

آخر مجبور ہو کر رامیش نے چھٹی ہی اور گھر جاکر علاج کیا اور بلطاب ہر ہر طرف اچھا ہو گیا۔ اب رامیش کا آنتر رسیدی پڑے کہ قریب ایک فٹے میں ہوا دہانگی بھی آج دو بخار خراب تھی، اگرچہ سامنے بہت احتیاطی تھی۔ اور پانی گرم کر کے پلاتی۔ مگر رامیش اچھا نہیں رہتا، اور کوئی نہ کوئی تکلیف محسوس کرتا رہتا تھا، اس طرح دو سال سے زیادہ ہو گئے اور رامیش کو مڈیش بیماری رہا کرتا تھا اور جب ذرا زیادہ سخت کام میں کرتا زیادہ بیمار پڑ جاتا تھا۔

آخر مجبور ہو کر پھر چھٹی ہی اور ڈھاکے جا کر علاج کیا۔ اگرچہ کم دہش چلا سہنے ہو گئے مگر آرام نہ ہوا۔ اور مگر دیر بہت زیادہ ہو گئی، سب کی صلاح سے رامیش اور راما اور رامیش کی ماں ایک بہن اور بھائی کلکتہ گئے کہ وہاں

رامیش۔ ااما، میری راما، جو تجھے کہنا ہو کہ لے، کہ تیری آواز محبت  
بھرے سرگ سے آئے ہوئے سینے سینے سر ہو کر تے ہیں۔ محبت کی دیوی،  
رامیش کی زندگی، میں بھی اس آخری منزل میں تیرے سُرے نغموں کے نغمے  
کا مشتاق ہوں۔ کہو!

راما۔ تمہارے چولن میں پرنام کرنے سے پہلے، میں تمہارا مسکنا  
دیکھا کرتی تھی۔ جب میں تنہائی کی راتوں میں اپنے ہونے والے مالک کا  
تصور کرتی تو مجھے یہ نظر آتا کہ ہرے بھرے نکل میں جس میں، میں تنہا ہوں  
اور اپنے پریم کا انتظار کر رہی ہوں پیچھے سے تم آجاتے اور محلو کیڑا کر سکتے  
گدگداتے اور اپنی پریم بھری آواز سے مجھے سے پسینہ کر دیا کرتے۔ میں چلا  
جاتی تو سنا سنا سا رہتے، جہاں کہیں گڑھا یا ادبچا بچا راستہ پڑ جاتا تو  
مجھے پار کر دیا کرتے۔

تم مجھ سے کہا کرتے کہ میں دل کا گیت گادوں۔ میں گاتی، تم میری  
آواز اور الفاظ سے متاثر ہوتے کبھی خود رتے کبھی مجھے بھی رلاتے۔ تم  
جب اپنے کام پر پہنچتے جاتے ہیں تمہیں دیکھا کرتی۔ دن دن بھر میں پریم کا  
رس پی کر گزار دیتی۔ اور جب تم آجاتے تو ہم تم ساتھ کھانا کھاتے ہیں  
تمہارے شخصے سے اس طرح ڈرتی جیسے کوئی دیوتاؤں کے بھائی ڈرتا ہو۔ مگر ہمیں،  
میری پریم کی دنیا، تم نے تو مجھ پر کبھی غصہ ہی نہیں کیا، جب میں تم کو غور  
سے دیکھتی تو میں اپنے کو دہن پنے اور شہتے ہوئے پاتی۔ میں دیکھتی تھی تم  
اویں ہرے بھرے بارش میں مجھ سے دودھ جاتے، اور جب مجھ کو بلاتے تو  
میں دودھ کو کبھی ٹھیک ٹھیک تیز کبھی آہستہ جاتی۔ تو مجھ کو کھلے سے دکھاتے،  
اور میں اپنے کو تمہارے دل میں پاتی، کبھی اچھا دل، کبھی آرام کی جگہ میں  
اُس نرم نرم جھونپے پر سرور بخش غنودگی میں پڑی رہتی، میں تم میں جذب  
ہو کر کبھی تم کو اپنے اندر پاتی۔

یہ پر امیدوں کے خواب تھے، میں جب ہوش میں آتی تو لذت  
گھبراتی، کو ایسا ہنوک یہ خواب خواب ہی ہو کر رہ جاتیں۔ مگر میں، میرے  
پریم جب تم مجھ کو لے آئے تو میرے لئے وہی خند لائے جس کو میں خواب میں  
دیکھا کرتی تھی۔ تم نے اگر میری تنہائی کی زندگی کو عکس بنا دیا۔ دوبرس تک تم  
نے مجھے وہ پریم کے بھرے گھونٹ پائے کہ مجھے ہر چیز میں پریم ہی پریم  
نظر آنے لگا۔ اور مجھے یہ یقین ہو گیا کہ ہم پریم کی شانت دنیا میں رہتے ہیں،

آپ کی واپسی کی مجھے امید نہ ہوگی۔

رامیش۔ یہ سب دنیا کا معمول ہیں اگر تم سے پہلے جا رہا ہوں تو تم میرے  
بعد آؤ گی۔ میں تمہارا وہاں انتظار کروں گا۔

راما۔ نہیں، میرے پریمو۔ یہ نہیں ہوگا، بلکہ میں تم سے پہلے جاؤں گی۔  
اور تمہارا وہاں انتظار کروں گی۔

رامیش۔ ایسا خیال کرنا گناہ ہے اور گناہ کرنے سے ہم دونوں بھڑک  
جاویں گے۔

راما۔ پرسش پر دل کا حال جانتے ہیں۔ دل، مومنوں نے دیا ہے، اور اُس  
دل میں تمہارا دیا (چراغ) جلایا ہے، اُس کی روشنی میں میں زندہ ہوں۔ اگر  
وہ روشنی بجھ جاوے گی تو میں اذمی ہو جاؤں گی۔ تم کو ہمیں دیکھ سکیں گی،  
اور جب تم کو نہیں دیکھ سکیں گی، میرا صبر، میرا قرار، میرے ہوش، میرے  
حواس کچھ نہ رہیں گے، اور اس طرح وہ کراہنے لینا یا نہ لینا میرے لئے دونوں  
برابر ہیں۔ میرا دل کمزور ہے۔ میں اتنے بڑے صدمے کی برداشت نہیں کر سکتی۔  
دوتے ہوئے پیارے۔ میرے دل، روح، میں نے جو تمہارے قصور کے ہیں  
اُن کو معاف کر دیجئے تاکہ اُن کی سزا سبکدے کے لئے تمہارے دل بھی میں تم  
سے الگ نہ رہوں۔

رامیش۔ پیاری راما، یہ کیا کہہ رہی ہو۔

راما۔ پیارے وہی جو میرا دل بکھلا رہا ہے۔

رامیش۔ پیاری راما۔ ایسی باتیں نہ کرو جس سے تم کو اور مجھ کو تکلیف  
پہنچے۔

راما۔ آج باوجود آپ کے منہ کرنے کے میں اُن جذبات کو جنہوں  
نے مجھ میں غم پر پار کر رکھا ہے، روک نہیں سکتی۔ میں جانتی ہوں کہ میری اس  
گنگل سے صدمہ پہنچے گا۔ مگر مجھے یقین ہے کہ اب کوئی صدمہ آپ کی زندگی  
پر اس موجودہ عرض سے زیادہ برا اثر نہیں کر سکتا۔ بس میرے پیارے اس  
سے پہلے کہ ہم دونوں اس دنیا میں ایک دوسرے سے الگ ہوں میرے دل  
کے احساسات جو آج تک آپ کی محبت اور محبت بھرے پرناؤں سے پروش  
پاتے رہے ہیں، اُن کو سنبھالنے دو۔ میں نے آپ کو رنجیدہ کیا ہے، دکھ دیا  
ہے، تکلیف پہنچائی ہے، اور آپ نے اُن کو میرے برداشت کیا، اپنی  
لنڈی، اپنی داسی کی یہ آخری تھوڑی سی محبت بھری تکلیف بھی برداشت کر لے۔

تہا رادیا (چراغ) سمجھ جاوے گا۔ تم آج ایسے ہوشیار ہو، میرے مرنے کا دوسرا  
اس کے بعد میری تم نہیں سمجھو گے، تہا رادیا دیکھ کر میرے ہر دے کو مال  
کو ٹھہری بنا دے گا۔ میری روشنی اب بھی کم ہو گئی ہے، اور کم ہو رہی ہے۔  
میں اس کم روشنی میں بھی تم کو اپنے سے جدا ہوتے نہیں دیکھ سکوں گی، ماما  
نے سچ کہا ہے کہ ہم دونوں ساتھ رہیں گے۔

ماما نے انا کہا اور رامیش کے سر پر پکڑے اور کہا کہ اس اپنی داسی  
کے گناہ معاف کر دیجیے کہ میں آپ سے دور نہ ہو جاؤں، اور پیر دبانے لگی۔  
رامیش - ماما، میری ماما، میں عزم کروں گا، اگر ہم تم پر لوک  
میں بھی ساتھ رہیں گے، مگر آج تو میں اچھا ہوں۔ اگر اس طرح اچھا رہا تو  
جدی ہم ڈھاکے چلے جائیں گے۔

ماما - پرانا کسے کہ آپ جدی اچھے ہو جاویں۔ مگر ڈاکٹر لوگ  
بھی پرمیش سے انسان کی زندگی کا علم لے کر آتے ہیں، باب نے اپنا فیصلہ  
سننا دیا ہے، اور مجھے جو کچھ کرنا ہے اب کر لوں۔ مجھے کرنا ہی کیا ہے، آج  
رات ان اچھی ہونے والی آنکھوں سے آپ کو جی بھر کے دیکھنا۔ اپنے  
گناہ اور قصور معاف کرانا، اس کے بعد آپ کا انتظار کرنا، میرے مالک  
کہو کہ اپنی اس داسی کے قصور معاف کر دے؟

رامیش - تصور میں نے کئے یا میری ماما تو نے، اچھا میں نے بھی کئے  
اور تو نے بھی۔ میں دل سے اپنے پرمیش کے سامنے معاف کرتا ہوں اور تو  
بھی مجھے معاف کر دے۔

ماما - ایسا نہ کہو، داسی کے مالک، بونڈی کے آقا، اس ماما کے  
حاکم آپ نے جو بھی کیا درست کیا، آپ کو اس کا حق تھا، آپ مالک تھے،  
آج بھی ہیں، اور آئندہ بھی ہوں گے، آپ کا کوئی فعل قصور یا نیکایت نہیں،  
ہو سکتا، ہاں مجھ داسی کی لغزش، تصور جو وہ معاف کر دیجیے۔

رامیش - میں جو بھی تھا یا ہوں اس کا ذکر نہیں۔ تیری زندگی  
میں سیبا ہوا، اور میری زندگی میں سیبا ہوئی تو ماما - زبان سے کہہ  
کہ تو نے بھی معاف کیا۔

ماما - میرے مالک، داسی حکم کی بندی ہے۔ آپ کا حکم ہے کہ  
میں کہوں کہ میں نے بھی معاف کیا۔ یہ آپ کے حکم، آپ کے اشارے،  
آپ کی مرضی کی منظر، آپ کے پریم میں خوش ماما، عرض کرتی ہے کہ میرے

اور یہ دنیا کبھی ختم ہونے والی نہیں۔ پریم کی دنیا جس میں رہتی تھی،  
مجھے میری ملکیت نظر آنے لگی، اور میں اپنے کو وہاں کی ملک جاننے لگی۔ پرتنا  
کو میرا غرور نہیں بایا۔ اور مجھے آگاہ کرنے کو تم سے تھوڑے دن کو الگ  
کر دیا، آپ مجھ کو بھول گئے۔ مگر میرے ہر دے میں آپ بسے رہے، میں  
آپ کو اپنے پاس دیکھتی اور آپ سے باتیں کیا کرتی، پھر چونک جاتی اور  
یہ معلوم ہوتا کہ آپ مجھ سے اوجھل ہو گئے ہیں۔ میں روتی اور پرانا سے  
آپ کے آجانے کی سنتی کرتی۔ سپت کو من میں بسا کہ جب پتہ دور رہا  
اُس کا مزہ بے چین لطف میں بھی لایا۔ میرے مالک جب پھر آپ اس  
لونڈی کے پاس آئے تو میں نے اپنے میں پیسے زیادہ پریم پایا، ہاں  
سچ ہے خوشی کا مزار اس کے بعد، ہاں کامرا جدا رہنے کے بعد، پریم  
پریم سے الگ ہو کر پھر اپنے اصلی رنگ میں آجاتے ہیں، اور پھر مجھے سرو  
اور شانتی ملے گی۔

نہاری بیماری کو میں بیماری نہیں سمجھتی تھی، میں تو یہ جانتی تھی کہ  
پرانا دیکھ رہے ہیں کہ میں تم سے کتنے پریم کرتی ہوں۔

جب نکلے آئے گے تو مجھے وہم اور دوساں نے تانا شروع کیا، میرا  
دل کڑھ رہا تھا۔ مجھے سانس لینے میں تکلیف ہونے لگی۔ میرے ہاتھ پیر مجھے  
جواب دینے لگے، اور ہر وقت مجھے خوف رہنے لگا۔ میں یکس سے کہتی،  
آپ کے علاج اور اُس کے نتیجے سے میں مایوس ہوتی گئی۔ میری مال پسینے  
میں میرے پاس آئیں اور مجھے پتہ نہ تھی دسی اور کہا کہ بیٹا تو سچ مگر تو  
اور تیرا بچہ ساتھ رہیں گے؟

ماما کی امید، میں اس پسینے اور گھبراہٹ اور کچھ نہ سمجھی کہ اب کے  
جو ڈاکٹر لوگ آئے اور جب جانے لگے تو دروازے کے پاس بیٹا سے کہا  
کہ علاج بیکار ہے اور رامیش بہت سے بہت ایک ہتھ کا ہمان ہے جو آگے  
سو دو۔ دو اہم لکھ دیتے ہیں یہ پلاتے رہنا۔

یہ سب میں نے دروازے کے برابر کی کوٹھڑی میں کھڑے ہو کر سنا۔  
میں جانتی تھی کہ ڈاکٹر لوں سے دروازے کے پاس اصل اصل حال پوچھا  
کرتے ہیں۔ مجھے سب نے چھپایا اور کہتے ہیں کہ اچھے ہو جائیں گے۔

میرے سوا میری سب امیدیں اب ختم ہو گئی ہیں۔ اب اُس مجھے  
والے چراغ کی مانند ہیں جو مجھ کو روشنی دے رہا ہے۔ میری زندگی کے چراغ

پریم بھری لکھا میں پریم سے لگ گئیں، اور رمانے دم توڑ دیا۔  
رامیش نے مرنے والی کو غور سے دیکھا، رویا، ایک سچی ماری، ہلنگ پر  
اُچھلا، راما کے پاس گرا، عزیز و اقربا دوڑے۔  
رامیش میں چکا تھا۔

یہ خبر سب کی طرح سارے کھلنے میں دوڑ گئی۔  
رامیش پوچھیں سب اس پر ایک نامعلوم سہتی جو کھلنے میں مدد کرنے  
آئی تھی، اُس کے دروازہ پر بٹھر کے معززین کا مجمع ہے۔  
راما کی لاش کو پورٹ مارم سے معاف کرا لیا گیا۔  
ایک ارستھی پر دو لاشیں، ایک دوسرے کے پیلوں ایک کا منہ دوسرے  
کے سامنے لے کر رہیں، چوستا ہے ساتھ ہو لیتا ہے۔

لگاٹ پر ہزاروں آدمیوں کا مجمع سینکڑوں سوئیں، سینکڑوں گائیاں  
کھڑی ہیں۔

دریا کے کنارے عدلی کی کڑیوں میں ملتی ہوئی ارستھی دکھائی دے  
ہی ہے، جس پر ایک محبت کا شہدائی، دوسری پریم کی دیوانی، شمول اور  
دھویں میں ایک دوسرے سے بٹے اڑتے ہوئے دوسری دنیا میں چلے گئے؟

سرتاج۔ میری خوشی کے سرچنے۔ میرے پریم کے موتے۔ معاف کیا، معاف کیا۔  
یہ کہہ کر رامارامیش سے لپٹ جاتی ہے، اور دوڑوں اس قدر  
روستے ہیں کہ مٹھی سی طاری ہو جاتی ہے۔ محبت، سچی محبت، اپنے پریم کے  
مذبات دوڑوں کے ہونٹوں سے ظاہر ہوتے ہیں۔  
راما یہ کہتے ہوئی کہ میرے نام میں اپنے پریمی رام کا انتظار کر دینی،  
نیچے بیٹھ جاتی ہے۔

رامیش کی ماں آجاتی ہے اور دیکھتی ہے کہ رامیش کی آنکھیں سرخ ہیں،  
ماں۔ کیوں بٹیا، طبیعت کیسی ہے۔  
رامیش، اچھی سہتی اور اچھی ہے۔

ماں۔ بھو! اب تو صبح ہو رہی ہے، رات بھر جاگی ہو، جاؤ تم بھی  
ڈرا ہاتھ پیر سیدھے کر لو۔

ماتا۔ جو علم، اُسٹی، رامیش کو آنسو میری آنکھوں سے دیکھا اور  
چلی گئی۔ دن معمولی طرح گزارتا رہا۔ دوپہر کا کھانا سب لے گیا، اور  
رامیش بھی محل سے بہتر رہا۔

کھانے کے بعد راما آئی، رامیش کے سامنے کھڑی ہوئی، موقوف  
پاکر ہاتھ جوڑے، آنسو آنکھوں سے گرے، اور لبوں سے پورے پیغام دیا  
اور چلی گئی۔

سستی!

منوڑی دیر کے بعد سامنے کی بند کو کھڑی سے دھواں نکلتا نظر  
آیا۔ سب اس طرف دوڑ پڑے معلوم ہوا کہ دروازہ اندر سے بند ہے،  
دروازہ توڑا تو دیکھا کہ

رامانیر جان بڑی دم توڑ رہی ہے۔ کپڑے سب جل چکے ہیں۔  
تیل جو بدن پر جا بجا رہ گیا تھا اب بھی جل رہا ہے۔

میں ایک کھرام بچ گیا، مرنے والی کو کپڑا اڑھایا اور لٹکا کر  
رامیش کے برابر کمرے میں لے جا رہے تھے کہ رامیش اُٹھ بیٹھا، اور اس  
ماتم کا سبب پوچھا، پہلے نہ بتایا، پھر مجبوراً بتانا پڑا۔ رامیش مصر ہوا کہ  
اُس کو سستی ہونے والی کے درشن کراؤ، جب نہ مانے تو ضد کی اور کہا  
کہ وہ خود کھلتا ہوا جاے گا۔ مجبوراً دم توڑتی ہوئی راما کو اُس کے ہنگام  
کے سامنے لا کر رکھ دیا۔

شک ہو کر راما شیخ کی نہیں رہتی جیسا  
حالتِ انجاریوں اس وقت توئی ہے تیر  
چاہے کہ کھولیں گد کی دیکھا غم سول  
چھکالتا غم شرم غمیں کریم  
(شکوہ)

# نان وایسان

نان کی مضراب سے ہے وجد میں سازِ نیت  
نان کی قوت سکھاتی ہے جوانی کو غرور  
نان دیتی ہے ہوا غیرت کی ذریں آگ کو  
نان دیتی ہے سبق قوم و وطن کی حباہ کا  
نان کی صہبا سے ہوتا ہے جواؤں کو سرور  
نان سینوں کو عطا کرتی ہے ایسی زندگی  
نان سے ہوتی ہیں روشن مشعلیں اشار کی  
نان ہی رخ پھرتی ہے گردشِ افلاک کا  
نان اعضا کو عطا کرتی ہے وہ رنگیں شباب  
نان دیتی ہے جوانی کو وہ پر شوکت وقار

الغرض لازم ہے اتنی نان بننے کے لئے  
جس قدر صلاح لازم آگے

اور ایسا نام ہے اُس قوتِ موہم کا  
جو بنا دیتی ہے انسانوں کو اس درجہ حقیر  
جو جھٹکا کر بیٹ کے بندوں کو اپنی آڑ میں  
جو بدل کر اہم کار و پ دیتی ہے فریب  
جو ہیں کر لیڈر مہی کا معصیت آلودہ بھین  
جو پانستی ہے جو غریبوں کو خدا کے نام پر  
چھین لے جو نوجوانوں سے جوانی کا شمار  
سورماؤں سے کرے جو بزدلی کو ہمسار  
گردنوں کو جو جھکا لے سیم و زر کے پاؤں میں

چھپتی ہے جو مستاعِ زندگی معصوم کا!  
بیچتے ہیں سیم و زر کے چند ٹکڑوں پر ضمیر  
رات دن کھتی ہے مزدوروں کے خون کی تاریں  
بن کے بھی بھونکتی ہے ترسِ صبر و شکیب  
بیچتی ہے مغربی زور و زر کے ہاتھوں میں دیں!  
چھپتے الفاظ کے دانے بھجھا کر دام پر  
سادہ لوحوں کو بنائے مولو نیت کا فرکار!  
جو جوانی کی انگلیوں کو سب سے سو گوار  
خون و ہتھال سے ہنائے ڈالڑیوں کی چھاؤں میں!

ایسے ایساں کو ہمارے دُور سے لاکھوں سلام  
ہو رہی ہو جس سے اپنی زندگی نانی نامک حرام

لے مزدور کی کمانی

# رقاروق

اداسہ

## خطبہ صدارت صدر کانگرس

باؤسبجاش چندر پوس کا پڑ پڑ فیشل، رنگائی ذہانت و ادبیت، جوان  
چش دو لولہ، پامردانہ غفلت و استقامت، جہتہاں فکر و بصیرت، میانہ روی  
المشرقی و بالائی نظری، نظر خداوندی و سرور و شگفتگی، پاکشانہ دعوت، ابتلا و استقبال  
آزمائش، پاک و دلنواز آئینہ ہے، ہم اس تاریخی نقیہ سیاسی کانگرس و جمل  
صفیات کعبہ پر وطن کے جہاد آزادی کے آئندہ مورخ کے لئے ثبوت کے دیتے ہیں۔

سنبھاش بابو نے اپنے انتخاب کو ملک کے نوجوان بھٹے کی خدمات کو اک  
مزاج حسین کی منگش کی تعبیر کیا، اور دعائی کا کش وہ اس منصب بلند کے سنگین  
و غمگین منکشات سے ہمہ براہ ہو سکیں، انھوں نے آغاز و لگن و سرور و شہرہ پائی  
نہرو، سرمہ کشیش چندر پوس، ڈاکٹر مسرت چندر پوس، اور شریہ ہرند دتا  
مٹھی (شہید متا طہ جی) کی وفات و حسرت آیات پر قوم کی طرف سے اظہار  
ور و تعزیت کیا۔ مہو تر المذکر فرزند وطن کے متعلق صدر کانگرس کا یہ جھکن  
بصیرت افزا و ررق آدھتاکہ وہ کسی رحمت تاب حکومت ہے جس کے  
سایہ عاطفت میں اس سرزمین کے بہترین دل و دماغ موت کو زندگی پر  
ترجیح دیتے ہیں۔

اس کے بعد اس نوجوان و شل پیران پختہ کار خلیب نے روستہ لکھری،  
خاضت عظمیٰ عثمانیہ، سلطنت ہندو، مملکت مہاراجہ کے عبرت انگیز عہد و غروب  
کا اک نظارہ طائرہ پیش کیا، اور لایزال و لم یزل ہونے کا زعم باطل رکھنے  
والی برٹش امپائر اور اس کے مداحوں اور صفوں کو اک صدائے غفلت  
شکن رسدیدی، پیر پیرایہ۔

نہیں کن زکیر و مذکور و مذکور و مذکور چین قبائے تیسر و تخت کلاہ کے،  
مقرر نے اب مخصوص طور پر نام ہند و برطانوی دولت مشترکہ، اقوام  
کی ساخت و بانی کی طرف اپنی نظر جازہ مرکوز کی۔ انھوں نے اس پر

”بھان منی کے گنے“ کی سمجھی صحبت کی، اور بنا یا کردہ اس درجہ اک اجتماع  
ہندوین واق ہوئی ہے، نیز اس کے گردشکات و خطرات کا اک ایسا باطن  
حلقہ محاورہ زن ہے کہ اس نے مستقبل قریب میں اس مثیل رومانے عظمیٰ  
کے سقوط و القراض کو اک تقدیر برہم بنا دیا ہے، نجات کی تہا ممکن سیل  
بھی ہے کہ برطانیہ اپنے اندرون خانہ ”سویٹ یسٹ“ بجائے، اور سواصل  
افغانستان سے باہر کی وسیع تر حدود و سلطنت میں اقوام آزاد کا اک رضا کار  
وفاق بن جائے، اس صورت میں افغانستان کے بھٹانے امارت و سرمایہ  
و حرفت کو اپنی فرعونیت و قارونیت کو خیر باد کہنی پڑے گی، سوال یہ ہے  
کہ خداوندانہ نیند“ اس“ ذہین عظمیٰ کی کتاب لاسکیں گے؟ اسے

”تک عمن سہی کہ نہیں سوز جھم سے“ مومن، غم مال کا آف زو ملینا!  
”پنوت ڈالو اور راج کر ڈو کے سامراجی حربے کے استعمال میں پڑاؤ  
قبیرت نے تاریخی طور پر اک عدم التفریق طوطی کا ثبوت دیا ہے، تاہم جو جو  
نفس باطل و شرعی سیاست کا ہے، اس کی بنا پر اب نظریہ پیش نظر ہے کہ  
اٹھایا ہے پاؤں یا رکازت و راز میں لو آپ اپنے دام میں صبا دا گیا!

ہندوستان میں ہندو و مسلمان بدلیں میں غلبہ و دیوبندی، تیسریں  
فاروق و وقفہ، اچن میں سیکھکا و مسیدرو، یورپ میں فرانس و جرمنی،  
مشرقی بعید میں چین و جاپان، ہندوستان و وفاق میں وائیکان ریاست  
و علیبر واران کا گم گیس کی متقابل و متعادم جاعتوں کے درمیان انتخاب  
اس کے لئے اک دو گونہ رنج و عذاب بن گیا ہے، اس ہمہ گیر عقدہ لاخیل  
کا مکمل اک سمجھ کر سے کہ ہونگا بصورت دیگر وہ تیسرے حکمت گردن کر برا  
میں اڑ جائے گی جس پر مات را شد آفتاب غروب نہیں ہوتا۔

آئرلینڈ، بحر ارم، تیسرے بدلیں، ہندوستان اور متحدہ چین مملکت  
برطانیہ کے خطرے کے نفاط ہیں، آج قدیم اٹھلکت کی ”کلاہ جھم“ کو جدید  
اٹلی کے سلیمان پورائے کے اندیشہ عرفانی سے لرزہ بر اندام کر رکھا ہے!





دوستو! آل انڈیا نیشنل کانگریس ہی ہمارا آخر کار مخلصی و مادی ہے کانگریس کے اندر دایاں بازو اور بائیاں بازو ہو سکتا ہے لیکن قوم کے سارے حیرت طلب جنگجو عناصر کا وہ تاریخی طور پر قدیم لشکر رہی ہے! آج حالات کا ایک ناگہانی پلٹا اپنے چشمہ واپس سے اُسے سپر میڈان کارزار کی طرف دھک دے رہا ہے! مادر وطن کا کوئی غیور فرزند و دختر اس لمحہ نازک میں اس سے یقیناً یوفانی کا حجرم نہ بنے گا! ہماری جنگ ہندوستان کی آزادی ہی کے لئے نہیں ہے! ہمارے جہاد کا مقصد و اعلیٰ تائی بشریت کی حریت و سعادت ہے! — بندے ماترم!!

## چین

جاپانی حملے نے اپنی عنان قریب اب جنوبی چین کی طرف موڑی ہے! اس خطے کا سیاسی و حیاتی مرکز کینٹن ہے! اہل کینٹن چینی تجارت کے سربراہ کار ہیں، اپنے وسائل پر مشرق و مغرب کی بحری و سبائی قوتوں کے اختلاط سے وہ سیاسیات کی وسیع کاریوں سے خوب آشنا ہو گئے ہیں! ان میں جنگی قابلیت و استقامت کی بھی معتد بہ تربیت ہوئی ہے! جدید الہدیت کے دل و دماغ کا سینہ و سر کینٹن ہی واقع ہوا ہے! سن یاٹ سین (چین کا گاندھی!) کو ولادت کینٹن ہی کی خاک پاک نے بخشی! اس لئے ان کے انقلاب چین کا پرچم اسی جگہ سے بلند کیا گیا! کینٹن ہی مارشل چینگ کا فی شیک کے عساکر کا مستقر بنا، جب کہ انہوں نے جنوبی چین پر یفنگ کی اور وسطی چین میں بمقام نانکنگ اپنا پایہ تخت قائم کیا، کینٹن ان کو پیش آواز ریاست کا دارلصدر رہا ہے! اور آج تک سن یاٹ سین کی سگورہ تحریک جمہوریت و مساوات و قومیت کے باقیات الصالحات کی تیرک گاہ سمجھا جاتا ہے، اب جاپان اسی کینٹن کو اپنے جنگی عوام کا مطلع نظر بنا کر گویا چینی سیاسی زندگی کے آخری سرچشمے کو خشک کر دینا چاہتا ہے۔ امریکہ و برطانیہ و فرانس یا دم بخود ہیں، یا دور از کار ٹائیں ٹائیں کر رہے ہیں! (۱-۱۱خ)

## یورپ

یورپ میں جو سیاسی صورت حال پیدا ہو گئی ہے وہ پوست کنڈ

بن جائیں! دوسری تاریخ کا سن غایت درجہ قیمتی ہے! اس لئے کہ اکثر برائے تباہی انقلاب کمزوروں، کاشٹکاروں، اور سپاہیوں کے متحدہ محاذ نے ہی ممکن بنایا تھا!!

ہمارے بین الاقوامی تعلقات سید اہم اور نتیجہ خیز ثابت ہو سکتے ہیں! مصر کی موجودہ آزادی، احرار مصر کی ہر طرف اس نظر بازی و دیدہ و سہی کا عطیہ ہے جس سے انہوں نے بحر اروم کی برطانوی ایٹلاوی کشیدگی کو مٹا دیا، اور ایک گلی چلائے بغیر موجودہ انگریزی مصری معاہدے کی فتوحات حاصل کیں! اہل آئرلینڈ کا یہ مدبرانہ مقولہ مشہور ہے کہ انگلستان کی ایک ٹینک شیکل آئرستان کا ایک ڈیز مونتج ہے!

جائزہ پر گیند ابھی بنایت ضروری ہے، ممالک غیر میں ہندوستان کے ہمدردوں، ہوا خواہ اخباروں، ہندوستانی طالب علموں اور تاجروں، ہندوستانی تاریخ و تمدن کی ترجمان ہندوستان قوتوں اور ہندوستانی آرٹ کی نمائشوں کے ذریعے بین الاقوامی دنیا کی تعلیم یافتہ رائے عام میں ایک انقلاب پیدا کیا جاسکتا ہے، یہ اس دروغ کو بھی بے فروغ کر دے گا کہ ہندوستانی لوگ نیم و خشیوں کی ایک منشر قوم ہیں، اور انگریزوں کا وہاں قیام از بس ضروری ہے! — بیرون ہند ہمارا اولین حلقہ آشنائی و شناسائی افغانستان، ایران، چین، نیپال، برما، اور سیلون ہونا چاہیے، دور تر ممالک میں یورپ و امریکہ کے بعد دکنی و جنوبی امریکہ بھی خاص توجہ کے مستحق ہیں! خود انگلستان کی جدید نسل اور طالب علموں کا طبقہ عوام ہندوستان کے صفراء کی سی شان رکھتا ہے!

ہمارے سیاسی اسیروں کا معاملہ اگر بے پناہ اپیل اپنے اندر رکھتا ہے! پُر ارمان شباب اور نر تازہ رعنائی کے لئے نکلے نکلے سرسبد ہیں جو تازہ زیت و بدینہ لڑائی کی رونکش تاریکیوں کے لئے وقت ہو گئے! جو کل رہا ہوئے ہیں ان کی حالت بھی کہ حسرت ناک نہیں۔ وہ تب ہی وقت کی گرفت میں پھنسے ہوئے اپنے زندانوں سے نکلے ہیں، جن کا غیر مقدم ان کے عزیز و اقارب نے دل گداز آنسوؤں سے کیا ہے! کیا ہم انہیں پیشگوہ رنگین کرنے کا موقع دیں گے کہ

مری تربت پر سب روئے، مژدہ دیا اک وہنگیں دل  
قیامت ہے کہ دو آنسو چشم یار میں آئے!

بیوسو دست افشانی و پا کوئی سے اپنے کو تنگ کرتا رہا ہے؛ نتیجہ یہ ہے کہ اب اُس کا جُؤن نقطہ بحران کو پہنچ گیا ہے، اب اُس نے اسٹریٹ پار دست اندازی کر کے شاید اپنی مکرر زخا طرہم زدن و گھبراہٹ کا آغاز کر دیا ہے؛ اپنی بدستور اُس کا بُشت پناہ ہے؛ اور بوقت ضرورت اُس کی گیر و دار میں اُس کا ہاتھ تباہی کے لئے تیار؛ بشکر و مسکوئی کے شیر و مہنگ کے نیل برٹانیر کو لرزہ برانداز کر رکھا ہے، اور سٹریٹ لائن، انگریزی وزیر خارجہ کا تازہ ترین ڈراما فی اسٹیج اسی خطرناک ماحول کی اک افتاد ہے؛ مہلکی تلخ ترنوائیاں اور تیز ترنوا خائیاں، المفاعف ہیں؛ اور سٹریٹ رگ اور پروٹسٹ باز انگلستان سے بربان حال خطاب کرتے ہوئے کہہ رہی ہیں کہ

مجھے اتنے عندلیب نوحہ گر تو دیکھنی کیسے؟  
بڑی مدت میں سیکھا ہے فغاں نے با اثر ہونا!

(۱-۱-خ)

## میر افرض

یہ کئی نئی بات نہیں ہے جو میں مسلمانوں کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں؛ مسجدوں، مدرسوں، خیرمخاںوں کے لئے اُن دن چندہ اور امداد طلب کی جاتی ہے جسے حضرات استطاعت حضرات دل کھول کر اپنی فیاضی کا ثبوت بھی دیتے ہیں؛ لیکن زیادہ تر اس معاملہ میں شکایت اور شک کا اظہار بھی ہوتا ہے اگرچہ اہل کم اس معاملہ میں دنیاؤ حُسنِ فن رکھتے ہیں پھر بھی شکایت کہیں کہیں بجا طور پر ثابت ہوتی ہیں۔

میری آبائی بستی موضع صالح پور پنجہ میں بے علم اور اسلامیات سے نا آشنا لوگ ایک مدت سے جہاں مسلمانی و تندرستی کے شکار ہیں وہاں بے علمی نے بھی اُپر تسلط حاصل کیا ہے۔ بے علمی اور سبیلِ اسلامی سے ناواقفیت کا یہ عالم ہے کہ وہاں کے باشندوں میں یہ خام خیالی بھی ہوئی تھی کہ اپنے بچوں کو پڑھانا لکھانا بڑی بد شگون کی ہے، یہاں جو پڑھتا ہے وہ مدرسہ نہیں جوتا یہ جاہلانہ خیال ابھی تک وہاں کے اکثر لوگوں میں باقی ہے، اس بنا پر جس جگہ کسب معاش کی غرض سے اپنے وطن سے دور رنگون (برا) میں بڑا ہوں، اپنے بھائیوں اور اہل وطن کے لئے علمی خدمت کیسے کر سکتا ہوں پھر میری اتنی حیثیت نہیں کریں وطن والوں کی تقلید کا ذاتی طور سے بندہ وسبت اسکول، اس لئے میرا فرض تھا کہ میں برادرانِ اسلام سے درخواست کروں کہ اس موقع پر حیات اور خام خیالی کے گڑھے سے نکالیں، چونکہ میرا موضع میں ایک شریف اور فاضل خاندان ہے جو یہ جانتے ہیں اُن کو بھی دعوتی اور مسلمان بچوں کی تعلیم کا شوق ایسا ہے کہ وہ سوچنے کے بچوں اور بچیوں کو ایک جگہ جمع کر جس کی موجودہ تعداد ۳۰ ہے پڑھاتی ہیں، اس بات کو میں نے پہلے پہل جناب ریکٹری شاہ صاحب تعلیمی سے کہا اور انھوں نے ارادہ اسلامی ہمدردی اُن بیوہ عہد کو پانچ روپے ماہوار دینے کا وعدہ فرمایا اور پانچ روپے انھوں نے سماء عائشہ خاں بیوہ ولی محمد خان مرحوم کے نام محض علمی کفالت کے لئے روانہ بھی کر دیے، اگر اسی طرح اہل یہ حضرات بھی توجہ فرمائیں تو مسلمہ صاحبہ جو لاوارث اور کین گزشتہ لائف اور بد فہم ہیں، اُن کے گزاردے کی صورت بھی جو بجا ہے گی، اور ایک اسلامی اسکول جس کا نام درمگر تھینہ نظا میہ ہے جسے خود کیا ہے وہ جتنا رہے گا جس میں مسلمانوں کے لڑکوں اور لڑکیوں کی تعلیم ہوتی رہے گی، جو صاحب ذریعہ سے امداد کرنا چاہیں وہ انھیں محلہ کے نام سے حسب ذیل پتہ پر روپیہ روانہ کر کے عند اللہ ماجور ہوں۔

پتہ یہ ہے۔ عائشہ خاں بیوہ ولی محمد خان صاحب مرحوم موضع صالح پور پنجہ۔ ڈاک خانہ روناہی، ضلع فیصل آباد۔ یو پی

المتمس۔ عبدالرزاق خاں لغامی فیض آبادی، ایجنٹ اخبارات رنگون (برہما) ۱۶ فروری ۱۹۵۲ء

# تقدیر و نظر

(۱-۱-خ)

جوش و آزاں ہمارے اردو ادب کی تاریخ جاریہ میں اس شکر برزخ بہرہ بھجاتے ہیں، ان دونوں کی ذات میں قدیم و جدید شاعری نے ایک دوسرے کو وہ پیامِ انجمنیت نہیں سنایا کہ "ذائقہ لیبی و بلیک" بلکہ ان کی باہمی محبت نے اس شکر برزخ البحرین کا سا جوا پسٹیں کیا ہے۔ انتہا یہ کہ بعض مواقع میں تو شکر تو سن شدی "میں یہ دونوں شاعرانہ رد میں اک واحد دل و دماغ اور متحدہ زبان و قلم بن کر سخن سنج ہوئی ہیں۔ حیدر آباد کن کے معاہدہ قیام کے ایام میں دونوں کی اس شکر برزخ غزلِ مسلسل کا اک دلچسپ اور یادگار مقطع یہ ہے:

آج ساقی کمی نہ رہنے پائے  
میں نے پیئے ہیں جوش اور آزاں!

حضرت آزاد کی زیرِ تنقید و تظہیر، طلعتِ حسن کے دونوں خضاروں کا مشاہدہ، باطنیتِ حسن کی دونوں افتادوں کی تھیں پیش کرتی ہیں! حسن کے اس جمال و جلال میں علامہ کوئی فرق نہیں! آج نامید بفرہ کشت "دریغ بفرہ" حسن کی اتنی قہری و دلبری کو جوش اس طرح بیک وقت دعوت دیتے ہیں:

کھال لیتے ہیں ظالم دلوں کو سنوں سے  
خدا بچائے نہ پیر بھی مجھے حینوں سے!  
آزاد بھی اصول و حقیقتِ حسن کے اس تہرہ و تہرہ کے کیسا قتل ہیں! لیکن

(۱) حسن کے دونوں رخ: "متوسط کتب فی تقیظ" ۲۲ صفحات حجم کا غزوہ کثابت و طبعیت پاکیزہ و عمدہ، ناشر محمد زب علی خاں بآز، پنا: کاشانہ بآز، بازار گھانسی، حیدر آباد کن، قیمت ۴۰  
حضرت آزاد انصاری اردو کے مشہور بزرگ سن اوکھنہ مشق استاد غزل ہیں، لیکن ان کی شاعری زبیرہ غزل گوئی ہی تک محدود نہیں، وہ عہد حاضر کی جدید الطرز نظمیں پر بھی پوری قدرت رکھتے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ ان کی بیری صرف جسمانی معنی میں صحیح ہے، اور حادثہ اک شاب سدا بہار واقع ہوئے ہیں وہ محمد و شعر الہند ہونا نا حالی مرحوم کے ارشد تلامذہ میں سے ہیں، اولیٰ ہے اسٹار معتمد ہی کے اس زندہ دلانہ مغز سے کی ایک فطرت کے رج

رہتے ہیں چروچال بیری میں جواںوں کی طرح!  
آزاد اک نادرو نعمت کی ہستی نظر آتے ہیں۔ وہ لغتی طور پر بڑے حساس ہیں، ذہنی طور پر بڑے آزاد خیال، اور اپنے تنقیدی مذاق میں بڑے روادار اور وسیع المشرب، دورِ پیشین کے شعراء میں ان سے زیادہ شرح صدر کے ساتھ کوئی "شاعر انقلاب" کا قدردان و ثنا خواں نہیں۔ اور خود جوش کا معاملہ بھی، ماہرہ نعرہ زنی، انقلاب و شباب، اس پیرِ نعت پیکر کے ساتھ کچھ اس قسم کا لپکے کہ ہے

آن دل کردم نموده از خود و جواںاں  
ویریز سال بیرے بروش بیک گلگے





# عروسی

یہ ایک نہایت کامیاب علاج ہے جو اجداد روغن عودس کے ترتیب دیا گیا مگر آہستہ میں صرف اتنا ہی اشارہ کافی ہے کہ مردوں کے تمام غمی شکایات کا بہترین میں واحد علاج ہے مخصوص ازکار رفتہ فائدہ اٹھائیں، اسلئے کہ ان اناں تجربہ ہے اس کے ساتھ چار چیزیں موسمی، نباتی، کیمیائی اور ہر ماہ میں جن کی کفایت اور ترکیب استعمال خریدار پر ظاہر کی جاتی ہے، ایک سیٹ عودس کا ہفتہ بہرہ کو کافی ہوتا ہے جس کی قیمت صرف ایک دوپیرہ آئے مقرر ہے علاوہ محصول ڈاک۔ اکثر تین ہفتہ کا استعمال صحت کے لئے کافی ہوتا ہے۔

عصا صاحب فرمائش نام و پتہ تصاف و خوش خط خریداری میں

شفاف خانہ رضویہ چاندنی محل دہلی

# ناظرین سالہ کلیم

اگر آپ ادب اردو کی خدمت کرنا چاہتے ہیں۔  
اگر آپ کلیم کی خبریں میں خاطر خواہ اضافہ دیکھنا چاہتے ہیں  
اگر آپ ملک کے بہترین شعراء اور ادباء کے حصے بڑھانا چاہتے ہیں  
اگر آپ اسی کتب کی ضرورت کو محسوس کرتے ہیں جو ملک کی ضروریات کو نظر رکھ کر لکھی گئی ہیں

اگر آپ اپنے علمی و ادبی ذوق کو ترقی دینا چاہتے ہیں۔  
اگر آپ اردو گوشت و سستان کی واحد زبان دیکھنا چاہتے ہیں  
اگر آپ ماضی اور حال کے شعراء اور ادباء کا مقابلہ کرنا چاہتے ہیں  
اگر آپ کفایت بہترین اطلاقی اور ادبی کتب خریدنا چاہتے ہیں۔

کلیم بک ڈپو، جینتی نواس نمبر ۱۱ دریا گنج دہلی سے فرمائش کیجئے

# گوڈرمنٹ میور سلک فیکٹری

کی بنی ہوئی جارجٹ، اکرپ  
یاسائن ملاحظہ فرمائیے یقیناً  
آپ ان کی عمدہ بناوٹ  
اور خوبصورتی کو دیکھ کر  
ہندوستانی صنعت پر تعجب  
رہ جائیگی گے، کیونکہ وہ  
بالکل ایسی ہی عمدہ بنی

Fastidious people -  
According to  
MYSORE  
SILK  
FABRICS  
GOVT. GETTING  
... CROWNED ...  
... SATISFIED ...  
They are doubtless  
Attractive and  
Durable.

Govt. Silk Weaving Factory  
MYSORE

کارآمد، دیرپا اور  
مضبوط مال سے تیار کی جاتی ہیں، جیسے ولایتی کثیر تعداد میں  
نئی قسم اور جدید ترین ڈیزائن کے نمونے ملاحظہ فرمائیے، یہ  
خالص اور صرف خالص کیشم سے تیار کی گئی ہیں، اس میں  
کسی قسم کی ولایتی یا نقلی آمیزش نہیں ہے۔

# گوڈرمنٹ سلک فیکٹری میور

آجینٹ برائے دہلی اور صوبہ ہند متحدہ  
میسرز گوگل چند کھنہ، اینڈ کمپنی سوڈی کلا تھ جنرل  
دہلی کلا تھ مارکیٹ، لکشمی بازار گریڈ - کوئٹہ روڈ دہلی



مارگز کے دونایاب تھے

کیش سنگار سٹریٹ

ریشک مینیر (پتھروں کا نیٹا)

کابن سنگھ موہن سنگھ میڈلٹ پرنٹریوم زلمر ستر نمائندہ ۱۸۹۶ء



# ادبی دنیا

لک بھر کے جاوونگار ادیبوں اور شعرا کے بہترین افکار مشرق و مغرب کے بلند ترین مصوروں کے نظر افروز شاہکار  
۸۲ دلاویز اشعار نے مضامین اور خطبے میں

۸ ہفت رنگ و یک رنگ تصاویر

قیمت صرف ایک روپیہ چار آنے، علاوہ معمول ڈاک

سالانہ خریداروں کو مفت

سالانہ چندہ پانچ روپے (صبر مع معمول ڈاک)

آج ہی اپنا نام خریداروں کی فہرست میں درج کرا کر یہ بے نظیر تحفہ مفت حاصل کیجیے

مینجر رسالہ ادبی دنیا لاہور

چند دن کے استعمال سے سفید بال جڑے کا لے ہو جائیں گے

## جھنگرہ میرا میل

سر اور ڈاڑھی کے بالوں کو سیاہ اور دراز کرنے، گرنے سے روکنے، جھکنا کرنے، جلد سے جلد نئے بال اگانے اور بالوں کا انہو پیدا کرنے میں کامیاب تجربہ شدہ اور بے نظیر روغن ہے، خواتین کے لیے بے بہا اور نئی چیز ہے ہم اپنے دعوے کے ثبوت میں یہ عرض کریں گے کہ آڈائنس کے لئے اولاد میں ایک ہفتہ استعمال کے لئے ملگا جائے، اور استعمال سے قبل اپنے بالوں کی لمبائی نام لے لی جائے پھر چند روز کے بعد جانچ کی جائے، اتنا کافی ہے کہ ہمارا شہنشاہ غلط ثابت نہ ہوگا اور سحر برکے مطابق ہی خوبیاں پائی جائیں گی۔

بائیں خیال کہ ہمارا روغن اپنا اشتہار خود ہی بی اچھال قیمت لاگت کے برابر رکھی ہے، قیمت فی ادھا ۱۲ روپے اور ۱۵ روپے کی کٹنگی ۵ روپے کا پتہ۔

انڈین اسٹور، بریلی

## ہمایوں

(۱) ہمایوں - اتنا پابند وقت ہے کہ جزوی مسئلے سے لے کر (جب یہ جاری ہو اسکا) آج تک کبھی اس کی اشاعت میں ایک دن کی تاخیر بھی واقع نہیں ہوئی۔ درود صفا میں اس سے قبل ایسی باتا قدمہ مثال نہیں مل سکتی۔

(۲) ہمایوں - آرزو میں جس میں محمد شہیدین صاحب ہمایوں مرحوم بیچ ایکوڑ پنجاب کی یادگار کے طور پر ایک مستقل سرمایہ سے جاری ہے۔ اس لئے اس کے نصاب ہی و معنوی حس کو برقرار رکھنے کے لئے کسی قسم کی کاروباری مصیبت مد نظر نہیں رکھی جاتی۔

(۳) ہمایوں - کا اخلاقی معیار اس قدر بلند ہے کہ ملک کا کوئی ادبی رسالہ اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اس میں فحش اشتہارات، عوامی انصاف اور

مخرب اخلاق مضامین اور نظموں کے لئے قطعاً گنجائش نہیں، یہ رسالہ بلا خطر خواتین کے ہاتھوں میں دیا جاسکتا ہے۔

(۴) ہمایوں کی ادارت جناب میاں بشیر احمد صاحب بی لے لاکسن، بیرسٹرا لاکے قابل ہاتھوں میں ہے اس کی ترتیب میں مضامین کے محض بلند معیار ہی کا خیال نہیں رکھا جاتا، بلکہ تنوع کا بھی اتنا خیال رکھا جاتا ہے کہ ہمایوں کا ہر پرچہ مختلف قسم کے مذاق کے لوگوں کے لئے یکساں جاذب توجہ ہوتا ہے۔

(۵) ہمایوں کے مضامین محض پر از معلومات ہی نہیں ہوتے، بلکہ انتہا درجے کے دلچسپ بھی ہوتے ہیں، اس لحاظ سے ہمایوں آپ اپنی نظیر ہے۔

(۶) ہمایوں - محبت زبان کے لحاظ سے نہ صرف پنجاب بلکہ ہندوستان بھر کے مستند ترین رسائل کی صف اول میں شمار ہوتا ہے۔

(۷) ہمایوں میں علمی و ادبی، تاریخی و تمدنی مضامین، فکری افسانے اور ڈرامے، پاکیزہ نظمیں، مزاحیہ مضامین، مشرقی و مغربی رسائل کے دلچسپ اقتباسات اور ملک کی موجودہ ادبی تحریکات کے متعلق بنیاد میں قیمت اطلاعات شائع کی جاتی ہیں۔

(۸) ہمایوں - ملک کے محکمہ تعلیم کی طرف سے منظور شدہ ہے، ہندوستان اور بیرون ہندوستان میں بے انتہا مقبول ہے۔

(۹) ہمایوں کے کاغذ، کتابت، طباعت، اور تصاویر وغیرہ پر دل کھول کر دیکھ کر حیرت کیا جاتا ہے۔

(۱۰) ہمایوں کے سالگرہ نمبر اور دیگر نمبروں کے لئے کوئی ذاتی قیمت نہیں لی جاتی۔

چند سالانہ پانچ روپے چھ آنے، ششماہی تین روپے، مع حصول ہے

خاکسار - منیجر رسالہ ہمایوں لاہور

# پیغمبر اسلام

## ہندوستان کے مشہور مصوٰر ماہنامہ شاہکار لاہور

تمام علمی ادبی رسالوں پر کیوں ترجیح دی جائے؟

(۱) اسلئے کہ اس کے ایڈیٹر ملک کے مشہور نقاد اور مصلح سماجی راہنما اور خراجہ محمود جاوید اہم ہے ہیں جن کا علم فاضل وسعت نظر اور طرز فکر خاص مقام میں مسلم ہے۔

(۲) اسلئے کہ شاہکار میں ترجموں کی ہر بار تہہ ہوتی۔ بلکہ انڈیکس (original) مضامین اپنے تنقید سے لبریز ہوتا ہے۔

(۳) اسلئے کہ اس میں نقل عزائمات ذیل کے تحت میں مستند اہل فکر کے نہایت بلند محققانہ مضامین شائع ہوتے ہیں۔ مسائل نامہ۔ تنقید شعری۔ تنقیح سوال و جواب۔ تعلیمات۔ شہینشاہ عالم۔ تنویرات۔ انباء علمی و تعلیمی۔ مجلہ دار۔ زیر انتخاب۔ آثار فقہیہ۔

یہ تمام مفید عنوانات صرف شاہکار کا امتیاز خصوصی ہیں۔

(۴) اسلئے کہ عنوان ملوہ زار کے تحت میں تازہ ترین اردو مسائل و اخبارات کے تمام مفید اور نثر معلومات مولیٰ مضامین کا مکمل مطالعہ شائع کیا جاتا ہے۔

(۵) اسلئے کہ مکتب انیم انتخاب کے ذیل میں یورپ، امریکہ، ایشیا اور ہندوستان کے ہر ماہ کے تازہ ترین انگریزی، عربی، فارسی، اردو اور ہندی کے ہندو اخبارات اور رسالوں سے بلند پایہ مضامین کے حاملہ اور جرد اور محضروں کے اقتباسات مہرمت اور تلاش کے بعد درج کئے جاتے ہیں اور اس طرح شاہکار کے پڑھنے کو مشرق اور مغرب کے ادبیات کا آئینہ دار مہیا کیا جاتا ہے۔ شاہکار کا مطالعہ دوسرے تمام رسالوں اور اخبارات کے مطالعہ سے بے نیاز کر دیتا ہے۔

(۶) اسلئے کہ اس کے مشرق نہایت حسین منت راج اور ان کے ہر مہر میں آرٹ کی نہایت بلند اور حسین سطح کی دیکھ کر تعایذ شائع کی جاتی ہیں۔

(۷) اسلئے کہ اس کے مہر میں مشرق و مغرب کے مستند افسانہ نگاروں کے دلکش اور بین آموز باج افسانے اور ہندوستان کی شہریت رکھنے والے مسخرہ نویس کی تازہ ترین نوع نواز نظمیں شائع کی جاتی ہیں۔

(۸) اسلئے کہ شاہکار ہر ماہ کی شاہکار کے ۲۷ صفحات میں اتنے مضامین شائع ہوتے ہیں کہ تمام رسالوں کے تین ہفتہ شاہکار کے ایک کتبہ کی برابر کیا جکتے۔

(۹) اسلئے کہ شاہکار کو عربی، انصاف، برہنہ نظموں، ادبیات، سوز مضامین کی شاعت سے ایمان کی طرح بنایا جاتا ہے۔

(۱۰) اسلئے کہ اس کے متعلق ہندوستانی گورنمنٹ اور پنجاب سرکار ہمدردی، مرحوم لاہور شاہد، دوسری داستانیں جس میں سرخو اور مکران، مسرف و غلام، فون، زینل جی، مہر، اور ملک کے اہل لائے، اہل فکر اور مستند اخبارات نے نہایت بلند جہ میں اظہار رائے کیا ہے۔

(۱۱) اسلئے کہ شاہکار کا ہر مہر تمام رسالوں کے سالانہ مولیٰ کے برابر اور ان سے زیادہ شاندار اور دلچسپ ہوتا ہے۔

مسالانہ چندہ۔ چھو بے موند کا پرچہ آئے کے ٹکٹ، سانا اور خیر بادوں، سے یہ پڑا نقدی چار روپے، بارہ، بے پڑا نقدی، اردو لیا جاتا ہے۔

دفتر رسالہ شاہکار لاہور

(مسعودی لاہور)

خواجه دو جہاں سر در کائنات آنحضرت  
محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت  
اور رسالت پر شاہکار انقلاب پیش  
کشیدہ ہادی کا وہ غیر فانی شہ پارہ  
جس کی رفعت عظمت کے سامنے  
قصر کفر سر ٹکوں ہوتا ہے۔ شہرت  
پیغمبر کے باب میں اس لافانی  
شاہکار کے انوکھے، استبدلالی  
دل میں تیر کی طرح اترتے جے جے جاتے  
ہیں اس کے انہی الہامات سے  
دماغ میں بڑا دل اور رسالت کی  
ہے۔ اس کے دلائی قاطع کے ساتھ  
اور اسے ملحق چھ شاہکاروں جاتے ہیں  
شاہکار انقلاب پر حبیب ایک شہر  
کا عالم طاری ہوا اس وقت انمول  
نے پلنگ کہن شروع کر دی۔ عالم  
بچہ دی جس چار روز کی برابرت  
شاہکار اور مکتبہ کی قلب سے کچھ  
مائل ہوا صرف وہی صفحہ قرآن  
پر پتھر پر کیا گیا، جب تک نیغم  
مکمل نہ ہوئی حضرت جوش نے  
نکچھ کیا یا نہ کیا اور نہ غفلت  
سے باہر تشریف لائے۔

رسالہ کلیم کے لئے ہر جگہ دیانتدار اور محنتی اکیٹیوں کی ضرورت ہے  
کلیم کلپ و دیگر دینی و دنیا کی

## نقش و نگار

## شاعری راتیں

شاعر انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی کی مختلف کیفیتوں کو اپنے خاص وجد آخرین اور کیف آزاد میں بیان کیا ہے، جنہیں پڑھ کر ہر شخص اپنے آپ کو اسی ماحول میں محسوس کرنے لگتا ہے۔ راتوں کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

سرت رات بدست رات راز و نیاز کی رات انتظار کی رات  
اندھیر کات جائز کی رات جوائی کی رات تصورات کی رات  
اتفاقات کی رات جدائی کی رات انگلیوں کی رات برسات کی رات  
رہو دہلی کی رات بچو دہلی کی رات سرشار رات بھگی ہوئی رات  
تصورات کی رات بچیں رات بیان نام کی رات

قیمت صرف آٹھ آنے  
کلیم بک ڈپو جینتی نواس نمبر ۴۰ - دریا گنج دہلی سے ملے

شاعر انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی کی وجد آخرین نگاروں کا مجموعہ  
(۱) نگار خانہ (۲) خبریات (۳) تاثرات (۴) مطا اور نظر (۵) نسیم  
بر نظم انہی مکمل، مریض اور کیفیات شعری میں ڈوبی ہوئی ہے، اور اس  
کے سحر کن نغمے، دل و دماغ کے لئے ایک مستقل سکون اور روح کے لئے  
ایک خاص سرور کا باعث ہوتے ہیں  
لکھائی، چھاپائی نفیس اور دیدہ زیب ہے

قیمت

غیر مجلد ایک روپیہ آٹھ آنے (۱۶) مجلد دو روپے (۲۰)  
کلیم بک ڈپو جینتی نواس نمبر ۴۰ - دریا گنج دہلی سے ملے

## سو شمع

حضرت جوش ملیح آبادی کے نام ملبوہ اور غیر ملبوہ کلام سے منتخب کئے

سو شمع

دئے گئے ہیں، ساتھ ہی سوانح حالات اور کلام پر مختصر تبصرہ کیا گیا ہے  
باوجود اختلاف مذاق کے نصف سے زیادہ اشعار آپ کو

اپنی پسند کے ملیں گے

جی سا، کاغذ کتابت، لطافت دیدہ زیب، سرورق خوشنما، جڑ

برش وکی تصویر بھی ہے

قیمت صرف چار آنے

مینجر کلیم بک ڈپو، جینتی نواس نمبر ۴۰ - دریا گنج دہلی

## شعلہ و شبنم

شاعر انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی

پر جوش اور کیف آزاد نگاروں کا مجموعہ  
جو آپ کو آتشکدے کی شعلہ افشانی، اسلامی شان و حریت کے خون کھلا  
دینے والے واقعات، باوجود سر جوش کی سرستوں اور لکھنا تک فطرت کے  
روح پر درخشاں سے لطف اندوز ہونے کا موقع دے گا  
شاعر انقلاب کا یہ لازمی شاعر کا غیر ملبوہ کلام سے مجموعہ  
کتاب مجلد ہے اور نہایت خوشنما گرد پوش سے آراستہ ہے

قیمت صرف تین روپے (۳۰)

کلیم بک ڈپو جینتی نواس نمبر ۴۰ - دریا گنج دہلی سے ملے



ذہنی اور سیاسی انقلاب

پیغامِ مبرا

کلمہ دہلی

ذیرِ احاسر

شاعر انقلاب جوش ملیح آبادی

اگر واقعی آپ کی یہ دلی آرزو ہے کہ وہ آپ کے وطن عزیز کو نیکو تر اور ملاؤں کے فساد سے نہایت مل جائے۔

(۱) انھیں اور رسوم کی عادت پر حریت فکر و آزادی خیال کا پھر پرا لہانے لگے۔

(۲) ہندو مسلم انسان بن کر اپنے اتحاد کے ذریعے سے ایک زندہ ہندوستانی قومیت کی بنیاد ڈال دیں۔

(۳) اور ہندوستان، غلامی کے طوفان کو جس سے شیطانی ملک پناہ مانگتا ہے، اپنی گردن سے اتار کر بے بیگ وے

تو

پہلی فرصت میں کلمہ کے خریدار بن جائیں

سنیچر سالہ کلمہ جنہی نو اس دیہی دہلی

بچوں اور بچوں کا با تصویر ماہوار سالہ

پیامِ مسلم

یہ رسالہ انھیں بچوں کی خاطر جاری کیا گیا ہے، اس میں ان کی دلچسپی کی ہر چیز ہوتی ہے، اچھے اچھے اور مزیدار قصے کہانیاں، مفید اور دلچسپ معلومات، لطیف، مفید مشغلے، لکچر اور ہلاک کی کبھی اچھی تصویریں وغیرہ وغیرہ، غرض اسے پڑھنے کے بعد انھیں کوئی دوسرا شغل تلاش کرنے کی ضرورت نہ ہوگی، پچھلے سال سے میمنوں کا سلسلہ بھی شروع کیا گیا ہے، ان میمنوں کو غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔ ایک انجمن بھی پیام برادری کے نام سے کھولی گئی ہے، اس انجمن کے ذریعے ان کے نئے دوست فراہم کرنے کا انتظام کیا جاتا ہے، تاکہ انھیں مشغلوں میں وہ ایک دوسرے کی مدد کر سکیں، اسی خیال سے اس کا جذبہ بھی صرف دور روپے آٹھ آنے

رکھا گیا ہے۔ اسی جذبہ میں سالنامہ بھی دیا جاتا ہے، یہ سنکر شاید تعجب ہو کہ ہندوستان کی کوئی دوسری زبان اب تک پیادہ تعلیم جیسا سالنامہ نہ پیش کر سکی۔

فوراً خریدار بن جائیے تو سالنامہ مفت ملے گا

ورنہ ۱۲ روپے ملٹ بھیج کر منگنا پڑے گا۔ سالنامہ ۲۹ روپے کوٹہر کوٹھ لٹ ہوتا ہے۔

مکتبہ جامعہ قمرول باغ، نئی دہلی

آپ اپنی تجارت کو ترقی دینا چاہتے ہیں

تو رسالہ کلمہ میں ضرور اشتہار دیں

# کلام قوت و حیا

آگے کئی صدیوں ہے فساد اپنا  
بہروں کو نئے جاترا انا اپنا  
سہماھی چندا - دور روپے

منی طور مشدہ  
ڈاکٹر کران سلیم

آئے گا نہ جانے کب زمانہ اپنا  
قدرت بلا ہے محکوم حدیف حکیم  
سلانہ چندا، چھ روپے

شیخہ چندا، تین روپے آٹھ آنے ریاستہائے میسور، پیالہ، وحیدر آباد دکن قیمت فی پرچہ - نو آنے (۹)

## جلد ۱۰ فہرست مضامین بابتہ ماہ اپریل ۱۳۳۸ء نمبر ۱

| نمبر شمار | مضمون                    | نمبر شمار | مضمون                  | نمبر شمار | مضمون                               | نمبر شمار | مضمون                            |
|-----------|--------------------------|-----------|------------------------|-----------|-------------------------------------|-----------|----------------------------------|
| ۱         | اشادات                   | ۱۳        | دوشیزا جنت (نظم)       | ۲۶۶       | حیر                                 | ۱۳        | جناب محمد علی خان صاحب لکھنؤ     |
| ۲         | رمایات چرخ               | ۱۴        | اسلام اور دین          | ۲۶۷       | چرخ آبدی                            | ۱۴        | جناب آقا محمد علی خان صاحب لکھنؤ |
| ۳         | شاہکار انار (نظم)        | ۱۵        | بایات                  | ۲۶۸       | چرخ آبدی                            | ۱۵        | جناب آقا محمد علی خان صاحب لکھنؤ |
| ۴         | جاپان کی سن آموک کا بیان | ۱۶        | مزدور کی جوانی         | ۲۶۹       | مستزید جناب محمد علی خان صاحب لکھنؤ | ۱۶        | جناب آقا محمد علی خان صاحب لکھنؤ |
| ۵         | حضرت آغا محمد علی خان    | ۱۷        | ہندوستان کی بیوری زبان | ۲۷۰       | جناب پرنسپل محمد علی خان صاحب لکھنؤ | ۱۷        | جناب آقا محمد علی خان صاحب لکھنؤ |
| ۶         | عورت (نظم)               | ۱۸        | نعمین                  | ۲۷۱       | جناب آقا محمد علی خان صاحب لکھنؤ    | ۱۸        | جناب آقا محمد علی خان صاحب لکھنؤ |
| ۷         | سایہ کی سنگدلی           | ۱۹        | مزدور کی (نظم)         | ۲۷۲       | جناب محمد علی خان صاحب لکھنؤ        | ۱۹        | جناب آقا محمد علی خان صاحب لکھنؤ |
| ۸         | ادب و ادب                | ۲۰        | آپا کی (نظم)           | ۲۷۳       | جناب محمد علی خان صاحب لکھنؤ        | ۲۰        | جناب آقا محمد علی خان صاحب لکھنؤ |
| ۹         | مہربانیت (نظم)           | ۲۱        | نقد و نقد              | ۲۷۴       | جناب محمد علی خان صاحب لکھنؤ        | ۲۱        | جناب آقا محمد علی خان صاحب لکھنؤ |
| ۱۰        | اورنگ زیب اور اچوت سنگھ  | ۲۲        | شاہ کی دعا (نظم)       | ۲۷۵       | جناب محمد علی خان صاحب لکھنؤ        | ۲۲        | جناب آقا محمد علی خان صاحب لکھنؤ |
| ۱۱        | پاسان شہاب علی (نظم)     | ۲۳        | نقد و نقد              | ۲۷۶       | جناب محمد علی خان صاحب لکھنؤ        | ۲۳        | جناب آقا محمد علی خان صاحب لکھنؤ |
| ۱۲        | آفتاب و آفتاب            | ۲۴        | بایات و آٹ             | ۲۷۷       | جناب محمد علی خان صاحب لکھنؤ        | ۲۴        | جناب آقا محمد علی خان صاحب لکھنؤ |

(چرخ آبدی پر مشتمل ہر پرچہ کے لیے ایک روپیہ دینا چاہیے اگر دوسرا دیکھ دیا جائے تو ہر پرچہ کے لیے ایک روپیہ دینا چاہیے)

# اشتقاق

مدیر

## بے اعتدالی کی معراج

اس لئے کہ ان اہلکار کی جرأت کر سکتا ہے کہ زندگی کو خوشگوار اور حیات کو تندرست و پائدار رکھنے کے لئے سب سے زیادہ ضروری اور سب سے زیادہ اہم چیز ہے اعتدال۔

توسط اعتدال سے بڑھکر کوئی خیر نہیں، اور بے اعتدالی اور افراط و تفریط سے بڑھکر کوئی شر نہیں۔ اگر کوئی مجھ سے پوچھے گا کہ وہ کی تعریف کیا ہے، تو میں صرف یہ جواب دہں گا کہ بے اعتدالی۔

بے اعتدالی وہ ہے کہ وہ امور بھی جنہیں عرف عام میں خیر کہا جاتا ہے، اس سے آلودہ ہو کر شر بن جاتے ہیں۔ اور اعتدال وہ برکت ہے کہ وہ امور بھی جنہیں عرف عام میں شر کہا جاتا ہے، اس سے بہرہ مند ہو کر خیر کا لقب حاصل کر لیتے ہیں۔ دور کیوں جائیے، عبادت ہی کو لے لیجئے، جہاں مذاہب کے نزدیک تین عمل ہیں، اگر کوئی شخص اپنے تمام فرائض انسانی، اور دو ظائف طبعی کو یک سوخت ترک کر کے شبانہ روز عبادت، اور صرف عبادت ہی کا پروکرہ جائے تو کیا اس کی یہ عبادت گزار ہی ہے، بے اعتدالی کے باعث، گناہ میں تبدیل ہو کر نہ جاسکے گی؟

اس میں کوئی شک نہیں کہ دنیا کے تمام دیگر اہم ترین امور کی طرح اعتدال بھی ایک نہایت ہی مشکل امر ہے۔ اور اسی وجہ سے زندگی کے کسی شعبے میں صحیح اعتدال کس کے مرنے یا غفلت نہیں آتا۔ لیکن بے اعتدالی کے سہی، دنیا کی تمام دوسری چیزوں کی طرح مختلف مراتب و مدارج ہیں، اور یہی وہ مختلف مراتب و مدارج

ہیں جن پر نگاہ کر کے، انسانی اقوال و کردار کے باب میں زشت و خوب کا محکم ٹکایا جاتا ہے۔ یہ سمجھئے کہ نقطہ اعتدال سے ہم سب بٹے ہوئے ہیں، لیکن دیکھنا یہ ہے کہ کون کس قدر بٹا ہوا ہے۔ یعنی نقطہ اعتدال سے جو شخص جس قدر کم بٹا ہوا ہوگا اسی نسبت سے وہ قابل تحسین، اور جو شخص جس قدر زیادہ بٹا ہوا ہوگا، اسی نسبت سے وہ قابل نفیس قرار دیا جائے گا۔

یہ الفاظ دیگر لوں سمجھ لیجئے کہ نقطہ اعتدال سے جو شخص جس قدر تیز ہے، وہ قابل تحسین ہے بہ اندازہ قُرب۔ اور جو جس قدر بعید ہے، وہ شاید نفیس ہے بہ اندازہ بُعد۔

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ وہ قومیں اعتدال سے نسبتاً زیادہ قریب رہتی ہیں جن کے ذہن معلوم کی روشنی سے تابناک، اور اُکھانے والے جذبہ سے طاقتور ہوتے ہیں، اور اس کے برعکس وہ قومیں اعتدال سے نسبتاً بہت دور ہیں، جی خاصہ پر رہتی ہیں جن کے ذہن جہالت سے تاریک، اور بہت توڑ دینے والے آلام سے مائل ہوتے ہیں۔ اور جو کم ہوشی اور کم ہوشی کے جاہل و مڑوہ باشندے، اسی ثنائی الذکر طبقے سے تعلق رکھتے ہیں، اسی ہماری زندگی اور ہماری موت دونوں کو اعتدال سے کوئی دور کا بھی دور باقی نہیں رہا ہے۔

زندہ قومیں، مہیا کہ ابھی عرف کیا جا چکا ہے، اپنے اقوال و کردار کو توسط اعتدال سے منجھوڑ نہیں ہونے دیتیں، لیکن مڑوہ قومیں افراط و تفریط اور بے اعتدالی کا شکار ہو کر جو کام بھی کرتی ہیں، ان میں حدود سے









# رُباعیاتِ جوش

اپنی ہی غرض سے جی رہے ہیں جو لوگ  
اپنی ہی عیائیں سی رہے ہیں جو لوگ  
ان کو بھی ہے کیا شراب پیئے گئے گریز  
انسان کا خون پی رہے ہیں جو لوگ

حق کا ہو عروج، بہر ولی چاہتا ہے  
باطل مٹ جائے، بہر نبی چاہتا ہے  
لیکن یہ بزرگوار جو چاہتے ہیں  
کیا قادرِ مطلق بھی وہی چاہتا ہے

بہل ہے مرنے لے نصابِ زردیم  
محل ہے منجھ بے سلطنتِ قلبِ سلیم  
رکھتی ہے نگاہوں میں جو آفاقِ حیات  
پیر ہی آتی ہے وہ مرسدِ گاہِ عظیم

نہ تاب کی فتوے گلستاں ہے شیریں  
پہ پوئیں نعل پہ رہا ہے اک ماہِ حبیب  
کُری سے براق لے کے آیا ہے بیکرون  
کہدو کیلٹ جائے، منجھ بے وقتِ نہیں

# شاعر کا ایشار

تجھے خبر بھی ہے ہندوستان اک تیرے لئے      عمل پسند ہے غفلت شاعر متا جو شخص  
رواں ہے وار و رسن کی طرف تری جانب      اسیر ملتے لگیوئے یار متا جو شخص  
وہ آج نوکِ سناں کا ہے والہ و شیدا      ہلاکِ طرۂ زلف نگار متا جو شخص  
بنا ہوا ہے گدائے رو نگار و مانغ      دیار دل کا کبھی شہر یار متا جو شخص  
وہ آج تیغِ رواں کا ہے ہمد و دساز      رفیقِ سرو لب جو بار متا جو شخص  
وہ آج طغنے طبلِ جنگ کا ہے امین      انیس زمرۂ آبشار متا جو شخص  
شعاعِ مہر خزاں سے ہے آج گرم کلام      خلیبِ منبر ابر بہار متا جو شخص  
وہ آج صرصر و غور شید سے ہے گرم ستیز      نسیمِ پیشہ و شبنم شاعر متا جو شخص

وہ آج ضائع بر دوش ویل بر کف ہے

سمن بدست و چمن در کسار متا جو شخص

جوش ملیح آبادی

# جاپان کی سبق آموز کہانیاں

مترجمہ محمود علی خاں اجاسی اہلی

## وزیر کی وطن پرستی

میں اپنے ان مہائیوں کی ہدایت کے لئے جو مسز فیٹشن اور انگریزی سکول  
دواج کی تقلید پر فخر کرتے ہیں ایک جاپانی وزیر کی وطن پرستی کا واقعہ ذیل  
میں درج کرتا ہوں۔

جاپان میں کثرت سے چنے اپنے باپ اور ماں کو "اوتوسان اوکٹان"  
کے بجائے "پاپا" اور "ماما" کہتے تھے ہیں، چچا کو اب یہ چیز لوگوں کی نظروں  
میں ٹھکنے لگی ہے، اس کے سب سے بڑے مخالف مشرک سوتا وڈیریکو  
ہیں جو خصوصیت سے اس کے انداز کی کوشش کر رہے ہیں، چنانچہ جاپانی  
زمانہ کے ایک اخبار میں آپ تحریر فرماتے ہیں۔

• وزیر تعلیم کو تعلیمات کے مسئلے میں خواہ کچھ بھی اختیارات حاصل ہوں  
لیکن یہ حق نہیں ہے کہ وہ لوگوں کے خانگی معاملات میں بھی دخل دے، تاہم  
میں اس مسئلے میں کچھ عرض کرنے کی جرات کرتا ہوں، میری یہ مین خواہش ہے  
کہ جاپانی گھروں سے "پاپا" اور "ماما" کے الفاظ خارج ہو جائیں، میری کچھ  
میں نہیں آتا کہ آخر جاپانی چنے اپنے والدین کو جو انتہائی احترام کے حق میں  
پوششی الفاظ سے کیوں مخاطب کرتے ہیں، میں عرصے سے یہی رائے رکھتا ہوں  
اور میں نے وزیر تعلیم ہونے سے پہلے بھی اکثر اپنی تقریروں میں بار بار اس  
اعادہ کیا ہے۔

جب میں فرانس میں تھا تو لاڈلر زن (جو اس وقت برطانیہ کے وزیر

ہوں تو جاپان کی ہر چیز سائنس کے اصولوں پر مبنی ہے، اس لئے ہمارے  
لئے سبق آموز ہے، لیکن اس باب میں میں نے ان بچے واقعات کو بھی کر دیا ہے  
جن سے میرے ہم وطنوں کو حسب الوطنی و احساس ذمہ داری، حق العباد،  
اور اصلاح سیرت کا سبق مل سکتا ہے، دو نفاقتہ میں یہ قصے ہندوستانی  
اجنادوں میں مشائے کرتا رہا ہوں، اب یہاں انھیں ایک جاپانیت دیتا  
ہوں،

میری دلی تمنا ہے کہ کاش ہمارے نوجوان اپنے جاپانی بھائیوں  
سے سبق حاصل کریں اور مادر وطن کی جانب سے ان پر جو فرائض عائد ہوتے  
ہیں ان سے پوری طرح عہدہ برائوں۔

## وطن پرست طالب علم تیار کرنا

جاپان کے امپیران تعلیم کا یہ نصب العین ہے کہ وطن پرستی کے جذبہ  
کے ساتھ ساتھ تعلیم ہونا چاہئے۔ چنانچہ طلبہ کو "اڈمرل ٹوگو" کے حالات زندگی  
بتانے کے لئے محکمہ تعلیمات نے ان کی زندگی کا ایک فلم تیار کیا ہے، جس میں  
"کاگوشیما" کی جنگ سے لے کر ان کے جنازے کے جلوس کے واقعات  
نک دکھائے گئے ہیں۔ یہ فلمی فلم ملک کے تمام پرائمری اور میڈل سکولوں  
میں بچا جائے گا، برعکس اس کے ہندوستان میں جہاں گاندھی کی تصویر  
بھی سکولوں میں لگا نا جرم سمجھا جاتا ہے۔



















بھگت اس کے آپ کو یاد ہو گا کہ ہندوستان میں بھگت سنگھ کی جان بخشی کے لئے لاکھوں آدمیوں نے سیریل پیجے اور خود ہاتھ لگا دیے۔  
نے اپنی پوری قوت صرف کر دی، کہ جس کا ہمارے دوستی کے طور پر لارڈ  
اردن بھگت سنگھ اور اُس کے ساتھیوں کو معاف کر دیں، لیکن سب  
کچھ بیکار ثابت ہوا۔

### جاپانی فلسفہ

انجائپر سچی سچی کے چیت ایلٹر سٹر کا سچی نے جاپانی فلسفہ کو صیرت  
ایک لفظ میں بیان کیا ہے، یعنی حوصلہ وہ کہتے ہیں۔

جاپانی قوم کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ بڑے بڑے ہرے حوصلوں  
کی حامل ہے۔ لوگ انفرادی و اجتماعی ہر حیثیت سے کبھی اپنی موجودہ حالت  
پر قانع ہو کر نہیں بیٹھ جاتے، جب تک حال نامنہ سے بہتر ہو، اور مستقبل  
حال سے بہتر ہو، تو وہ اسے تنزیل سے تعبیر کرتے ہیں۔ اور صورت حالات  
کی پیشی کی کوشش کرتے ہیں، گویا جاپانی قوم کے فلسفہ کو صرف ایک لفظ  
سے تعبیر کیا جاسکتا ہے، یعنی

”حوصلہ، یا اولوالعزمی“

### قطعہ

محنت سے نہ گھبراؤ، ہے اس کا اثر اچھ

سینگو گے جو محنت سے بھولے گا شجر اچھ

جب کاوش و کوشش سے ملتا ہے صلہ سب کو

گر بو گے تنم اچھا، پاؤ گے شہر اچھا

(علیم حبیب آبادی)

سب سے پہلے پروہت اور نشواؤنی کے استناد تھے، انھوں نے فرمایا  
کہ انہی نے قومی جذبہ کے تحت بودھ مذہب کے بنیادی اصولوں کو  
نظر انداز کیا اس لئے خواہ اسے انتہائی سزا بھی دی جائے، لیکن اس کی  
روح ہمیشہ ملک کی خدمت کرتی رہے گی۔

اس ضعیف العمر پروہت نے ابتدا میں کہا کہ میں قانونی نقطہ نظر  
سے قانون کی وکالت کرنے نہیں آیا ہوں بلکہ روحانی اعتبار پر اس معاملہ  
کو معاف کرنا چاہتا ہوں اور نشواؤنی کے فعل پر بودھ مت کے لحاظ سے  
روشنی ڈالنا چاہتا ہوں۔

نشور عرصہ تک میراث گرد رہا ہے، اور اُس نے بودھ مت کے تمام  
اصولوں کو اچھی طرح سمجھا ہے۔ اس لئے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ نشور نے  
یہ فعل مذہبی مواد اقلیت کی بنا پر نہیں کیا، بلکہ ملک کے حالات نے اسے ایسا  
کرنے پر مجبور کر دیا، بودھ مت میں ہر مخلوق کو حق کہ کیروں تک کو مارنے کی  
ممانعت ہے، لیکن اگر کئی کی خاطر جو دو یا تمام مخلوق کی خاطر ایک فرد کو مارنے  
کی ضرورت ہو تو بودھ مذہب اس کی اجازت دیتا ہے، ہمارا مذہب کے  
علاوہ تمام بودھ اوتار کوئی نہ کوئی ہتھیار لئے ہوئے ظاہر کئے گئے ہیں۔  
یہ ہتھیار اسی سے ہیں کہ مخلوق کے دشمنوں کو ہلاک کر دیں۔

نشور کو مستقبل میں بھی قوم کی خدمت کرنے کا موقع حاصل رہے گا، اگر  
قانون آسے موت کی بھی سزا دیے بغیر بھی اس کی روح ہمارے درمیان  
رہے گی، نشور تو جن کے سچے جذبہ کا حامل ہے، اس لئے اگر ہم اسے، رہی  
ذالیں تب بھی اس کی روح اس اعلیٰ مذہب کی حفاظت کرتی رہے گی، ورنہ  
جاپانی قوم کا انحصار اسی جذبہ پر ہے۔

ذرا تصور کیجئے کہ اگر کوئی شخص ہندوستان میں کسی سیاسی قتل کے  
مقدمہ میں اس قسم کی گواہی دیتا تو اُس کا حشر کیا ہوتا؟ قاتل کی حمایت کے  
جرم میں اُسے گرفتار کر کے فوراً بسات برس کے لئے بھیج دیا جاتا، یہ ہے  
ایک آزاد اور غلام قوم کا فرق۔

اسی مقدمہ میں جاپان کے طولی دعوے سے ہزاروں لاکھوں عریض  
سے لیکر حاضر ہوئے اور انجائی کی ملازمتوں کو بہت معمولی سزا دی جائے،  
کہونکہ ان کی نیت نہایت اعلیٰ ہے، وہ فحشاء اور وطن پرستانہ تھی، چنانچہ  
جے آٹھن بیت معمولی سزا دی، گویا اسے رائے عامہ کے سامنے جھکا کر باہر ڈالا۔

# حضرت اثر لکھنوی اور میں

پروفیسر رگوپتی سہائے فراق گورکھپوری ایم اے

ہنیں کرسنے والے "امیر" آپ کی جان سے دور آپ پر مرنے والے "دراغ" یا حضرت سائن دہوی نے بڑے سچ و سچ کی ایک غزل لکھی ہے۔ وہ چلی لوگ پیکان والے وہ سوخا پر والے یا عزیز لکھنوی کا ایک شعر لے بیٹے۔  
 خلعت اک ہلکی تربت میں جان آنے کی جوبیں ذرا ادا نے والے قبر پر پھر مسکرا دینا  
 شب بھر غمخوار گس کوست میں ہیں ہنسنے والے ہیں دوسے والے  
 دیکھئے کہ "دالے" کا لفظ مندرجہ بالا شلوں میں کیا اثر پیدا کر رہا ہے اور  
 کتنی خوش اسلوبی سے لایا گیا ہے، ان کے مقابلہ میں "نیشن چوٹنے والے"  
 کے لب و لہجہ پر غور کیجئے۔ اور کیا عرض کروں۔ لیکن چنے کی مثالوں میں ڈ  
 "نیشن چوٹنے والے" میں کچھ فرق تو بھی ہے۔ اب ذرا اور تہ میں جائیے،  
 خواہ یہ خطاب خدا سے ہو یا دوست سے یا دشمن سے۔ مگر یوں برا و راست  
 کسی سے کہنا کہ اسے میرا سب کچھ جلائیے والے، اسے مجھے بے غامی کرنے  
 والے، اسے "نیشن چوٹنے والے" علم کی ایسی نشر ہے جو مذاقِ سیر پر  
 گراں گزرتی ہے۔ شاعری اور غزل کی شاعری کا نازک دل اس سے دسے  
 اور اس تو قومیں میں سے بیزار ہو جاتا ہے، دیکھئے قابلِ ایک ہی لفظ ہے،  
 لیکن یہ ایک لفظ بھی سینہ حاضر میں مستعمل کر کے کوئی اب شاعر جس کا  
 مذاق اور وجدان تربت یا تانتہ ہے اپنے شعر کو طراپ نہیں کرتا، اسے قابلِ  
 ادھوا کا، ادبے وفا کہ کہ سو دوسرا نہیں پیدا ہوتا، شاعری اور چہر چھوڑ  
 کے معنائیں کی اور بات ہے، لیکن حضرت سچو دسے اگر کوئی کہے کہ آپ نے  
 شاعری یا چہر چھوڑ کا مضمون اس شعر میں لکھا ہے تو وہ بامان جائیں گے۔

ذہر شمس کے کیم میں جعفر علی خاں صاحب اثر لکھنوی کی ایک تحریر  
 شائع ہوئی ہے، اس تحریر میں حضرت سچو د اور حضرت سچو کے دو ایک شعروں سے  
 مستحق میرے خیالات پر حضرت اثر نے انہارنا خوش کیا ہے۔ میرے خیالات ان  
 اشعار پر جو کافی شمس کے نگار میں شائع ہوئے تھے۔ کبھی کبھی تو میں اس شبہ  
 میں پڑ جاتا ہوں کہ کسی شعر پر وجد کرنا اس سے اپنے وجدان کو مجروح پانا  
 اپنے اپنے مذاق کی چیز ہے اور بحث و مباحثہ محض ایک حد تک ممکن یا کارآمد  
 ہو سکتا ہے۔ میرے والد مرحوم حضرت عبرت کا ایک شعر یاد آیا۔

گونا بنا حقیقت میں اتفاق پہ ہے

خوشی بشر کی مگر مختصر مذاق پہ ہے

نیز میں اس کی کشش کروں گا کہ جیسے نئے الفاظ میں حضرت سچو د  
 اور حضرت سچو کے اشعار کی کچھ تخیل کر دوں، تاکہ ان پر پختہ سے جو اظہار  
 ناپسندیدگی میں نے کیا تھا اس کے وجہ اگر ممکن ہو تو حضرت اثر پر واضح  
 ہو جائیں۔ حضرت سچو د کا شعر یہ تھا۔

نفسین چوٹنے والے ہماری زندگی پہ ہے

کبھی روئے کبھی سجدے کے خاکِ نیشن پر

کبھی میر تقی نے اپنے ایک شعر میں ایک قیامت کا ٹکڑا رکھ دیا تھا،  
 "اے اہ چاک گر مالِ دالے" ان کے بعد کے شعر اسے بھی دالے کے لفظ  
 کو اشعار میں باندھا، اور کہیں کہیں سچے شاعرانہ انداز سے باندھا، مثلاً  
 "ان کا بندہ ہوں جو بندے ہیں مبت دالے" "دوق" "دلی جیسے سینہ جیسے جنت"







یہ نہیں کہتا کہ کبھی روئے کبھی تڑپے، کبھی سجدے کئے۔ لیکن در۱  
کھٹو کے رنگ میں ایک مصرع اسی مضمون کا ہے۔  
تم نہ آئے تو کیا سجدہ ہوئی  
گنا جھجھورا انداز بیان ہے۔

بات کہاں سے کہاں نکل گئی، لیکن آنسوؤں کو اور سجدے کو بھی  
ٹٹکے سیر کر دینا ملک و ملت کے لئے اور شعاع و جدان کے لئے اتنا مضر  
رسالہ ہے کہ شاید مجھے اس تیغ لڑائی سے معاف رکھیں گے۔ ہاں تو میں  
یہ کہہ رہا تھا کہ اگر اظہار غم میں غم کے خارجی پہو جہانی حرکات و سکنات  
کے ذکر پر سوز و گداز کا انحصار ہے تو یہ معاذ میں داخل ہے نہ کہ محض  
میں، ایسا نہ ہوتا تو ہسپتال میں رونے کو اپنے اور مریضوں کی حالت اور  
صورت کی تصویر یا سٹرک پر جو لنگڑے ٹوٹے اور کڑھی نظر آتے ہیں  
ان کی حالت اور صورت کا بیان سوز و گداز پیدا کرنے کے لئے بہتر چیز  
سمجھی جاتی یا قریب کے انداز احسام کے سڑنے گھنے کا بیان۔ نظم میں ان مناظر

اور کراہتوں کا ذکر میں خود ضمن سمجھتا ہوں، میں ان لوگوں میں نہیں  
ہوں جو ان چیزوں کو شاعری کا موضوع نہیں سمجھتے۔ ہاں لیکن غزل میں  
رونے تڑپنے کے مادی پہلو کو پیش کرنا بلکہ محرم اور چوٹی کا ذکر کرنا بڑا  
عیب ہے۔ اسی احساس سے تو کچھ عین ہو کہ حضرت آٹھ کو بھی کہنا پڑا  
کہ کوئی اس وقت نہ تو درد رہا ہے نہ سجدے کر رہا ہے۔ اس میں تو رونے  
اور سجدے کرنے کا صرف ذکر ہے (یہ صریح ملاحظہ ہو) بیان واقعہ ہے  
نہ کہ صورت حال۔ میں پوچھتا ہوں کہ اس شعر میں رونا اور سجدہ کرنا  
فی الحال مثنوی کو دینے کو ہم شریکی جان سمجھیں یا  
کبھی روئے، کبھی سجدے کئے خاک پر نہیں پر

میں جس فعل کا ذکر ہے براہ راست اس فعل کو؟ بیان واقعہ کیا ہے۔ قائل  
کا ایسا کہنا یا ایسا کرنا، کیا ہماری زندگی میں جھوٹ اتنا سرگرت کر گیا  
ہے کہ جو کچھ کسی غافل ربا پر گزرتی ہے جو اس کی زندگی ہے، جو وہ  
کر رہا ہے، اس حقیقت کو اس حقیقت کے بیان سے الگ کر دیا جائے اور  
پہلی بات سے قطع نظر کر کے یہ کہا جائے کہ "بیان واقعہ" کو سب کچھ سمجھنے  
اصل واقعہ کو کچھ نہ سمجھنے۔ رہی یہ بات کہ تنقید کہنے والے کی تصویر حزن  
دیاس پہلی نظر کرتا ہے نہ کہ رونے اور سجدہ کرنے کی جس کو وہ باریک بینی

اختیار نہ کر سکا۔ اس کا فیصلہ حضرت آٹھ کریں کہ درس و تدریس کی بوسیری ناچیز  
تخریر سے آتی ہے یا کسی اور کی تحریروں اور عقیدوں سے۔ دوسری گزارشیں  
یہ ہے کہ حضرت آٹھ کی مثولہ بالا شرح بھی کیا شعر کو سوز و گداز کی مثال بنا کی۔  
شعر میں درد پیدا کرنے کے لئے بڑی بے دردی کی ضرورت ہوتی ہے بڑے  
ضبط (restraint) کی ضرورت ہوتی ہے۔

جھوٹ کر ان سے بہت بیدار و ہم بھی ہو گئے  
ایک خضر ہو گئے جب سے کہنے کا دل ہے ہم  
حضرت آٹھ کی عبارت کے ان لکڑوں پر غور کیجئے۔  
"جن نہیں کا نہیں ہو تک دیا گیا ہے، آسے بے غمانان کرنے والے"  
کیوں حال پوچھ کر بھولے ہوؤں کو چلا تا ہے، ہوم، ڈانٹے، درجمل ٹیکسٹر  
اور ڈکس، اتنے سستے بے سے رقت نہیں پیدا کرتے تھے، غم اور اظہار  
غم دو لفظی چیزیں ہی مگر اس طرح پھیل نہیں جاتا جیسے غم کی نفسیاتی  
ماہیت روک اور اننگی ہے (check pain) وسعت  
(release) خوشی کی ماہیت ہے۔

فراموشی سے باعنی بنا دے قصہ غم کو  
زانہ طول دیتا جائے کر دے مختصر اتنا  
نثار پرستی غم کے، ترے کرم کے نثار  
ہیں غیر میں بھی کھلے دست عشق رسوا کو  
نثار پرستی غم کے میں کیا کہوں لے دیت  
کہ توجہ سے اب وہ مری سرگراںیاں نہ رہیں  
ہزار شکر کے پہلو میں عشق میں ہیں  
سمجھ نہ اور کچھ ان شکو ہائے عجب کو  
(راقم الحروف)

زندگی میں تو شائستہ اخلاق ہونا اور صدق و صفایہ اکرنا تو سوا  
مگر وعدہ ای اخلاق بھی کوئی چیز ہے اور شعر و شاعری کے اہم مقاصد میں ایک  
یہ بھی ہے کہ ایک مثالی اخلاق (ideal ethics) کی مثالیں  
پیش کی جائیں۔

مگر حقیقت تو یہ ہے کہ بذاتی جب ضبط کا ذکر بھی کرتی ہے تو  
شاعری کی روح کو چٹ گئی ہے، سودا کہتا ہے۔  
موت پوچھ پکارت کئی کر کہ تجھ بغیر اس گنگو سے فائدہ، پیارے گزرتی







ہے حضرت اگر اسی احسان کرنا کے ٹکڑے نے شعر کو نشتر بنا دیا نہ؟  
میں دوجہتا ہوں کہ کیا دہی کے مسلمان شہر اہندوؤں کی طرح بھائے جاتے  
تھے، کیا قبر گن چیز کا نام ہے اسے وہ نہیں جانتے تھے، پھر وہ ایسے شعر  
کیوں نہیں کہتے تھے، شاید وہ سوز و ساز میں حضرت صفی سے کم تھے، بندہ  
نواز دادہ وجہ ایسی باتوں سے اُن کے بچنے کی دہی تھی جو میں نے بتا دی  
تھی، یعنی بازار بیت اور خاٹ سے نفرت۔

ہاں آپ ضرور ایسے اشعار سے لذت باب ہوں اور بڑے خود اسے  
"وجدان اور ذوقِ سلیم" بتائیں۔ اس سے اکثر لوگ بے بہرہ ہی ہیں، بقول  
آپ کے، مجھے یہ معلوم ہی نہیں تھا، اب میں بھی کہتا ہوں کہ حضرت بنجو  
کے ایک شعر اور حضرت صفی کے ان دو اشعار میں آہ کیا اعلیٰ زبان ہے،  
کیا سوز و ساز ہے، کتنی گہری کیفیت ہے، بار بار پڑھتے ہی نہیں بھرتا وغیرہ  
وغیرہ وغیرہ، واقعی یہ دونوں حضرات بہت بڑے حسن پرست اور بیت  
بڑے عاشق تھے، انہیں کچھ نہ کہو۔

توتے نہیں، تیرہ غائب، درد اور متکبر جان جانا کو تو یہ بات نصیب نہ تھی، یہ  
لوگ ذرا سنگدل تھے، انہیں یہ توفیق کیونکر ہوئی۔ وہ گئے حضرات کھنڈ تو وہ  
ایسے اشعار سے جتنا بھی مائل ہو کر یہ ہوں وہ اُن کا حصہ ہے، ابھی تو غزل کی  
شاعری کی غرض و فائز ہے کہ ایسے اشعار سننے سنانے کے لئے جمعیوں کی  
جائیں۔

دو گھڑی مل بیٹھے رونے رو لانے کے لئے

حضرت آؤ کے الفاظ میں (یا شاہدہ اور تجربے کے مطابق؟) جی ہاں، بہرہ  
اور بھول ہوں کے بعد "جس میں دانت بھی ناپاں ہو جاتے ہیں حضرت اثر  
آپ نے باطل پر کہا، پھر یہ مصرعے پڑے جائیں کہ جانے دیجئے، اگر کم کیجئے، ادھر  
نہ دیکھئے

آپ کو مفت ندامت ہوگی

اس کے بعد باطل اس سے الٹی خواہش ظاہر کی جائے، اور پیسے سے زیادہ  
چٹا کر کہا جائے کہ

ایک ٹوٹی ہوئی تربت پر سہی احسان کرنا

## عورت

کبھی اک رازِ عریاں ہے کبھی اک رازِ پنہانی  
نیا زونا زکی بانی، نقوشِ زلیست کی بانی  
محبت ابتدا اس کی محبت انتہا اس کی  
طبیعت کی اُمتلیں ہیں جواں عورت کی ہستی سے  
مفصور بھی سمجھتا ہے تنہا اپنی عورت کو  
وہ اپنے دل کو نورِ عشق سے جب جگمگاتا ہے  
محبت اس کی فطرت میں ہے نفرت اس کی طہیت میں

نہ سمجھا آج تک دُنیا نے عورت کی حقیقت کو

سراپائے محبت کو سراپائے عداوت کو

# سماج کی سنگدلی

محمد کمال احمد، راز، بھاگل پور

(۱)

ٹرین ایک معمولی سے اسٹیشن پر آ کر رکھی،  
باہر بلا کاسٹنا، لاکھ بیٹے کا جازا،  
وہ وہ ہفتہ کی پہلی روشنی، کبر آلود فضا تھی۔

ٹینٹ فارم پر جا سجا  
شبنم زدہ کھلانے ہوئے بچوں  
جھلکاتی ہوئی دو ایک ٹھنسیں، دو تین سسٹے سسٹے قے  
ایک آدھ سا فرخاموش گاڑی پر  
سوار ہونے اور اترنے نظر آرہے تھے،

گاڑی نے سیٹی دی، گاڑی کی سبز جھنڈی ہوا میں لہرا رہی تھی، پیسوں میں  
جھنڈ ہونے لگی تھی۔

اتنے میں ایک عورت پچھی پرانی ساری میں لمبوں گود میں ایک ننھی بچی دبائے  
اندرا آئی ہانچتی ہوئی۔

اس کے روکے روکے بال پر لیشان، اور سیاہ و خالصورت آنکھیں کھلائی  
ہوئیں۔

قلی نے ایک پٹاری اور ایک حین تصویر

جو جھکے میں لگی ہوئی تھی

اٹھ رہی تھیں

(۳)

گاڑی آہستہ خرابی کو چھوڑ کر  
اب تیزی سے سائیں سائیں کرتی  
دونوں طرف جنگلوں اور بھاڑیوں کو  
پچھے چھوڑتی، ہوا سے باتیں کر رہی تھی  
گاڑی مسافروں سے کچھ کچھ مہربانی بھی تھی،  
عورت بھی ابھی تک کھڑی تھی  
دیوار کا سہارا لے بیٹھے  
اس کے پاؤں گاڑی کے چکروں سے ڈگمگا رہے تھے۔

آخر وہ جیٹے گئی (بچی کچی کو دبا کر)  
موسم سرما کی بیٹی ہوئی رات (۳)

پہلی ہوئی معمولی سوتی ساری  
گاڑی کی ٹھنڈی نشست

میرادل اس نظارہ کو دیکھ کر بھڑک آیا

میں نے اپنے پاس اس کو تھوڑی سی جگہ دی

اس کی دوسرا ننھی بچی ایک ہلکی سی ادنیٰ بنیان پہنے سردی سے گود

میں شکر کی ہوئی تھی۔

"کیا تم بتا سکتی ہو کہ تم کن ہو اور کہاں جا رہی ہو؟"







اور لٹین کے بیان لاؤ، اور یہ تمام شہر کے لوگوں کو محل کے قریب ٹھیکہ شراب  
پنی پنی کر دنیا میں میرا نام روشن کرے دو۔

### مسافر چکا رستے میں

مسافر۔ جناب! جناب! اور دو کتوں کے بچہ جناب! پلوار  
اپنے اونٹوں کی رستہ پاں کھو لو ہا کہ سب لوگ کد کو روانہ ہوں۔

بلنار۔ میں ریگستان کو بہت بد دعا دیتا ہوں۔

آؤ اب۔ اب اونٹ کھڑے ہو رہے ہیں۔۔۔۔۔ قافلہ کد کی جانب  
روانہ ہو رہا ہے۔۔۔۔۔ رخصت۔۔۔۔۔ اسے خوبصورت شہر تھیلنا  
رخصت۔۔۔۔۔

بادشاہ یہ وعدہ کر کے کہ اگلے سال اسی دن دوبہر تک مکہ  
واپس آجائے گا، ریگستان کی طرف روانہ ہو جاتا ہے۔۔۔۔۔  
وہ اپنا لباس تبدیل کر کے مکہ واپس آتا ہے، اس کے ساتھ  
ایک عربی سمن دوشیزا ہے، جس سے وہ محبت کرتا ہے، ایسے  
ہی وہ شہر میں داخل ہوتا ہے ایک بدو (اونٹ چلانے والا  
اس کے سامنے آتا ہے، اور اپنے بادشاہ ہونے کا اعلان  
کرتا ہے۔)

بادشاہ۔ آہ۔۔۔۔۔ دنیا ہنسنے کیسا نہیں رہتی۔۔۔۔۔  
رفتہ رفتہ ہر شے تبدیل ہو جاتی ہے، اور آخر میں اس کی ایک نمٹاتی ہوئی  
شے نظر آتی ہے۔۔۔۔۔ اور کوتوالی دیر بعد وہ بھی خاموش ہو جاتی ہے  
۔۔۔۔۔ اس وقت ہر طرف ناامیدی ہی ناامیدی نظر آتی ہے۔  
(انڈانار اعلیٰ دوشیزہ اس کا کوئی جواب نہیں دیتی، وہ اپنا  
سمن ڈھک لیتی ہے، بادشاہ اُٹھتا ہے اور آہستہ آہستہ  
سیڑھوں پر چڑھتا ہے)

(چیمبرلین اور زہرا داخل ہوتے ہیں)

چیمبرلین۔ آئے گا۔۔۔۔۔ وہ ضرور آئے گا۔

زہرا۔ لیکن اب دوبہر ہو گئی ہے۔۔۔۔۔ آہ۔۔۔۔۔ کیا  
ہماری قسمت نے ہمارا ساتھ چھوڑ دیا ہے، ہمارے دشمن ہم کو ذلت کی گلاہ  
سے دیکھتے ہیں۔ آہ۔۔۔۔۔ خدا کیا تو ہم سے خوش ہے۔۔۔۔۔  
کیا وہ آئے گا؟

(جناب اور آدب داخل ہوتے ہیں)

چیمبرلین۔ بہن! اگر وہ زندہ ہے تو ضرور آئے گا۔

زہرا۔ لیکن مجھے درہمے کیوں کہ اب وہ بھی پہرے گزر چکی ہے۔

چیمبرلین۔ تب شاید وہ مر گیا، یا ماہ میں ڈاکوؤں نے اسے لوٹ لیا۔

(چیمبرلین اور زہرا گھبراتے ہیں)

بلنار۔ (آؤ اب سے مخاطب ہو کر) خدا نصبت مزاج ہے، (چیمبرلین  
اور زہرا کی طرف مخاطب ہو کر کہتا ہے)۔۔۔۔۔ میں۔

(بادشاہ کا ہاتھ دروازہ پر ہے، جب جناب یہ کہتا ہے تو بادشاہ  
آہستہ آہستہ میسر سے نیچے اُترتا ہے، اور عربی دوشیزہ کے قریب بیٹھ  
جاتا ہے، انڈانار اپنا سر اوپر اٹھاتی ہے، اور بادشاہ کی طرف بخود  
دیکھتی ہے، بادشاہ چیمبرلین، زہرا اور آؤ اب کی باتوں کو بغور  
سناتا ہے) انڈانار اپنا چہرہ ڈھک لیتی ہے۔

چیمبرلین۔ کیا آپ واقعی بادشاہ ہیں؟

بلنار۔ ہاں!۔۔۔۔۔

چیمبرلین۔ حضور والا ایک سال کے عرصے میں بہت تبدیل ہو گئے ہیں۔

بلنار۔ ہاں!۔۔۔۔۔ انسان ریگستان کی آب و ہوا سے بہت  
تبدیل ہو جاتا ہے۔

آؤ اب، واقعی عالی جناب آپ ہی بادشاہ ہیں (چیمبرلین کی طرف اشارہ  
کرتے ہوئے) جب حضور سلامت ریگستان گئے تھے تو میں نے ہی آپ کے اونٹ  
چراگے تھے۔

زہرا۔ ہاں!۔۔۔۔۔ آپ ہی بادشاہ ہیں، میں جب کبھی آپ کو دیکھتا  
ہوں تو پہچان لیتا ہوں۔

چیمبرلین۔ قوم نے حضور کو اکثر دیکھا ہے۔

زہرا۔ ہاں!۔۔۔۔۔

چیمبرلین۔ اگر اس شخص کے علاوہ (جو آپ کے چہرہ ہے) اور کوئی  
دوسرا شخص آپ کو پہچان سے تو ہم آپ کو بادشاہ تسلیم کرنے کے لیے تیار ہیں۔

بلنار۔ اس کی کوئی ضرورت نہیں، میں ہی بادشاہ ہوں۔

(بادشاہ اپنی جگہ سے اٹھتا ہوا کھڑا ہو جاتا ہے)

بادشاہ۔ ہاں!۔۔۔۔۔ پاک کمین میں نے آپ کو بطور بادشاہ کے دیکھا ہے۔



# اورنگ زیب اور راجہ حسونت سنگھ

کوثر چاند پوری

یہی عمل رہا، اس کا بیٹا محترم علی یا ہوا آتا ہے، اور ذرا سٹہ پر بادشاہ تو پورا کامنہ اس کے لشکر کی طرف پھر کر حکم دیتا ہے کہ ہتھیار اتارنا صرف بیٹوں کو سنا سنا کر آؤ۔ پھر اسی بیٹے کو سعادت دکن کی پیچیدگیوں سے متاثر ہو کر قید کر لیتا ہے اور اس وقت تک رہا نہیں کرتا۔ جب تک دکن کی صورت حال سے مطمئن نہیں ہو جاتا، اکبر لغات و دگرشی کرتا ہے تو اس کے مقابلہ میں بھی اورنگ زیب وہی سیاسی چالیں چلتا ہے جو کسی خطرناک غنیمت کے ساتھ چلی جاسکتی ہیں، جس تیر سے بیٹے کی فوج کے عہدہ سرداروں کو اس سے توڑتا ہے، اس کے لشکر میں بیوٹ ڈالواتا ہے اور اس طرح بغیر تلوار میدان سے نکالے وقت لغتہ جنگ کو بدل دیتا ہے، اورنگ زیب کے بھائی اور بیٹے سب مسلمان تھے، اس نے یہاں قدر شاہی مذہبی تعصب کا سوال پیدا نہیں ہوتا اور مجبوراً تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ یہ ساری کارنامے ملکی اور سیاسی امور سے متعلق تھے، لیکن یہی سیاسی اور ملکی موزوں طریقہ مسلم سرداروں اور باغیوں کے بالقابل استعمال کی جاتی ہیں تو جاہل اور بے بصر معترض فوراً امنیں تعصب اور ہندو کشی سے تعبیر کرتا ہے، چنانچہ مسیحا اجمی اور اس کے خیر و شر بیٹے سبھا پر اسی اصول کے ماتحت فوج کشی کی جاتی ہے، اور امنیں اس پر دوسٹگیر کرنے کی سعی ملتی لائی جاتی ہے تو یہ سیاست اور ملکی ضرورت باکسی وقت کے تعصب اور رنگ نظری میں تبدیل ہو جاتی ہے، حالانکہ تاریخ پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ مسیحا اجمی مرہٹہ اورنگ زیب کا باغی اور اس کی حکومت کا بدترین دشمن تھا، سبھا کی حیثیت بھی اس سے مختلف نہ تھی۔ یہ دونوں حکومت مغلیہ کو بیخود زمین سے اٹھا ڈالنا چاہتے تھے، متعوضات شاہی پر غاصبانہ قبضہ کرتے تھے، بادشاہ کی رعایا کو ٹوٹے اور اُن کے گھروں کو تباہ کرتے تھے۔

کون نہیں جانتا کہ اورنگ زیب نہایت دین دار اور متقی بادشاہ تھا، اور یہی اس کی ایسی زبردست خطا ہے جس نے اورنگ زیب کو ہزاروں الزامات کا ہدف بنا دیا ہے، حالانکہ جو لوگ دین اور مذہب کی حقیقت سے باخبر ہیں وہ خود جانتے ہیں کہ ایک مسلمان بادشاہ جس کے تمام افعال و اعمال اسلام کے دائرے میں محدود ہوں کسی حالت میں بھی غیر مسلم رعایا کے ساتھ بے انصافی نہیں کر سکتا، زنان کے مذہبی حقوق اور آزادی کو سب کرنے کی جرات کر سکتا ہے، وہ اسلامی قانون کی رو سے مجبور ہے، نہ مختلف طبقات رعایا میں عدل و مساوات کی نیراز کے پڑے برابر رکھے۔ اگر کوئی بلا اسی جھکا لگی تو عاقبت میں اُس کی سرانٹکٹنی پڑے گی۔ اس میں شک نہیں کہ اورنگ زیب پچاس مسلمان تھا، مگر یہ بھی واقعہ ہے کہ وہ نہایت سیاسی، دور اندیش اور عقیدار انسان تھا، اُس نے مذہب کو ہمیشہ سیاسی سر بلند یوں کے لئے بطور رکاز استعمال کیا ہے، اور یہ کہنا حقیقت سے لاعلمی کا ثبوت دیتا ہے کہ اس نے ہر کام مذہب کی روشنی میں کیا ہے، وہ ایک وقت مسلمان بھی تھا اور بادشاہ بھی، اس لئے جو لوگ اس کی دودلاں حیثیتوں کو جدا جدا نقطہ نظر سے نہیں دیکھ سکتے، وہ اس کی زندگی کے ایک رخ کو باطل نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اس کے ہر کام میں مذہبی رنگ پیدا کر دینا ایک سخت قسم کا تعصب ہے جس کے لئے جہالت اور بے تجربی لازمی ہے، اورنگ زیب نے ضرورت سے آخر تک جو کچھ بھی کیا وہ فاعل سیاست اور چہانپانی کے اصول سے کیا، باپ اور بھائیوں کے ساتھ اس نے جملہ اعمال اختیار کیا، اس میں بھی ملکی اور سیاسی اغراض کا فرما تھے، اور ایک اولیٰ العزم بادشاہ کو اس کے سوا کوئی چارہ کار بھی نہ تھا۔ بیٹوں کے ساتھ بھی اس کا

لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ مدرین یورپ نے جو دہریے اثرات پہنچائے ہیں ہمارے دل و دماغ پر ابھی ان کا کافی اثر موجود ہے، چنانچہ ابھی حال میں ایک تاریخی انسانہ انتقام کے عنوان سے شائع ہوا ہے جس کے مصنف لکٹر ملکشی دت صاحب ہیں، سیرس رائے میں یہ انسانہ تاریخی حقائق سے زیادہ تعصب گفاریوں، اور انسانہ طرازیوں کا حامل ہے۔ مجھے خوشی ہوئی اگر اس نامور مصنف سمیٹی تحقیق و کاوش سے کبھی کام لیتے، اگر معاملہ میرا اور مصنف ہی کا ہوتا تو یقیناً میں اس کا جواب دے کر اپنی اور اپنی معلومات کی توبہن بالقصد کا نمک نہ ہوتا۔ لیکن صورت حال دوسری ہے، اور یہ بہت افراد سے گزرا کہ اب کبھی سوم کر سکتی ہے، اس لئے میری دوستی مجھ سے مطالبہ کرتی ہے کہ میں ان تاریخی حقائق کو کہ عالم کشاکش مارکروں، جن کو کذب و افتراء کے بنارس سے دھندلایا جا رہا ہے۔

ہندوستان اب اسے قومی دور سے گزرا، ہاں، اس دت نمک وہ اپنی تعین کی ہوئی منزل مقصود تک نہیں پہنچ سکتا، جب تک ہمارے خیالات اور عقائد میں غلطی پیدا نہ ہو۔ غرض کی بیان کی ہوئی جھوٹی داستانوں پر اعتماد کرنے کی مذموم عادت خود اعتمادی کے باطل خلاف ہے، اس لئے میں اس کے خلاف پوری قوت سے جہاد کر کے اپنے ارادوں میں ملندی اور خیالات و محسوسات میں پاکیزگی پیدا کرانی چاہیے۔ علامہ شبلی کی کتاب عالمگیر پر ایک نظر اور اس کے تمام تاخیر سے سامنے ہیں، اور میں کوشش کروں گا کہ جس چیز کو علامہ مرحوم نے ایجاد و اختصار کے ساتھ پیش کیا تھا، تفصیل و وضاحت سے بیان کروں، اور ان ضروریات کا بھی احاطہ کروں جو بعد میں پیدا ہوئی ہیں۔

ہمارا جہنم سنگھ و شخص ہے جو اورنگ زیب کی اقبال مندی کا آفتاب طلوع ہوتے ہی، اس سے ٹکرایا۔ "میں کے مقام پر جس کو عالمگیر کے "خوشنید اقبال کا مطلع کہنا چاہیے، راجہ جہنم سنگھ بھی جہنم نے اورنگ زیب کی سلطنت و اقتدار کے تیز دھارے کو روکنے کے لئے نیزہ و شمشیر کا استعمال کیا۔ مگر وہ طاقت و شجاعت کے اس سیلاب کو نہ روک سکا اور بالآخر شکست کھا کر بھاگ گیا۔ میر خیال ہے کہ واقعات کو سمجھنے میں "اشارات" سے حسب دلخواہ اعداد نہیں لی جاسکتی، اس لئے ضروری تفصیلات کو کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

پھر سب اورنگ زیب ان کے استیصال کی غرض سے فوجی قوت استعمال کرتا ہے، اور عساکر خلیہ کو حرکت میں لاتا ہے تو اس اہم اور ملکی خدمت کو اس کے اسلامی جذبات سے متعلق سمجھا جاتا ہے۔

یہ ہیں نقاد، رہا از کماست تا بہ کجا

اورنگ زیب اور ہمارا جہنم سنگھ والی جو دھوڑ کا معاملہ بھی اسی ذہنیت کا ہے اگرچہ اس میں ازل سے آخر تک اورنگ زیب کی فیاضی، اخلاقی اور عفو و درگزر کی متواتر اور حیرت انگیز مثالیں ملتی ہیں۔ مگر ان سب کو نظر انداز کر کے ایک چند غلط فہمیوں کی بنا پر جو یورپ میں مورخین کی حماقت کے ثبوت پیدا ہو چکی ہیں، اسے بدنام و سزا کرنے کی ناکام کوشش کی جاتی ہے، اگرچہ ان جہرہ سرانیوں کے خلاف متعدد بار آواز بلند کی جا چکی ہے۔ بالخصوص علامہ شبلی مرحوم نے اس خصوص میں نہایت کامیاب اور قابل تعریف خدمات انجام دی ہیں۔ مگر جو لوگ جھوٹے افسانے اور سدا پہلے کے عادی ہوتے ہیں، ان پر دلائل کی معقولیت اور واقعات کی اصلیت کا اثر نہیں ہوا کرتا، ان کا مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ غرضی اور غلط انسانے بیان کر کے ہنگامہ برپا کریں اور بس، چنانچہ اسی "عادت قدیم" اور ضلالتِ یلیم کی بنا پر آج بھی اورنگ زیب کے خلاف غیر ذمہ اور حضرات کی زبانیں اور ان کے قلم اچھے کام سے غافل نہیں، اس کام کی اہمیت کو وہ خود بھی اچھی طرح محسوس کرتے ہیں۔ لیکن اپنی اعراض سے مجبور ہیں اور اصحنی اقتدار کی ریشہ و انہیاں رہ رہ کر انہیں اس شرارت پر اکساتی اور آمادہ کرتی ہیں یہی راز ہے جو بارہا راجہ جہاں اور عالمگیر کو مود وطن بنا جاتا ہے، اور ان پر بے بنیاد، دل آزار جھگڑے کئے جاتے ہیں، غرض دوائی سے دیکھا جائے تو ان غلط فہمیوں کا سرچرچہ عالمگیر کے خلاف پھیلائی جاتی ہیں۔ انگریز مورخین کی وہ کتابیں ہیں جو ایک غیر ملک میں میٹھکر، مہاں کے رسم و رواج اور خصوصیات سے بے خبری کے عالم میں انہوں نے مرتب کی ہیں، اور محض اس وجہ سے کہ یورپ کے آسان سے نازل ہوئی ہیں، ان واقعات اور متعصب لوگ ان پر اعتماد کرتے ہیں، حالانکہ ہندوستان کی تاریخ ہندوئوں سے بہتر اور کوئی شخص بیان نہیں کر سکتا۔

موجودہ زمانہ میں جب کہ ہندوستان صدیوں تک سوچنے کے بعد متحدہ قومیت کا خواب دیکھ رہا ہے اور ارباب فکر و نظر اس کی تعبیر تلاش کر رہے ہیں۔ اس قسم کی ہیروہ گفاریوں کا سلسلہ قطعاً بند ہو جانا چاہیے،

کے لئے فوج بھیجی کی فکر نہ کرنے لگا۔ آخر ایک زبردست لشکر راجہ جیوت سنگھ رامپور کی زیر سرکردگی اجین روانہ کیا، اس سے متعلق یہ تھا کہ دریائے زہاکے گھاٹوں پر قبضہ ہو جائے، اور مالگیر آگے کاٹنے نہ کر سکے۔

مراد اور شجاع کی طرف سے داراشکوہ نے بادشاہ کو ہرج کر دیا تھا، وہ چاہتا تھا پیسے ان دونوں کا قصہ تمام ہو جائے، اور مالگیر تیار ہو جائے تاکہ اس کا مقابلہ کرنے میں کوئی دشواری پیش نہ آئے۔ شجاع کی سرکوبی کیلئے بھی فوج جا چکی تھی، مراد کا یہ انتظام ہوا کہ قاسم خان کو لشکر دے کر راجہ جیوت سنگھ کے ہمراہ بھیجا گیا تاکہ ضرورت کے وقت مراد کو گھبراتے بے دخل کر دے۔

اگرچہ اورنگ زیب نے اب تک باپ کے خلاف کوئی اقدام نہ کیا تھا اور نافذ مانی کا خیال بھی اس کے دل میں نہ آیا تھا، لیکن داراشکوہ نے جھوٹی خبریں بیان کر کے بادشاہ کو اس کی طرف سے بھی خوفزدہ کر دیا۔ اور اس کے وکیل عیسیٰ بابک کو گرفتار کر کے اس کا مال، واسباب ضبط کر لیا گیا۔

### اورنگ زیب اور جیوت سنگھ کا مقابلہ

جبکہ لکھا جا چکا ہے کہ اورنگ زیب بجا پور کے محاصرے میں معروف تھا کہ فوج کی دباہی کے لئے شاہی زبان پہنچ گیا۔ اور اس نازک وقت میں اورنگ زیب تیار ہو گیا، مجبوراً وہ سکندر عادل شاہ سے صلح کر کے اورنگ آباد گیا۔

بیان اگر مالگیر نے آگرہ جانے اور داراشکوہ کے اختیارات کو کم کرنے کا پختہ ارادہ کر لیا، اس کا خیال تھا کہ مراد کو بھی ساتھ لے جائے اور باپ سے اس کا تصور معاف کرائے۔

اورنگ زیب اچھی طرح جانتا تھا کہ داراشکوہ اُسے دربار تک نہ پہنچنے دے گا۔ چنانچہ ملکن ہوگا باپ اور بیٹے کی ملاقات میں رکاوٹیں پیدا کر لیا، اس کے علاوہ آگرہ جانے کے لئے مال سے گردن مائوری تھا، چنانچہ راجہ جیوت سنگھ اور قاسم خان اپنا لشکر لے کر آئے تھے۔ اور قلعہ بندی کر رہے تھے، ان حالات کا انصاف تھا کہ وہ بھی تیار ہو کر جائے، اور اپنے راستے سے رکاوٹوں کو دور کرتا ہوا آگرہ پہنچ جائے، اس خیال سے اس نے اپنی فوج درست کی، امرالی استقامت کیلئے ان کو مناصب و خلایا بتھلائے۔ شاہزادہ مراد کو پیام بھیجا کہ تم بھی مالے کی طرف بڑھو اور زہاکو

ہرزدی اور شجاع شہزادہ کو اورنگ زیب کا باپ اور شہنشاہ ہند شاہجہاں بیمار ہو گیا، اور کمزوری کے باعث سلطنت کے نظم و نسق کی نگرانی نہ کر سکا۔ شاہجہاں کے جواروں، بیٹوں میں سے صرف داراشکوہ چاہتے تھے دلی عہد ہونے کا یقین رکھتا تھا۔ بادشاہ کے پاس موجود تھا، اورنگ زیب دکن میں قلعہ بجا پور کی بند اور سنگین دیواروں پر اپنی قوت آزمایا تھا، مراد گجرات کی سویہ داری کے جنگجوؤں میں اچھا ہوا تھا، شجاع بنگال میں تھا، داراشکوہ نے میدان خالی دیکھ کر کاروبار حکومت کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ ساتھ ہی یہ بے غرضی بھی کی کہ داراشکوہ کی خبروں کا ہر جاننا بند کر دیا۔ خطوط پر نگرانی قائم کر دی، امراد اور شاہزادگان کے وکلاء کو سختی سے معافت کر دی کہ وہ باہر کی کوئی خبر نہ لکھیں، داراشکوہ کی اس ناقابل اندیشی کا یہ نتیجہ ہوا کہ بادشاہ کی موت اور زندگی کے معاملہ میں لوگوں کو شبہات پیدا ہونے لگے، رعایا جو بادشاہ کے دشمن کی عادی تھی اس دولت سے محروم ہو گئی۔ ملک میں اس سرے سے اُس سرے تک پہنچ گیا ہو گیا، جگہ جگہ فتنے برپا ہونے لگے۔

مراد بخش نے گجرات میں اپنی بادشاہت کا اعلان کر کے خطبہ اور سکہ جاری کر دیا۔ شجاع بھی خاموش بیٹھنے والا نہ تھا، اس نے بھی حاد مزاری اور آزادی کا دعوئی کیا، اور پٹنہ پر قبضہ کر کے بنارس تک آ گیا، اورنگ زیب ان سب میں مقتصد اور دور اندیش تھا، اس نے اپنے دامن کو خود مری اور بغاوت کے داغ سے محفوظ رکھا۔

داراشکوہ خوب سمجھتا تھا کہ اورنگ زیب کے علاوہ اس کے کسی مہمائی میں مقابلہ کی ہمت نہیں۔ مالگیر کی دانشمندی اور شجاعت کا اس پر کافی اثر تھا، یہ وہ وقت تھا جب مالگیر بھیجا پور کے محاصرے میں مصروف تھا اور فتح کے آثار پیدا ہو گئے تھے، داراشکوہ کو معلوم تھا کہ اورنگ زیب کے پاس کافی لشکر موجود ہے، وہ جس وقت چاہے گا داراشکوہ پر حملہ کر دے گا۔ چنانچہ اورنگ زیب کا زور توڑنے کی اس نے یہ تدبیر کی کہ (عداوی لشکر کو جو فتح بجا پور کے لئے مامور ہوا تھا بادشاہ سے کہہ کر واپس بلا لیا۔ تمام امراد حکم شاہی کی تعمیل میں ہم کو اودھورا چھوڑ کر حضور میں آ گئے، اورنگ زیب تیار ہو گیا، بڑے بڑے امیروں میں سے منظم خان، شاہنواز اور شجاعت خان کے علاوہ کوئی امیر اس کا شریک حال نہ رہا۔

داراشکوہ، بادشاہ کو دہلی سے آگے لے آیا، اور مراد و شجاع کی تہیہ

ہے، اگرچہ اس حیثیت سے کہ وہ داراشکوہ کے احکام کی تعمیل کر رہا تھا، اور باغی نہ تھا، دیکھنا چاہئے کہ فرار کے بجائے وہی میں وفاداری سے کوئی کوشش کر رہا تھا، راجہ کو کسی طرح مورد الزام نہیں بنایا جاسکتا، لیکن اورنگ زیب اور راجہ کے تعلقات پر اس وفاداری کا کوئی اثر نہیں پڑ سکتا، داراشکوہ اور عالمگیر کی حیثیت ایک نئی، ایسی صورت میں راجہ کو ان کے معاملات میں دخل نہ دینا چاہئے تھا، اگر گھر میں داراشکوہ جن فریب کاریوں کے جال میں پھنسا ہوا تھا، راجہ ان سے بھی بے خبر نہ تھا، اس وقت بھی مناسب تھا کہ وہ عالمگیر کو نہ جھڑپاتا اور نکل جانے دیتا، ان افغان سے یہ نتیجہ نکالنا بعید از عقل نہیں ہے کہ اورنگ زیب کو راجہ حبونٹ سنگھ کی یہ بے ادبی سخت ناگوار ہوئی ہوگی، اور اقتدار و سلطنت حاصل کرنے کے بعد اگر وہ اس سے انتقام لینے کی سعی کرتا تو قطعی حق بجانب ہوتا، مگر دیکھنا یہ ہے کہ اورنگ زیب کی یہ ہمہ جہاں سے لڑائی سے شروع ہوئی تھی یا بدشاہت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئی، تو اس نے اپنے شکست خوردہ راجہ حبونٹ سنگھ کے ساتھ کیا کیا؟ اس کا جواب نہایت مختصر ہے، یعنی اورنگ زیب سر پر آرائے سلطنت ہوا تو پہلے ہی سال راجہ حبونٹ سنگھ نے معافی اور قصوری کی درخواست پیش کی، اور عالمگیر نے اپنی شاہانہ فیاضی سے اس کا قصور معاف کر دیا، جشن و ذبح کے موقع پر منصب اور ضلعت بھی عنایت کیا۔

### راجہ حبونٹ سنگھ کی غداری

اُجین کی جنگ کے متعلق کہا جاسکتا ہے کہ حبونٹ سنگھ نے عالمگیر کا مقابلہ کر کے اپنا وہ فرض ادا کیا تھا جو شاہی حکم کی رو سے اس پر عاید ہوتا تھا، اس لئے ہم بھی تعجباً اُجین کو نظر انداز نہ کریں، اور راجہ کی غداریوں کا اس وقت سے شمار کرتے ہیں، جب شجاع کی لڑائی میں دفعہ دوم اورنگ کے لشکر سے بھاگ کر سخت نقصان اور فتنہ کا باعث ہوا تھا، ہم اس واقعہ کو کچھ تفصیل سے بیان کریں گے تاکہ وقت کی نزاکت اور عالمگیر کی مشکلات کا اچھی طرح اندازہ ہو جائے، اور بادشاہ کی رد و اداری و فیاضی کا اندازہ کرنے میں کوئی غلطی نہ ہو، اورنگ زیب نے اپنے بھائی شجاع کو صلہ و استسقی کی دعوت دی لیکن اس نے دل سے اس کی پذیرائی نہ کی، آخر کار ۱۹ ربیع الثانی ۱۰۶۸ھ کو اورنگ زیب شجاع کے مقابلہ کو چلا، اور شجاع کے لشکر سے نصف کوں کے فاصلہ پر ٹھہر چکا۔

عبر کر کے ہے آخر، ان اشتہارات سے فارغ ہو کر اورنگ زیب ۱۲ جمادی الثانی ۱۰۶۸ھ کو اورنگ آباد سے برہان پور کی طرف بڑھا، برہان پور سے اس نے باپ کی خدمت میں مزاج پرسی کے لئے علیحدہ لکھا، جواب کے اشتہار میں ایک مہینہ تک وہاں قیام کیا، لیکن جواب نہ آیا، اور دشتناک خبریں برائے آئی ہیں مجبوراً ۱۵ جمادی الثانی کو وہ برہان پور سے اگرت آباد کی طرف چلا، دیا پور سے نکلا تو شاہزادہ مراد بھی اس کا شریک سفر ہو گیا۔

راجہ حبونٹ سنگھ نے اُجین سے سات کوں بڑھ کر شاہزادوں کو روکھا، اورنگ زیب کی نیت خواہ کچھ بھی ہو، لیکن یہ واقعہ ہے کہ وہ لڑائی سے بچنا چاہتا تھا، اس نے راجہ حبونٹ سنگھ کے پاس پہلا بھیجا کہ میں باپ کی زیارت کو جا رہا ہوں، لڑائی کا ارادہ نہیں رکھتا، بہتر ہے کہ تم بھی میرے ساتھ چلو ورنہ راستہ سے ہٹ جاؤ، راجہ نے اس پیام کا کوئی اثر نہ لیا، اور جنگ و جدل پر آمادہ ہو گیا۔

۲۲ رجب ۱۰۶۸ھ کو جمعہ کے دن اورنگ زیب نے اپنا لشکر آراستہ کیا۔

عالمگیر نامہ کی روایت ہے کہ راجہ حبونٹ سنگھ نے اورنگ زیب سے مرعوب ہو کر پہلا پاکہ میں لڑنا نہیں چاہتا، بلکہ اطاعت و ملازمت کا قصد رکھتا ہوں، اورنگ زیب نے اس کی بات کا اعتبار نہ کیا، اور جواب دیا کہ مجھے ہو تو نہ تھا، شجاعت خاں کے پاس جاؤ وہ شاہزادہ محمد سلطان کے پاس نہیں لے جائے گا، شاہزادہ ہارسے پاس لائے گا، راجہ نے اس حکم کی تعمیل نہ کی، اور لڑائی کے اتمام میں مصروف ہو گیا، بہادریوں بہادریوں اور راجہ حبونٹ سنگھ نے اس کے ساتھ، لڑائی شروع ہوئی اور تیرہ دن تک سے لڑ کر دست بردست مقابلہ ہوئے گا، راجہ حبونٹ نے اورنگ زیب کے ہراول پر زہر دست حملہ کیا، اورنگ زیب اس سحر کوں میں خود شریک تھا، اس نے شمس کا منہ پھیر دیا، نتیجہ یہ ہوا کہ راجہ حبونٹ سنگھ شکست کھا کر اپنے وطن چودھری چلا گیا اور دھماکا شکر شہر کی کے ساتھ فرار ہوا۔

یہ تھی اورنگ زیب اور حبونٹ سنگھ کی مخالفت کی ابتدا، جس سے مٹا طور پر پڑھتا ہے کہ عالمگیر جن سکون کے ساتھ مالوے کی سرحد سے نکل جانا چاہتا تھا، مگر راجہ کی فساد و آگاہی نے اس کے امکانات باقی نہ رکھے، اور مجبوراً لڑائی تک ذلت پہنچی، جس کی تمام ذمہ داری راجہ حبونٹ سنگھ کے سر پر عاید ہوئی

خیوں اور اہل و عیال کی دیکھ بھال کو دوڑے کسی نے ٹھکی کی طرف بھاگ کر وہاں نہ پای۔ بڑل اور سنائی تو آگاہ رہے، اچھے اچھے جان مندوں اور پیادوں کے قدم ڈنگا گئے اور سختی بیت عاری ہو گئی کہ ایک راجپوت بھی نیزہ سے کرنا تو پوری جماعت کی جماعت بہ حواس ہو کر کھڑی کی کھڑی رہ جاتی، راجپوت لڑے ہوئے اونٹوں کو گھیر کر لے جانے لگے، تو کسی کو روکنے کی ہمت نہ ہوتی، غرض فوج میں ایسی اتیری پہلی کہ سارا نظام درہم درہم ہو گیا، لیکن عالمگیر کی جماعت اور دلیری دیکھنے کو اس کی جبین استقلال پر بل بھی نہ آیا، جب اس کو اطلاع ہوئی کہ جہنم سنگھ بھاگ گیا تو اس نے ذرا بھی پریشانی اور اضطراب کا اظہار نہ کیا۔ بلکہ جتنی پرہیزی سارا نہ ہوا، اور تخت روان پر بیٹھ کر ہر ادل مقرر کے کہنیل سواروں اور گھوڑا سواروں کو تاکید کر دیں کہ اپنی جگہ سے نہ ہٹیں، اگر کوئی بھی پٹے تو نہایت ذلت سے کیچنے ہوئے ہمارے پاس لائیں۔

بادشاہ اس خطرناک اور نازک وقت میں بھی نہایت مطمئن تھا۔ بلکہ خدا کا شکر کر رہا تھا کہ اس طرح منق و نقص میں تیز ہو گئی، جو لوگ اپنی بے عقلی کے باعث راجہ کی اس حرکت کو دشمن کی فتح خیال کر کے اس سے جا ملے ہیں، وہ جلد اپنے کفر کو ادا کر دیں گے۔ باوجودیکہ آدھا لشکر فرار ہو کر خیم سے جلا تھا، لیکن اورنگ زیب برابر اپنے کام اور لڑائی کے انتظام میں مشغول رہا، صبح کو معلوم ہوا کہ راجہ جہنم سنگھ آگے چلا گیا، بادشاہ نے اس کی کوئی پرواہ نہ کی اور ہاتھی پر سوار ہو کر لڑائی کا بندہ بست کرتا رہا۔ جہنم سنگھ کی جگہ اسلام خاں برائے راجہ کا سردار مقرر ہوا۔

ہر عقیدت سمجھتا ہے کہ راجہ جہنم سنگھ میں پر اعتقاد کر کے اورنگ زیب نے ایک بیماری فوج کا فسر نہایا تھا، اس میں کئی اور کفرانِ نعمت میں کہاں تک حق بجانب تھا، اور اس کی یہ غداری کس قدر خطرناک شرارت تھی، اور بڑا سخی، عالمگیر کی جگہ اگر کوئی دوسرا شخص ہوتا تو اس کے گرفتار اور ہلاک ہونے میں کیا کمی رہ گئی تھی، لیکن یہ عالمگیر ہی تھا کہ نفع لشکر کے فرار ہو جانے اور حالات کا رخ پھر جانے پر بھی اس کے پائے ثبات کو گرفتار نہ ہوئی اور پہاڑ کی طرح اپنی جگہ پر قائم رہا۔ حتیٰ کہ فتح و کامرانی نے اس کے قدم چٹے اور دشمن تباہ و برباد ہوا۔

صاحب سیرات خزین اس واقعہ کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

دو دن لشکر آئے سانسے پڑے تھے، گولہ اندازی اور ناکامی ہو ہی تھی، رات کے وقت شجاع نے اپنا قہقہہ خوار اور رنگ زیب پر گولہ باری کرنے کی غرض سے میدان میں بھیجا گیا تھا واپس بلایا۔ اور اپنی ساری فوج کو اکٹھا کر لیا، لشکر آگستہ ہو چکے تھے۔ مگر باقاعدہ جنگ کی ذہت نہ آئی تھی، سورج غروب ہو گیا تو عالمگیر نے حکم دیا کہ فوج کی ترتیب اور آراستگی میں فرق نہ آئے، سپاہی گھوڑوں سے اتر آئیں۔ گھسٹہ نہ اتاریں اور مسلح ہو کر لشکر کی حفاظت کرتے رہیں۔ سردارانِ سپاہ فوج کے آگے ہو جے بنا کر دشمن کی نقل و حرکت کو غور سے دیکھتے۔ یہ احکام دے کر بادشاہ ایک جھوٹے سے خیمہ میں جو لشکر گاہ میں نصب تھا چلا گیا، فوج رات بھر بڑی ہی مستعد کھڑی رہی نہ ہتھیار الگ کئے گئے نہ گھوڑوں سے زین اتارے گئے، رات کے آخری حصے میں دھنڈے لشکر میں ایک شور برپا ہوا اور زبردست ہرجان پھیل گیا۔ معلوم ہوا کہ جہنم سنگھ لشکر کو لٹا، کھسٹا، قتل و خوریزی کرتا ہوا شجاع کے پاس جا رہا ہے، یہ بہت ہی خراب وقت تھا، لشکر میں سخت برہمی اور بے چینی پھیل گئی، اور جلد انتظامات میں خلل پڑ گیا، جہنم سنگھ نے شجاع سے سازش کر کے لے کر لیا تھا کہ میں رات کو شاہی فوج پر شرب خون ماروں گا اور لوٹ مار کے بعد وہاں سے بھاگے لوگوں کا تو بادشاہ میرا قہقہہ کرے گا۔ مین اسی وقت شجاع کی فوج لشکر شاہی پر حملہ کر دے۔

چار پنج گھڑی رات باقی تھی کہ اس قرار دار کے موافق راجہ جہنم سنگھ نامور راجپوتوں اور رام سنگھ، انمور، بھیش داس اور زبردست فوج کے ساتھ تھمک ہوا، بادشاہ، امراء، اور شاہزادوں کے جس قدر کا رخاٹے اس کے راستے میں پڑے سب کو بھی طرح اس نے لٹا، جو اس کا ردوائی میں مانع آیا راجپوتوں کے ہاتھ سے قتل ہوا۔ شاہزادہ محمد سلطان کو راجہ کی اس قزاقی سے بہت زیادہ نقصان پہنچا۔ اس کو کافی خیرہ راجپوتوں کی دستبرد سے محفوظ نہیں رہا۔ بادشاہی خزانے اور کا رخاٹے بھی لوٹ سے نہ بچے، اور دولت خانہ تک تمام خیموں پر راجپوتوں نے ہاتھ صاف کیا، دیر تک اس شہدہ و غوغا کا سبب معلوم نہ ہو سکا۔ لشکر میں قیامت برپا تھی، اور عجیب قسم کا تفرقہ پڑ گیا تھا، کوئی راجپوتوں کے ساتھ مل جاتا کوئی دشمن کے پاس چلا جاتا، اور وہاں مارا جاتا، امراء جو بادشاہ کے ساتھ تھے اپنے

اور سازشوں کے لئے آزاد نہیں چھوڑا جاسکتا تھا، چنانچہ مجدد خاں کو کسی ہزار سواروں کا سرور بنا کر سعد اللہ خاں کے ہمراہ جہونٹ سنگھ کی تادیب کے لئے روانہ کیا گیا۔

ادھر رائے سنگھ راجپوت کو جو جہونٹ سنگھ کا بھتیجا تھا، راجہ کا خطاب اور منصب عطا کرنے کے بعد اس ہم میں شریک کیا گیا۔

### راجہ جہونٹ سنگھ کی سرگرمیاں

جہونٹ سنگھ آگرے کے قریب پہونچا تو اکثر کم ہمت لوگوں کے دل میں یہ خطرہ پیدا ہوا کہ وہ قلعہ کا محاصرہ کر کے شاہجہاں کو چھڑائے گا اور اسے تخت نشین کرے گا۔

ماتل خاں لکھتا ہے کہ جہونٹ سنگھ آگرے کے قریب آیا تو شہزادہ شاہجہاں سے میر انصورت معاف کرادو۔ مگر انصاف خاں نے اس کو سمجھایا اور اس افواہ کی تصدیق تک خاموش رہنے کی ہدایت کی، چنانچہ یہ سب اندیشے غلط ثابت ہوئے اور راجہ آگرے سے گزرتا ہوا، اپنے وطن کو چلا گیا۔ وہ خود بدحواس تھا اور یقین رکھتا تھا کہ اس کے تعاقب کے لئے لشکر روانہ ہو چکا ہوگا، اس لئے اپنی عاقبت اسی میں سمجھتا تھا کہ جلد مارواڑ کی حدود میں داخل ہو جائے، اور داراشکوہ کو بلا کر اس کے دامن میں بٹھا لے۔

ادھر داراشکوہ احمد آباد پہونچ چکا تھا اور جہونٹ سنگھ سے ملنے کی تدابیر کر رہا تھا، اسی اثنا میں اسے اطلاع ہوئی کہ جہونٹ سنگھ لشکر شاہی سے بھاگ گیا، پھر جہونٹ سنگھ کا خط بھی پہونچ گیا جس میں اس نے داراشکوہ کو اجیر کرنے کی دعوت دی تھی، راجہ کا خط پہونچنے پر جمادی الاول ۱۰۲۹ء میں داراشکوہ اپنی فوج اور قوت خانہ کو دروت کر کے امیر کی جانب چلا، ہر منزل پر اسے جہونٹ سنگھ کا خط ملتا تھا، وہ برابر داراشکوہ کی ہمت بڑھا رہا تھا، اور لکھ رہا تھا کہ میں امیر کے رہنے والے راجپوتوں اور راجپوتوں کو سے کراتا ہوں آپ جلد آئیے، داراشکوہ پر ان خطوط کا بہت اثر ہو رہا تھا، اور وہ تیزی سے بڑھا چلا آ رہا تھا داراشکوہ جو دھور سے تین منزل کے فاصلہ پر رہ گیا تو تربت خاں

در اور خزاں شب سانچہ غلطی خوش افزا بطور پورست و اختلال کمی در استقام افواج روئے دادہ بیدلان قابو پیشہ را پاے قرار وثبات لغزیدہ راہ فرار گشت وہ گشت و عنان استقلال و اصلبار از دست رفت، اما مخلصان غیرت مند شجاعت گیش و فائزیش پاسے ثبات و قرار افشردہ از جانہ رفتند و تزلزلے در اساس اخصاص شان را نہ یافت، سوزج واقعہ آن کہ راجہ جہونٹ سنگھ ضلالت گیش بے عار و رنگ باد جو و تعصیر آتش کہ عالمگیر نوہ لبغیات وافرہ اور اخصاص دادہ بودہ در ظہر سر بر خط بندگی نہادہ دوست خواہی می نمود بدین جہت دریں یوسکس برادار امتا و فرمودہ ہمراہی و سرداری را لغتار بخشیدہ بود چون طینت قنوت سرشت و از حمت مراد بے بہرگی داشت بغیر فتنہ پروازی از موعکہ کارزار آخر ہمیشہ فرار نمودند۔

راجہ جہونٹ سنگھ کی اس حرکت کو کسی آئین اور اصول سے بھی منافی نہیں کیا جاسکتا، اور اب کسی دانشمند انسان کو اس کی حمایت و تائید کا حق باقی نہیں رہ جاتا، یہ وہ جرم ہے کہ موجودہ قانون میں بھی اس کی کسی کم سزا قتل ہے، جن لوگوں نے وہ انعام میں تصور کا صرف ایک ہی رخ دیکھا ہے جو تعصب اور جمالت کی تاریکی میں حقیقت و عدالت کی روشنی سے محروم ہو چکا ہے، وہ ان تصریحات کو آئندہ واقعات کے ساتھ ملا کر سوچیں اور لکھیں کریں کہ اور رنگ زیب نے راجہ جہونٹ سنگھ کے ساتھ کس قدر انسانیت، شرافت اور جفا فرسی کا ثبوت دیا اور اس کے جواب میں خود راجہ جن سے تحکات نہ بلوچ کا مظاہرہ کیا، اس سے عالمگیر کے راجہ واری کا وزن بھی کریں تاکہ بزمگنوں کی گنجائش باقی نہ رہے۔

### راجہ جہونٹ سنگھ کی تادیب

راجہ جہونٹ سنگھ نے شجاع کی لڑائی میں جس ناقابت اندیشی اور بزدلانہ سازش کا ارتکاب کیا تھا، اس کا تذکرک نہایت ضروری تھا خصوصاً ایسے وقت میں کہ شجاع کی ہم پور سے طور پر سر نہ ہوتی تھی، داراشکوہ گجرات پہونچ گیا تھا، اور وہ ان فساد پر باکر ملک کا کسی طرح بھی راجہ کو مزید لبناؤ تو

نوجوان اہمیر کو بہت ترہ ہوا اور وہ ہمال کرادنگ زیب کے پاس آگیا۔ اورنگ زیب خدان امور سے آگاہ ہوا، اور داراشکوہ کے مقابلہ کو اہمیر روانہ ہو چکا تھا۔

## راجہ جے سنگھ کی سفارش

راجہ جے سنگھ، جس وقت سنگھ کا وزیر تھا، بادشاہ اس پر نہایت بہیمانہ تھا، جسے سنگھ نے بادشاہ سے جس وقت سنگھ کی سفارش کی، اور اس کے تصور کی معافی مانگی، بادشاہ نے نہایت فراموشی سے اس کی سفارش منظور کر لی، اور حکم دیا کہ جس وقت سنگھ کو معافی کے حکم کی خوش خبری سنو، وہ جے سنگھ کے پاس آئے، اور خط لکھا کہ یہ خبر سنو، بادشاہ نے فراموش کر دیا۔

اس خط کے پہنچنے ہی میں جس وقت سنگھ نے داراشکوہ کی امداد سے پہلے ہی شروع کر دی، جس وقت طے ملا کہ وہ اہمیر کے امداد سے جو دہلی سے آئے، اس کو اس کے محل آگیا، لیکن پھر واپس ہو گیا۔

داراشکوہ نے راجہ کو اس کے وعدے یاد دلانے، لیکن وہ نالگیا، اس کا بیٹا سپہ سالار بھی بلانے آیا، مگر جس وقت سنگھ نے اسے بھی کسی نہ کسی طرح واپس کر دیا۔

## خطا بخشی کا دوسرا فرمان اور صوبہ اری

عالمگیر کو داراشکوہ کے مقابلہ میں فتح ہوئی، جس وقت سنگھ کا قصور پہلے ہی معاف ہو چکا تھا، مگر وہ شرم ہے بادشاہ کو منہ دکھانا نہ چاہتا تھا، راجہ جے سنگھ کی سفارش سے بادشاہ نے دوبارہ اس کی تسلی کے لئے فرمان لکھا اور خط میں معاف کیں، احمد آباد کی صوبہ داری مرحمت فرمائی، سات ہزاری منصب بحال ہوا، اور خلعت عنایت کیا گیا۔

اس موقع پر کوئی منصف مزاج انسان بھی اورنگ زیب کی شایانہ نوازشوں کا اعتراف کے بغیر نہیں رہ سکتا۔

یہ اعتراض کہ اورنگ زیب نے جس وقت سنگھ سے دیکر یہ کام کیا تھا، نہایت غلط ہے، بنیاد اور طعنہ ہے، مگر اس کے بعد جس میں راجہ کی ذاتی شجاعت و طاقت کے علاوہ شاہی اقتدار بھی اس کی پشت پناہی کر رہا تھا، اورنگ زیب کے ڈرنے اور دہنے کا کوئی سوال ہی پیدا

نہیں ہوتا، اگر جے سنگھ بیچ میں نہ پڑتا اور راجہ جس وقت سنگھ سے وعدہ داراشکوہ کا ساتھ دیتا، اس وقت بھی وہ اہمیر کے میدان سے زیادہ بہادر نہ دکھائی دیتا، اور اس کے لڑائی کا جو انجام ہو چکا تھا وہ پہلے آپ بڑھ آئے ہیں، وہاں بھی داراشکوہ ہی کے اشارے سے جس وقت سنگھ نے معرکہ کارزار گرم کیا۔ اور اس وقت کا داراشکوہ اتنا کمزور، اور جس نے تھا، وہ راجہ کی امداد کے بغیر ہوسہ پر احمد آباد سے اہمیر نہیں آ رہا تھا، بلکہ چتر شاہی کے سایہ میں بیٹھا ہوا، دولت، سپاہ اور شاہانہ عنایت سے خود راجہ کی اعانت کر رہا تھا، اور اس امداد کا نتیجہ تھا کہ راجہ جس وقت سنگھ نے اپنی فوجی طاقت کے بغیر ہوسہ پر اورنگ زیب کا راستہ روک لیا تھا، لیکن طوفان انسانوں کی صفوں سے نہیں ٹکا کرتا، وہ زمین کے نشیب و فراز کو روندتا اور بیٹا زدن سے ٹکرا ہوا اپنی منزل مقصود پر ہی پہنچ کر دم لیا کرتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اورنگ زیب کچھ تو راجہ جے سنگھ کی مدد کے باعث اور کچھ اپنی جو پیشانی و قدر دانی کے باعث راجہ جس وقت سنگھ کے جہاد پر مدد ڈال رہا تھا، اور اسے معاف کر کے ایک راجہ جس وقت سنگھ کی حیثیت سے کام لینا چاہتا تھا، اور یہ کوئی نئی یا عجیب بات نہیں اکثر الزام بادشاہ ہونا ہے اپنی حکومت کے باغیوں کو اسی طرح معاف کیا ہے۔ تیموری سلطنت ہی میں اس کی بیٹیاں رشاہیں دستیاب ہو سکتی ہیں۔

## دکن کی مہم میں جس وقت سنگھ کی کستی

شاہ جہاں میں راجہ جس وقت سنگھ کو حکم ہوا کہ دکن پہنچ کر سیوا جی کے استقبال میں امیر الامرا کی شرکت اور ہمنوائی کرے۔

جس وقت سنگھ احمد آباد سے چل کر دکن پہنچا۔ مگر اپنی فوج کو لے کر اپنے بڑے لڑکے اطراف میں بیکار پڑا، آخر امیر الامرا کو کھمبے میں گس کر مہلوں نے مجبور کیا اور راجہ جس وقت سنگھ کو خبر نہ ہوئی، صبح کو جس وقت سنگھ امیر الامرا کا حال پوچھنے لگا تو امیر الامرا نے کہا کہ میں تو سمجھتا تھا، آپ کام آگئے، جب ہی تو یہ لذت پہنچتی۔

اس واقعہ کے بعد امیر الامرا کو مہلوں کی مہم سے بدل دیا گیا اور شاہ جہاں محمد معظم اس کی جگہ مقرر ہوا اور راجہ جس وقت سنگھ کی طرح ملک پرست رہا۔



یہ عنایت منصب و راج فرازش خواہند یافت۔

اس حکم میں کوئی ضرب، دھوکا یا مداخلت نہیں ہے۔ جمہوری خاندان کا اصول یہی ہے تھا کہ جب کوئی عہدیدار مر جاتا تھا اور اس کی اولاد کو سن ہوئی تھی تو بادشاہ اپنی نگاہی میں ان کی تعلیم، تربیت اور پرورش کا انتظام کرتا تھا۔ بہتر ہندوؤں کی طرح ان کی عزت کی جاتی تھی، جب وہ سن قریب کو پہنچ جاتے تھے تو ان کی استعداد کے موافق منصب اور عہدے ملی جا یا کرتے تھے، حکومتِ مغلیہ میں شروعات سے آخر تک اس نوع کی بہت سی مثالیں مل سکتی ہیں، مگر جو بہت سنگھ کے ساتھیوں نے حکم کا انظارِ علی نہ کیا، اور بغیر پروانہ یا مہاری حاصل کے کابل سے چل دئے۔ دریائے انک پر امیر بھگت نے پروانہ یا مہاری نہ ہونے کی وجہ سے روکا تو اس سے لڑے، اور نہ برکستی دیا کہ عیور کر لیا۔ وطن جانے کے لئے انھیں لازمی طور پر دہلی سے گزرنے، چنانچہ دہلی آئے تو عالمگیر نے ان کی شوریہ مہری کے پیش نظر ان کی قیام گاہ پر پہنچو لگا دیا، کچھ دنوں کے بعد درگاہ اس اور چند سواروں نے وطن جانے کی اجازت مانگی، بادشاہ نے ان کی درخواست منظور کر لی۔ انھوں نے یہ فریب کیا کہ راجہ جو بہت سنگھ کے لڑکوں کو غلاموں کے لڑکوں کا لباس پہنا یا اور غلام زادوں کو راجہ کے بیٹوں کے کپڑے پہنائے، رانی کو بھی مردانہ لباس میں لباس کیا، اور اس کی جگہ لونڈی کو زیور و فرہ سے آراستہ کر کے چھوڑ دیا، اس طرح جو بہت سنگھ کی رانی اور بیٹیوں کو لے کر چلے۔ خیمہ میں، بنا و راجہ جو توں کو بٹھا کہ ہدایت کردی کہ جانے کے بعد راجہ کھل جائے، قریبی لڑکوں اور رانیوں کی حفاظت میں اتنی سی کرنا کہ پانچ چھ گھنٹہ تک کسی کو ہماری تلاش کا خیال پیدا نہ ہو، دو تین پہرے بعد بادشاہ کو اطلاع ہوئی تو اس نے کو قوال سے پوچھا، کو قوال نے جواب دیا یہ خبر غلط ہے، بیٹے اور رانیوں خیمہ میں موجود ہیں۔ بادشاہ نے راجہ جو توں کے تعاقب میں آدمی بھیجے، اور خیمہ والے بچوں اور رانیوں کو قلعہ میں طلب کیا۔ راجہ جو توں نے کہا ہم رانیوں اور لڑکوں کو بہنیں دیں گے چاہے ہماری جان جاتی رہے۔ عالمگیر نے اس گستاخی اور نافرمانی کی بنا دے کہ جو بھبی، راجہ جو توں نے مقابلہ کیا۔ لیکن شاہی آدمیوں کے سامنے نہ ٹھہرے، اور بھاگ گئے اس میں اتنی دیر لگی کہ رانی اور بچے آسانی سے نکل گئے اور پھر زندہ و سلامت جو دھور پور پہنچ گئے۔

مہارانا اودے پور نے ان کی طرف داری کی، عالمگیر نے اس کے نام فرمان بھیجا کہ باغیوں کی حمایت نہ کی جائے اور جو بہت سنگھ کے بچوں کو ہا سے پاس بھیج دیا جائے۔ لیکن رانا پر اس فرمان کا اثر نہ ہوا، مجبوراً فوج کشی کی گئی اور رانا کو ملیں کر کے اس سے جدا کیا کہ جو بہت سنگھ کے بچوں کی مدد نہ کرے گا۔ مگر وہ اس عہد سے بھر گیا۔

رانا اودے پور کی جھڑپ کے بعد بادشاہ خود وجہ نشہ میں رانا کی گوشائی کے لئے اجمیر روانہ ہوا۔ اور شاہزادہ محمد غلام کو دکن سے منظم کو بنگالہ سے لانے کے احکام نافذ کئے۔

اجمیر پہنچ کر بادشاہ نے شاہزادہ محمد اکبر کو رانا کی مہر پر بھیجا، وہ جو بہت سنگھ کے بال بچوں کو لے کر پہاڑوں میں جا چھا، عالمگیر نے اپنے غمگین بیٹوں کو رانا اور دوسرے راجہ جو توں کی تادیب کے لئے مقرر کر کے سب کے ذرائع تقسیم کر دیے، رانا کی اعانت کے لئے پچیس ہزار راجہ جو دھور کے جمع ہو گئے اور شاہی لشکر پر حملے کرنے لگے۔ رسد بھی ان کی دستبرد سے تباہ ہو جاتی تھی، لیکن جلد شاہی فوج نے ان کو مغرب کر لیا۔

رانا لشکر شاہی سے ٹکرانے کی تاب نہ رکھا، اس نے تنگ آ کر شاہزادہ محمد منظم سے درخواست کی کہ بادشاہ سے معافی ملا دے۔ شاہزادے کی والدہ لالہ بانی نے اُسے ہدایت کردی کہ راجہ جو توں کی ان باتوں پر ہرگز متوجہ نہ ہو، بلکہ رانا کے دکھار کو اپنے پاس بھی نہ آنے دے۔ یہاں سے یوں ہو کر رانا نے شاہزادہ اکبر کو پھانسی کی تدبیریں کیں، درگاہ اس بہت چالاک اور چرب زبان تھا۔ اُس نے اکبر کو یہ فریب دیا کہ جاہیں ہزار راجہ جو آپ کی اطاعت کے لئے اور شہزادہ خزانہ خرچ کے لئے موجود ہیں۔ آپ انہی بادشاہ کا اعلان کر دیجیے۔ اکبر فوجان اور ناخبرہ کار شاہزادہ تھا، راجہ جو توں کی باتوں میں آ کر باپ سے باغی ہو گیا۔ محمد منظم نے باپ کو اطلاع کی کہ اکبر سے بغاوت کا اندیشہ ہے، لیکن اورنگ زیب کو یقین نہ ہوا۔ سمجھا کہ شاہزادے نے اکبر پر بہتان باندھا ہے، لیکن درگاہ اس میں ہزار راجہ جو سواروں کی حمایت لے کر اکبر سے چلا۔ اکبر نے اورنگ شاہی پر بیٹھ کر جاری کر دیا، اور اپنی فوج کے امراء کو منصب و خطابات عطا کئے، ان کاموں سے فارغ ہو کر باپ سے ملنے کو چلا۔

بادشاہ کی ساری فوج راجہ جو توں کے مقابلہ میں اکبر کے ساتھ تھی یا شاہ





بیان، دوسرے ناروا اور سخت الفاظ کا استعمال، قومی عدالت میں انسانہ نگار کے یہ دلائل بڑا کم حقیتاً سخت مزاحمت تھے ہیں، میں اگر اس کا جواب دیتا تو یہ دشمنوں تاریخی حقائق کا مرقع نہ ہوتا، بلکہ تلخ کامیوں کا مجموعہ ہر جہتاً جو مجھے گوارا نہ تھا، کیونکہ میں نے میرے تاریخ بیان کرنے کی غرض سے قلم اٹھایا تھا، دست نامزدی اور بربستی کی گندگی اچھاں میرا مدعا تھا، میں ہندو مسلم اتحاد کی دل سے قدر کرتا ہوں اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ میرے پیدا کئے ہوئے لٹریچر میں ایک حرف بھی اس دعوے کے خلاف مل سکتا ہے، میرا اعتقاد ہے کہ ہندوستان کی نجات ہندو مسلم اتحاد میں مضمر ہے حقیقتاً بھی جذبہ ہے جس نے مجھے اس عنوان کے لکھنے پر آمادہ کیا۔ تاکہ اصل حقیقت کا انکشاف ہو جائے۔ اور تاریخ کی وہ غیر مستند مگر دل فریب روایات جو کسی خاص حکمت عملی کے پیش نظر وضع کی گئی ہیں، قابل التفات نہ رہیں، اور آئندہ یہ سنگریزے اتحاد و محبت کے سمندر میں "نفاق و شقاق" کی لہریں پیدا نہ کر سکیں۔

## مقالات زیر

وہ بھول صرف قبروں ہی پر چڑھانے کے واسطے ہیں جو تاریخی حقائق کو کھنڈروں میں پیدا ہوتے ہیں۔

یہ کتاب ہر جہاں توڑ پھاڑے یہ نہ پوچھو کون روتا ہے؟ یہ دیکھو کوئی "انسان" روتا ہے۔

دن کی آہستہ آہستہ دہے پاؤں گزر رہی ہے اور ہم شور انگیز دلوں اور طویل امیدوں کے شکار ہیں۔

نیک آدمیوں کے مرتے ہی برائیاں زور پکڑ جاتی ہیں، آفتاب ڈوبنے لگتا ہے تو سارے دراز ہو جاتا ہے۔

علوم کے سمندر میں ہم گمراہ رہتے ہیں، اور روز بروز ذہانت کے تازہ جزیرے دریافت کرتے جا رہے ہیں۔

ہر شخص کی طوٹ سے نیک لگان رکھنا ایک اعلیٰ مگر سمیت جلد تباہ کر دینے والی صفت ہے۔

(مقالات ذہنی از جوش)

رہا صاحب انسانہ کا یہ ادعا کہ "کابل کے ناقابل ترمیم قلعہ پر راجپوتوں کا کیمیر جیٹا لہرانے لگا، فتح و نصرت نے میرا لکے لنگھوں کے کابل کی سر بلند اور سرکش پہاڑیوں پر پاؤں چوم لے شکست خوردہ ہندوؤں نے سہارت کے بانی ناز سہوت در کے محبوب اتار، راجپوت روایات کے بہترین مخالف جو سنسکرت کے روبرو ہتھیار ڈال دیے۔"

اس کے متعلق صرف اتنا لکھ دینا کافی ہے کہ جو سنسکرت کابل کے صوبہ کا معاون اور مددگار تھا اور آغزاں کے ساتھ دودھاری کے لئے تین ہوا تھا، انھان کی ہم آغزاں کی مردانہ یورشوں سے ملے ہوئی، آغزاں کی شکست اور شیرازی کا آغزاں کے دلوں پر ایسا سنگین تھا کہ آغزاں کے بچے روتے تو انھیں آغزاں کے نام سے ڈرایا جاتا تھا، اس میں شک نہیں کہ راجپوت اور مندروں کا شکر سبھی اس کے برابر تھا، لیکن انسانستان میں جو کچھ ہوا تھا وہ سب آغزاں کی جو ازمدی اور اس کے حقیقی معانی سنگریزی و روی خاں کے دم سے ہو رہا تھا، آغزاں نے کابل سے ستھروں کے ستر و سوسر اور بشپار قیدی باؤٹا کے پاس بھیجے۔ بادشاہ نے اس کا رگڑاڑی کے صلے میں اس کو چار ہزاری منصب عطا کیا۔

انسان نگار نے اورنگ زیب کے لئے جو دل آزار اور خلاف حقیقت الفاظ استعمال کئے ہیں، ان کے لئے میں انھیں قابل معافی سمجھتا ہوں، ذہنیت مسکوم اور دماغ ماؤت ہو جاتا ہے تو زبان اور قلم پر بھی اس کا اثر پڑتا ہے، البتہ ان کی تاریخی غلط بیانیوں کا پل کوٹا ضروری تھا، اور میں نے اپنی ذات میں شرارت، انگیز، اور حقارت آمیز الفاظ سے بچتے ہوئے اپنا یہ فرض انجام دیا یا لیکن ہے بعض الفاظ مثلاً غدار، سازش، بغاوت وغیرہ سے کوئی صاحب تعلیم محسوس کرے لیکن اول تو معنی اور منہجوں کے لحاظ سے کسی موقع پر بھی ان کا غلط استعمال نہیں کیا گیا اور جہاں ان کو لکھا گیا ہے محض اس مجبوری سے کہ اپنے معنی کو ظاہر کرنے کی غرض سے ان الفاظ سے اجتناب ممکن نہ تھا، بادشاہ سے روگردانی کرنے والے اور محسن کش کے عادی شخص کا تذکرہ کرتے وقت کوئی معصوم نگار لکھتا ہی گریز کرے لیکن ان الفاظ سے نہیں بچ سکتا، حالانکہ انسان نگار نے ایک نقطہ داستان، اور دل آزار انسانہ لکھتے وقت بہت زیادہ سخت انداز گفتگو اختیار کیا ہے، اور اس پر پورا وہ ایک وقت و محلہ غلطی کا مرکب ہو گیا ہے۔ ایک غلط اور بدگمانی پھیلانے والے جھوٹے واقعات کا

# پاسبانِ شبابِ طفلی

کل شہرے باہر پہ گلگشت گئے ہم اک حُسن کا گلزار بھی تھا ساتھ ہمارے  
 کچھ پھول تھے کچھ غنچے تھے، نورستہ وزنگیں کچھ برگ و گیا ساتھ میں پھولوں کے ہمارے  
 بنے قید مناظر وہ فراغت کی ہوائیں بیروں کے وہ باغیچے، وہ کھیتوں کے نظارے  
 گیہوں کے ہرے کھیتوں میں پھولی ہوئی سرسوں اس طرح نہ چھٹے کبھی افلاک پہ تارے  
 گو، پردے کی پابند نہ تھیں پھر بھی وہ حوریں کچھ دیر ذرا دور رہیں شرم کے مارے  
 دوڑی کوئی پھسی کوئی جھکی کوئی سنبھلی دل تنگ و شکستہ سے وہ کھیتوں کے کنارے  
 مرغانِ حرم، نیند سے جاگے ہوئے فستے جس طرح بہرں دشت میں بھرتے ہوں طرارے  
 بکھرے ہوئے گیسو، وہ لچکتی ہوئی کمریں اڑتے ہوئے ڈھلتے ہوئے ساری کے کنارے  
 پیڑوں میں چھپیں اور کبھی میدان میں آئیں نکلائے ڈوبائے وہ چاند ستارے

جو کافر و غریزہ زہتی اس جمعِ حسیں میں صد شکر وہی سمجھی مرے دل کے اشائے

آزاد و گرفتار و حیا پیشہ و بیباک  
 وہ نازک و نرم آنکھ وہ نشتر سی نگاہیں  
 آنکھوں میں حیا دل میں محبت کے شرارے  
 وہ پھول سے رخسار دیکھتے ہوئے تارے  
 کچھ دیکھ کے شرمائی بھی شرمائے بھی دیکھا  
 متی رہیں نظریں کبھی ترچھی کبھی سیدھی  
 بٹے رہے مٹتے رہے الفت کے نظارے  
 چلتے رہے دل پر کبھی نشتر کبھی آ رہے  
 آنکھوں میں وہ طوفان کبھی رندی کبھی تقویٰ  
 بکھرائے کبھی اور کبھی بال سنوارے  
 بے ہاتھ اٹھائے ہوئے انگڑائی کا عالم  
 طوفان کی وہ موج جو پہنچی نہ کنا رہے  
 اک چھوٹی بہن ساتھ میں وہ حسن کا دربار  
 نیاری سے جس شوخ کی دربان بھی ہمارے  
 حامل کہیں پر دے کی طرح اور کہیں حیراں  
 منظر کئے دیتے تھے اُسے میرے نظارے  
 تنبیہ کی جرات بھی نگاہوں میں جھجک بھی  
 غصہ بھی وہ معصوم وہ اندازِ پیارے  
 آخر کو وہ گھرے ہی گئی ساتھ بہن کو  
 جیتی وہی اس بازی کو ہم جیت کے ہمارے  
 آنے دے جوانی کوئی دن اور ہٹسرجا  
 الفت ہی پہ تو اپنا دل و جان نہوارے  
 کیا کام فقیروں سے تمہیں جاؤ سدھارو  
 ہو جائیں گے اپنے بھی کسی طرح گزارے  
 اپنے ہی سے اب خلوت دل کیجئے روشن

یہ جلوے یہ عالم تو ہیں مغرب کے تارے

# گُنبد یا گُنبد؟

ڈاکٹر عنید شادانی۔ ایم۔ اے۔ پی ایچ۔ ڈی لندن  
پروفیسر ڈھاکہ یونیورسٹی

مجھے اپنے اس سماعی علم پر پورا اعتماد تھا۔ میری خواہش پر وہ مولوی صاحب  
اُسی وقت تھار کا پرانا فانی لائبریری سے اٹھائے۔ دسمبر ۱۹۳۷ء کے تھار میں یہ  
عبارت درج تھی۔

”جس (شیخ آبادی) نے ایک نظم خاقون ہندی کے عنوان سے لکھی  
تھی جس کا پہلا شعر یہ ہے۔“

”میں اے خاقون ہندی انجمن سے کیا تجھے نسبت  
کر دیا ہے تجھے تو غلوست افلاق کی مسند  
اسی نظم کا دوسرا شعر ہے۔“

قریٰ رعنیوں پر حق نہیں بزمِ شہباز کا  
ترے عشقوں کا مرکز ہے حب و شرم کا گُنبد  
لفظ گُنبد کو گُنبد کا جو قافیہ استعمال کیا گیا ہے، دراصل ایک صحیح  
تلفظ اس کا گُنبد (یعنی با) ہے۔

نیا دھاب کی اس تحقیق کا ماخذ کیا ہے جس معلوم نہیں، اس لے اس کے  
مسند اور غیر مسند ہونے کے متعلق ہم کوئی رائے نہیں دے سکتے۔ البتہ اس  
لفظ کے صحیح اعراب دریافت کرنے کی تین صورتیں ہیں۔

اولیٰ یہ کہ فضلاے ایران کس طرح بولتے ہیں؟

دوسرے یہ کہ مسند لغات میں اس لفظ کے اعراب کیا بیان کئے گئے ہیں

چند روز پہلے، میں ایم اے کلاس کے طلبہ کو شاہ نامہ پڑھا رہا تھا۔  
افراسیاب و سیاوش کی داستان میں جب اس شعر پر پہنچا کہ۔  
پہر گوش گنبدی ساختہ  
سرش را با بر اندر افراختہ

تو ایک معلوم جو مدرسہ عالیہ کلکتہ کے فارغ التحصیل مولوی ہیں، کسی قدر متعجب  
سے میری طوط دیکھنے لگے اور خواہش مند ہوئے کہ میں اس شعر کو کمر پڑھ دوں۔  
میں نے پڑھا۔ اُن کے چہرہ سے عدم اطمینان کے آثار ظاہر تھے۔ میں نے  
سمجھ لیا کہ اس شعر کے پڑھنے میں اُن کے خیال کے مطابق غزور مجبور سے کوئی  
غلطی ہوئی ہے، وہ اپنا خیال ظاہر کرنا چاہتے تھے، مگر میرے احترام کا لحاظ رکھ  
تھا، آخر میں نے ہراسہ پڑھا تو انھوں نے بتایا کہ آپ نے گُنبد پڑھا حالانکہ  
یہ لفظ گُنبد ہے۔ میں نے دریافت کیا کہ آپ کو کیونکر تحقیق ہوا۔ انھوں نے  
جواب دیا کہ مولانا یزدنجوری نے تھار کے ایک معزز میں اس لفظ کے اعراب  
بیان کئے ہیں اور گُنبد کو (گُنبد با) غلط اور گُنبد کو (گُنبد با) صحیح قرار دیا ہے۔

گُنبد کے پڑھنے کے اعراب سن سکر مجھے اس سے زیادہ تعجب ہوا جتنا انھیں  
میری زبان سے گُنبد سن سکر ہوا تھا۔ مجھے کسی طرح یقین نہ آتا تھا کہ تیار دہشت  
نے گُنبد لکھا ہو گا اور گُنبد کو غلط بتایا ہو گا۔ اس لے کہ صرف علمائے ہند  
ہی کو نہیں بلکہ فضلاے ایران کو بھی میں نے گُنبد ہی بولتے سنا ہے۔ بہرحال

تیسرے یہ کہ رسم الفوت اساتذہ کے کلام میں یہ لفظ کس طرح استعمال ہوا ہے۔

پہلی صورت غالباً تیار صاحب کے نزدیک قابل قبول نہ ہوگی۔ وہ کہہ سکتے ہیں کہ جس طرح انجی آکھتے رمضان کا چاند دیکھتے بغیر روزہ رکھنا ہم پر واجب نہیں ہوتا، اسی طرح کسی ایرانی فاضل کا قول جو بطریق دعایت کسی کی ذہانی ہر تک پہنچے، کسی لفظ کی لغوی تحقیق کے بارے میں ہمارے لئے فحش نہیں ہو سکتا۔ اس کے علاوہ یہ بھی ممکن ہے کہ خط ایران میں یہی یہ لفظ غلط اعراب کے ساتھ مروج ہو گیا ہو۔

لہذا جہاں یہ لکنا کہ ہم نے ایران میں متعدد دفعتاً کی زبان سے گنبد ہی نہ ہے، چنداں اہمیت نہیں رکھتا۔ البتہ لغت اور کلام اساتذہ کی سند اگر پیش کی جاسکے تو تیار صاحب کو بھی اس کے قبول کرنے کے سوا چارہ نہ ہو گا۔ آئیے پہلے لغات ہی کو اس جن لغات سے لفظ گنبد کے اعراب کی تحقیق میں مدد مل سکتی ہے، وہ پانچ قسم کے ہیں۔

(۱) فارسی کے وہ لغات جو اہل ہند نے مرتب کئے۔

(۲) فارسی کے وہ لغات جو ایران میں لکھے گئے۔

(۳) فارسی کے وہ لغات جو اہل فرنگ کی تالیف ہیں۔

(۴) دوسری زبانوں کے وہ لغات جن میں ان زبانوں کے الفاظ کے

معنی فارسی میں بیان کئے گئے ہیں، اور روئے رسم الخط میں تحریر ہیں۔

(۵) اردو زبان کے لغات (۱) اہل ہند کے لکھے ہوئے۔ (ب) اہل فرنگ کے مرتب کئے ہوئے۔

اب ہم پانچوں قسم کے مستند و معتبر لغات سے لفظ گنبد کے اعراب پیش کرتے ہیں۔

فرنگ چنگیزی۔ گنبد و گنبدہ۔ باول معزم ثانی زوہ و بائی مفتوح۔

مہان قاطع۔ گنبد۔ معزم اول و فتح بائی اجبد و سکون ثانی و

والی بے لفظ

نیار عجم۔ گنبد۔ باعزم۔ (صاحب بیار عجم نے لغات کے اقرا

بیان کرنے کا یہ قاعدہ اختیار کیا ہے کہ حرف ثانی

مفتوح ہو تو اس کا ذکر نہیں کرتے مثلاً فتوحہ۔ بالغتہ

صرف ضمین کی حرکت ثانی اور ز۔ چونکہ مفتوح

ہے اس کا ذکر نہ کیا، لیکن غفلت (بعض ہر دو ضمین)

میں چونکہ حرف ثانی مفتوح ہے، اس لئے اس کا

ذکر بھی کر دیا۔ گنبد کی ب۔ چونکہ مفتوح ہے

اس لئے اس کا ذکر نہیں کیا

گنبد (نیلوزی)۔ بعض اول و سکون لون و فسح

معدہ تختانی

شش لغات۔ گنبد۔ باول معزم ثانی زوہ و بائی مفتوح

فرنگ آندراج۔ گنبد و گنبدہ۔ بعض اول و فتح بائی معدہ و سکون

ثانی و والی بے لفظ

برہان جامع۔ (تالیف عبد فریح علی شاہ قاجار) گنبد و گنبدہ۔

بعض اول و فتح ثالث

فرنگ ابیار۔ (چند سال قبل تیرہ میں چھپی ہے) گنبد چو دختر

فرنگ کاتوزیان۔ (چند سال قبل لہران میں چھپی ہے) گنبد

Persian-English Dictionary by Steinguss.

Gumbad - گنبد

Lexicon Persico-Latinum by Vullers.

گنبد B. S.

Dictionnaire Persen-Francais by Desmoussins.

گنبد. Gounbed.

Dictionary English-Persian by Palmer:-

Dome = Gumbad (Gumbaz) گنبد

Dictionary English-Persian by Phillot:-

Dome = Gumbad or Gumbaz

Dictionary Hindustani-English by Forbes:-

Gumbad, Gumbaz گنبد گنبد

Dictionary Hindustani-English by Fallon:-

Gumbad, Gumbaz = گنبد

نورالغات۔ گنبد. (ف) صحیح ذال سے ہے۔ ذال سے غلط ہے۔

لفظ گنبد

سے پہلا حرف متحرک ہو تو آخری حرف کو ذال پڑھنا چاہیے جیسے گنبد، کبریا،  
”ب“ متحرک ہے۔ البتہ اگر ذال سے پہلا حرف ساکن ہونے کے ساتھ ساتھ  
حرف علت بھی ہے (یعنی الفت۔ وا۔ ی۔ میں سے کوئی حرف ہے) تو اس  
صورت میں بھی ذال کو ذال ہی پڑھنا چاہیے، مثلاً استاذ (استاد)  
خود (خود) وغیرہ۔

خواجہ محمود ابن مبین نے اس قاعدہ کو ایک قطعہ میں بیان کیا ہے:  
قطعہ۔

در زبان فارسی فرتے میان دال و ذال یا دیگر زن کو این نزو افاضل میم است  
پیش از دو در نلف مغزو اگر میج و ساکن است دال خوان آن را و ہائی مجذول ہم است  
بعض کتا ہوں میں ابن مبین کا قطعہ اس طرح منقول ہے۔  
ہر گاہ دال، ذال، کہ در مغزو یافت ذال الفاظ پارسی بشود انکہ میم است  
حرف میج ساکن اگر پیش از دو بود دال است ہر جہت خبری، ذال ہم است  
ابن مبین کے علاوہ دوسرے اساتذہ بھی اس قاعدہ کو نظم کیا ہے جو معنی  
طوسی کہتے ہیں۔

اناکہ بقاری سخن می رانند در مغزو دال، ذال را بنشانند  
تا قبل وی اسراکن جزو دای بود دال است و اگر نہ ذال میم خوانند  
تہیہ فرمایا ہے اس معنیوں کو عربی میں بیان کیا ہے۔

احفظوا الفرق بین دال و ذال  
فہو سرکت بالفاء رسیۃ مغظم  
کل ما قبل سکون بلا (دای)  
فہو دال و غیر ذال متجسم  
شباب الدین احمد حکمرانی نے ایک قطعہ میں سب سے زیادہ وضاحت  
کے ساتھ اس اصول کو نظم کیا ہے۔

ہر کجا تا قبل وی جزو علت ساکن است  
بجم دو گرد و سرد و برد، آن را دال خوان  
ہر کجا تا قبل وی ساکن بحرف علت است  
بجو بازوید و بود و با ذہ آن را ذال خوان  
حکیم آذری کی ایک رباعی بھی اس قاعدہ پر دلالت کرتی ہے۔  
دست بجات میر میرینا جنود از جو تو بر جهان، جہاں انسرود

یہ اور ان کے علاوہ لغت کی جتنی کتابیں ہماری نظر سے گزری ہیں،  
سب میں گنبد کی ”ب“ کو مغزو ہی لکھا ہے۔ لہذا کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی  
کہ اتنی کثیر مستند شہادتوں کی موجودگی میں گنبد کو صرف اس لئے غلط مان لیا  
جائے کہ جو حرف صاحب نے (جن کا کلام، خدا کے کلام کی طرح اسقام سے  
پاک نہیں) اسے گنبد لکھا ہے، اور نہ گنبد کو اس لئے صحیح مانا جاسکتا ہے  
کہ صرف نیاز صاحب کے نزدیک اس کا صحیح تلفظ گنبد ہے۔

شعرا نے ایران کے کلام میں یہ لفظ بار بار استعمال ہوا ہے لیکن ایسے  
متعدد اشعار تلاش کرنے کے لئے جن میں یہ لفظ بطور قافیہ واقع ہوا ہو،  
وقت اور محنت کی ضرورت ہے۔ لیکن اس زحمت کا کوئی خاص فائدہ نہیں  
کیونکہ لغت کی تمام مستند کتابوں میں اس کا تلفظ بصر احوت مذکور ہے۔ بہر حال  
اتحاد محبت کے لئے ہم صرف ایک مثال پر اکتفا کرتے ہیں اور وہ ایک  
ای مشال ایسی ہے کہ اس کے بعد کبھی دوسری سندی کی ضرورت باقی  
نہیں رہتی، سعدی علیہ الرحمۃ کا یہ شعر قافیہ نیاز صاحب نے بھی ضرور  
سننا ہو گا۔

پرتو نیلک نہ گمرو ہر کہ بنیادش بد است  
تر بیت ناہل را چون گرد گاہاں برگنبد است  
نیاز صاحب کی صنعت مزاجی سے مجھے امید ہے کہ جس طرح انھوں  
نے میرے بتلانے پر جوش کی ”پیر شکار“ والی ترکیب کو صحیح تسلیم کر کے  
علی الاعلان اپنی غلطی کا اعتراف کر لیا تھا، اُن سطور کے ملاحظہ فرمانے  
کے بعد ابھی اس مجبوری سے لغزین کو سہی مان لیں گے، اور اولین فرصت  
میں اعلان کر دیں گے کہ غلطی میری تھی جوش کی نہ سہی، تاکہ جو لوگ ان کی  
جتنی تحریروں سے غلطی میں مبتلا ہو گئے ہیں وہ راہِ راست پر آجائیں۔

اس امر کے متعلق تو اب کوئی شبہ باقی نہیں رہا کہ گنبد کی ”ب“ غلطی  
ہے۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ لغت کی مختلف کتابوں میں اس لفظ  
کی دو شکلیں یعنی گنبد اور گنبد کیوں پائی جاتی ہیں؟ اس دال (بہمل) اور  
ذال (جہمل) کے فرق کو سمجھنے کے لئے پہلے فارسی زبان کے ایک اصول کا  
جاننا ضروری ہے۔ اساتذہ فن نے یہ قاعدہ بیان کیا ہے کہ فارسی زبان  
کے مغزو الفاظ جو ”دال“ پر تمام ہوتے ہیں ان میں اگر ”دال“ سے پہلا حرف  
ساکن ہے۔ لہذا آخری حرف کو ذال پڑھنا چاہیے۔ اس کے عکس اگر ذال

ساتھ لکھے اور پڑھتے جاتے ہیں۔ ذال کے ساتھ لکھے ہوئے ہیں گے، بات یہ ہے کہ آج سے چند سو سال قبل تک اس اصول کی پابندی کی جاتی تھی۔ مگر تاجزین نے اس قاعدہ کو ترک کر دیا۔ لہذا صرف چند مخصوص الفاظ کے سوا تمام الفاظ ذال ہی سے لکھے اور پڑھتے جاتے گئے۔

خاتمہ پر اس قدر اور عرض کر دینا مناسب ہے کہ پرشین فلاوچی (علم الانسان فارسی) کے ماہرین کے نزدیک یہ لفظ (گنبد) فارسی میں آرامی زبان سے لیا گیا ہے، اور یہودی میں اُس کی شکل تحریری "گبت" (بدن) حرکت گات ویم ولفیچ (با) پائی گئی ہے۔

کس چون تو سخی نہ ہست دنی خرابد بود گو قافیہ ذال شوزہی عالم جود افزود کے ساتھ قافیہ جود ہونا چاہئے تھا، لیکن شاعر کہتے ہیں کہ ذال کے بجائے اگر ذال قافیہ ہو گیا (یعنی جود) تو کچھ مضائقہ نہیں۔ جود (جو دینی) سخاوت کا مرتبہ بہر حال بہت عالی ہے۔

بعض علماء کا خیال ہے کہ زبان کے اکثر قاعدوں کی طرح یہ قاعدہ بھی نکتہ نہیں بلکہ اکثریہ ہے۔ بہر حال اس سے ظاہر ہے کہ گنبد کی "ب" چونکہ حرکت ہے اور حرف جمع ہے، حرف غلت نہیں۔ لہذا آخری حرف کو ذال نہیں بلکہ ذال پڑھنا چاہیے۔ اور اس اصول کی رو سے گنبد ہی صحیح ہے، فارسی کی پرانی قصبی کتابوں میں آپ کو مکتب سے ایسے الفاظ جو آج کل ذال کے

## دوشیزہ جہنا

وہ آبشارِ جہنا وہ دلفریبِ منظر  
خاموش وہ فضا میں بہتا ہوا وہ پانی  
دوشیزہ اک کن رے تفریح کر رہی تھی  
وہ حسن کی شعاعیں دُروں کا جگمگانا  
گو یا چراغِ الفت پانی میں جل رہے تھے  
انگڑائی لے رہا تھا سرور ہو کے پانی  
زخماں پر ہوا سے بل کا رہی تھیں زلفیں  
وہ زیر لب بسم وہ بھولی بالی باتیں  
بڑھ بڑھ کے آب دریا قدموں کو چومتا تھا  
پتھر اٹھا اٹھا کر پانی پہ مارتی تھی  
امید دوتی تھی ارمان بہہ رہے تھے

دھیمپوں میں بھینس کر تو قید ہو رہا ہے  
محسن مجھے خبر ہے دل صید ہو رہا ہے

جولہ ۱۹۷۷ء میں شائع ہوا۔  
 علامہ اقبال کی زبان میں اقبال گو کیا۔ اپنے ہی پسند کے ہوئے میدان میں  
 بار گئے؟ ———— وھذا یوم الفرقان! یوم التقی الجمعان!  
 اور ہمارا خیال ہے کہ اب حضرت اقبال کی یہ موضوع بحث شرفیابی بھی  
 اپنی خاصی طرازی سے کچھ پیرشتر مستد رہیں گئی۔ شاید ان کا یہ شعر مؤثر (افغان  
 بیان) ان کے قابل قلعے کی زبوں انجلی کی طرت نچ کرتے ہوئے، زبان حال سے  
 کہہ رہا ہے کہ کج  
 تو بردن باچہ کردی کہ درون مایابی؟!  
 (۳)

## قوم اور ملت

حضرت اقبال اپنے بیان کے افتخار ہی میں تیر کرتے ہیں کہ اپنے موصوف  
 مصرعے میں میں نے لفظ ملت، قوم کے معنوں میں استعمال کیا ہے۔ اور معن  
 بیدار اقوام فرماتے ہیں کہ اس میں کچھ شک نہیں کہ عربی میں یہ لفظ اور  
 بالخصوص قرآن مجید میں، شرع اور دین کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔  
 سوال یہ ہے کہ لفظ قنار ذہنیہ کے لغوی معنی، اور دین قرآن مجید کے مطلق  
 سے دیدہ و دانستہ اخراج کرنے کی کونسی وجہ موجود اقبال کے پاس تھی؟  
 کیا یہ ”دلیرانہ تحریف“ اس نے لے اختیار کی گئی کہ اس جیسے سے حضرت مدنی

## اسلام اور وطن!

ڈاکٹر اقبال نے مولینا حسین احمد مدنی کے جہاک بیان شانہ اخبار  
 (در بارہ بحث وطنیت و قومیت) پر اپنا بھی ایک بیان شائع کیا ہے، یہ امر  
 معنی خیز ہے کہ علامہ اقبال نے جناب اقبال اہل کے قطعہ (جواب ابتدائی  
 قطعہ اقبال متعلق مولینا نے مدنی) کا کوئی منظوم جواب انجواب دینے سے  
 گزر دیا! محاذ کی یہ تبدیلی اولین اعتراض نکلت ہے! مولینا حسین احمد صاحب  
 کے معانی میں یہ تاریخ کا ایک خوشگوار امانہ ہے! ظہور دعوت اسلام  
 کے زمانے کا ذکر ہے کہ ایک معاہدہ اسلام جاہلی شاعر اس مبارزت کے  
 ساتھ حضرت داعی اسلام کے سامنے آیا کہ میں آپ کے شاعر سے زبان  
 آوری میں مقابلہ کرنا چاہتا ہوں، اور اپنی فتح و شکست کو فظہور پیام  
 اسلام کی حقانیت یا کفالت کا معیار تسلیم کرنے کو تیار ہوں! اس باخبر  
 چیمہ کردن، کی جو سزا اس مدعی شاعری و ساجری و جردی پیغمبری کو  
 انگیز کر لی پڑی وہ حق یعنی تاریخ کی عدالت کے محافظ خانے میں محفوظ  
 ہے! مدینۃ النبی کے اس مخمور حملہ آور کے حوصلہ مند ڈرامے کا آخری  
 باپ خزانہ یہ ہے کہ بقول اسی مبارک زرخ کی سرپرست ہماری جماعت کے  
 ”الحق کہ آپ کا شاعر ہمارے شاعر سے بڑی ہے گیا۔“ ———— اپنے  
 ہمدردانہ کی اس قدیم فتح حسین کی یہ تازہ ترین ٹکڑا۔ آل رسول مولینا  
 مدنی کو مبارک ہو! ہمارے عہد کے ادیب لبیب اور مناظر میکیز مولینا



شروع ہوتا ہے: ————— اشد اندہ!  
اس قدر دشمن ارباب دفا ہو جانا!

(۴)

علامہ اقبال کا مغالطہ و واہمہ!

ڈاکٹر اقبال کو باوجود فاضل اہل ہونے کے یہ معلوم نہیں کہ مولینا حسین احمد یاکوئی مسلمان "وطن" کو اک ہمنیت اجتماع کے خالقان کی حیثیت سے قبول نہیں کرتا، ہندوستانی وطن کا اقتضا، ہم سے انتہائی ہے کہ ہم سب اپنی سیاسی و معاشی زندگی کی بجائی و ہجرتی گمبھس کریں، اور اس کی تعلیم کے لئے ایک مشترک ادارہ نظر و سنس کے علم کے نیچے کھڑے ہو جائیں! ہم سیاسیات و معاشیات کے علاوہ اپنا کوئی اور شعبہ حیات اس وطن سرشتہ حکومت کو تفویض کرنا نہیں چاہتے: البتہ ممکن بھی نہیں، اس لئے کہ یہ ڈاکٹر کو بار بار مختلف ہندوستانی فرقوں اور ملتوں کے درمیان کروہش متبائن واقع ہوئے ہیں جن کی داشت و پرداخت کا بند و بست فریقانہ اصول پر علیحدہ علیحدہ ہی ہو سکتا ہے! اس اعتبار سے ہندوستانی قومیت کو سب کے سب کے علاوہ ہر گروہ، بیکریگ و ہمد آہنگ قومیت کے قدرے اک وفاق سیاسی سے تعبیر کرنا زیادہ موزوں ہوگا: شاید یہی وجہ ہے کہ معاہدات سیاسی و وطنیت کی جگہ ہماری زبان پر متحدہ قومیت ہند کی ترکیب جاری ہو گئی ہے! پس ہمارا ہندوستانی وطن اک "فیڈریشن" ہے! فیڈریشن کچھ بھی بدب و انجذاب کی کوئی کارگاہ نہیں ہو کرتا: بنگال اس کے وہ ثقافتی استقلال (Cultural independency) کے مختلف دشمنان کی اک صورت ہوتا ہے! ہندوستان ایسی واحد اسکن اور متحدہ اللہ الہی دنیا میں قومی سیاسی زندگی صرف عبارت ہو سکتی ہے اک آل انڈیا کانٹیننٹل فیڈرل گورنمنٹ سے، جو اس مشترک سر زمین کی کس و قد و قدر مشترک سیاسی نظریات و قومی معاشی تدبیر (dispensations) کی انچارج ہوگی، اور جس کی اس سطحی سیاست بالائی کے زیر سایہ ماطلت تمام انفرادی ثقافتی خطوں اور مذہبی فرقوں کو گواہ اک نوع کی داخلی آزادی کامل (Autonomy) نصیب ہوگی، خود وطنی تحریک کی اس وقت تک کی رفتار اسی پر رہی ہے۔ انٹرنیشنل کانگریس

دے تھے، وہی لعن و لعن اب اس طرح جاری رکھیں کہ ہندوستان کے منظم و درست آدمائے آزادی ہند و مسلم ہونٹوں کو (مثلاً) جاپان کی مردم خوار و خون آشام ڈرگین سوسائٹی کے شکیل اہل قرار دیں! ————— ہاں جو آسمان کہن سے نکل گیا: اہل زمین نے کیا ستم نو کیا کوئی! —————

ذہنرت یہ کہ ہم اس بے پناہ استدلال پر حیران ہیں، بلکہ خود جناب اقبال کی زبان بھی ہر جگہ ان کی غیر معمولی کادش کا ساتھ دینے سے ایسا کرجاتی ہے! چنانچہ زیر بحث پیرا گراف ہی میں، مولینا نے مدنی کے مرکز بحث جسے کے بعد ہی علامہ مدوح کا یہ بھی ارشاد موجود ہے کہ "محکومہ حقیقت میں بلانا کے اس ارشاد پر بھی اعتراض نہیں! ————— ہمارا عقلی یہ

بجھنے سے قاصر ہے کہ جب مولانا حسین احمد کا لے دے کے ہی ارشاد مابہ لفظ تھا اور اس سے اب حضرت اقبال کوئی تصریح کرنا بھی بچا، تو پھر اس نئی کام در کالم دراز لفظی کا قلعہ کیا معنی ہوا یا غلطی کے سنگ بنیاد پر تعبیر ہوا ہے! —————

اقبال سی اقبال سے آگاہ نہیں ہے: کچھ نہیں کھٹ نہیں و اللہ نہیں ہے! —————

تھوڑی دیر کے بعد صاحب مدوح، مولینا حسین احمد صاحب کے معمولہ انہار پر اپنے اعتراف کو بار درگشتے ہیں، وہ "اقوام و ادیان" کے درمیان کے "انالی رابطہ" کا اشتکاک کا اعتراف کرتے ہیں، پھر ازراہ ذرہ نوازی اپنی ذات خانی فی اتحاد کو "ہندی" کہلاتا بھی قبول فرماتے ہیں، ہم آغوشی وطن کو اسلام سے ہم آداری کے ہم معنی نہیں سمجھتے، اپنی جمہوریت سے محبت اور اس کی خدمت و بیداری کو کسی اک فطرت انسانی تسلیم کرتے ہیں! —————

تاہم یہ سب کچھ منظور فرمائیے کہ بعد و معاذ اللہ انشا رب روح سامعوس کرتے ہیں: چنانچہ اگر کوئی ان تمام جذبات فطرت کے شمس و استعان کی تقریب سے شخب الوطن من الایمان کی نگاہ ناگہ عقیدت بند کر دے تو وہ اس جہل و نادانی پر شمس ہو جائے ہیں! اور مٹو غلطی ہماری کی فہرست سے اک کتاب و جی کی شان سے، اس بیان کو وہ حدیث کو خارج فزادہ ہیں ان کا ارشاد ہے کہ وطن اک جہز انسانی اصطلاح "ہونا چاہیے، اوریں! اگر کوئی فرزند سر زمین اپنے وطن مالت سے اس شائبہ تعین تعلق سے زیادہ غلط کار کھنہ ہے جتنا کہ اک مسافر مسافر ہے، تو معاذ اللہ اسلام اس ماورین کا حریف بن جاتا ہے، اور اک تصادم و تراجہ، اور اک معرکہ حرب و ضرب















عمرہ عالم میں اک صالح المزاج اور قائم الطبیعت عالمی ریاست کے قیام کے لئے زمین ہموار کر دیں، اور اس مضطرب اور پرکرب دنیا کو یہ شادمانہ گانے کا موقع بخشیں کہ

لغشہ احمد ہر آن چیز کہ خاطر میخیزد  
آخراً ز پس پردہ تقدیر پیدا

(لکنت)

بشر میکہ ان ارکان عمارت عالم میں نہ ہاتھ پاؤں کی طرح کا کوئی برہنہ عنصر ہو، نہ اقلیت کی متم کا کوئی سنگ راہ!

غاصب قیصریتوں سے محروم ملتیں ٹکرائیں، اولی الذکر کی زندگیوں کو برابر روشنائی رہیں گی، تا آنکہ وہ مساوی و معتدل، مہرک و مہمناں مہم کی دلیلیتوں کی سطح مستوی پر آکر اور سپاڑہ دلیلیتوں کو ذرا اٹھار کر

عشگرِ صغیرِ نیک خطِ آسمان ہے  
اک قلبِ چربِ نیک خطِ آسمان ہے  
گر پتی ہے جب خاک کے ذروں پر تپ  
ہر ذرے میں خوشنید خطِ آسمان ہے  
بہل بیدی دلی

مژدہ ہو چشم کے سزاواروں کو  
اللہ کی رحمت کے پرستاروں کو  
دوزخ کو تو سے خوار پئے جانے میں  
اب کون جلائے گانگ گاروں کو  
بہل بیدی دلی

حسرت ہی رہی کوئی نہ حسرت نکلی  
راحت بھی کسے حق میں مصیبت نکلی  
بیجا غائب دولت کی توقع پر غم  
خود وقت کی محنت جیودت نکلی  
عظیم حسرت بادی

وہ شامِ صبح کی تبسم بیری  
تاریکی و نور کی دو رنگ بھیری  
پیغامِ ہزار اندسی و سستی ہے  
خبر سے کی ایک گلوں کی بھیری  
آزاد گلوں کی

# مزدور کی جوانی

## سری نگر کشمیر کی ڈل پراکٹاثر

دما دئی کشمیر اور پھر ڈل پہ یہ ہنگام شام  
 سا تگینوں میں نسیم شام کے ہے رُوحِ گل  
 چھن رہا ہے آنچلوں سے ابر کے ریگ سیاہ  
 ہیں رواں ہر چار سو تار کیوں کے قافلے  
 بارے تار کیوں کے دب رہی ہے روشنی  
 جھک گئیں جلوؤں کی پلکیں رُک گئی نبضِ شفق  
 یہ بجوم کوہِ یہ سسٹی ہوئی راتوں کے ڈھیر  
 بجاری بجاری تیرگی ہے ہلکی ہلکی روشنی  
 وقت کے مارض پہ وہ نمکینیاں ہیں الاماں  
 سوچے ہیں پتھروں کے بستروں پر زمرے  
 یہ نکارے، سانوے خوابوں کی رنگیں کشتیاں  
 کشورِ تنویر میں ہے ظلمتوں کا اہتمام  
 بے نیم جانغراک بادۂ بے طرفِ دھام  
 پڑ گیا دھماحسِ موجوں کا بے پردہ اخرام  
 پاسباں بن بن کے تائے ہیں مصروفِ خرام  
 کھل رہی ہے نوعِ وسِ شب کی زلفِ مشکِ خام  
 پڑ گئی محرابِ مغرب پر ردائے تیسرہ فام  
 رُک گئے ہوں جیسے نیلی کندھیوں کے ارادہام  
 پھیکے پھیکے سے چمن ہیں ہکا ہکا سا شام  
 ہر کنوئل کا پھول ہے گویا چراغِ بزمِ شام  
 نطق کی بستی میں ہے لبِ بستی کا اہتمام  
 نیم بیداری کے دھارے پر ہیں سرگرم خرام

شوخی فطرت میں اندازِ حیا پیدا ہوا

شورشوں سے اک سرود بے صدا پیدا ہوا

آہ اس دُھندلے سے منظر میں رہیں انقلاب  
جبار ہے اک جواں مزدور باحالِ خراب  
وقتِ رفتن پیر بن کی دستجیاں ہلتی ہوئیں  
رہروؤں کے ٹھاٹھ سے کٹتا ہوا زعمِ شباب  
جنشِ مرگاں میں دل کی ناتوانی کا ثبوت  
چینِ پیشانی میں محرومی، تبسم میں حجاب  
کُرب سے اترے ہوئے بے نور چہرے سے عیاں  
شادمانی سے کنارہ، راحتوں سے اعتبار  
پتیلیوں کے گرد آنسو رقص سا کرتے ہوئے  
ٹھیس سے چھلکی ہوئی، میخانہٴ دل کی شراب  
دامنِ عسرت میں عہدِ نوجوانی غنچہ ریز  
مُفسی کی گود میں پالی ہوئی رُوحِ شباب  
گرد آلودہ حبس میں جُراتوں کے آئینے  
ہر نفس کی آمد و شد برق و باراں کا جواب  
سامنے تقدیر کے تدبیر ہے محوِ سجد  
مطلعِ خاکی کے تارے پر ہے گردوں کا عتاب  
بندِ سیبی سے خزاں کی زد پہ تھراتا ہوا  
آنکھ کا غنچہ، لبوں کا لالہ، عارض کا گلاب  
بائے چھانٹا ہے کے مشنِ ستم کے واسطے  
دیدنی ہے گردشِ گردوں کا ذوقِ انتخاب  
یہ بجا رائج ہے آغازِ جہاں سے آج تک  
مکتبِ آلام میں مردانہ سیرت کا نصاب  
لیکن اُف یہ موت کا سیلاب اور افسانِ کال  
مصرعہٴ اندوہ کے چھونکے ہیں اور جانِ حباب

کس طرح کہدوں کہ شکوہ آدمی کی بھول ہے

مسئلہ یہ پیشِ اہل ہوش نامقبول ہے

# ہندوستان کی جمہوری زبان

امام اکبر آبادی

مختلف، اشکال و اجسام کی ساخت مختلف، رنگ اور روپ مختلف، لباس و خوراک مختلف، اور زبان و کلام مختلف، حتیٰ کہ اسی اختلاف کی بنا پر دو ملکوں کے دو آدمی مختلف مذاق و مختلف ہندیب نظر آئیں گے۔ اور وہ مجاہدہ کر کہیں لطف و راحت کی زندگی بسر نہیں کر سکیں گے، البتہ ہمزبانی بڑی حد تک ان میں انسیت پیدا کر دے گی، ہمزبان ہونے سے ایک دوسرے کے جذبات و احساسات کا احترام کرنا پڑے گا، اور حقیقت یہ ہے کہ قوموں کی شہانہ بندی کے لئے بھی ایک واحد و تہنا ذریعہ ہے۔

جس قوم کے پاس اپنی کوئی ایک زبان نہیں، وہ قوم نہیں، بلکہ غلامی، مندرجوں، گولگوں، اور بہروں کا ایک گھمبے، جو بیٹروں کے خواص اپنے اندر رکھتا ہے، جب کہ کسی قوم کا دور القاء شروع ہوا ہے، تو سب سے پہلے اُس نے اپنی زبان ہی کی طرف توجہ کی ہے، تاکہ باہمی انسیت دور ہو سکے، جب کہ کسی ایک ملک کے دو آدمی کسی دوسرے ملک میں جن الفاظ سے ملے ہیں تو ہمزبانی ہی نے اُن کے فیض پر اخوت و ہمدردی میں تحریک پیدا کی ہے، باد جو اس جہل و تعصب کے جو آج ہندوستان میں دوڑتا ہے، اگر یہاں کا ایک ہندو ایک مسلمان کو کسی غیر ولایت میں مل جائے تو وغیرہ سرت سے دولاؤں کے دل بھراؤں گے، اور دولاؤں ہم آغوش ہو کر ایک دوسرے کی دوستی کا دم بھرے لگیں گے۔

غرض کہ ہمزبان ہونا قوم کے لئے باعثِ رحمت و برکت ہے، اور

گاہے گاہے باز خواں اس دفتر پارینہ را  
تا زوخرای دانش گردا غمناے سینہ را

اس دنیا میں زبان کا مسئلہ بھی ایک ایسا بہم باشان مسئلہ ہے، جو عارف کی تمام قوموں میں پایا جاتا ہے، اور ہر نسل کے بعد اس مسئلہ کی نشو و اشاعت میں کافی حصہ لیا ہے۔ نیز ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ ملتوں کی قوم کو اپنی زبان سے آشنا کر دے، تاکہ باہمی تعاون سے ایک دوسرے کے لئے آسانی پیدا ہو اور روزمرہ کی بول چال میں، کاروباری معاملات میں، تہذیب و معاشرت میں مخصوص میلان طبع میں، ذوق ادب و سیاست میں، ہمزبان و ہم قوم ہونے میں ہر گئی نظر آئے، اور دوسرے ملکوں کی قوموں سے ایک نوع کا امتیاز حاصل ہو، نیز اس کی عادت و خصائص سے واقف ہو سکیں، بول تو انسان، خواہ وہ دنیا کے کسی شے کا رہنے بسنے والا ہو، اور خواہ وہ کس مہر و دم سے متعلق ہو، پر ہوا انسان ایک ہی جنس اور ایک ہی چیز ہے، لیکن مختلف اقوام کے فطری قائلوں کے ماتحت، اس کی طبعیاتی بھی مختلف ہیں۔ اس طرح جس طرح ایک بارش میں مختلف رنگ کے پھول پڑتے ہیں اور پھول ہونے کی حیثیت سے تمام پھول ہیں۔ پر خواص والدان میں اختلاف ہوتا ہے، اسی طرح اس دنیا کے بارش میں مختلف النوع انسان ہیں، کہ ایک گاہ کا آدمی اپنے غمزانی ماحول کے تاثر سے، دوسرے ملک کے آدمی سے بالکل بد نظر آتا ہے، اس کے حالات و تخیلات مختلف، حرکات و سکنات

بلک ہستی مارو ہندا سسلانے  
کو ماہ صلیح دیم، اور جنگ ہی طلب

ظاہر ہے کہ یہ جنگ اردو ہندی کی نہیں ہے، بلکہ عربی و ناگری رسم خط کی ہے۔ اگر آج سمن عربی و فارسی کے تمام الفاظ نکال کر منسکرت کے تمام الفاظ اردو زبان میں بھرتی کر لیں، اور رسم الخط اردو ہی رکھیں، تب بھی اردو وطن کو تسکین پہونگی، گو یا سیاہ لکیریں بدل دینے سے ان کے نزدیک جابیں یا اس کردار انسان سمجھ سکتے ہیں، بصورت دیگر نہیں ہو سکتے، یعنی اگر آج ہندی رسم الخط اختیار کر لیا جائے تو پھر کوئی سمجھتا باقی نہ رہے، حصول آزادی و اتحاد کے نزدیک تو یہ کوئی بڑی اور اہم بات نہیں ہے کہ لکیروں کی صورت بدل دی جائے، بشرطیکہ تبدیل شدہ الا سے کسی زبان کے لفظوں کے معنی پہل نہو جائیں، لیکن اگر معنی کی صورت ہی سنہ جو جائے تو پھر ایسا کرنا ممکن ہے۔ مثال کے طور پر دوچار الفاظ ہم آواز و مختلف المعانی درج ذیل کے جاتے ہیں۔ اگر ذیل کے الفاظ اور اسی قبل کے سیکڑوں الفاظ جو اردو میں شامل ہیں، ناگری رسم الخط میں لکھے جائیں گے تو یقیناً ان کے معنی کچھ نہ ہوں گے۔ مثلاً

آسی و عاصی۔ آشیر و اسیر۔ عالمہ و آملہ۔ ان کی آوازیں ایک ہیں، لیکن معنی جدا گانہ ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہندی رسم الخط میں، ج۔ ہ۔ ث۔ بن۔ ص۔ ز۔ ح۔ ذ۔ ز۔ جن۔ ظ و غیرہ وغیرہ کے لئے الگ الگ حروف نہیں ہیں۔ اگرچہ اس کے اعلانیہ ۳۴ حروف دیئے، ۱۶ حروف سوز، اور ۱۶ ماتر یعنی اعراب ہیں۔ اگر ان پر ۵ اُن حروف کا اضافہ کیا جائے جو۔ خ۔ ز۔ ث۔ ف۔ اور ذ کی آوازیں کے لئے قسطہ لگا کر بنائے گئے ہیں، تو یہ سمل (۶۱) حروف ہوتے ہیں۔ لیکن باوجود اسے کثیر ذخیرے کے ل۔ ہ۔ اور ن۔ ہ کی مرکب آواز کے کوئی ترکیب نہیں ہے۔ مثلاً کوہوں میں ل کے ساتھ ہ کی مرکب آواز نکلتی ہے، اور لفظ تنہا میں ن اور ہ کی آواز مرکب ہے۔ لیکن ناگری میں مرکب آواز نہیں نکلتی۔ چتر ویدی و دارکار پشادشرا بالی ہندی و کشتری میں یہ الفاظ اس طرح استعمال ہوتے ہیں کہ کوہ **کوہ** پشادشرا **پشادشرا** تنہا **تنہا** ان سے جو آوازیں پیدا ہوتی ہیں وہ یہ ہیں۔ کوہ ہو اور تنہا اس طرح ان الفاظ کے معنی بالکل مغل ہو گئے۔ اہل میں ناگری حروف کے ٹکڑے حرف الف و ن کے ساکن ہونے کو بتاتے ہیں۔ لیکن مرکب آواز پیدا نہیں کر سکتے جیسا کہ

اور موجب عروج و ارتقا۔ یہ ظاہر ہے کہ ہر ملک اپنی ایک عمدہ زبان رکھتا ہے، اور ہندوستان بھی باوجود مختلف مقامی زبانوں اور لہجوں کے، ایک مشترکہ و جمہوری زبان رکھتا ہے، ایسی جو اطراف ہند میں بولی اور سمجھی جاتی ہے، اور جس کا نام اردو ہے، یا ہندوستانی، یہی زبان آج سے چند سال پیشتر حکومت ہند کی دفتری زبان تھی، اور مغلوں کے زمانہ حکومت سے لے کر برٹش حکومت تک یہی ملی زبان سمجھی گئی تھی، اور سمجھی جا رہی ہے۔

لیکن حبیب نے ہند کی سیاست نے اہل ہندو کی ذہنیت میں انقلاب برپا کیا ہے تب سے تنگ خیالی کے باعث، اس زبان کے رسم الخط کو عربی زبان کے مشابہت کو دیکھ کر مسلمانوں کی مذہبی زبان سمجھ لیا، اور اس سے اس کے لفظوں سے اور اس کے حروف سے ان کو بوسے خون آنے لگی۔ چنانچہ یہ ہندی رسم الخط کی نشر و اشاعت کی طرٹ مائل ہو گئے کہ ان کی نگاہوں میں ناگری رسم الخط منسکرت کے مثل ہونے کے علاوہ مذہبی تقدس کی بھی چیز ہے۔

اگرچہ یہ سحر کثرت آراسلہ کا گولیس کے اہل بنیش کے پیش نظر ہا ہے، اور اہل فکر نے اس پر اجنبہ و فیصلہ کن وجہا دی بھی کیا ہے اور جاہا ہے کہ کسی طرح زبان کی اس گتھی کو سمجھا یا جائے، چنانچہ جماعتیں کا دل رکھنے کے لئے، یا عامی مضامین کو پیش نظر رکھ کر بڑی حد تک اس مسئلہ کو حل ہی کیا ہے، یعنی یہ کہ اردو زبان کا نام "ہندی" یا "ہندوستانی" رکھا جائے، یا ہندی اردو دونوں زبانیں ملک میں جاری رکھی جائیں اور غیر ملک سے انگریزی زبان میں مرامت کی جائے، گو یا ایک ملک میں تین زبانوں کو استعمال کیا جانا کالائیس کے نزدیک عقلمندی، حق، اور انصاف ہے، لیکن میرے نزدیک ابھی تک یہ مسئلہ لایحل ہے۔ نہ صرف میرے نزدیک بلکہ آٹھ لاکھ وڑو انسانوں کے نزدیک بل نہیں ہو سکا ہے۔

بظاہر اس کے حل میں ایک عامی مضامینت و رواداری تو ضرور معلوم ہوتی ہے۔ لیکن باطل اس میں فریب کاری، غیر دیانتداری۔ تا انصافی، اور ہٹ دھرمی اپنا کام کر رہی ہے۔ یہ سبب ہے مذہبی جنون شہاب کا جس طرح انسان جنون کی حالت میں تعیب و فراز کو نہیں سمجھ سکتا، اسی طرح ارتق کا پندار قوت انصاف و حق کو زائل کر دیتا ہے۔



کہ ناگری کسی بلند تن کی نزاکت کے ہار کی متعل نہیں ہو سکتی، اور انداز بیان میں وہ مزعج پیدا نہیں کر سکتی، جو مختلف اسلوب بیان کے لئے ضروری ہے۔ دوسرے یہ کہ عربی وفاداری کی طرح اس میں تصریحی ہولیتیں نہیں ہیں، اس کا سبب یہ ہے کہ ہندی کوئی علمی زبان نہیں ہے، بلکہ فرعی زبان ہے، اور ہر فرعی زبان ناواقفانہ اپنی کسی علمی زبان سے تنفیض نہ ہوگی کبھی مکمل ہی نہیں ہو سکتی۔ سنسکرت سے یہ بخوبی فیضیاب ہو سکتی تھی، لیکن ذات بات کے جھجکاؤں نے اُسے اتنی مہلت نہ دی کہ یہ اپنی علمی مسلسل سے فیضیاب ہو سکتی۔ تو تاریخ سے یہ ثابت ہے کہ ہندو مذہبی لوگوں نے سنسکرت کے دامن و دشمنی سے کسی کو ہاتھ نہیں لگائے دیا، اور ہاتھ دینڈت اس سے اور اس کے جمال باصرہ قاز سے حسب دلخواہ فیضیاب ہوئے دہر۔ مولف آج حیات نے لکھا ہے کہ:-

”چنانچہ جب (ایرین) نسوں کی حفاظت کو پورا بندوبست کر کے تو خیال ہوا کہ تئو دروں کے ساتھ آٹھ سو پیر بات حیت رہتے ہیں، اور تین دن کرنے میں بزرگوں کی زبان دوغنی ہو جائے گی، اس واسطے کہا کہ ہماری زبان زبان الہی ہے اور الہی ہند سے اس طرح علی آتی ہے، چنانچہ اس کے اصول و قواعد باندھے اور ایسے جانچ کر باندھے کہ جن میں نقصان کا ذوق نہیں آسکتا۔ اصل پاکیزگی نے غیر لفظ کو اپنے دامن پر ناپاک و خبیث سمجھا، اور سوائے برہمن کے دوسرے کی زبان، بلکہ کان تک گزرناسمیں ناجائز ہوا۔“

مگر لکھا ہے کہ

”اسی بنا پر (ایرین) فتح یا بوں کی بلند نظری نے اسکا نام سنسکرت رکھا، جس کے معنی آراستہ پیراستہ، منزه و صفا اور مقدس، جو چاہو سمجھ لو، ان کے قواعد زبان بھی ایسے مقدس ہوئے کہ بزرگان دین ہی اسے پڑھنا میں توڑ پھینک، بلکہ اس طرح بکار کر پڑھنا بھی گناہ ہوا کہ شودر کے کان میں بھی آواز نہ پڑے۔ اس کا نام دیو یا بائی ہوا، یعنی زبان الہی؛

جو کچھ مولف آج حیات نے لکھا ہے، یہی مہتمم، بیم چند ناسنکرت کا جانت بھی لکھتا ہے۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملک میں پراکرت زبانیں رائج ہو گئیں، اور سنسکرت کے علم سے عوام ہند و محروم رہے، آج سینکڑوں برس کے بعد سیماسی جہن نے ہندو دماغ کو اس طرف بھی متوجہ کر دیا ہے، لیکن اس کے حصول میں عوام کو جو تکلیف ہوگی اور جس قدر مدت درکار ہوگی وہ ظاہر ہے، تاہم اگر یہ کشمکش اردو کے رسم الخط کو شایاں سکتی ہے، تو اب کرنا کوئی دشوار نہیں، لیکن اگر اردو رسم خط ماننا ناممکن ہے، اور یقیناً ناممکن ہے کہ

”ایں خیالست و محالست و جہول“

تو پھر آزادی کے میدان میں، حصول آزادی کے لئے یہ رکاوٹ سمجھنی و انصاف کے خلاف ہے، اور تنگ خیالی کے مرادف، حقیقت یہ ہے کہ سحر یریں، تقریریں، سلاست و روانی میں، اور انتخاب و استطاعت میں، جو طاقت اردو کو حاصل ہے، وہ ہندوستان کی کسی زبان کو نصیب نہیں، اردو بھی ایک فرعی زبان ہے، لیکن اُس کو ادلی روز سے تین طین زبانوں نے نوازا، اور آج تک نوازی رہی ہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ ان میں سے دونوں فطرتاً خارج مسلمان تھے، جن کی مذہبی زبان عربی تھی، لیکن انھوں نے اپنی زبان میں بادجو و قرآن کی زبان ہونے کے، اور بادجو و مذہبی تقدس کے، کبھی مکمل سے کام نہیں لیا، کہ عوام اس سے محروم رہیں، چنانچہ خمیزن علمی زبانوں نے نہایت فیاضی و نہایت دلیری کے ساتھ فیض عام جارہ کر دیا، اور سوری مدت میں اردو زبان، الفاط کی دولت سے مالا مال ہو گئی، دنیا کی شاید ہی کوئی فرعی زبان ایسی جو جس کو ایک ہی وقت میں تین علمی زبانوں نے نوازا ہو، یہ وجہ تھی، یہ سبب تھا کہ ہندوستان کی جلد مقامی زبانوں کو کیسے چھوڑ کر اردو آگے نکل گئی۔ اور بادجو و فرعی زبان ہونے کے آج علمی زبانوں کے سد مقابل ہے، اس کے مقابلہ میں ہندوستان کی پراکرت زبانیں کپڑا پیچھے رہ گئیں، صرف اس لئے کہ اُس وقت تک سنسکرت کو ایک عروس فنی کی طرح سات پردوں میں چھپائے رکھا، لیکن مسلمان خاتمین نے اس علمی و دین کو دنیا سے روشناس کرایا، اگر مسلمان اب نہ کرتے تو سنسکرت کا تمام شہنشاہ خزانہ کم خورہ ہو گیا ہوتا، یہ اردو والوں ہی کا کم تھا کہ سنسکرت کی جان بچائی، ورنہ اندلس کے عیسائی بادشاہوں کی طرح، جنھوں نے مسلمانوں کے عربی علوم و فنون کا قیمتی خزانہ نذر آتش و آب کر دیا تھا، یہی کر سکتے تھے، (باقی آئندہ)

# نصیب

وجاہت، سندیلوی، بی لے

”ارے کھانا نہیں لائی ابھی ناک حرام زادی، میں دیکھتا ہوں اس کجغت مال زادی کے تو مزاج ہی نہیں ملے، آج میں اس کی مرمت کئے بغیر نہ چھوڑوں گا، جان کے پیچھے بڑی ہے کچھ کئے، ارے کھانا چل یا پھر میں آؤں،“ مولوی صاحب پھر گرے،  
نصیب، ایک سین میں کھانا لے کر آگئی۔ جیسے ہی اس نے نصیبی رکھی بیگ صاحب نے ڈانٹ بتائی، ”نا ہند دھوئے کا پانی، نہ تو لیا، بیگ صاحبہ سے کر آگئیں کھانا“

نصیب نے منہ بسور کر کہا، ”لے آ رہی ہوں“  
”لے آ رہی ہوں کی کچی! پیسے سے خیال نہ تھا“ مولوی صاحب نے پھر غصہ دکھایا،

جلدی سے نصیب پانی اور تولیہ لائی، قواب صاحبہ کی گانگ پڑی،  
صاحبان آیا تو مولوی صاحب اور بیگ صاحبہ نے کھانا شروع کیا۔

”یہ دال میں مرچ کس قدر تیز ہے؟“

”یہ شہرہ ہے کہ پانی“

”آلو بالکل ہی کچے رکھتے ہیں“

مولوی صاحب کھانا کھاتے جاتے اور ان کا غصہ تیز ہی سے بڑھتا جاتا، بیگ صاحبہ بھی اس شکل کو برداشت نہ جاتیں، نتیجہ یہ ہوا کہ مولوی صاحب نے کھانا کھاتے ہی سے ٹھیکر نصیب کو مانا شروع کر دیا، ”بدعاش، حرام زاد

رات زیادہ جا چکی تھی، مولوی صاحب نے دو گنڈہ نمک اخوت اور سادات پر دھواں دھار تقریر کی مٹی اور سینکڑوں آسمان بھار لفرے بند کئے تھے، لہذا حق خشک ہو چکا تھا، طبیعت خسہ مٹی تنکا وٹ قدم قدم پر بٹھائے دیتی اور پھر بھوک کی شدت سے تو سکرات ہی کا لطف رہا تھا، راستہ پھر مولوی صاحب نے جلسہ کرنے والوں کو گالیاں دیں کہ کیسے کجمنوں نے جا رہے ہیں پر رٹا دیا، گھر پہنچتے ہی مولوی صاحب بڑے زور سے گرجے، ”نصیب، نصیب، کھانا لاؤ، نصیب شامت کی ماری ذرا غافل ہو گئی تھی، لہذا پہلی آواز پر نہیں بولی، اب کیا تھا، مولوی صاحب نے اپنا سارا غصہ اسی پر اُتار دیا،“ حرام زادی، لاٹ صاحب کی کچی بی بی ہے، ادھر شام ہوئی، ادھر مری، ڈوگری کرنے ملی ہے، انکو خیرے دکھانے لیا کچھ تیرے باپ رکھا گئے تھے ہمارے پاس، کام کی نہ کاج کی دشمنانج کی“ وغیرہ وغیرہ، مولوی صاحب اپنا لیکو دیتے ہوئے بیگ صاحبہ کے پاس پہنچ گئے، بیگ صاحبہ نے کچھ اسی سلا کرنے کو دودھ پلا دی تھیں، مولوی صاحب نے جاتے ہی جاتے پوچھا، پھر تو چچی کو کوئی درست نہیں آیا۔ سچا اس کے کہ بیگ صاحبہ اس سوال کا جواب دیتیں اُنھوں نے نصیب کو کون شروع کر دیا، اس مال زادی نے شام کو پھر بٹھانڈا دودھ پلا دیا اس کو بٹھانڈا دودھ پلا دیا،“ مولوی صاحب اپنی جگہ سے ایک باشت اٹھلے گئے۔ پھر تو پھر کیا دودھ دست اور آگئے، بیگ صاحبہ نے کہا۔

کینی، چوٹی، نمک حرام، دودھ، حرام خوراک  
وہ تو کہے کہ بیگم صاحبہ کو ترس آگیا، درد مولوی صاحب تو نصیحت کی  
جان لئے بغیر نہ چھوڑے۔

اپنے بیٹے پرانے بستر پر وہ تنہا بیٹھی بڑی درنک کچھ سوچا کی، کئی دفعہ  
اس کے دل میں خیال آیا کہ وہ لڑکی چھوڑ دے، لیکن ذرا اُس کی آنکھوں  
کے سامنے تصویر کھینچ جاتی کہ کس طرح اُس کی بچیاں کھڑا اور شہر بیٹھی سے منظر  
ہوتی ہیں، اگر کب وہ روئی سے کر آئے، اور کب وہ کھانا کھائیں۔ اگر اُس نے  
لڑکی چھوڑ دی۔۔۔۔۔؟

گھر ٹالنے ایک بچیاں۔ وہ جلدی سے اپنے بستر میں گھس گئی، اُسے  
پانچ بجے اُٹھ کر مولوی صاحب کو دھوکا پانی دینا تھا، اور پھر گل دن بھر  
کا کام، برتن، مچھنی، جھاڑو دینا، کھانا بچانا، سالہا پیٹنا، حقہ بھرنا،  
بچوں کو کھانا، کپڑے دھونا، پانڈا، اُٹھانا، اُگلدان لانا، پٹنگ اُٹھانا،  
بچھونے کرنا۔۔۔۔۔ وہ سوچے سوچے سوچے رہ گئی۔

## مزدور!

وہ جس کی گرم آہوں پر کسی کا بس نہیں چلتا  
وہ جس کے حال پر آنکھیں کبھی گریاں نہیں ہوتیں  
وہ، مستی جو کہ غیروں کے لئے پر باد ہوتی ہے  
عروس لڑکوں بھی جس کی لباس تو نہیں ملتا  
وہ جو اکثر گرسنہ زیر چرخ پیسہ سوتا ہے  
جسے آرام و آسائش کا کوئی حق نہیں ہوتا  
سلاتا ہے جو معصوموں کو اپنے گرم ریتی پر  
ہلاک بیگی ہوتے ہیں جس کے شیر خوار اکثر  
بیان درد دل پر کٹائی جاتی ہے زباں جس کی  
اُسی کو اصطلاح دہر میں مزدور کہتے ہیں  
یہی ہے جو ہلاک شدت گرما بھی ہوتا ہے  
یہی ہے جو کہ کٹ جاتا ہے اکثر کارخانوں میں  
بناتا ہے یہی ملکوں کی جب قسمت بگڑتی ہے

وہ جس کا گردش تقدیر پر کچھ بس نہیں چلتا  
وہ جس پر شکنیں پڑتی ہیں تو آسائش نہیں ہوتیں  
وہ، ہر اک سائش جس رنجور کی فریاد ہوتی ہے  
وہ جس کا زندگی بھر غمِ حسرت نہیں کھلتا  
کڑی محنت کی آہوں میں جو دن بھر جان کھوتا ہے  
کسی کو پاس جس کے درد کا مطلق نہیں ہوتا  
بناتا ہے جو قہرِ عیش کے دیوار و بام و در  
رہا کرتی ہے پائالِ خزان جس کی پسرا اکثر  
کوئی مست نہیں دنیا میں فریاد و فغان جس کی  
وہ جس کو سب غریب و سبک و مجبور کہتے ہیں  
یہی ہے جو قہرِ خیرِ سہ ما بھی ہوتا ہے  
یہی ہے وہ جو زندہ دفن ہو جاتا ہے کاؤں میں  
اُٹھاتا ہے یہی قوموں پر جب افتاد پڑتی ہے

یہی ناکام رہ کر کام اک دنیا کے آتا ہے  
یہی ذلت گدائی کی بُرا ہے میں اُٹھاتا ہے

# آج کل

پھر کاروانِ شوق پریشاں ہے آج کل  
 پھر ہو چلا ہجوم ہزار پریدہ رنگ  
 پھر زاویہ نگاہ کا بدلا ہوا سا ہے  
 پھر آرزوئے مرگِ مفاجات ہے ہمیں  
 ہو جائے پھرتوں کی حقیقت نہ بے نقاب  
 یہ مشتِ خاک پھر ہے تماشاے رہگذر  
 پھر آنسوؤں نے حسن کی گرمی کو کم کیا  
 پھر خزنِ اُمید پہ منہستی ہیں بکلیاں  
 رگِ رگ پھڑک رہی ہے بہ اندازِ نغمہ پھر  
 پھر حل کے پوچھ لیں دلِ شوریدہ کا مزاج  
 پھر رنگِ دلوں میں جان پڑی دیکھنا بہار  
 پھر چھپ گیا ہے پردہ تصویر میں کوئی  
 پھر ذرہ ذرہ دشتِ بد اماں ہے آج کل  
 مغل پھر چراغِ گوبرِ غریباں ہے آج کل  
 پھر میں ہوں اور گردشِ وراں ہے آج کل  
 پھر اعتبارِ دوشِ عزیزاں ہے آج کل  
 دنیا میں پھر نائشِ امیاں ہے آج کل  
 دامنِ پھر اُن کا میرا گریباں ہے آج کل  
 پھر دردِ عشقِ مائلِ درماں ہے آج کل  
 پھر دانہ دانہ شعلہٴ رقصاں ہے آج کل  
 پھر تارتار ساز کا لرزاں ہے آج کل  
 قسمت سے بند پھر دردِ زنداں ہے آج کل  
 ہر غنچہٴ عندلیبِ گلستاں ہے آج کل  
 پھر جوشِ پر تصویرِ عسریاں ہے آج کل

پھر جبر و اختیار میں ہے کشمکشِ تمپش

پھر مرگ و زلیستِ دستِ دگریباں ہے آج کل

# نقارِ وقت!

ادارہ کلیم

ماہ اکتوبر ۱۹۳۷ء کے قلم میں ہم نے یورپین سیاسیات کی رفتار کا مطالعہ کرتے ہوئے جزئہ مندرجہ ذیل خیالات کا اظہار کیا تھا۔

”یورپ غلطی پر مدت سے ایک دہرہ کھولتے ہوئے کھینچتے ہوئے جا رہی ہے؛ جیسی دہائی گزشتہ نصف صدی سے زور آتی کانگریسوں کو کھینچ رہی ہے؛ جیسی دہائی نہ معلوم کب سے مشرق کی فتح کا پرچم اُڑا رہا ہے۔ امریکہ ’مکڈونلڈ‘ کی سرانجام دہی سے قبل اسی اعلیٰ اعلیٰ اعلیٰ کو مہر دے کر چکا ہے؛ اور پھر شاید ’سٹریٹ‘ دوس ’تو مغربی عالم میں ایک ذوق مند بشری کی دعوت ملے ہوئے مسند نشین مجلس بن چکا ہے؛ ترکی کی ’ترکی قائم ہو جانے کے بعد فلسطین کا مرکز بن جائے گی۔‘ انگلہ کا مرکز دوسری میں چکا ہے؛ اور اسی سرزمین ہندو چین پر جو مناظر ہم مشہد دیکھتے ہیں آئے ہیں، ان کا منظر اب بھی یہ ہے کہ

گر ان خواب میں سنبھلے گئے  
”ہمارے کسے“ ”اُسے“ گئے؛

ہم یہ ہم اپنا ہند کا خواب خرگوش ہی ہے کہ دنیا کو ذرا دیکھنے کے بعد ساکن سمجھ جائے گی؛ بقول مسکین کے ”تاریخ عالم چلے چلے کر گئی نہیں گئی ہے؛ اور اگر یہ خدا خواستہ خاتمِ الاقوام نہیں ہیں؛ ایسی فحش فحش میں انسان اس سے بھی بے منتہا رہا ہے، لیکن بالغاؤ خضر مشرق شیشِ ستھی کے دریا بنے و جدہ بستر و ج

ہم از غلیظہ سوزِ ابد گزشتہ در بعد آوا؛  
روحِ تقدیر کسی کی بے نقاب ہو چکی ہے؛ اب یہ ایک ماؤ فاش ہے کہ انگلستان و فرانس کے بعد براعظم یورپ کی کارواں سالاری جو تیس دہائی کو حاصل ہونے والی ہے؛ سوویت روس، غالباً، ایک نیم مغربی و نیم مشرقی طاقت کی حیثیت سے اپنے ایک عظیم الشان منصب پر تاقاب نہیں دیکھا، اور ہنگر و روسو کی اپنے عارضی مغربی و قدیم عہد کی ”کے خاتمے اور براعظم کے میدان کے خیمے کے بعد شاید روس کے ”پروٹاروی عہد“ کے عہد میں روسی کے ”سڑک صاف کرنے والے“ ثابت ہوں گے؛ جدید عہد جس اور اعلیٰ لای ہاری ہندوستان کی تاریخ سابقہ کے مرتبہ اور سمجھنے نظر آتے ہیں؛ اور آئندہ ایک برطانیہ، مغربی یا مشرقی عالم کے بعد کی ”سلطنتِ مغلیہ“ کے تاریخی ذرائع کے بارٹ کو کھینچنے والی ہے؛ جیسی کہ انسانی ازم“ اور انسانی کا فاسم“ اُس وقت کے ہمارا مشرک و پنجاب کی ”خزانی جنگ“ کا میں تاریخی نظر آتا ہے؛ شاید موجودہ روس اُس وقت کے انگلستان کی تاریخ کا ”دوہرائے“ اور ان دوسرے اور تیسرے درجے کے تمام تباہ کن عناصر سے طبع صاف کر کے ایک بشری تبدیلی کے آفتاب جیسا تاب کے مطلق الاذکار کی جلوہ گاہ بنے؛ آگے جو کچھ دیکھتے ہیں اب پہ آسکتے ہیں جو حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی؟“









جائستان و دشمنوں کو تھج احسان سے قہیل بنانے سے باز رہیے! آج ہماری  
وزارت و حکومت کی سونپیدی نجات آپ کے ہاتھ ہے، اگرچہ آپ کی اسی  
نجات دہندہ جماعت کے ۱۰ فیصدی ارکان جرائم پیشہ ہیں!  
اگر پنجاب کی کانگریس پارٹی سکندری وزارت کی آگ میں گود  
پڑتی تو اس کی اس معصومانہ خوشی پر ہم اس کو اس طرح داد دیتے کہ  
آسٹریل ہے کس انداز کا قاتل سے کہتا ہے  
(۱-۱۰-۱۸)

سے بانہا ہوتی ہے کہ سیاست میں کوئی شرافت نہیں ہے؛ چنانچہ وہ پوری شہانہ  
شان سے اپنی رقیب و رقیبہ ادگشتہ ناز مسعودی، کانگریس پارٹی کے آگے  
یہ دست سوال پیش کرتی ہے کہ قائد آپ اپنی وسیع الشرفی و عظیم الداری کی لاج  
لیجیے، اور سلا شہید گنج کو کسی طرح لے کر آئیے؛ اس بات کو قبول جائیے  
کہ جس نے گزشتہ انتخابات میں آپ کے ڈرامائی لمحے پر وہ فرقہ وارانہ آگ جلائی  
تھی، جس میں ہمیں آزار اور پنجاب کی کانگریس پارٹی کی کاسیائی کے سارے آثار  
سوفت ہو گئے تھے؛ اگر ہم اس وقت آپ کا ہلاک کرنے سے نہ ہٹے تو آپ بھی اپنے

## شاعر کی دعا

قاضی الحاجات! ہم کو ٹھوک سے کر دے نہ حال  
صورتِ شعلہ بھڑک اٹھیں زمین و آسمان  
پایاں کی شدت سے بچے ہوں ہمارے نیجاں  
آسمان سے بوندیوں کے بدلے برسیں اڑ دیا  
ہوا اگر خواہش تو انگاروں پہ تڑپانا ہمیں  
صورتِ منصور سولی پر بھی کھنچوانا، ہمیں  
موت سینے سے لگانے کے لئے ہو بے قرار  
دست و پاشل ہوں، نظر بیکار اور دل ہونگار  
بن کے خنجر کاٹ ڈالے آرزوؤں کا گلا  
مضطرب آنسو ہوں آنکھوں میں، لبوں پر مبراہ  
آبِ دریا ہو لہو یہ بھی ہمیں منظور ہے  
زندگانی پر ہماری موت کا ہوا اشتباہ  
ہو غضبِ آلود تو یہ بھی ہمیں منظور ہے

قاضی الحاجات! لیکن اس دعا کو بے اثر

گر پڑیں طوبی غلامی گردنوں سے ٹوٹ کر



# رباعیاتِ اتر

دردِ یاد ہوتا ہے، جیتے فوت فوت  
کھلتی ہے لولہ زخمتِ فوت فوت  
بڑھتی ہے پوئیں روحِ بھی نثر کی کھڑ  
ہوتا ہے فروغِ نغمہ فوت فوت

بے پھول دی جب چمنِ نازاں ہو  
بے شک دی جب چمنِ نازاں ہو  
موتی ہے دی جب چمنِ نازاں ہو  
انساں ہے دی جب چمنِ نازاں ہو

ایسا بھی کوئی مضطرِ ناشاد نہ ہو  
دشمن ہے بھی دشمن پہ بیدار نہ ہو  
پیشِ بیمار اور حکمِ صبا  
تڑپیں نہ اسیر لب پہ کیا نہ ہو

زہارتِ مہ نہ دیکھ گئے پائے  
خونِ پورا میل نہ آنے پائے  
ہر خطِ رہے نفس کی غرت کا لحاظ  
سہ جائے گم بات نہ جانے پائے

# عروسی



# کلی

یہ ایک نہایت کامیاب علاج ہے جو بعد روغن عودس کے ترتیب دیا گیا  
مگر اشتہار میں صرف اتنا ہی اشارہ کافی ہے کہ مردوں کے تمام مخفی شکایات کا  
ہر موسم میں واحد علاج ہے مخصوص اذکار رفتہ فائدہ آٹھائیس اس لئے کاردار  
تجربہ ہے اس کے ساتھ چار پیڑس مومی، نناق، مکیدی، لعلی اور ہواہ ہیں،  
جن کی تفصیل اور ترکیب استعمال خریدار پر ظاہر کی جاتی ہے، ایک سیٹ عروسی  
کا ہفتہ بھر کو کافی ہوتا ہے، جس کی قیمت صرف ایک روپیہ پندرہ مانسے  
مقرر ہے، علاوہ محصول ڈاک۔ اکثرین ہفتہ کا استعمال صحت کے لئے کافی ہوتا ہے۔  
صاحب فرمائش نام دیتے صاف و خوش خط تحریر فرمائیے



کا بہترین سامان  
کفایت کے ساتھ

شفا خانہ رضویہ چاندنی محل دہلی

## ناظرین رسالہ کلیم

اگر آپ ادب اور دل کی خدمت کرنا چاہتے ہیں  
اگر آپ تحریر کی جو بول میں غلطی خواہ اعتدال دیکھنا چاہتے ہیں  
اگر آپ ملک کے بہترین شعراء اور ادبا کے جو خطے بڑھانا چاہتے ہیں  
اگر آپ اپنے علمی و ادبی ذوق کو ترقی دینا چاہتے ہیں  
اگر آپ اردو کے بلند و ستان کی واحد زبان دیکھنا چاہتے ہیں۔  
اگر آپ دینی اور محال کے شعراء اور ادبا کا تقابذ کرنا چاہتے ہیں  
اگر آپ ایسی کتب کی ضرورت کو محسوس کرتے ہیں جو ملک کی ضروریات کو نظر  
رکھ کر لکھی گئی ہیں۔  
اگر آپ کفایت بہترین اخلاق اور ادبی کتب خریدنا چاہتے ہیں

کلیم بک ڈپو جنتی لٹریچر نمبر ۱۰۰ دہلی سے فرمائش کیجئے

بجلی کا سامان — پائنداری اور ارزانی

انسولٹر، سوک، روز وغیرہ یعنی بجلی کے چینی مٹی کے ساز و  
سامان کے باب میں اس کی کوالٹی سب اہم چیز ہے اور گورنمنٹ  
پوسٹل فیکٹری مالے سوارم بنگلور کی بنائی ہوئی چیزوں  
میں یہ خوبی ہے کہ وہ عالی دماغ انجینئروں کے علم اور

تجربہ کا پتہ پڑتی ہیں  
گورنمنٹ پوسٹل فیکٹری  
مالے سوارم پوسٹ آفس — بنگلور



میں شہرِ بادشاہ کے خریداروں کو "لوچر خچہارم سے سیما اتر آیا" گھوڑا بچنے کا شکار دیکے جاہلوں کو  
دنیا کے صفات کا درخشندہ تارہ  
بہترین و بہر قیاس دیکھنا اور مثنوی سمیٹنے کی ضرورت ہے

## گھوڑا

بہت جلد آسمانِ ظرافت پر نہایت آب و تاب کیساتھ نمودار ہو گیا ہے  
مسٹر گھوڑا مذاہبِ آسمانی، دھرمپن مضافین، پُر لطافت کاروں دیدہ زیب فولادک، خوبصورت فنی تصاویر، شعرائے شیریں مقال کے غیر  
مطبوعہ کلام اور تازہ تیارہ خبروں سے مرصع معرین ہو کر پیٹنے میں صرف دو بار دیر ادارت جناب (رشیدل ذکی صاحب محل پٹری  
دیر سرپستی جناب احمد حسین صاحب بی ایس سی، ایل، ایل بی، ۸۰۰ پر پیل مشرق سے جلوہ افروز ہوں گے۔  
دی پی بھیا جھٹ ہے، ساز ۱۹۳۲ء بمجموع ۴۲ صفحہ، قیمت سالانہ ۵۰ روپے، ششماہی پری کابی ۲۰ روپے، اسٹال پر تین کتب  
پڑے۔ دفتر اخبار گھوڑا (لالہ بازار) پکے بازار، رستی (ای۔ پی)

## ادبی دنیا

ملک بھر کے جادو نگار ادیبوں اور شعرا کے بہترین افکار — مشرق و مغرب کے بلند ترین مصوروں کے نظر افروز شاہکار  
۸۲ دیکھنا انسانے مضامین اور نظمیں

قیمت صرف ایک روپیہ چار آنے، علاوہ محصول ڈاک

سالانہ خریداروں کو مفت

سالانہ چندہ پانچ روپے مع محصول ڈاک

آج ہی اپنا نام خریداروں کی فہرست میں درج کرا کر یہ بے نظیر تحفہ مفت حاصل کیجے

ینچر سالہ ادبی دنیا، لاہور

چند دن کے شمال سے سفید بال جڑے کالے ہو جائیں گے

## بھنگرہ میرا ل

# ہمایوں

سر اور ڈاڑھی کے بالوں کا سیاہ اور داڑھی کے، اگر لے سے روکنے، چمک پیدا کرنے، جلد سے جلد نئے بال اگانے اور بالوں کا انہو پیدا کرنے میں کامیاب تجربہ شد

(۱) ہمایوں اتنا پابند وقت ہے کہ جزوی سید سے لے کر (جب یہ جاری ہوتا تھا) اور بے نظیر روشن ہے، خواتین کے لئے بے پناہ اور نئی چیز ہے۔ ہم اپنے دعوے کو چمک بھی اس کی اشاعت میں ایک دن کی تاخیر بھی واقع نہیں ہوتی، اردو صحافت میں اس سے قبل ایسی باقاعدہ مثال نہیں مل سکتی۔

(۲) ہمایوں، آئینہ حسن و جمال محمد شاہین صاحب ہمایوں مرحوم جج ہائیکورٹ پنجاب کی یادگار کے طور پر ایک مستقل سرمایہ سے جاری ہے، اس لئے اس کے ظاہری و باطنی خیال کو ہمارا درود و تحریک کے مطابق ہی خوبیاں پائی جائیں گی۔

(۳) ہمایوں، اخلاقی معیار اس قدر بلند ہے کہ ملک کا کوئی ادبی رسالہ اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا، اس میں محض اشتہارات، عریاں تصاویر اور مخرب اخلاق غنائی اور ننگوں کے لئے قطعاً گنجائش نہیں ہے۔ یہ رسالہ بلا خطر خواتین کے ہاتھوں میں دیا جاسکتا ہے۔

(۴) ہمایوں، ایک ادارت جناب میاں بشیر احمد صاحب بی اے (اگس) پریسٹرٹ لاکہ قابل ہاتھوں میں ہے۔ اس کی ترتیب میں معنائیں کے محض ہندو معیار ہی کا خیال نہیں رکھا جاتا، بلکہ تنوع کا بھی اتنا خیال رکھا جاتا ہے کہ ہمایوں کا ہر پرچہ مختلف قسم کے مذاق کے لوگوں کے لئے یکساں جاذبِ توجہ ہوتا ہے۔

(۵) ہمایوں کے معنائیں محض ہندو معیار پر مبنی نہیں ہوتے، بلکہ ابتدا درجے کے دلچسپ بھی ہوتے ہیں۔ اس لحاظ سے ہمایوں آپ اپنی نظیر ہے۔

(۶) ہمایوں، محبتِ زبان کے لحاظ سے نہ صرف پنجاب بلکہ ہندوستان بھر کے مستند ترین رسائل کی صفِ اول میں شمار ہوتا ہے۔

(۷) ہمایوں، علمی و ادبی، تاریخی و مذہبی معنائیں، دلکش افسانے اور ڈرامے، پاکیزہ نظمیں، مزاحیہ مضامین، مغربی رسائل کے دلچسپ اقتباسات اور ملک کی موجودہ ادبی تحریکات کے متعلق نہایت پیش رفتی اطلاعات شائع کی جاتی ہیں۔

(۸) ہمایوں، ملک کے عکاسِ قلم کی طرف سے منظرِ رشہ ہے، ہندوستان اور بیرون ہندوستان میں بے انتہا مقبول ہے۔

(۹) ہمایوں کے کاغذ، کتابت، طباعت اور تصاویر وغیرہ دل کھول کر روپیہ صرف کیا جاتا ہے۔

(۱۰) ہمایوں کے سالگرہ، فرادہ و دیگر خاص فیروزوں کے لئے کوئی ذاتِ قیمت نہیں لی جاتی۔

چند سالانہ پانچ روپے چھ آنے، ہشتاویں روپے، مع محصول ہے

خاکسار منیجر رسالہ ہمایوں لاہور

(۱) ہمایوں اتنا پابند وقت ہے کہ جزوی سید سے لے کر (جب یہ جاری ہوتا تھا) اور بے نظیر روشن ہے، خواتین کے لئے بے پناہ اور نئی چیز ہے۔ ہم اپنے دعوے کو چمک بھی اس کی اشاعت میں ایک دن کی تاخیر بھی واقع نہیں ہوتی، اردو صحافت میں اس سے قبل ایسی باقاعدہ مثال نہیں مل سکتی۔

(۲) ہمایوں، آئینہ حسن و جمال محمد شاہین صاحب ہمایوں مرحوم جج ہائیکورٹ پنجاب کی یادگار کے طور پر ایک مستقل سرمایہ سے جاری ہے، اس لئے اس کے ظاہری و باطنی خیال کو ہمارا درود و تحریک کے مطابق ہی خوبیاں پائی جائیں گی۔

(۳) ہمایوں، اخلاقی معیار اس قدر بلند ہے کہ ملک کا کوئی ادبی رسالہ اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا، اس میں محض اشتہارات، عریاں تصاویر اور مخرب اخلاق غنائی اور ننگوں کے لئے قطعاً گنجائش نہیں ہے۔ یہ رسالہ بلا خطر خواتین کے ہاتھوں میں دیا جاسکتا ہے۔

(۴) ہمایوں، ایک ادارت جناب میاں بشیر احمد صاحب بی اے (اگس) پریسٹرٹ لاکہ قابل ہاتھوں میں ہے۔ اس کی ترتیب میں معنائیں کے محض ہندو معیار ہی کا خیال نہیں رکھا جاتا، بلکہ تنوع کا بھی اتنا خیال رکھا جاتا ہے کہ ہمایوں کا ہر پرچہ مختلف قسم کے مذاق کے لوگوں کے لئے یکساں جاذبِ توجہ ہوتا ہے۔

(۵) ہمایوں کے معنائیں محض ہندو معیار پر مبنی نہیں ہوتے، بلکہ ابتدا درجے کے دلچسپ بھی ہوتے ہیں۔ اس لحاظ سے ہمایوں آپ اپنی نظیر ہے۔

(۶) ہمایوں، محبتِ زبان کے لحاظ سے نہ صرف پنجاب بلکہ ہندوستان بھر کے مستند ترین رسائل کی صفِ اول میں شمار ہوتا ہے۔

(۷) ہمایوں، علمی و ادبی، تاریخی و مذہبی معنائیں، دلکش افسانے اور ڈرامے، پاکیزہ نظمیں، مزاحیہ مضامین، مغربی رسائل کے دلچسپ اقتباسات اور ملک کی موجودہ ادبی تحریکات کے متعلق نہایت پیش رفتی اطلاعات شائع کی جاتی ہیں۔

(۸) ہمایوں، ملک کے عکاسِ قلم کی طرف سے منظرِ رشہ ہے، ہندوستان اور بیرون ہندوستان میں بے انتہا مقبول ہے۔

(۹) ہمایوں کے کاغذ، کتابت، طباعت اور تصاویر وغیرہ دل کھول کر روپیہ صرف کیا جاتا ہے۔

(۱۰) ہمایوں کے سالگرہ، فرادہ و دیگر خاص فیروزوں کے لئے کوئی ذاتِ قیمت نہیں لی جاتی۔

چند سالانہ پانچ روپے چھ آنے، ہشتاویں روپے، مع محصول ہے

خاکسار منیجر رسالہ ہمایوں لاہور

ہندوستان کے مشہور رسالہ کلمہ کیلئے دیانتدار اور مختاری اینٹوں کی ضرورت ہے

۱۵ اپریل ۱۹۳۸ء کو نہ بھولے

موسم بہار اور صبحِ نشاط سے زیادہ لطیف

ادبِ غوث شہریت (کیا؟)  
افسانہ نمبر (کس کا؟)  
عذباتِ حمید احسانِ لطیف

## ہفتہ وار گل فروش دہلی کا

حسین فطرت کے جہل پہلو اداسانی جذبات کے ورق کو نمایاں کرنے والے رُوح پرور افسانے رُومان آمیز کہانیاں اور کوششیں تروتازہ نگہیں شائع ہونگی  
نی پرجہ دو آنے مینجر ہفتہ وار گل فروش دہلی سے منگائیے  
والہ نے ہر کے اپنے گزشتہ سے خرید دیا ہے

ادارہ ادبیات اُردو کا مصور لچپ ادبی رسالہ

### ”سب رس“

زیر نگارانی زیر ادا رت  
ڈاکٹر سید علی الدین قادری دُور پردیس سر حاسد عثمانیہ  
سالانہ چندہ چار روپے آٹھ آنے  
موند کا پرچہ سات آنے  
نئے کا پتہ

خواجہ حمید الدین مہتمم ”سب رس“

رغبت منزل، خیریت آباد، حمید آباد، دکن

نئے سال کا بہترین تحفہ

حقیقت نگار علی عباس حسینی کے افسانوں کا تازہ ترین مجموعہ

### آئی۔ سی۔ ایس

طبع ہو گیا

قیمت صرف ایک روپیہ ۸

انڈین پرنسپل آباد

برائچ آفس۔ کلکتہ۔ پٹنہ۔ لکھنؤ۔ لاہور

## نقش و نگار

شاعر انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی کی وجہ آفرین نکلوں کا مجموعہ (۱) نگار خانہ (۲) خریات (۳) تاثرات (۴) مطالعہ و نظر (۵) شیب ہر نظر اپنی جگہ کمال، مرصع اور کیفیت شعری میں ڈوبی ہوئی ہے، اور اس کے کور کن نئے، دل و دماغ کے لئے ایک مستقل سکون اور روح کے لئے ایک خاص سرور کا باعث ہوتے ہیں

لکھائی، چھپائی، نقبیں اور دیدہ زیب ہے

قیمت

غیر مجلد ایک روپیہ آٹھ آنے (پیر)

مجلد دو روپے (دہلی)

کلیم باب ڈپو، جینیٹو لاس نمبر ۴ دریا گنج دہلی سے منگائیے

## شاعر کی راتیں

شاعر انقلاب نے چند راتوں کی مختلف کیفیتوں کو اپنے خاص و عید آفرین اور کیفیت آور انداز میں بیان کیا ہے، جنہیں پڑھ کر ہر شخص اپنے آپ کو اسی حامل میں محسوس کر سکتا ہے راتوں کی تعبیل حسب ذیل ہے

|                |              |                    |                |
|----------------|--------------|--------------------|----------------|
| سترات          | پرسترات      | راز دنیا کی رات    | افطار کی رات   |
| اندھیری رات    | ہاندنی رات   | جوانی کی رات       | تصویرات کی رات |
| انفحات کی رات  | مداحی کی رات | انگوں کی رات       | برسات کی رات   |
| ربو لگی رات    | جڑی کی رات   | سرشار رات          | سبھی ہوئی رات  |
| تصویرات کی رات | بیمین رات    | پیان ناگن کالی رات |                |

قیمت

صرف آٹھ آنے (دہلی)

کلیم باب ڈپو، جینیٹو لاس نمبر ۴ دریا گنج دہلی سے منگائیے

## سوشل شعری

حضرت جوش ملیح آبادی کے تمام مہلوعہ اور غیر مہلوعہ کلام سے منتخب کر کے

سوشل شعری

دئے گئے ہیں، ساتھ ہی سوانح حالات اور کلام پر مختصر تبصرہ کیا گیا ہے

باوجود اختلاف مذاق کے نصرت سے زیادہ

اشعار آپ کو اپنی پسند کے میں گے

جیسی ساز، کاغذ، لکنا، ت، طباعت دیدہ زیب، سرورق خوشنما

جس پر

حضرت جوش کی تصویر بھی ہے

قیمت صوف چار آنے

میجر کلیم باب ڈپو، جینیٹو لاس نمبر ۴ دریا گنج دہلی سے منگائیے

## شعلہ و شبنم

شاعر انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی

(کی)

پُر جوش اور کیفیت آدر نکلوں کا مجموعہ

جو آپ کو آتشکدے کی شعلہ (شائیں)، اسلاقی شان و حریت کے خون کھولا دینے

والے دامنات، یادہ سر جوش کی کسمپرسیوں اور گنگا ناگ عظمت کے روح پرور

نفلوں سے لطف اندوز ہونے کا موقع ملگا

شاعر انقلاب کا یہ لافانی شاہکار غیر مہلوعہ کلام سے مرصع ہے

کتاب مجلد ہے اور نہایت خوشنما گروپش سے آراستہ جو

قیمت

صرف تین روپے (دہلی)

کلیم باب ڈپو، جینیٹو لاس نمبر ۴ دریا گنج دہلی سے منگائیے

**نوجیون**

نوجیون کو ہی اور اس وقت مولانا کے لئے سو قدر ہو  
 کہ کاسی کی اور کاشی میں اس کو کتنی آسنا دیکھ لگت  
 رہی ہے، جو سوئی اور ایک وقت میں دیکھ لگت  
 ہے، یہ ایک شخص سے دیکھ لگتا ہے کہ اس میں  
 کیا کوئی زمانہ دور میں آسنا لگت  
 وقت ہے

وہ دین کا دین ہے

**جمیل**

**جل جلال**

خانی شمس خرد واد کے چہرے سے پہنچی، اگر دیکھ  
 چہاں کیل، جہاں، سونا، آتش، آتش، آتش  
 سونے میں، اور جہاں میں سونا خوں سے  
 ہر لے والی تمام باریوں کے لئے نہایت  
 وقت، اور سونا بارہ لگے

**عجیب**

ان رگوں کے لئے  
 چہاں میں دیکھ لگت  
 خراب کچھ ہے، اور  
 ہر لے والی تمام باریوں کے لئے نہایت  
 وقت، اور سونا بارہ لگے

عاجل جابج الملک حکیم جیل خان جہاں پر ہندوئی دوانہ دلی

**جمیل**

**عجیب**

ان رگوں کے لئے  
 چہاں میں دیکھ لگت  
 خراب کچھ ہے، اور  
 ہر لے والی تمام باریوں کے لئے نہایت  
 وقت، اور سونا بارہ لگے

**عجیب**

ان رگوں کے لئے  
 چہاں میں دیکھ لگت  
 خراب کچھ ہے، اور  
 ہر لے والی تمام باریوں کے لئے نہایت  
 وقت، اور سونا بارہ لگے

وہ تھو جس سے ۲ لاکھ مرلیضیاں جہاں کو ایک آرام ہو چکا ہے

**جمیل**

**عجیب**

ان رگوں کے لئے  
 چہاں میں دیکھ لگت  
 خراب کچھ ہے، اور  
 ہر لے والی تمام باریوں کے لئے نہایت  
 وقت، اور سونا بارہ لگے

**عجیب**

ان رگوں کے لئے  
 چہاں میں دیکھ لگت  
 خراب کچھ ہے، اور  
 ہر لے والی تمام باریوں کے لئے نہایت  
 وقت، اور سونا بارہ لگے

جمیلان سب سے بہتر نہایت ہوتی ہے +

**جمیل**

**عجیب**

ان رگوں کے لئے  
 چہاں میں دیکھ لگت  
 خراب کچھ ہے، اور  
 ہر لے والی تمام باریوں کے لئے نہایت  
 وقت، اور سونا بارہ لگے

**عجیب**

ان رگوں کے لئے  
 چہاں میں دیکھ لگت  
 خراب کچھ ہے، اور  
 ہر لے والی تمام باریوں کے لئے نہایت  
 وقت، اور سونا بارہ لگے

وہ تھو جس سے ۲ لاکھ مرلیضیاں جہاں کو ایک آرام ہو چکا ہے

**جمیل**

**عجیب**

ان رگوں کے لئے  
 چہاں میں دیکھ لگت  
 خراب کچھ ہے، اور  
 ہر لے والی تمام باریوں کے لئے نہایت  
 وقت، اور سونا بارہ لگے

**عجیب**

ان رگوں کے لئے  
 چہاں میں دیکھ لگت  
 خراب کچھ ہے، اور  
 ہر لے والی تمام باریوں کے لئے نہایت  
 وقت، اور سونا بارہ لگے

جمیلان سب سے بہتر نہایت ہوتی ہے +

**جمیل**

**عجیب**

ان رگوں کے لئے  
 چہاں میں دیکھ لگت  
 خراب کچھ ہے، اور  
 ہر لے والی تمام باریوں کے لئے نہایت  
 وقت، اور سونا بارہ لگے

**عجیب**

ان رگوں کے لئے  
 چہاں میں دیکھ لگت  
 خراب کچھ ہے، اور  
 ہر لے والی تمام باریوں کے لئے نہایت  
 وقت، اور سونا بارہ لگے

وہ تھو جس سے ۲ لاکھ مرلیضیاں جہاں کو ایک آرام ہو چکا ہے

**جمیل**

**عجیب**

ان رگوں کے لئے  
 چہاں میں دیکھ لگت  
 خراب کچھ ہے، اور  
 ہر لے والی تمام باریوں کے لئے نہایت  
 وقت، اور سونا بارہ لگے

بچوں اور بچیوں کا باقصور ماہوار رسالہ

# پیامِ سلیم

ذہنی اور سیاسی انقلاب

پیغامِ مکتب

کلم دہلی

رسالہ

ذریعہ اداس

شاعر انقلاب جوش ملیح آبادی

اگر واقعی آپ کی یہ دلی آرزو ہے کہ  
(۱) آپ کے دین عزیز کو ہندوؤں اور ملوں کے  
ضاد سے نجات مل جائے

(۲) تقید رسوم کی عمارت پر حجتِ فکر و  
آزادی خیال کا پھر راولہ لائے گئے

(۳) ہندو مسلم اٹن بن کر اپنے اتحاد کے  
ذریعے سے ایک زندہ ہندوستانی قومیت  
کی بنیاد ڈال دیں۔

دہلی اور ہندوستان، غلامی کے طوقِ لعنت  
کو جس سے شیطان تک پناہ مانگتا ہے اپنی  
گردن سے اتار کر پھینک دے۔

تو

پہلی فرصت میں کلم میں خریداریں بچائے

پتہ یہ ہے  
مینجر رسالہ کلم دریا گنج دہلی

یہ رسالہ محض بچوں کی خاطر جاری کیا گیا ہے، اس میں انکی لکھی کی ہر چیز ہوتی ہے، اچھے اچھے اور مزید  
قسطے کہانیاں، مفید اور دلچسپ معلومات، لطیف ہنسی، تھیو اور ہلاک کی اچھی اچھی تصویریں وغیرہ۔  
وغیرہ، غرض اسے پڑھنے کے بعد انھیں کوئی دوسرا مشغلہ تلاش کرنے کی ضرورت نہ ہوگی، پچھلے سال  
سے ضمیموں کا سلسلہ بھی شروع کیا گیا ہے، ان ٹیموں کو غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی ہے، ایک انجمن  
بھی پیام برادری کے نام سے کھولی گئی ہے۔ اس انجمن کے ذریعے ان کے نئے نئے دوست فراہم کرنے  
کا انتظام کیا جاتا ہے، تاکہ مفید مشغلوں میں وہ ایک دوسرے کی مدد کر سکیں، اسی خیال سے اسکا چندہ بھی  
صرف دو روپے آٹھ آنے

رکھا گیا ہے، اسی چندہ میں سالانہ مہ بھی دیا جاتا ہے، یہ سنکر شاید تعجب ہو کہ ہندوستان  
کی کوئی دوسری زبان اب تک پیام تعلیم جیسا سالانہ پیش کر سکی۔

فوراً خریداریں جائے تو سالانہ مفت ملے گا

ورنہ ۲۲ روپے ٹکٹ بھیج کر منگوانا پڑے گا، سالانہ ۲۶ روپے کوٹیشن ہوتا ہے

مکتبہ جامعہ قرول باغ نئی دہلی

رسالہ کلم میں اشتہار دیکر فائدہ اٹھائیے

بِنَامِ قُوَّتِ وَحَيَاتِ

کلا د ہلے

آگے کی صدیوں ہر فسانہ اپنا

بہروں کو سنائے جاترا نہ اپنا

سہ ماہی چندہ - دور روپے  
قیمت فی پرچہ نو آنے (۹۰)

آگے گانہ جانے کب زمانہ اپنا

قد رست ملا ہے مجھ کو صد جین حکم

سالانہ چندہ - چھ روپے  
شش ماہی چندہ تین روپے اٹھ آنے

منظور شدہ

ڈاکٹر کثران تقی سلم

ریاستہائے میسور - پیٹالہ، وجیر آباد و کن

فہرست

فہرست مضامین بابتہ ماہ مئی ۳۸ء

جلد

| نمبر شمار | مضمون                         | نمبر شمار | مضمون | نمبر شمار                 | مضمون                             | نمبر شمار | مضمون |
|-----------|-------------------------------|-----------|-------|---------------------------|-----------------------------------|-----------|-------|
| ۱         | اشارات                        | ۳۵۴       | ۱۳    | حساس بھکاری               | لطیف شاہد                         | ۳۹۸       |       |
| ۲         | پیرزن لیگ                     | ۳۶۰       | ۱۴    | خونفک انتقام              | سرخ جہ آقا محمد شریف بی. بی. علیگ | ۴۰۵       |       |
| ۳         | سرماہ                         | ۳۶۱       | ۱۵    | میرے لئے دنظم             | جناب عمن صاحب دنظم گدھی           | ۴۰۸       |       |
| ۴         | دل مخزون دنظم                 | ۳۶۵       | ۱۶    | ہندوستان کی جمہوری زبان   | جناب امام اکبر آبادی              | ۴۰۹       |       |
| ۵         | کامیاب ناکام                  | ۳۶۶       | ۱۷    | عہد دنظم                  | جناب اثر صاحب بکوالی              | ۴۱۴       |       |
| ۶         | لفظ آزادی دنظم                | ۳۶۷       | ۱۸    | خون آرزو                  | شکیلہ اختر صاحبہ                  | ۴۱۵       |       |
| ۷         | ہندوستانی درو سورتھ           | ۳۶۷       | ۱۹    | ہوا کے جھوٹے کی تمنا دنظم | جناب الطاف صاحب شہیدی             | ۴۱۷       |       |
| ۸         | گسی کی آمد دنظم               | ۳۸۰       | ۲۰    | نظیر اور انسان            | جناب محمود صاحب اکبر آبادی        | ۴۱۸       |       |
| ۹         | شیلا و سلیم                   | ۳۸۱       | ۲۱    | سری کرشن دس صاحب کا مکتوب | .....                             | ۴۲۳       |       |
| ۱۰        | ہمارا ادب                     | ۳۸۴       | ۲۲    | رنگار وقت                 | ادارہ کلیم                        | ۴۲۵       |       |
| ۱۱        | جرنی کا آئینہ بڑھتے کیوں ادیب | ۳۸۵       | ۲۳    | نقد و نظر                 | .....                             | ۴۳۱       |       |
| ۱۲        | مرفا عبد السلام پر بیجا حملہ  | ۳۹۴       | ۲۴    | اشارات                    | مشترکین                           | ۴۴۳       |       |

# اشارات

عہدِ حاضر کی ادبی دنیا کا سب سے بڑا حادثہ

## اقبال کی موت

جس وقت ریڈیو نے اقبال کے انتقال کی خبر سنائی، ایک ہنسرا دل و جگر کے پار ہو گیا، اور ضبط کی انتہائی سعی کے باوجود سیری آنکھوں سے آنسوؤں کے چشمے اُبھنے لگے۔ یہ دیکھ کر حضرت آزاد انصاری نے مجھ کو کہا: آپ کو اقبال کی اب قدر ہوئی، بیٹے! یہ دیکھ کر آزاد صاحب کس روز اقبال سیری نکلا ہوں میں، ذیقعد نہ تھا، ہر چند مجھے اس کے مسلک و خیالات سے شدید اختلاف تھا، لیکن اس اختلاف کے باوجود مجھے اس کے شاعرانہ کمال اور اس کی مفکرانہ عظمت سے کب انکار تھا۔

اقبال ہر حالت اور ہر رنگ میں اقبال تھا۔ انوس کہ ہماری شادی کا آفتاب غروب ہو گیا۔

اقبال ان لوگوں میں سے تھا جو صدیوں اور قرنوں کی سچی پیہم کے بعد پیدا ہوتے ہیں۔

مست بہل ہیں سچو، پھر تباہ فلک برون

تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

اس میں کوئی شک نہیں کہ مجھے اس کی روش اور اس کے دائرہ عمل کو

بیشدہ اختلاف تھا۔ ابتدا میں ہر عظیم شاعر کی طرح، اقبال کی شاعری بھی ویسا اور آفاقی شاعری تھی۔ اس کی نظر دور رس، اور اس کا سینہ چوڑا تھا، مگر اس

کے بعد بعض وجوہ کی بنا پر، اس کی شاعری کا دائرہ تنگ ہونے لگا اور آخر کار یہاں تک تنگ ہو گیا کہ اس کی تمام تر شاعری مذہب تک محدود ہو کر رہ گئی۔

اعتراف یہ نہیں ہے کہ اس نے شاعری کے ذریعہ سے مذہب کی خدمت کیوں کی۔ شکوہ تو صرف اس بات کا ہے کہ اس کے سے عظیم شاعر کی آفاق فکر نے اپنے کو ایک ہی دائرے میں محدود کر لینے کی پابندی کو کیوں نہ کر گوارا کر لیا۔ اس نے کہ شاعر کے متعلق یہ بات حیرت انگیز بھی ہے، اور عبرتناک بھی کہ وہ حیات کے تمام نا قابل شمار پہلوؤں اور کرداروں کے تمام لافعلیہ احوال کی طرف سے آنکھیں بند کر کے صرف ایک ہی کو چپے میں پاؤں توڑ کر بیٹھ جائے۔ شاعر تو ہوتا ہوا ہمیشہ ہوتا ہوا پانی ہوتا ہے۔ اس کا تو یہ نمبر مستقل نمبر ہے۔

دریچ مقام نگار در بدر گئے

از بے یوسے بردا از رنگ برنگے

لیکن ان تمام باتوں کے باوجود کس کے منہ میں اتنے دلچسپی ہیں کہ وہ اقبال کی عظمت کا انکار کر دے۔ اقبال شاعر تھا، اور عظیم شاعر۔ اقبال مفکر تھا، اور عظیم مفکر۔

یہ صحیح ہے کہ وہ ایک لیڈر کی حیثیت سے نکلا، لیکن یہی ناکامی اس کی شاعرانہ عظمت کی دلیل کے طور پر پیش کی جا سکتی ہے۔ کیونکہ کوئی شاعر لیڈر کی سی فزوتیہ ملک اور نہیں سکتا۔

میں ہندوستان کے رعب آفریں اور حیرتناک وسیع برعظم پراس سرے سے اس سرے تک نگاہ دوڑانا ہوں۔ مگر کوڑوں کی آغوشی برعزت آبادی کے اندر مجھے ایک شخص بھی ایسا نظر نہیں آتا جو اس بلند پایہ سرے والے

کی خانہ پری کر سکے۔

سے صرف ایک روپیہ فی صدی سالانہ چندہ دیا کرے۔  
اگر ہندوستان کے سے وسیع براعظم میں سے جہاں پیشینہ کردار انسان آباد ہیں، ہمیں صرف پچاس ہزار آدمی ہی ایسے مل جائیں جو ایک روپیہ فی صدی کے حساب سے چندہ دینا شروع کر دیں تو اماندہ لگائے کہ دائرہ اقبال میں کتنی خطرہ دولت جمع ہو سکتی ہے۔ اور اس دولت سے ہم اردو زبان کو کس آسانی اور کس جرتناک سرعت کے ساتھ فروغ دے سکتے ہیں۔ اور اس کے دوش بددش اقبال کے متعلقین کی کس قدر خدمت انجام دی جا سکتی ہے اور ہر سال بہترین تصانیف پر ہم انعام بھی دے سکتے ہیں۔

فی صدی ایک روپیہ بھی بڑی چیز ہے، اگر چاہئے ہی آدمی مل جائیں جو صرف ایک روپیہ سالانہ چندہ دیں پھر بھی اس دائرے کی آمدنی پچاس ہزار سالانہ ہو سکتی ہے۔ اور پچاس ہزار سالانہ کی رقم بھی اتنی ہے کہ ہم اپنی زبان کو زمین سے اٹھا کر آسمان پر بٹھا سکتے ہیں۔

## نخست کے پردے میں سعادت

آج کرۂ ارض کے ہر گوشے، اور ہر مقام پر ایسے ہولناک ہنگامے برپا ہیں، جن کا اس عہد سے پیشتر اس دنیائے کبھی تجربہ نہیں کیا تھا۔ ہر چند ہمارے یہ دنیا کسی عہد میں بھی ہنگاموں سے خالی نہیں رہی ہے اور حوادث اس شاہراہ سے ہمیشہ گزرتے ہی رہے ہیں، لیکن اس دور کے ہنگامے، اور اس زمانے فسادات اپنی نوعیت و شدت میں ایسے عجیب و غریب، اور عمومی دانتے ہوئے ہیں کہ تاریخ عالم میں ان کی کوئی نظیر نہیں ملتی۔

اس سے پیشتر بھی فتنے برپا ہوتے تھے۔ اور زمین انسانی خون سے رنگین ہو جاتی تھی۔ مگر وہ تمام بد امنیاں اور خون نشا نیاں چند ماہ اور چند مقامات تک محدود رہنے کے باعث وقتی و مقامی ہو اکر ہی تھیں۔ اور انھیں مختصر سی بہت سی کے بعد دبا دیا جاتا تھا۔ لیکن اس میں صدمہ کے فتنے کی نوعیت و وسعت گذشتہ زمانے کے فتنوں کے مقابلے میں عجیب بھی ہے۔ اور ہولناک بھی۔

عصر حاضر کا فتنہ کسی ایک صوبے، کسی ایک ملک اور کسی ایک قوم تک

آج اقبال ہمارے درمیان موجود نہیں ہے، لیکن جب تک اس دنیا کے کسی گوشے میں علم و ادب کا نام باقی رہے گا، اقبال زندہ و پائیدہ رہے گا اس کے گیت ایک ملک سے دوسرے ملک تک سفر کرتے رہیں گے۔ اور اس کا نام انسانی ذہن کے، حق پر آفتاب کی طرح ملک کا رہے گا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ہندوستان نے اقبال کو اس کے تمام ہنر شعراء سے زیادہ سراہا، اور سب سے بڑھ کر اس کی قدر کی، لیکن عجیب خلقت ہندوستان کی قدر شناسیاں محض رسمی اور فنی تھیں، اور بعض اوقات تو ان کا دائرہ ذاتی تعلقات یا صوبوی افتخار تک محدود و تنگ رہا اور یہی وجہ ہے کہ اقبال کی مالی حالت تمام عمر غراب رہی، اور جو پال کے دیکھنے کے باوجود وہ ہمیشہ تنگ دست ہی رہا۔ لیکن اب آسانی کے ساتھ یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ ہندوستان اس کی فکر کو زور و جواہر سے پاٹ دے گا۔ محض اس خوشی میں زور و جواہر سے پاٹ دے گا کہ شاعر و شاعر ہے۔ مگر باور رکھئے کہ تمام نڈھالیاں اس کی قربانی تک محدود رہیں گی کوئی اللہ کا بندہ ہوصے سے بھی یہ دیانت کرنے کی زحمت اچھا گوارا نہیں کرے گا کہ اقبال کے بچے اور اس کے متعلقین شکم سیر ہیں، کہ فائدہ کرسے ہیں۔ زندہ ہیں کہ مر گئے۔

اقبال بلند مرتبہ اقبال، تو مرگیا، بہت اچھا ہوا کہ تو مر گیا، اس شخصیت ملک میں تیری جتنی جلد تھی۔ ہر چند تیری موت نے ہمارے سینوں کو سناں، اور آنکھوں کو دیراں کر دیا ہے، مگر خود تیرے حق میں یہ بہت اچھا ہوا کہ تو مر گیا اور مگر ناقدرستان غلام ہندوستان کی سرودھریوں سے تو نے نجات حاصل کر لی میرے دے دے تو مر گیا اقبال کی مرث کو بھی سمجھی موت سمجھ کر مٹا دیا جائیگا؟

کیا اس عظیم مرتبت انسان کی کوئی یا دگار قائم نہیں کی جائے گی؟ محض کسی شخص کا اس پر نصب کر دینا، یا اس کی قبر پر کوئی منارہ تعمیر کر دینا یا ہر سال مرنے والے کی برسی منادینا تو کوئی بہتر یادگار نہیں ہے۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ دائرہ اقبال کے نام سے ایک ایسی متعلیٰ الجہن کی بنیاد ڈالی جائے جو ہندوستان کے تمام بڑے بڑے شہروں میں اپنی شاخیں قائم کرے ہر جگہ ترجمہ و تالیف اور تصنیف کا کام جاری کر دے؟

اس انجمن کی ہفتا کی سب سے زیادہ آسان صورت یہ ہو سکتی ہے کہ اردو زبان کے ہر سمجھنے اور بولنے والے پر یہ فرض عائد کر دیا جائے کہ وہ اپنی آمدنی میں

کہا جاتا ہے کہ دنیا کے تمام مفاسد کی جڑ ہے جہالت، اور تمام نعمتوں کا سرچشمہ ہے علم۔

یہ ایک بہت بڑی حد تک درست ہے لیکن تمام تر درست نہیں ہے اس لئے کہ وہ علم جو انسانی نفس میں محبت و شرافت کے عوض شقاوت پیدا کر کے اکثر قریب عام پر آمادہ کر دے، اس جہالت سے بدتر ہے جس کی بریت شعور کی بے تربیتی کے باعث، محدود رہنے پر مجبور رہتی ہے۔

ہنگلے تو دونوں جگہ برپا ہیں۔ مشرق میں بھی، اور مغرب میں بھی لیکن ایک درجہ کی بات ہے کہ مشرق میں ہنگلے برپا ہیں مشرق کی جہالت کی وجہ سے، اور مغرب میں ہنگلے برپا ہیں مغرب کی عیبت کے باعث۔

یعنی اس وقت علم و حیل، دونوں معروف کار ہیں، اور ہر چند کان و دوا میں زمین و آسمان کا فرق ہے، مگر دونوں ایک ہی مقصد حاصل کرنے کے واسطے دوش بدوش سرگرم عمل ہیں۔ اور دونوں کے نتائج عمل میں جڑ تک ہم آہنگی پائی جا رہی ہے۔

یورپ کی عیبت نے یورپ کو بتایا ہے کہ سیاسی صنعتی اور تجارتی فروغ کے بغیر کوئی قوم زندہ رہنے کا حق نہیں رکھتی۔ اور اس دن سے یورپ نے یہ بات سمجھ لی ہے، اس کے دامن میں پرورش پانے والی تمام قومیں ایک دوسرے پر سبق لے جانے کے لئے آلات ہلاکت کی طیاروں میں دیوانہ دار کوششیں کر رہی ہیں۔

ہندوستان کی جہالت نے ہندوستانیوں کے کان میں یہ چھوٹک دیا ہے کہ مسجد کے سامنے جا بیٹھنے سے اللہ تعالیٰ کی حوسٹ میں فرق آجاتا ہے۔ گائے کے ذبح ہونے سے دیوتاؤں کے گلوں میں نوائے امک جلتے ہیں چار بار کی مدح سنتے ہی روحوں میں آگے پڑ جاتے ہیں۔ اور تیز بول کا جھلوس جب رک جاتا ہے تو آتما مسمومین سگواروں کے نام دونوںوں کے رجسٹر میں درج فرمایا جیتے ہیں۔ اور اس دن سے ہندوستانیوں نے اس جالاند کو اس کو ایمان سمجھ لیا ہے۔ اس روز سے ایک دوسرے کو لاشیں اور سوڈے کی بوتلوں سے ہلاک کرنے کے واسطے ہر قدرت بڑی خوشی سے آمادہ رہتے ہیں

قدرت کے کھیل عجیب ہوتے ہیں۔ وہ جب کوئی آفاقی دھارمک تحریک جاری کرنا چاہتی ہے تو اہل ادا کو اپنا ایجنٹ بنا کر پانی سے بھی دہی کام لیتی ہے جو آگ سے لیا کرتی ہے۔ اور علم سے بھی دہی خدمات

محدود نہیں ہے، بلکہ یہ فتنہ تو احاطہ کئے ہوئے ہے ہر ترغظ کا۔ ہر ملک کا ہر صوبہ کا۔ ہر شہر کا، ہر قصبہ کا۔ ہر گاؤں کا۔ ہر محلے کا۔ بلکہ ہر گھر اور ہر فرد کا اور اس طرح احاطہ کئے ہوئے ہے، جیسے شندیلے جس کے بعد کا پانی سے لدا ہوا طوفانی آبر۔

دنیا میں اس وقت جتنی قومیں بھی موجود ہیں۔ وہ سب کی سب بلا آشنا اس غیر طبی ذہنی کیفیت میں مبتلا ہیں۔ جیسے جنون کہا جاتا ہے۔

ہر قوم، دوسری قوم کو دیکھ کر دانت نکال رہی ہے، اور ہر ملک دوسرے ملک کی طرف منہ اٹھا اٹھا کر بھونک رہا ہے۔

جنگ کے بادل، آفاقی جنگ کے بادل قطبین کے درمیان ہر طبقہ پائیں کو ہلا کر خاکستر بنا دینے والی جنگ کے خوفناک بادل اقوام عالم کے سروں گھڑ گھڑا رہے ہیں۔ اور وہ آخری لمحہ پر آچکا ہے۔ جب طوفانی ہواؤں کی سنسان ہٹ اور لرزہ انگیز بجلیوں کی کرک کے ساتھ پانی دہشتناک چپکھا دھوں کے ساتھ برسنا شروع ہو جاتا ہے۔

اخباریں ہلنے کو پھی طرح معلوم ہے کہ اس وقت مشرق و مغرب میں کیا کھیل کھیلا جا رہا ہے۔ جہنم میں کیا ہو چکا ہے۔ آسٹریا پر کیا کچھ بیت چکا ہے۔ عربوں پر کیا کچھ گزر رہا ہے۔ چین و جاپان میں کیا نیامت برپا ہے۔

روس، فرانس، انگلستان، انڈیا اور ترکی گھبرا گھبرا کر امریکی سرگوشیاں اور کس بھم کی طیاریاں کر رہے ہیں۔ اور ہندوستان کے مستقبل کے باب میں کیا کیا پیش بندیوں کے جال بچھائے جا رہے ہیں۔ افروم کے سینے اس جہنم تک حد تک تنگ و تار ہو چکے ہیں، اور افراد کی حرص و ہوس کا دامن اس جہنم تک طور سے وسیع ہو چکا ہے کہ انسانیت کی نجات کا کوئی امکان نظر نہیں آ رہا ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انسانیت کسی پہاڑ کی ایسی پھسل پر آ گئی ہے جہاں ہر چند کہ ہر شخص اپنی پوری قوت سے پاؤں جما رہا ہے اور زمین کو ناؤں سے مضبوطی کے ساتھ پکڑ رہا ہے، لیکن اس تمام سعی کے باوجود جسے دیکھو وہ آہستہ آہستہ پھسل رہا جا رہا ہے۔

لیا قدرت انسانی نسل سے تنگ آ چکی ہے۔ آدم کے بچوں کو غم کر دینا چاہتی ہے؟

نفا ہر تو ایسا ہی نظر آ رہا ہے۔

انجام دلائی ہے جو خدمات کے محل انجام دیا کرتی ہے۔

اور یہی وہ مواقع ہوتے ہیں کہ دامن انسانیت بے تاب ہو کر چیخ اٹھتی ہے کہ:-

گبذ رخواست و سعادت، کہ مرا

ناہید مغز و کشت و مریخ بغیر

بظاہر یہ تمام علامتیں سخت ہولناک ہیں۔ اور اتنی ہولناک، کہ ان کے تصور تک سے جسم میں لرزہ پیدا ہو جاتا ہے۔ لیکن ان خوبی آثار کے پس پر جو جلوہ رنگین چھپا ہوا ہے کوئی نہیں دیکھتا۔ اور جو دیکھ لیتا ہے اس کے بدن پر اس یقین سے تبسم کیلئے لگتا ہے کہ قدرت کس نہر و سوت حکمت عملی سے کام لے رہی ہے، اور کس نہر و سوت آپریشن کے ذریعہ سے انسانی جسم کے تمام فاسد مادے کو کیس خارج کر دینے کے حزام پختہ ہو چکے ہیں۔

یہ عہد حاضر جو توپوں کی گرج سے لرزہ برآمد، اور ہڈیاں تک گھٹلانیے والی گیسوں سے تھر تھرا رہا ہے بظاہر کس قدر خوفناک معلوم ہوتا ہے۔ لیکن بہت کم افراد اس بات پر یقین لائیں گے کہ اور تو اور خود دنیا کے تمام حلیل القذیبوں کے زمانوں کے مقابلے میں بھی یہ زمانہ زیادہ مسود اور زیادہ مبارک ہے۔

پیمبروں کے زمانے میں صرف پیمبروں کی ایک ذات، یا ان کے معتقدین کی ایک تھیل جماعت ہوتی تھی، جو شر کا مقابلہ کرتی تھی، لیکن آج کا ناسات کا ہر ذرہ، ہم ٹھونک کر شر کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہو چکا ہے۔

پیمبروں کے عہد میں شر کو ایک قوی شے ہے، خبر کے ذریعہ سے چیلنج دیا جاتا تھا۔ جس تبنا کو وہ جزو واقعہ جوتی ہے۔ اور اسی وجہ سے پیمبروں کے دل میں ہمیشہ یہ آرزوی رہی کہ کاش وہ خبر کے دائرے کو حسب مراد وسیع دیکھ سکتے۔ لیکن اب قدرت نے تنگ اگر اور پائے نہج بات سے ناخداہٹھا کر شر کا زور توڑ دینے کی خاطر اپنا سب سے بڑا اور آخری حربہ استعمال کرنے کا ارادہ کر لیا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ اس نے دنیا کی تمام حریص قوموں کو ایک دوسرے کے خون کا پیاسا بنا دیا ہے جس کے پیاسی ہیں کہ قدرت نے شر کی مختلف مقداروں کو کہیں متوازن اور کہیں غیر متوازن صورتوں میں ایک دوسرے کے مقابلے کے لئے لا کر کھڑا کر دیا ہے۔ اب اگر جنگ ہوگی تو فیرا اور شر کے درمیان جنگ نہ ہوگی، بلکہ خود ایک شر کو دوسرے شر سے ٹکرا دیا جائے گا۔ اور اس ہولناک دھماکے کے ساتھ ٹکرایا جائے گا کہ شر کے تمام اجزاء مسفوت بن کر ہواؤں میں اڑ جائیں گے۔

یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہے کہ دنیا کی تمام جمہوری بڑی قوتیں ایک دوسرے کو فوج گڑاٹنے کی خاطر تلواروں پر سان کھ کھاتی ہیں، اور انسانی تہذیب و ثقافت کو جان کے لالے پرے پرے ہوئے ہیں۔ لیکن اسی کے ساتھ ساتھ ساتھ ہر قوم تلوار پر بات ڈالنے سے لرز بھی رہی ہے۔

کیوں لرز رہی ہے؟ اس لئے کہ ایک باز تلوار چلتے ہی سب کی موت ایک یقینی چیز ہے۔

چالاک، شرارت اپنی موت سے گریز کر رہی ہے۔

بات یہ ہے کہ یہ جنگیز و لاکھلا کا زمانہ نہیں ہے جب ایک قوی گروہ دوسرے کو زور و گرد و گھو بہ آسانی بغیر کمر جاتا تھا۔ اور ایک بیدار جماعت دوسری کو خلیہ جماعت کو اپنا نواسہ بنالیتی تھی یا ایک چالاک جماعت دوسری بے وقوف جماعت کو ہلاک کر داتی تھی۔

اب تو وہ زمانہ ہے کہ تقریباً دنیا کی ہر قوم بیدار، محبت، ہوشیار اور قوی ہو چکی ہے، اور آسانی کے ساتھ ایک دوسرے کا شرک نہیں بن سکتی ہے۔ اب جب جنگ ہوگی تو خفتہ بیدار اور کمزور و قوی کے درمیان نہیں ہوگی، بلکہ بیدار کے مقابلے میں بیدار۔ چالاک کے مقابلے میں چالاک اور قوی کے مقابلے میں قوی ہتھیار اٹھائے گا۔

اور ظاہر ہے کہ یہ صورت حالات ہرگز ایسی نہیں ہے کہ کبھی جنگی قوم کا کوئی نوجوان کر نیل دیوانہ وار لغوہ جنگ بند کرنا ہو جنگ کی آگ میں کود پڑے۔

مصلحت اس قدر سنگین اور نازک صورت اختیار کر چکا ہے کہ عقلیں بڑی بڑی باریک ہیں، اور دقیقہ سنج عقلیں سرز او نظر آ رہی ہیں۔

اگر ایک طرف امن پسند و غیر مسلح شہری ہیں اور ایک طرف امن سوز و مسلح ڈاکو، تو تمام کارروائی آسانی کے ساتھ بغیر دخول انجام تک پہنچ جاتی ہے۔ مگر جب دونوں طرف چور۔ ڈاکو اور بد معاش ہوتے ہیں تو اس وقت عقلیں معطل ہو کر رہ جاتی ہیں۔

اگر اقوام عالم کو جلد ہوش نہ آگیا۔ اور سیاسی۔ تجارتی اور صنعتی اہتیلہ کا خیال ترک کر کے انسانیت کے میدان حشر میں عدل و داد کی ترازو بہت جلد نہ کھڑی کر دی۔... گئی اور تمام زندگو ہر اند تمام پیداوار کو نزع انسانی میں مساوی طور سے تقسیم کر دینے کی کوئی صورت بہت جلد نہ نکالی گئی تو یاد

کے گی۔ اور قدرت کو مجبور ہو کر وہ عمل کرنا پڑے گا جو دیکھنے میں تو نفاق و آئینہ ہوگا۔ لیکن حقیقت میں اس کے اندر ایک ایسی بے پایاں رحمت ہوگی کہ انسانیت اس وقت تک شکر کر ادا کرتی رہے گی جب تک کہ یہ نعمت اس سے کمرہ از من عظیم الشان آفتاب کے گرد نقصان و غر لٹواں رہے گا۔ کیونکہ اس شکست و روغت کے بعد گہری ہوئی انسانیت کی خاک سے ایک ایسا میر تنگ نیا آدم پیدا ہوگا جسے دیکھ کر قدرت کا جذبہ الوہیت جھٹوٹنے لگے گا۔ اور انسانیت کے ہاتھ پر الوہیت کا زین تاج چمکنا اٹھے گا۔

رکھنا چاہیے کہ ہماری لاکھوں برس کی تہذیب آج واحد میں فنا ہو کر رہ جائیگی۔ میں بین الاقوامی سیاست سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا ایک قوم دوسری قوم کے ساتھ عدل نہیں کرے گی۔ کیا بازار سب کے لئے مساوی ملو سے کھلے نہیں رہیں گے؟ کیا رنگ۔ نسل۔ مذہب اور وطن کے تقصبات نہیں ہٹائے جائیں گے اور کیا "جیو اور جینے دو" کے اصول پر عمل نہیں کیا جائے گا؟ اور کیا دولت و ذرائع دولت کی مساوی تقسیم سے دلوں کے زخم مندمل نہیں کئے جائیں گے؟

امکان کا دائرہ تو بہت وسیع واقع ہوا ہے۔ ممکن ہے مذہبیت اپنی اصلاح کر لے لیکن حد سے گزرے حالات سے اندیشہ ہو رہا ہے کہ انسانیت ایک سببت ہی بڑے آپریشن کے بغیر اپنی اصلاح کی طرف مائل نہ ہو

## ”کلیم“ کی زندگی میں سب سے پہلی اپیل

ہو چکا ہے۔ اور اس کے سوا کوئی چارہ کا نظر نہیں آتا کہ وہ اپنے قد و احوال کی خدمت میں یہ درخواست کرے کہ ہر خدیوہ براہ کرم پانچ پانچ خریدار بھیار کر کے کلیم کے اجراء میں اس کا بات بنائے۔ اگر تاریخین کرام کے نزدیک ”کلیم“ ایک ایسا پرچہ ہے جسے وطن عزیز کی خاطر زندہ رہنا چاہیے تو پھر ان کا یہ ایک ذاتی کام ہے۔ کہ وہ مندرجہ بالا درخواست پر توجہ مبذول فرمائیں۔ اور اگر صورت حال اس کے برعکس ہے تو وہ اپنی رائے سے مطلع کریں تاکہ اس سلسلے کو ہمیشہ کے لئے سدود کر دیا جائے۔

قارئین کرام کو اول تو خود ہی یہ بات معلوم ہوگی، اور اگر نہیں معلوم ہے تو اب ان کی خدمت میں یہ عرض کیا جاتا ہے کہ مدیر ”کلیم“ کتنی تجارت پیشہ انسان نہیں ہے۔ ”کلیم“ کو اس نے ”تاہم از نقطہ نظر سے نہیں بلکہ وطن عزیز کی خدمت کے لئے جاری کیا ہے۔

”کلیم“ کی زندگی کا یہ تیسرا سال ہے۔ اور اس تمام مدت میں ہمراہ یہ صورت پیش آئی ہے کہ مدیر ”کلیم“ کو خود اپنی جیب سے ایک کافی رقم صرف کر دینا پڑتی ہے۔

لیکن اب حالات کی نوعیت کچھ ایسی نازک صورت اختیار کر چکی ہے کہ مدیر اپنی جیب پر کوئی مستقل بار ڈالنے کے امکانات سے محروم



# پیرزن لیگ

کل رات کو یہ خواب تھا کیا حضرت آزاد  
 سہمے بے اجالے میں ہے اک پیرزن تند  
 یوں گرم سخن ہے کہ جو اللہ نے چاہا  
 ایک بوند میں بے جائے گی تعمیرِ دو عالم  
 ہاں لیگ ہوں اسلام کی دیرینہ مجاہد  
 کافر کو جلاتی ہوں سب نارِ جہنم  
 ابھی نہیں سکتا مرے منہ "لا لہ" بزدل  
 کیا اس کا مراد کر، وہ دیسی، میں بدیشی  
 گنگا کی ہر اک لہر میں غلطیدہ ہے پستی  
 کفار کے دل، اور مرے چند سپاہی  
 بھڑکوں تو ابھی سینہ گیتی کو جلا دوں  
 اے حضرت آزاد، نصاریٰ :-

آغوش میں ظلمت کے ہے سہما سا اجالا  
 اوڑھے ہوئے شبہائے جوانی کاوشالا  
 کروں گی میں اسلام کی دنیا میں اجالا  
 چھلکے گامرے صبر کا جس وقت پیالا  
 ہر بات مری تیغ ہے ہر سانس ہے بھالا  
 مومن کو عطا کرتی ہوں جنت کا قبالا  
 میں پاک، وہ ناپاک میں گوری ہوں، وہ کالا  
 میں مصر کی مسجد، وہ بنارس کا شوالا  
 دجلے کی ہر اک موج میں رقصاں ہو ہمالا  
 اعدا کے پرے، اور مرا ایک رسالا  
 گرجوں تو ابھی چرخ کو کروں نہ و بالالا

ہر فرد حکومت ہے مری آنکھوں کا تارا ہر خان بہادر ہے مری گود کا پالا  
اتنے میں اک انگریز نے ایک قصر کے درے  
آہستہ سے پٹ کھول کے سراپنا نکالا

پیشانی کلرنگ پہ کج افسر شاہی آنکھوں میں فسوں ہات میں سونے کا نوالا  
یہ دیکھتے ہی پیرزن لیگ یکا یک دوڑی بڑی شفقت سے اٹھائے ہوئے مالا  
مالے کو بچاتے ہی بہ اندازِ محبت چہرے پہ نظر گاڑ کے آنچل کو نبھالا  
اور کہنے لگی پیار سے، لے لے کے بلائیں  
لے نورِ نظر! سلمہ اللہ تعالیٰ

جوش

جاری ہو گلوں کے درمیان گفت و شنود  
موضوعِ مکالمت ہے انجامِ فنود  
کھلتی ہوئی کلیوں پہ شبنمِ صبح  
ان شبنمِ صبح گارِ اشکِ آلود

محبوبوں سے دور نہیں تھا ہوں  
رشتے ہیں قویٰ نور نہیں تھا ہوں  
اجاب ہیں منجملہ عاداتِ فحش  
واقف ہوں مگر چھوڑیں تھا ہوں

# سرمایہ

فیضی پراچہ

”جوتے جو مہنسی کی خرابی یا نفل کے بغیر مڑی کے طور پر چب یا کھنٹی  
جا سکے اور وقت خواہش خواہشات کی گھٹیل میں کام آئے سرمایہ بکواسی

فیضی پراچہ

دور حاضر میں جبکہ انسانی حیات کا فرض اولین اور شہنائے مقصد محض  
”حصولی زندگی“ رہ گیا ہے اور جبکہ ہر انسان کو اس کے ارد گرد پیسے سے محال  
کر دہ منہ لاتی ہوئی شان و شوکت سے چھایا جاتا ہے، تو یہ قدرتی بات  
ہے کہ ہم میں سے ہر ایک اسی طرف راغب ہو اور اسی کے حصول میں ہنہک  
لیکن اس سالا سال کے اٹھاک و رغبت نے جو نتائج پیدا کئے ہیں وہ آج ہمارے  
سامنے ہیں۔ انسانیت وہ عالمگیر گروہوں میں تقسیم ہو گئی ہے، ایک وہ جس نے  
ماضی میں اپنی تمام تر توجہ حصولی زندگی طرف مرکوز رکھی، ظلم و استبداد چالاکی  
و بے انصافی کی تمام گھول کو کام میں لا کر دولت جیتی، اس پر قابض ہو کر اپنے  
رعب و وقار کو بڑھایا اور رعب و وقار کے نشے میں غمزدہ ہو کر چہرہ کو دبانڈا،  
دوسرا وہ جو ان تمام بد دنیا فنیوں، اور چالاکیوں سے بے خبر ترقیت  
و مقدر پر دالہا نہایت یقین رکھے۔ ان ضرب کاریوں کا شکار ہوتا رہا، اپنے  
خون پیسے سے، تمام تر سادہ و سچی کے تحت، دوسرے کے گھر کی دیوار  
پر اینٹ بچھا کر لگاتا رہا، ایک کی چالاکی اور دوسرے کی سادگی سے یہ  
عمل تیز رفتاری سے جاری رہا، حتیٰ کہ تو اذن معاشرت اس قدر بگڑ گیا کہ  
ایک کو تو دنیا کی ہر چیز حاصل ہو گئی تھی مگر ایک انسان بنا کر نہ رہا،

اور دوسرا اس قدر غلوک الحال ہو گیا کہ محنت و مزدوری کی ان ملک بھڑکوں  
کے باوجود، مزدوریات حیات کی گھٹیل سے عاجز رہا۔ اس زمین و آسمان کے فرق  
نے سپارہ کے دل میں اعلیٰ کے غلات شہنائے دگمان پیدا کئے، فکر و غور  
کی بلند پروازیوں کے ساتھ ساتھ یہی شہنائے حقیقت میں بدلے گئے، ادب و ہند  
کو احساس ہونے لگا، کہ اعلیٰ کو سب کچھ اس کی ہند آتالی کی وجہ سے حاصل  
ہیں، بلکہ خود (لہذا) کی سعی و محنت سے حاصل ہے، اُس کے اس احساس  
نے شہنائے کو غنا و دوستی میں بدل دیا۔ اور وہ تمام شد و د کے ساتھ سرمایہ  
کے مقابل صفت آرا ہوا، اس کے سادگی ہونے کا دعویٰ کیا اور اُسی نظام و  
نقد و معاشرت کو کبکسر بدل دینے کا مطالبہ کیا، جو سرمایہ دار کو لوٹ کے اور  
چہرہ کوٹنے کے سوا کچھ پیچھا پاتا ہو۔ سرمایہ دار اپنی طاقت کے زعم میں غمزدہ  
ان چیزوں کو کب برداشت کر سکتا تھا۔ اُس نے اپنی تمام قوت ان جذبات  
کو دبائے میں صرف کی۔ خدا اور مذہب کے نام کو، کلیساؤں، مساجد اور  
منا در میں رہنے والے راہنماؤں کی وساطت سے اپنی مطلب برکری کے لئے  
استعمال کیا، ٹیکش جاری رہے، حتیٰ کہ دنیا کے ایک کٹنے حق و صداقت کو  
نچ ہوئی، اور روس میں، ٹیکوس زار کے زیر قیادت سرمایہ داروں کے جب و  
استبداد کا خاتمہ ہو گیا اور عثمانی حکومت چہرے کے ہاتھ آئی۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ سرمایہ (ذروسیم) کو انسانی حیات کے ساتھ کہاں  
تک تعلق ہے، اسکا اجراء ضروری ہے کہ نہیں، اور اس کے بغیر ہم وہ ضرورہ

فطرت کا خا صہ ہے کہ وہ نظام قدرت کے صحیح قیام کے لئے جا بر پر جا بر جماعت کو پیدا کرتی ہے، تاکہ توازن قائم رہ سکے۔ چنانچہ کیرٹوں کو پیچھے، مرغ اور پرندوں کی خوراک ہیں۔ مرغ اور پرند، شہناز اور چیل کا لقمہ ہیں، بکری نباتات میں سے ہوئے بے شمار حشرات الارض کو کھا جاتی ہے، اور بکری کو شیر کھا جاتا ہے، لیکن ماموائے حادثات کے یہ انسانی مشاہدے میں نہیں آیا کہ شیر ہیرے کو شت سے شکم پروری کرے، شہناز، شاہب زکو مار کھائے، بلکہ اس کے برعکس دیکھا گیا ہے کہ چونٹیاں حمل خوراک کے لئے قناد کرتی ہیں، ایک چونٹیاں کبھی کبھ دیکھ پائے تو قبیلہ تھیل کو خیر کرتی ہے اور وہ بڑے انہماک سے سب مل کر قطار در قطار بار بار درباری شردہ کر دیتی ہیں، یہی حال چڑیوں کا ہے، اور اس سے زیادہ بہت آموز منظر اس وقت دیکھنے میں آتا ہے جب ان میں سے اٹکا کوئی کمرور سناٹی مر جاتا ہے یہ بھی غلو ق اپنے مردہ دہنی کے جسم کو سنبھالنے میں جس انہماک و سعی کا ثبوت دیتی ہے وہ اپنی کا حصہ ہے، لیکن انسانی دستور عبادت، ان میں سے ہر چالاک و جا بر کمزور و نادان کے وجود پر اپنی عیش و عشرت کا عالیشان قصر تعمیر کرتا ہے اور اس قصر کی حفاظت کے لئے خود کمزور و نادان کو استعمال کرتا ہے، کمزور و نادان کیسے استعمال ہوتا۔ اس کی بھی ایک راہ ہو سکتی تھی کہ اس کی ضرورت کی تمام اشیاء پر قبضہ کر لیا جائے، اور ضرورت کی انتہائی شدت میں اسے اس قدر دیا جائے کہ وہ زندہ تو رہ سکے لیکن اس کی ضرورت قطعی طور پر پوری نہ ہو، اور اس داؤد و ستد کے لئے اسے اپنی طلب پر آری کے لئے استعمال کیا جائے۔ اس میں مذہب اور خدا کو بڑی حد تک غلط طور پر استعمال کیا گیا۔ عوام الناس کو کہا گیا کہ یہ قدرتی فعل ہے کہ کمزور، طاقتور و توانا کے ذریعہ اس کے دم و دم پر زندگی بسر کرے، اور اس دعوے کے جوازیں اوپر دی ہوئی دلائل پیش کی گئیں اور اس حقیقت سے یکسر انکار کر دیا گیا، کہ ہم جنس، ہم جنس پر علم نہیں دھاتا، چونکہ کمزوری و توانائی کا تعلق فطری ساخت سے ہے، اس لئے کمزور کا اپنی ناجہمی کی وجہ ان نفسی دلائل سے گواہ ہو کر طاقتور کی چالاک کا ٹھکانہ رہا، اور اس کی سرداری کے آگے جھکنا رہا۔ اور ابتدا میں تقریباً تمام مزدوریات بھی قوت بازو سے ہیہا تمیں، مثلاً خوراک شکار کے گوشت سے پوشاک اس کی پوستیں جے، اور گھبر بھاڑیں غار کو دینے سے۔

کی ضروریات نبھا سکتے ہیں یا نہیں، سرمایہ کی مختصر سی تعریف یہ ہو سکتی ہے جو بچے و جو بچہ کی خرابی یا فعل کے بغیر مڑی کے طور پر اکٹھی کی جاسکے، اور وقت فراغ، خواہشات کی تکمیل میں کام آئے سرمایہ کہلاتی ہے۔ کیا ایسے سرمایہ کے بغیر انسانی گزر ہو سکتا ہے؟ فرض کیجئے سوئے اور چاندی کو معیار بنا دو، اگر یہ حیثیت حاصل نہ ہوتی۔ تو کیا سونا اور چاندی بنفسہ ہمارے کسی کام آ سکتے۔ کیا ان سے حیات انسانی کی کوئی خاص ضرورت پوری ہو سکتی؟ ضرورت کا اطلاق آج کل میت وسیع ہے، دیکھیں یہ ہے کہ انسان کو قدرتی طور پر ایک کچھ ضرورت ہے، اور اس میں کام نہیں کہ قدرتی ضروریات ہر انسان کی مساوی ہیں، مثلاً انسان کو زندگی کی اعتدالی ہیئت قائم رکھنے کے لئے مندرجہ ذیل اشیاء ازلیں لازمی ہیں، اور ان کا ہر ذی روح بغیر امتیاز نسبت و بالا، امیر و فقیر مزدور و سرمایہ دار، یکساں طور پر محتاج ہے۔

(۱) خوراک (۲) پوشش (۳) ہوا (۴) باد و باران سے بچنے کے لئے گھسرنان کے علاوہ اگر کسی کے قبضے میں کوئی شے ہے تو وہ ضرورت کو نبھانے کے لئے نہیں، بلکہ تکمیل خواہشات کے لئے، فالتو قبضہ ہے، جو قدرتی طور پر اس کا اپنا حق نہیں بلکہ وہ کسی اور کے حق پر قابض ہے، یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ راجہ کا محل بھی تو گھر ہے اس کی نئے و نشیمن بھی تو خوراک ہے، اس کا ذہب تب بھی تو پوشش ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ ہم صرف اُس چیز کی ضرورت ہے جو حیات انسانی کو اعتدال میں رکھے، جو اس سے بڑھ جائے۔ فالتو ہے، اور جو گھٹ جائے۔ کم ہے، اس حکم و فالتو کے تفاوت ہی نے دنیا میں آگ لگا رکھی ہے، انسان، انسان کے خون کا بیاسا ہے، اگر سونے چاندی سے ہیں دیگر حسب خواہش اشیاء بیبا نہ ہو سکیں تو سونا اور چاندی بڑا تہ ہمارا کسی کام کی چیز نہیں۔ اُن سے ہماری کوئی ضرورت پوری نہیں ہوتی، نہ وہ خوراک ہے، نہ پوشش، اور نہ مکان میں استعمال ہونے والی دھات، زیادہ سے زیادہ آج اُن کے وجود سے جو کام لیا جاتا ہے وہ زیورات ہیں، اور زیورات ضرورت کی چیز نہیں۔ یہیچیشان دشواری اور طریت کے مظاہر کے کام آتے ہیں، اور یہی وہ مظاہرات ہیں جو بے انصافی دید و بایاتی کو منظر عام پر لا کر، نادار، قدرتی ضروریات کے لئے محتاج نادار کے دل پر جوٹ لگاتے ہیں۔ لہذا ہر اس شخص کو اس قدر ہر و لعل و زری اور قبولیت کیوں حاصل ہوئی؟

شروع ہوتا ہے۔ اُس زمانے کے چند کے جو آج کل مختلف جگہوں کی گدائی سے برآمد ہوئے ہیں بتاتے ہیں کہ اُن کی قدر و منزلت اقتصادی بنا پر پیشینگی بلکہ اعتقادی وجہ تھی۔

یہ بڑی تانبہ۔ اور لوہے کے ٹکڑوں پر کھدی ہوئی چند سورتیاں ہیں جن پر قیمت درج نہیں۔ ان کے حصے میں جو کچھ ملتا ہوگا وہ اُس محنت کی وجہ جمنانے اس پر صرف کی اور خریدنے والے نے اُس سورتی سے عقیدت کی وجہ جو کہ ان ٹکڑوں پر کھدی ہوئی ہے انھیں خریدنا، ڈروسم کے عوض نہیں بلکہ غنہ کمال یا ایسی ہی کوئی اور چیز دے کر۔ (تبت میں آج کل بھی یہ رواج عام پایا جاتا ہے) اصل کی کٹی کے دوران میں صنایع کئی قسم کی سورتیاں، گلابی پتھر، مٹی تانبہ اور پستل کے ٹکڑوں پر بنا کر لے آتے ہیں۔ جن کا معائنہ غنہ کے مقررہ وزن کی شکل میں مقرر ہے۔ کسان وہ غنہ دے کر سورتیاں صنایع سے تبرک کے طور پر لے لیتا ہے، آج کل اُن پر فصلی سبزی بھی درج ہوتا ہے۔ ان سورتیوں کی خرید و فروخت اتنی بڑی کہ عام کاروبار میں اسی طرح ہو گیا۔ اب طاقتور لوگ ایک اور موضوع ہاتھ آیا۔ اُس نے دھات پر درجوان دلاں بیت ٹھہری تھلا میں بہنا پھینکی، لوٹ کھسوٹ سے قلعہ کر لیا۔ اور اُس پر اپنی سورتیاں لگا کر انھیں اس طرح لٹروں کے عوض اُن کی فروخت شروع کر دی۔ یہی خرید و فروخت انجام کار دھات کے مستقل "معیار تبادلات" کی حیثیت پر منتج ہوئی۔ آج بھی جو دیتے ہیں کہتے ہیں کہ مرد وہ ہیں اُن پر بادشاہوں کے بست نشین ہیں، اور جو ہمہ دہی نفع کے لئے ہیں اُن پر بھی کوئی نہ کوئی بت بنا ہوا ہے۔ اُن تہوں کے معنی یہ ہیں کہ یہ دھات اُن کی ملکیت ہے، جن کا بت اُس کی سطح پر موجود ہے، یا اس ابتدائی جبر و سلطنت اور اظہار ملکیت کے دستور کا اعلاہ ہے، جو انسان نے سب سے پہلے اختیار کیا۔ ارتقاء کے ساتھ ساتھ انسان غیر فطری زندگی اختیار کرتا گیا، اعلیٰ و ادنیٰ کی تفریق برپا تھی گئی اور مغرب کی پہچان برسنے لگی۔ حتیٰ کہ بعد کے مذاہب نے بھی سرمایہ اور سرمایہ دار کے متعلق کوئی نہ کوئی حکم لکھ کر کسی شکل میں پیش کیا۔ انسانیت بھی مذاہب کے عروج کے ساتھ ساتھ

اس لئے بھی تھی ورنہ ان کا بہت حد تک دور دور رہا۔ جب عقل انسانی نے ترقی کی اور کسکے کے بجائے زراعت وسیلہ معاش بن گیا تو اجتماعی محنت کی ضرورت محسوس ہوئی۔ انفرادی طاقت و ذوق پہنچ ثابت ہوا، چنانچہ اب اسی طاقتور نے اپنی بہبودی اسی میں دیکھی کہ زیادہ سے زیادہ زمین پر قابض ہو جائے، اور اپنی سرداری کو قائم رکھے۔ چوں کہ نسل انسانی کی حیثیت اجتماعی کی عادی ہوئی گئی، طاقتور کی سرداری بھی کمزور ہو گئی۔ زمین کا قبضہ اس کی سرداری کو زیادہ دیر قائم رکھنے میں مدد و معاون ثابت نہ ہوا۔ اب ضرورت تھی کہ کوئی اور طریقہ اختیار کیا جائے، اور وہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا کہ کسی کیاب دھات کو تعبیر بتا دلا "قرار دے کر اس دھات پر قبضہ رکھا جاتا، کیونکہ پیداوار (communitiy) پر قبضہ نہیں ہو سکتا تھا، اگر ہر بھی سکتا تو دیر پا نہیں، یہاں سے وہ دور شروع ہوتا ہے جس کے حالات مختلف آثار و قرائن کی شکل میں آج ہمارے سامنے ہیں، دھات کے مستقل طور پر معیار تبادلات کی حیثیت کب اور کیسے حاصل ہوئی، یہ ایک تاریخی سوال ہے، اور اس کے حل کے لئے ہم ابتدائی دور کی مذہبی کتب کی طرف رخ کرنا ہو گا۔ یہ کتب بھی اپنے وقت کی بہترین تاریخ ہیں، کیونکہ عام تاریخوں کی طرح یہ محض حالات پر مبنی کتب نہیں کرتیں بلکہ اپنے اپنے زمانہ کا کالان، جو معاشرت کا بڑی حد تک ذمہ دار ہوتا ہے بھی پیش کرتی ہیں، ہندو مت کی ہی کتب کو لیتے، اُس نے یہ چاہا ہے کہ زراعت کے ابتدائی ارتقاء کے دوران ہی میں مذہبی پریش کا چرچا ہو چکا تھا، اور انسان نے کسی نہ کسی طرح اپنے ہم جنس طاقتور و توانا کے رعب و خد سے مستحضر ہو کر، الیڈر کی پریش شروع کر دی تھی۔ دھات کا استعمال بھی فطریہ تفریبنا اسی دور سے شروع ہوتا ہے لیکن یہ بالکل خیال ہے کہ ابھی تک دھات کو "معیار تبادلات" کی حیثیت حاصل نہیں ہوئی تھی، کیونکہ ہندو مت کی ابتدائی کتب سرمایہ (ڈروسم) کو کسی خاص ایسی بینشوں میں پیش نہیں کرتیں، جیسے کہ بعد کے مذاہب کی کتب عروج و مدح کے طور پر بیان کرتی ہیں، بلکہ اس کے برعکس شہو فراموش اور جھوٹی چارہ پر گرد ہوں، بہرین، کھتری، وید، شودا میں تقریباً اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ اُس وقت تک صرف محنت ہی نہیں بلکہ عز و ریاضت کا واحد ذریعہ تھی ایک گروہ نے ایک کام کر دیا اور دوسرے نے دوسرا۔ اس طرح سب کا گروہ ہوتا رہا۔ یہی وہ زمانہ ہے جہاں سے سماجی طاقت و توانائی پر مبنی سرداری کا دور پڑھا

نہ ہیں کے شہر و تاریخ سماجی نام نے اپنی کتاب *Handbook of Indian Social History* میں لکھا ہے "انسانی حیثیت میں دھات کا اولین استعمال سورج پرست سے شروع ہوا۔ جو پ اور اچانانی کی ہر رنگ دھاتوں کو ان کے وجود کا حصہ سمجھ کر ان نے ان کی پھر سانی کو اپنی ہی سمجھا، لیکن قب کے لئے اپنے پاس اور گھر رکھے۔"

ہائیں سودا گندم، کئی اور جو کے عوض ایسا ہی فروخت کرتی ہیں جیسے نقد کے عوض۔ غرض تمام تر مقبولیت کے باوجود سرمایہ دہسیم مزدراں نظام کو از سر نیا نہیں سکا جس کی بنیاد محنت کا معاوضہ محنت پر ہے، وہ حاضرین ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ ضروریات کی تکمیل کے لئے سونا چاندی یا کوئی اور دعائی سکہ بہت کم کام آتا ہے۔ بلکہ زیادہ تر ان کا علم البدل ٹوٹ ہی استعمال ہوتا ہے۔ ایک کاغذ کا ٹکڑا جس کی بذاتہ کوئی قیمت نہیں، میا ربنا دل کی حیثیت سے کیسے استعمال ہوتا ہے؛ کیا امپیریل حکومتوں کے پاس اس قدر بڑا فنڈ موجود ہے، جتنے کہ ٹوٹ رائج ہیں۔ ٹوٹوں کے سرمایہ ریزرو، خود کار انکسار، فیس فیصدی بھی ریزرو نہیں۔ پھر یہ کیوں، جو یہی سرمایہ کی حیثیت سے بل رہا ہے، اس لئے کہ اس کی پشت پر حکومت کا وقار ہے اور بعض وقار، جبکہ پرسٹیج سے ایک ناقص نمائندہ داری نظام کا ٹوٹ میا ربنا دل کی حیثیت سے چل سکتا ہے تو کیا اسی "پرسٹیج" سے پروڈیوسر ٹوٹ (Producers' Guild) نہیں چل سکتا۔ جو معاوضہ میں سونا چاندی جیا نہیں کرے گا، جو اکٹھا کر کے رکھی جاسکے، بلکہ ضروریات روزمرہ کی اشیاء محنت کے ذریعے جیم بنیائے گا، چونکہ امپیریل ٹوٹ (Imperial Guild) مستقل حیثیت رکھتا ہے اور چاندی سونے کی ایک مقررہ تعداد کو پیش کرتا ہے اس لئے اس کا جمع کرنا بھی مفید ہو سکتا ہے۔ لیکن پروڈیوسر ٹوٹ (Producers' Guild) غیر مستقل حیثیت کا ہوتا ہے، اور اس مقررہ عرصے کے گزر جانے کے بعد جس کے لئے کہ اس کا اجراء میں آیا ہے بے قیمت ہو جاتا ہے، اور اس کے علاوہ سونا چاندی نہیں بلکہ صرف جس میں ہیا کر سکتا ہے، اس لئے اس کا اکٹھا کرنا کسی طرح مفید نہیں ہو سکتا، اور چالاک انسان دوسرے کے حقوق اپنے قبضہ میں نہیں رکھ سکتا۔ جیسی اور روس کے "امپیریل کونسل ٹوٹوں" کا جو حشر جناب عظیم کے بعد ہوا وہ آج ہمارے سامنے ہے، ۱۰۰ اسم کا دوسری رول، اور ۱۰۰ اسم کا جیسی ٹوٹ صرف چار چار آنے کو ہے، یہی ٹوٹ جناب عظیم سے پیسے، دنیا کی تمام مارکیٹوں میں ایک امتیازی درجہ رکھتے تھے، غرض اگر غور کیا جائے تو دنیا کی تمام برائیوں کا ۵۰ فیصدی ٹھہرا اس سرمایہ کی وجہ سے مل میں آتا ہے۔ اگر اسی دعائی "میا ربنا دل" کو اڑا کر ٹیکل ضروریات کا ذریعہ محض محنت کو قرار دیا جائے تو دنیا میں بہت

ہیں سکہ کو قضا و قدر سے نفع مانکر اس سے مانوس ہوتی گئی، اور اس قدر ہوئی کہ سچے کا احساس ہی مٹ گیا۔ لیکن جب بھی کوئی نئے معاشرہ اس سے بڑھ جاتی ہے، اس کی خوبیوں مٹ جاتی ہیں اور بُرائیاں منظر عام پر آ جاتی ہیں، یہی حال سرمایہ دہسیم (سکیم) کا ہے۔ جب اس کی مقبولیت محدود برآمدگی اخلاق و دیانت کا خون ہونے لگا۔ خود غرضی برآمدگی۔ بددیانتی اور ٹوٹ لکھڑٹ کا بازار گرم ہوا، تو یہ خیال پیدا ہوا کہ ان تمام تقاضوں کی علت غائی کیا ہے۔ فکر و غور اور مشاہدات نے ثابت کیا کہ ان تمام برائیوں کا بڑی حد تک ذمہ داری ہی سرمایہ ہے۔ غرض کیجئے، اگر ایک کے پاس سونے چاندی کا انبار ہے اور دوسرا قدرتی ضروریات کے لئے محتاج تو یقیناً محتاج سرمایہ اسے اپنی ضروریات کو نبھانے کے لئے اس کا جمع کر دے سرمایہ جینے کی کوشش کرے گا، خواہ اسے چوری ڈاکہ قتل، بددیانتی یا کوئی اور ایسا ہی طریقہ کیوں نہ اختیار کرنا پڑے۔ اب اگرچہ نقد مٹ جائے تو یقیناً چور کو چوری، ڈاکو کو ڈاکہ، چالاک کو بددیانتی، زور آور کو قتل اور ضروریات شکر کے لئے زانیہ کو عصمت فروشی کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ اب دیکھتے ہیں کہ کیا اس سرمایہ کے بغیر نظام چل سکتا ہے یا نہیں، یقیناً چل سکتا ہے، آج بھی سرمایہ کے اس متغیر اور دور میں ہمارے نظام کا بیشتر حصہ ذریعہ سرمایہ کا محتاج نہیں، اور نہ ہی کیجئے، مالک و مزارعہ کے تعلقات نقد و زر کے لین دین پر نہیں بلکہ محنت اور حاصل محنت کی تقسیم پر ہیں۔ فرق اتنا ہے کہ دیندار بے محنت کئے سرمایہ دارانہ نظام مفید دوسرے کی محنت پر پیش آڈا ہے، اور مزارعہ اپنی محنت کے بل بوتے پر زندہ ہے۔ پنجاب کے دیہات میں آج کل بھی چولا ہوں، بریسوں، لوہا ہوں، سوچی اور نائیٹوں سے کس ٹوٹوں نے ان کی مزدوری نقد کی شکل میں مقرر کر رکھی ہے۔ نقد کی قیمت میں اتار چڑھاؤ کا اس مزدوری پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ سوچی اور نائیٹ سارا سال کسان کا کام کرتے رہتے ہیں اور فصل کے موٹھے پر اپنا مقررہ غلہ لے جاتے ہیں۔ پنجاب کے ہر گاؤں میں ایک چولا ہا آج بھی چار چھ گندم کے عوض چار ہاتھ کیڑا بن دیتا ہے۔ کشمیر میں یہ عام رواج ہے کہ سبز پلوں کے موسم میں مالیں سنگھاڑے اور دیگر سبز پلوں کے کرگلیوں میں پھیری کرتی ہیں اور میوں عوض سود فطری نہیں جیتیں۔ بلکہ خالص دھان اور چاول کے عوض فروخت کرتی ہیں۔ یہی دھان انھیں آئندہ کاشت میں بیج کا کام دیتے ہیں۔ راجپوتانہ میں بھی یہ رواج عام ہے۔ بازار میں مٹی ہوئی

حکیم امن و سکون قائم ہو جائے گا۔ اور ایک ناقابل انسان کو محض اس  
وجہ سے وقار حاصل نہیں ہوگا۔ وہ کسی مذکورہ طرح دولت پر قابض ہے بلکہ  
موجودہ مشکلات، دھچکنی، بے کاری اور بے روزگاری کا واحد حل ہے،  
علم اور محنت ہی کا دور دورہ ہوگا۔ اور انسان اپنی ذات اور خدا کے سوا  
کسی دوسرے انسان کا محتاج نہیں ہوگا۔ سرمایہ داری کا مکمل انہدام ہماری

## دل محزون

دل محزون جسے کہتے ہیں، اک سنان بستی ہے  
سرور اس کا فغاں ہے اور نالہ اس کی ہستی ہے  
اگر لیلہ کی ہے یہ بات تو ہنگی سے ہنگی ہے  
یہ سودا بھی عجب سودا ہے بازارِ محبت میں  
شرافِ ثانی، اٹھکر دامن، اور آتش اندامی  
بھڑکتا ہے ہوا سے، اور سبھ جاتا ہے پھولوں سے  
فغاں اس کا قرار اور بے قرار ہی ہے بقا اس کی  
اسی کا درد ہمایہ ہے، اور ہمدرد بیتابی  
تردد اور تنہا میں سدا حیران و سرگرداں  
بکیدہ آرزوئیں اور مکدر حسرتیں اس کی  
ہے دھستِ حرص اس کی، اور ہوس اس کی فریخی ہے  
حریمِ کلبہ حزن و اندیمِ فاسدِ ناکامی  
فدا لگ جائے ہلکا سا حرارت کا اگر جھوٹا  
آہنی، برنجی کی، پرتیردوں کے اور ٹوٹے ہوئے نشتر  
ابابیلوں کے گھر، زار و زغن کے آشیانوں سے

عدم اس کا وجود اور بے وجود اس کا عدم سلطان  
یہ ایسی زندگی ہے، زندگی جس کو ترستی ہے

# کامیاب ناکا

محمد خلیق ابراہیم لکھنؤی

سدا دل اور بھرے بھرے جسم کی دلغریاں بار یک ساری سے بھوٹی پڑتی  
تنبیں، وہ ایک اندازِ استغنا کے ساتھ معروضِ لذت کا مطالعہ کر رہی تھی، اُسے  
شائشی کیفیت میں آئے چند ہی روز ہوئے تھے، جب شائشی کیفیت کا ہونا ر  
طابِ طم جو آج ہی چھٹیوں سے دلہن آ رہا تھا بھلتا ہوا ادھر نکل آیا اور  
بچ کے ایک کونے پر بیٹھ گیا۔ اندر کی محویت میں غفلت پڑ گیا، وہ معمول شرت  
تاپ آنکھیں اٹھیں۔ لبوں پر ایک شوخ ہنسی کھیل گیا۔ جیسی سے آنکھیں چار  
ہوئیں۔ دونوں کے سینوں میں دفعتاً ایک ہلکا سا خیر میل چمک گیا جس طرح  
سورج کی کرن اس کو اپنے میں جذب کر لیتی ہے، اسی طرح دونوں کے دل  
ایک دوسرے میں پیوست ہو گئے، جذبِ محبت دونوں میں اس طرح ابھرتے  
لگے جس طرح کسی گہرے پستے سے پانی اُبلتا ہے، دونوں کی دوستی بہت  
خوشیوں و حسین لڑائیوں اور لڑکیوں سے تھی مگر اس وقت نظروں کے  
ملاپ نے دونوں کو ایک بالکل نیا تجربہ کرایا، بالکل نئی سرگرمیاں اور  
احساسات ابھر آئے، بیک نظر عاشق ہونا نئے آئے تھے لیکن یقین نہ تھا،  
اب عملی تصدیق ہو گئی،

دونوں بات چیت کرنے کو چاہ رہا تھا، اندر انہی انسوانیت  
اور جفا کی وجہ سے بات کرنے میں سبقت نہ کر سکی جمہلی مرد ہوئے کی وجہ سے

(۱)

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ محبت کبھی کامیاب نہیں ہوتی، راجن کہتے ہیں  
کہ ہوتی تو ہے مگر شذر میں جو پریم کہا فی اس وقت بیان کر رہا ہوں اس میں  
محبت کامیاب بھی ہوئی اور محبت ہی جلد یہ کامیابی غرورِ اندوہ میں بھی تبدیل  
ہو گئی، یہ ایک سبب تھا ہوا شعلہ تھی جس سے کچھ عرصہ تک تو کبھی کی سی دم نہ  
نہ نہ ہی اور صاف شفاف روشنی ظاہر ہوئی، لیکن بہت جلد اس کی لطافت  
ختم ہو گئی اور تیز و تند ہوا میں بھڑکتے ہوئے لال لال شعلے کی گرمی نے وہ  
معتوم دونوں کو گھٹا کر ان کی زندگیوں کو جھمک کر دیا۔

وہ ایک خوشگوارہ دلغریاب شام تھی۔ گرمیوں کی پُرفشا شام۔ ہندوستان  
کی گرمیاں ناقابلِ برداشت ہیں۔ مگر یہ سیم گرمی کی شائیں سستی پیدا کرنے والی  
فشا لگتی ہیں۔ شائشی کیفیت کے بورڈنگ ہاؤس کے باہر لان (Hall) میں  
بہ وہ خوش نصیب طالبانِ علم بلبلا دے ہوئے سب سے ادھر بھی کھین خوشبودن  
میں بھڑکتی ہوا کا لطف اٹھا رہے تھے جو شاعرِ اعظم حکیم نیکو سے اسباق  
فطرت کا دیس لیتے تھے۔ قریب کی ایک بچ پر جو چاروں طرف خوشنما ہوا  
کی کہاںوں سے گھری ہوئی تھی، ایک حسین دوشیزہ نیم دراز انہی سپاہ  
اور رقتیں آنکھوں کو حکیم نیکو کی تعریفِ نثر پر جھکا دے ہوئے تھی، اُس کے  
نہ نیکو کی من کتاب کا نام لیکن عملی ہے، نیا دھنچور نے اس کا رد و رد جو عرض لڑکے نام سے کیا ہے۔

جرات کرگیا۔ اُس نے پوچھا، آپ عوضِ نذر پڑ رہی تھیں شاید  
اندر۔ جی ہاں، بہت عمدہ کتاب ہے، مجھے بھی پسند ہے۔  
جھلی۔ جی ہاں، یہ بھی پسند کئے جانے کے قابل (ڈراؤٹ کر)  
آپ کا غالباً نیا داخلہ ہوا ہے؟

اندر۔ جی ہاں، کوئی چھ سہات روز ہوئے۔  
جھلی۔ جی آپ کو آج پہلی بار دیکھا۔ میں جتنی لے کر گھر گیا ہوا تھا۔  
(تھوڑی دیر کے بعد)۔ اچھا، اپنا تعارف تو کرایے۔

اندر۔ میں ادا ہادی دیکر رہنے والی ہوں۔ میرے والد بہت بڑے  
تاجر تھے۔ تین ماہ ہوئے وہ دس لاکھ کی جائیداد میرے نام چھوڑ کر اس دنیا  
سے سدھار گئے (اُس کی آنکھیں نناک ہو گئیں) میری والدہ کامیری خیر  
خاں کی کے زمانے ہی میں مشغول ہو گئی تھی۔ میرے بہت دور دراز کے  
چند عزیز ہیں۔ مگر اُن سے اور والد سے جانتے کس بات پر ہمیشہ لڑائی  
رہی۔

جھلی۔ تو اب آپ تعمیرِ حال کرنے کے لئے شانتی نکلتی آگئیں؟  
اندر۔ جی ہاں، میرے والد کو میری تعلیم کا بڑا خیال تھا، پارسل  
جب میں نے الیف لے لیا تو اُن کا ارادہ شانتی نکلتی سمجھنے کا تھا مگر  
زندگی نے یہ فائدہ ہی نہیں دیا۔ اُن کی خواہش پوری کر دی۔  
جھلی۔ بہت اچھا کیا آپ نے، شانتی نکلتی واقعی شانتی نکلتی ہے،  
اس طرز کی درسگاہ ہندوستان تو کیا دنیا میں شاید ہی ملے۔  
اندر۔ جی ہاں، مگر اپنا تعارف کرایے۔

جھلی۔ مجھے جھلی کہتے ہیں۔ مجھے یہاں دوسال ہو گئے۔ میں ڈاکٹر  
جعفری ڈی مالٹ کا لڑکا ہوں۔  
اندر۔ ڈاکٹر جعفری مشہور کانگریسی لیڈر؟  
جھلی۔ جی ہاں۔

اندر۔ آپ کی تعریف بھی میں یہاں بہت سُن چکی ہوں، بڑی  
دش قسمتی ہے جو آپ سے ملاقات ہوئی۔

جھلی۔ خوش قسمتی تو میری ہے جو آپ مجھے جو سعادت و پاک سیرت  
وشیرہ کی دوستی نصیب ہوئی۔ (اندر کے چہرہ پر سرخی دوڑ گئی)  
اندر۔ (شرما کر)۔ یہ آپ کا سچا فن ہے ورنہ میں اس قابل کہاں؟

جھلی۔ غضب کرتی ہیں آپ، آپ اس قابل نہ ہوں گی تو اور کون ہوگا۔ (اندر)  
نے شرما کر نظر نہ اٹھا کر لیں۔)

اندر۔ آپ کو زیادہ شغف کن فنون سے ہے؟

جھلی۔ شاعری سے، گو خود شاعر نہیں ہوں، ہاں۔ فخرِ عزت رہے کہ شاعر  
مطالعہ صحیح طور پر سمجھ سکتا ہوں۔ مجھے ہجر، خیام اور میر حسن بہت پسند ہیں؛  
کالج میں میں لیک شاعری، بطور امتیازی عنوان سے ہوتے تھے۔ کچھ روز دین  
کلاسیکل شاعری کا بھی مطالعہ کیا۔

اندر۔ ہجر اور خیام کے کیساتہ میر حسن کا نام لینا آپ کے فطری ذوق پر  
وال ہے۔ مجھے میر حسن انہیں سے زیادہ پسند ہے۔ اُس کی ایک شاعری ہزاروں  
دیوانوں پر بھاری ہے، اُس کی شاعری کے لکھی اشعار ہر مسرت لکھتے ہیں مثلاً  
شاہزادہ کے ہوش آنے پر پری کا کہنا ہے

ابھی تک تو میرا تھا تیرا نہیں پر اب گھر پر تیرا ہے میرا نہیں  
تعلیق سے متغنی ہے۔ لوگ ایتس و تیر کے آگے میر حسن کو کچھ نہیں سمجھتے، اکثر  
کے ذوق کے خلاف کوئی بات زبان سے نکال کر بڑی جرات کا کام ہے، اپنے  
بڑی جرات و بہت سے کام لیا جو ہر کے ساتھ میر حسن کا نام لیا۔

جھلی۔ بڑی خوشی ہوئی کہ آپ کا اور میرا ذوق اتنا یکساں ہے؟  
اندر۔ مجھے بھی بہت سرت ہوئی کہ آپ کو شاعری سے اس قدر دلچسپی ہے  
یہاں چھ سات روز میں مجھے کوئی اپنا خیال دوست نہ ملا۔ اب آپ سے  
بڑی پُر ملت صحبتیں ہا کر میں گی۔

جھلی۔ مجھے بھی یہاں آپ کا ایسا صحیح ذوق رکھنے والا کوئی شخص نہ ملا۔  
دو سال کے بعد آج آپ مجھے صحیح و بلند ذوق رکھنے والی خاتون سے ملاقات  
ہوئی۔ اب شانتی نکلتی میں بغیر زندگی بڑی پُر ملت گزرے گی۔

اندر۔ اے عوفیا، شاعری کے باب سے میں آپ کی کیا رائے ہے۔  
جھلی۔ لا حول و لا قوت

اندر۔ یہ معلوم کرنے کو تو پوچھا تھا، مجھے بھی اس پر زہ لگتی ہے  
سخت نفرت ہے۔ مگر مراد آبادی کا کام شروع سے آرتھک بہترین ہوتا،  
اگر وہ صرف اس طرح کے اشعار کہتے

مہنسی پھر اڑنے لگی عشق کے فسانے کی  
لقاب اٹھاؤ بدل و دفعتاً زمانے کی

بہنا یا دور انداز کے کہو کی طرٹ روانہ ہوا۔ فضا جید خوشگوار تھی۔ بجلی بجی  
جیسا ہی ہوا ہوا لوگوں کی خوشبوؤں میں سی ہوئی۔ دماغوں کو تازگی اور  
دلوں کو فرحت پہنچ رہی تھی۔ ہر سہرے صبحے پودوں پر برسے ہوئے پانی  
کی بوندیں آباد رویتوں کی طرح جھک رہی تھیں۔ انداز اپنے بازو پر سر رکھ  
کھڑکی کے پاس کھڑی ہوئی بازو بہلہاتے ہوئے سبزے پر پانی کی ٹھنی ٹھنی  
بوندوں کے خوشگوار ششدر کا لطف اٹھا رہی تھی۔ اس کا چہرہ رنگارنگ کیفیت  
کا حامل تھا۔ جیسی جگے اُس کے پاس کھڑا ہو گیا۔ اُس نے سہلی پر ایک  
ٹکھا و غلط انداز ڈال کر آسمان کی طرٹ دیکھا۔ پھر اپنی نظریں جیسی پر گھاڑیں  
جیسی نے اُس کی آنکھوں میں موتی جیسا ایک آس جھلکتا ہوا دیکھا وہ اس  
منظر کی تاب نہ لا سکا۔ بے اختیار وہ انداز کے سامنے دوڑا فو ہو گیا۔  
اس کا ہاتھ اسے دوڑاں ہاتھوں میں سے کرے درپے بوسے لینے لگا۔

جسبیل (تھمرائی ہوئی آواز میں) اندرا۔ میں تم سے پریم کرتا ہوں۔ (اے)  
دفتنا! انہما بہ محبت نے اندرا کو ایک وقفہ کے لئے خوشی سے سرشار کر کے  
بالکل مجس کر دیا)

جیسی۔ لہو، اندھا بولو۔ میں تم سے پریم کرتا ہوں۔ تم کیوں نہیں پڑھتیں؟

انہارنے اب جھلی کے دو وزن ہاتھوں کو بکڑ کر اُسے اپنے پاس ایک عوف پر بیٹھایا۔ اپنی مرضی میں باہیں اُس کی گردن میں حمالہ کر دیں۔ ایک آنسو اب بھی اُس کی آنکھوں میں جھلک رہا تھا۔ مگر محبت اور پریم کا مقدس مسرت انگیز آنسو۔

اندر اجمعی پیا رسا بہتہا حسن پہی ہی نظرمیں اپنا کام کر گیا تھا، اسی  
روڑ سے میرے دیدہ و دل میرے نہیں بلکہ بہتہا سے جو گئے ہیں۔ شرم و حیائے  
میری زبان کھلنے نہ دی۔ مگر میں اس کی گرز و مند ہی تھی کسی طرح نہ  
داری کا یہ حجاب ہمارے درمیان سے اٹھ جائے۔

جسبلی :- اذما پیاری! مجھے پورا یقین تھا کہ میرا پریم یکطرفہ نہیں ہے  
(آسمان کی طرف سر اٹھا کر) اے اللہ! میں کتنا خوش قسمت ہوں۔

اُس نے اندرا کی کمر میں اپنے قومی بازو کا تھام لیا اور اُسے اپنے  
 آغوش میں کھینچ لیا۔ اندرا نے بھی اپنے جسم کا تھام لیا اور کھینچ لیا۔  
 دوزخ و تازک پتھر کیوں والی تیر شگفتہ گلاب کی کسی کھلیاں ایک دوسرے

تقسیم کے ساتھ سبکی کعبہ اس طرح چلی  
یہ نشہ بھی کیا نہ ہے کہتے ہیں جسے حسن  
نظر میں پھر گئی تصویرِ آشیانے کی  
جب دیکھئے اک نیندیا آنکھوں میں بھری  
لیکن اس طرز کے اشارے کو کہ

مجھے تلاش کر اسے بے خودی شوق سجدہ  
تو سامنے ہے سہمی ہمتا کو کہاں ہے  
مٹھائے دل در دوسرے محبت  
اُن کے کلام میں سہی خرافات کا ایک حصہ شامل کر دیا ہے۔

جبلی :- اے مائرا! اللہ آپ کی فکر بہت وسیع ہے، اور کیوں ہوں، بھلا ہر  
اور غلام کے پسند کرنے والے کی نگاہ میں ان خرافات کی کیا حقیقت ہو سکتی  
ہے! آپ کا مجھ سے پرچھنایا بیچارہ کون صوفیانہ شاعری کو کیا سمجھتا ہوں۔  
اندر! یعنی لوگ صوفیانہ شاعری کی طرف اندازہ میں بڑے غلو سے کام  
لیتے ہیں، میں نے کہا کہ آپ کا عندیہ معلوم کروں۔  
جبلی : بہت اچھا کیا آپ نے۔

(F)

اسی طرح پانچ چھ بیٹے گزر گئے۔ دولڑ میں روزانہ دلچسپ مہلی ملاقاتیں ہوا کرتی تھیں۔ مگر اپنے دل کی بات ظاہر کرنے کی ابھی تک کسی کو جرأت نہیں ہوئی تھی۔ شادی کچھ مہینے میں غنیمت غالب بلوں کی طوٹ سے مایوس ہو گیا کہ ایک عاشقانہ سوشل ڈراما دکھایا جائے والا تھا۔ اس میں ہیرو اور ہیروئن کے پارٹ جمیلی اور انڈرا کو دے دیے گئے۔ رہنمائی شروع ہوئی، دولڑ کے جذبات محبت اور زیادہ ابھر آئے۔ خاص ڈرامہ دکھانے کی رات آئی۔ ڈرامہ دکھایا گیا۔ حکیم بیگم نے سید جمیل کو دیکھا۔ جمیلی اور انڈرا کا پارٹ بالکل فطری رہا۔ اور کیوں نہ بہت۔ دولڑ کے دل ایک دوسرے کی حقیقی محبت میں سرشار تھے، شادی کچھ مہینے کی طوٹ سے دولڑ کو انعام میں سمجھتے تھے۔ تین بجے ڈرامہ ختم ہوا۔ جمیلی اور انڈرا دولڑ کے جذبات سیدھی اُبھر آئے تھے۔ دولڑ کے دل مہرے ہوئے تھے اس خوف سے کہ کہیں دولڑ کے یہ طوفان اک دم ٹھہر نہ جائیں دولڑ فوراً اپنے اپنے کمرؤں میں چلے گئے۔ ابھی رات میں کسی کو غینہ نہ آئی۔ ڈرامہ کے پیرامیٹرز دولڑ میں بیکر آجائے رہے۔ جذبات محبت کا اثر زور و شور سے دل و دماغ پر چھایا گیا۔ پچھلے کو تھوڑی سی بارش ہوئی، صبح آسمان بالکل صاف ہو گیا۔ تڑکے اٹھ کر جمیلی

میں پیوست ہو کر رہ گئیں۔

(۳۴)

اس واقعہ کے بعد شام کو جب دولان میں ملاقات ہوئی تو گنگو کا مہموزہ محبت مہتا، اندرا بولی جمیلی پیارے لوگ کہتے ہیں کہ محبت سراسر لطیف و پاک ہوتی ہے، اگر ایسا ہے تو یہ آخر میں لینا یا پیار کرنا کی معنی رکھتا ہے، سرفراز و مستحق کو بھی کرتے دیکھا اور سنا۔ اس کے تو یہ معنی ہونے کا یا حقیقی محبت کا جو دہی نہیں یا محبت کا مفہوم بالکل غلط ہے۔

جمیلی۔ ہاں پریم، دراصل مفہوم غلط ہے۔ ایک طرف تو محبت کو سراسر لطیف و دلہانہ ماننے والے لوگوں کا گردہ ہے، دوسری طرف اس کو سراسر گندگی کے آلودہ ماننے والے لوگ۔

مشہور ادیب علامہ عبدالوہابی اپنے ایک افسانہ مرد، عورت اور دنیا میں لکھتے ہیں کہ پانی میں کنکر ڈالو تو دائرے پیدا ہوتے ہیں۔ اسی طرح غلط محبت منہ سے نکالنے سے مختلف دائرے پیدا ہوتے ہیں۔ مثلاً محبت و مرد کی نظموں کا چار ہونا، بیک نظر عاشق ہونا، ملاقات ہونا، پیٹنگ ہونا اور بے تکلفی ہونا، انہار محبت، شادی، وصل حاصل ہونا، پھر آخر میں گلے میں کوڑ چر خانہ کوئی اچھا منظر پیش نہیں کرنا، کتنا بھارتیہ ہوا اور صبح یہ جلد ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ محبت نہ صرف پاکیزگی ہی پاکیزگی ہے اور نہ صرف خواہشات نفسانی کا نام۔ ایک روز مشہور جرمن شاعر گوٹے اور اس کی محبوبہ شارلٹ ایک کمرے میں بیٹھے تھے، شارلٹ کسی کام سے ذرا دیر کے لئے اٹھ کر باہر گئی، گوٹے اپنی جگہ سے اٹھا اور اس جگہ کے پے در پے دوسرے لینے لگا، جہاں شارلٹ بھی گئی تھی۔ یہ وہاں محبت، مگر یہ کہنا غلط ہے کہ گوٹے کو شارلٹ سے بالکل بے لوث اور خواہشات نفسانی سے پاک محبت تھی، اسکی ساتھ ساتھ یہ خیال بھی غلط ہے کہ محبت کا منہا نہ چر خانہ اور ایک لودا بچہ کا ٹیپوں ٹیپوں کرنا ہے، محبت محمود ہے لطیف اور کثیف دونوں عناصر کو جس طرح انسان نظر ہے برائی اور اچھائی دونوں کا، اور جس طرح سے انسان کو برائی اچھائی دونوں کا منظر ہونے سے اثرات المخلوقات بنا دیا، اسی طرح جذبہ محبت کو لطیف و کثیف دونوں عناصر سے مرکب ہونے کی وجہ سے بہترین جذبہ قرار دیا گیا۔

اندرا۔ بڑے ذہین جو قہجیلی۔ میں نے اس پر بہت غور کیا مہتا، مگر کچھ دیکھی تھی، اب جو تم نے اس کا تجزیہ کیا تو سب کچھ سمجھ میں آ گیا۔ میں تم پر کیوں نہ فخر کروں؟ قہجیلی۔ اور مجھے تو پتہ ہے، سب سے زیادہ خوشی اس بات کی ہے کہ ہم میں مذہب کے اختلاف کے باوجود جذبات محبت نے ٹھوکانا پائی اور اب ہم شادی کر کے ہندوستانی مناسخی اور معصیت سے بھری ہوئی منسا میں ایک انقلابی قدم اٹھانے میں کامیاب ہوں گے۔

اندرا۔ اچھیلی پیارے، مجھے بھی اس کی بڑی خوشی ہے۔ مذہب کی ظاہر داری سے میرے تن بدن میں آگ لگاتی ہے، ہندوستان میں شادی نہیں رشتہ محبت قائم نہ ہو حقیقی الفت قائم نہ ہو۔ کیوں؟ اس لئے نہیں کہ ان دولان میں سے کوئی ایک انسانیت سے خارج ہے۔ بلکہ اس لئے کہ خدا کو دولان دو مختلف طرز عبادت سے پوجتے ہیں، مذہب جو امن و سلامتی، ہمدردی و محبت کا پیغام لے کر آیا تھا، آج قتل و غارتگری، بیدردی و نفرت کا باعث ہے، مصلیٰ، بدھ، کرشن، اور محمدؐ کی رو میں کیا خوش ہوتی ہوگی، جب وہ شیعہ سنی، ہندو مسلم، مسلم عیسائی فسادات کے منظر دیکھتی ہوگی، وہ انسانیت جس کی تبلیغ کرنے کو آئیں محمدؐ آئے تھے دنیا اس کے وجود سے خالی ہے۔

جمیلی، ہائل ٹیکہ کتنی ہو تم، اندرا پیاری! ان جنت و جہنم کے خود ساختہ ٹیکیداروں کے دراصل یہ سب ہیں، بوسے ہوئے ہیں، اسکی کے ساتھ ساتھ سرمایہ داروں کا بھی جہان رنگ روٹوں کے ہاتھ کاٹھونا میں بہت بات ہے۔

اندرا۔ پی کی محبت تو منافرت اور دندگی کے رہنما ہیں، اگر اپنی یہ حیوانی حرکات چھوڑیں تو مالویت، مولائیت، پرمانندیت اور جانتیت کا ٹھکانا ہی کہاں ہے۔

جمیلی۔ بڑی عجیب بات کہی ہے تم نے، خدا کا شکر ہے کہ میرے والدین خرافات سے پاک ہیں، جی میں انھیں بے حد چاہتا ہوں۔ تو سے شادی پر والدہ مزور تھا ہوں گی، مگر والد سب ٹیکہ ٹھاک کر لیں گے، ہم کہتے خوش نصیب ہیں اندر کہ ہادی راہ میں زیادہ روڑے نہیں ہیں، ورنہ تم جانتی ہو اس طرح کی شادیاں قریب قریب ناممکن ہوتی ہیں۔

نہ امر اور ٹکٹ ہی ہے۔ خ۔

عرسے کے بعد سب کے سب آپ ہی آپ روٹھ گئے۔ والد نے بھی کہا کہ چلو اچھا ہوا۔ ان روز روز کے نام دھڑلے والوں سے فرصت ملی، ایک بڑے بھلے قصبہ سنو، انھیں رشتہ داروں میں سے ایک صاحب سے والد سے کسی بات پر جھگڑا ہو گئی۔ والد نے کہا خیر۔ آپ اپنے گھر خوش، ہم اپنے گھر خوش، شام بغیر باسلامت" چھوٹے ہی وہ صاحب بڑے ہاں تم تو ادھر ہی ہو، بات بات پر وہی ملکوں کے مسئلے مسئلے" جھگڑا۔ تعصب ہر مذہبی شخص میں آج کل ہے۔ مگر ہندوستان میں جس اذیت کے طرز کا تعصب ہے اس کا دوسرے ممالک میں وجود ہی نہیں ہے اور خدا کرے ہو۔

اندر ا جی بی بی سے تعلیم کے فارغ ہو کر ہم دونوں اپنی زندگی انھیں اصلاحات کے لئے وقف کر دیں، کیوں کیسا خیال ہے؟ جی بی، اہمیت مبارک خیال ہے۔

(۴)

اسی طرح تین سال کا عرصہ گزر گیا، دونوں کی محبت زیادہ دہانہ ہوئی گئی۔ ہر وقت دونوں ایک دوسرے کے خیال میں محو رہتے تھے، دونوں ایک دوسرے میں جذب ہو کر رہ گئے تھے، ان کی جھگڑا بہت دلکش و دلچسپ ہوتی تھیں، اب کسی کو تعلیم سے فراغت حاصل ہو گئی، اندر نے جو کچھ اس لئے دو سال بعد واپس کر لیا تھا، اس لئے ابھی اس کو فراغت میں دو سال باقی تھے، شادی نکیتن میں تعلیمی زمانہ میں شادی ممنوع تھی، اس لئے ابھی دونوں کی شادی بھی ملتوی تھی۔ جی بی نے اندر کے اصرار سے یہ دو سال کا عرصہ بھی شادی نکیتن ہی میں شادی کے سلسلہ میں گزارنے کا ارادہ کر لیا۔ باپ سے اجازت منگائی۔ وہ علم کے بڑے شائق تھے، اپنے بیٹے کو بہترین عالم و فاضل دیکھنا چاہتے تھے اس لئے دو سال تک اور لڑکے کو اپنی آنکھوں سے دور رکھنے پر راضی ہو گئے۔

اب جی بی کا طرز زندگی بالکل بھرا ہوا تھا، دماغی فائدہ تھا، وہ اندر کو پورے جوش و خروش کے ساتھ چاہتا تھا، اس کو اندر کا محبوب اور اس کا ہونے والا شوہر ہونے پر فرخ تھا۔ وہ یہ جانتا تھا کہ اس کی اندر ابھی اس لئے ایک عظیم شخصیت کی مالک ہے۔ اندر کی محبت بھی اس کے ساتھ کچھ جوش و خروش کی بجائی، اس کو بھی فرخ تھا کہ جی بی کا ایسا شخص اس

اندر۔ اور میری کوئی اعتراض کرنے والا ہے ہی نہیں۔ چند دور کے رشتہ دار بھی سوچتے ہی سے روٹے بیٹھے ہیں۔ جی بی، مگر جن کو ہم سے کوئی سروکار نہیں ہے وہ زیادہ غور و غفلت کریں گے۔ جلد سن لیا کریں گے۔ اور یہ معلوم کیا گیا کریں۔

اندر۔ تو ہم ان کی بات پر کان ہی کب دھرتے ہیں۔ جی بی، جب ہم تعلیم ختم کر کے اک دم شادی شدہ دہلی پہنچ جائیں گے تو اتنا جان اس شادی پر کتنے خوش ہوں گے۔ دوڑ کر بھیے اور نہیں دونوں کو لپٹا لیں گے۔ تم سے بھگتا نہ لگتا کریں گے، اماں جان تم سے اگر نہیں بولیں گی تو ان کو ڈانٹیں گے۔

اندر۔ اور میں تمہاری اماں جان پر اپنی معصومانہ ڈیڑ بالی آنکھوں سے عجیبانہ نظریں جھا کر ان سے منت کر دوں گی، انھیں مناؤں گی۔ وہ ضرور من مانیں گی۔ پھر ہماری زندگی کسی بڑے بھلے گزرے گی۔

جی بی، خدا ایسا ہی کرے۔ اماں بڑی تعصب اور کٹر مسلمان ہیں، مجھے شادی نکیتن سمجھنے کی صورت اس لئے مخالفت تھیں کہ ڈاکٹر لیگور کا قیام کیا ہوا ہے اور لیگور ہندو ہیں

اندر۔ مگر جب ابھی قدر سنائی شخص کو نرم نہیں کر سکیں گے تو اور کیا کر سکیں گے؟ میں ان کو سمجھاؤں گی۔ ان کے پاؤں پڑوں گی۔ ان کے پاٹ جاؤں گی۔ آخر وہ بھی عورت ہیں اور عورت کے جذبات سے واقف، اپنی جان پر سے راضی ہو ہی جائیں گی۔ چاہے بادل ناخواستہ ہی کیوں نہیں۔

جی بی، ہاں راضی تو ہو جانا چاہیے، انھیں، رہا یہ کہ وہ عورت کے جذبات سے واقف ہیں، غلط ہے، وہ عجیب الخلق عورت ہیں۔ تمام دوسری عورتوں سے الگ تھی۔ اور خدامت پرست جاہل عورتیں تو سب ہی ایسی ہوتی ہیں۔

اندر۔ ہاں میری دور دراز کی اکثر رشتہ دار عورتیں ایسی ہی ہیں۔ اور دراصل وہی اصل وجہ میرے والد اور دوسرے رشتہ داروں کے جھگڑے کی ہیں۔ میرے والد۔۔۔۔۔۔ میری والدہ کو لے کر اٹھلٹان گئے تھے۔ وہاں سے واپس کیا ہوئے ہیں ادھر ہی ہو گئے۔ برادری نے حقہ پانی بند کر دیا۔ پھر بھی کچھ رشتہ دار ملنے بیٹھ رہے۔ لیکن تھوڑے

سے غرض نشا وہے کس روسیاہ کو  
اک گونہ خودی مجھے دن رات چاہئے  
کی تفسیر ایک ہی چیز کیسے کیسے رنچ پٹتی ہے۔ اسٹیاری کی حیثیت نفعہ نظر  
کے ساتھ تبدیل ہوتی رہتی ہے۔

مجھے تو پسند اور مجھوں کو پسند نظر اپنی پسند اپنی  
یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ جہلی کا درست سریندر مکمل آیا، باقوں میں  
فضل پڑ گیا، سریندر نے پوچھا کہ جہلی، آگے کیا کرنے کا ارادہ ہے؟  
جہلی، ملک اور زبان کی خدمت،

سریندر۔ زبان کی خدمت تمہارے لئے مناسب ہے۔ ملک کی  
خدمت کے لئے کسان اور مزدور بنائے گئے ہیں مذکورمیا مالی دماغ۔  
جہلی۔ شانتی ملک میں رہ کر تمہارے یہ خیالات امیرا دل چٹا جاتا ہے،  
سریندر۔ واہ میں نے تو زمین فطری بات بتائی ہے۔ فطرت نے تم کو پیش  
دعوت کے لئے تخلیق کیا ہے، مذکور کالیف و مسائب اٹھانے کے لئے۔ اگر  
اُسے تم سے یہ پوچھ لیا کہ کام کرنا ہوتے تو وہ اتنی مزدور بنائی۔ مالی دماغ  
نہیں۔

جہلی۔ تمہاری ذہنیت میں مجھے علم انقلاب رونما ہوتا معلوم ہو رہا ہے۔  
کسان اور مزدور کی انسانیت سے گرے ہوئے ہیں؟ کیا وہ ہمارے ہی  
پیسے آدمی نہیں۔ رہائش و عشرت کا غلغلا تو میں اپنے لئے تو کیا اُسے  
کسی شخص کے لئے بھی مناسب و بہتر نہیں سمجھتا، سکون و اطمینان اور پیش و عشرت  
کی تلاش موت کے آثار ہیں۔ ہر چیز اپنی جہیز بننے کے لئے ترکیب پا رہی  
ہے، اس تحت میں ہم ملکہ ساری کائنات ٹہنک ہے جو پیش و عشرت و دولت  
وہ اس دنیا کے لئے بیکار ہو گیا۔ اُس کے اجزا ترقی کرنے سے معذور ہو گئے،  
خدا کا حکم انسان کو اور نہ صرف انسان بلکہ تمام کائنات کو یہ ہے کہ آگے  
بڑے جاؤ۔ یہی عقیدہ ہے اور یہی آخوت۔ اس کے علاوہ سب دل بہلانے  
کے دسکوسے موجودہ سائنٹیفک ایجادات ایک نئی زندگی کا پیش خیمہ  
جو انقلاب اور ترقی کی حامل ہے، پھر آئے والی نسلیں اس سے بھی افضل و  
برتر دور زندگی کے لئے کوششیں کریں گی، یہی ہوتا چلا جائے گا، یہاں تک  
کہ نظام کائنات درجہ درجہ ہو جائے۔ مگر یہ ایجادات ترقی کی راہ میں صرف با  
برواری کے خیر ہیں۔ اصل ترقی انسانیت کی ترقی ہے۔

عاشق، محبوب اور ہونے والا تو ہر ہے جہلی کو اپنے باپ سے جید محبت تھی،  
لا انتہا محبت، باپ بھی اُسے جید جانتے تھے، اُن کی محبت کو جہلی کی نئی دنیا پر  
قبضے دبا دیا تھا، یہ نہ تھا کہ باپ کے دیکھے کو اُس کا دل نہ چاہتا ہو۔ باپ  
سے ملنے کی بھی خواہش تھی اور اندر کو بھی نہیں چھوڑا تھا تھا۔ باپ سے دو  
سال بعد وہ دل کو لے کر ہی گیا اور اندر اُس کے پاس ہی تھی، کیا  
ایک دل میں بیک وقت خود خواہشات نہیں ہو سکتیں؟ اور اگر ایک ہی دل  
پوری کر لے تو کیا یہ سمجھا جائے گا، کہ دوسری طلب کمزور تھی؟ انسان کی طبیعت  
کے دوسرے اور جذباتی نفعی نہیں ہوتے، اس لئے یہ کہنا کہ باپ کی محبت  
کو نئی کیفیت تعلقی نے دیا دیا تھا صحیح نہیں۔ ان کیفیت کا بھی زور تھا اور  
اس محبت کا بھی، اسی وجہ سے کہا گیا کہ جہلی کا ظریف زندگی لب لباب بھرا تھا،  
ظرف زندگی کا نہ بھرا ہوا نصیب ہے، اور ناقابل برداشت مصیبت۔ مکمل  
انسانی زندگی وہی ہے جو اذواق و خواہشات و جذبات سے بھری ہوئی  
ہو، اذواق انسان کو مستغولی کا رکھتے ہیں اور خواہشات و جذبات  
سرو پیدا کرتے رہتے ہیں۔

(۵)

ایک روز اپنی شام کی دلچسپ ملاقاتوں میں سے ایک خوشگوار ملاقات  
میں اندر اسے کہا۔ جہلی پیارے کچھ بھی ہو محبت کا عقودہ لاغیر معلوم ہوتا  
ہے۔ نئے نئے سوالات دماغ دل سے کرتا ہے۔ مگر جواب قریب قریب نہیں  
ہوتا ہے۔ مثلاً اسی کو کو کہ یہ کیا کہ ایک شخص صرف ایک ہی سے محبت کرنا  
ہے۔ اُسی کا نام چپکے چپکے زور زور ہر وقت در زبان رکھتا ہے۔ وہی نام  
دل کی گہرائیوں سے اس طرح اُٹا کرتا ہے جیسے گہرے کنویں کا سوتا، پھر  
اگر کوئی یہ سمجھتا ہے تو صرف ایک یا دو انسان ہی کیوں اُس سے محبت  
کرتے ہیں۔ ساری دنیا اس کو کیوں نہیں چاہتی؟

جہلی۔ اندر پیاری، یہ کوئی عقودہ لاغیر نہیں ہے، ذرا غور کرو ضرور  
ہے۔ تمہارے اس سوال کا جواب صرف یہ ہے کہ ہر شخص اپنی مخصوص پسند  
رکھتا ہے، تم جو کچھ میری نظر میں ہو کیا اپنے والد کی نظر میں بھی وہی تھیں؟  
وہ بھی کی تو بل عام لال کے لئے تو مذہب ہیں، مہا تپا کا مذہبی کے نزدیک  
ایک ذات ہے جس میں سب سچے سمجھتے ہیں زیادہ زہریلی کوئی چیز بند ہے مرنی  
عبداللہ جو کوشش کر دینے والا نیال اور کسی کے لئے ہے

مگر عوامِ محکم کے آگے کسی کی کچھ نہ تھی، ہندو مسلم برس کے لئے تو گویا ایک شگوفہات اگیا۔ ساتھ ہی ساتھ ملک میں چند خیر مقدم کرنے والے بھی تھے۔ انہارے معلوم ہو کر ڈاکٹر جعفری نے جمعی کو مبارکباد کا خط لکھا اور لکھا کہ اندرا کو کیڈ فوراً پٹے آؤ۔ دیکھنے کو جید بھی چاہتا ہے۔ ہتھاری والدہ کو جید بچہ ہے۔ اور تم سے بہت خفا ہیں۔ مگر میں انہیں سمجھاؤں گا۔ جمعی نے جواب دیا کہ ہم اسی نمونہ بنا کر آئیں گے، آپ والدہ سے کہئے کہ وہ ہمارے ڈر سے نہیں آتا۔ ایک آدھ ماہ بعد ان کی ماسا جوش مارے ہی گئی، اس وقت واپس پہنچا۔ تو کوئی جھگڑا بھگیرا نہ اٹھے گا، ڈاکٹر جعفری نے بھی اس رائے کی تائید کی۔ شادی کو تین ماہ ہو گئے، ڈاکٹر جعفری کا خط آیا کہ ہتھاری ماں کی طرح نہیں سمجھتی۔ مگر ان کو کہئے دو۔ زیادہ سے زیادہ تم سے اور اندرا سے ڈوبیں گی۔ اب فوراً پٹے آؤ جمعی نے لکھا کہ چند روز میں واپس ہوں گا۔ آنکی تار سے اطلاع دیدوں گا۔

اس روز رات کو جمعی نے کہا۔ اندرا بیاری جلد از جلد دہلی چلو۔ اندرا، تم نے ابھی سے زبردستی شروع کر دی۔ دہلی پہنچ کر اس میں اور ترقی ہو جائے گی۔

جمعی۔ مجھے اس بارے میں زبردستی کرنے کا حق پیدا ہو گیا ہے، کیا میرے اس حق سے نہیں انکار ہے؟

اندرا۔ میرے ہی خلاف مجھے سے شہادت لیتے ہو، یہ دوسری زبردستی۔ جمعی۔ میں جمعی کی شہادت دینے پر تیار نہیں ہوں۔

اندرا۔ جمعی کی ہوا بچی۔ میں شہادت دینے کی عادی نہیں ہوں۔ اچھا نہیں اس طرح تعین ہو کہ میں ہمارے اس حق کو مان لوں گی۔ اگر میں انکار کر دوں تو؟

جمعی۔ میں بہاد ہو جاؤں گا۔ میرے دل کی بستی ویران ہو جائیگی۔ اندرا تو میرے ساتھ زبردستی کرے میں ہتھارے دل کی بستی آباد ہے؟

جمعی۔ مگر یہ حق نہیں بھی میرے اور حاصل ہے، پھر شکایت کسی؟ اندرا۔ مگر میں تو اس حق کا مطالبہ نہیں کرتی؟

جمعی۔ یہ ممکن ہے اس وجہ سے ہو کہ میری محبت کا جذبہ ہتھارے جذبہ محبت سے قوی تر ہو۔

سریندر۔ تم اس انتہائی تخیل پر پہنچ گئے ہو، جہاں سے پھر راور است پر واپس آنا ناممکن ہے، انسان جب اپنے کو دوسروں کا ٹیکیدار اور ان کے مصائب کے غم کرنے کو اپنا فرض سمجھنے لگتا ہے تو اس کے ذاتی جوہر ختم ہو جاتا ہیں۔ میں تو سولینی کی فیلسر م کا مای ہوں۔ آخر انفرادی عظمت بھی کوئی چیز ہے؟

جمعی۔ بھی تم تعلقدار کے ارشے ہو، ہتھاری ایسی ذہنیت نہ رہو تو عجب ہے۔ ہا انفرادی عظمت، کوئی شک نہیں اس کے وجود میں۔ مگر اس کے یہ مسی ہیں کہ پرائفٹ عوام سے حقوق انسانیت میں ہلا کرے، ابو کر و غیرہ عظیم الشان انسان تھے۔ غلیظ تھے۔ لوگوں کے دلوں میں ان کی عظمت تھی۔ مگر حقوق انسانیت میں دوسروں سے ہلا کر تھیں تھے، ہندو مذہب سے تو مجھے واقفیت نہیں مگر اسلام میں محمد رسول اللہ کی زندگی خود انسانی مساوات و اخوت کا بہترین پیکر تھی۔ تم انسانیت کا در اپنے دل میں رکھنے والے کو کہتے ہو کہ اپنے کو دوسروں کا ٹیکیدار سمجھتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ تم انسانیت کے منہم ہی سے نہیں واقف ہو۔ اندرا۔ تعلقدار اور پھر دھوکے تعلقدار کا لڑاکا۔ انسانیت، اس کے منہم سے کیسے واقف ہو سکتا ہے؟

سریندر۔ جواب دے نہ بن پڑا تو امیروں اور تعلقدار کو گالیاں دینے پر اتر آئے۔ (ہنسکر) اچھا چھوڑ داس قصہ، کچھ اور مزے کی باتیں کرو۔

جمعی۔ میں تو خود تم ایسے کوڑ مزے بحث کرتے گھر آتا ہوں۔ خدا خدا کہے جان بچی۔

(۶)

اسی طرح سے دلچسپیوں اور دلفریبیوں سے کیسے ہوئے یہ دو سال بھی گزرتے جمعی نے اندر سے کہا کہ شادی نہیں کر کے دہلی میں تو اچھا ہو گا۔ اندر نے کہا کہ ہنسی نہیں منانا چاہیے۔ پھر حال چند دوستوں کے جبر میں دو دن رشتہ نکاح میں دلالت ہو گئے۔ حکم بگورنے دول کو دعائے ترقی دی۔ شہر کے ہندو مسلمان نے سخت احتجاج کے مگر جرمِ مسلم کرچا ہو وہ ان گیدڑ بھلیوں کی جہاں آتا ہے۔ خود یہ کہ شادی نہیں کیے ایسے ادارے کے بھی چند اشخاص اس مبارک شادی کے مخالفت تھے،

اندر۔ ابھی سے یہ شک اور بدگلی؟

جھیلی۔ اندرا پیار ہی مجھے دق نہ کر دو۔ خوش ہوئے دو۔

اندر۔ دہشکر اور جلی کو لپٹ کر نہیں پیار سے، میں نہیں کیوں دق کرنے لگی؟ یہ سوں ہی دہی چلو۔

(۷)

دوسرے دن رات کو جب اندرا اور جھیلی گھول میں جا رہی تھیں تو دکن میں کھڑے ہوئے تھے۔ اندرانے کہا۔ اگر اسی حالت میں ہرجاؤں تو میرا غائب ہونا ہی ہو گا؟

جھیلی۔ مگر میری حالت کیا ہو گی؟

اندر۔ پیار سے محبت خود غرضی کا عطر جو ہر ہے۔ جب ہتھاری محبت میرے دل میں جوش مارتی ہے تو مجھے اپنی ذات کے برابر کوئی ذات نہیں دکھائی دیتی۔ مجھے ہتھاری پیار کرنا نہیں اچھا معلوم ہوتا۔ جی چاہتا ہے خود ہی پیار کروں خود ہی لپٹوں۔ اس کیفیت میں جان کی طرف سے بے پروائی ہو جاتی ہے۔ جذبہ جان سے حرکت نہیں ہوتا، خود اپنے میں نئی جان پیدا کر لیتا ہے، جان تنگ جاتی ہے تو اپنی باگ جذبہ کے ہاتھ میں دیتی ہے، جذبہ جان پر حاوی ہو جاتا ہے۔ جان ایک بے حقیقت شے ہو جاتی ہے۔ یہ ایک عجیب وقت ہوتا ہے۔ ایک نیا عالم سامنے آتا ہے۔ ایک نہایت پر کیفیت عالم۔ اگر تو اس عالم میں ہو جائے تو یقیناً خستہ یا خیر ہو گا۔

جھیلی۔ تو کیفیت اندرونی کی تحلیل و تجزیہ خوب کرتی ہو۔ مگر عالم بیرونی کو قبول جانا اس تحلیل و تجزیہ میں کہاں تک صحیح ہے؟

اندر۔ عالم بیرونی کا تصور کیفیت اندرونی کا تابع ہے۔

جھیلی۔ کیا تم بوڈے لیر اور راتجو کی پیروی ہو۔ اس نئے اسکول کی طرح عالم کی کسی چیز کی صورت و حقیقت معلوم کرنے کی جستجو نہیں کرتی۔

اندر۔ میں کسی شخص اور کسی اسکول کی پیروی نہیں۔ پیروی کرنا اپنے ہاتھ سے اپنے پیروں میں بیڑیاں ڈالنا ہے۔ پیروی جو کچھ ہمیں آتا ہے اسی کی قائل ہوں۔ نظام قائم کرنا متحرک زندگی کو ساکن کر دینا اور اس میں جمود پیدا کر دینا ہے۔ میں اس سے متنبی ہوں کہ فلاں مذہب ہے، فلاں مذہب وہ ہے خیال کو فرم میں لٹکا کر بند کرنے سے میرے آگ گنتی ہے، گنیمت ہے،

اپر میزیم اسے کہتے ہیں۔ لبرلزم کے مقابل ایک دوسرا نظام خیال کنسروٹیزم ہے۔ میری طبیعت ان ازموں میں سے ہے۔ پیغمبر مذہب بنایا کرتے تھے یہ عالم ازمیں بناتے تھے ہیں۔ ان کی پیروی بھی مذہب کی پیروی سے کم نہیں ہے، انسانی زندگی خانوں میں بند نہیں کی جاسکتی۔ اصل بوجھ تو کوئی شخص بھی کسی مذہب کا پابند نہیں۔ ہاں تو بوڈے لیر اور راتجو کی شاعری فطرت پرستی اور خیال پرستی کی شاعری نہیں ہے۔ کیفیت پرستی کی شاعری ہے، مرکز عالم انسان کے لئے انسان ہے، اشعار کو صرف ان تحریرات سے غرض ہے جو انسان کے عالم کو دیکھنے یا تجزیہ کرنے سے اُن کے دماغ میں پیدا ہوں حقیقت عالم جلیقہ فضا اور سامان کی کوششوں سے معلوم ہو سکتی تو شاعری کو معلوم کرے گی، تم مجھے اسی لئے غور بناؤ اور پیار سے جو کہہ لے پاس بیٹھئے میری قلبی کیفیت میں بل چل رہی جاتی ہے، اگر میں ہتھاری تحلیل اور تجزیہ کرنے لگوں گی کہ ہتھاری حقیقت معلوم کرنے کی کوشش کروں گی تو میرا مزہ بھی خاک میں مل جائے گا اور ہتھاری حقیقت بھی ذرہ برابر معلوم ہو گی۔ جھیلی۔ اگر یہ بات ہے تو اس تھک کو جانے دو۔ میرے گلے کا جادو لکھیں یہ سادہ ہمارے ہتھارے درمیان ہو جائے کہ مزے کے وقت ہم دونوں میں سے کوئی مرے نہیں۔ مجھے نفسی، مرض اور صورت سے نفرت ہے، ہم تم جب دنیا میں نہ رہنا چاہیں تو عالم بالائی طرف اٹھنے چلے جائیں اور پھول کی خوشبو کی طرح ہوا میں غائب ہو جائیں۔ یہ طیب اور اُن کے کو اتھن اس کے بعد تجزیہ و تحقیق کے سامان مثل دینے والے اور گورکن یہ سب کئی نفرت انگیز چیزیں ہیں بصورت ہر دن پر رویش کھڑے ہو جاتے ہیں۔ زندگی سے انکا تعلق کیوں ہے؟ اس کا خیال دل بٹھا دیے والا ہوتا ہے۔

اندر۔ گریٹھیں کسی دیکھی دن بند ہو جاتے گی۔

جھیلی۔ لیکن آج اس صلف میں تو اس بات کو میں نہ ملاؤں گا۔ ہم ہمیشہ ہمیشہ ذلہ اور نہدرت رہیں گے۔ اندرا اور کبھی جب تک ہندوستان باقی ہے اُس وقت تک باقی رہیں گے۔ میری اندرا اور میرا ہندوستان۔ اس خشک کایں قائل ہوں۔ عالم کی حقیقت بس اسی تخلیق میں ہے،

اندر۔ میرے اور ہمارے خیالات کتنے یکساں ہیں گو کہ انداز بیان میں نہ میں آسمان کا فرق ہے۔ جھیلی تم بہت پیار سے ہو۔ (گلے لپٹ کے پیار کرنے لگتی ہے۔)

(۸)

اس کے دوسرے روز اندرا اور جمعی شام کی گاڑی سے دہلی کے لئے روانہ ہو گئے اسٹیشن سے جمعی نے ڈاکٹر جعفری کو اپنے آنے کا تار دیدیا۔ جس جہ سے تار سے پڑا کٹر جمعی سے کہا کہ کبھی اور اندراج کو نیچے پہاں پہنچ جائیں گے۔

جمعی۔ اُن سے اگر تم کو اپنی ثابت ہے تو الگ رکھنے کا سامان کرو۔ میرے گھر میں وہ قدم نہیں رکھ سکتے۔

ڈاکٹر۔ بڑی کٹر جو تم خدا کی قسم، اُن کے کی مانتا بھی نہیں رہی۔ جمعی۔ میرے بدلے تم کو مانتا ہو گئی ہے، اُس نے میرا بھیج دیا ہے۔ خدا ن بھر کے لئے جیسے سنا پڑتے ہیں۔ مایا نا، مایا، ایسی مانتا نہیں رکھتی، اُس کا نام سنکر میری آنکھوں میں خون اتر آتا ہے، کجنت، ننگاب، خاندان۔

ڈاکٹر۔ افواہ، انتہی عصبيت۔ جمعی۔ نہیں تو مذہب جو رُودوں۔ ریت رسم کو بلائے حلق رکھوں۔ میں لاف بیچنے کی خاطر اپنی غلطی معذرت خواہ کر دوں گی۔

ڈاکٹر۔ تم مذہب سے واقف ہی کب ہو۔ ریت رسم جانتی ہو پس۔ جمعی۔ اے لومنتا چپ رہو آنا ہی دباتے ہیں۔ اب ہم مسلمان بھی نہیں رہے۔ پھر کون خدا کا سوا را مسلمان ہے! دیکھو جی، اب کی تو کہا، اب نہ کہنا۔

ڈاکٹر۔ خدا کی قسم جاہل جمعی عذاب الہی ہے۔ ہندو عورتوں کو دیکھو۔ جمعی۔ ہاں ہاں عیاشی اور عاشق مزاجی ہی کے لئے تو گنا گری ہوئے تھے۔ لہو جمعی اب مسلمان پر وہ نہیں پھوسیتیں سے یہ ٹوٹی کافر بھی ہنسیاں جن کو نہ کچھ جیا ہے نہ شرم، ابھی ہو گئیں۔ ڈاکٹر۔ اچھی تم تو سجدہ گو تمغز ہو، اگر ایسا ہی ہے تو تم بیٹے ہو سے بات نہ کرنا۔ رہا یہ کہ میں اپنے گھر میں نہ رکھوں ناکم ہے۔ جمعی۔ اگر ایسا ہی ہے تو میری صورت نہ دیکھو۔

ڈاکٹر۔ دیکھو جی، ہتھاری چہالت اب ناقابل برداشت ہوتی جا رہی ہے۔ میں جو جاہلوں کا وہ ہو گا۔ تم میری جمعی ہو، مالک نہیں۔ تم کو میرا حکم ماننا پڑے گا۔

جمعی۔ آئے وہاں سے حکم کی دھولیں بٹھانے۔ میں نے آج تک اپنے ماں باپ کی تو بات سنی نہیں، ہتھاری بہت سنوں گی؟ ڈاکٹر۔ ماں کے قدموں کے نیچے تو جنت ہے۔ یہی تم مذہب سے واقف ہو۔ جاہل اجہل۔

جمعی۔ (بجور غصہ میں) دیکھو ذرا زبان منجبال کے بات کرو۔ برابر کہے جا رہے ہو۔ میں جب تک نہیں بولتی ہوں تبھی تک۔ ڈاکٹر۔ خیر، میں کچھ نہیں جانتا، اندرا اور جمعی میں ایسی گھر میں ہیں۔ جمعی۔ جمعی تک تو میں راضی ہوں۔ مگر وہ ہندی ٹوٹی کافر کی بیٹا ہرگز قدم نہیں رکھ سکتی۔

جمعی۔ یہ قیامت تک نہیں ہو سکتا۔

اب بہت زور و شور کی لڑائی ہونے لگی۔ اندرا اور جمعی جب اسٹیشن پر اترے تو انہیں کوئی نظر نہیں آیا۔ جمعی نے کہا معاذ دگرگوں معلوم ہوتا ہے، وہ نہ آتا جابائے خرد کرتے۔ خیر گاڑی کر کے دولوں ایوان جعفری پہنچے۔ اندر سے شور وغل کی آوازیں آرہی تھیں۔ گاڑی کو کھڑا رکھنے کا حکم دے کے جمعی اندرا کو لے کے اندر گیا۔ باپ دیکھتے ہی دوڑ کر بہو اور بیٹے سے لپٹ گئے۔ ماں نے کہا۔ اے نکل نکل چھو کر۔ یہاں تیرا کوئی کام نہیں۔

اندرا (دوراؤ ہو کر)۔ اماں جان، اتار میں آپ کی بہو ہوں۔ خدا رحم کیجے۔ دنیا میں سوائے آپ کے میرا اور کون بزرگ ہے۔ آپ ہی اپنی پناہ میں مجھے لے لیجئے۔

جمعی کی ماں (لکڑی اٹھا کر اور اندرا کو دو تین مرتبہ مار کر) جل نکل ٹوٹی کافر بیٹے گھر سے۔

جمعی۔ چلو اندرا چلو۔ (ماں سے) اماں جان، اب آپ میری صورت کبھی نہ دیکھئے گا، انشا اللہ۔

ماں۔ جمعی تجھے جنت نصیب نہیں ہوگی، ماں کو خدا کر کے۔ بیٹا اس ہندی کو چھوڑ دیکو تو کسی شفی ختمی خاندسی وہ پس بیاہ کے لاتی ہوں۔

جمعی۔ پس چپ رہیئے، اماں جان!

ماں برا بھتیجی ہوتی رہیں۔ جمعی اندرا کا ہات پکڑ کر باہر چلا گیا۔ پیچھے پیچھے ڈاکٹر جعفری گئے۔ باہر ڈاکٹر جمعی سے بولے۔ تم تاج کل ہوٹل

سینے سے زور سے لپٹ جا۔ میں تجھے بھجوا رہی ہوں۔ اندرا بیٹی! جمیلی اور اندرا کی آنکھوں سے خوشی کے آنسو بہنے لگے۔ اندرا زور سے جمیلی کی ماں کے لپٹ گئی۔

جمیلی کی ماں (اندرا سے) دودھ کا ایک گلاس (لاکر) دے بیٹی، یہ دودھ پی لے۔ ہمارے یہاں دم ہے کہ بچہ پلنے پہل آتی ہے، تو دودھ پلاتے ہیں۔ اندرا نے شکریہ کے ساتھ دودھ پی لیا۔ ادھر ادھر کی باتیں ہوا رہیں۔ جمیلی کی ماں بچہ سرد رہتی۔ ذرا دیر میں اندرا نے کہا کہ اُس کی طبیعت خراب معلوم ہوتی ہے۔ لمحہ کے لمحہ میں وہ جمیلی کی طرح تر پڑنے لگی۔ جمیلی اذ حد پریشان ہو گیا، وہ ڈاکٹر کو ملینغون دینے جا رہی رہا تھا کہ اندرا کی روداد غصہ سے بھر اڑا کر گئی۔ جمیلی ہائے اندرا کہہ کر اُس کی لاش پر گر گیا جعفری بنگا لگا ہو گیا تھا۔ اُسٹانے بڑھا تو جمیلی بھی باکل سر دھتا، اُس نے اپنا سر پٹ لیا۔ اپنی انگلی کا ہیرا چا لیا اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ بھی تڑپ تڑپ کر رہا۔ سخت ہو چکا تھا، تینوں لائیکس ایک عجیب بے نیازی کی شان میں پڑی تھیں، فضا پر اداسی جا رہی تھی۔ گھر کے لئے لازم کھڑے جرت زدہ سے ہو گئے تھے۔ اندرا اور جمیلی ایک دوسرے سے لپٹے ہوئے تھے، اُن کے لب الہام دہر میں پرست تھے، ایک دائمی سنی اُن کے معصوم چہروں پر کھیل رہی تھی، فضا باکل ساکت و صامت تھی کہ جمیلی کی ماں کی دلدلہ تو بچوں نے فضا کے سکوت کو درہم درہم کر دیا۔

## پیغام

مظلوم کو غرق صہبائے گلغام ہیں کرنا ہے اٹھو

لبریز لبوسے ظالم کے اک جام ہیں کرنا ہے اٹھو

جو مذہبوں سے حل ہو نہ سکیں اُن گتھیوں کو کُسلجنا ہے

جو کام خدا سے ہو نہ سکا وہ کام میں کرنا ہے اٹھو

پیش رو

میں مٹیر جاؤ۔ میں بھی ساتھ چتا ہوں۔ کل تک کوئی اچھا رنگہ ڈھونڈ لیں گے، میں بھی اب ہمارے ہی ساتھ رہوں گا۔

جمیلی۔ بہت اچھا! واجاں!

ڈاکٹر۔ اندرا بیٹی! صحت کرنا۔ تم جانتی ہی ہو کہ جاہل تعصب عورتیں کس لٹاپ کی ہوتی ہیں۔

اندرا۔ جی اجا جان، اس میں صاف کی کوئی بات ہے، اماں جان ابی بید غصہ میں ہیں۔ میں چند روز بعد اُن کو سناٹے میں ضرور کا سیاب ہو جاؤں گی۔ ڈاکٹر۔ آمین۔

تینوں آدمی تاج محل، بوتلی روانہ ہو گئے۔ جوی کو معلوم ہوا کہ وہ نہیں آ رہیں۔ دو تین گھنٹہ کے بعد جب ڈرا وارغ درست ہوا اور واقعات پر غور کیا تو خیال کیا کہ یہ تو برا ہوا کہ سیال صاحب بھی بیٹے اور بہر کے ساتھ چلے گئے۔ ہندوستانی سماج بڑی خطرناک ہے۔ جاہل عورتیں کمزور فریب سے پڑنے اور چالاکی میں بھد مشاق ہوتی ہیں۔ خدا ان کے زینا چرتے سے بچا کہ ایک کمزور فریب سے پراسیکم اُس کے دماغ میں آئی۔ سوچا کہ کیوں نہ اندرا کو ختم کر دوں۔ بیٹے کو قحطی رنج ہو گا۔ باپ بنگال میں گئے، چند ماہ بعد مجھے بل بل جانے لگا۔ آخر کو ماں ہوئی اُس کی، سب معاملہ ٹھیک ٹھاک ہو جاؤ گا۔ یہی نہ خیال کیا کہ بیٹا تعلیم یافتہ ہے۔ وہ کہاں ملٹ سکتا ہے، یا اندرا کے قتل سے پولیس کچھ اکیشن لے۔ جاہل عورت تو سکاری کرنا جانتی ہے۔ اُسے اُس کے نتائج سے کیا مطلب۔

بہر حال شام کو آنکھوں نے بیٹے کے نام اپنے بیان کے ٹکڑے لکھ کر ایک رقعہ بھیجا کہ بیٹے میں اپنے کے پر بھید نامہ ہوں۔ اندرا پھر بھی میری بہو ہے۔ جو ہونا تھا ہو چکا۔ اب میرا کھیتا مارا ہے، اپنی بوڑھی ماں کے پیچھے سے تم اور اندرا دونوں آکر گت جاؤ، تاکہ میں اپنی بے اعتنائیوں اور بچا گھر کیوں کا بد لاؤ تا رسوں۔

رقعہ پہنچ تو ڈاکٹر جعفری جمیلی اور اندرا سب بید خوش ہوئے۔ ڈاکٹر بولے کہ کبھی ماں کی مات کہاں تک ٹھنڈی رہتی۔ تینوں فوراً سب اس بات کے ادا ان جعفری پیٹے۔ مکان میں داخل ہونا تھا کہ دوڑ کر جمیلی کی ماں نے اندرا کو لٹا لیا۔ بیٹا بچے صحت کر۔ میں نے تیرے ساتھ بڑی زیادتیاں کی ہیں۔ تو میری بہو ہے، اپنی بوڑھی ماں کی باتوں کا کچھ خیال نہ کر۔ بیٹی، میرے

# لفظ آزادی

(یہ لفظ معنی اپنی معنوی حیثیت سے شان کی جا رہی ہے)

لفظ آزادی اور اوراقِ عالم دیکھنے والے  
یہی اک لفظ بنیادی ہے تعمیرِ حکومت کا  
اسی اک لفظ میں دعوت ہے غور و فکر کی تھکاو  
یہی اک لفظ نشی ازل کا جو عطیہ ہے  
یہی اک لفظ جو دیباچہ ہستی کا عنوان ہے  
یہی اک لفظ جو آئینہ انسانی شعائر کا  
یہی اک لفظ باعث ہے زبان بے زبانی کا  
یہی اک لفظ جو ہے خاتمہ قسیدِ غلامی کا  
یہی اک لفظ ہم معنی ہے جو خود اختیاری کا  
یہی اک لفظ جو صامن ہے انصاف و عدالت کا  
یہی اک لفظ جس پر خو ا جگی تیز بدلتی ہے  
یہی اک لفظ جو ہے روحِ آئین چانداری  
یہی اک لفظ جو بیدار کن جذبات رکھتا ہے  
یہی جس سے غور و شہریاری ٹوٹ جاتا ہے  
یہی جس سے غلام اپنی جگہ میاں ہو جائیں  
یہی اک لفظ ہے معنی پئے ہندوستان اب ہے  
سمجھ اس لفظ کو ہمارا یہ ہے لفظِ آزادی

جماعت و رجاعت ربطِ باہم دیکھنے والے  
اسی اک لفظ میں نقشہ دستانِ سیاست کا  
اسی اک لفظ میں گویا ہے درسِ آگہی تھکاو  
اسی اک لفظ پر شاہوں کا استادانہ قبضہ ہے  
یہی جس کے عمل کی فطرت آزاد خواہاں ہے  
یہی اک لفظ کنجشہ حقائق کا بصائر کا  
اسی سے ناطق ہے بند زعم حکمرانی کا  
یہی عنوان مقصد ہے محبت کے پیامی کا  
یہی جو ہے خلاصہ ہند کی مقصد پراری کا  
یہی مفہوم رکھتا ہے مساوات و اخوت کا  
یہ جس سے بکسی اعزاز کے سانچے میں دھلتی ہے  
اسی پر مشرق و مغرب میں ہے اک گفتش جاری  
یہی جو اپنی تہ میں حشر احساسات رکھتا ہے  
یہی جس سے کہ پابندِ غلامی چھوٹ جاتا ہے  
یہی جس پر ہزاروں عہد نامے چاک ہو جائیں  
یہی جس میں کہ پنہاں دفترِ معنی و مطلب ہے  
سیاست وال جماعت کو ہے جس پر زعمِ استادوی



سے بکا طور پر وہ ہندوستانی دردمند کہلائے جانے کا سہی ہے۔ نیز اس کی مستوفی شاعری نے اس کو اردو زبان کا امیر خسرو بنا دیا ہے اور یہ اس کا ایسا گہرا رنگ تھا جو اس کے قلمی کام پر حاوی ہے اور بقول سے بندہ عشق شد ہی ترکہ نسب کن جاتی

کا ندریں راہ فلاں ابن فلاں چہیزے بُرت

وہ مذہبی تعصبات اور نسلی امتیازات کا محض مخالف ہی نہ تھا، بلکہ اس قسم کی باتوں کو نہایت لغزت اور حقارت کی نظروں سے دیکھا کرتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ہندو اس سے اس قدر غلط طے رہتے تھے کہ وہ صرت ان کے رسم و رواج، ان کی زبان، ان کے خیالات ہی سے نہیں بلکہ ان کے مستند نامک سے گما حقہ واقف ہو گیا تھا، جس کو اس نے اپنے کام میں ایسی خوبی اور محنت کے ساتھ اس قدر محب طریقے پر بیان کیا ہے کہ اس کی ہندوئی میں مطلق شک کی گنجائش نہیں ہو سکتی۔

دوسرے مذاہب یا ان کے لوازم، پرہنسی، ڈانا تو دین کر دیکھی ان کو حقارت کے ساتھ بھی نہ دیکھتا تھا۔ جو کہ ہمارے ہندوستانی شعرا میں صرت کیابی نہیں بلکہ نایاب ہے، وہ مسلمان یا ہندو نہیں بلکہ خفیہ معنوں میں ایک ہندوستانی شاعر تھا، اس نے ایسے الفاظ کو جن میں ہمارے شعراء دلی اور بازاری کہہ کر جھوڑ دیتے ہیں۔ اپنے کلام میں جگہ دی اور اپنے معاصرین کو دکھلایا کہ ان میں کیسی بھی خرابیاں پوشیدہ ہیں، جن کو شاید ظاہر بین نگاہیں نہیں دیکھ سکی تھیں۔

اس کی ہمدردی اور محبت صرت بنی نوع انسان کے ساتھ محدود۔ نہ تھی بلکہ حیوانات کے علاوہ غیر ذی روح اشیائے بھی وہ ایک خاص اُس و محبت رکھتا تھا، چنانچہ اس کی نگلیں ریمبو کا بچہ، گھری کا بچہ، برن کا بچہ۔ اور ملبوں کی لڑائی وغیرہ جانوروں کے متعلق نیز روٹی وال اور تلوڑ وغیرہ جان چیزوں کے متعلق نہایت دلچسپ اور جڑیاں سے اس قدر موم ہیں کہ پڑھنے والے کو شاعر کی گما حقہ واقفیت اور ہمدردی پر تسلیم کر کے بغیر کی جارہے نہیں ہے۔ بڑے تو بڑے چھوٹے نیچے نامک اس کی چھوٹی چھوٹی نگلیں شکوہ تر بادی، چنگ بازی، بولی، دولانی، بسنت اور عید وغیرہ پر حکم باغ باغ ہو جاتے ہیں۔ وہ مثل گو نامک کے تارک اللہ نیا فقیر اور سادھو شاعر تھا، اس کی

جاننا تھا اور بنی خوشنویسی سے بھی واقفیت رکھتا تھا۔ اُس کی طبیعت میں آسودگی اور قناعت اس وجہ تھی کہ نواب سعادت علی خاں کی طلبی کے باوجود کلکتہ جانے سے اُس نے انکار کر دیا، اور اسی طرح راجہ صاحب بھرت پور کے یہاں بھی نہ گیا۔

اُس کے مزاج میں سادگت اور شوخی اور طبیعت میں نفس بدرجہ اتم وجود تھا، خلق و انکسار میں وہ پیش تھا اور یکبوں کی خبر گیری اور غریبوں سے ہمدردی اُس کا شعار تھا، وہ نہایت ہی محبت پسند تھا، اور مختلف قسم کے لوگوں سے میل جول رکھتا تھا، جس کا ثبوت یہ ہے کہ جب اُس کا انتقال ہوا تھا تو اُس کے جنازے میں مسلمانوں کے علاوہ ہزاروں ہندو بھی شرکت کیے۔ وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے ہزاروں میں ہمیشہ بے دریغ شریک ہو کر آتا، اور ان کے میلے ٹھیلوں کی خوب سیر کیا کرتا، ابھی وجہ کی بنا پر اُس کا بچہ بہت وسیع تھا، اور بقول شمس پور تعلقلند چتر سے وہ خط سننے میں، اور ہر چیز سے اچھائی حاصل کرتے ہیں۔ اُس نے اپنی اس طرز معاشرت کا بہت بڑا فائدہ اٹھایا تھا، جس کا ثبوت اُس کے کلام سے ملتا ہے، اُس نے معمولی معمولی باتوں کو ایسی دلچسپ تفصیل سے بیان کیا ہے کہ بغیر تعریف کے رہا نہیں جاتا۔ اُس کی معلومات غیر محدود، اُس کا خزانہ لغات غیر مختصر اور اُس کی صفائی بیان دلکش ہے، وہ دوسرے ہندوستانی شعراء کی طرح عاشقانہ نغفے نظم نہ کرتا تھا، اُس کی رگوں میں خالص ہندوستانی طون دور رہا تھا، اُس کے قلب میں وطن پروری کی آگ شعلہ تھی، چنانچہ اپنے ملکی لوگوں کی معاشرتی و ذہنی ترقی کا خیال اُس کی حب الوطنی کا بین ثبوت تھا، شاعری میں وہ کسی کا شاگرد نہ تھا، مگر اُس کے بہت سے شاگرد تھے، اُس کی نگلیں حقیقت میں ایک نگار خانہ ہے جس میں میل کو دیش و آرام، مسرت و شادمانی، غم و الم، دکھ درد اور ہندوستانیوں کے دل و دماغ کی زندہ و متحرک تصویریں نظر آتی ہیں۔

اس کا مینار شاعری بچل تھا، اور معاصر ہندوستانی شعراء سے اُس کا رنگ بالکل ہی جدا تھا، وہ یورپ کے شعراء کی طرح مبالغے اور مزین سے بیزار تھا، اور سیدھی سادھی باتیں اور حقیقی کیفیتیں صاف اور سہری زبان میں نگر کیا کرتا تھا۔ مناظر قدرت، واقعات عام، اور جذبات انسانی وغیرہ اُس کی نگلیں میں بکثرت پائے جاتے ہیں چنانچہ منظر نگاری کی حیثیت



قیام رہتا تھا۔ صحن میں اتر جانب نیم اور سر کے درخت تھے جن کے سائے  
تھے کبھی کسی بوریاجھا کر میٹھا کرتا تھا، یہاں تک کہ تقریباً سو سال کی عمر  
میں فالج کے مرض میں مبتلا ہو گیا، جس کے باعث زبان، ماٹ ہو گئی تھی،  
اور آخر کار سو برسوں اگست ۱۹۳۳ء مطابق ۲۶ دسمبر ۱۹۵۷ء  
کو انتقال ہوا اور اپنے ہی صحن میں بزرگے درخت کے نیچے مدفون ہوا۔ پختہ  
قبر موجود ہے۔ جس پر تذکرہ درخت سایہ لگے ہوئے ہیں۔ اور چپاں

اب تک ہر سال ۲۶ دسمبر مظفر کو عرس ہوا کرتا ہے سے

ہے دلاکس کو دوام اس گردش افلاک میں  
(ماتخ) خاک کے نیچے ہزاروں مل گئے ہیں خاک میں

آخ میں یہ بھی عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ ہندوستان کی وہ بے بدل  
ہستی جس نے اپنے ملک و فلسفیانہ کلام کے ذریعہ اپنی زبان، ملک اور  
قوم کی درستی و ترقی کے لئے جان و دل سے کوشش کی ہے۔ آج ہمیں  
موجود نہیں ہے، تاہم وہ اپنے پُر اثر و اغوائہ کلام کی وجہ سے یقینی طور  
پر زندہ جاوید ہے، کیونکہ

ہرگز نیر و آنک دلش زندہ شد عشق  
ثبت است ہر جریۃ عالم دوام

مرد نعل کے جاتے ہیں سے  
اجا بھی آدمی ہی کہتا ہے لے نظیر اور سب میں جو برابر ہے سبہ و کبھی آئی

یہ کچھ بہر و پ پ دیکھو کہ بن کر شکل دانے کی  
کھتر نا، سہز، ہونا، لہلہا نا پھر کسٹ جانا

تمہی نرگ جسے کہتے ہیں انوس انوس ایک دن سب کے تیں دہر یہ کھانا ہوگا  
دیکھ لے اس جہن دہر کو دل بہر کے نظیر سہر ترا کا ہے کو اس باغ میں آنا ہوگا

مرد و زن، نعل و جواں، خرد و کلاں، پیرو و فیر  
بتے عالم میں ہیں محتاج و گدا شاہ و وزیر  
سب کے دل ہوتے ہیں ہندسے میں خوشامد کے گیر

تو بھی دائد و ثری بات یہ کہتا ہے نظیر  
جو خوش کرے خلق اس سے سدا راضی ہے  
صد تو یہ ہے کہ خوشامد سے خدا راضی ہے  
اپنی عمر کے آخر پانچ سال تک ہندوستان کا وہ مایہ ناز شاہ عہد ہی  
کبر سنی اور ضعف کے باعث خانہ نشین ہو گیا تھا۔ مگر کے اندر دالان میں

## کسی کی آمد

وہ دیکھو میری ----- نور برساتی ہوئی آئی  
وہ آئی، رنگ و بو کی ایک دنیا ہے جس میں لیک  
وہ انداز میں اس کا، وہ روئے آتشیں اس کا  
وہ چھائی اک بہار تازہ بنکر میری ہستی پر  
وہ آئی اور میرے دل کو گرگاتی ہوئی آئی

نگاہ شوق جس کی منتظر تھی ایک مدت سے  
وہ آئی اور میرے دل کو گرگاتی ہوئی آئی

# شیلا و سلیم

تجاوید ریح آبادی

(۱)

کی ضرورت کی بنا پر الگ رہنے پر مجبور ہو گئے۔۔۔۔۔ آہ سلیم بے اپنے نام سے ذرہ بھر بھی تعلق نہ تھا، جو سلیم الطین ہونے کی بجائے شریخ واقع ہوا تھا، اکثر سنجیدہ اور قدرے رنجیدہ بھی ہو جاتا تھا، ہاں وہی سلیم جو اپنی طرف کی وجہ سے لوگوں کے دلوں میں گھر کر چکا تھا، ابیں بھرے لگا، ایک جذبہ محبت کی بنا پر۔۔۔۔۔ ورنہ اور کیا وجہ ہو سکتی تھی۔

(۲)

دسمبر کی ایک اندھیری رات۔۔۔۔۔ تاریک۔۔۔۔۔ بیابانک۔۔۔۔۔ خوفناک تیز ہوا چل رہی تھی۔ گورنٹ کوارٹر کے اس طرف جل کے ساتھ ساتھ ایک تنہا سڑک پر ایک تہاڑا جوان خلیصورت لڑکی۔۔۔۔۔ آف فو۔۔۔۔۔ ڈورنک برقی بسیوں پر پروانے چھوٹے نظر آ رہے تھے، لیکن سڑک باہل سنان تھی، سوسائے اس کیسے راگیر کے۔۔۔۔۔ وہ سٹری بار بار ادھر ادھر دھڑکتی چلی جا رہی تھی، اپنے خیالات میں گن، کبھی کبھی برقی بسیوں کے بیچے بیچے کو خوف و ہراس کے بجائے اس کے چہرے پر ادا کی لہریں دوڑتی ہوئی نظر آتیں، لیکن وہ اپنی منزل کی طرف لپٹی ہوئی چلی جا رہی تھی، اس کے ہونٹ کانپ رہے تھے۔ اسپتال کی گھڑی نے بارہ بجائے۔۔۔۔۔ وہ چونک پڑی۔۔۔۔۔ اس نے اپنے ڈاگلائے ہوئے قدموں کو اور تیز کر دیا۔ اب اس کی منزل بہت قریب تھی، وہ ایک کوارٹر کے قریب آ کر ڈلی۔ شاید فی اداوی طور پر اس نے اندر جھانک کر دیکھا، ایک کمرے کی گھڑی کی روشنی چمن چین کے باہر آ رہی تھی۔ بہر طرٹ خاموشی چھائی ہوئی تھی۔۔۔۔۔ قبروں کی

سلیم کی خوشی میں مذاق کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا، اور کالج کی تعمیر نے تو اس کے اس جذبہ کو اور بھی اُبھار دیا تھا۔ لذتِ عمر سے وہ قطعاً نا آشنا تھا، اس کی زندگی ایک رنگین زندگی تھی، جو فطری رنگوں میں رنگی ہوئی تھی۔ اس میں محبت کے تاثرات بھی تھے جیسا کہ وجہ و ایک بالغ نظر نوجوان کے دل کے ساتھ لازم و ملزوم کا تعلق رکھتا ہے۔ شباب جب اپنے نکھار کے ساتھ ایک ناقابلِ انہما شہر دنیا کے دل میں پیدا کر دیتا ہے، تو عشق ایک انگڑائی سے کر دیتے ہوئے کو چھٹکا دیتا ہے۔ یہی کیفیت سلیم کی بھی تھی۔

آہ عشق کا اندھا دیوتا، یہ کہیں جانتا کہ اس کے ذہن میں مجھے ہوئے تیرکون سے دو دلوں میں پوسٹ ہو رہے ہیں۔ وہ تیر محلے جاتا ہے۔۔۔۔۔ اسے جوانی کا علم ضرور ہوتا ہے۔۔۔۔۔ نہ جانے کیسے۔۔۔۔۔ لیکن اغلباً وہ مذہب و ملت کی تعزیر کو ناجائز قرار دیتا ہے۔۔۔۔۔ چنانچہ سلیم کی سرشت میں بھی یہی راز نہاں تھا، اور جس کے عقد سے وقت کے ساتھ ساتھ کھٹے چھے گئے، اور جب وہ نیک و بد سوچنے کے قابل ہوا تو اس نے اپنے دل کے آفتن پر ایک غیر مذہب و شریعہ کو جلوہ گر پایا، جس میں لاگ سی تھی۔۔۔۔۔ جو جوانی میں آگ بن گئی۔ وہی جو کل تک آنکھ مچولی کھیلنے سے، آنکھ ملائے ہوئے شرمائے گئے۔ دم بھر الگ رہتے تو اداں ہو جاتے۔۔۔۔۔ خدا جانتے کیوں۔۔۔۔۔ کچھ تھا ضرور جو اندھیری اندازِ سنگ و پختا۔ جس کا احساس رفتہ رفتہ پیدا ہو چلا تھا، اور اب وہ سوسائٹی اور وقت

رہے ہیں۔۔۔۔۔ ہاں۔۔۔۔۔ اسے ہنگامی نظروں سے، لیکن آپ کی سواہل  
نکلی ہیں، میرا جواب نہیں بن سکتیں۔ آج میں نے اپنے جی کو اڑا کر لیا ہے اور  
میں نجات کر رہی ہوں۔۔۔۔۔ آپ سے۔۔۔۔۔ اپنے والدین سے  
۔۔۔۔۔ اپنے مذہب سے۔۔۔۔۔ اور اپنے آپ سے، چونکہ میرے خیال  
میں محبت نام ہے اس کیفیت کا جسے عوام جنوں کے نام سے پکارتے ہیں۔  
چنانچہ سے

رہے جو عشق جنوں تک تو مت ہے لیکن  
فنا کے گھاٹ سے اترے تو زندگی ہو جائے  
چونکہ میں اپنی موت پر قدرت حاصل نہیں، اس لئے اپنی زندگی پر اختیار  
رکتے ہوئے میں نے اپنے لئے ایک ایسی زندگی تجویز کی ہے جسے مسابقت  
ایک راہبہ (NUN) کے نام سے موسوم کرتی ہے۔ اس سے زیادہ زمیں  
کچھ کہنا چاہتی ہوں نہ سننا، بس سمجھ لیجئے کہ یہ ساری آخری طاقت ہے  
۔۔۔۔۔ آخری۔۔۔۔۔ ہاں آخری۔۔۔۔۔ ہم زیادہ دیر تک دنیا کی آنکھوں  
میں دھول نہیں جھونک سکتے۔ ہم لاکھ پالکڑہ بھولیں۔ لیکن دنیا کی آنکھیں  
اُٹھیں گی۔۔۔۔۔ ضرور اُٹھیں گی۔۔۔۔۔ چنانچہ میں بدنام ہو چکی ہوں اور  
میں ذات کی زندگی سے گنہ گار کی زندگی کو ترجیح دیتی ہوں، بس میں کہہ چکی  
کہ آپ سے کچھ سننا نہیں چاہتی۔

اُس کے بعد اُس کا جی بھر آیا، اُس کی ناسیت عود کر آئی، وہ دروازے  
کی طرف پہلی سیلم نے اپنے ہاتھ اٹھا کر کچھ کہنا چاہا۔ لیکن وہ جا چکی تھی۔  
سیلم نے باہر نکل کر دیکھا۔ چاروں طرف خاموشی اور تاریکی چھائی ہوئی  
تھی، اور شیلہ اُس تاریک فضا میں گم ہو چکی تھی۔

(۳)

شیلہ کے جانے ہی سیلم کی دُنيا بدل گئی، وہ ہر وقت اُسی کے خیالات  
میں ڈوبا رہتا۔ اُس کی والدہ اُس کو سمجھاتیں، وہ خاموشی سے سب کچھ  
سننا۔ دفتر جاتا تو اُس کا دل وہ دماغ اُس کی آنکھیں اُس کو جواب دے  
جاتیں۔ وہ کام باقاعدگی کے ساتھ نہ کر سکا۔ دفتر سے بغیر حاضری بھی ہونے  
لگی جس کی وجہ سے اُسے کافی سختی اُٹھانی پڑتی۔ اُس کے دوست اُس  
سے مایوس ہو گئے۔ بالآخر اُس نے اس حالت سے مجبور ہو کر چار ماہ  
کی رخصت لے لی۔ اب وہ بائبل بیکار تھا، اور پہلے سے بھی زیادہ مبتلا۔

مرحہ۔۔۔۔۔ سترہ اُسمان پر آنکھ جوئی کھل رہے تھے، کبھی کبھی کوئی ستارہ  
سجاگ کھڑا ہوتا تو اُسمان ایک لمحہ کھٹکٹا اُٹھتا۔۔۔۔۔ کبھی کبھی پیر سے وار  
کی آواز خاموشی کو توڑتی ہوئی گاڑوں کو رخنہ کر جاتی تھی۔ لیکن وہ ان سب  
سے بے خبر ان سب سے بے پروا جھانک رہی تھی۔

سیلم گڑھی پر بیٹھا ہوا، بڑی بے تابی سے اُس کا انتظار کر رہا تھا،  
اُوہ سیلم، آج واقعی سیلم ہو چکا تھا، آج تاک اُس کو کسی نے اس انداز میں  
نہیں دیکھا تھا، یکا یک ایک دوسرے کے سے آواز آئی۔  
"تم اتنی رات گئے تاک نہیں سوئے، کیا بات ہے بیٹا؟ اب سو جاؤ"  
"ابھی سوتا ہوں۔ آپ سو جائیں۔ اتنا کہہ کر وہ پھر اپنے منتشر خیالات  
میں غرق ہو گیا۔

شیلہ یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی۔۔۔۔۔ وہ سب کچھ سن رہی تھی، لیکن  
خاموش تھی، وہ سیلم کی مذہب کی وجہ سے جانتی تھی، مگر خاموش تھی، اُس کی  
ہمت نہیں پڑتی تھی کہ وہ اس سیلم کو جس کو وہ مدت سے اپنا جی ہے مخاطب  
کرے۔۔۔۔۔ ہاں۔۔۔۔۔ آج کی رات۔۔۔۔۔ آج کی رات۔۔۔۔۔  
مُسے ایک تیغ ترین حقیقت کا انکشاف کرنا ہے۔ اُس کا دل زور سے دھڑک  
رہا۔ گھڑی کی طرف۔۔۔۔۔ وہ رونے لگی، اُس کو سر دہی کی شدت کا احساس  
اب ہوا۔

اُس نے آہستہ سے شیشے پر دستک دی۔ سیلم گڑھی پر اچھل پڑا، اور  
دروازے کی طرف لپکا، اُس نے جلدی سے دروازہ کھولا، اور شیلہ کو اندر  
بُلا لیا۔ پھر خاموشی سے تمام دروازوں اور کھڑکیوں کو بند کیا، اور اطمینان  
سے بیٹھ گیا۔ اُس نے شیلہ کے برت سے ہاتھوں کو پکڑتے ہوئے کہا: شیلہ  
ہیت سردی تھی، آج تو ہمیں بیت تعلیق ہونی ہوگی، شیلہ نے مسکراتے  
ہوئے جواب دیا۔ ہاں اگر کسی اداس کے لئے آتی تو تکلیف ہوتی، مگر ہمارے  
لے نہیں لیکن ایک لذت اُس نے تن کر کہا۔ سیلم صاحب اب وہ سننے کے لئے تیار  
ہو جائے جس کی توقع شاید آپ کو خواب میں بھی نہیں ہو سکتی، اب کو معلوم  
ہے کہ اس مذہب کی دیوار نے حال پر ہمارے ارمانوں کی دنیا کو الگ  
کر دیا، اور فی الحقیقت ہم اپنے آپ کو اس سے مستثنیٰ بھی نہیں کر سکتے، باوجود  
اعلیٰ تعلیم کے۔۔۔۔۔ باوجود موجودہ تہذیب دانانے کے ہمارے والدین،  
ہماری سوسائٹی، ہمارا انمیر ہمیں ایک نہیں کر سکتے۔ سیلم صاحب آپ دیکھ



کی پروا نہ تھی۔ اس نے اس کو کھوئی ہوئی شیلہ مل چکی تھی۔ شیلہ کو جب کچھ  
برش آیا تو اس نے اپنے آپ کو ایک ناکھرم کے پاس پایا، وہ گھبر گئی۔ لیکن بہت  
شیلہ نے آخری مرتبہ آنکھیں کھولیں اور سیرم کو ہاتھ جوڑ کر کہنے لگا

## وجاہت سندیلوی

## ہمارا ادب

ہاں تو اس نے وہی کیا جو اُسے کرنا چاہئے تھا، جب میں اس سنسان  
شام کو اس سے تہنہ لگئی تھی تو مجھے پہلے ہی سے غر کر لینا چاہئے تھا کہ وہ  
کیا کرے گا۔ لیکن نہیں غلطی میری سچی نہیں، غلطی ہے میرے ماحول کی، غلطی  
ہے میرے ادب کی، اُس نے مجھے پہلے ہی سے کیوں نہ بتا دیا، کہ جو خواہش  
محبت کے دریا میں کودتا ہے وہ صرف اس کا صاف و شفاف پانی دیکھ کر  
نہیں کودتا، وہ کو دتا ہے، اس کے کنول نکالنے کے لئے وہ کو دتا ہے اُس کے  
سوتی لانے کے لئے وہ کو دتا ہے، اُس کے پانی سے اپنے جسم کو راحت پہنچانے  
کے لئے۔

اس سنسان شام کو میں خوش تو ہوئی کہ مجھے معلوم ہو گیا کہ محبت  
کیا بلا جوتی ہے، لیکن مجھے اس کا انصاف ہے کہ مجھے اپنے کتب خانے کی  
تین چوتھائی کتابیں آشنان میں پھینک دینا پڑیں۔ محبت تو ایک دھوکا  
ہے، لیکن ہمارا ادب ایک دغا بازی! وہ محبت کے دھوکے کو پاک  
اور معصوم بناتا ہے۔

## اقوال سحر سحر

میرے مالک واسطہ ہے سمجھنے اپنی عظمت کا بتا دے اور صاف بتا دے  
کہ اس زمانے میں شریف انفس کو اجتناب کیوں کہتے ہیں۔  
ہم نے خواب میں دوستی کی، خواب ہی میں دشمنی، خواب ہی میں پیدا  
ہوئے اور خواب ہی میں مر گئے، خواب ہی میں شادی کی، خواب ہی میں غم  
ہے دنیا، اُس کی ابتدا اور انتہا ہے۔  
کام یوں کر کوکھڑوں کو زندگی کا آخری دن سمجھو۔

”مجھے چھوڑیے مجھے جانے دیجئے“

”نہیں، نہیں، ابھی نہیں، مجھے تم سے محبت ہے۔“

کبھی آپ نے کسی خوشخوار جالور کو اپنا شکار سمجھو لٹے دیکھا ہے؟ بس  
اُسی طرح ایک عشان شام کو ایک غزلت کہہ میں محبت کی تفسیر کی جا رہی تھی۔  
میں غزلت کہہ سے باہر نکلی تو رات چھا چکی تھی۔ ہر طرف تاریکی تھی،  
لیکن مجھے ایک روشنی دکھائی دی۔ آج میری آنکھوں سے پردہ ہٹ چکا  
تھا، اور میں صاف دیکھ رہی تھی کہ محبت کیا ہے، کتنا پیارا لفظ ہے محبت  
م، جب بہت، لیکن اس معصوم لفظ کی آڑ میں کیسے کیسے بولابوس کی کوششیں  
سانپ اینڈر میں رہے ہیں، بل کھا رہے ہیں، انسان سب سے زیادہ دھوکے  
آپ کو دیتا ہے، جس طرف اُس نے اپنی مختلف قسم کی نفسی خواہشات پر پردہ  
ڈال رکھے ہیں، اُسی طرح اُس نے ایک خاص قسم کی نفسی خواہش پر بھی کیا پردہ ڈالا ہے۔ تم جانتے

اس شام کو تصور میرا تھا، اس کی کیا خطا؟ میں کیوں اس کی بیوی بنی  
باتوں میں لگ گئی میں کیوں نہ سمجھ کر محبت کا معصوم لفظ کن کن معنوں میں استعمال  
ہو رہا ہے؟ خیر اب گزری ہوئی بات کا انصاف ہی کیا؟ کچھ بھلا! اب میں سمجھ تو  
گئی کہ یہ ننگین سنجہ کیا ہوتا ہے، باپ اپنے لڑکے سے محبت کرتا ہے، اس لئے  
کہ وہ اُس کا ہے، اُس سے اُس کو توہمت ہیں، اس کا نام ہے شفقت پدی! کبھی  
کبھی آپ نے کسی باپ کو کسی دوسرے کے لڑکے سے بھی محبت کرتا دیکھا ہے،  
فقیر کو کھانا دیا جاتا ہے، اس لئے کہ میں گھر میں کھانا خراب نہ ہو جائے، اس کا  
نام ہے خدا ترسی! کبھی آپ نے کسی کو اپنا پیٹ کاٹ کر بھی فقیر کو کچھ دیتے دیکھا  
ہے؟ اہا ہا ہا ہم نے الفاظ کے کیسے رنگ بڑی پردے ڈال رکھے ہیں محبت  
پر یہی جی کے خوشنما سحر میں چھپا ہوا ایک خوشخوار سنجہ ہے!

# جرمنی کا آسٹریا پر قبضہ کیوں اور کیسے؟

سید عید جعفری مچھلی شہری

ہو جانا نہ صرف ایک ممکن الوقوع حادثہ تھا، بلکہ گزشتہ بیس سال کی تاریخ اس بات کی منہر ہے کہ یہ واقعہ ایک تاریخی ناگزیرت کی حیثیت رکھتا ہے یہ کیوں۔

آئیے آج کی صحبت میں اس ملک کی گزشتہ سبست سالہ تاریخ پر ایک سرسری نظر ڈالیں، آسٹریا میں چند سال پہلے یہ جلد ضرب المثل تھا کہ جرمنی میں صورت حالات ٹھیکین ہے، لیکن ناگفتہ بہ نہیں آسٹریا میں صورت حالات ناگفتہ بہ ہیں لیکن ٹھیک نہیں اس جملے کے اندر وہ روح پوشیدہ ہے جو آسٹریا کی مخصوص مسرت و محبت برقرار رہتی ہے۔ جان کنٹر یورپ کا شہرہ آفاق معنف اپنے دلچسپ انداز میں آسٹریا پر نظر ڈالے "آسٹریا یورپ کا خوشگوار ترین ملک، جہاں لوگ زندگی کی سنجیدہ چیزوں میں شہماک رہتے ہیں، جیسے سامعہ نواز مسیقی یا ہوا خوری اور شراب نوشی۔ لیکن غائب پہلے چند دلائل میں نہ صرف ایک سیاسی انقلاب ہوا ہے بلکہ ممکن ہے کہ آسٹریا کی عام بے پرواہی امن پسندی، سکون طمانیت میں بھی تبدیلی پیدا ہو جائے۔

یگنگ عظیم سے پہلے آسٹریا ہنگری اگرچہ قریب المرگ تھی، لیکن اپنے رقبہ کے لحاظ سے ایک عظیم الشان حکومت تھی۔ دنیا میں انقلابات ہمیشہ آیا کرتے ہیں۔ آسٹریا کی حکومت میں جناب عظیم کے باعث جو انقلاب ہوا وہ کوئی خاص دور میں نہیں تھا، لیکن یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ وہ ریاست جو ایک

اٹاراج شدہ ملک اور اب بعد جنگ عظیم یورپ میں ایک جداگانہ حیثیت رکھتا ہے۔ جرمنی کا آسٹریا کو ہرپ کر جانا ایک اہم اور اپنی نوعیت کے لحاظ سے زبردست واقعہ ہے، اس نے ہمیں کہ موجودہ دور تہذیب میں امن و بربریت کی مثالیں مفقود ہیں یا زیادہ تعداد میں بنیں نہیں، حبش، ہسپانیہ اور چین سماجیات موجودہ زبان حال سے بچا رہا کر اس بربریت و استبدادیت و جنگلیہ کاردن اور سر ہے، جو آج ایک عالمگیر و باکی طرح کمزور اقوام کو گھیرے ہوئے ہیں، بقول اقبال سے غارت گری جہاں میں ہے اقوام کی معاش ہر گزگ کو ہے برہ معصوم کی تلاش

بلکہ اس لئے کہ ابھی تک اس دیدہ دلیری کے شکار سیماہ یازدو قومیں نہیں، جو باوصف دعوائے جمہوریت ہندب اقوام کی صف میں شمار کرنے کے قابل نہیں تصور کی جاتی تھیں، حبش اور چین پر اٹلی اور جاپان کی دست درازی نے یورپ کی بڑی قوموں کے اطمینان میں صرف اس حد تک فعل ڈالا، جہاں تک ان کے اپنے سیاسی و اقتصادی مفاد کو دھکا پہنچنے کا احتمال تھا، آج جنگ عظیم کے بعد پہلی بار یورپ کی خود اعتمادی کو ضرب کاری لگی ہے اور ہر شخص از دست خویش نالہ و فریادیں مسموم ہے۔

بہت کم لوگ اس حقیقت سے باخبر ہیں کہ آسٹریا کا جرمنی میں جذب

گئے۔

اگر وٹن کے وعدوں میں کچھ بھی حقیقت تھی تو آسٹریا کو جرمنی سے ملحق کر دینا چاہیے تھا، کیونکہ لقبول کوئلہ، و فصدی آسٹریا کے باشندے جرمن زبان بولتے ہیں اور اس کی نسل اور تہذیب سے متعلق ہیں۔ اگر ایسا کر دیا جاتا تو آسٹریا یورپ کو یہ ہزیمت نہ اٹھانی پڑتی۔ اور آئین کی دہری اس شرمندگی سے بچ جاتی جو آج ہنگری کی زبردستی سے اس کے حصے میں آئی، محض اسی پر کٹنا نہیں کیا گیا، بلکہ آسٹریا سے جو معاہدہ ہوا (معاہدہ سینٹ جرمن ۱۸۶۶ء) اس میں صاف الفاظ میں لکھ دیا گیا کہ آسٹریا ہر اس عمل سے احتراز کرے گا جو بالواسطہ یا بلاواسطہ کسی طریقے سے بھی اس کی آزادی کو معرض خطر میں ڈالے گا۔

اس دہری کے عالم میں آسٹریا کے لئے اگر کوئی امید تھی تو جرمنی کے ساتھ اتفاقا دہی تعاون میں، لیکن فرانس اس کو کٹ برداشت کر سکتا تھا۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۸۷۱ء کے دوران میں آسٹریا کو فاقہ کرنا پڑا۔ مگر فرانس کو آسٹریا کی آزادی پر رقرار رکھنی تھی۔ کیونکہ آسٹریا کے لئے سوائے جرمنی سے اتحاد کے اور کوئی چارہ نہ تھا، جس کو کچھانے کے لئے فرانس ہر جائز و ناجائز اقدام پر عمل کرنے کے لئے تیار تھا، لہذا یہاں تک کہ آسٹریا کی کمزوری میں اس کی طاقت منحصر تھی اس محنت میں کہ ایک شیر خوار بچہ کی طرح اس کی ہر ضد دہری کی جاتی تھی۔

۱۸۷۱ء تک اقوام لیگ آسٹریا کی ہر نازک وقت پر مدد کرنے کو تیار تھے، سببوں ان کی ضد تھا کہ آسٹریا کو کئی مہر جیسی سیاسی و مالی و اقتصادی مدد مل ہوئی، اور ہر بلا نازی اور فرہنگی جنگوں کے دروازے آسٹریا کے لئے ہر وقت کھلے رہے، اس خوف کے مارے کہ مبادا آسٹریا کی جنگ سے سارے وسط یورپ کا نظام متزلزل نہ ہو جائے۔

آسٹریا کے لئے یہ کوئی خوشگوار صورت حالات نہ تھی، اس لئے متعدد بار اس نے جرمنی سے تعلق پیدا کرنے کی کوشش کی۔ ان سب کا اعادہ پہلا ضروری نہیں معلوم ہوتا۔ مثلاً ۱۸۶۶ء میں آسٹریا کے و صوبات میں سے تین صوبوں نے جرمنی سے اتحاد کا ریزولوشن پاس کیا جو کہ فرانس وغیرہ کی وجہ سے شرمندہ عمل نہ ہونے پایا۔ سب سے اہم واقعہ وہ تھا جب آسٹریا نے جرمنی سے اتفاقا دہی اتحاد کا ارادہ کیا، لیکن فرانس نے ایسی سخت

نہایت میں اپنے دامن میں ڈھکا کر ڈھکادی کو سوسے تھی صرف ایک چوڑے سے قبضہ محدود ہو گئی اور اس کی کل آبادی صرف ۶ لاکھ رہ گئی (جرمنی کی آبادی سے کم ہے) یہ تشنگ نہ صرف ایک دردناک پیلور رکھتا ہے بلکہ کبھی حد تک متھک نیز خیر ہے۔ مشہور کہاں ہے کہ جنگ کے بعد دو ادا لوگوں میں حسب ذیل بات حیات ہوئی۔ آدھی ذرا آسٹریا کے چاروں طرف گھوم آئیں، دوسرے نے جواب دیا۔ نہیں بھائی، میں دو پہر سے پہلے واپس نہیں آنا چاہتا، لیکن یہ محض مذاق کی بات نہیں۔ آسٹریا کی اس کمزوری کا اثر یورپ کے سارے سیاسی و اقتصادی نظام پر پڑا۔

خدا عزوجل نے کساہدہ وارسائی کے ترتیب دینے والوں نے ایک ایسا ملک بنادیا جو اپنے سپروں پر کھل پڑنے کی بھی صلاحیت نہ رکھتا تھا، ۳۳ ہزار مربع میل کا ایک عجیب سا ملک لیکن اس میں بھی نوے فیصدی پہاڑی علاقہ کسی نے لیا خوب کہا ہے کہ آسٹریا کی خاص پیداوار پہاڑی سینئر ہے، اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ آسٹریا میں خود اتنی استقامت نہی کہ اپنا بیٹ اپنے غصے سے سہکتا۔ اس لئے غلڈی و آرمہ لادی تھی، اس کے بدلے میں مزدوری تھا صنعتی کاروبار ہوتا لیکن خام پیداوار مثلاً کوئلہ وغیرہ کی کمی تھی۔ ہاں لوہائی فراوانی تھی اور خشکوں کی کثرت، جس کی وجہ سے آسٹریا کی خاص صنعت کا غذاسازی اور لکڑی کے کاروبار کو فروغ ہوتا رہا۔ لیکن آسٹریا کی ہمایہ اقوام نہ خام پیداوار ہینا کرنے پر راضی تھیں اور نہ اس کی مصنوعات ہی کو خریدنے کے لئے تیار۔ نتیجہ اقتصاد اور تجارتی انتشار۔

جنگ عظیم کے وقت یہ دعویٰ کیا جاتا تھا کہ یہ جنگ دنیائے جنگ کو ختم کرنے کے لئے لڑی جا رہی تھی، یہ دعویٰ تو باطل ثابت ہو چکا۔ لیکن ایک طریقے کے قول کے بموجب اس جنگ کے بعد جو معاہدہ ہوا وہ یقیناً ویسے صلح تھی جس نے صبح کا اسکان دینا سے خارج کر دیا۔ پالیسیڈنٹ وٹن کے بلند بانگ و عادی حرف نہط ثابت ہوئے۔ معاہدہ وارسائی کے الفاظ میں آسٹریا ہنگری کی اقوام کو خود مختار نہ ترقی کی پوری آزادی دی جائے۔ لیکن مقام حدیث ہے کہ ایک طرف خود اختیاری کا نظریہ تھا۔ لیکن علاوہ بہت سے حصے جو مثلاً آسٹریا سے متعلق تھے آسٹریا سے الگ کر دیے گئے مثلاً جنوی، ٹائیروں، گلیڈیشا۔ لیچن۔

زیکو سلوکیا کے قبضہ میں ۳۰۰۰۰۰۰۰ جرمن زبان والے آسٹریا کے عید

کی کامیابٹی دی اور کامیابی اور فتحدی کے لغات سے بچے لگے برٹشٹ پارٹی کی علی کامیابی ایک معجزہ سے کہ نہ تھی اور دنیا کی دوسری قوموں کے لئے شعلی راہ ہدایت ثابت ہو سکتی تھی۔ لیکن اس معجزہ میں عصائے موسیٰ فرائض وغیرہ کی مالی امداد تھی جس کے بغیر میسایم اور ظاہر کر کے میں آسٹریا کا ایک سنٹ زندہ رہنا نامکن تھا، سیاسی حیثیت سے آسٹریا ایک عجیب ملک تھا، ایک رجعت پسند ملک میں ایک (احمد حسن) دار الخلافہ بیرونی ممالک اگر مالی مدد روک لیں تو ساما توازن درہم برہم ہو جائے اور آسٹریا کی ساری ترقی کا فور ہو جائے۔ ۱۸۷۱ء میں میسایم اور پر کھیلے، فرائض نے ہاتھ روک لیا اور آسٹریا کے بنیک بنڈل دیگر ممالک کے بنکوں کے بوسیدہ عمارت کی طرح گرنے لگے۔

سیاسی حیثیت سے اس اقتصاد ہی ہنگامہ کی اہمیت بہت زیادہ ہے، کیونکہ دراصل آسٹریا میں جمہوریت کی موت اور آمریت کی پیدائش اسی رستہ پر جا کر مہر بن منت ہے۔

اس سے قبل ہی آسٹریا میں مصطفیٰ صبح بویا جا چکا تھا، اور انتہائی تداوت پسند صوبے اور لوگ ہزارہ خان سٹارٹنگ کی قیادت میں ایک نئی فوج میں منظم ہونے لگے تھے جس کا نام (Hochwehr) تھا۔ ان فوجیوں میں اور شوٹس حکومت میں اکثر جھگڑا رہتا تھا، جب ۱۸۷۳ء سے ڈرامین صورت اختیار کرنا شروع کی۔

ایسی فضا میں ایک کھربائی طاقت وجود میں آتی ہے جس کا نام ڈولفس تھا، چند ہی سالوں میں اُس نے آسٹریا کی ارجل میں ایک نیاں پوزیشن حاصل کی۔ پس جب ۱۸۷۳ء میں ڈاکٹر بورش کی حکومت مستعفی ہوئی تو ڈولفس کو حکومت بنانے کی دعوت دی گئی۔ اگرچہ اس کی سیاحتی مرت ایک کی تھی۔ پھر سب سے ذرا نہ ڈرا، اور بے خطر ہو کر چاندی منظور کی۔ یہ نائنے قد کا چاند آسٹریا کی تاریخ میں بڑی اہمیت کا مالک ہے، اُس نے آسٹریا سے جمہوریت کی بجائے کی، پارلیمنٹ کو ختم کر دیا، آمریت کی بنیاد ڈالی، اجتماعی اور فطرتی پارٹیوں میں تصادم پیدا کرنا چاہا، لیکن اسی اعلام سے خود بھی ختم ہو گیا۔

وہ ایک کسان تھا اور ایک کسان کی طرح بروخو غلط ذہنیت کا مالک، خدا پر یقین رکھتا تھا اور ملین تھا کہ اس کے ہر کام میں خدا کا ہاتھ

مخالفت ہوئی کہ یہ اس کی کامیاب نہ ہو سکی۔ یہی نہیں بلکہ فرائض نے آسٹریا میں ایک کریٹ ڈیفالٹ (Kredit default) (جو کہ وسطی یورپ میں اقتصادری مرکز کی حیثیت رکھتا تھا) سے امداد اہل سہلی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سارے یورپ کے اقتصادری نظام کا بچہ بچہ لگا لگا اور نہ صرف آسٹریا ہی دیوالیہ بن کے مندر میں ڈوبنے لگا بلکہ اُس کی لہریں بلانید تک پر اثر انداز ہوئیں، ایک مشہور مصنف میکا رٹھی کا دعویٰ ہے کہ فرائض کی اس مضبوط اقتصادری گرفت کا ہی نتیجہ تھا کہ آسٹریا ہر ممکن تدبیر کے باوجود فاضل کی مصیبت سے نجات نہیں حاصل کر سکتا تھا۔

یہ بات واقعی قابل حیرت ہے کہ فرائض وغیرہ کی ضرورت کے باوجود آسٹریا کس طرح زندہ رہ سکا۔ غالباً جو چیز اس عالمگیر مصیبت میں آسٹریا کی معاون ثابت ہوئی وہ آسٹریا کے باشندوں کا جبر و استقلال تھا، لیکن یہ بے خبری اور بے پروائی اور غفلت زیادہ عرصہ برقرار نہیں رہ سکتا تھا، بالکل گھٹو غافل آسٹریا کو خواب غفلت سے بیدار کرنے میں مل پیرا ہوئیں، ایک ہٹلر اور دوسرا ڈولفس۔

اس جگہ ضروری ہے کہ ہم آسٹریا کے سیاسی نظام پر ایک نظر ڈالیں، جس کے بغیر گزشتہ تہ سال کی جنگی تاریخ ناقابل فہم ہے۔

جنگ عظیم کے بعد آسٹریا میں ایک دفاتی نظام قائم ہوا اور یہ چھوٹا سا ملک و صوبوں میں منقسم ہو گیا۔ دار الخلافہ وینا کی حیثیت ایک صوبہ کی تھی، ساری آبادی کا تہائی حصہ دار الخلافہ میں آباد تھا، دیانات اپنی گونا گوں جماعتوں کے دیگر موجدات سے ایک جدا گانہ حیثیت رکھتا تھا، یہی جہاں باقی صوبہ جن میں کسان آباد تھے مذہبی رحمان کے باعث رجعت پسندانہ سیاست کے حامل تھے۔ ویانا ایک ترقی پسند صوبہ تھا، جس پر اشتراکی جمہوری پارٹی برسر اقتدار تھی۔ جنگ عظیم کے دور بعد جب کمونزم کا ایک سیلاب سارے وسطی یورپ میں موجزن ہو رہا تھا، اس وقت اس اشتراکی جمہوری پارٹی نے آسٹریا میں کمونزم کو پسپے سے روکا۔ ویانا میں اور اس کے ہمسایہ صوبوں میں ایک کشش جاری تھی، لیکن اس دباؤ کے باوجود ویانا یونیورسٹی اپنے کام میں لگی رہی اور چند ہی سالوں میں اصلاحات کی یہ فزادائی تھی کہ بلاشبہ ویانا دنیا کے سب سے زیادہ ترقی یافتہ یونیورسٹی میں شمار کی جاتی تھی۔ (Kaiserliche Universität Wien)

ہی جلد ہلکے اس جذبہ کی تشریح کرتا ہے۔ وہ رقمطراز ہے "میرے لئے یہ بات بہت معینہ ثابت ہوئی کہ میری پیدائش بران میں ہوئی۔ یہ مجھ کو سا شہر ان دولوں جو جن ملک کی دریاہی سرحد پر واقع ہے۔ جن کے اتحاد کے لئے ہر ممکن کوشش ہم جائز سمجھتے ہیں" اور پھر مزید برآں "اسٹریٹیا کو جن قوم غلام کے پاس واپس ہونا پڑے گا۔ افساد ہی وجوہات کی باعث نہیں۔ مشترک نسبت ایک مشترک ملک میں ہونی چاہیے۔"

ایک ایسے شخص کے لئے جس کا مقلوب ہے "سرحدیں محض انسانی طاقتوں سے بنی اور بدلتی ہیں، طاقت ہی ملکیت کا واحد حق ہے جس کی لامتناہی کی بعینہ" یہ جذبہ متنازع کرنا ثابت ہو کر ہے۔ ان واقعات اور درسیاں کرالوں کی تفصیل جن کا نتیجہ آج ہماری نظروں کے سامنے ہے، آسان نہیں، کیونکہ اکثر اہمیت ابھی تک میٹھا راز میں ہیں اور سیاسی تحقیق مینیوں کی لئے اتنی متعادل ہے کہ کسی غیر جانبدار شخص کے لئے تصنیف کرنا ذرا مشکل ہے۔ پھر بھی ہماری کوشش ہوگی کہ مختصر طور پر ان شاطراں جالوں اور تحریکوں کا ذکر کریں، جس نے حق کو باطل کی طاقت کے سامنے سونگوں ہونے پر مجبور کیا۔ جس وقت سے ہلکے جہنم میں ہر سر اقتدار ہوا اسی وقت سے آسٹریا کی طرٹ رخصتہ نگاہیں اٹھنے لگیں، اور چونکہ شروع شروع میں نازیوں کی طاقت حکم اور نظم نہ ہوئی تھی اور یورپ کی سیاسی نفسا اتنی مکدر نہ تھی، اس لئے اکثر جرمنیں پوشیدہ رہیں۔ نازیوں کے آلاکار دہشت انگیزی اور پروچینڈا تھے، اول الذکر اس قدر سرعت کے ساتھ ترقی پذیر تھی کہ آسٹریا کی آبادی کا متعدد حصہ جرمنی کے خلاف ہو گیا۔ ہر دیکھ چکے ہیں کہ سٹریا اور سٹریا کے دو ان میں آسٹریا کی ہمدردی جرمنی کے ساتھ تھی، لیکن گٹزکی سند ہے کہ سٹریا کے آداؤنک کم از کم ۱۰ فیصدی لوگ جرمنی کے مخالف ہو گئے۔ اس کا باعث دہشت انگیزی اور پروچینڈا کا وہ سیلاب تھا جو بہت چلا آ رہا تھا، اور جس نے فرانس، اٹلی اور برطانیہ کو بھی خواب غفلت سے جگایا۔ ان اقوام نے مددائے احتجاج بلند کی، جس کا فوری نتیجہ نازیوں کی سرگرمیوں کی سرورقاری کی صورت میں ظاہر ہوا۔

مکن تھا کہ کفایہ اسی طرح گرم و سرد ہوئی رہتی کہ آسٹریا کی خارجہ اور اندرونی حکمت عملی میں ایک انقلاب پیدا ہوا جس نے آسٹریا کی سیاسی بساط کا پرانا نقشہ دہم پر دم کر دیا، اور جس نے نازیوں کو مجبور کر دیا کہ وہ

کار پرواز ہے، جمہوریت اور آزادی کے پرستاروں کے لئے ہر مارچ کا دن آسٹریا کی تاریخ میں ایک نہایت خوش دن تھا کیونکہ اسی دن آسٹریا کی پارلیمنٹ نے خود کشی کی اور ڈولفس کا پیش کردہ نہر کا بیانیہ لیا۔ دنیا کے متعدد اکثر واقعات کی طرح اس کی بھی ابتدا نہایت ہی سہمی طریقے سے ہوئی، کسی شمار رائے کے دوران میں ایک سوشلسٹ ممبر کسی ضرورت سے باہر چلا گیا اور اس کی جگہ پر اس کے کسی دوست نے اس کی طرف سے ایک جمعیٹ بیٹ پر ڈال دیا۔ اسی کا صدر جو ایک ( ) تھا،

بہت عالی دماغ اور ایماندار تھا۔ اس نے اس قانون درازی کی اجازت نہ دی، اور فیصلہ سوشلسٹوں کے خلاف اور حکومت کے موافق دیا، رائے کا خلاصہ ۸۰-۸۱ تھا۔ شور وغل میں صدر نے دماغی توازن کھو دیا۔ اور اسی جگہ پر استعفا دیدیا۔ دولوں نائب صدور نے بھی صدر کی تقلید کی۔ بات تو آئی گئی ہو جاتی۔ لیکن ایک مشکل یہ آئی کہ آسٹریا میں قانونی طور پر پارلیمنٹ بائیس کا اجرا، صرف صدر یا نائب صدر کر سکتا تھا، اور اس وقت تینوں مستثنی ہو چکے تھے، ڈولفس کے ایسا شاطراں تھا۔ ان اس موقع سے کب چوکنے والا تھا۔ اس نے فوراً اپنا بھی استعفا دیدیا اور تین روز کے اندر اندر ایک آمر کی حیثیت سے نمودار ہوا۔

بیان تو یہ خود دہری تھی، یہ تو وہ میں میں، یہ تصادم، یہ کشمکش اور دور آفاق پر ایک چھوٹا سا بادل وجود میں آ رہا تھا، جو عنقریب سارے آسٹریا پر محیط ہو جانے والا تھا، یہ بادل ہلکے تھا۔

ہلکے ایک ناقابل فہم انسان ہے یا بقول بیڈن "ہلکے انسان نہیں ہے جس کے ساتھ کوئی سمجھنا آدمی کسی قسم کا سمجھنا یہ بات جیت کر سکتا ہے۔ وہ ایک مافوق الفطرت پہنچتا ہے جس کو آپ ختم کیجئے یا خود ختم ہو جائے" لیکن اس کے باوجود وہ ایک عاقل گوارا انسان ہے۔ اور یہی غالباً اس کی عظمت کی سب سے بڑی دلیل ہے، اس نے اپنی عہد آفریں خود نوشت سوانح عمری میری جد و جہد میں متعدد بار آسٹریا کے بارے میں اپنے خیالات اور نصب العین کا اظہار کیا ہے۔ ہلکے کا پیدائشی وطن آسٹریا ہے اور اس لئے ایک نفسیاتی کشش اس کو آسٹریا کی طرف مینجی رہی ہے، اس پر امن ذہنی، افساد ہی اور سیاسی فوائد اور آپ پر ہلکے کی آسٹریا سے بچسپی کا راز منکشف ہو جائے گا۔ میری جد و جہد کا سیلا

کسی یقین اور مخصوص راہ عمل پر گامزن ہوں۔

ڈولفس کی طاقت کا راز اس کی دوسری اوسلوئی کی مد میں مضمر تھا۔ آج جب کہ ہر مسلوینی اور ہٹلر کی نغیب اہمیت کی ایک جہتی کو مد نظر رکھ کر ان دونوں کے لازمی اتحاد پر محکمہ ساز کرتے ہیں تو ہم غائب بھول جاتے ہیں کہ ان دونوں آدمیوں کا اتحاد بہت تازہ ہے۔ اور کئی سال تک دونوں میں آسٹریا کے اوپر کشش رہی، یہاں تک کہ ان دونوں کا تصادم کسی کو بھی حیرت میں نہ ڈالے اس کشش کی وجوہات کئی ہیں۔

(۱) اوسلوئی ہر حالت میں اپنی سرحد پر کمزور قوموں کے وجود کو طاقتور اور جنگجو جن لوگوں پر ترجیح دے گا۔ اگر آپ نقشہ پر ایک نظر ڈالے تو آپ پر واضح ہو جائے گا کہ اٹلی کے شمال میں کوہ (وے) ہی محافظہ کا کام دیتا ہے جیسے ہالیہ ہمارا پاس بان ہے، اور شمال سے فوج کے آنے کا راستہ صرف بذریعہ درہ برنیر ہے جو آسٹریا اور اٹلی کی سرحد پر واقع ہے۔

(۲) ہٹلر کا دعوے یہ تھا اور ہے کہ تمام جرمن نسلیں ایک ہی ملک کی سرحد میں آجانی چاہئیں، بد قسمتی یا خوش قسمتی سے جنگ عظیم کے بعد کی لوٹ مار میں اٹلی کے قبضہ میں جنوبی ٹائرول آگیا، جس میں سولہ لاکھ جرمن رہا، بسنے والے لوگ آباد ہیں۔

خند و دگر وجوہات کی بنا پر جن کا ذکر آگے آگے سے کیا گیا، اوسلوئی نے یوں کہنے کو ڈولفس کو اپنی حبیب میں ڈال لیا۔ اوسلوئی نے یہی نہیں کیا، بلکہ اپنا ایک اور اسجٹ شہزادہ اسمار ہمبرگ کو بنا لیا، جو صیہم اور پر دیکھ آئے ہیں۔ آسٹریا میں فسطائی جماعت کا باقی اور رہتا تھا، اُس وقت تک ڈولفس نے اپنی آمریت کی بنیادیں کافی ٹھکر کر لی تھیں، ڈولفس کا ارادہ ایک طرف تو سوشلسٹ جماعت کی پڑھتی ہوئی طاقت کو کچل دینا تھا اور دوسری طرف وہ اپنے ملک کو آزاد بھی رکھنا چاہتا تھا اور اس لئے جرمنی سے نازیوں کے سیلاب کے دفاع کے لئے بھی پریشان تھا۔ پس اُس نے اپنے ملک کی اندرونی فسطائی جماعت اسمار ہمبرگ کی بیوہ پرست اتحاد پیدا کرنا چاہا، لیکن تھا کہ ڈولفس اسی طرح ( ) میں

رہ کر راست و چپ دونوں جانب اشتراکیوں اور نازیوں سے لڑتا رہتا، لیکن اوسلوئی کی شہ لی جانے کے بعد اس نے طے کر لیا کہ اپنی استبدادیت

اور طاقت کا رزق سوشلسٹ جماعت کی جانب پھیر دے۔

آسٹریا میں سوشلسٹ جماعت کا فی نظم اور ترقی یافتہ تھی، لیکن اس نے اپنے ہاتھوں آپ اپنے پیروں پر کھلائی ماری کیونکہ اس نے اپنی آنکھیں اس خطرہ کی طرف سے بند کر لی تھیں، جو فسطائی طاقت کی بے راہ روسی میں پوشیدہ تھا، سوشلسٹ جماعت صلیح پسند جماعت تھی، اس پسند جماعت تھی، ان مزدوروں کی جماعت تھی جو اپنی مزدوری سے مطمئن تھے اور جن کو دیانا کی ترقی پسند کمیونٹی کی بدولت بہتر کام آرام بہتا تھا، آسٹریا کی سوشلسٹ جماعت کے رہنما ایسے عالمی ظرف لیکن برخود غلط لوگ تھے، جس کی حالت میں انہیں کرنے کے لئے تیار نہیں تھے کہ اُن کے دشمن ذلیل اور کمزور حرکات پر اُتر آئیں گے۔ غور تو کیجئے ڈولفس سوشلسٹ جماعت کی بیخ کنی شروع کر دیتا ہے، اسمار ہمبرگ کی فسطائی فوج کے جیروہ متیل زوروں پر ہیں اور دونوں محکمہ راہ و رکچہ میں کہ دیا ناسے سوشلسٹ پارٹی کا دعوہ و معدوم کر دیا جائے گا، لیکن دوسری جانب سوشلسٹ پارٹی کا رہنما بائیر ایک امیدواریوں پر کہ شاید یہی صلیح کا امکان ہو اور خود غریب بن جائے اپنی جماعت کو کسی قسم کے اقدام سے روکتا ہے۔ کئی مصنف نے کتنی بچی تیلی بات کہی ہے کہ آسٹریا میں سوشلزم اپنی شرافت کی وجہ سے ختم ہو گئی، آسٹریا کی سوشلسٹ پارٹی نے ایسی حالت میں جو مقابلہ کیا اور یہاں دوسری اور اہل العزمی کا جو نمایاں ثبوت دیا وہ دنیا کی تاریخ میں ایک درخشندہ باب ہے، چاروں ملک خاندانی جتنی ہوتی رہی۔ دیا ناسے کے مزدوروں کے ٹھکانا کو اثر مبارکی کی نذر کر دئے گئے۔ عورتیں اور بچے فسطائیوں کی بند دقوں کا نشانہ بنائے گئے اور چار روز کے اندر آسٹریا سے سوشلسٹ پارٹی کی مرمت کا لعدم ہو گئی۔

ڈولفس کا نصب العین خواہ کچھ بھی رہا ہو لیکن اس سے انکار نہیں کیا جاتا کہ وہ آسٹریا کی آزادی کو برقرار رکھنا چاہتا تھا، لیکن اس نے اسی جذبہ کو اسی جماعت کو اسی طاقت کو جو آسٹریا کی آزادی کی ممبر دار ہو سکتی تھی، ختم کر دیا اور نازیوں کو نسلیں بچانے کا موعظ دیا، کیونکہ نازیوں کی دہشت انگیزی اور روٹیہ جس کام کو سر انجام دینے میں ناکامیاب رہے وہ کام ڈولفس نے جو کہ نازیوں کا کسی صورت سے دوست نہ تھا پورا کر دیا، جمہوریت کے نام لیاؤں کا قلع قمع ہو چکا تھا، اس لئے اب نازیوں کی طاقت کو عروج

نازی تھا، اور بہت ممکن تھا کہ ڈولفس خود ہی ختم ہو جاتا، لیکن سولینی کی مدد پر رہی اور ڈولفس اپنی آمریت کی کیناؤ زندگی کچھ دنوں تک اور طویل کرنے میں کامیاب رہا۔

لیکن سارا توازن درہم برہم ہو چکا تھا، فرانس اور برطانیہ غلطی اپنی اپنی مشکلات میں مشغول تھے اور دخل و معقولات سے عاجز۔ ڈولفس اور اسٹاربرگ میں وہ پرانا رابطہ ختم ہو چکا تھا، کیونکہ دونوں ایک دوسرے کو اپنی طاقت میں رخنہ خیال کرنے لگے تھے۔ ڈولفس نے سچائے اسٹاربرگ کی فوج کے ایک نئی فوج کو جوشیلا بہت دھڑبڑ پرست ششنگ کی سرکردگی میں قیام میں آئی تھی امداد دینی شروع کی۔

۵ مئی تک صورت حالات اس خاموشی کے مانند رہی جو طوفان کا پیش خیمہ ہوتی ہے، لیکن اس دوران میں طوفان خیز جماعت - جرمنی کے نازی، براہر اپنی سرگرمی میں مصروف تھے اور کہا جاتا ہے کہ تقریباً ۵ کروڑ مارک جرمنی کی طرف سے محض پرہنگینہ پر خرچ کئے گئے۔ مگر محض پرہنگینہ کسی ملک کو اپنی آزادادی قربان کرنے پر راضی نہیں کر سکتا۔ نازی اس حقیقت سے قہرے تھے، خود جرمنی میں ان کا تجربہ ان کو بتا چکا تھا کہ جب تک ضعف آبادی کو وہ تہ تیغ نہ کر چکے ان کی ساری عبادت گاہیں اور ساری دہشت انگیزی کسی کام نہ آئی۔ اس لئے تیسری کی گئی کہ ڈولفس کا جو نازیوں کے حملے کے لئے سینہ سپر تھا، خاتمہ کر دیا جائے، اور ۲۵ جولائی ۱۹۴۴ کو ڈولفس ایک نازی کی گولی کا نشانہ بنا دیا گیا۔ اختتام تو یہ کیا گیا تھا کہ ڈولفس کے قتل کے ساتھ ہی حکومت پر بھی نازی قبضہ کر لیں۔ لیکن جینر غلطیوں کی وجہ سے ساری سازش ممکن نہ ہو پائی نازیوں کا خیال تھا کہ آسٹریں فوج ان کا ساتھ دے گی۔ مگر آسٹریں فوج اپنے ملک کی آزادی کی دفا دار رہی، نازیوں کا خیال تھا کہ کیتھولک صوبے جو اکثریت کے خلاف تھے، ان کا ساتھ دیں گے۔ لیکن یہ صوبے پہلے ہی نازیوں کی دہشت انگیزانہ کارروائیوں کے باعث ان کے خلاف ہو چکے تھے، ایسی حالت میں صرف جرمنی کی مدد ان کے کام آسکتی تھی، مگر ہٹلر باوجود اپنے ہند بانگ و دغاوی کے جہاں خطرہ دیکھتا ہے دیے پاؤں داپس ہو جاتا ہے۔ یہ ساری سازش جرمن قوم کے فائدوں کی مرضی اور مدد سے وجود میں آئی، لیکن جرمنی نے اپنا قدم واپس نہ لیا، کیونکہ سولینی جو ڈولفس کا رہی تھا کسی حالت میں

بھی آسٹریا کو جرمنی کے قبضہ میں دینے کے لئے تیار نہ تھا۔ سولینی نے فوج اٹلی کی فوج کو آسٹریا کی جانب روانہ کر دیا۔ سولینی کی اس دلیسری کا نتیجہ یہ ہوا کہ ساری سازش غلط ہو گئی اور صرف ڈولفس کی روح ان اشرار کی منتقلین سے ملاقات کرنے کے لئے پہنچی گئی جن کو ڈولفس نے اپنی زندگی میں گولی کا نشانہ بنا یا تھا۔

ڈولفس کا قتل نہایت ہی اہم واقعہ ہے۔ اسی واقعہ سے یورپ کی سیاست میں ڈاکوں کا انداز شروع ہوتا ہے، نازی اس وقت تک کافی منظم ہو چکے تھے اور اس واقعہ نے دنیا پر واضح کر دیا کہ ایک ایسی جماعت نپور میں آنے والی ہے جس کے لئے سیاست میں شرافت، اہانتا، معاہدہ پرستی سب بے معنی الفاظ ہیں، دنیا پر ظاہر ہو گیا کہ ہٹلر جو کہتا ہے وہ کرتا بھی ہے، نازیوں کی اس حرکت کا سب سے بڑا اثر تو یہ پڑا کہ آسٹریا کی اکثریت ہٹلر اور جرمنی کے خلاف ہو گئی جس نے ان سے اس کے تنہے ڈکٹیر کو کھین لیا۔ اور یہ نامکن ہو گیا کہ نازی مسلح جوتی سے آسٹریا پر قابض ہو سکیں۔ ڈولفس کے ہٹلر سے آسٹریا کی ملکیت علی میں سولینی کا اثر کم ہونا شروع ہوا۔

آسٹریا کا دوسرا ڈکٹیر ششنگ تھا جو زیادہ ہر دلعزیز و متاعر لینی ابلیسیا کی وجہ سے ذاتی مشکلات میں مبتلا تھا ششنگ کے پاس اس کے سرا کوئی چارہ نہ تھا کہ جرمنی سے کسی قسم کا اقتصادوی اور مالی سمجھوتہ کرے، ششنگ کا یہ اقدام آسٹریا کی ملکیت علی میں ایک انقلاب کی حیثیت رکھتا تھا۔ سولینی آسانی سے اس کے لئے راضی نہ ہوتا۔ اگر یورپ کی سیاسی فضا نہ بدل گئی ہوتی، ہٹلر کے حملے کے دوران میں جب ساری اقوام عالم اٹلی کے خلاف ہو رہی تھیں صرف جرمنی نے دوستی کا ہاتھ بڑھایا تھا، اور اس کے لئے شرط یہ تھی کہ آسٹریا سے جرمنی کے منہ دہ میں سولینی رخنہ اندازی نہ کرے۔ جولائی ۱۹۴۴ کو جرمنی کے منہ دہ لان ہین اور آسٹریا کے درمیان ایک تم کی صلہ ہو گئی جس سے آسٹریا باوجود جرمنی کے تعلقات راہ راست پر آگئے۔ یہ بات آسانی سے سمجھ میں نہیں آتی کہ جرمنی اور آسٹریا کے ناخوشگوار تعلقات کیسے اپنی حدی صلہ جوتی میں تبدیل ہو گئے، اور خصوصاً جب آسٹریا کا نیا چانسلر ششنگ پرنسٹ ڈولفس کے جرمنی کے زیار و خلافت تھا۔ اصل واقعہ یہ تھا کہ ہٹلر نے سمجھ چکا

وعداد اول کے بعض سادہ لوح برطانوی مدبرین اس مکتبہ عملی کا مطلب یہ سمجھتے ہیں کہ ہٹلر کو مشرق کی طرف پھیلنے کی مکمل آزادی دیدی جائے تاکہ برطانیہ اور فرانس ہر قسم کے خفرو سے بری رہیں، اودکی جنگ عظیم کا امکان نہ رہے۔ لیکن ایسا کرنے سے وہ اسی چالاک کا شکار ہو جائے جو ہٹلر کا اصل مقصد ہے۔ ہٹلر قومیت یہ چاہتا ہے کہ شروع میں وہ ان کمزور اقوام پر حملہ کرے اور پھر جب ادھر سے اطمینان حاصل ہو جائے تو اسی رسمی و تاریخی دشمن فرانس کی طرف رخ کرے۔ ہٹلر کو اپنے ملک میں جو ناپاکیاں کامیابی حاصل ہوئی وہ اس کی خارجی مکتبہ عملی کی کامیابی کے سامنے بچ معلوم ہوتی ہے۔ شروع شروع میں ہٹلر کے پاس عسکری اور فوجی طاقت کی کمی تھی۔ مگر اس کے باوجود وہ دوسروں کی خود غرضانہ منافقت سے فائدہ اٹھاتا رہا اور دیکھتے بعد دیگرے کامیابی حاصل کرتا رہا۔ سب سے پہلے سربیا میں اس نے آلمینڈی شروع کی اور جمعیت اقوام کا قاذخ کرنا شروع کیا۔ اس کے بعد پولینڈ سے معاہدہ کیا۔ یہ بھی معاہدہ وارسائی کے خلاف تھا۔ اس کے بعد سربیا میں آسٹریا اس اس شروع کا سہیلہ بنا تھا جس نے ڈانٹس کو قتل کیا، مگر جو ناکامیاب رہی۔ اس تمام عرصہ میں ہٹلر کی دست راست برطانیہ کی خاموش سہن سہی تھی۔ برطانیہ کی حکمت عملی یورپ میں ہمیشہ طاقت کے توازن کے نظریہ پر قائم رہی ہے۔ جرمنی کی کمزوری جس کے باعث فرانس کی طاقت روز افزوں ترقی پذیر رہتی۔ برطانیہ کے مفاد کے خلاف تھی۔ اس نے معاہدہ وارسائی کے باوجود برطانیہ کی راہ پر یہ کوشش بھی کی کہ جرمنی کی طاقت بڑھتی رہے۔ برطانیہ کی اس حکمت عملی کے پس پشت دراصل لندن کے بڑے بڑے تجارت اور سرمایہ داروں کا ہاتھ تھا جو جرمنی کو کمزور اور موثر کم کا دشمن سمجھتے ہوئے بغیر معاہدے کے اصول پر مدد دیتے رہے، لیکن ڈانٹس کے قتل کے فوری بعد کچھ عرصے تک برطانیہ کا جرمنی سے یہ ہمدردانہ رویہ ٹھنڈا پڑ گیا، اور فروری ۱۹۳۷ء میں برطانوی فرانسیسی معاہدہ وجود میں آیا جس کے تحت مشرقی یورپ کے مختلف کے لئے ایک کمیشن بنائی قرار پائی۔ سلطان ابن عبداللہ دعاوی کی اہمیت سے واقف تھا، اس نے مارچ ۱۹۳۷ء میں معاہدہ وارسائی کی رو سے جو فوجی بائندیاں عاید کی گئی تھیں اس نے انہیں بھی مسترد کر دیا، فرانس، برطانیہ اور اٹلی کے ابراہان میں ایک دفتی بھان بڑا ہو گیا، اودسٹریا کا نعرہ سنہندہ ہوئی جس میں جرمنی کی آئندہ جارحانہ کارروائی کے خلاف ایک

متا کرم دست حالات متغیہ تھی کہ بجائے زیربستی کے کم از کم کچھ دلاں تک اودمکین چپڑی باتوں سے آسٹریا میں جرمنی کے اقتدار و سرخ کو فروغ دیا جائے دیا بقول گٹنر اس لڑائی کی زیربستی عصمت درمی کرنا جس سے آپ کل شادی کرنے والے میں ایک فضول سی بات ہے؟

اس کے بعد کچھ ہوا وہ تفصیل کا محتاج نہیں۔ گزشتہ ماہ سنگ سے ایک مجموعہ جو کہ دراصل ایک دھکی تھی وقوع میں آیا۔ سنگ کو احساس ہوا کہ آسٹریا کی آزادی معروضی خطر میں ہے۔ اس نے ہٹلر کی ذریعہ سے بچنا چاہا۔ مگر دوسری طاقتوں نے اس کی مدد نہ کی اور ہٹلر تین گھنٹہ کے اندر اندر آسٹریا پر قابض ہو گیا۔

جوابات قابل غور ہے وہ یہ ہے کہ کیا وہ ہے کہ ہٹلر جو آج سے ہم سال پہلے باوجود اپنی طاقت کے آسٹریا پر قبضہ کرنے میں بری طرح ناکام رہا۔ آج بغیر ایک گلی چلے سارے آسٹریا پر مختار کل ہو گیا، اس کا جواب ہم کو یورپ کی سیاسی شرط کی چالوں میں ملے گا۔ اس بساط پر بھی ایک سرسری نظر ڈالنی ضروری ہے

ڈبلیو بیسٹ اپنے ایک مقالہ افتتاحیہ میں رقمطراز ہے، جرمن مکتبہ عملی کا مخصوص حربہ یعنی عریاں زیربستی پھر ناپاکیاں ہوا ہے۔ آسٹریا دراصل اس خونیہ ڈراما کا تازہ ترین ایکٹ ہے جس کے پیچھے جتنے تجویزیا، معین، اسپین اور چین میں، اور ڈراما اہمی اختتام سے بہت دور ہے؟

ڈبلیو میل لکھتا ہے ہم یورپ کے تاریخی ارتقاء کے ایک فیصلہ کن تمام پر پہنچ گئے ہیں۔ سوال یہ ہے اب کیا ہوگا؟ یا غالباً اب کون ہوگا؟

یہ سوال معنی پرانی کا اظہار نہیں ہے بلکہ اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ جرمنی کی خارجی مکتبہ عملی یورپ کو کس راستہ کی طرف لے جا رہی ہے، وہی راستہ جنگ کا ہے۔ قتل و غارت کا ہے، خودکشی کا ہے، موت کا ہے۔ یہ حکمت عملی کیا ہے؟

ہٹلر اپنی خود نوشت سوانح حیات میں لکھتا ہے ہم کو چاہیے کہ جرمنی کی قوتیں کا رخ بجائے یورپ کے بیرونی ممالک کے یا یورپ کے مغربی اور جنوبی ممالک کے مشرقی یورپ کی طرف پھریں۔ اور اسی لئے گوشتہ چار سال میں اس کی برابر یہ کوشش رہی ہے کہ فرانس اور برطانیہ کی طرف سے اطمینان حاصل کرے، تاکہ آسٹریا اور دیگر ہسلوکیا اور یورپ کرین پر

دانشان سے دیتا ہے اور سولینی کو یقین دلاتا ہے کہ اگر اٹلی پھر جرمنی کی مدد یا ہمدردی کی ضرورت ہوئی تو مثلاً اس سے دریغ نہیں کرے گا۔

جنگ مش کے بعد سے برطانیہ کی خارجی حکمت عملی جو یہی ہے اس سے ان آدموں پر یہ بات اظہارِ نفس ہو گئی کہ برطانیہ ہر حالت میں جنگ سے اجتناب کرے گا خواہ یورپ کی سیاست سے اخلاقی عنصر غائب ہو جائے۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دنیا کا امن خطرہ میں پڑ گیا ہے۔ امریکہ کی ہمیشہ سے یہ پالیسی رہی ہے کہ یورپ کے مسائل ایک خانگی صورت رکھتے ہیں جس سے امریکہ کا کوئی تعلق نہیں۔ فرانس اپنے میں اتنی سکت نہیں پاتا کہ بغیر برطانیہ کی پالیسی کی تشریح کے کوئی مستقل فیصلہ کر سکے۔ امن پسندوں کی امید کا دار مرکز سوئٹ روس رہ گیا۔ مگر گزشتہ ڈیڑھ سال سے روس کے اندر ایک زبردست خانگی اتہزیسی پھیل رہی ہے جس کی وجہ سے روس غالباً معذور ہے کہ نہ تنہا سیاست عالم میں چنگیزیٹ اور رہنریت کے خلاف اپنا علم نصب کر سکے۔ سٹراٹین کا استعفیٰ بقول مسٹر لائیڈ جارج، سولینی اور ہٹلر کی فتح ہے، فرانس کی سیاست حربہ مولیٰ ایک نازک دور سے گزر رہی تھی۔ ایسے موقع کو ہٹلرک ہاتھ سے دینے والا تھا۔ اس نے فرسی فیصلہ کیا۔ حالات کا ٹھیک جائزہ لیا اور تین گھنٹے کے اندر یورپ کا سارا سیاسی نظام الٹ دیا۔

اجتماعی تحفظ جس تخیل پر جمیعت اقوام دو دین آئی تھی ایک بیکار چیز ثابت ہو چکی ہے، اور جب اس زمانہ کی تاریخ لکھی جائے گی تو اس گناہ کبیرہ کا سب سے بڑا الزام برطانیہ کے سر رکھا جائے گا۔ باوجود اپنی طاقت کے گمنام کے نہ سولینی اور نہ ہٹلر میں یہ جرات ہوئی کہ یکے بعد دیگرے سن مانی کرتے چلے جاتے۔ اس دعوے کا ایک ادنیٰ سا ثبوت یہ ہے کہ جب گزشتہ سال مراکش کے بارے میں ہٹلر کی کارروائی ظاہر ہوئی تو فرانس نے بخوبی ظاہر کر دیا کہ ہٹلر کا تشریح کی طرف متوجہ ہونا فرانس کبھی برداشت نہ کرے گا۔ نتیجہ ظاہر تھا، ہٹلر نے صاف اس واقعہ سے ہاتھ دھو لیا، پھر جب گزشتہ سال بحیرہ روم میں آبدوز کشتیوں نے برطانوی جنگی جہازوں پر حملہ کرنا شروع کیا اور برطانیہ نے نین کا نفرٹس منفقہ کر کے اس صورتِ حالات سے اپنی بیزاری ظاہر کی تو تین مہینہ تک پھر کسی قسم کا اتفاق نہیں ہوا۔ یہ مزور ہے کہ گمنامی طرزِ حکومت کے اندر مجبوراً کافر فرما ہے۔ یہ بھی صحیح ہے

معاذِ قیام کرنے پایا۔ لیکن اس میں کس قدر ایسا اندری اور اہلیت تھی اس کا ثبوت اس سے ملتا ہے کہ اس معاہدہ کی سیاہی بھی خشک نہیں ہونے پائی تھی کہ دس دن کے اندر برطانیہ کا وزیر خارجہ سر جان سائمن ہٹلر سے دوستانہ ملاقات کے لئے برلن جا نکلیے۔ چہ دلا درست دزدے کہ کیف چراغ دارد۔ اور جون میں اس کا نتیجہ برطانوی جرمنی بحری معاہدہ کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے، جو معاہدہ کی خلاف ورزی کا برطانیہ کی طرف سے نمایاں گناہ ہے، ایسٹس میں (Rhine land) پر جرمنی کا قبضہ اس کی جارحانہ کارروائی میں ایک اور قدم تھا، اس کے بعد ایسٹس میں اسپین میں جرمنی کا شورش پھیلنا اور خانہ جنگی پیداکرنا اور ترقی دینا جرمنی کا یورپ کی فضا کو مکدر کرنے کے لئے سب سے اہم کارنامہ رہتا۔ مگر اسپین کی اٹلی کا رجحان اور توجہ دیکھ کر ہٹلر نے اپنا ہاتھ واپس لے لیا، اور اسپین اٹلی کے حوالہ کر دیا یہ کہتے ہوئے کہ سپر دم تو مایہ خویش را۔

لیکن ان سب کے باوجود اس دعوے میں بہت کچھ حقیقت ہے کہ ہٹلر اتنا زبردست کارنامہ یعنی آسٹریا پر حکم ٹھکانا کھانے کی جرات نہ کرتا، اگر گزشتہ سال کے دوران میں یورپ کا سیاسی توازن درہم برہم نہ ہو چکا ہوتا۔

دنیا میں امن قائم رکھنے کے لئے برطانیہ کے علاوہ جو دو قوتیں سب سے زیادہ کوشاں تھیں وہ سوئٹ روس اور امریکہ ہیں۔ جنگِ مش کے موقع پر امریکہ نے ثابت کر دیا کہ وہ ہر عملی کارروائی کے لئے تیار ہے، اور اگر برطانیہ امریکہ سے اشتراکِ عمل کر کے پٹرول کی درآمد بند کر دیتا تو اٹلی کو ایک مہینہ کے اندر مش سے واپس ہونا پڑتا۔ مگر برطانیہ ان مضامی طاقوتوں سے کچھ ایسا خوفزدہ رہا ہے، اور برطانیہ کے سرمایہ داروں کا اٹلی اور جرمنی سے ممبرداری وہ یہ تمسک ایسا فیصلہ کن رہا ہے کہ سوائے سولینی کو خفا کرنے کے کوئی نکتہ کچھ نہ کھسکی۔ یورپ کی سیاست پر جنگِ مش جس کا سب سے زبردست اثر یہ ہوا ہے کہ اٹلی اور جرمنی میں اتحادِ عمل کے لئے برلن، روما، محورِ وجود میں آئی، آج جب ہٹلر آسٹریا پر قابض ہو چکا ہے تو یہ سولینی جو چار سال پہلے ہٹلر کے خلاف فوجی طاقت روانہ کرنے سے پرہیز نہیں کرتا، ہٹلر کو دوستانہ پیغام روانہ کرتا ہے اور اس کے کان پر بظاہر احوالِ ناک نہیں چھپاتی۔ کونسی عجیب کی بات ہے کہ ہٹلر سولینی کے اس پیغام کا جواب دلی لشکر

وسط اور مشرقی یورپ کی جمہوری ریاستیں ایک مسلسل خطرہ عظیم سے دوچار ہیں اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ جب تک برطانیہ کی خارجی پالیسی چمک رہی ہے اور لارڈ بلینکس ایسے لوگوں کے ہاتھ میں ہے کیا کچھ ہو جائے۔

اگرچہ جنگ کے بعد آسٹریا کا جرمنی میں جذب ہو جانا ایک جائز بات تھی اور زیادہ قابل اعتراض نہیں، لیکن آج جس طریقہ سے ہٹلر نے آسٹریا کو اپنے ہاتھ میں لیا ہے۔ وہ ایک سنگین واقعہ ہے، یہ واقعہ بذات خود اتنا سنگین نہیں جتنا وہ طریقہ ہے جس کو ہٹلر نے آسٹریا کا رہنا یا ہے۔ اقوام عالم کی بے بسی اس بات کی منظر ہے کہ آج دنیا میں بندوبست کا بول بالا ہے نہ سیاست کی روز افزوں ترقی دنیا کی امن و تہذیب و تمدن کے لئے ایک خطرہ عظیم ہے۔ اگر نازی جرمنی اور فسطائی اٹلی اور جنگ پرست جاپان اسی طرح جنگ کے دیوانہ کی پرستش کے لئے انسانی خون کی صینٹ چڑھاتے رہے تو وہ دن دور نہیں جب ہماری ساری تہذیب و تمدن ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گی۔ وقت تھوڑا ہے۔ لیکن ابھی بارہ نہیں گئے ہیں، اور ابھی ممکن ہے کہ آسٹریا کی اور جمہوری اقوام دنیا سے سلامتی کی کچھ پالیسی کو فریت دنا لو کر کے لئے ایک متحدہ محاذ قائم کر لیں۔ مگر کیا ایسا ہو سکے گا؟

(ادواراچ مشیر)

کہ ایک دنیا کے دن فسطائی طاقتیں دنیا کو عالمگیر جنگ میں مبتلا کریں گی لیکن ان سب باتوں کے باوجود دنیا میں امن خواہ لوگوں اور قوموں کی اکثریت ہے۔ ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ ترقی پسند ممالک مثلاً روس و فرانس اور برطانیہ اجتماعی تحفظ کے لئے کوئی مستقل قدم اٹھائیں اور فسطائی قوموں کی دیکھوں کی اہمیت سمجھ لیں۔ جمیعت اقوام ایک مضبوطی کی بنیاد پر امن کر چکی ہے۔ ان سب وجوہ سے یہ خطروہیت قریب ہو جاتا ہے کہ ہٹلر اپنی اسکیم کی آئندہ منزل کی طرف روانہ ہو جائے۔ یعنی ڈیکو سلو کیا۔ ہٹلر نے اپنی کتاب میں بار بار اس بات کا اعادہ کیا ہے کہ جرمنی کے لئے اپنی گذشتہ مقبوضات کے حصول کی سعی ایک فسطائی غش ہے، اور مقبوضات میں اور خدام پیداوار کی فراوانی محض ایک ڈھونگ ہے۔ مگر یہ ڈھونگ محض اس لئے راجا جا رہا ہے کہ ہٹلر برطانیہ کو مجبور کر دے کہ وہ اپنے ذاتی مفاد کے خیال سے ہٹلر کو روس پر حملہ کرنے کا موقع دیدے۔ مقبوضات کے واپس لینے کی چنج پکا محض برطانیہ کو پریشان کرنے کے لئے ہے، اور یورپ کی سیاست میں سولہا دھکا ایک نادر نمونہ ہے، ہٹلر کی اور ہٹلر کے ہٹلر کی طرف راغب ہو رہی چکے ہیں۔ پولینڈ سے تعاون کا معاہدہ مکمل کو پہنچ چکا ہے۔ اب صرف ڈیکو سلو کیا پر حملہ باقی ہے۔

ڈیکو سلو کیا بھی ان ریاستوں میں سے ہے جو معاہدہ دار سائی کے مرتب کرنے والوں نے قوم کی جنبش سے پیدا کر دیں۔ اور قریب ڈیڑھ کروڑ آبادی میں تقریباً ہوا لاکھ جرمن نسل کے باشندے ہیں۔ جرمنی اس بات کو ایک غدر بنا رہا ہے، تاکہ ڈیکو سلو کیا کے معاملات میں دخل دینے کا ایسے موقع مل جائے، اور آسٹریا کی تاریخ ڈیکو سلو کیا میں دوہرائی جائے تو کیا واقعی ڈیکو سلو کیا کے اوپر غریب مصیبت نازل ہوئے والی ہے؟ سویت روس اور فرانس دونوں نے صاف طور سے نفی کر دیا ہے کہ بغیر برطانیہ اور دوسری اقوام کی رائے کے وہ ڈیکو سلو کیا کو جرمنی سے بچانے کے لئے جنگ سے احتراز نہ کریں گے۔ ایسے تو ابھی کچھ عرصہ آسٹریا ہی میں ہٹلر کو اپنی بنیادیں محکم کرنے میں لگے گا۔ کم از کم ہم فیصدی اسٹریٹن باشندے ہٹلر کے خلاف ہیں اور ہم فیصدی کی آبادی کو ختم کرنا چاہتے ہیں اور دوسری اپنی رائے کا بنا پانچ دن لیتا ہے، ہر حال

جنگ عظیم  
نی نظریہ جنبش کو دیکھنا ہوتا ہے  
پیش قدم میں گھو گیا ہوں میں  
کبھی یہ ذکر کہ وہ مصومی نظریہ ہے  
جسے لگاؤ جنبش سمجھ رہا ہوں میں  
(راہنما نواز)

# مولانا عبد السلام اکبر علی حاحلہ

عبد اللطیف عظمیٰ

تبصرے کے صحیح فرائض انجام دیتا ہے تو اس کے سر کی خیر نہیں! اس کے فلاح تمام ممکن حربے استعمال کئے جاتے ہیں، تعریضات و گناہات، استخفاف و استہزاء، تحقیر و تذلیل کے جتنے الفاظ لغات میں مل سکتے ہیں وہ تمام اس پر صرف کر دئے جاتے ہیں، اسی وجہ سے ہمارے یہاں نفاق و بہت کم پیدا ہوتے ہیں۔ اگر کسی کو بہت بھی ہوئی تو دودھ کو دودھ اور پانی کو پانی کرنے کی جرأت نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا حاحلی کی کسی شخصیت کو اس وادی میں قدم رکھنے کی جرأت نہ ہو سکی تھی۔

میرے کہنے کا یہ مطلب نہیں کہ تبصرہ نگار معدوم ہوتے ہیں، ان سے غلطیاں ممکن نہیں۔ وہ جو لکھ دیتے ہیں، صحیح ہی ہوتا ہے۔ تبصرہ نگار کو صحیح راہ دکھانا، ان کی غلطیوں پر انہیں متنبہ کرنا، درحقیقت یہی سبب ادب و زبان کی بہت بڑی خدمت ہے، کیونکہ اُسے بہتیت اجتماعی)

میں مخصوص اہمیت حاصل ہوتی ہے، اس کی بے راہ روی بہتوں کو گمراہ کر دے گی اور لٹریچر کو غیر معمولی نقصان پہونچ جائے گا۔ لیکن لکھنے اور کہنے کے طریقے ہوتے ہیں۔ یہ کیا کہ جو زبان وقلم پر آیا اُسے لکھ دیا۔

صحیح نقد و تبصرہ، لٹریچر کی بقا و تحفظ اور ترقی و اصلاح کے لئے نہایت ضروری ہے۔ لیکن یہ جس قدر اہم ہے، انہوں ہمارے یہاں اسی قدر کم باب ہے، خصوصیت کے ساتھ موجودہ دور میں، اس کی کیا بی نہایت شدت کے ساتھ محسوس کی جاتی ہے، کیونکہ:-

ادبی تحقیر و اداہن کے سامان کے لئے موضوعات ختم ہوتے جاتے ہیں۔ غزل، قصیدہ، مثنوی، سہم۔ مرثیہ غرض ہر شے نظم میں داخل اسی طرح کے خیالات اب بھی پیش کئے جا رہے ہیں۔ جو صدیوں سے ہمارے پاس نسخہ بعد نس ہے آ رہے ہیں۔ مگر حاضر کی مغربی طرز کی نگلیں بھی کوئی نئی چیز نہیں، ان کی ساری جدت اتنے ہی میں ختم ہے کہ اشعار زیادہ تر ناموزوں ہوں، ایک ہی شعر کے دو مصرعے دو مختلف بحر میں ہوں، تشبیہات مغربی ڈھالوں سے ستار ہوں اور زبان حدودِ چار ماٹراس ہو، وہی نثر قرین نامتھ مرشار کے زمانے سے اس وقت تک کے نامال۔ نئے کہانیاں اور نئے سوائے معدودے چند کے سب ایک ہی ڈھانچے پر الفاظ بدل بدل کے لکھے جاتے ہیں، ان میں تنوع ہے اور نہ تخلیقی تھیں جس طرح تخلیقی کاموں کے لئے، جو بڑی حد تک تنقیدی بھی ہیں، بہت زیادہ ضروری ہے۔

لیکن سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ اگر کوئی نفاق و عام دستور سے ہٹ کر

ٹیک انہیں خصوصیات کا حامل، اگست کے نیرنگ خیال میں مولانا



دوسرے ماہ فقیر پھر آیا اور حسب سابق لکڑی کاٹی اور دامے کر چلا گیا۔ اس بار وہ پہلے سے بھی خفیت و کمزور معلوم ہو رہا تھا، مگر کسی نے کسی طرح اس نے کام کر دیا۔ کبھی کبھی اسے خفیت کام بھی کرنا پڑتے تھے۔ کبھی مجاہد دیتا۔ لحاف اور گندے صاف کرتا اور کبھی لکڑی کاٹتا۔ غرض کہ وہ یہ کام کرتا اور دام وصول کرتا رہا۔

خوشید کبھی کبھی ترس لھا کر اسے تھیں اور ہانچا سر بھی دیدیتا تھا۔ جب وہ کام کر کے جانے لگا تو خوشید اسے مطالعے کے کمرے میں بلاتا، اس سے میز، کرسی، درسی، اور کھڑکیاں صاف کرواتا۔ فقیر نہایت سنجیدگی سے اس کی ہر فرمائش اور اس کے ہر حکم کی تعمیل کرتا، لیکن کبھی کسی سے کلام نہ کرتا۔ اس کے کمرے میں اور جو لوگ بیٹھے ہوتے وہ اسے دیکھ دیکھ کر ہنسنے۔

ایک دن جب وہ کام ختم کر چکا تو خوشید نے اسے بلا کر کہا "سنو دوست، مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ میرے الفاظ را انگان نہ گئے، اور تم نے ان سے اثر لیا اور اب تم کام کی طرف توجہ کرنے لگے ہو، ویہ اشٹی — اچھا تہا نام کیا ہے؟"

"فیروز"

"فیروز، میں جانتا ہوں کہ تمہیں تہا ہی حیثیت کے مطابق کام دل۔ کیا تم کچھ پڑھ سکتے ہو؟"

"ہاں، جناب، بہت اچھی طرح"

"ادھر آؤ، یہ رقعہ لو اور میرے ایک کالج کے دست جو نفاں دفتر میں ہیں ان کو دیدینا، وہ تمہیں نقل کا کچھ کام دیدیں گے، اس کو نہایت احتیاط سے انجام دینا۔ اور سنو، مستندی سے کام کرنا، جس چیز نہایت کبھی نہ پینا — اور دیکھو میرے الفاظ ہمیشہ یاد رکھنا۔ اچھا..... خدا حافظ۔"

خوشید یہ سمجھتے ہوئے کہ اس نے ایک غریب و ناکارہ فرد کو کسی قابل کر دیا، بہت خوش تھا، اس نے فیروز کو آفرین کہتے ہوئے رخصت کر دیا، اور رخصتی کے وقت اس سے ہاتھ بھی ملایا۔ فیروز نے رقعہ لیا اجازت چاہی اور سلام کر کے کمرے کے باہر نکل گیا اور اس کے بعد پھر کبھی اس آدمی سے نہیں آیا کہ اسے لکڑی پھر نہ پڑے۔

اس کے علاوہ خوشید بھی دیکھ رہا تھا کہ جس نے اس کی حالت بدست بدتر کر دی تھی، اور نہ صرف یہ کہ وہ ڈبلا کر اور کام کے قابل نہ معلوم ہوتا تھا، بلکہ اس کے چہرے سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ اسے حرارت بھی ہے۔ خوشید کھانے کے کمرے میں جا کر کھڑکی سے دیکھنے لگا۔ جہاں سے لکڑی کی کوٹھری اور میدان صاف نظر آ رہا تھا۔

باد چن آگے آگے جا رہی تھی، اور فقیر پیچھے پیچھے۔ باد چن نے راستے میں اپنے ساتھی کو غور سے دیکھا، کچھ کہا اور اس کے بعد لکڑی کی کوٹھری کے پاس پہنچ کر تالا کھولا اور دھنکے کے ساتھ دروازہ کھول دیا۔ "معلوم ہوتا ہے کہ باد چن کسی کام میں مصروف تھی، اور اسے نادقت بلانا ناگوار گزارا۔ خیر" خوشید نے خیال کیا۔

بیکاری ایک لکڑی کے کندے سے پہنچ گیا اور اپنے سر کو ہاتھ کا سہارا دے کر کچھ سوچنے لگا۔ باد چن نے کہا "ڈی اس کے قدموں کے پاس بھیکاری، اور کچھ آہستہ آہستہ بڑبڑانے لگی، جیسے اس کو گالیاں دے رہی ہو، فقیر نے بے پروائی سے ایک گندا اٹھا لیا، اور اپنے پیروں کے درمیان مضبوطی سے پکڑ کر اسے چرنے لگا۔ لیکن جیسے ہی اس نے کندے پر کھانسی چلائی کندہ اچھل کر دوڑ جا کر اور فقیر کو در دوسری طرف۔ فقیر نے پھر اسے اسی طرف کھینچ لیا۔ اور ڈرنے لگا کہ مبادا کھانسی اچھل کر اس کی پیڑ کی انگلی کو زخمی کر دے۔ آخر اس نے دوبارہ کھانسی چلائی، اور اس بار لکڑی اچھل کر دوڑ جا گری۔

خوشید لکڑی کی آڑ سے یہ سب کرشمے دیکھ رہا تھا اور مدلی ہی دل میں اپنے اوپر نفیر کر رہا تھا کہ ناخن اس نے ایسے ناکارہ آدمی کو ایسے سخت کام پر مقرر کر کے اپنے سر غراب مول لیا۔ وہ اس وجہ سے اور پریشان تھا کہ وہ مر لیں بھی تھا۔

"کوئی حرج نہیں" اس نے آخرش خود ہی کہا، میں جو کچھ کر رہا ہوں اس میں اُمی کا فائدہ ضرور ہے، یہ کہتا ہوا وہ اپنے مطالعے کے کمرے میں چلا گیا۔ تقریباً آدھ گھنٹے بعد باد چن نے اس کو اطلاع دی کہ لکڑی ختم ہو گئی۔ "لو، یہ اشٹی اس کو دیدو، خوشید نے کہا۔ اور اس سے کہہ دو کہ ہر ماہ کی پہلی کو وہ اسی طرح آکر لکڑی کاٹ جایا کرے۔ وہ کبھی واپس نہیں کیا جائے گا۔ کوئی نہ کوئی کام اسے ضرور دیا جائے گا۔"

رفتہ رفتہ دوسال گزر گئے۔

لگا دیتی اور میں کھڑی لے کر چہرے کھڑا ہوتا، ایک منہ لگتا تو دس منٹ دم لیتا۔ غریب بادرچن دیکھنے آتی اور آخر رحم کھا کر خود کھڑا ہوتا چہرہ دیتی۔ میں آخر وقت اٹھتا آپ سے دام لیتا اور خوش خوش چلا جاتا، آپ کو سنکر تعجب ہو گا کہ میں نے آپ کے یہاں ایک بار بھی لکڑی خود نہیں چیری۔

خورشید پیسنکروخت تحریر ہوا، اور غصہ ہو کر بولا۔

”ناساختی، خدا تجھے سمجھے۔ بد قسمت آدمی۔ نہ تیرے لئے یہاں سکون ہے نہ آخرت میں۔“

لیکن آپ یقین کیے جب وہ کلاسی چیتی ہوتی تو میں اپنی جگہ بیٹھا بیٹھا محو ہو کر تاتا اور شرکایا کرتا، اُس نے متعدد بار میرے حال پتہ کیا۔ مجھے سمجھا یا اور آخر کار میں بھی رفتہ رفتہ سمجھا کہ اگر میں تو جو کچھ کرتا ہوں کرتا ہوں لیکن میری وجہ سے اس بادرچن کو کیوں تکلیف ہو، چنانچہ میں نے چرس پنا چھوڑ دیا، اور اُس کے بعد سے میری حالت سدھرنے لگی۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ صرف بادرچن تھی جس نے مجھے فرس سے اُٹھا کر عرش پر بٹھا دیا۔

خیر وہ میں ہوں یا بادرچن، دعا تو تمہارا سدھنا تھا سو وہ پورا ہو گیا؛ (پچھوت)

## تلاش حق

خدا کو بزم امیری میں ڈھونڈنے والو  
نشان شباب کا پیری میں ڈھونڈنے والو  
خدا تہیں نظر آتا ہے زر پرستی میں  
خدا کو ڈھونڈتے ہو تم فراخ دستی میں  
تلاش حق میں سبکدے ہو کچھ خیال کرو  
خدا کہاں ہے غریبوں سے یہ سوال کرو

(سفید فیضی جالندھری)

ایک دن خورشید عکاس خانے کے پاس کھڑا تھا اور منٹ خرید کر وہ ایک داسی کا انظار کر رہا تھا۔ اچانک اُس نے اپنے نزدیک ایک چھوٹے آدمی کو کھڑے دیکھا۔ وہ گرم پٹے سوٹ میں بیٹھتا تھا۔ اُس نے ٹوک سے منٹ کے لئے کہا اور وہ دم دے کر انظار کرنے لگا۔

”اغاہ فیروز صاحب آپ کہاں ہیں؟ خورشید نے اپنے کلاہار سے کو پہچانتے ہوئے کہا۔ کہو بھائی، اچھے تو ہو یا“

”بہت اچھا جناب، میں باکل بغایت ہوں اور آج کل ایک دفتر میں ہنرمند حیثیت سے دن سو رہا ہوں اور پرلاطم ہوں۔“  
”بڑی خوشی کی بات ہے۔ فیروز صاحب، میں پیسنکروخت سرور ہوں، اتنی تعزہ تو کافی ہے تمہارے لئے۔ تم جانتے ہو تم کسی نہ کسی بیچ سے میرے پیچھے ہو بیٹھیں یا دے لو میں نے نہیں کس طرح راہ راست پر لگا یا۔ اگر میں اُس دن تم پر تاننا نہ ہوتا، اتنا سخت سست نہ کیا تو شاید آج نہیں یہ دن بچنا نصیب نہ ہوتا، میں تمہارا شکر یہ ادا کرتا ہوں کہ تم نے میرے الفاظ تو مٹانے نہ ہوئے نہ۔“

”اس میں کلام نہیں کہ اگر میں اُس دن آپ کے پاس نہ جاتا تو اس وقت تک اپنے کو تسلیم و تسلیم کی بیج ہی میں بیٹھا ہوتا اور اب تک اسی غشی اور ناکامی کی زندگی بسر کرتا ہوتا۔ میں خورشید آپ کی وجہ سے سنبھلا اور غشی کے غار سے نکل آیا۔“

خورشید نے کہا ”میں تم سے بہت خوش ہوں“  
”اور میں بھی آپ کے گزشتہ الطاف و عنایات کا بیش از بیش شکر یہ ادا کرتا ہوں، آپ نے مجھے اُس دن جو رائے دی تھی وہ بالکل صائب تھی، میں آپ کا ہدایت منون ہوں اور خصوصاً نصیبن بادرچن کا، وہ رحمدل اور شریف عورت۔ میں آپ کا احسان قیامت تک نہیں بھول سکتا لیکن حقیقتاً وہ صرف نصیبن بادرچن کی ہستی تھی، جس نے مجھے اُس عذاب سے نجات دلائی۔“  
”میں سمجھا نہیں کرتا کہ یہ کہہ رہے ہو“ خورشید نے کہا۔

سنئے، واقعہ یہ تھا۔ فیروز نے کہا ”میں تو آپ کے یہاں ہر ماہ لکڑی چہرے کی فروخت سے آتا تھا، لیکن میں بہت نحیف و زار تھا، مجھ میں چلنے کی تاب نہیں تھی۔ لکڑی کیسے چرتا، بادرچن میرے سامنے کندوں کا ڈھیر





اور نہ اپنی تعصبات اور رکیز خیالات کی سلعین پردہاہ بین کی ہے

سلسلہ عی زما میں دارالصفین (اعظم گڑھ) کے متعلق ایک معنون شائع ہوا تھا مضمون نگار مولانا عبدالسلام صاحب پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

”مولانا کی اصلی خصوصیت سرت ادب و انشا کی ہے۔۔۔۔۔ آپ فخر

ادیب پیدا ہوئے ہیں، اس لئے آپ کی قوجہ کا محور صرف لٹریچر ہے،

ان کے فخر سے بنات مختصر نفع اور ہر سبب سے ہوتے ہیں، اور وہیں وہ

نظم و نثر و دلائل پر قادر ہیں اور دونوں کو اس انداز سے لکھتے ہیں کہ

اس کی تقلید نہیں ہو سکتی؟

استقصا مستعد و بین، اور نہ اس کی ضرورت، مولانا کی قابلیت اس قسم کے ثبوت سے بالا ہے، ورنہ فخر کے دفتر میں کئے جا سکتے ہیں۔

مہا آپ کا یہ فرمانا کہ شعر الہند کے جو حیرت سے اڑائے گئے ہیں، اُسے نا

مکمل ثابت کیا گیا ہے، تو یہ کوئی نئی اور تعجب کی بات ہے۔ دنیا میں کوئی ایسی

تصنیف ہے جس کے حیرت سے اڑائے گئے ہوں، جس کے مصنف پر فخر

نے کئے گئے ہوں، خصوصاً اس جماعت پرستی کے دور میں؟ یہ تو عام تصانیف

کی کیفیت ہے، تنقیدی کتابوں اور تبصرہ نگاروں کی جو گت بنتی ہے، وہ موجود

دور کا بہا ہے، ہی الٹک اور شرمناک واقعہ ہے۔

معمون نگار نے نزدیک شعر الہند کا مصنف حیوان آرزو پر تبصرہ کرتے

کا اہل نہیں، لیکن

بکر و ناگس ہے نقد تبصرہ کا مدعی؛ زندہ رہنا اہل فن کا آج کل دشواری ہے

لکھنوی شعر الہند کا فخر ہوتا تھا، شعر کہنے کے لئے خون جگر دے رہا ہے

کے کہنے والے کو وہ شعر الہند پر تنقید کرنے کا نہ صحت حق دیتے ہیں بلکہ اس کی

راسے کو قابل ثبوت سمجھتے ہیں، سچ ہے، دوسروں کی آنکھ کا شکایت آسانی

سے نظر آجاتا ہے، اور اپنی آنکھ کا شبہ نظر نہیں آتا، جو جس چادر صرے بھی

میچ نہ کہہ سکے، جسے یہ معلوم ہو کہ مترادفات الفاظ میں ترکیب اضافت

جائز نہیں۔ وہ شعر الہند پر کیا تبصرہ کر سکتا ہے اور اُس کے تبصرے کو کیا ثبوت

دی جا سکتی ہے۔

محب نے اُسے یا تو اس لئے نقل کر دیا کہ یہ اُن کے کوئی بزرگ ہیں اور

شعر الہند کے خلاف لکھا ہے، اس بحث میں کہ شعر کہنے والا تنقید کی اہلیت سے

لے اور وہ اکتوبر ۱۹۷۷ء

کس قدر معر ہے اور یا تو اُن کے نزدیک تنقید کے لئے کسی خاص صلاحیت

کی ضرورت نہیں، ہر وہ شخص جسے قلم چلانا آجائے، وہ تبصرہ کر سکتا، حالانکہ

۱) نقد و ادب کی مصلحت اور اس کے متعلق شیوں کی خصوصیات سے

واقف ہونا چاہیے، نیز متعلق اصناف سخن کی اصطلاحات کے متعلق

و معانی پر بھی اُس کو کافی عبور ہونا ضروری ہے، تاکہ جہاں کہیں مصلحت

آئیں، وہ ان کی تمام مصلحتات سے واقف ہو جائے۔

۲) تاریخ پر اس کی گہری نظر ہونی چاہیے، اسی کے تمام ادبوں اور

صنعتی دوروں کی نشوونما اور عروج و زوال سے اس کو کافی فہمیت

ہونی ضروری ہے، ورنہ بہترین سے بہترین تنقیدی سحر پر بھی ایک

شاذ رائے لکھیں یا درو عمارت ثابت ہوگی۔ (ادب تنقید صفحہ ۱۱۱)

محب کا یہ کہنا بالکل خلاف واقعہ ہے کہ مولانا نے اپنی زندگی میں ایک

مصرعہ بھی موزون نہیں کہا، اگر وہ معارف کا مطالعہ کرتے تو اپنی بے خبری

کا ثبوت نہ دیتے، لیکن جب محب کے نزدیک سبھی غیر شاعر کو شاعری پر تنقید

کا حق حاصل ہے تو پھر مولانا عبدالسلام صاحب نے کیا قصور کیا ہے کہ انہیں

یہ حق نہ دیا جائے، کیا صرف اس وجہ سے کہ آرزو لکھنوی کی اُنھوں نے لکھنوی

کی طرح محض تعریف پر اکتفا نہیں کی؟

معمون نگار نے مولانا سید سلیمان صاحب ندوی سے استمداد کی ہے

کہ باب الانفاذ کے فرائض، وہ اپنے ذمے لیں۔ لیکن اس کی کیا ضمانت

ہے کہ کمل اگر مولانا سید سلیمان صاحب نے آرزو صاحب کی شان میں کوئی

تعریفی قصیدہ نہ کہا تو یہی مطالبہ ان سے نہ کیا جائے گا اور اُن کے خلاف

اسی طرح خلاف نہ اچھالی جائے گی، جس طرح حیوان آرزو کے نقاد کے

خلاف اچھالی گئی ہے۔

اعظم گڑھ سے، فاضل مضمون نگار کی سرگرائی کا یہ حال ہے کہ اگر کوئی

صدا اعظم گڑھ سے بلند ہوتی ہے، تو چاہے وہ اپنی جگہ لکھنوی ہی میچ، لکھنوی

ہو اور کتنی ہی ضروری ہو، وہ انکار کر دیتے ہیں، صرف اس وجہ سے کہ وہ

اعظم گڑھ سے آئی ہے، چنانچہ آجسز مرحوم اور جگر کی خوش بیانی اور قناد لکھنوی

کے احترام کے باوجود، ان سے صرف اس لئے ناراض ہیں کہ اُن کی لکھنوی

اعظم گڑھ سے کی گئی ہے، محب کا ذہنی تضاد و لحاظ ہو، وہ سید صاحب

سے درخواست کرتے ہیں کہ باب الانفاذ اپنے ذمے لیں، یا کم از کم

دیوان اور ادبی کتابوں پر غور و تبصرہ فرمایا اس اور جب وہ لکھنؤ کو علم و ادب کا گہوارہ اور بڑے بڑے ادیبوں کا مرکز سمجھتے ہیں تو انہیں پیکرِ انصاف مولانا اور قبلہ و کعبہ سب کچھ کہا جاتا ہے، لیکن یہی جیب جگر کے دیوان پر مسدود لکھتے ہیں تو اس پر اعتراض کیا جاتا ہے اور انہیں جگر کا کندیڈیٹ کہا جاتا ہے۔ محترم جیب ایک جگہ لکھتے ہیں۔

”مولانا کے اس رویہ میں وہ جذبہ ہی شریکِ حال ہے جس کا مظاہرہ لکھنوی اور غیر لکھنوی شاعری کی بحث میں بریل کے بنائی اور بعض دواؤں کے دیباچوں اور مقدموں میں اکثر نظر آتا رہتا ہے :

علامہ سید سلیمان کے ایک خطبہ صدارت کی کچھ عبارت نقل کر کے لکھتے ہیں۔

”اے جن کو لکھنؤ کی خدمات کا اعزاز جن الفاظ میں کیلئے وہ عبدالسلام صاحب نے مدھی نے مزدور دیکھا ہوگا۔ حیرت کا مقام ہے کہ ایک انصاف کا پتلا اور دوسرا اذیت کا نقشب کا کالبد ہو کر رہ گیا :

میری سمجھ میں نہیں آیا کہ مولانا عبدالسلام صاحب کی کس تحریر سے فاضل جیب نے یہ نتیجہ نکالا ہے، کیا جہان آرزو کے تبصرے سے ؟ اگر مضمون نکالنے سے پہلے صرف معارف اور ہندوستانی کی جلدیں دیکھ لیتے تو انہیں اس الزام کی جرأت نہ ہوتی۔

انہیں اس وقت میرے پاس شعرِ آہند موجود نہیں اور قریب کے کسی کتب خانے میں بھی انصاف سے نہ مل سکی، ورنہ دیکھنا نا انصافی نہ لگنے نہ دیتا۔ پھر لکھنؤ کی علمی خدمات کا اعزاز کیا ہے، مولانا کا ایک مضمون شاعر کے عنوان سے آئندہ پیش نظر ہے، یہ علم گڑھ کے ایک شاعر سے میں پڑھا گیا تھا اور معارف میں شامل ہو چکا ہے، مولانا ایک جگہ لکھتے ہیں۔

”وہی کہ تباہ کرنے کے بعد جب لکھنؤ اور شاعری کا مرکز قرار پایا تو چند شاعروں نے اور بھی دقتِ حال کی، بائیسویں شہزادگان دلی نے جو لکھنؤ میں آ رہے تھے، ان کی رونق کو ادب بھی ادھا گیا۔۔۔۔۔ ان کے آگے سے فخر تہذیب کو جو شاعری کا ایک لازمی جزو ہے، نہایت ترقی ہوئی تھی چنانچہ مولوی محمد حسین صاحب آقا نے اجمیات میں اس قسم کے بیچ نہ

تتقدیر کی تھکے تھکے ہیں جو انہیں شاعروں کی پیداوار میں، شہنشاہِ خان آئندہ کے مکان پر شاہد ہوتا، سوادے پہ ملنے پڑھا آوازہ قطراتِ عرق و لہجہ میں کو آخر جسے جس نے جس نے فلک پر سے زمینِ خان آرزو دے کر آواز دے گا ایک مطلع پڑھا۔

آوازہ قطراتِ عرق دیدہ جس را آخر ز فلک سے نگر دروئے نہیں دیا ہاں ! ان سے یہ قصور نہ ہو تا ہے کہ تبصرہ کرنے دقتِ لغاف سے کو بھی نہایت جرأت کے ساتھ ظاہر فرما دیتے ہیں، اور اس کا مطلق خیال نہیں کرتے کہ صاحبِ دیوان یا مصنف لکھنوی ہے یا غیر لکھنوی، مضمون نگار کے محدود کے استاد و معلم سید عثمان علی جلال لکھنوی کی شاعری کے شوق، مولانا کا جو مضمون ہندوستانی میں شامل ہو اسے غالباً وہ مضمون نگار کی نظر سے نہیں گزرا، اور شاید وہ اس الزام کی جرأت نہ کرتے۔

اگر مضمون نگار کے جواب کے متعلق کچھ عرض کرنے کا ارادہ نہیں تھا، بلکہ صرف تجویز کے اس نارادارونے کے غلط صدمے احتجاج بند کرنی تھی، جو جواب کے سلسلہ میں اختیار کیا گیا تھا، کیونکہ میرا خیال ہے کہ شاعری کا ذوق سے بہت گہرا تعلق ہے، ناگہان ہے کہ کوئی شاعری پر تنقید کو اس اور اس کے ذوق کو اس میں دخل نہ ہو، یہی وجہ ہے کہ ایک ہی دیوان پر متفاو تبصرے شامل ہوتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ صرف ذوق ہی کی کارفرما نہیں ہوتی، بعض دوسرے جذبات کا بھی حصہ ہوتا ہے، مگر اس کا اثر سب پر غالب رہتا ہے، لیکن یہ میرا خیال غلط ہو۔ مجھے اس کی صحت پر چنداں اصرار نہیں، مگر خود میرا ہی پر عمل ہے۔ لیکن جب یہ بحث چمک رہی ہے تو ذوقیت سے سیحوہ ہو کر جہاں تک اصول کا تعلق ہے اس پر بھی ایک نظر ڈالی جائے تو تہرہ ہوگا۔ مولانا عبدالسلام صاحب جہاں آرزو پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

”علم سیدنا علی بن ابی طالب لکھنؤ کے ان شعراء میں سے تھیں نے سب سے پہلے لکھنؤ کی شاعری میں انصاف پیدا کیا اور عوامی مفاد میں یعنی خال و خط، ذلت و لاکھا اور محرم اور دودھ کو چھوڑ کر جذبات و دوا دات کو اپنا سراپا بن لیا۔ ان کے کلام نے سبھی کی روش اختیار کی ہے، اور ان میں سید الاحمرین آرزو نے اس روش کو اس قدر ترقی دی کہ اب ان کا شمار دوسرے شعراء میں کیا جاتا ہے، اس وجہ سے رنگیں



دولان اور ادلی کن لوں پر طبع و تبصرہ فرمایا کہ اس اور جب وہ لکھنؤ کو علم و ادب کا گہوارہ اور بڑے بڑے ادیبوں کا مرکز بن گئے ہیں تو انہیں پیکرِ انصاف مولانا اور قبلہ و کعبہ سب کچھ کہا جاتا ہے، لیکن وہی جب تیکر کے دولان پر مقدمہ لکھتے ہیں تو اس پر اعتراض کیا جاتا ہے اور انہیں جگر کا کنڈیڈٹ کہا جاتا ہے۔ محترم مجیب ایک جگہ لکھتے ہیں۔

”مولانا کے اس رویہ میں وہ مذہبی شریکِ حال ہے جس کا مظاہرہ لکھنوی اور غیر لکھنوی شاعری کی بحث میں بڑی کے بانی اور بعض دواؤں کے دیباچوں اور مقدموں میں اکثر نظر سے گزرتا رہتا ہے“

علامہ سید سلیمان کے ایک خطبہ صدارت کی کچھ عبارت نقل کر کے لکھتے ہیں۔

”آگے میں کرکھڑکی خدمات کا اعتراف جن الفاظ میں کیا ہے وہ عبدالسلام صاحب ذوق نے مزور دیکھا ہوگا۔ حیرت کا مقام ہے کہ ایک انصاف کا چنلا اور دوسرا اذیتنا یا تعصب کا کالبد ہو کر رہ گیا“

میر تقی میر ہیں نہیں آیا کہ مولانا عبدالسلام صاحب کی کس تحریر سے فاضل مجیب نے نتیجہ نکالا ہے، کیا جان آرہے کہ تبصرے سے اگر مضمون نگار لکھنے سے پہلے صرف معارف اور ہندوستانی کی جلدیں دیکھ لیتے تو انہیں اس الزام کی جرات نہ ہوتی۔

انہیں اس وقت میر سے پاس نہ آتا ہندو موجود نہیں اور قریب کے کسی کتب خانے میں بھی اتفاق سے نہ مل سکی، ورنہ دکھانا کہ انہوں نے کتنے منہا پر لکھنوی ملی خدمات کا اعتراف کیا ہے، مولانا کا ایک مضمون شاعر کے عنوان سے اہلِ پیش نظر ہے، یہ ظلم کڑا کہ ایک شاعر سے میں پڑھا گیا تھا اور محاف میں شائع ہو چکا ہے، مولانا ایک جگہ لکھتے ہیں۔

”میں نے بتا دیا کہ بعد جب لکھنؤ اور شاعری کا مرکز قرار پایا تو چچاں شاعروں نے ادبی و فنی ماحول کی باطنی شہزادگی دینی نے جو محض میں آدھے تھے، ان کی روش کو ادبی ڈھانچا لایا۔۔۔۔۔۔ ان کے آگے سے فنی تنقید کو شاعری کا ایک لازمی جز ہے، نہایت ترقی پزیر تھی چنانچہ مولوی محمد حسین صاحب آپاؤ نے آبجیات میں اس قسم کے بیج بٹے

تنقیدی نکتے لکھے ہیں جو انہیں شاعری کی پیداوار میں شفق خان آرزو کے مکان پر مشاعرہ تھا، مگر اسے پہلے پڑھا آدوہ قطراتِ عرق و لہجہ میں کو اختر بڑے جانے ہیں فلک پرستہ زمین خان آرزو نے فردرہی کا ایک مطلق پڑھا۔

آدوہ قطراتِ عرق ویدہ میں را اختر فلک سے نگر دوئے میں را ہاں! ان سے یہ شعر گزرتا ہوتا ہے کہ تبصرہ کرنے وقت لفظ کو بھی نہایت جرأت کے ساتھ ظاہر فرمادیتے ہیں، اور اس کا مطلق خیال نہیں کرتے کہ صاحبِ دولان یا مصنف لکھنوی ہے یا غیر لکھنوی، مضمون نگار کے محدود کے استنادی حکم سید صفا من علی جلال لکھنوی کی شاعری کے متعلق، مولانا کا چوتھوں ہندوستانی میں شائع ہوا ہے غالباً وہ مضمون نگار کی نظر سے نہیں گزرا، ورنہ شاید وہ اس الزام کی جرأت نہ کرتے۔

گو مضمون نگار کے جواب کے متعلق کچھ عرض کرنے کا ارادہ نہیں تھا، بلکہ صرف مجیب کے اس نادرادہ دینے کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی تھی، جو جواب کے سلسلہ میں اختیار کیا گیا تھا، کیونکہ میرا خیال ہے کہ شاعری کا ذوق سے بہت گہرا تعلق ہے، نامکمل ہے کہ کوئی شاعری پر تنقید کرے اور اس کے ذوق کو اس میں دخل نہ ہو، یہی وجہ ہے کہ ایک ہی دولان پر متقاد تبصرے شائع ہوتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ صرف ذوق ہی کی کارفرمائی نہیں ہوتی، بعض دوسرے جذبات کا بھی حصہ ہوتا ہے، مگر اس کا اثر سب پر غالب رہتا ہے لیکن میرا خیال غلط ہو۔ مجھے اس کی محنت پر چنداں اصرار نہیں، مگر خود میرا ہی پرمل ہے۔ لیکن جب یہ بحث چمک چکی ہے تو ذوقیت سے علیحدہ ہو کر جہاں تک اصول کا تعلق ہے اس پر بھی ایک نظر ڈالی جائے تو بہتر ہوگا۔ مولانا عبدالسلام صاحب جہاں آرزو پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

”علم سیدنا من عقل لکھنؤ کے ان شعرا میں تھے جنہوں نے رب سے پہلے لکھنؤ کی شاعری میں انقلاب پیدا کیا اور شاعری میں نیا یعنی خیال و خط، ذلت و کمال اور محرم اور دہلی کو چھوڑ کر جذبات و عمارت کو اپنا سراپا بنوا لیا۔ ان کے کلام ذہن سے بھی بڑی روش اختیار کی ہے، اور ان میں سید الرحیم آرتو نے اس روش کو اس قدر ترقی دی کہ اب ان کا شمار دوسرے شعرا میں کیا جاتا ہے، اس عہدہ رنگ میں

ان کا دوسرا دین چنانچہ آرزو کے نام سے شائع ہوا ہے۔ جاسکے پیش نظر ہے۔ اور اس کے لکھنے سے ان کے کلام کی جو خصوصیات سامنے آتی ہیں وہ مرہبہ ذیل ہیں۔

(۱) وہ بہت سخی غزلوں میں نامائوس قافیے استعمال کرتے ہیں، جن کی تعداد محدود ہوتی ہے۔ اور اس وجہ سے شرار غزلوں میں، ان قافیوں کو بہت کم استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً

(پیشاشر) یہ دوئی کب تک چول کو سو زخم سے کاک ہے

جل اٹھی یزیم تو ہر یزیم نہیں ہے آگ ہے

جواب۔ نامائوس قافیوں سے کیا مراد ہے، یہ سیری سمجھ میں نہیں آیا، واگ، لاگ کو اگر قافیہ قرار دیا جائے تو یہ قوافی محدود تو ہیں مگر غیر نامائوس کس جیت سے ہیں؟ کیا محدود قافیوں میں غزل لکھنا قافی جرم، اخلاقی کمزوری یا ادبی گناہ ہے۔

گزارش۔ دوسرا اعتراض عجیب نے تسلیم کیا ہے، اب رہا یہ مسئلہ کہ یہ قافیہ جرم یا ادبی گناہ ہے تو اس سے اہل علم اور ادبی ذوق رکھنے والے کو بلی واقف ہیں۔ غیر نامائوس کا مطلب جو کہ ان کی سمجھ میں نہیں آیا ہے، اس سے اس کے فضیلت کا انھیں کوئی حق نہیں، پیچھے کچھ لیکن پھر جواب دینے کی کوشش کریں۔

دوسراشر۔ کم انصاف پر بھی شوق دل کو سمیٹے ہے

گنہ درخت نہ ہو چھاؤں تو گھنہری ہے

دوسراشر۔ دم بخود بیٹے کے خود بیٹے زبان کیسی ہے

سائنس کیوں کہ ہوا دہری کہ زہری ہے

اس کا عجیب نے کوئی جواب نہیں دیا ہے صرف یہ کہہ کر نکال دیا ہے کہ اشعار بہرہ اور دوسرے قدر وہ حضرات اور زیادہ کریں گے جو زبان کے لغات کی تصنیف و تالیف میں اپنا عزیز وقت صرف کرتے ہیں۔ شاعر نے گنہ اور گھنہری کا فرق ظاہر کر کے اردو زبان پر احسان کیا، گنہ درخت بدلتے ہیں اور گھنہری چھاؤں۔ زبان کیلی محاورہ ہے۔

گزارش۔ واقعی گنہ اور گھنہری کے معنی کسی کو معلوم نہیں تھے، آپ نے بتا کر بڑا احسان کیا۔ زبان کیلی کا محاورہ بھی نہیں معلوم تھا، حیدر آباد میں اردو کا لغت تیار ہو رہا ہے، آپ انھیں سبیدیتے، اردو کی بہت بڑی خدمت اور مرتبین پر بہت بڑا احسان ہو گا

ہم کو تو حسرت اور کبھی عزت، ان کو نہ کہ خنیت کہ جو خاشاک۔

اس کا بھی کوئی جواب نہیں دیا گیا ہے۔ ناظرین کا ملاحظہ فرمائیے کہ چاروں شعروں میں شاعر کی ہی مشکور نظر آتی ہے۔ کی آڑ میں پناہ لی گئی ہے۔ گزارش۔ سوال ہی مشکور اور غیر مشکور کا نہیں ہے۔ نفا دکا کہنا یہ ہے کہ قافیے محدود اور نامائوس ہیں۔ جواب اس کا دیکھئے۔

(۲) بہت سخی غزلوں میں نامائوس بحر میں اختیار کرتے ہیں مثلاً

(۱) کیوں ڈاڈی این کے پیرے کیوں طور کو آنا جانا ہے

(۲) میں نے بھی کب کہا کہ یہ کہا نہیں کہ ہے۔

(۳) سبید دسپاہ ایک ہی ہیں تو کھوہ نظر نہ کریں نہیں۔

(۴) دے کے قریب بے کے دل کہتے ہیں جلد ساز ہو۔

جواب۔ پیچھے دوسرے اور جوئے معصے میں چھوچھریا ہیں وہ نامائوس نہیں بلکہ مروجہ بحر ہیں۔ مروجہ شعر، میں بھی سیکڑوں غزلیں ان بحر میں مروجہ ہیں چنانچہ ایک کس انھیں بحر میں براہ راست جڑے ہوتے ہیں، حضرت، اصغر رحم کا دیوان میرے پاس ہے نہیں، مگر میں جب کا دیوان ہے۔ جگر کے ذیل کے معرے انھیں بحر میں ہیں۔

(۱) مشرود نگاہ ساقی کی تحریک پہ جس کا ہے

(۲) مرا جو حال ہو سو ہو، برقی نگرانے جاسے۔

جگر کے دیوان میں یہ بحر میں مولانا کی آنکھوں کو نامائوس نظر آتی ہیں، اب رہے آرزو صاحب تو ظاہر ہے کہ وہ لکھنوی ہیں۔

آرزو صاحب کا تیسرا معرہ اس میں شگ نہیں کہ نامائوس بحر میں مزور ہے۔ مگر میں بھی عرض کروں گا کہ شاعر اپنے خیال میں آزاد ہے، اگر اس نے ایک غزل نامائوس بحر میں لکھی تو شہر کے انڈیسے سے قاضی متا کو ڈبلا ہونے کی کیا ضرورت ہے۔

گزارش۔ خدا کا شکر ہے کہ آپ نے یہ تسلیم کیا کہ ایک معرہ ملا بحر میں ہے۔ رہا یہ کہ تبصرو نگار، شاعر کی آزاد سی کو مستفید کیوں کر رہا ہے، شہر کے انڈیسے سے ڈبلا ہونے کی کیا ضرورت ہے تو مولانا عبدالسلام کوئی پیچھے نفا نہیں ہیں جنھوں نے کسی شاعر کی بے راہ ردی پر ٹوکا ہو، اس

پہلے بارہا ایسا ہو چکا ہے۔ خود مجیب کے مدد و احسان کے استاد حضرت عبداللہ مکتوی  
بھی، شہکے اندیشے سے مکمل کیے ہیں۔ اگر انہیں معلوم نہ ہو تو آرزو صاحب کی خدمت  
میں لکھ کر یا خود اپنے الفاظ میں فرما دنا۔ ارسال فرما کر ان سے دریافت کیجئے  
کہ حضرت عبداللہ نے غلاب ملک علی خاں کو یہ کہہ کر کیوں ناراض کر دیا تھا کہ  
”حضور نے مطلع میں روی کے ساتھ تائیس اور خلیل کا التزام کیا ہے، اور  
اشعار میں اس کی پابندی نہیں کی۔ یہ درست نہیں۔“  
شاعر تو اپنے خیال میں آزاد ہے، شہر کے اندیشے سے قاضی صاحب  
کو دبا ہونے کی کیا ضرورت ہے۔

بیت تین بحر وں کے متعلق، مجیب کا جواب نا کافی ہے۔ قدیم و جدید  
شعرا کی سیکڑوں غزلوں میں سے دو چار اشعار تو پیش کیجئے۔ یقین رکھئے  
اگر مولانا، جس کے کلام پر تبصرہ کرتے تو نا ملازم ہی کہتے، سمجھنے سے پہلے اپنی  
معلومات کا جائزہ لے لیا کیجئے۔ تبدیلیوں سے کوئی فائدہ نہ ہو گا۔  
(دو) اس قسم کی بحر وں میں بعض غزلیں ایسی ہیں جن کا سمون بجائے ایک  
شعر کے دو شعروں میں تمام ہوتا ہے۔ اور آخری شعر میں قافیہ کی پابندی  
کی جاتی ہے۔ شفا

ہے راہ پر بس وہ طوفانی مدح کی کوئی نہ تھی ہے  
ہر گام خوشی کا بھی پھر بھی آؤ منزل نا کامی ہے  
اس بارغ میں آکر ہم کو بھی تقدیر ہی ہے فتری کی  
بندش بازو میں اداوت کی  
گردن میں طوق غلامی ہے

میں ہوں ترا ضوئی زلال مجھے کام منظر عام سے  
ہر گام مہو، ہے خوشی کے نظر آگے وقت، ہام سے  
وہ ہٹ کے جلد نہ آئیں گے یہ عیاں ہے طرزِ حرام سے  
کوئی گردش ایسی بھی نہ نکلتی جو غلامی کا شام سے  
دقن نصیب نہ آسکیاں ہے میانِ بربذیٰ بینِ داک  
رہی پشت کے ہر رخ جان

کہ پھر کے نگاہ ہے جام سے

مجھ نے اس کے جواب میں جو کہہ لکھا ہے، اس کا مطلب غائب ہے  
کہ اشعار غلط نقل ہو گئے ہیں، لیکن شعر کے ایک شعر سمجھ لیا گیا ہے۔ یعنی

اسے حالی قال سے واسطہ، ذوق میں تمام دقتا رہے  
ہے کوئی نسبت خاص ہو، تے حسنِ رقی خرام سے  
مجھے دے رہے ہیں نیاں، وہ ہر ایک ناز و نیاز سے  
کبھی آئے منظرِ عام پر، کبھی ہٹ کے منظرِ عام سے  
کہوں کیا راہ مستابہ خطراتِ کام بہ کام سے  
ہر گام میں تمام تک، دو شوقِ نیم مست م سے  
ذوقِ کس سے نہ واسطہ، مجھے کام ہے، ہم کام سے  
ترے ذکر سے، تری یاد سے، تری نگاہ سے ترے نام سے  
دخیر و غیر (معنا)

گزارش، انتہائی کوشش کے باوجود جہان آرزو و مستجاب نہ ہو سکا، اس  
اس کے متعلق میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ بیت ممکن ہے کہ کتب کا کپنا درست ہو مگر یہ  
بھی نہیں ہو سکتا کہ تنقید نگار نے تصدیق کیا ہو، ممکن ہے دیوان کی طبعیت  
میں اس قسم کی غلط فہمی کا امکان ہو، ہر حال جہان آرزو دیکھنے کے بعد اس کا  
بہتر فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔

دہم، ان خصوصیات کا نتیجہ ہے کہ ان کی اکثر غزلیں جن غزلوں سے شعرا  
ہیں، اس کے ساتھ ان غزلوں نے اس عید کو کہے میں یہ تحفہ قدم رکھا ہے  
اور کھنکے کے دائرے سے نکلنے کے سنی یہ کیجئے ہیں کہ ہر سے سے عاشق  
مغنیوں تک کو کہے میں، مگر جہان نے یہ سبب متبادل اور خارجی  
مغنیوں کو جو غزل سے لفظ نہیں رکھتے ترک کر دیا تھا، لیکن اس کے ساتھ  
انہوں نے مجدد و غزل سے باہر قدم نہیں نکالا تھا۔ لیکن سبب الازم میں  
بیت نگار اشعار پیش کیے ہیں۔ یہ معلوم ہی نہیں ہو سکتا کہ غزل کے  
اشعار یا جدید ہیں۔ ایک باری غزل و محکمہ

ایک جو کہو کے آن بان نہ مانگ  
قتل ہو جا کر امان نہ مانگ  
دیکھ پاؤں شکن امان نہ مانگ  
بعد کو پیر دے کے جان نہ مانگ  
موت اُس کی خوشی میں سب کچھ ہے  
ایک نئے مانگ دو چہان نہ مانگ  
روں پر در ہے کا بہش قسم دل  
موت ہو جو کے بد گمان نہ مانگ  
فلم سے بھاگتے نہیں حق گو  
دار کا کافی ہے ریسمان نہ مانگ  
دینے والے سے تو ہے کم بہت  
خود اُسے مانگ لے چہان نہ مانگ  
جان کر جان دی نہیں جانی  
ہوں دھنی بات کا زبان نہ مانگ  
بے دلی میں دکھاؤں دل کیونکر  
نہیں جو شے وہ میری جان نہ مانگ  
آرزو یہ طلب ہے بے معنی  
ہند میں رو کے اُٹھان نہ مانگ

کھٹے پڑے کے بعد بآسانی کہا جا سکتا ہے کہ روکنا ب قابل قدر ہے یا  
اصل فتنہ ہے، بلکہ اگر کسی کو فطرت کے صلاحیت وہی ہے تو اُس کے لئے  
واقعی موت دس منٹ کافی ہیں، کسے فطرت ہے کہ ایک بے مزہ بعد  
کو پورا پورا ہڈت، اس ذرا سا کچھ لینا اصل کافی ہے، بلکہ کافی سے  
بھی زیادہ ہے۔  
(ہندوستانی سندھ صفحہ ۳۱۱)

(۴) باوجودیکہ ان کے کلام میں اخلاق و ایہام نہیں ہوتا، شعرائے دور  
میدہ کی طرح معنوی نارس کرکس بھی استعمال نہیں کرتا، تصرف و فصاحت کے  
پہچیدہ سلی بھی نظم نہیں کرتے۔ لیکن اہم بر اس قسم کے پیکے اور بد مزہ  
اشعار سے اُن کا یہ دیوان بھرا پڑا ہے، اعتدال کس کس سہارے غزل کے  
مطابق کچھ اشعار بھی اُن کے قلم سے نکل چکے ہیں اور اچھے گو، دیوان کا  
مامل کھنا چاہیے۔

اس کے بعد بارہ تیرہ اشعار بطور مثال کے نقل کئے ہیں۔

اس کے جواب میں مجیب نے تقریباً سو اشعار انتخاب کئے ہیں اور انہوں  
کو غور کرنے کی دعوت دی ہے کہ آیا آرزو کا کلام خیال الفاظ اور انداز بیان  
کی خوبیوں سے مالا مال اور اُن کے شعروں میں جذبات کی مصوری اور محاکات  
کی نادر مثالیں ہیں یا نہیں؟ اسی کے ساتھ ایک نئی چیز پیش کی ہے جس سے  
حضرت شعر الہند کا مصنف بلکہ تمام دیوانا واقف تھی، ناظرین کی حق تعالیٰ کی  
مگر انھیں ان نواد سے محروم رکھا گیا۔ اس لئے ملاحظہ فرمائیں۔  
وہ لکھتے ہیں۔

مجیب نے اس کا فیصلہ ناظرین پر چھوڑ دیا ہے۔ میں بھی ناظرین پر چھوڑتا  
ہوں۔ وہ شروع سے آخر تک پڑھ جائیں، انشاء اللہ انھیں ایک مصرعہ  
بھی ایسا نہیں ملے گا جس میں شانِ تغزل اور عاشقانہ معنوں کا شائبہ نہ ملے۔  
مجیب نے یہ بھی لکھ دیا ہے اور پورے جزم و یقین کے ساتھ کہ نقاد نے  
غیر پوری کتاب پڑھ کر چند ادراک پڑھ کر لیا ہوگا ہے۔  
ادفہ مجیب کے پاس اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے، دوسرے بقول ادھر  
داعفہ (شہور تصدیق نگار)

”یہ کتاب پڑھ کر مجھ کی عزت بھی نہیں ہے، کسی شرب کا مزہ اور ذائقہ  
دریافت کرنے کے لئے کیا عزت ہے کہ تو کچھ کا کچھ چاچا جا جائے؟“

”غزلی میں اب تصرف اور اخلاق کے معنی میں بھی باتکلف نظم لکے جاتے ہیں۔ مزہب اشل باتوں کو بھی نظم کا  
جاسرینا یا جاتا ہے، فتنہ بھی ان کا جزو بن گیا ہے، ایسا بھی ہوتا ہے کہ شاعر چند و فتناء سے بھی بے  
کلام میں کام لیتا ہے۔“

عالم میں ہزاروں لوگوں کے کالے  
اس پر بجا بہت شادیں حکمت والے  
پیر نی بی جالتیں نہ جانتے کتنی  
کا بھول چھلے علم و دانش ٹالے  
جب فتنے راہ پر لگا یا مجھ کو  
حکمت نے جب آئینہ دکھا یا مجھ کو  
ذرات سے لے کے تا خیمہ ہلال  
خدا اپنے کو خاطر نہ آیا مجھ کو  
(پیش)

# خونناک انتقام

مُترجمہ آغا محمد شریف، بی۔ اے (ملک)

ہو کر اس نے اپنے مکان میں قید کر کے اُسے گونا گوں اذیتیں دینی شروع کیں جب اس سے بھی کام نہ چلا تو جوش غضب سے اندھا ہو کر اس نے اُسے کچاں ضرب ناؤٹ مارنے کا حکم دیا۔

پرست سینہ نے رو رو کر اس وحشی سے جان بخشی کی بیسود انجامی، لیکن درندہ صفت پرئس کا فلاحی دل اس کی آہ و زاری پر نہ پسپا، ناؤٹ کی پندرہویں ضرب پر نازک اذام سینہ پہنچ ہو گئی، اور سسر کے خاندان سے پہلے ختم ہو گئی!

اس ہیبتناز واردات کے راز کے پشت از بام ہونے کا بڑا خوف تھا، لیکن پرئس کے ذاتی رسوخ اور اس کے کارندوں کی راز داری اور حکمت عملی سے بات چھوٹنے نہ پائی۔

جیس ڈی ناؤٹل نے صرت اُس کا نام سنا تھا، وہ کسی فضیلت اہل جگہ میں اُس سے ستارفت ہوا تھا، اور نہ ہی کہیں اس کی صورت و کجی تھی، آجکل پرئس دوس میں تھا، اُس کی غیر حاضری سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے اُس کی بیگم کلیں کے ساتھ بہت بے تکلف ہو گئی تھی۔

شعردی نازیبا: جیسے انگریزی میں (Cat of nine tails)

کے مسترد کردہ وارنٹس ایک دستے سے بندھے ہوئے ہوتے ہیں۔ ننانو قرب تک اس وحشتناک مردانہ دھچ، دوش اور بھاری افواج میں جی تھا، اس سزا کا سڑیٹے ڈیویٹینا نے اپنے نالی سولجروہ انک میں پُر درون نشہ لپیٹا ہے۔ (مترجم)

مات بیگم کی سنی، کارنیرال پر سے شباب پرستا، محاذ لیں کا ایک لاسٹا چٹینور کنیز کی گھون میں سے گزر رہا تھا، ہونٹوں، تہوہ خاؤں اور مکانوں کے درجوں سے چال بیگم کے تماشائی تفریح کے لئے جمع ہو رہے تھے، مکانے ہنسی اور ششوں کی آواز میں پیچ آ رہی تھیں، ان جگہوں سے حال ہی میں یہ لوگ نکل کر جوں میں شامل ہونے لگے۔

شہر کی ایک طویل اور تاریک گلی میں سے جلیس ڈی ناؤٹل گرد پیش کے ہنگامہ سے بے خبر فیکٹر خود صرت سے سمندر دل کے ساتھ قس کی ایک شہر درجن سیٹی میں بچا ہوا تیز روی سے گزر رہا تھا، ایک ہنڈ سے وہ شہزادی اولگا ڈی ڈوٹ کا خوش قسمت عاشق تھا۔

شہزادی اولگانے اداں عمر ہی میں ڈاکٹر بڈیکانگ پرئس سر جی ڈی ڈوٹ سے شادی کر لی تھی، جیسے اب دس سال ہو گئے تھے، اُس وقت اُس کی خوبصورتی کا آفتاب نصف النہار پر تھا، لوگوں میں اس کے چال میں کے متعلق چرچے گویاں ہوا کرتی تھیں، لیکن پرئس کے رعب اور قہاری کے باعث کسی میں ملائیم اظہار مانے کی ہمت نہ تھی۔ خود پرئس کے متعلق لوگوں کا خیال تھا کہ وہ ایک شہر راہکس کے ساتھ اشتعال رکھتا ہے، کہا جاتا تھا کہ وہ ایک حسین اور لڑکا جو راقصہ پر ایک عجیب طریقہ سے متعوت ہوا تھا، عرصہ دراز تک جب وہ فوج و کوششوں کے اس کے چال میں بیٹھتی تو غضب اور ہوس کی آگ سے متعل ہوا کہ وہ اُسے اُس وقت اڑا دے گیا، جب کہ وہ اپنے کام سے فارغ ہو کر تھکے سے نکل رہی تھی۔ پھر اُس کے پیچ نکال پر ہر فرضہ

خاموش! کوئی باغی نہیں ہے۔ اُس نے پہلی کالمب گل کے پردہ و زُور کو پردہ دار غلت میں تبدیل کر دیا لیکن کوشی میں پھر بھی شہر خوشاں کا سا سنا سنا تھا۔

یہ صرف ہتھاروا ہمسہ تھا، پیاری! یہ کہہ کر حکمت نے مٹن دبا کر کوہ کار باروگر لہو لہا دیا اور دولٹ اس واقعہ پر ہنسنے لگا۔ یکایک ادلگا پھر چونکی۔ اس وضع جو آہٹ ہوئی وہ نہایت صاف تھی، کوئی شخص سامنے کا دروازہ کھولنے کی کوشش کر رہا تھا۔ آنے والے خطرہ کے خوف سے ادلگا کانپنے لگی۔

خلفہ قوت و کر شایہ جلد ہی واپس آگئے ہیں، اُس نے سرگوشی میں کہا: اُن سے ہتھاروا سنا نہ ہونا چاہیے۔ میری خواہگاہ میں کل جوں وہاں ہم نسبت محفوظ ہوں گے۔

نہیں! جسکے نے جواب دیا: اب ہمارا مہینہ ہوجانا ہی بہتر ہے، اب زیادہ یہاں ٹھہرنا مصلحت کے خلاف ہے۔ یہ کہہ کر وہ کھڑکی کی جانب بڑھا، اور اُسے کھول کر چاہتا تھا کہ باہر بھلا لنگ جائے۔ لیکن اس کی حیرت اور دہشت کی انتہا نہ رہی: درخچے میں لوہے کی سلاخیں لگی ہوئی تھیں!۔

یہ کیا؟ اُس نے خشکیں انداز سے ہٹ کر پوچھا۔

کچھ نہیں! شہزادی نے جواب دیا: میرے شوہر مدانگی سے پیشتر بہنوں کے خوف سے تمام درجوں کو اسی طرح محفوظ کرنے کی پابندی کر گئے تھے، گینز کی حالت سے تم واقف ہو۔ خصوصاً کارنیرال کے ایام میں۔۔۔۔۔

باہر نکلنے کا کوئی اور راستہ بھی ہے؟ اُس نے غلٹ سے دریافت کیا۔

ہاں، میری خواہگاہ کے درخچے سے تم سیڑی کے جائیداد فریم کے ذریعے اُتر سکتے ہو۔ یہ کہہ کر ادلگانے دروازہ کھولا یا لیکن وہ باہر سے منتقل تھا! اس کا رنگ خوف سے زرد ہو گیا!

دعا، فریبا! اُس نے گہرائی ہوئی آواز سے کہا: یہ محسوس ہے یا کہکشاں! میں سنا دہن چاہیے، لیکن ہے اس وقت بھی ہماری نگرانی کی جائی ہوگی۔

وہ ہنسنے لگا۔ ایک عجیب سی خوشنما کوشی کی کہن تھی، جہاں آج وہ پہلی مرتبہ اپنے عاشق کا استقبال کر کے اُسے باغیچہ کی راہ سے اپنے پھولوں اور پتروں سے بے ہوش مشرقی دشن کے کاشانے میں لائی۔ اس سے پیشتر وہ اکثر خود اس کے پاس جا چکی تھی۔ لیکن آج پرس کی غیر حاضری میں اپنے محبوب کو یہاں لانے میں اُسے کوئی امر مانع نہ تھا۔

جسکے نے ایک ہنڈ ہمان کی طرح کسے کی آرائش کا اکٹھا غلط انداز سے جائزہ لیا۔ یکایک اُس کی نظر مینٹل پر رکھی ہوئی ایک تصویر پر پڑی۔

یہ کون صاحب ہیں؟ اُس نے پوچھا

آپ ڈیوی ڈوٹ ہیں۔ آدھیں اُن سے ہتھاروا تعارف کراؤں۔ ایم جیکس ڈی ٹاؤنل! یہ میں میرے شوہر و عاشق — پرس ڈیوی ڈوٹ! اُس نے ایک شاندار لہجے کے ساتھ تصویر کے سامنے خم ہوتے ہوئے کہا:

جسکے مسکراتے لگا۔ لیکن ابھی مجبور کے شوہر کی تصویر پر سے (جیسے آج پہلی مرتبہ اس نے دیکھا تھا) وہ یکایک اپنی نظر ہٹا سکا۔ پرس شاہی دست کی دردی میں ملبوس تھا، وہ ایک جوان العزادی معلوم ہوتا تھا، جس کی آنکھیں بیت بارعب تھیں۔

کچھ غلام اور دشمنی سا معلوم ہوتا ہے، کیوں؟ ادلگانے شوخی سے ہنسنے ہوئے کہا۔ لیکن اُس کے باوجود میں اُسے آنکھوں پر تپا سکتی ہوں، پیار سے جسکے! آج کی رات ہمارے لئے کتنی پرکٹ ثابت ہوگی۔ میں نے اپنے تمام نوکروں کو آج تقریر کے لئے کارنیوال بیچ دیلے۔

جسکے نے خاقان کو ابھی آغوش میں لیے ہوئے کہا: ادلگا میں تمہاری پرسش کرتا ہوں! تمہارے بغیر زندگی بے معنی ہے، تم مجھ کو تو میں اُس کا سایہ۔ تم جاؤ تو میں تمہارے غلام شوہر کو ہلاک کر سکتا ہوں اور اپنے تئیں بھی۔۔۔۔۔

محبت اور پرسش کے معنی کچھ عورتیں ہی بہتر جانتی ہیں۔ ادلگانے اپنے فائن کالکلام کھاتے ہوئے کہا: تم باقی کا وقت آئے دو۔ لیفٹینانٹ اُس امر میں پیش پیش ہوں گی!

اس کا جواب اس کے محبوب کی طرف سے ہم آغوشی کے ساتھ گرم جوشی کے چند ہیمنہ دے گئے۔ یکایک وہ گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی اور ہر طرف پر آنکھیں رکھ کر دبی آواز سے کہا۔

وہ دونوں دروازے سے ہٹ کر کمرے کے ایک گوشے میں آگئے۔ متواتر  
وقت کے بعد دروازہ کھلا اور ایک شخص اندر داخل ہوا۔

جیکب نے پرس سرخی قہمی ڈوٹ — اپنی عجب کے شوہر کے لئے اپنے  
آٹھ پہلی مرتبہ تصویر میں دکھاتا تھا، پہچان لیا۔

لیکن وہ جیکب کی طرف قطعاً متوجہ ہوا؛ وہ صرف اپنی بوجی کو تیز نظر  
سے گھورتا رہا، جو فرط غصہ سے بھال ہو رہی تھی۔ بالآخر اُس نے کشت پیچے  
میں ردی زبان کے چند جملوں میں اُس سے خطاب کیا۔ خطا کا رخنہ تو نہ دو  
زاد ہو کر اُس نے ردی کی انتہا کرنے لگی۔ لیکن قہمی ڈوٹ بغیر کچھ جواب دے  
کمرے سے باہر نکل گیا۔

جیکب جو اس دوران میں امید دیم کے تھک میں مبتلا تھا، اپنی عجب کی  
طرت بڑھا۔

— اس نے تم سے کیا کہا، اوتھو؟

شہزادے کی ہونٹوں کو دمرتہ جھیش ہوئی، لیکن منہ سے آواز نہ نکل  
سکی۔ بالآخر گھبراہٹ میں اُس نے کہا۔

— ہم دونوں میں سے ایک کو ایسا کرنا پڑے گا — ایک کو —  
اس کا ہمیں فیصلہ کر لینا چاہیے — پانچ منٹ کے بعد وہ اس آکر

ہم دونوں میں سے ایک کو ہلاک کر ڈالے گا — سمجھے؟ — تم کو چھوڑا  
یہ سننے ہی جیکب کے حواس باختہ ہو گئے۔ لیکن اُسے یاد آیا کہ وہ اس وقت

مدن میں ڈار کی چکیڑی حکومت کے ماتحت نہیں ہے۔ بلکہ فرانس میں ہے؛  
— ہند اور جمہوری فرانس کی زمین ہاتھ میں!

— ڈیجی ڈوٹ ایسا ہرگز نہیں کر سکتا اُس کا مقصد صرف ڈرانا تھا۔  
اس معاملہ کا فیصلہ ڈویل سے ہوگا یا اطلاق سے؛ اس نے اوتھو کو تسلی

دیتے ہوئے کہا۔  
شہزادے نے مل کر جواب دیا۔ تم اُسے نہیں جانتے۔ وہ ایک بے

بس عورت کو ناؤٹ کی پیہم ضربات سے ہلاک کرنے سے نہ چوکا، باوجودیکہ  
وہ علیحدہ کی امان میں تھی؛

— تو پھر اس صورت میں ہم کو اپنی حفاظت کی آخر دم تک کوشش کرنی  
چاہیے۔ جیکب نے کہا۔ وہ اندر داخل ہو کیوں دیم دونوں اُس پر

ایک ناک جا پڑیں یا دھوکے لے چکے ہوں۔

— حملہ میو دہی۔ وہ سچ ہے؛ یہاں دھوکے لے چکے تھے۔ ہماری  
کون سنے گا؛ اگر لازم یہاں موجود ہوتے ہی سب بغیر نکلے۔ کیونکہ وہ

سب کے سب ردی ہیں۔ جن کے جان و مال کا پرس مالک و مختار ہے؛  
وہ اُس کی مرضی کے خلاف اُٹھیں اُٹھ سکتے۔

— تو پھر میں اس درجہ کی سلاخوں کو توڑتا ہوں۔ یہ کہہ کر جیکب  
نے اپنا نام و لکال زور سلاخوں کو ختم دینے میں لگا دیا، لیکن اُنھیں جیکب  
نکاب ہنوائی؛ بہت جلد اُسے معلوم ہو گیا کہ اُس کی رہائی کا ہر راستہ مسدود  
ہے۔

اوتھو کا لین بر پڑی بسک رہی تھی۔ اُس نے جیکب سے ہنسے کہا،  
— وہ ہم دونوں میں سے ایک کی جان چاہتا ہے۔ جیکب — ہنسا رہی یا میری!

— خوب سوچ لو! — یہ سب کیا دھڑا رہا ہے!  
یہ الزام سن کر اسے تاب نہ رہی، اُس نے مل کر جواب دیا۔

— میرا کیوں؟ قصور اس پر ہوتا ہے۔ تم نے ہی تو مجھے یہاں بلایا تھا۔  
— بزدل! غدار! — کیا تو نے خود یہاں آنے کی مجھ سے درخواست

نہیں کی تھی؟  
— تو جس کو تم نے بالکسی میں ویش کے منور کر لیا تھا؛

— تمہیں تو ایک شہزادے کی عاشق ہونے کے پندار نے مغالطہ زدہ  
بن کر رکھا تھا! — اوتھو نے کہا۔

— لیکن ایک ایسی شاہزادی کا عاشق کہنا جس کے مجھ سے پہلے کئی  
عاشق رہ چکے ہوں۔ جنہاں غفر کی بات نہیں!

— کتنی جگر خراش بات تھی! اٹ  
— پیچ عاشق تین معنی پر مشوق نہ گفت!

دہی طالب و مطلوب جو کچھ عرصہ پہلے باہم دای مجت کے بعد وہاں باندھ  
رہے تھے اب وہ درندوں کی طرح زندہ رہنے کے حق پر محکم رہے تھے! اٹ

— کیا یہاں فراموش کر دند عشق!  
ایک ایک دروازہ کھلا اور پرس سرخی ڈیجی ڈوٹ ریلو اور دست اندر

داخل ہوا۔  
جیکب نے پھر سے ایک کر اوتھو کا باوجود اس کی مزاحمت کے اپنے

بازوؤں میں لے کر اس کے جسم لڑان کو اپنے سبب دھوکے لے ایک زندہ دھوکا

بنالیا! سچ

ایں کار از تو آید و مرداں چنین کنند!

پر تفس نے حقارت آمیز قسم سے کہا۔

”اچھا تو تم دولوں نے ایک ساتھ ہی مرنے کا تہیہ کر لیا ہے؟ بہت

مہارک خیال ہے! بیشک تم ایک جان دو دو قاب ہو! ریلوے کی ایک ہی  
گوئی تم دولوں کو قید کرتی سے آزاد کر دے گی!“ اور یہ کہتے ہوئے اس نے  
اپنا ریلوے اٹھا یا، دولوں عاشق و معشوق ایک چنچ مار کر ایک دوسرے  
سے جدا ہو گئے۔

”رحم! رحم!“ غاقون نے اپنے شوہر کے قدموں پر گر کر روتے ہوئے

کہا۔ میں بے شعور ہوں! مجھے اس شخص سے محبت نہیں — اس نے مجھے

براہ کیا!“

اس پر حکمتیں بول اٹھا

”خدا اچھے نہیں دے۔ یہ سب فتنہ اسی عورت کا ہے، اس نے اپنے

شادی شدہ ہونے کا سچ سے تذکرہ ہی نہیں کیا، مجھے جانے دو۔ میں وعدہ

کرتا ہوں کہ آئندہ اس کی صورت بھی نہ دیکھوں گا۔“

پر تفس نے نفرت بارسکوت سے اُن کی طرف دیکھا، اور حقارت بڑ

قسم سے کہا،

”ابھی چند ہی لمحے پہلے تم دولوں باہم محبت اور پرورش کے تذکرے

کر رہے تھے، اور اُس کی راہ میں قربانیاں دی جا رہی تھیں! لیکن بہت

جلد غریباں حقیقت آشکارا ہو گئی! اچھا تمہیں پسند نہ آئے ہو گا کہ میرا

ارادہ اب تمہیں قتل کرنے کا نہیں ہے! میرا انتقام اس سے کہیں زیادہ

ہو ناک ہو گا! میں تم دولوں کو ایک ہی جگہ قید رکھوں گا۔ تاکہ جب

تاک موت تمہیں آزاد نہ کرے، قریب ہونے کے باوجود ایک دوسرے

کی صورت سے متغیر اور بیزار نہ رہو!

یہ کہہ کر تفس مڑا اور ان مجرمینِ عشقِ باغی کو اپنی سزا سناسکتے کے لئے

چھوڑ کر کمرے سے باہر نکل گیا! (فریسی اسٹاڈ کا ترجمہ)

## میرے لئے

صبح غم میرے لئے شامِ بلا میرے لئے  
کہتی ہے تقدیر تیرے نام کا کچھ بھی نہیں  
بے طلب دنیا کو ملتا ہے دلِ راحت طلب  
چارہ گر کی کیا ضرورت کیوں ہوں ممنونِ دوا  
بدگماں صیاد و دشمنِ باغباں گلچیںِ خف  
ابتدا میرے لئے ہے انتہا میرے لئے  
میں سمجھتا تھا کہ میں ارض و سما میرے لئے  
دائے قیمت تھا دلِ دردناں میرے لئے  
درد و غم و بچائے گا بڑھکے دوا میرے لئے  
ناموافق ہے زمانے کی ہوا میرے لئے

اگلی محسن سمجھ میں ٹھوکریں کھانے کے بعد

میں بلا کے واسطے ہوں اور بلا میرے لئے

# ہندوستان کی جمہوری زبان

امام اکبر آبادی

(۲)

وطن کو اس سے چڑھے، اور ایسا کرنے سے اردو عام فہم نہیں ہو سکتی، میرے نزدیک یہ اعتراض کچھ وزن نہیں رکھتا، اس لئے کہ اولیٰ تو برادران وطن کو اردو الفاظ سے نفرت نہیں بلکہ اس کے رسم الخط سے متغیر ہیں، دوسرے یہ کہ ہر زبان کے دو فرق ہوتے ہیں، ایک وہ جو ملک کے دربرو اعلیٰ لٹریچر پیش کرتا ہے، اور اس کو ہمیشہ ہی زبان سے استفادہ کرنا پڑتا ہے، اور چونکہ عربی و فارسی بھی زبانیں ہیں، اور اس گروہ کا ہمیں زبانوں سے قریبی رشتہ ہے۔ لہذا ان کی نظر ہمیں پر ہوتی ہے۔ دوسرا گروہ غیر انشا پرداز ہوتا ہے، جو معمولی لکھنے پڑھنے پر اکتفا کرتا ہے، اس کو معیاری ادب سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ اس کو بھی چھوڑیے اور دیکھئے کہ اردو زبان میں عربی و فارسی کے الفاظ زیادہ ہیں یا ہندی کے ابھی اس کا شمار اوپر بنایا جا چکا ہے، اس کے ثبوت میں ڈاکٹر گستاخی بان، جو ایک فرانسیسی محقق ہے، اور جس نے ہندوستان میں اپنا سارا وقت اسی تحقیق و تفتیش میں گزارا کہ یہاں کی قوموں، برادرانوں، زبانوں کی تحقیق کرے اور تہذیب و تمدن نیز تاریخی حالات قوم ہند کے دنیا کے دربرو پیش کرے۔ لکھتا ہے کہ

”جو سیاح ہندوستان میں اس خیال سے آئے کہ وہ تمام ملک ہند کے

باشندوں سے ہمیں کی زبان میں لنگو کوئے تو اسے تقریباً ۴۰۰ زبانیں

اور ۳۰۰۰۰ محاورے سیکھنا پڑیں گے۔“

مصنف فرینگک آصفیہ لکھتا ہے کہ اردو زبان کا سرمایہ الفاظ و محاورات کل ۵۵ ہزار ہے۔ اس میں تقریباً تیس ہزار عربی کے الفاظ، اس سے کچھ زیادہ فارسی کے، ہزار آٹھ سو الفاظ ترکی، پرتگالی اور انگریزی کے ہیں۔ باقی میں چوتھائی کے قریب خاص اردو کے وضع کیے ہوئے ہیں، اور اس کے بعد بڑی تعداد ہندی الفاظ کی ہے۔

یہ فرینگک مشرق میں شائع ہوئی ہے، اور چوتھی جلد کے آخر میں تفصیل درج ہے، لیکن تیس سال کے گزشتہ دور میں اردو نے جس قدر ترقی کی ہے اور جس سرعت کے ساتھ اس نے اصطلاحات وضع کرنے کا، اور نئے نئے الفاظ ڈھالنے کا کام کیا ہے۔ نیز دنیا کے دربرو جمعیاری ادب پیش کیا ہے، اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ چند ماہ میں انہیں ترقی اردو نے تنہا کچھ اوپر چھ ہزار عربی اصطلاحات وضع کیں، اس کے علاوہ چھوٹی چھوٹی انجمنوں نے، اور انفرادی طور پر سے دیگر شعراء و ادیبانے ہزار ہا نئی نئی ترانے استعمال کر کے اردو زبان کو چار چاند لگا دئے، اس بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ آج اردو کا سرمایہ الفاظ دو گنا ہو گا۔

یہ اعتراض کہ موجودہ دور میں اردو کے انشا پرداز عربی و فارسی

کے زیادہ الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ اُن کو ایسا نہیں کرنا چاہیے کہ براہِ دہان

اس بنا پر انھوں نے سبیا تفتیق و کاوش کے بعد اردو زبان کو ملکی بتایا، جس کا آپ آگے پڑھیں گے، یہاں صرف ملاحظہ کے لئے نمونے کے طور پر ذیل کے مضامین درج کیے جاتے ہیں۔ تاکہ آپ اندازہ کر سکیں کہ عربی و فارسی کے الفاظ زیادہ میں یا ہندی کے۔ سبھا شاکا ادیب لکھتا ہے۔

”دھرتوں کے ٹھنڈ چھانے ہیں۔ گئے ہوئے پتے ہیں۔ ان کی گہری گہری چھاؤں ہے۔ جاس کی ٹہنیاں، اور آہ کے پتوں میں پھری ہو رہی ہے۔ گہری کی ٹہنیاں۔ فاسے کے درخت میں سبھی ہوئی ہیں۔ چاندنی کی بل، گرک کے درختوں پر لٹی ہوئی ہے عشق بیچاں لکروندے پر چڑھی جا رہی ہے۔ اس کی ٹہنیاں سانپ کی طرح ہل رہی ہیں۔ بھجوروں کے گچے پڑے ہندو ہے ہیں۔“

برسات کی ببار کے متعلق اس طرح لکھتا ہے۔

”ساتھ سے کالی گٹھا جھوم کر آئی۔ اور دھواں دھار ہے۔ سبھی کو گندتی

جی آتی ہے سبھی میں بیگوں کی سفید سفید قدیں پھاڑ دیکھ رہی ہیں جب بال کرکڑا ہے۔ اور سبھی بچے ہے تو پرندے، دیک کرکھی ٹہنیوں میں چپ جاتے ہیں، آہی دیواروں سے لگ جاتے ہیں۔ سورج اچھکا رہتا ہے، اور پیچھے الگ نکارتے ہیں۔ چٹا زیاں برسی بھری ہیں، اور دگر سر سبز بادلوں میں جیسے بڑے گھانڈاؤں آ جاتے ہیں۔ پھاڑ کے پیچھے ایک وامن میں بڑل جیل ہر رہا ہے، مینے مرقی کی آب۔ بھجوں پچ میں ہنر باد ہے۔ جب اس کے اونچے اونچے مکانوں اور برجوں کا مکس پڑتا ہے تو پانی میں کھسکیاں جھلک جھلک کرتی ہیں۔“

رات کی آدھی کے متعلق یوں لکھتا ہے۔

”آسی رات، ادھر آدھی رات، ادھر بجلی سنسن، اندھیرا سیاہان، مرگٹ میں دور دور تک دھیرے دھیرے بڑے کٹر پڑے ہیں۔ کہیں تپاں آگ بجتی ہے۔ بھرتوں، پر تیوں کی ڈاؤنی حوریں، اور دیکھیں حوریں ہیں۔ کوئی تار سا قد، کوئی لال لال دیدے پھاڑے، اچھے اچھے دانت نکلے، گلے میں کھوپڑیوں کی لاڈلے کھڑا ہے۔“

اب فرمائیے کہ مندرجہ صدر مضامین میں عربی و فارسی کے کتنے الفاظ ہیں؟ اور ہندی کے کتنے؟ اسی نوعیت کے ہزار ہا مضامین ہیں، جن کے مقابلے میں عربیت و فارسیّت آمیز مضامین ایسے ہوں گے جیسے آٹے میں

نمک، حقیقت یہ ہے کہ اگر ہندوستان کی زبانوں اور بولیوں کے متعلق بحث کی جائے، تو تفصیل سے لکھا جائے تو یہ داستان گنج جلدوں میں ختم ہوگی، کیوں کہ یہاں کی سرزمین پر صد ہا زبانیں اسی طرح پھیلی ہوئی ہیں، جس طرح صد ہا مختلف ذاتیں اور برادریاں۔

اسی وجہ سے ڈاکٹر گستاؤلی بان کو اور تمام ستیاہوں کو ٹکھنوں اور دقتوں کا مقابلہ کرنا پڑا۔ اور کہنا پڑتا ہے کہ ہندوستان میں کوئی مشترکہ زبان نہیں، اور ایک ہے بھی تو اس کو سٹا دینا چاہتے ہیں، حالانکہ اردو زبان کی تدوین اور اس کی توسیع و اشاعت میں جس قدر حصہ مسلمانوں نے لیا ہے، اسی قدر اہل ہندو نے بھی، آج بھی ہندوستان کا ایک اکثر گروہ اردو زبان کی توسیع میں برابر کا حصہ رہا ہے۔ ہندو دوستوں نے اس کو اپنی زبان سمجھ کر تصنیف و تالیف میں، شعر و شاعری میں، اور ادب و لطیف میں، باوجود زمانہ حاضری کی مخالفت کے وہ پیش کی ہے جو تاریخ میں یا دگار رہے گی۔ نہ صرف ہندو، بلکہ ہندوستان کے یورپین حضرات نے بھی اردو کی توسیع میں کافی حصہ لیا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت ہٹ کو سونا پڑا، کہ ہندوستان کی دلچسپی زبانوں میں اگر کوئی زبان ملکی زبان بننے کا حق رکھتی ہے تو وہ صرف اردو ہے۔

چنانچہ اس نے ملک کے ماہرین زبان کو وقتاً فوقتاً جمع کر کے مشورہ لیا کہ ہندوستانیوں کے لئے اور خصوصاً انگریزوں کے لئے کونسی زبان ایسی ہو سکتی ہے، جس میں اجماع ہو، سادہ سلیس ہو، اور تمام مرد و عورتوں پر عادی ہو؟ اس پرسب کی مشفقہ رائے ہوئی کہ اردو زبان سے زیادہ کوئی زبان ایسی نہیں جو صحت و جاویدیت، سلاست و روانی میں اس کا مقابلہ کر سکے۔ چنانچہ لاہور دارن میننگز جو ہندوستان میں انگریزی سلطنت کے قیام کا بانی سمجھا گیا ہے، اس نے انصاف پسندی سے انگریزی زبان پر عربی و فارسی کو ترجیح دے کر اسے انگریزوں ایک مدرسہ مدرسہ عالیہ کے نام سے سکھانے میں جاری کیا، اور فارسی کو دفتری زبان تسلیم کر لیا، یہ اس لئے کہ جو کچھ فارسی میں زبان ہے اور اردو فارسی ہے، اور فارسی زبان ہمیشہ عربی زبان سے استفادہ کرتی ہے، لہذا فارسی کے راگ ہونے سے اردو کی اشاعت خاطر خواہ ہوتی رہے گی۔ لیکن اس کے بعد جب لاہور ڈیپارٹمنٹ نے محسوس کیا کہ یہ دونوں زبانیں، یعنی عربی و فارسی غیر ملکی ہیں تو انھوں

سے بڑی دلچسپی رکھتے تھے۔ تنازکا ثابتی، شعروشاعری کا ذوق رکھتے تھے، پہلی اہل شکرت نے فاضل ہونے کے باوجود اردو سے بڑی دلچسپی رکھتے تھے اور حسنِ پرستی کے باب میں خوب شاعری کی ہے۔ تان سین کوہستی کے ماہر تھے۔ اور اردو ادبیات کا ذوق رکھتے تھے، لنگاہ، یہ غان غاناں کے درباری شاعر تھے، ایسے کہ ان کی شاعری سے متاثر ہو کر شاہ نے ان کو ایک مہینے پر ۳۵ لاکھ روپیہ بطور انعام دیا، جوٹ سنگھ، دیو کوئی چکیت مشہر راجہ جی، کالی داس وغیرہ وغیرہ یہ سب کے سب اردو زبان کے حامی و مددگار تھے، ان کے علاوہ ہمارا جلدان سنگھ، صاحب دیوان تھے مٹی جواہر لال جواہر شنئی سحر البیان اور سیر التاخرین وغیرہ کے مصنف تھے۔

شہاب الدین غوری کی فتح پر شاہ نے جن چند کوئی نامی شاعر نے، برقی راج راسا لکھا۔ راجہ جے سنگھ سوانی نے اردو زبان کی بڑی قدر کی، مٹھی ہر گوبال تفت کی مرزا غالب، مجبشت ادیب ہونے کے بڑی قدر کرتے تھے، پنڈت موٹی لال منیر جم کر گشت پنجاب، اور دیگر اسی قبیل کے ادب نواز مشہور و معروف گذرے ہیں۔

ہمارا ج صاحب اور اردو کے مشہور شاعر ہیں، اور غالب صاحب دیوان بھی ہیں۔ لیکن پرشاد صاحب سابق وزیر اعظم نظام حیدر آباد اردو کے اعلیٰ شاعروں میں ہیں، اور سارے ہندوستان میں مشہور ہیں، پنڈت موٹی لال ہنر کے تمام خاندان کی مادری زبان اردو ہے، اور شمالی ہند کے تمام کاسٹہ و کشتریوں کا شمار اردو کے اہل ادب میں ہے۔ سر پنج پیا درپور نے اردو زبان کے متعلق ۳۸ فروری سنہ ۱۹۰۸ء کو انجمن ہمارا ادب کی صدارت کے موقع پر اردو کی ہمدردی، اور اس کی بنیاد کے متعلق ایک بصیرت افروز تقریر فرمائی جو درج ذیل ہے۔

”دراصل اردو زبان کے وجود میں آنے کی وجہ یہ تھی کہ ہندوستان

ایک دوسرے سے متحد ہو سکے، کیونکہ اس زمانے میں یہ ممکن تھا کہ تمام ہندو عربی سیکھ لیتے یا تمام مسلمان ہندی سیکھ لیتے، اس لئے ایک مشترک زبان کی حیثیت سے اردو وجود میں آئی۔ میں تسلیم کرتے ہوں کہ یہ زبان

کہ اردو زبان صرف مسلمانوں کی زبان ہے، اور اردو جاننے والے محض مسلمان ہیں۔ اردو کی خدمت سب سے زیادہ محنت لے کر ہے اور جس قدر خدمت اس جگہ برپا ہے ہندوستان کے کسی اور شہر میں نہیں

انہی آتش بیانی سے ایک انقلاب برپا کیا، اور عیسائی مشنریوں کی تحریک پر فارسی کو دفتر سے ہٹا کر، انگریزی وارد کو اس کی جگہ دیدی یہ کس لئے؟ صرف اس لئے کہ یہی ایک زبان ایسی سمجھی گئی جو تمام ملک کے لئے آسان ترین تھی، چنانچہ مشنریوں میں ڈاکٹر جرن بگوار اسٹ کی نگرانی میں سرکاری حکم اور جرن سے فورٹ ولیم کالج میں اردو زبان کا ایک کالج قائم کیا گیا، اور صدر عدالت دیوانی نے حکم نافذ کیا کہ ہر مانت عدالتیں اردو کو رواج دیں۔ چنانچہ حکومت ہند نے اس زبان کی تصنیف و تالیف پر انعامات مقرر کر دیئے اور تمام مدارس میں اس کو جاری کر دیا۔ رفتہ رفتہ یہ زبان سارے ملک میں پھیل گئی۔

مگر یہ تو بعد کی باتیں ہیں، انگریزوں کی حکومت سے بہت پہلے، تاریخوں کے مطالعہ سے یہ بات بہر تعلیم یافتہ جانتا ہے کہ کشالی ہند میں ہندو مسلم اختلاف وارتباط کی وجہ سے ہندی و فارسی کے الفاظ مخلوط ہو کر ایک نئی زبان پیدا کر گئے تھے جس کا نام اردو ہے، سکندر لدھی کے زمانے میں جب کہ آگرے کو پایہ تخت بنایا گیا تھا، تو اسی وقت سے برادرانِ وطن نے فارسی زبان سیکھنا شروع کر دی تھی، اور غالب فارسی کا سب سے پہلا شاعر پنڈت ڈوگرل تھا، کاسٹہ و کشتری پنڈتوں کو اس زبان سے کافی دلچسپی تھی، اور اسی بنا پر اردو ان کی مادری زبان ہو چکی تھی، پس جس زمانے میں اردو کی تشکیل شمالی ہند میں ہو رہی تھی قریباً اسی زمانے میں یہ کام جنوبی ہند میں ہو رہا تھا، اور ترقی طور پر ہو رہا تھا، جس میں ہندو مسلمان دونوں برابر کے حصہ دار تھے، اور انگریز بھی کافی دلچسپی لے رہے تھے۔ شمال کے طور پر چند انشا پر داؤد ہندو بزرگوں کی نام درج ذیل کے جاتے ہیں، یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے تصنیف و تالیف و ادبیات میں کافی حصہ لیا۔

کتیر داس، ان کی شاعری میں بھاشا کا رنگ غالب تھا، ان کا کلام علاوہ آجیات کے دوسری کتابوں میں بھی ملتا ہے، گردننگ متا یہ مواحدتے، اور ان کا سارا کلام صوفیانہ رنگ میں ہے، بابا تسی داس مترجم رامائن وغیرہ سرور داس جی، آپ نے سری کرشن جی کا ترجمہ کیا، لولال جی آپ نے چند کتابیں تصنیف کیں، راجہ شیر پرشاد دیر منشی تھے، سندھو برہمن چند کتابوں کے مصنف تھے، سہناپت برہمن قنوی اردو زبان

ہوتی۔ میں سمجھتا ہوں کہ اہل لکھنؤ اس خزانے کے وارث بھی نہیں، بلکہ حافظ بھی ہیں اور اگر یہ خزانہ ڈنٹ لگا تو بلی لکھنے بھرم ہوں گے۔

میں اخباروں میں زبان کے معاملہ کے اختلاف کو بڑے انصاف سے دیکھتا ہوں۔ مگر نہ تو اس کو ہندو دیکھتے ہیں اور نہ مسلمان کو ہم اس ذریعہ افتاد کو ذکر کرتے ہیں جاتے ہیں۔ سچا سال قبل یہ ہوتا تھا کہ جب ایک ایک کتب میں پڑھتے جاتا تھا تو پانچ دہے والے سواری صاحب سے تعلیم حاصل کرتا تھا، اس وقت نہ تو کوئی پریزورسٹی تھی نہ کچھ اور تھا۔ مگر اس وقت یہ جہان تھا کہ ہندو دھرم اسلامی ہندو سب سے اور مسلمان بچہ ہندو ہندو سب سے واقف ہوتا تھا۔ جب آپ ایک دوسرے کی ہندوبندوں سے واقف ہوں گے تو باہم اتفاق و اتحاد کیونکر ہو سکتا ہے؟ اور ایک دوسرے کی عزت کیونکر کر سکتا ہے؟ جب عربوں نے اسپین فتح کیا تو وہاں اصفیٰ نے ایک ایسی زبان کی بنا تھا جس کے لئے ڈالی تھی۔ اگر آپ اتحاد کے جو یا ہیں جس کے ہندوستان فتح نہیں کر سکتا تو آپ اردو زبان کو فتح کریں، موجودہ اردو کی روش سے کچھ اتفاق نہیں ہے۔ آج کل اردو ایسی استعمال ہو رہی ہے کہ لکچرائٹ دیکھے کام نہیں چلے گا۔ لکچرائٹ کے غیر فوٹو اس الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں۔ اسی طرح جو حضرات ہندو و فروع میں رہتے ہیں اور ہندی و سنسکرت کے راہ میں ہیں وہ بھی یہی کہہ رہے ہیں۔ یہ طریقہ بھی نہیں ہے۔ میں ہندیت بھرنے کے ساتھ لکھنؤ کی لکھائی زبان کے حامیوں سے کہوں گا کہ اس زبان کو ذریعہ اتحاد و ہمبھائی کرنے کے لئے اردو نہ لکھو گے کیونکہ اس زبان سے بہتر اردو کا محو نہ ہیں؟ مجھے انجمن بہار ادب کے معاملہ سے دلی ہمدردی ہے، اور میں اس کی خدمت کرنے کے لئے ہر طرح تیار ہوں۔

جو میں اردو و فارسی ہندو بزرگ، جو معمولی لوگ نہیں ہیں، بلکہ ہندوستان کی تمام شخصیت کے گرد کے ایک فرد ہیں۔ لیکن آج جو ہمیت برادران وطن کے ایک کثیر گروہ میں کام کر رہی ہے، وہ موسم اور ذہن رکھو و ذہنیت ہے، انظار اس گروہ کی کدش مناجا نہ نظر کرتی ہے، لیکن باطن ہلاکت آفرین ہے، زندگی کے ہر شعبہ کے متعلق محبت، ایچ بی جی، اور آسٹری کے اعلانات کے لئے، اور کئے جا رہے ہیں، انڈین نیشنل کانگریس کے پیٹ فارم سے اتحاد و تحفظ اقلیت کی آواز اٹھاتی ہے، اس کی ورلڈنگ لکھی بار بار اقلیتوں کو تحفظ کے ذریعہ منظور میں دعوت دیتی ہے، اور اہل زبان و دھرم اقلیت کے متعلق کہا گیا ہے کہ کانگریس

کسی زبان کے رسم الخط میں مداخلت نہیں کرے گی۔ کانگریس کے دستور کار کی دفعہ ۱ میں یہ درج ہے کہ اس کی جد کارروائی معمول ہندوستانی زبان میں ہو کرے گی، اور ہندوستانی زبان کی تعریف انڈو کے ہندی سہاوتہ سیمین کے سالانہ اجلاس میں گاندھی جی نے اس طرح کی تھی کہ

وہ زبان جو ہندی ہند میں عام طور سے بولی جاتی ہے اور جسے اردو و دیوناگری دونوں صورت میں لکھا جاتا ہے۔

پنڈت جواہر لال نہرو نے زبان کے مسئلہ پر جو ایک مختصر رسالہ لکھا ہے اس میں اس طرح اعلان کیا ہے،

شمالی ہندوستان میں قومیت کے ساتھ جڑ زبان بولی جاتی ہے وہی ہندوستانی ہے، خواہ اُسے ہندی کہا جائے یا اردو۔

مسٹر سوبھاش چندر بوس نے اپنے خطبہ صدارت میں اس مسئلہ پر انجمن بر خیال کرتے ہوئے بولی فرمایا کہ

ہندی اردو کے درمیان جو فرق بنایا جاتا ہے وہ اسی نہیں ہے جتنی ضرورت پڑتی ہے۔ ہماری مشترک قومی زبان دیہی ہے جو ملک کے ایک دیکھنے والے عربوں بولی جاتی ہے چاہے اُسے اردو رسم الخط میں لکھا جائے یا دیوناگری رسم الخط میں۔

لیکن اس تمام توضیح و تصریح کے باوجود کانگریس کے بیشتر مذاہن کی ذہنیت یہ ہے کہ وہ ہندوستانی زبان ہر اس لفظ کو نکال دینا چاہتے ہیں، جو اصل کے اعتبار سے عربی یا فارسی ہے۔ ایسے الفاظ جو روزمرہ کی عام گفتگو میں خواہ کئے جاتی ہیں، اور خواہ اُن کے کچھ میں کتنی ہی آسانی ہو لیکن اُن کی رسوم ذہنیت ان کے ترک کر دینے پر باطل آئادہ و مستعد ہے، اور اُن کے بدلے وہ جناتی زبان لکھی اور بولی جاتی ہے، جس کو سوائے مقرر کے پاس کچھ سہیجہ آدمیوں کے اور کوئی نہ سمجھ سکے۔ اس جناتی زبان کو ملک میں عام کرنے کی پوری کوشش و طاقت صرف کی جا رہی ہے، مثال کے طور پر یہاں چند الفاظ درج کئے جاتے ہیں۔

|       |       |           |        |
|-------|-------|-----------|--------|
| گرین  | منظور | آؤٹ       | مزدوری |
| پرست  | تجوڑ  | سنسودھن   | ترمیم  |
| پرانت | مردہ  | سو متفرتا | آزادگی |
| بیہوش | ہندوب | انتی      | ترقی   |

محور کیا، مٹھلا دیا۔ آج انھیں عدول کو یاد دلانے کے لئے کانگریس قائم ہوئی لیکن ابھی اُس نے پوری طاقت بھی حاصل نہیں کی کہ عہد باندھنے کے ساتھ ہی توڑ دیا۔ اگر واقعی سنسکرت کا سار سے ملک میں پرچار کرنا ضروری سمجھا گیا ہے تو کچھ، اس بدعہدی کا نتیجہ ہی ہوگا جو ہمیشہ بوتا آیا ہے۔

بہر فرقت کوئی زمانہ ایسا نہیں گزرا، جس میں برادران وطن نے اس زبان کو شکر کہ زبان نہ سمجھا ہو۔ موجودہ دور میں جو چھات و تعصب کے باب میں اپنی نظیر نہیں رکھتا۔ ہندوستان کے گوشے گوشے میں کوئی جگہ ایسی نہیں، جہاں اردو لازماً پسند و دوست، مسلمانوں کے ہمدوش نظر نہ آئے ہوں۔ اس گروہ نے محسوس کر لیا ہے۔ اور اس کو بھولی علم ہے کہ اردو تنہا مسلمانوں ہی کی زبان نہیں ہے، بلکہ ہند کی تمام قوموں کی ہے، اور جبکہ اس میں ہندی کے سہ چہند الفاظ ہیں، اور ان الفاظ کا استعمال مسلمان بھی کرتے ہیں تو پھر کیا وجہ کہ اس کا ریم خط اردو ہونے؟ الفاظ ہندی کے اور خط اردو کا، زناد میں نیچے کے دانے معلوم ہوتے ہیں، اور رشتہ اتحاد کی مثال دنیا میں اس سے بہتر نہیں ملے گی، جب کہ ہندی کے الفاظ مسلمانوں نے قبول کر لئے تو وہ ریم خط ہندوؤں کو قبول کر لینا چاہیے، اس سے بہتر نصیحتات ہو نہیں سکتی، اور اگر آپ تو قیاس کیا جائے۔

ہندو ادب و شعر الگ ہے چند نام بطور نمونہ پیش کر دئے گئے ہیں، اور ان میں ایسے ایسے بزرگ اور قوموں کے بانی ہیں۔ جن کے نام نامی سے بچہ بچہ واقف ہے، اور جن کا احترام ہر قوم و جماعت کے لوگ کرتے آئے ہیں، اگر دھانک صاحب، کبیر داس جی، بابا جی داس، کالی داس، اور تانائیں، یہ وہ بزرگ ہیں جنہوں نے ہند کی سر زمین میں جھنڈے گاڑ دیئے ہیں، اُن کی روش کو شکر دینا آسان کام نہیں ہے۔ اگر تمام اردو لازماً ہند کے نام درج کے حامیوں کو اس کے لئے کئی مجلسیں و کار کار ہوں ملی۔ حقیقت یہ ہے کہ اردو زبان کی جاذبیت حیرت افزا ہے۔ دنیا کی کوئی زبان ایسی نہیں جس کے الفاظ اس میں آسانی سے آسائیں، اور اس ضمن خوبی کیساتھ کہہ سکتے ہیں اور سننے والا محسوس نہیں کر سکتا کہ یہ اس کی مادری زبان کے الفاظ ہیں، یا کسی غیر زبان کے، مثال کے طور پر یہاں چند غیر زبانوں کے الفاظ درج کئے جاتے ہیں، ملاحظہ ہوں۔

انگریزی کے الفاظ۔ گلاس، ٹن، ہلک، کوٹ، پنکون، انجن، ریل، لائن

خلک، تعلیم، شہادت، اصول، گھوشن، اعلان، متعبد، اختلاف، سرپرست، منہ کار، رشتہ بہرہا، کانگریس، کلنی ٹیکنک، کھلا اجلاس، پرتی ندی، ڈیٹیلیٹ، بوجہ تالیف، جاتے علماء

کانگریس کے قائدین غلام کے پیروا عید و اعلانات کے بعد اور اس کی دھند، اے کے تحت رہے شمالی ہندوستان کی عام زبان جس کا ایک ایک لفظ تو کوئی مسلمان سمجھ سکتا ہے اور نہ ہندو۔ پھر اس کے علاوہ کانگریس کے پندل میں اس کی ہر ہر شے شگاہ پر، دروازوں پر، نشانیں لگا دیں، اور یہاں کے دوسرے دوسرے پوسٹاٹے ہندی و بھارتی رسم الخط کے اردو کانگریس نام تک نہیں ہوتا، اُن کے غذاات، اُن کے رجسٹر، اور ان کی رسیدات، استہانات و دیگر وغیرہ وغیرہ سب کے سب دیوناگری میں ہوتے ہیں، دیکھنے والوں کو اور خصوصاً شمالی ہند کے باشندوں کو ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ یا تو ہم کسی غیر ملک کے جلسہ میں شریک ہیں، اور یا جاہل و اُن پر دم کر گئے، پھرے اور اندھے ہیں کہ نہ بول سکتے، نہ سمجھ سکتے، اور نہ دیکھ سکتے ہیں۔

بڑی پور کانگریس میں یہ تھی شمالی ہند کی زبان، اب اگر مسلمان آنکھوں پر پٹی باندھ کر اور کالوں میں سدھی ٹکوس کر کانگریس میں شریک ہونے تو بھی جتنا ہی زبان سارے ملک میں پھیلی ہوئی نظر آئے گی۔

حقیقت یہ ہے کہ جب کوئی فرد یا کوئی قوم کسی سے قوی تر ہو جاتی ہے، تو طاقت کا زور، آنکھوں کی بصارت، کالوں کی سماعت، اور دماغوں کی قابلیت ذائل کر دیتا ہے، اور حق و انصاف کا نام صرف زبانوں اور کاغذوں پر بجاتا ہے، تاریخ میں اس کی بہت سی مثالیں ہیں گی کہ عہد و بیان ہمیشہ توڑنے کے لئے باندھا گیا ہے، چنانچہ ہندوستان کا تاریخ دان گروہ باغیر ہے کہ کشتہ رو میں برٹش پارلیمنٹ نے ہندوستان کے مفاد کے لئے کیا اعلان کیا تھا؟ پھر کشتہ رو میں مذہب، نسل، اور رنگ کے فرق امتیاز کے متعلق کیا کیا تھا؟ پھر یہ وعدہ کہ ہندوستان کے مفاد کو یورپین مفاد پر ترجیح دیں گے، کیا ہوا؟ آخر میں مشہور افسانہ ملک و کٹوریا آج بھی نہ

ان اطلاعات کی تصریح میں جو کچھ زبان اور جن لفظوں میں فرمایا خبردار ان ہند کے دلوں پر وہ الفاظ بھی مترجم ہیں، لیکن طاقت نے ان تمام وعدوں کو کھسکا

درج کردہ سود ہے، یہ اور اسی قبیل کے ہزار الفاظ و دوا استعمال کئے جاتے ہیں۔ جن سے ایک شہری، ایک دیہاتی، ایک عالم اور ایک گنوار تک واقف ہے، اور جانتا ہے۔ سمجھتا ہے کہ یہ الفاظ میری مادری زبان کے ہیں، اُس کو ان کے بولنے اور سمجھنے میں کوئی تکلیف اور کوئی رکاوٹ نہیں ہوتی۔

چونکہ سب سے پہلے یورپ سے ہندوستان میں پرتگالی قوم آئی تھی اور باوجود اس کے کہ اس کی حکومت یہاں پر برائے نام رہی، تاہم پرتگالی زبان کے الفاظ بھی اس میں بکثرت بول گئے۔ ان کے علاوہ فرانسیسی اور یونانی الفاظ بھی اردو میں شامل ہیں۔ جن میں "یونانی لفظ ہے جس سے ایک گنوار تک واقف ہے۔ (باقی آئندہ)

ایشین۔ ٹمک۔ بنگ۔ نوٹ۔ سائیکل۔ موٹر۔ گاڑی۔ پوسٹ کارڈ وغیرہ غیر پرتگالی الفاظ۔ کرا۔ تباکو۔ بوتل۔ گلاس۔ الماری۔ آئین۔ توپا وغیرہ وغیرہ ترکی الفاظ۔ قاب۔ قابو۔ قاش۔ قرق۔ قزاق۔ قلاش۔ قورما۔ قینچی۔ چمک۔ چمچ۔ ماش۔ ماش۔ زاد (ایک پہل کا نام ہے) جو گنوار تک جانتا ہے، فارسی الفاظ۔ چاک۔ چاکلوسی۔ دو۔ چار۔ چارہ۔ چاشنی۔ چاکر۔ چالاک۔ چائے۔ چپاتی۔ چراغ۔ چربی۔ چرخ۔ چیت۔ چتر۔

عربی الفاظ۔ ماتم۔ ماجر۔ مادہ۔ ماش (دال کا نام ہے) مال۔ مٹن۔ ملک۔ ملکیت۔ اراکھی۔ عدالت۔ روکیل۔ محضر۔ عرضی۔ عزت۔ عرق۔ محل۔ روضہ۔ مصنف۔

ہندی، اور اردو کے الفاظ کی تو بہرہ مار ہے، اس لئے ان کا یہاں

## عہد

ہندو والوں کو جگا دوں گا میں خواب ناز سے  
سجھ و زنا کے انسوں مٹا دوں گا میں  
عارضی درد و الم مجھ کو ڈرا سکتے نہیں  
بادۂ حُب وطن سے سرسبز سرشار ہوں!  
میرے نعروں میں جہاد و جہد کے پیغام ہیں!!  
جبر و استبداد کے قلعوں کو ڈھانے کے لئے  
میں اٹھا ہوں ہند کے اک گوشہ آزاد سے  
کیکپا اٹھے گا میرے نام سے سرمایہ دار  
زندہ کروں گا میں اُن کو شعر کے عجا ز سے  
تہذیب اس کفر و ایمان کی چھاؤں گھائیں  
عاداتِ زندگانی مجھ پہ چھاسکتے نہیں  
عشق کی تشیل کا اک جاو داں کردار ہوں  
رُست خیزی اور تغیر دو ہی میرے کام ہیں  
عزتِ مزدور دنیا میں بڑھانے کے لئے  
لے کے اپنے ساتھ تند و تیز و عالی حوصلے  
زندہ ہو جائے گا پھر عُشرت کا مارا کشتکار

شیر کی صورت بچھ جاؤں گا، چاہے کچھ بھی ہو  
مجھ کو جو کرنا ہے کر جاؤں گا، چاہے کچھ بھی ہو

# خون آرزو

شکیدہ انتر

کی رکھی تھیں۔

اُس نے حوالی کی دوکان پر باپ کے نہیں اپنے پیٹ کے لئے ہاتھ پھیلا دیا۔ بابا۔۔۔۔۔ کچھ دیدو۔۔۔۔۔ عجبو کا بھوں۔ مگر حوالی کی ایک دلد وڑواٹ سکندوہ ہم گیا، اور باپ کے گئے کی جھٹھلوں سے لپٹ کر پھوٹ پڑا۔ بابا۔۔۔۔۔ بابا وہ نہیں دیتا۔ بچہ باپ کی لاش کو چھوڑ کر اچھی نئی انگلیوں سے انگلیوں مل کر رونے لگا۔ بابا جو کئی ہے کچھ دلا دو۔ اندر سے فقیر نے اپنا سر تنگ چہرہ اٹھایا۔ دھنسی ہوئی انگلیوں کو گردش دیتے ہوئے کہا "دیدو بھائی کچھ بھی دیدو۔ یقین کرو کہ یہ معصوم بچہ صبح سے بھوکا ہے، اور اب رات ہو رہی ہے، تہا سے بھی نیچے ہیں کچھ تو سوچو۔" فقیر کی آواز سن کر اس پاس کے محلویوں نے بھی کہا۔ "کیا تہا را یہاں کچھ قرضہ ہے جو اتنی دعویداری کر رہے ہو؟" نہیں بابا بچے کے لئے کہہ رہا ہوں، وہ صبح سے باطل بھوکا ہے۔ فقیر نے اپنے سوکھے چہرے کو ہلاتے ہوئے کہا۔ "ارے ان فقیروں کا کچھ نہ پوچھو۔ ہر دفت ہر ملک اور ہر گھڑی سینے پر سوار رہتے ہیں۔" یہ کہتے ہوئے کچھ لوگ اندر سے فقیر اور اُس کے ننھے ننھے کو دھکیلے ہوئے گزر گئے۔

بچہ اب چپ تھا۔ فقیر نے جھگڑا اپنے نیچے کو ٹٹولتے ہوئے کہا۔ "کیا کھا رہا ہے منیر؟ بابا سڑک پر کھل کی ٹھک لکھائی ہوئی تھی وہی کھا رہا ہوں نہ ہی لوگے بابا؟" فقیر رو پڑا۔ اُس کی آنکھوں کے کنارے شکرل آسروں نکل رہے تھے، اُس نے اپنے نیچے کو گلے سے لگاتے ہوئے کہا دینا خود غرض ہے منیر معصوم بچہ اپنے ننھے ہاتھوں سے باپ کے نام کا چہرے کو اٹھاتے ہوئے بولا، اُس

"بابا۔۔۔۔۔ بابا کچھ دیدو۔۔۔۔۔ راو خدا پر کچھ دیدو۔۔۔۔۔ اندھا فقیر صدا لگا رہا تھا۔ مراد پور کے پُرونی بازار میں جھلکتی ہوئی دوکانوں اور سر بلند عمارتوں کے آگے اندھا فقیر گڑا رہا تھا، اُس کی دونوں آنکھیں اُس کے فداکرت زدہ چہرے کی جھڑکیوں میں دھنسی ہوئی تھیں۔ اور دائیں کے بال بے ترتیبی سے چہرے کے دونوں طرف پھیلتے ہوئے تھے۔ اُس کے جسم پر کوئی کپڑا نہیں تھا۔ صرف دو جھینوں کا ایک ہار اُس کے جسم کی ہڈیوں پر پڑا ہوا تھا، وہ صدا لگا رہا تھا اور حسرت کے ساتھ کبھی اس طرف نہ پھیر کر جھانکتا اور کبھی اُس طرف۔ اُس کے حلقہ چشم میں دھنسی ہوئی چمکیں تیزی سے چل رہی تھیں اور وہ اپنے ننھے سے نیچے کے سہارے آہستہ آہستہ چل رہا تھا، معصوم بچہ اپنی ننھی ننھی انگلیوں سے اپنے اندر سے باپ کی لاشی پکڑے بازار کے انتہائی بجوم میں دھیرے دھیرے چلا جا رہا تھا، وہ پانچ سال کا بچہ تھا جس کے بدن پر صرف ایک بھٹی ہوئی لنگوٹی کے سوا اور کوئی ایک چھتیرا نہ تھا، بھوک کے ننھے میں جھلا ہوا معصوم بچہ ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ تھا، وہ مراد پور کے چلتے ہوئے بازار میں اپنے بھوکے باپ کو بھیک دلانے آیا تھا۔ بھیک۔۔۔۔۔ صرف چند معمولی سکوں اور کچھ سوئی ہوئی روٹیوں کی، وہ ہر ایک جھلکتی ہوئی دوکانوں سے ڈاٹ کر نکال دیا جا چکا تھا، نہتا بچہ بڑی حسرت سے الماری میں رکھے ہوئے خوبصورت کھونوں کو تک رہا تھا۔ مگر حوالی کی دوکان میں کبھی اچھی اچھی پکی مٹھائیاں کھا



یہاں آج ہی کھانے چلے گئے۔ بچے نے اپنے باپ کی آواز سن کر نکلیں  
 کھولیں۔ حسرت بھری نیم باز آنکھوں سے دیکھتا ہوا بولا۔ بابا.....  
 دودھ..... بابا..... دودھ..... بابا.....  
 بابے نے اپنے کپے ہٹے ہاتھوں اور پیروں کو سمیٹنے سے کھینچے ہوئے  
 ایک خاموش بچہ کی ادھر بیٹھنے کے لئے جپ ہو گیا۔

دھڑکتے ہوئے دل سے پوچھا کیا ہوا بھائی کون کیا؟ ایک بچہ فالودہ  
 کی دوکان سے ابھی آرہا تھا کہ ایک نوٹریسیکل کی زد میں آ گیا۔ ایک  
 لمبے چنچے ہوئے کپا ارے اندھے تیرا ہی تو بیٹا ہے۔ یہ آواز نہیں تھی  
 ایک برصا جو اندھے فقیر کو غفلت ہو اگر۔ بچارہ فقیر میتابی سے اپنے  
 بچے کو کیچے سے لگائے ہوئے چنچے لگا۔ بھوکے تھے منیر اللہ میاں کے

## ہوا کے جھونکے کی تمنا

الہی! نرم رخساروں کو چُوموں یہ نہیں خواہش  
 نہیں خواہش کہ زلفوں کی گھٹاؤں سے لپٹ جاؤں  
 چمن میں لگنا نے کی تمنا ہی نہیں مجھ کو  
 نہیں خواہش سے الفت سے پھولوں کے شجر سنجوں  
 میں گھبراتا ہوں چشم مست سے آنکھیں ملانے میں  
 تمنا ہی نہیں آنچل حسیں چہروں سے سر کاؤں  
 مجھے بھاتی نہیں اک آنکھ جلوؤں کی حسیں ادبی  
 مری نظروں میں عارض کی دمک بھی بیچ ہے یارب  
 تنہا ہے مجاہد کھیلے ہوں جب شراروں سے  
 بہکتی آنکھڑیوں سے پی کے جھوموں یہ نہیں خواہش  
 لب گل رنگ کی مسیعی صلاوت کا مزا پاؤں  
 کلی کو گدگد آنے کی تمنا ہی نہیں مجھ کو  
 جوانی کے شرابی تہمتوں کو گود میں بھینچوں  
 میں شرماتا ہوں دوشیزاؤں سے شانہ لڑانے میں  
 نشیے زمزموں کو شوق سے پلکوں پہ بھلاؤں  
 جواں مدہوش کُن رنگیں، ترنم آفرین وادی  
 مری نظروں میں اعضا کی لچک بھی بیچ ہے یارب  
 وطن کا نام چمکاتے ہوں شمشیروں کی دھاروں کے

میں بن کر سانس اُن کے ابھی سینوں کو گراؤں

حیات جاودانی کا چہاں میں مرتبہ پاؤں

# تظیر اور انسان

مختصر اکبر آبادی

(پعضون اگست ۱۹۷۷ء میں دلی سے ریڈیو میں پڑھا جا چکا ہے)

اور خالق حقیقت ہے اور یہ تینوں کیفیتیں انسانی ذہن کی پیداوار ہیں۔ اس لئے جس شاعر میں اس نوع کی بعیرت موجود ہو وہ حقیقی شاعر ہے اور اس کا موضوع بھی تمام وقتہ کیسجوں کی طرح انسان ہوگا، بہرہ کا لیداس، فردوسی، شیکسپیر، میرزاں، سب کا موضوع کسی نہ کسی حیثیت سے انسان اور اس کے کارنامے ہیں۔ ان ناموں نے مجھے ایک اور اپنی شاعر کا نام یاد دلایا۔ جو مدت مدید تک گم نام رہنے کے بعد آج پھر نگاہ انتخاب کا کام کرنا ہوا ہے۔ میان نظیر اکبر آبادی ایک رمز شناس، حقیقت نگار شاعر ہیں اور ان کا موضوع بھی انسان ہے۔

اصل یہ ہے تمام حقیقی شعرا کا موضوع انسان ہوتا ہے۔ اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اردو زبان کے دوسرے شعرا کیا حقیقی شاعر ہیں، اور اگر ہیں تو کیا ان کا موضوع بھی انسان ہے۔ اس کا جواب اگر ہاں سے دیا جائے تو دوسرا سوال یہ پیدا ہوگا کہ نظیر کو کیا فوق ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ شعر کے باب میں فوق کا سوال کرنا غلطی ہے حقیقی شعرا میں ایک کو دوسرے پر فوق نہیں ہوتا۔ ہر فرد اپنے پیغام کا حامل اور اپنی حیثیت میں حق اور حال کے جاننے والا ہے۔ ہاں فوق کی بجائے امتیاز یا خصوصیت کا سوال پیدا ہوتا ہے۔

نظیر کا امتیاز دوسرا ان فنون میں ہے کہ دوسرے شعرا نے انسان پر جو وہی نگر ڈالی ہے یا زندگی کا ایک پسو، خواہ وہ انتہائی بہم باشان ہو۔

سب سے پہلی کیفیت جو انسان پر طاری ہوتی ہے وہ غالباً حیرت ہے اس لئے حکما نے حیرت کو علم کی ابتداء یا جینا د قرار دیا ہے۔ حیرت ایک نہی اور اضافی کیفیت ہے، یعنی یہ کیفیت انسان پر خود اپنے اور اپنے ماحول کے متعلق طاری ہوتی ہے، اس سے ظاہر ہے کہ علم کا موضوع خود انسان ہے، مجھے اس وقت علم کے امکانات سے بحث منظور نہیں، صرف یہ بتانا ہے کہ علم جس چیز کا نام ہے وہ انسان سے شروع ہو کر، ہیئت سے درسیاتی مدارج طے کرنے کے بعد، جن سے انسان کو اپنے تعینات کا ادراک ہوتا ہے، خود انسان ہی پر ختم ہو جاتی ہے۔ اس جگہ اندازہ دہر کے وقوف کے بعد دنیا کے تمام مذاہب اور فلسفوں نے انسان کو اثرات مخلوق اور کائنات کی خلقت کی غایت قرار دیا ہے۔ حامل یہ ہے کہ خالق، قدرت، تمدن اور حکمت کا سچا نظر انسان ہے۔

انسانی وجود کی اہمیت تسلیم کر لینے کے بعد، صاحبان بعیرت کے لئے، انسان کا مطالعہ ضروری ہو جاتا ہے۔ یہ کہنا بھی بے جا نہیں کہ حقیقی موضوع جس منکر کی نظر کام کر رہا ہے۔ خود اس صاحب فکر کو صاحب نظر مان لینا فرض ہو جاتا ہے۔ حیرت کی طرح بعیرت بھی ایک ذہنی کیفیت کا نام ہے، لیکن جب یہ فطری پیکر اختیار کرے تو شعر بن جاتی ہے، واضح طور پر پولی مجھے کہ تخیل، عظمت اور شاہدے کے سوسنے سے جو ذہنی جہاں خلق ہو، اس کے فطری وجود کا نام شعر ہے۔ انسان کا کائنات کی سب سے نمایاں، اہم

پیش کیا ہے۔ تیسرے جذبات کا تجربہ کیا اور جذبات میں بھی وہ پس منظر کیا جو علم کہا جاتا ہے، انہیں نے رزم کے چہرہ دکھائے، ذوق نے توصیف کے دریا بہائے۔ موت نے حساسیت کا مطالعہ کیا۔ غائب نے مسائل حیات پر فلسفیانہ نظر ڈالی، واضح نے حسن و عشق اور معاملہ بندی میں کمال دکھایا اور اکبر نے ظرافت کے پیرائے میں ملک کے خزانے دکھائے۔ لیکن ان کمالات کے باوجود جو ان بزرگواروں کا حصہ تھے، انسان کے ساتھ ان کا علاقت جزدی رہا۔

اب نظیر اکبر کو باقی کہیے: انھوں نے مکمل انسان پر نظر ڈالی، ان کے کلام میں انسان کے خیالات، اس کے جذبات، اس کے افعال، غرض نفس انسان کا مکمل مرقع آپ کے سامنے آتا ہے، نظیر کی تصویریں انسانی زندگی کی سچی تصویریں ہیں۔ ان کی محبت میں آپ معاشرت کے برہمن میں حصہ لیتے نظر آتے ہیں۔ ہر پہلو سے باخبر اور ہر حالت سے آگاہ معلوم ہوتے ہیں۔ بچہ، جوان، بوڑھا، ہنست کھلتا، روتا، گاتا، بابا زور، گھنگار، عافت، غافل، غرض ہر قسم اور ہر شکل کے انسان سے آپ کی ملاقات ہوتی ہے، اس امتیاز کے علاوہ ایک پہلو امتیاز کا یہ ہے کہ دوسرے شاعروں نے ہزنی زندگی کو اپنے نقطہ نظر سے دیکھا ہے، ان کے نتائج ان کی فکر کا ثمر ہیں، مگر یہاں نظیر نے مکمل انسان کو اس طرح دیکھا جس طرح وہ ان کے سامنے موجود تھا۔ ان کے مرقع ان کے مشاہدے کے شاہکار ہیں۔

نظیر نے شوق جب یہ کہا ہے کہ مکمل انسان پر نظر ڈالی ہے تو اس کے یہی نہیں کہ مکمل نظر ڈالی ہے، مکمل، معاملے کا دوسرا پہلو ہے، مکمل انسان پر نظر ڈالنا مکمل نظر سے جداگانہ بات ہے، پہلی کہ سختی یہ ہیں کہ انسانی زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں باقی رہتا جس پر نظیر کی نظر پڑی ہو، اس سے مشابہہ کی وقعت کا اندازہ ہوتا ہے۔ دوسری کا مطلب یہ ہے کہ جس جرد کو دیکھا، اس کی مصوری کا حق ادا کیا۔ اس سے تحلیل اور تجزیہ کی قوت ثابت ہوتی ہے۔ نظیر کے باب میں یہ دو لائن پہلو غلط نہ کرنے چاہئیں۔ زندگی کے بیشتر پہلو ایسے ہیں جن کا مکمل تجربہ کر کے نظیر نے مصوری کا حق ادا کیا۔ لیکن ہمیں ایسے بھی ہیں جو نشہ نہ گئے۔ نظیر کا اصل اہل کار مشاہدہ ہے اور اس باب میں آپ انھیں کہیں قاصر نہ پائیں گے۔

میاں نظیر ایک مجدد تھے جو اپنے ہر ہے ایک صدی بیشتر پیدا ہوئے

یا بوں کہے کہ جس درخت کو اس جہد میں بارود ہونا مقنا اس کا بیج فطرت کی دُور بین فراست نے اتنی دت پیٹے ہو دیا تھا، نظیر کی اس عظمت یہ ہے کہ انھوں نے مکمل انسان سے بحث کی اور اس طرح فطرت شناسی۔ فطرت نگاری اور فطرت سے مطابقت کا ثبوت دیا۔ فطرت نے انسان کو مکمل پیدا کیا ہے، تکمیل سے صرف ہر حالت یا ہر قسم مقصود نہیں، بلکہ ہر جہد ہر ملک ہر مہذب اور ہر روح کا انسان مراد ہے، میاں نظیر کی تصویریں ان کے جہد کی تصویریں بھی ہیں اور اس معیار پر بھی پوری اترتی ہیں۔ غالباً یہی وہ خصوصیت ہے جس نے شمسیر کو شہرت عام اور لائقے دوام کی عزت بخشی۔

عام شاعرانہ حیثیت، غزل گوئی، نظم گوئی، آرٹ۔ مصوری، ادبیت، فنِ شریک واقفیت، ایسے پہلو ہیں جو میاں نظیر میں دوسرے شاعروں کے ساتھ مشترک ہیں، ان حیثیتوں سے نظیر اور دوسرے شعر پر یکساں نقد کیا جاسکتا ہے، لیکن نظیر کے خصوصیات یہ ہیں کہ انہیں پہلو بندی شاعر، خاص ماحول کا مالک اور موضوع کا خلاق کہا جاتا ہے۔ کوئل کھڑکی آئینہ مستر ادب ہے، کچھ خصوصیتیں ان سے بھی بالاتر ہیں، وہ اخلاق اور خط و دھاری کا درس، بے قصعی اور دروادی، قومی نظریہ، رزم و درواج سے واقفیت، عادات و فضائل کا درک، تاریخی ماحول اور انسانی نکتہ دانی ہیں، ان موصوفات میں ہر ایک فی نفسہ ایک مقام ہے کا محتاج ہے اور ان سب سے مل کر نظیر کے انسانی شغف کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس شغف کی یہ اہمیت ہے کہ اس کو نظیر کی شاعری کی اساس یا روح و رواں کہنا ہے جائز ہوگا۔ اب تاریخی ماحول اور انسانی نکتہ دانی پر نظر ڈالئے تاکہ اس شغف کی وضاحت ہو جائے۔

نظیر کی بصیرت اور ذہنی ہمہ گیری جس طرح وسعت نظر، فطرت کے خاتر مطالعے اور کمالات کی بغیر مشناسی پر مبنی ہے۔ اسی طرح نبی آدم سے ان کی انتہائی دلچسپی غائبانہ کی تاریخی ماحول کا نتیجہ ہے۔ ہر سے اتفاق کے مطابق تو یہ جذبہ بھی انھیں فطرت نے ودیعت کیا تھا، لیکن عارف کو اسباب و علل کی روشنی میں دیکھنے والوں کے لئے خارجی سبب کا وجود لازمی ہے اور وہ صرف تاریخی ماحول ہو سکتا ہے۔

مارٹن لیو تھرنے ۱۶۰۰ء میں یورپ کی روایت پرستی کے خلاف جریہ خیال کا آواز بلند کیا۔ یورپ کا نشہ انسانیہ سے ان کو کارسانان کی عظمت کا جھنڈا اگڑا، اسی تحریک کا نتیجہ تھا جس طرح اس تحریک کی

اہمیت سمجھنے کے لئے یورپ کے اخلاقی، مذہبی اور سیاسی اختلاف کا مطالعہ ضروری ہے۔ اسی طرح میان نظیر کے پیغام کی اصل و غایت سمجھنے کے لئے ان کے عصر کے ہندوستان کو واقعات و حوادث کی روشنی میں دیکھنا لازمی ہے۔ نظیر عمر شمس کے عہد میں پیدا اور شمس اہم میں فوت ہوئے۔ ان کا زمانہ انتشار یورپی صدی عیسوی کے دوسرے نصف اور انیسویں کے اول ٹربل کو محیط ہے۔ یہ عہد اخلاقی، تمدنی، مذہبی، سیاسی غرض ہر اعتبار سے ہندوستان کے تنزل کا زمانہ تھا۔ امن و سکون کی حکومت، بد امنی اور طوائف الملوک نے غصہ کر لی تھی، اورنگ زیب کی وفات (۱۰۷۰ء) کے بعد سے برطانوی حکومت کے قیام تک (۱۸۵۸ء) جو مدت گزری اُس میں زندگی کا سمیاری نہایت لپٹ اور شرمناک رہا۔ اس دوران کے تاحیدارادہ شاہزادے، امراء اور اراکین عام طور پر سیرت کے بدترین نمونے پیش کرتے ہیں۔ مشاہیر کی زندگی، شرارت، فحاشی، فتنہ انگیزی، قتل و غارت مکروہ شہوت پرستی، شدید ظلم، بے نہایت ہوسناکی اور حرص و آرزو کا ایک طویل اور انتہائی نظر آتی ہے۔

مغل فرماؤں کی کم بختی، غفلت اور عیش پرستی کے باعث سلطنت کا زوال شروع ہو گیا تھا۔ مہاراجوں نے خود مہاراجہ کی بجائیے۔ اکبر اور اورنگ زیب کی میراث افکار کے ہاتھوں سے بجزے ہو رہی تھی۔ مرہٹوں، راجپوتوں اور پٹھانوں نے مات کی خنجر اور دن کی بھوک حرام کر دی تھی سکھوں کی خورش روز افزوں ترقی پر بھی، دلی کا نادر شاہی قتل، احمد شاہ ابدالی کا حملہ اور پانی پت کی تیسری لڑائی، غلام قادر کے مظالم، سب بلائیں اسی عہد میں نازل ہوئیں۔ اندرون ملک کا تو یہ عالم تھا اور اساعلوں پر پڑی سوداگر فاتحانہ نظر ڈال کر اختیار کرتے چلے جاتے تھے۔ امن و سکون، راحت و آسائش نے زندگی کو خیر باد کہہ دیا تھا۔ انسان کی جان مال، آبرو ہر وقت سخت خطر میں تھی۔ آزادی کا کوئی وقار اور زندگی کی کوئی عظمت باقی نہ رہی تھی، یورپ اس وقت کم و بیش بیدار ہو چکا تھا، روس اور وائٹ ریلیف غفلت سوز مغلیوں نے مذہب اور استبداد کے غلام انسان اور ان کی بنیادیں ہلا دی تھیں۔ آخر کار فرانس کے انقلاب نے جگہ جگہ، مسادات اور حریت کا اعلان کیا۔ دنیا میں آزادی کی لہر دوڑ گئی۔ فرانس کا انقلاب جس اصول کو لیکر اٹھا تھا وہ معاشرتی مساوات اور انسان کی عظمت کا اصول تھا۔

ہندوستان اور یورپ کے حوادث اور انقلابات ایسے نہ تھے کہ کوئی اہل دل یا صاحب بصیرت ان سے متاثر نہ ہو۔ نظیر ایک گوشہ نشین بزرگ تھے۔ ان کے زمانے میں مرادیت کے ذرائع نہایت محدود تھے، انھیں یورپ کی آزادی کی جنگ کا پورا علم ہونا محال نہیں تو شواہد و ثبوت، مگر وہ یورپ کی لڑائے براہ الہام اور ہند کے حوادث سے براہ راست سخت متاثر ہوئے۔ وطن کے اٹکانے جو درد ان کے دل میں پیدا کر دیا تھا اس کی جھلک کلام میں صاف نظر آتی ہے۔ ملک کی غفلت اور پستی کے حوالے جابجا جو دیں۔ دنیا اور پیش دنیا کی ناپائنداری اور بے ثباتی دکھا کر مگر عکس عورت آموزی کی ہے۔ آلام و مصائب دور کرنے کے لئے غالباً پہلا سبق یہ ہے کہ معاشرتی فرق اور عمرانی عدم مساوات کو ذہنی پستی کا مترادف بنا کر لگایا جائے، اور مساوات کا احساس کرایا جائے۔ اور اس طرح انسانی حیات کی صحیح عظمت اور وجود کی منزلت پر زور دیا جائے، نظیر نے فرض پر درجہ ادنی انجام دیا ہے۔

الٹی نامہ۔ آرمی نامہ۔ بجاہ نامہ۔ بہن نامہ۔ فنا نامہ۔ عاشق نامہ۔ اسی قسم کی نظمیں ہیں۔

دوسرا نمونہ جس سے نظیر کا انسانی شغف نمایاں ہے، اس کی لسانی ہمارت ہے۔ اردو کے کئی شاعر کے یہاں لغات کا ایسا وسیع استعمال نہیں ملتا۔ اردو میں کثرت سے ایسے الفاظ ہیں جو نظیر نے ہندی سے جن جن کو اردو میں لکھا ہے، لسانیات کا ماہر غالباً اس حقیقت سے انکار نہ کرے گا کہ بازاری دیہاتی زبان میں کسی مہنوم کما داکر نے میں قاصر نہیں ہوتی۔ یہی نہیں بلکہ بعض مفہیم کے لئے ان کے الفاظ اتنے موزوں، جملین اور جانت ہوتے ہیں کہ ان کے مترادف ثقافت کی سرس نہیں آتے۔ نظیر نے اس راز کو سمجھ کر ان تینوں ذرائع سے الفاظ حاصل کئے اور اس خوبی سے اردو میں سموئے کہ نہ صرف ان کی اصیت ڈال دی ہوئی بلکہ ان میں خود بخود وسیعیدگی، ثقافت اور ادبیت بھی پیدا ہو گئی۔ عوام اور خواص کی زبان کا اختلاف دور کرنے کی کوشش اہل میں ادنی اور اعلیٰ کا بنیادی فرق مٹانے کی کوشش ہے جو ان کی عظمت کے احساس اور تہنیک کی جگہ دہا ہے۔

قریب کے احسان سے بڑا احسان یہ ہے کہ نظیر نے زبان کو سلیس اور عام فرمایا۔ زبان کی سلاست اور بیان کی سادگی ان کی دلی شگفتگی کا تقاضا

محب وطن کی کوششیں مشترک زبان تک محدود نہیں رہتی۔ وہ اپنے ملک میں ہمارے دم و دوا ب، میلے، سیر و اور دہوتا بھی مشترک دیکھنا چاہتا ہے، ہوتی۔ دوا بی۔ راکی۔ دوا جی کا میلہ۔ کرشن جنم بائرسی، بخت، تیرا، کا میلہ نام کی نغلیں اسی جذبے کے تحت میں لکھی گئی ہیں۔ ان میں ہر لفظ ایک نغلیں تبصرہ کی محتاج ہے۔ جس ملک میں مختلف مذہب رائج ہوں اور پھر اس کی قوموں کو ایک قوم بنانے کی کوشش کی جائے تو ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ قومیں ایک دوسرے کی مذہبی روایات اور اعتقادات کو سمجھیں اور ان کی عادت کرنا سیکھیں۔ پیچھے حضرت علیؑ اور حضرت سلیمؑ چشتی نام کی نغلیں جس خلوص اور عقیدت سے لکھی گئی ہیں اتنی ہی محبت اور ارادت کرشن جنم کے جنم اور بابا نانک شاہ گرد، نام کی نغلیوں میں نظر آتی ہے۔

اشرف المخلوق ہونے کی حیثیت سے جہاں دنیا کی ساری نعمتیں انسان کا حق سمجھی جاتی ہیں، وہاں مصائب اور عذاب کا سارا بار بھی انسان ہی کی گردن کے لئے مخصوص ہے۔ یہی نہیں بلکہ انسان خود بھی اپنا دشمن ہے، وہ اپنے کو خود ساختہ قید و بند میں گرفتار کر کے اپنی زندگی کو ادم و بہوت سے سحر کرتا رہتا ہے، نظیر کو یہ راز معلوم تھا۔ ان کی محبت کا تقاضا تھا کہ اس بار کو ہلکا اور ان بیرون کو کٹھن کی تدبیریں بتائیں۔ تعصب، غو، غرضی، غلامی، لہذا بی، بے دینی، جاہ پرستی جب دنیا، ظلم و تعدی، کبر و نخوت کے ذریعے نازل ہونے والی بلا ہیں، آپ اپنی لائی ہوئی نعمتیں ہیں۔ نظیر نے انسان کو ان آفات سے محفوظ رہنے کی بار بار تدبیریں بتائی ہیں۔ دنیا کے ملاحین بھلانے کے لئے کہیں خوش باغی اور آواز داذل و زندگی سکھایا ہے، سخاوت و عشرت اسی قسم کی ایک ہدایت و محبوب نظم ہے۔

نظیر کے انسانی شغف کا مزید تجزیہ کرنے سے انسان کی محبت کی ایسی پُر خدش مثالیں سامنے آتی ہیں، جن کی بنا پر اس محب ظلم کو مجد تسلیم کر لینا پڑتا ہے۔ وہ اتنے کنیز لہذا جواب سے کہ شہر میں ظلم عام ہو لوگوں سے اُن کے تعلقات تھے، ان کی دوستی کے لئے حیثیت کی کوئی قید نہ تھی۔ ہر درجے اور معاشرت کا انسان ان کی محبت میں بار بار پاسکتا تھا۔

پیشہ دروں اور اہل حرت سے انھیں خصوصیت تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی معاشرت اور ان کے فنون کی اصطلاحوں پر نظیر کو اس قدر عبور تھا، صدی کی طرح نظیر کا وسیع تجربہ ان کے اخلاق کی وسعت کا ریزہ بنتا ہے۔

سنتی، اپنا اصلاحی پیغام عوام تک پہنچانے کے لئے عوام کی زبان کا استعمال از بس ضروری تھا۔ نظیر کے اس طریقے سے شاعری کو پشیمانی کے جزو تسلیم کرنا پڑتا ہے، اصلاح اور پیچھے کے علاوہ شعر کا اثر مسرت، روشنی خیالی اور بلند حوصلگی بھی پیدا کرتا ہے۔ نظیر کی کوششیں سنتی کے شعر و سخن کی دولت میں جو خدو و خال کی ذہنی کاوش کا ثمرہ اور اس کی غیر فانی سیرت ہے۔ ہر فرد بشر برابر کا حصہ دار نظر آئے۔ علم کی دولت، درو جو اہر کے انبار کی طرح سرت خواص کا ہمارا نہ بن جائے۔

نظیر کے مخالف اُن کی سادگی اور عام فہمی کو علم کی کمی کا سبب قرار دیتے ہیں۔ یہ خیال غلط ہے۔ اُن کا تجربہ خاصی اور لطیف مقامات راز و کلام سے ثابت ہے۔ مگر وہ نائش کے مخالف تھے، اخلاق اور فاضل سادگی اور فوجی کے مقابلے میں نہ صرف بہت آسان ہیں بلکہ ان کو علم و فضل کی نائش کا دھریہ یا مین نکرا ورت خیال اور نظیر کی دلیل سمجھتا ہے۔ نظیر نے اپنا اسلوب دانستہ اختیار کیا تھا جو ان کے سخن کا ایک پُر اثر طریقہ کار تھا، نظیر کی زبان ہندوستانی ہے اور وہ ہندوستانی جسے عہد حاضر میں ہاتھ گا ندھی نے زبان کا اُنڈیل سمجھا ہے۔ یہ شعر کا معجزہ ہے کہ جس زبان کی ضرورت ملک کو آج محسوس ہوئی، اس کی بنیاد نظیر نے ڈیڑھ سو برس پہلے رکھ دی تھی، ان کا طریقہ سیاسی بصیرت کی بڑی دلیل ہے، اور سیاسی بصیرت کا یہ مفاد ہے کہ وہ انسان کے لئے کرب و شغف کا ایک معقول ذریعہ ہے۔

ملک اور قوم کی محبت نفس کی شرافت کا لازمہ ہے، اس نزع کی محبت ہندوستانی کے دل میں، یہاں کی مختلف قوموں کو ایک ہندوستانی قوم بنانے کی آرزو پیدا کرے گی۔ نظیر کا قلب اس آرزو سے لبریز تھا، ایک قوم کے لئے واحد زبان ضروری ہے، اس احساس نے نظیر سے مشترک زبان کی مینا و ڈولائی، غیر بالواس فاری محاورے، ترکیبوں اور لفظوں کو نکال کر ہندی محاوروں، ترکیبوں اور لفظوں کو رائج کرنا نظیر کے عہد و وطن ہونے کی بڑی دلیل ہے، انوس ہے کہ یہ اہم خدمت ایک زمانے میں عیب خیالی کی گئی۔ مگر آج کا زمانہ سمجھی جاتی ہے، نفسیات کا مطالعہ کرنے والے اس پر تعجب نہیں کرتے، مرض کی شدت میں دوا کی معنی طیب کا لفظ عظیم محسوس ہوتی ہے، مگر پھر وہی پنجی تریاق بن جاتی ہے۔

سے ایک قسم کی بغاوت ہے، نظیر جیسے پروردہ قدرت کے لئے اس نوع کی بغاوت حرام تھی۔ اس لئے بازاری زندگی کی جو تصویریں نظیر نے کھینچی ہیں وہ تمام کو کمال صحیح، دلچسپ اور مکمل ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ نظیر نے خود بازاری زندگی بسر کی، اسی لئے انہیں اس زندگی کے حالات اتنے صحیح معلوم ہیں اور بعد کو وہ خود اپنی حالت پر بیان ہوئے، مجھے اس خیال سے اتفاق ہے نہ پشیمانی کی کوئی مثال کلام میں میسر آتی ہے، حقیقت اس کے حالات اور سادہ لفظوں میں یہ ہے کہ نظیر نے ہر قسم کی سوسائٹی زندگی کا غائر مطالعہ کیا اور یہ جیسے ممکن تھا، جب ان حالات میں زندگی بسر کی جائے، لیکن شہر کی بے نشینی، تھار باڈی دوستی اور عیاشی کی ہم علمی سے یہ لازم نہیں آتا کہ ساتھی بھی مزدور شرابی، جواہری یا عیاش ہو جائے، انسانی فطرت کے تحقق کے لئے ناگزیر ہے کہ وہ تمام فطرتوں کا قریب سے مطالعہ کرے نظیر نے یہی کیا اور اپنی روح کو تمام آلودگیوں سے منزہ رکھا۔

مسیحوں کا اعتقاد ہے کہ مسیح خود خدا تھے، باری تعالیٰ نے اپنے کو پہنچانے کے لئے مسیح کا انسانی قالب اختیار کیا۔ اصول یہ ہے کہ ایک عیسیٰ کے لئے جنس کا عرفان محال ہے، خدا جب تک انسان بن کر، انسانوں میں نہ آئے، انسان کے لئے اس کا سمجھنا ناممکن ہے، مذہبی اعتقاد سے قطع نظر کہ بعض نفسیاتی نقطہ نظر سے اس مسئلے پر نگاہ ڈالے تو بڑی حقیقت ہے نقاب ہوتی ہے، مہر نشین مولانا کا وہ نقاب پر اتنا اثر نہیں چھوڑتا جتنا ہمنشین کی برہنہائیں۔ نظیر نے سوسائٹی معاشرت میں گھل مل کر اس لئے حصہ لیا کہ عوام کی برہنہائیں کا موقع ملا آئے، انہوں نے وہ اعطاء کے علاوہ اعلیٰ پر کھڑے ہو کر دنیا کو کبھی نصیحت نہیں کی، بلکہ جس طبقے کی ہمائش مقصود ہے۔ اس کے بدترین افراد کے گھلوں میں باہیں ڈال کر سمجھا یا اور اپنے کو خود انہیں کی جماعت کا ایک انسان قرار دے کر نصیحت کی ہے اس کا اثر لازمی طور پر یہ ہوتا ہے کہ سننے والے کو ناگوار نہیں ہوتا، اور سننے والے کو گوش شنوائی سے شہوتا ہے۔ دوالی کی نظم میں قاری بازاری کی خیابیاں بیان کرتے کرتے فرماتے ہیں۔

نظیر آپ بھی ہے جو اربا و والی کا

نظیر کی انسانی محبت کا یہ عالم ہے کہ انہیں انسان کے چڑے سے چڑے فعل سے سب نفرت نہیں ہے۔ ان کی مخالفت یا اشتعال، درجہ کی صورت میں مجبور مانا ہوتا ہے۔ یعنی پیشہ اختیار کرنا ہمدردی کی کھلی ہوئی دلیل ہے۔ مسکائی نے معلوم کہ ذہن اور اخلاق دونوں کی تربیت کا موقع اور اختیار دیا ہے۔ علم کا فرض ہے کہ وہ اپنے شاگردوں کے بہت طبقے کی طرف زیادہ توجہ کرے، توجہ جیسی ممکن ہے جب علم کی فطرت میں انہما درجے کا مکمل اور رواداری ہو جس کی وجہ سے وہ اپنے شاگردوں کی پستیوں سے بیزار ہو کر ان سے نفرت نہ کرنے لگے۔ نہ صرف یہ بلکہ نفرت کو اپنے ذاتی ایشیاء اور نفس کشی کے ذریعے ہمدردی میں بدل دے۔ نظیر کے یہاں انسان کے انفعالی شہیہ سے کہیں بیزار کاری کا اظہار نظر نہیں آتا۔ عجاہار حم اور ہمدردی کے جذبے پائے جاتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ ان کی فطرت میں ایشیاء کی کتنی غلیظ قوت موجود تھی۔

فواش کی موجودگی کی بنا پر نظیر کے کلام کو ریکاک اور سوسائٹی کہا جاتا ہے۔ یہ فیصلہ اول تو اس لئے قطعی غلط ہے کہ ایک عیب کی بنا پر ہزاروں بے مثل خوبیاں نظر انداز نہیں کی جاسکتیں۔ دوسرے فواش کے باب میں نیت کا مسئلہ نزاعی ہے۔ دنیا اور لوازم دنیا کو نظیر کی طرح پیچ اور لالچی سمجھنے والا نفس، امیث و عشق کی بہت وہانی لذتوں میں مبتلا نظر نہیں آسکتا، ہمیں بگڑا ہوا ممکن نہیں۔ اس قسم کا گمان صرف نفسیاتی غلطی ہے، اس لئے یہ مان لینا چڑے گا کہ فواش کا واسطہ بد نیکی کی بنا پر اپنے نفس کی پرورش یا حصول لذت کے لئے نہ تھا، جب یہ وجہ باقی نہیں رہتی تو دوسری وجہ تلاش کرنی پڑیگی، اور وہ نظیر کے عام رویے اور طریقہ کار کے مطابق ہونی چاہیے، یہاں پھر نظیر کی کالانہ نصیحت ہماری جستجو کی مدد کرتی ہے۔ باغی کی سیر کرنے والا کانٹے سے خلق نظر نہیں کر سکتا۔ شہر کے آباد و مسموم حصوں، فرحت بخش و دلکش شہروں سے گزرنے والا، گندے نالوں کے وجود سے انکار نہیں کر سکتا، اور اگر کرے تو وہ بھرے نہ کہ بکسے گا کہ چڑے باغ کی سیر کر لی یا نام شہر دیکھ لیا، اگر وہ میں تاج گج کا روٹھ اور ڈھولی کہاں کا نالہ دونوں پائے جاتے ہیں۔ سوسائٹی کے مردوں میں نیکو کار اور بدکار دونوں قسم کے افراد موجود ہیں، جب نیک و بد جن و جن، خیر و شر کی دھلی کا یہ عالم ہو تو صرف ایک کو دیکھنا اور دوسرے سے بے خبر نہ ہونا نہ صرف اپنی بے بغیرتی کا ثبوت بلکہ فطرت

# سری کرشن داس صاحب کا مکتوب

از پرنس لائن گورکھا نڈہ

کرم بندہ ایڈیٹر صاحب زادہ عنایت

کینٹا و مچن کا پرنٹنگ سنی ٹھکانہ راول

خسب این بیشہ پبلو می ورو چاک پورالہ را

تعلیم کرس کی تعلیمات میں میرے فاضل دوست سید شمس علی صاحب  
بنی لے ایل، ایل، بنی پرنٹنگ سنی ٹھکانہ راول گورکھا نڈہ نے  
رسالہ طور کا پرنٹنگ سنی ٹھکانہ راول گورکھا نڈہ نے  
ہوں۔ میں اس کے مطالعہ سے بہت مدد سوار ہوا۔ مگر مجھے اس سلسلے میں ایک  
امر جو نہایت نمایاں و روشن تھا، قابل اعتراض بلکہ محبوب معلوم ہوا۔ اور  
وہ امر یہ ہے کہ دقیق و اداق بندہ شوں کے علاوہ جا بجا ہل و پھل الفاظ استعمال  
کئے گئے ہیں۔ جن کی نظیریں مستند اردو کی عبارات میں پائی جاتی ہیں۔ اور  
جو قواعد صرف و نحو کی دوسرے بھی غلط ہیں۔ مثیل کے طور پر ان میں سے میں چند  
ایک درج ذیل کرتا ہوں۔

- (۱) ادبیات (۲) تجلیات (۳) سنی رجحانات (۴) ذاتیات (۵) اقتصادیات
- (۶) عرفانیات (۷) شبہات (۸) جمالیات (۹) تاریخی مقامات،
- (۱۰) فلسفاتی حسن (۱۱) مقدس تعلیمات (۱۲) ابعاد الطبیعیاتی (۱۳) مافوقی نظارہ
- عربی اور فارسی مصادر کی تحفیں و تائید اور سہارے مصادر و نثر
- کی جس صورت و نحو یا علم ادب کے کسی قاعدہ سے بھی جائز نہیں ہیں۔ ان میں سے
- بعض میں تو غیر ضروری بھی ہیں، لیکن ان کے سبب مقامات و احوال و صورت و
- اور صحیح معنوں میں استعمال ہوتے ہیں مثلاً سنی۔ رجحان۔ عرفان۔ جمال وغیرہ

معلوم معنوں نگاروں کی جدت پسند بلانی نے کیوں غلط۔ غیر ضروری اور  
بے معنی الفاظ کے اختراع کی ضرورت محسوس کی۔ میں خود زبان داں یا لٹرا  
پر داں نہیں ہوں۔ لیکن لٹری معنی

ذیب و ذہنیت ہیں پیغمبر نام من ذیب النساء

مگر میرا خیال ہے کہ بعض الفاظ مثلاً شبہات۔ جمالیات وغیرہ کے  
موجود خود بھی ان شغلات کے فائدہ و مہم کی تلاش سے قاصر ہوں گے۔

تاریخی مقامات۔ فلسفاتی حسن اور مقدس تعلیمات کے صحیح مترادف یعنی

تاریخی مقامات۔ فلسفاتی حسن اور مقدس تعلیم اردو میں مرد و ج و سوجو ہیں۔ پھر

معلوم کہ ایسے صفت لگانے سے پیچھے اہم کی صحیح بنانے کی کیا ضرورت درپیش تھی۔

بعض مرکبات مثلاً ابعاد الطبیعیاتی۔ مافوقی نظارہ وغیرہ ایسے مرکبات

میں جو غیر مرد و ج و غیر فصیح۔ غلط محاورہ اور غلط قواعد میں نہ تو قواعد

صحت و نحو ایسے مرکبات کی اجازت دیتے ہیں۔ نہ ہی اشعار اردو کے

لے ان کی ضرورت ہے۔ اور نہ ہی ان کا مطلب آسانی سے اخذ ہو سکتا

ہے۔ بلکہ بڑے دے کی طبیعت پر ان کا دہی اثر پڑتا ہے جو بالائی میں محو

کی دلیوں کے ساتھ سنگ بڑوں کی آمیزش سے پیدا ہوتا ہے۔

تجلیات کے راقم خود متفاد و بندہ شوں کے مورد ثبات ہوتے ہیں مثلاً

صفحہ اول پر لکھتے ہیں۔

جو مشکلات اعلیٰ خدایا رسانی میں دیکھا پڑیں۔

اور صفحہ دوم پر لکھتے ہیں۔

ہر ایک چیز کو آہستہ آہستہ ترقی کرنی چاہیے۔

ایک اہلی رسالہ کے مدیران کا فرضِ ادین ہے کہ اپنے قارئین کو علم و ادب کے صحیح الفاظ اور سن سکھائیں۔ اور اردو زبان کو لغزشوں اور بہل بندشوں سے بھر رکھیں۔

خود پرستانہ مذہب بزمِ عشرتِ ساخن  
رکبت کو اید بزل در رزمِ نڈانِ باغن

میں اپنے خیالات کی تائید میں جناب مولوی سید ہمدی حسن متا  
احسن لکھنوی کے چند اشعار جو ملک کے چوٹی کے انشا پرداز اور شعرا  
میں سے ہیں، نقل کرتا ہوں۔

نغیبات و علیات و شغیبات و دغیبات و حویات و برغیبات و شغیبات  
مالیات و حسیات و دغیبات و صدقیات و صریحات و دغیبات و دغیبات  
سالم جمع سوئٹ ہزلیات و دہلیات  
فلاطون، فلاطون، فلاطون، فلاطون

ہر اہلی رسالہ کا ایک فرضِ اہم اردو کی مروجہ غلیظوں کی تصحیح بھی  
ہونا چاہیے، اور میں سفارش کرتا ہوں کہ ہر چرچے کے ساتھ ایک ہزرت  
مروجہ افلاطون کی اور ان کے صحیح مترادفات کی درج کی جائے، تاکہ زبان  
اردو کو جس کے متعلق گرامی صاحب فرماتے ہیں کہ

در نہ قرآن اُرتا بزبانِ اردو  
اسے گرامی کشا برزہ سرایانِ زبان  
نیستی واقعہ اسرار بہانِ اردو  
یہ شعر زبانِ حال سے نہ کہنا پڑے  
زبانِ جدتِ یارانِ حق بہ تنگ آمد  
کہیر معنی پڑ جوشِ پُر آشنگ آمد

ان الفاظِ مشکل اور ترقی اردو میں موٹ استعمال ہوتے ہیں۔ نہ معلوم اول  
الذکر کے لئے فعل، دیکھا بعینہ ذکر اور موخر الذکر کے بعد کرتی بعینہ موٹ  
کیوں استعمال کئے گئے ہیں، نہ سب تھا یا تو دونوں جگہ صیغہ ذکر استعمال  
کیا جانا یا صیغہ موٹ، اگرچہ مختلف شعرا نے دونوں بندشوں کو استعمال  
کیا ہے، مگر ایک ہی صفت کے ایک ہی معنوں میں دو مفاد و صیغوں کا  
استعمال معیوب اور قابلِ اعتراض ہے، ارشد گوگرانی فرماتے ہیں  
اگر آنکھیں دکھنا ناسخیں دکھاتے اپنی آنکھوں سے

صفحہ ۳۶ پر لفظ لاؤا ظاہر کرتا ہے کہ یہ لفظ ہر کسی اردو مصدر  
لاؤا کا صیغہ ماضی ہے، مگر اردو زبان میں آج تک ایسا کوئی مصدر  
دیکھنے یا سننے میں نہیں آیا، البتہ فارسی میں فاضل، فاضلین، مصدر ہیں  
معلوم لفظ لاؤا کہاں سے تلاش کیا گیا۔ یا کیوں اختراع کیا گیا ہے، ایسا  
بہ صوفیہ پر درج ہے،

”وہ ایک بھارتی تن و توش کا آدمی تھا“

اردو میں لفظ بھارتی استعمال ہوتا ہے، آج تک کسی نے الفاظ بھارت  
یا بھارتیہ استعمال نہیں کئے، عیاں کہ شعر ذیل سے ظاہر ہوتا ہے۔

دیکھو یہی جو اُنکا نہ ترے ٹوٹے ہاتھ  
اپنی اتنا تو نہ تھا پر وہ محفلِ بھارتی

صفحہ ۳۷ پر جو رباعی درج ہے، اُس کے مصرعِ دوم میں لفظ آرمیدہ  
استعمال کیا گیا ہے مگر شعرا اردو نے اب تک لفظ آرمیدہ ہی استعمال کیا ہے مثلاً

علمِ چاں نہ دورِ فلک کا مجھے خیال  
اور پاکے جوش میں تریل آرمیدہ ہوں  
ہے آرمیدگی میں لکھنؤں بجا بے  
فائب صبح وطن ہے خندہ دندانِ نا مجھے

میر اسبقہ تنقید یا کہ مہنی نہیں ہے، بلکہ میں چاہتا ہوں کہ رسالہ  
مطالعہ جیسا پڑھنا اور شنیدہ ہے۔ اُسے ویسا ہی عام فہم بھی ہونا چاہیے تاکہ  
نہ صرف وہ اصحاب جو عربی اور فارسی سے بخوبی واقف ہوں، بلکہ اردو  
دان اصحاب بھی اس کے مطالعہ سے فیضیاب پر لیں اور مجتہدوں کے ساتھ  
ایسی بندشوں اور ترکیبیں پیش نہ کی جائیں جس سے وہ گمراہ ہو کر خود غلط الفاظ  
کے موجود بنیں۔

ہر عالم میں پیدا ہوا، جاہل  
دشمن کا، بے بس  
انہیں کہتے تھے سپاہِ قتل کا  
خاکِ توغیرِ باطل کا

# تعارف

اداسہ کلیم

قمر کے اسٹیٹ سوشلزم کے منہک کو اپنی پالیسی بناتی رہی ہیں، آزاد خیال ملک  
و قوم کی جتنی تحریکیں بھی اس وقت سر میں نشوونما میں ہیں ان کی معاشی جہدیت  
کی اساس انھماک غیر فرشتہ نشستہ تقدیر پایا جاتا ہے؛ انڈین نیشنل کانگریس  
کی مدد جہد بھی اس نکتے میں کوئی استثنا نہیں رہی ہے، چنانچہ اس کی کئی  
قریب کی تاریخ کے دریا میں یہ دو دھارے — لبرلزم اور سوشلزم  
— نمایاں طور پر پہلو بہ پہلو نمودار ہوئے ہیں؛ کراچی کانگریس ۱۹۲۱ء اگر  
- اعلان حقوق باشندگان ہندوستان کے لئے یادگار ہے تو آل انڈیا  
کانگریس کچی کا کانگرس اجلاس منعقد ہوئی بجاہ - سترہ صفحات تاریخ  
ہند پر اس حیثیت سے ثبت ہو چکا ہے کہ اس کی ایک طویل مفصل قرارداد  
نے نشست کراچی والی ابتدائی مسئلہ جذباتی دربارہ استحسان قیام ہندو  
پردہ لاریت کی واضح و قاطع الفاظ میں تصدیق و توثیق کی اس نئی مجوزہ تعبیر  
آخر (dispensation) نے کانگریس پیام و نظام و ہدایہ  
کے سارے سرشتوں کو شدید طور پر دھکیل کیا؛ کانگریس روز بروز ماز میں  
دور و زمان کی اکھن بننے لگی، اس نے اپنا پہلا دیہاتی اجتماع فیض پور کے کچھ  
گوردہ میں برپا کر کے انصافی قدم اٹھایا، جس کے بعد ہی آئندہ انتخابات  
زیر نفاذ آئین ہند کی شرکت کے لئے اتحاد برائے نیشنلسٹس کی کیا۔ وہ کیا  
کسٹوں اور مزدوروں کے حقوق کی کانگرس شارت نامہ تھا؛ کانگریس کے  
- ایکشن کمیٹی - کا یہی نقیب بنا، اور سلطنت ہند کے - صوبوں کے اندر  
اہل کانگریس کا کونسن الملک الیوم بجا دیا!

کانگریس کا مینٹنہ و مسیرہ ہذا فراق مینی و بینک کے مرحلے پر!  
(Congress at the Cross-roads!)

جس پرینکا انڈیا معاہدہ اپنی ترقی اور شاید اپنے قیاسی وقت گہور کے  
میں لے کر پھیل گئی، ہمارا مشاغلہ وہ سب سے شائق ہے جو عام کانگریس  
اس کے سوشلسٹ بازو کے درمیان ملاوٹ ہو گیا ہے؛ اور اس سانچے  
کے سر میں جو دمیں آجائے ہیں اگر کوئی کسر ہو گئی ہے تو وہ اس قدر کسر  
نہیں جس قدر کہ اس کی پردہ داری کی ایک سیدہ پردہ در کشتش  
ہے؛ کانگریس کا سوشلسٹ گروپ شاید زبان حال سے یہ غیر مغفول  
پیام سننا چاہے کہ اسے -

مفتاب در پئے و جسے زحریاں بہ کیں -

شبلیہ: زندہ ہی چہان تو دوشوار افشاں!

اس اجمال کی تفصیل اور اس ایہام کی تصریح مندرجہ ذیل سطوہیں  
لاحظہ فرمائیے!

اس بحث کے جزو ہی میں منظر کی حیثیت سے اگر قارئین کرم رسالہ ہذا  
کے جزوی نمبر سترہ دوں اس کے پہلے دفعہ وقت کے لٹ برسی نیشنل  
کانگریس اور ہندوستانی سوشلسٹ جماعت کو چہن نظر رکھیں تو ہم  
مطلب میں خاص آسانی پہنچے گی؛

جہد حاضر میں جہاں جہاں ہندو دنیا کی حکومتیں قائم ہوئی ہیں وہ اک

چہ پر وہ دالبر شیر می زند ہمارا کئے تقیم حرم جسم منخا بد ماند؛  
صوبہ بہار میں کانگریس و کان سبھا کی ان بنے اس آفرش  
کو قریب قریب اک درجہ اہل کے تصادم کی نوبت تک پہنچا دیا؛ باجو  
راجندر پرشاد اور سرسہما تہ، علی الترتیب بگڑ سہا پر داری کانگریس  
اور دلدادہ سوشلزم کان ان دونوں کے علمبرداروں کی حیثیت سے اک  
دوسرے کے دہیدو آگئے؛ اول الذکر نے اک کانگریس پر کان سبھا  
کی مہر می حرام کر دی، اور آخر الذکر نے بادل نا خواستہ کانگریس سے سختی  
دیدیا؛ کیا بہار کانگریس کیسے کے اس اقدام کی اثر آخری تیار کے زندہ  
اور نقد داروں کی سستی گری کی مہم تھی؟ اگر راز درون پر وہ یہ متاثر  
صوبہ بھارتی کانگریس کا دشمن و دروت کا یہ نیا ترک و اختیار کہاں تک قابل  
رنگ کہا جاسکتا ہے؟

بقول دُشنے میانِ دوست شکستہ؛ سبیں کو از کز بیدیدی و با کہ جو سستی؟  
مشر سہما تہ نے انہی ایام میں اس نئی سیاسی شکست و رکت کو اپنے  
اک مہبوط و مدلل بیباک اعلان میں واشگاف بیان کیا تھا؛ اسے  
افشائے راز عشق میں گو دلتیں مہوئیں  
لیکن اُسے جتا تو دیا، مان تو گنہا؛

آخر کار آل انڈیا نیشنل کانگریس کے سالانہ اجلاس سری پورہ میں یہ  
سیاسی جھوٹ پیش ہوا، راجندر بابو کی ڈکٹیٹری کی عنایتی کی گئی، کانگریس  
و کان کے درمیان کی اس مزعوم فیض سے انکار کیا گیا؛ اور کانوں کی  
تنبیہ و سیاسی تہیہ کانگریس کے سخت خرائض قرار دئے گئے، نہ کانگریس تنبیہ  
یا کانگریس تنبیہ؛ کانگریس ششوں کی طرف سے اس موشے پر اک جو بھجی کی  
گئی؛ اتنا ہوتا کہ سر دانیل کو جلال آگیا؛ اور انھوں نے اپنے سارے  
مشنبرہ مکیہ کلام عدم نشد و روحانی قوت کو خیر باد کہ کر یہ بلند ہامگ  
چیلنج کیا کہ۔

”میں دو سال سے ششوں کی رختہ اندازوں اور فتنہ پر دازوں کو  
برداشت کرتا رہا ہوں، لیکن اب برداشت نہ کروں گا؛“

یہ اُس ہندوستانی فاسزم کی پہلی آواز ہے جس کی نسبت ہنڈت  
جو اہر لال ہونے وقتاً فوقتاً اپنی تحریکات و تقریرات میں ریل ملک کو متنبہ  
کیا ہے؛ اور جس کے ہندوستان ایسے سر پائے داروں اور ہاجنوں،

بلشبہ کانگریسی وزارتوں نے اپنے مشنبرہ مواعید کو فراموش نہ کیا، انھوں  
نے سب حکومت پر تنک ہوتے ہی اصلاح پرستی، حریت پروری، صحافت آزادی،  
تعمیر ہیات کی پرچم کشائی، اہل دیہات و کارخانہ جات کی دستگیری و پشت  
پناہی کا اک فاسخانہ دور شروع کیا، اور اک ہفتہ عشرہ کے اندر ہی اندر  
منظوم کی فضا کو امید آسودگی، راحت رسیدگی، اعتماد، اعتبار، بلکہ ہند  
کی برقی امواج سے لبریز کر دیا؛ اسے

لشند احمد ہر اک چیز کو خاطر سخواست

آخر آمد ز سبیں پر وہ نقد پر پدید

تاہم دورِ انعقب کی اس باصرہ لازمہ تہ میں قدرے خوش دشتید  
وے دولت شعل بلو کے سیاسی منظر تھے؛ کانگریس کا مہنہ دے وزارت  
کے یہ مجلس ہائے اصلاح و امداد و تعمیر اپنے تنگ ملکات کے آخری مددو  
سے جلد و چار ہو گئے؛ برلازی دفترت و تعمیرت کی محفوظ سب سکندی  
ان کے مزید تقدم میں عانی ہو گئی، لیکن یہ چیز تو ناگزیر اور سخت نظر اندازی  
تھی، جو چیز دیکھنے والوں کو لکھی وہ یہ تھی کہ کم از کم حزنی مزدوروں کی بعض  
ہنگامہ آرائیوں میں ان کے ساتھ تباہ سبیدہ غلبہ پر دازوں کا سا  
معاہدہ بڑا گیا؛ اسے

لوہ بھی کہتے ہیں کہ۔ یہ بے رنگ نام ہے؟

یہ جاننا اگر تو نہ تائے گھر کو میں؛

مشہور سوشلسٹ ایچی ٹیٹر سر پائی والاک، اک واشگاف تقریر کی بنا پر  
مداس کی تہہ بہت تاب“ حکومت اہدات شرییت راجہ گو پال چارڈیہ نے  
ان کو ایسروں کی رائے کے علی الرغم تقریباً انتظاماً اقتضیٰ جیل بنا دیا، اور  
کان پور کے بن مزدوروں کے فائدہ زدہ حدود اور رہنہ جموں کو تو فائزنگ  
سے بھی وازا گیا؛ — ان کے اُس وٹ کی قیمت کی ادائی میں جس نے  
کانگریسی وزراء کو ایوان وزارت کا پر داء رابہ رایت پیش تھا؛ اسے

سجہم عشق تو ام می کشند و غوغا فایت

تو نیز بر سر ہام اگر خوش تاشا میرست؛

بالآخر اک عرصے کی نشی ناز کے مشاہدہ و مطالعے کے بعد وقت کے  
کانگریس پرینڈنٹ ہنڈت جو اہر لال ہنڈو کو کانگریسی وزراء و اہماری ہند  
پروریوں اور تیز خرمیوں کا شکوہ رنگیں کرنا پڑا؛ اسے

دینداروں اور عقیدداروں، نوادوں اور راجوں، تعلیمی جی کے مجاریوں اور  
 مبلغین علیہ السلام کے پرستاروں کے ملک میں بھوپر پیر ہونے کے بڑے قوی  
 امکانات و محرکات پائے جاتے ہیں: **راجہ**  
**مہشار** کہ سیلاب فنا پیش امت!  
 معلوم ہندوستان اور روشن اس عالم جنگالی شمشکٹ معصفت و  
 صفائی و داعی مسٹر ایم۔ این۔ رائے کا معنی قریب کی جنگالی پولیٹیکل کانفرنس  
 کے پٹال میں پھینکا ہوا یہ "م" اگر ہم اس کو پتے پر اک دفعہ اوٹن میں تو ملک  
 کی تحریک سیاسی کی موجودہ "سوز" کی توجہ و تفسیر میں اہم آسانی ہو بیٹھی گی!  
 "منصور" اجماع صفت "رائے نے کہہ ڈالا کہ  
 "اگر آپ کا گنگو بیروں کے دلوں کو ٹھیس تو آپ کو ان کی اکثریت ایسی  
 نظر سے گی جو بہتر رہے نا خواہہ اور غریب ہر ملوں سے فائدہ اٹھانا  
 چاہتی ہے! اور آپ اگر اچھی طرح ان کے فانی تضیق کا جائزہ لیں تو آپ  
 ان کے قول کل کا اختلاف دیکھ کر حیران ہر شہر رہ جائیں گے! غریب  
 مزدوروں اور کسلاؤں کی حالت پر ازراقتضی اشک ریزی کرنے والے  
 یہ لوگ، سامہو کاروں، کارخانہ داروں اور بڑے بڑے زمینداروں سے  
 جو ملک کے خربار کے جسم سے خون کا آخری قطرہ پھول لینے پر تھے ہوئے ہیں،  
 گہرے تعلقات رکھتے ہیں! اس وقت ملک کی عام آبادی کو اسی طرح کانگریسی  
 کارکنوں کی خود غرضی سے نجات دلانے کی ضرورت ہے جس طرح غیر ملکی حکمرانوں  
 کے اثر و اقتدار سے! اگر ایسا نہ کیا گیا تو ہم اپنی جدوجہد سے آزادی کے  
 منہبائے مقصود سے قریب تر ہونے کے بجائے دور تر جا پڑیں گے!"  
 رائے کے اخیر جملے میں جس اندیشے کا اظہار کیا گیا ہے وہ اسپن اور  
 اتنی میں اک ملکی تاریخی حادثہ بن چکا ہے: اول الذکر ملک میں معاشی جمہوریت  
 اک کامیاب انتخاب لڑا چکی تھی، اور آخر الذکر میں اک پورے پارلیمانی  
 سوشلسٹ انقلاب کا عبوس رواں دواں ہو گیا تھا! لیکن  
 پہلا تھا دام سخت قریب آشیانے کے  
 اُڑنے دے پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے!  
 ہمارا شاہزادہ الیہ اسپن کے افسر اور قائدین عسکری کی باغیانہ غدلت  
 فی الجمہوریت اور اتنی کے کارخانہ داروں اور زمینداروں کا جواہری انقلاب  
 رجعت ہے ایسی تحریک کا سرخیل جنرل فریڈلینڈ، اور دوسرے قسماً فاسیزم

کا آلہ کار بنیٹو سولتینی، جمہوریت جب معاشی جمہوریت کی صورت میں اپنی تکمیل پاتی  
 اور اپنا "اقام" غمت "حاصل کرتے گئے ہیں تو "سریہ دارا" ہر لازم کے پروردہ متعین  
 اس نشوونما کو دے گی ایسی ہی جان فرد کو شش کرتے ہیں، مہدی کو ملکیت کی عزت  
 اور حریت کے آفاذ کئے پڑشاہ اور پٹنر اسے، ایمان و بارادار کان دولت ہر  
 کردنی و ناکردنی کو گزرتے ہیں: و حقیقت اسی افتادہ کو دے گئے لے شہابی  
 خاندان کی نظر بندی اور "ڈاکٹر شپ" آت دی پر ویلیٹیٹیٹ کی ضرورت ہوتی  
 ہے! اس نکتہ سیاست کو مارکس اور لینن نے مبسوط کیا وہ اپنی کا حصہ تھا،  
 ہست پائیدہ و ایتقاد کے علاوہ یہ فرد گزشتہ جنگ عظیم کے بعد کی سوشلسٹ  
 جرتی اور گریٹ اسٹراٹجی کے عوامی لیڈروں سے بھی سز و ہوتی! اور دور  
 عبوری کے اس دشوار گزار پٹریٹ "برسے گزرتے ہوئے شہر شاد انقلاب  
 کا "لاہر جنت" اوندھے منہ فاسیزم اور ملٹریزم کے جہنم میں جاگا رہا ہے  
 برسے ڈوب جانے کا باعث نہ پوچھو کہ اسے سے لگا لگا تھا سبب نہ:  
 سیاسیات کے اس چوراہے پر آکر ہندوستانی تاریخ جرت کا  
 اس منزلہ اقدام کی فکر سے سخت ہوجانا کوئی بعد اسکان نہیں ہے! یہ  
 تو یہ ہے کہ اس خواہر استمب اور اور ہندو ذر زمین میں "فاسیزم" کا شہر شاد  
 اک خود رویداد کی نظر آتا ہے! آج بھی ہر چار اطراف میں اس عبور  
 موسم کے ہتھید آمیز آثار کافی نمایاں ہیں! مسلم لیگ اور ہندو جناسا  
 حقیقتہ مسلمان اور ہندو فاسیزم کے درخیزہ کارندے ہیں! اس لئے ان کی  
 قرار واقعی تشریح کے لئے ہندو جواہر لال نہرو کے اُن مقالات کے پڑھنے  
 کی ضرورت ہے جن میں انھوں نے ان پر دوش پذیرفتوں کی طرف دعوت  
 نظر دی ہے! اُن لوگوں کی بصیرت قابلِ رحم ہے، جو لیگ اور سیمیا کو اٹلی  
 طبقہ امارت اور ہندو ہماجینی کو لے کے نقیض اور سنگھناؤوں کے سوا  
 کچھ اور سمجھتے ہیں! پوٹہ کا "خواجہ ملٹری اسکول" اور بادشہ بقی گواہ قلعہ  
 علی "بزبان خواجہ حسن نظامی، لاٹ پادری آل انڈیا فسطائیت! کا مجوزہ  
 کلیدی حربی مستقبل کے ہندوستانی فاسیزم ذر ساریہ برتانیہ کے رہاؤن  
 ڈپو "ثابت ہونے والے ہیں! برین بسیرے کے "قلعہ الموت" والا شہر اکمل  
 اپنی ہتم باشان "خبر کچنی کے ذریعہ تجویز آوردہ ہندی، انگریزی اخبارات و  
 جرائد کے ساغور کی گزشتہ سے اک ہندوستانی رجعت و فسطائیت کا حق  
 حشیش "ہر پائے کہ تفسیر کرنے کے منصوبوں کا بانیاب ڈبل اعلان کر چکا ہے!

پر اتر آیا ہے کہ جہادِ حرت کو معاشرتی جمہوریت کے آخری غیر خیریں سے بارود نہ ہونے دے، اس لئے کہ سوشلسٹ نظم و نسق ملک کا گنہگار اس کی دولت و عشرت و ریاست کے لئے اک سازِ موت ہوگا!

سر دارمیکل کاہری پورہ کے کانگریس پینڈال میں یہ چیلنج کر رہے ہیں سوشلسٹوں کو برداشت کرتے کرتے اپنے پیادے ممبر کو چھلکتا ہوا پا رہا ہوں؟ ہندوستانی پورٹروا کے ترکِ رفاقت جنگ کا وہ مرحلہ آخر میں ہے جبکہ ملک کی تباہی و سخت جان مہرباہ داری، وطن کی مصیبتِ انقلاب کو اپنا مقدمہ بنام ہذا فراموشی و بیکشتانے پر مجبور ہو رہی ہے، اب وہ اپنے نقابِ فریب کو چاک ہونے سے نہیں بچا سکتا!

اس عجیب و غریب سے جہانِ گاندھی کا موقوف مطالعے کا دمپ توڑنا ہے، بقول پنڈت جواہر لال کے ہاتھ اچھی اک سید انشی انقلابی ہیں، اور ظلم و محروم خلقِ اندک کے دوسو حامی، لیکن وہ کیونکر نہ کے شکابِ قلم سے حوالہ دیتے ہیں اور اربابِ دولت کے نصبِ امانت و داری، دولت کے مقدس خط میں مبتلا ہیں، اس آغاز پذیر سرچسپ کے اس کی ذہن پرست شخصیت کا سارا وزن علامہ پورٹروا دعوامی کے پڑنے میں جاتا ہے، اور نادانستہ اُن کی معاشرتی خون آشامی کی حمایت کرتا ہے، سر دارمیکل، جہان کے فانی فی الشیخ مریض ہیں وہ اب مہرباہ نواز کانگریس کے علم کے نیچے ہندوستانی مزدوروں کی اک ہندوستان گیر تنظیم کے ممبر دار بن کر میدان میں آگئے ہیں، احمد آباد کے حرفتی مزدور، ان کی اک انجمن اُن کے ادعا میں مزدوروں کے لئے بہترین ملن اُس وقت ہے، جو نہ ہر تان کی حامل ہے نہ مزدوری دہرایہ کے درمیان کی بیعتی جنگ کی قابلِ گویاست

سپر دم توڑیہ خواہش را تو دادی سب کو ویش را! سر دارمیکل کی معصومانہ خود فراموشی قابلِ دید ہے! غالباً وہ ممالک و محکوم کے درمیان کی بھی کسی ناگزیر تقیض کو بھی اب تسلیم نہ کرتے ہوں گے، جس پر اُن کے دیہاتی ستیاگرہ اور انکارِ ادا فی ٹیکس کے سارے تاریخی یادگار دھرم کے اپنی تنہا بنادو اس اس رکھتے تھے! تاہم ہندوستانی سوشلسٹ ان ابدِ فریبوں میں آنے والے نہیں، وہ ملک کے مزدوروں اور کسانوں کی تنظیم و تنظیم گرنٹ اصولوں پر جاری رکھیں گے، تاکہ فرض کی بیکار پر وہ آجس کے تلخ تنہا سے دوچار نہ ہوں! بلکہ روسی انقلاب

اُس کی زبان کی خوفناک معنی فیزی کا سلا لکھنے، ہمدلی جتاہ کوئی سیدالقوم خادیم نہیں میں مختار الملک ہیں، یعنی اسلامی ریاست کے بندے اندر اجڑا اصطلاحات سیاسی پر اُن کی تنبیہ کی جاتی اور بجائے اکٹھی قسم کے شہر پار بننے کے اُن کے سامنے بہتر دستکاری کی جتنی وائی کا ملال و اقبال جیش کیا جاتا ہے، ہمارو وہ مرکبِ عوامیہ کا تشریح کتبیں گردی، یہ کی جاتا ہے! اور کانگریس سوشلسٹوں کی سرگرمیوں کو روسی غلاموں کی تدبیر کرنے والی انقلابی طاقتِ خیر یوں سے تعبیر کیا جاتا ہے! — پھر خود والیان ریاست ان پشت گریموں پر جن بلند پروازیوں میں ہیں اُس کا اندازہ اس امر سے کیجئے کہ ان میں سے دو ایک تاجداروں نے گزشتہ ایام میں کانگریس کی پیش قدم انقلاب و دستِ جماعت کی طرف روئے سخن کرتے ہوئے اک وائی ملی جنگ (Civil War) کا یہ انیسٹم دیا ہے اگر ہمارے آبائی ویشی معوقی شاہد کو تشریحی آنکھوں سے دیکھا گیا تو ہم اپنے اقتدار کی بڑبڑیشتِ مداخلت کرنے میں بھی قطعاً تامل نہ کریں گے!

یہ ساری خائف و خون آشام قوتیں ہندوستانی فیڈریشن کے مجوزہ نظام کی صورت میں دنیا کی سب سے بڑی ملی فاسٹ طاقت برطانیہ عظمیٰ کے زیرِ سایہ طاقتِ ضعف بستہ ہونا چاہتی ہیں! لارب کہ قانونِ ہند سوشلہ مجبورۃً ایوانِ دفعی، اس ملک میں اک فاسٹ گراؤ کا نسل کا ہم معنوں واقع ہوا ہے!

فتنہ می باروازیں طاقی مقررئیں بر خیز! اک ملن الوجود ہندوستانی فاسٹرم کی یہ پوری معرکہ آرائی نہیں ہے! اختیار دار اُن کے خواجہ تامل اور حلقہ گوشوں کے علاوہ تمام ملی اعراض کے لئے اک حلیف کی طرح کی اہم دستگیری خود مجاہدین آزادی کے لشکر کی بعض داخلی مصیبت سے اس چیز کو بل رہی ہے! یہ ملک کے سارے پورٹروا ہیں جو مخلص کانگریسی ہونے کے باوجود فاسٹرم کی قدرتی خوب ہیں! یہ دولت مندوں اور سرمایہ داروں کا طبقہ ہے، اور اپنی اصلاح ازلی جماعتی فطرت کے ناگزیر تقاضے سے جنگِ آزادی میں کچھ زیادہ دور تک نہیں جاسکتا! وہ خارجی مستبدوں کے اخراج میں پورا اہم آئینگ احرار ہے، لیکن سرمایہ داریت کے شیطانی آئینِ حیات قومی کوشش ہونے دینا نہیں چاہتا، اور چونکہ معرکہ آزادی اپنے آخری مراحل میں ہے وہ اعلانِ اس جدوجہد

اپنی "نظر اندازی" کو ناقابل برداشت صدر محسوس کرتے ہیں: (۱-۸)  
اس قدر دشمن ارباب و فدا ہو جانا؟

ملطف یہ ہے کہ سچے شہید گج کے تفسیہ نامرضیہ میں تو سر جتاج محکم مسلح  
و آستھی ہیں، لیکن مسلم لیگ اور کانگریس کی نزاع موہوم کو داؤدِ حشری کے  
سے اٹھا رکھا جاتے ہیں:۔

در کینہ و رزمی نفسیہ ہشتہ! در ہربانی نسبتاں سراسے!  
اک نہایت پر خلقت ماجرا یہ نظر آتا ہے کہ مسلم لیگ کے بڑے بڑے  
خلعیوں اور آتش خواروں کے بلہاے بلند بانگ وازمیان تھی، اپنی  
ملفہ خوش فہیوں میں شاید یہ سمجھتے ہیں کہ گویا انھوں نے ہندوستان  
کی سرزمین میں یوروپین فاسزم "اور نازی ازم" کا قلم لگایا ہے: ان کے  
فکر و خیال کو "ہٹلر کے" اسٹارم ٹروپز سے کہ نہیں: ان کے برپائے  
ہوئے "ہندو سائنس دان" "اسپین کی داخلی جنگ کا منشی ہیں: جو ابر لالہ  
ہما تھا گاندھی کی طرف سے جناح کو کیا بات اتحاد کو یا مترازی واقع ہوئے  
ہیں، سر جتاجیرین و لارڈسٹینکس کی دلجوئی سولہی و ہٹلر کے: اور فانا  
یوپی، کے گزشتہ تین انتخابات میں مسلم لیگ کا سپاہی بال مقابلہ رکھی جاسکتی  
ہے، اتنی ورتنی کی فتح پیش و اسیر و آسٹریا کے: پھر بھی، کلکتہ، لاہور و  
نواح "میں عاشق کہا جاسکتا ہے" دم۔ برتن، تو گیکو محاذ کے:۔۔۔ زیر ذکر  
اجلاس لیگ میں مولانا شوکت علی اور سر فضل الحق کی زبان بے ہنگام سے  
چڑچڑی یک وقت کانگریس، ہندو قوم، اور دوسرے ہند کی طرف سے  
گئے ہیں، وہ اپنی سنجیدگی و خواہوں اور جعفر زلمیاد نیز نیات کے غماز نظر  
آتے ہیں: (۱-۸)

گو تو خوش باش کہ مالِ بخش بر احمق ندیم!

(۱-۸)

## یورپ:

برطانیہ اور آئرنی کے درمیان کا نوٹیکل معاہدہ دوستی "یورپی سیاست  
کی تاریخ میں ایک نئے دور کا آغاز ہے: ابھی تک انگلستان اپنے کو براہِ علم  
کا سر تاج اور عالم کا سیاسی قطب سمجھتا تھا: یورپ کی گزشتہ طویل  
تاریخ نے سچے اُس کے اس زعم و پندار کی قرار واقعی پرورش کی: اس نے

کی تاریخ کے ایک ہندوستانی اعادے سے فریاب ہوں:۔۔۔  
توڑ ڈالیں غلظتِ انسان نے زنجیریں تمام  
دوری جنت میں دو تہی چشم آدم کہ تنہا؟ (۱-۸)

## مسلم لیگ کا اجلاس کلکتہ:

مسلم لیگ کا تازہ اجلاس کلکتہ جبرتناک شرمنائیوں اور زعفران دار  
مستطاب خیر یوں کا ایک حکم و ستر مضمون ہے: حسب معمول رجزِ خوانی کی اس محفل  
کا افتتاح سچے کانگریس کے غلات جہاد بالسان سے ہوا، ایک سنجیدگی  
نعرہ یہ تھا کہ مسلم لیگ اس کسی میں بھی سر کانگریسوں کے برابر ہے:۔۔۔  
لڑنا سائے جوش آفتاب آئے گا جب ان اداؤں پر پورا شباب آگیا:  
ضیغِ اسلام مولانا فضل الحق نے اربابِ مسلم لیگ کی سامعہ خراش و داغ  
باش و غایت کا اعتراف فرمایا، لیکن اس کی وجہ توجہ یہ بیان کی کہ ایک  
ایک یگی مسلمان شیر اور شیر پر واقع ہوا ہے:۔۔۔

جئے زیم و سہرا منشی شہزاد شکار مارا اڑیں گیا و ضعیف اس گال نمود:  
برطانوی حکومت کی مکروری سر فضل الحق کو ہٹلر اور سولہی سے بھی  
زیادہ زار و زور نظر آتی ہے: کاش اس نوبل ہند کا ساہوکار اعلیٰ  
پر پڑ جائے تاکہ ان کو کم از کم ایک صدی کی توسیع عمرانی تو اور نصیب ہو جائے:  
سر جتاجیرین، جناب جلالت الملک فضل الحق سے زبان حال کہہ رہے ہیں  
کہ:

آنانکہ ناک را بنظر کیسب گزند آیا بود گو گزشتہ حشرے با کسند؟  
عظیم الشان مسلم لیگ کے تاریخی اجلاس کلکتہ میں اس کے بعد پانی پت  
اور تھانہ ستر کے سر کھٹے جدال و قتال لڑے گئے اور حسب توقع، لیگ  
ایکٹرز ان نہات سے بھی مغرور و مغرور ہندہ برآہوئے:۔۔۔

ذوق: بادی گوشتان جو سر اسیر زمین ساتھ بچوں کے بڑا کھین گویا ہم کو:  
اسی طرف و راستہ بنگالی کی "میر جعفری" حکومت کو عالمگیر علم کی مسلفیت  
بھی فرض کر لیا گیا: (۱-۸)

برتن ہائے عرفی خندہ می آید مرا!

والسٹر نے کی طرف سے ہما تھا گاندھی کو نیاز مند دعوت ملاقات  
دے جانے پر مشروط بری طرح خون و مرگ رہیں: اور اپنی نوٹ کے باوجود





اک قول کا حالہیں کچھ خوش و آسودہ ہوا! ہندوستان کی سیاسیات میں اب وہ دفتر ختم ہو رہا ہے کہ ایک پولیکل پارٹی کا مین فینڈو اک دوسری حریف جماعت کا کوئی نفس ناطقہ ترتیب دیا کرے۔  
اسی طرح طرح لائے سیاسی نشان — تصویر کش — کے بچے یہ مصرعہ کہ

”طرح تو افغن کہ ماجد تہ پسند افتادہ ایم“

کہنے کچھ اچھے گل تہ تعبیر نہیں! انقلاب اور ادب انقلاب بعض استیقاتی مذاق جدت پسندی سے براصل بلند تر زمین تر واقع ہوا ہے! اس کا مقصد کسی حیرت غناء امروز و فردا کی تحول ٹھیکان سے غلطی نہیں! دارلگاوا استبداد سیاسی اور عذاب کہہ پیدا و معاشی سے نجات ہے! — اگر رسالے کے نام طرح تو! کی لغتی رعایت ہی ایسی ناگزیر ضرورت تھی تو اس زیر بحث مصرعے کا کہیں بہتر نم البدل یہ مصرعہ تھا کہ خط

فلک راستف انگلانیفیم طرح تو! دراندازیم!

اخبارات و رسائل کی مینیا پر اس قسم کے اشعار یا آیات کا کہنا جن کی ترکیب لغتی سے کسی جگہ مختلف اخبار یا رسالے کا نام ٹپک پڑے، ہماری آراء و اسلامی صحافت کی ایک سنت منوکرہ بن گئی ہے! بعض موقعوں پر تو اس صنعت ادبی کا حاذق خواہ التزام پر غفلت بدحواسیاں پیدا کیا کرتا ہے! یادش بخیر پنجاب کا جدید فرد، انقلاب (لاہور) شاید اس کی سب سے زیادہ مشککہ خیر اور عبرت انگیز مثال ہے! غالی سیاسی حجت کی یہ پوٹ جس کا نام انقلاب رکھا گیا ہے، اپنے اس برعکس تسمیہ میں کی اس حقیقت کی صداقت نہیں کہ ج

برعکس ہند نام زندگی کا فور!

مگر آخری ستر راجا دی یہ ہے کہ انقلاب اپنی ہیسماء صحیحہ پر قرآن مجید کی یہ ملامت آیت قاہرہ کہنے سے بھی نہیں شرماتا کہ سبیلہو الدین ظلمو! اسی منقلب یںقلبون! — قرآن کا یہ اعلان خود غلط کارو باطل کو خشن دشنام انقلاب کے نام ایک جینے صحاح میں اس کو یہ صدلے غفلت شکن رسید کی گئی تھی کہ وہ اسلام کی تحریک حق کے خلاف اپنی ساری کوششیں اور کاوشیں مرث کر ڈالیں! بہت جلد وقت کا ٹھکانا ملن یہ فیصلہ کر دے گا کہ جو ابی انقلاب کے ان قسمت آدموں کی اٹلی اٹلی

گھے پڑ جائیں گی؟

سیاسی و ادبی مقولوں کے انتخاب کی اس تقریب سے ہم نے جو طویل و لاٹھال ٹکڑے مستتر منہ چھپڑا یا، ہم اس کی قابل اعتراض ذمیت کو محسوس کر رہے ہیں! لیکن ہمارا یہی عذر ہے (بشرطیکہ وہ قابل قبول ہو) کہ صحیح بدو حکایت شدید تر گفتیم!

ہاں باز آدیم برسر مطلب! رسالہ طرح تو! اپنے مواد و منظومات کے اسی معیار کی روشنی میں غالباً اک درجہ اول کا انقلابی محیف ہے! خود مدیر طرح تو! اک خوشگوشا عریں، اور اک انقلابی ادیب! رسالے کے اندر جا بجا ان کی لغتیں طرح تو! کی نثری تحریرات کی عام گرمی کو سرخ فراہ ہیں اڑانے لگتی ہیں! ہم جناب سر آغا الدین صاحب لغت، بی لے کے کچا جب کی سیاسی طور پر شہر زمین سے اس اعلیٰ صحافت و ادبیت نکالنے پر گرجوئن مبارکباد دیتے ہیں! طرح تو! کی نسل کے ایک ایک فرد کے مطالعے کی ناگزیر چیز ہے!

(۱-۱-۱)

واقف ہوں یہ فوجنا پشانی کی کیوں ہے  
پیشواں دار و نو حوضانی کیوں ہے  
برسی و عمل ہے زندگانی کے لئے  
لیکن کھلا کہ زندگانی کی کیوں ہے  
(رجش)

انفس کو کوئی کام ہوتا ہی نہیں  
جی بھر کے پیاں قیام ہوتا ہی نہیں  
سننے والے ستام ہوتا ہی نہیں  
خفا یہ کوئی کام ہوتا ہی نہیں  
(رجش)

حسین بن جاناس قدر آسان ہو گیا ہے

# میو صندل سوپ

یہ چہرے کے رنگ کو تروتازگی، نرمی اور صحت آمیزنگی بخشتا ہے اس کے مسامات میں اتر جانے والے بالائی کے سے لانا مال جھاگ



چہرے کی جلد کو تمام آلودگیوں سے پاک کر دیتے ہیں، کیونکہ میو

صندل سوپ میو کے شہرہ آفاق روغن کی آمیزش ہوتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ تمام حسین جمیل خواتین میو صندل سوپ کا استعمال کرتی ہیں، اس لئے کہ انھیں یہ یسید معلوم ہو چکا ہے کہ یہ صابون ان کے حسن و جمال کو برقرار رکھ سکتا ہے۔

میو صندل سوپ ہر دو کا گذر سے مل سکتا ہے  
گوڈ نمٹ سوپ فیکٹری بمبکھور

# عروسی

یہ ایک نہایت کامیاب علاج ہے جو بعد روغن عروس کے ترتیب دیا گیا مگر اشتہا میں صرف اتنا ہی اشارہ کافی ہے کہ مردوں کے تمام غفلت کالہ برہم میں واحد علاج ہے، مخصوص اذکار و رشتہ فائدہ آٹھائیس، اس لئے کہ اندھا تجربہ ہے اس کے ساتھ چار چیزیں موسی، سنائی، کھیدی، تعلیمی اور ہر وہ جن کی تفصیل اور ترکیب استعمال خریدار پر نظر پڑی جاتی ہے، ایک سیٹ موسی کا ہفتہ بھر کو کافی ہوتا ہے، جس کی قیمت صرف ایک روپیہ پندرہ ماٹنے مقرب ہے، علاوہ محصول ڈاک، اکثریت مہنت کا استعمال صحت کے لئے کافی ہوتا ہے صاحب دربارش نام دہ صاف و خوشخیز و زبانی

شفا خانہ رضویہ چاندنی محل دہلی

# ناظرین رسالہ کلیم

اگر آپ ادب اردو کی خدمت کرنا چاہتے ہیں  
اگر آپ تعلیم کی خوبیوں میں خاطر خواہ اضافہ دیکھنا چاہتے ہیں  
اگر آپ ملک کے بہترین شعراء اور ادبا کے واسطے برضا چاہتے ہیں  
اگر آپ اپنے علمی و ادبی ذوق کو ترقی دینا چاہتے ہیں  
اگر آپ اردو کے چند داستان کی واحد زبان دیکھنا چاہتے ہیں  
اگر آپ ماضی اور حال کے شعر اور ادبا کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں  
اگر آپ ایسے کتب کی ضرورت کو محسوس کرتے ہیں جو ملک کی ضروریات کو نظر رکھ کر لکھی گئی ہیں۔

اگر آپ بکافیت بہترین اخلاقی اور ادبی کتب خریدنا چاہتے ہیں

کلیم بک ڈپو جنینی فراس نمبر ۱۰ دریا گنج دہلی سے فرمائش کیجئے

# ادب لطیف کا افسانہ نمبر

افسانہ نگاری پر لا جواب تنقیدی مقالات — فن افسانہ کے مہر پہلو پر گرا نیا یہ مضامین  
دیکھی زندگیوں کی اشک افش کہانیاں — سرسبز ہستیوں کے مسکراتے ہوئے افسانے  
مغربی شاہکار افسانوں کے کامیاب انجام — روح پروردگری کی زوالی منظم داستانیں

دلپذیر تصاویر!

شاندار گیٹ اپ!

ادب لطیف کا افسانہ نمبر حقیقتاً

اردو کے افسانوی ادب میں ایک دلآویز اضافہ ہے

ان تمام خوبیوں کے باوجود قیمت صرف ۱۲

اگر آپ یہ افسانہ پڑھ کر خوشنود ہو کر نہ رہتے محال کرنا چاہتے ہیں تو آج ہی خرید لیں پڑھ کر اپنے بھیکوڑی وار بن جائیں

مقام اشاعت

مکتبہ اردو - ۱۵ - سرکل روڈ - لاہور

مشہرین حضرات کے لئے یہ نایاب موقع ہے جلد اشتہار دیکر فائدہ اٹھائیں

اسٹریٹ شاہ  
کاتب لاہور

”لوچرخ چہارم سے سیاحت اتر آیا“ گھوٹا بچہ گمشادہ دیکے چاروں کو  
 دنیائے صوفات کا دوشندہ تارہ  
 ۱۰۰ لاکھ روپے قصبہ میں دیانت دار یعنی اسٹیبلوں کی ضرورت ہے  
 گھوٹا بچہ

بہت جلد آسمانِ ظرافت پر نہایت آب و تاب کیساتھ نمودار ہو نہیو والا ہے  
 مسٹر گھوٹا بچہ مذاہمہ افسانے، دلچسپ مضامین، پر لطف کارٹون دیدہ و زیب فوٹو بک، خوبصورت فلمی تصاویر، شاعرانہ نثریں مقال کے طرز  
 دیر سر پرستی جناب احسن رضا صاحب بی ایس سی، ایل ایل بی، ۸۰ روپے پر پیلے مستعار سے ملبہ افزا ہوں گے۔  
 دہلی، بی بی جیٹا جھنڈ ہے، ساز ۱۹۳۲ء جمہور صنفی قیمت سالانہ عجائبات شاعری، غنائی کالی ہر در باب اسٹال پر تین آنے  
 پتہ یہ ہے۔ دفتر اخبار ”گھوٹا بچہ“ (لالہ بازار) پبلک بازاری، بستی (دہلی)

## ادبی دنیا

نماک بھر کے جادو نگار ادیبوں اور شعرا کے بہترین انکار — مشرق و مغرب کے بلند ترین مصوروں کے نظر افروز شاہکار

۸۲ دلاؤ افسانے، مضامین اور نظمیں ۸۰ ہفت رنگ و ایک رنگ تصاویر

قیمت صرف ایک روپیہ چار آنے، علاوہ محمول ڈاک

سالانہ خریداروں کو مفت

سالانہ چندہ پانچ روپے، مع محصول ڈاک

آج ہی اپنا نام خریداروں کی فہرست میں درج کرا کر یہ بے نظیر تحفہ مفت حاصل کیجئے

مینجر رسالہ ادبی دنیا، لاہور

# مطبوعات

ذکرہ دہلی مرحوم کا اسے دوست نہ چھوڑا۔ خواجہ شفیق دہلوی نے دہلی مرحوم کی داستان الم اس کے ایام عروج کی دستاویز بنائے گا ہم سے یہ سنا نہ ہوگا۔ کمرق نگاری، صاحبان کمال کا تذکرہ اس کتاب کی زبان میں کیا ہے، جواب ناہو ہے۔ انداز بیان ایسا موثر کہ دل بے اختیار ہو جاتا ہے، کتب، طباعت اور تہذیب کے لئے کتب خانہ کا کافی ہے۔ صفحات ۱۵۵۔ قیمت فی جلد ۱۰/-

لطائف غالب { مسرور لے۔ شاہ، بی، ایس، سی، الین، پی، ای، مرزا اسد اللہ خاں غالب کی شوقی بیان، خوش طبعی اور ظرافت سے لکھنا

شعلہ طور { شاعر فطرت حضرت جگر داد آبادی کے کلام کا مجموعہ، جو حضرات شعلہ طور پر ایک دفعہ بھی اُٹھتی ہوئی نظر ڈال چکے ہیں وہ اس طرح لے پھرتے ہیں جیسے کہ لوگ زمانہ انقلاب فرانس میں معاہدہ "عمانی" لے پھرتے تھے، اس ایڈیشن میں چند نئی سحرانہ غزلوں کا اضافہ کیا گیا ہے۔ بالکل نئی ترتیب، از حد دیدہ زیب، چمک چمک اور جگر کی ایک بے نظیر تصویر، قیمت ۱۰/-

سب سچین { مرزا غالب کے کیا بے لکھنا بے غامی کلام کا مجموعہ۔ اس میں قصائد، قطعات، ثنویاں، ترکیب بند، ترجیع بند، غزلیات اور مرزا اسد اللہ خاں غالب کی مکمل سوانح حیات اور تعینات کا تذکرہ بھی شامل کر دیا گیا ہے قیمت ۱۰/-

ذکر غالب { مرزا اسد اللہ خاں غالب کی مکمل سوانح حیات، اب تک مرزا صاحب کی سوانح حیات پر یادگار غالب، غالب اور غالب نامہ ذکر غالب { چھپ چکی ہیں، لیکن اس کے باوجود وہ غالب کی زندگی کے بہت سے ایسے پہلو تھے جو تاریکی میں تھے، چنانچہ اس کتاب میں تمام ممکنہ ذرائع سے معلومات فراہم کر کے غالب کی زندگی کے تمام پہلوؤں کو اجاگر کیا گیا ہے۔ غرض یہ کتاب اتنی جامع اور مختصر ہے کہ شعر و ادب کا ذوق رکھنے والے حضرات کے لئے عموماً اور یونیورسٹی کے طلباء کے خصوصاً اذہن مفید۔ قیمت ۸/-

قرآن پاک کیا ہے اور اس نے کیا کر دکھایا؟ { کتاب بچوں کی نفسیات، شعور اور استعداد کو مد نظر رکھ کر آسان زبان میں بیان کی گئی ہے، قرآن پاک اس شخص پر کس طرح آؤتا تھا، آپ کس طرح لوگوں تک پہنچاتے تھے، کیسے اس کی حفاظت آپ نے اور آپ کے بعد صحابہ کرام نے کی، اور کیسے اُس نے لوگوں کے دلوں پر اثر کیا۔ بہت مفصل، معشائی قیمت ۶/-

دہلی { بچوں کے لئے دہلی کی خاص عمارتوں کا دلچسپ بیان۔ جس کے پردے میں دہلی کی مختصر تاریخ بتا دی گئی ہے۔ ہلاک کی چھ تعدادیں، آبوی دہلی { اور یہی دہلی دہلیوں کے دوشیزے۔ قیمت ۱۰/-

## مکتب جامعہ

دہلی - نئی دہلی - لاہور

شائع ہو گیا!

شائع ہو گیا!

# نویسار

## کیا؟

### ہفتہ وار اخبار گل فروش دہلی کا افسانہ نمبر

اس خاص نمبر کے تمام افسانے جناب سید محمود صاحب مورخ نے لکھے ہیں، حیرت انگیز، لرزہ خیز، معاشرتی، اصلاحی، سائنٹفک اور رومانی افسانے ان کے ساتھ ہی اردو کے بہترین رومانی شاعر حسرت اختر شیرانی کی ذہن جاوید نفلوں کا مطالعہ کیجیے۔ مختصرات چالیس صفحات - قیمت مہرت ۳ روپے آنے والے ہفتہ وار اخبار گل فروش دہلی ایک کامیاب اور کثیر الاشاعت اخبار ہے، اس کا سالانہ چندہ بیسٹین روپے آٹھ گیارہ روپے آنے والے ہے، مگر جو صاحب اس مہینے کی خریداری قبول فرمادیں گے ان کے نام دو روپے آٹھ آنے سالانہ میں جاری کر دیا جائے گا۔ اور مذکورہ بالا افسانہ نمبر کے علاوہ ۵ روپے کوٹاٹ ہونے والا جو کس نمبر اور اس مہینے کوٹاٹ ہونے والا افسانہ نمبر بھی ہلکے مفت میں گے، اس لئے آج اپنا چندہ بیکار خریدار بن جائیے۔ کیونکہ دیر کرنے سے ممکن ہے کہ افسانہ نمبر ختم ہو جائے اور آپ کو نہ مل سکے۔

مینچر ہفتہ وار اخبار گل فروش دہلی

ادارہ ادبیات اردو کا مسطور پچ دہلی رمال

## تسب رس

زیر نگرانی  
ڈاکٹر سید محمد الدین قادری دور  
پروفیسر جامعہ عثمانیہ  
سالانہ چندہ  
چار روپے آنے والے

زیر ادارت  
صاحبزادہ میکش دھما  
نواز کا پرچہ  
سات آنے والے

خواجه حمید الدین، مہتمم "تسب رس"

مفت منزل، غیریت آباد، حمید آباد، ملکن

نئے سال کا بہترین تحفہ

حقیقت نگار علی عباس حسینی کے افسانوں کا تازہ ترین مجموعہ

## آئی سی ایس

طبع ہو گیا

قیمت صرف ایک روپیہ

انڈین پرنسپل آباد

برادری آفس، کلکتہ، پنڈت بھگت — دہلی

## نقش و نگار

شاعر انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی

لی وحد آفرین نکلن کا مجھ وہ  
جوشمہ زب ڈول اباب پرتم ہے

ان نگار خانہ (۳) خبریات (۳) تاثرات (۴) مطالعہ و نظر (۵) شیب  
ہر نظم اپنی جگہ کمال مرصع اور کیفیات شعری میں ڈوبی ہوئی ہے، اور اس کے کور  
نہ تھے، دل و دماغ کے لئے ایک مستقل سکون اور روح کے لئے ایک  
خاص سرور کا باعث ہوتے ہیں

کھائی، چھپائی نفیس اور دیدہ زیب ہے

قیمت

غیر مجلد ایک روپیہ آٹھ آنے (پیر)

مجلد دو روپے (علا)

عظیم بک ڈپو، جنیتی نواس نمبر ۱۷ دریا گنج دہلی سے منگائیے

## شاعری راتیں

شاعر انقلاب نے چند راتوں کی مختلف کیفیتیں کو اپنے خاص وحد آفرین اور کیف  
آور انداز میں بیان کیا ہے جنہیں پڑھ کر نفس اپنے آپ کو اسی ماحول میں محسوس کرے گا

راتوں کی تعمیل حسب ذیل ہے

|                |               |                    |               |
|----------------|---------------|--------------------|---------------|
| سست رات        | بہست رات      | رازدہ یاد کی رات   | انظار کی رات  |
| اندھیری رات    | ہاندنی رات    | چوائی کی رات       | نصرت کی رات   |
| انسان کی رات   | مہمان کی رات  | اشکوں کی رات       | برسات کی رات  |
| ربو دلی کی رات | بجڑ دی کی رات | سرشار رات          | سبکی ہوئی رات |
| نصرت کی رات    | بیمین رات     | چابن ناگن کالی رات |               |

قیمت

صرف آٹھ آنے (۸)

عظیم بک ڈپو، جنیتی نواس نمبر ۱۷ دریا گنج دہلی سے منگائیے

## سوشل شعری

حضرت جوش ملیح آبادی کے تمام مطلوبہ اور غیر مطلوبہ کلام سے منتخب کر کے

سوشل شعری

دئے گئے ہیں، ساتھ ہی سوانح حالات اور کلام پر مختصر تبصرہ لیا گیا ہے

باوجود اختلاف مذاق کے نصف سے زیادہ

اشعار آپ کو اپنی پسند کے میں گئے

جیسی سائز، کاغذ، کتابت، طبعیت، دیدہ زیب، سرمد حق خوشنما

جس پر

حضرت جوش کی تصویر بھی ہے

قیمت صوف چار آنے

غیر مجلد ایک ڈپو، جنیتی نواس نمبر ۱۷ دریا گنج دہلی سے منگائیے

## شعلہ و شبنم

شاعر انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی

پُر جوش اور کیف آور نظموں کا مجموعہ

و آپ کو آتشکدے کی شعلہ افشانیوں، اسد ہی شان و حریت کے خون کھلا دیئے  
اسے واقعات، یاد و سر جوش کی سرستیں اور نگاہِ نفرت کے روح پر

نظموں سے لطف اندوز ہونے کا موقع دیا

شاعر انقلاب کا یہ لافانی شاہکار غیر مطلوبہ کلام سے مرصع ہے

کتاب مجلد ہے اور نہایت خوشنما گروپوش سے آراستہ

قیمت

صرف تین روپے (۳)

عظیم بک ڈپو، جنیتی نواس نمبر ۱۷ دریا گنج دہلی سے منگائیے

نور علی

نور علی

وہ ہیں کیا نہیں ہند

**جل جلال**

**نوجیون**

**حیدر**

خاموش ہو کر، داد دے، چہرے پہنچ، گری ملے  
 ہماں کیل، ہماں، سونا، آتش، آتش، آتش  
 سون، سنا، سنا، اور جہاد، غص، غص، غص  
 ہر لمحہ الی تمام بلوں کے لئے بہت سیر  
 وقت، دوسرے بارہ گئے

ماتائی کی کوئی اور طاقت موانع کے لئے اس قدر زیادہ  
 ہے کہ اس کی اس کا تعلق نہیں کر سکتی، اس کا ایک گات  
 ہے، جو مٹوئی اور ایک وقت پریشانی سے چاہی  
 ہے، یہ ایک غص، غص، غص، غص، غص، غص  
 غص، غص، غص، غص، غص، غص، غص، غص  
 غص، غص، غص، غص، غص، غص، غص، غص

عیا لجناب سچ الملک حکیم جیل خان جہا ستر ہند تائی وونا دلی

وہ نخر جس سے ۲ لاکھ مایمان جرایں کو بانک آرام ہو چکا ہے

**جمیلان**

جہان کا بچہ کیلے ۹ دل و دماغ و جگر کا درد دھماکا، ہاضمہ کا کار، مائیک کی خرابی، بہت کی بچی  
 طبیعت کی سستی، اولاد سے غمروں، جڑوں کا درد اور غامضاتی، پھر رفتہ رفتہ مائیک کیلے یا جڑوں  
 کیلے غت، پانی، شلا، وق، وسل ویدو، اگر آپ کو جہان کی شکایت ہو تو فوراً قیصر کیلے ہی آپ  
 پیش ہوا اور مایاب دھاکا استعمال فرماتے کر دیکھ  
 جہان کی جہان کی بہترین اور کامیاب ترین دوا ثابت ہو چکی ہے جس سے آپ ایک دو لاکھ سے گزری سستی  
 جہان کی جہان کی بہترین اور کامیاب ترین دوا ثابت ہو چکی ہے جس سے آپ ایک دو لاکھ سے گزری سستی  
 جہان کی جہان کی بہترین اور کامیاب ترین دوا ثابت ہو چکی ہے جس سے آپ ایک دو لاکھ سے گزری سستی  
 جہان کی جہان کی بہترین اور کامیاب ترین دوا ثابت ہو چکی ہے جس سے آپ ایک دو لاکھ سے گزری سستی

جمیلان سب سے بہتر ثابت ہوئی ہے +

وہ دوسرے جیسے دودھ کے ساتھ استعمال کریں، تیزی سے بیل گداور

نور علی

ہند تائی دوا خانہ پور تائی

چند دن کے اشتعال سے سفید بال جڑے کا ہے جو جالیں گے

## جھنگرہ ہیر آریل

کالہ بھنگرہ ہیبت کیاب ہے، اور اپنے دیگر قیمتی خواص کے ساتھ بھالوں کی درازی سبب بھی اور انہوں کے لئے حد درجہ مفید ہے۔ بھنگرہ ہیر آریل خاص سیسہ بھنگرہ اور دیگر قیمتی اجزاء سے سائنس کے اصولوں پر تیار کیا گیا ہے، جو سر اور ڈاڑھی کے بال کاٹنے، بڑھانے، گرنے سے روکنے، چمک پیدا کرنے، ویز کمبلی اور بالٹور سے دفع کرنے میں عدم اشتعال ہے۔ زیادہ تعریف بیکار ہے، ہم صرف اتنا عرض کریں گے کہ یہ تیل اشتعال کرنے سے قبل بالوں کی لمبائی ناپ لیجئے۔ اور پھر کچھ دنوں کے بعد ناپئے آپ حیرت انگیز فرق پائیں گے، سفید بال ایک ماہ میں، خلیہ طور پر کاٹے ہو جاتے ہیں۔ ایک شیٹ ۵۰ اتریں، کشیاں، جاشی، کاساز، کانٹا، بڑا، معمولی فی شیٹ، تین شیٹوں اور تیار کردہ انڈین اسٹور بریلی۔ بے کا پتہ۔ شاہد اینڈ کمرشیر مندر لیا، لاہور، دہلی

## ہمایوں

(۱) ہمایوں اتنا پابند وقت ہے کہ جزوی سلسلے سے لے کر (جب یہ جاری ہوا) کہ چمک بھی اس کی اشاعت میں ایک دن کی تاخیر بھی واقع نہیں ہوتی، اور وہ صحافت میں اس سے قبل ایسی باقاعدہ مثال نہیں مل سکتی۔

(۲) ہمایوں، آریل میں مہاں محمد شہین صاحب بتاتے ہیں کہ مرحوم جی بنگوٹ پنجاب کی یادگار کے طور پر ایک سنگھل سر پائے سے جاری ہے، اس لئے اس کے ظاہری و معنی حسن کو برقرار رکھنے کے لئے کس قسم کی کاروباری مصلحت مد نظر نہیں رکھی جاتی۔

(۳) ہمایوں، کا افغانی معیار اس قدر بلند ہے کہ ملک کا کوئی ادبی رسالہ اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا، اس میں شمس اشتہارات، عریاں تعداد پر اور محراب افغانی صفات اور نفلوں کے لئے نفاذ گناہیں ہیں۔ یہ رسالہ بلا خطر خراج میں دیا جاسکتا ہے

(۴) ہمایوں، کی ادابت جذب میاں بشیر احمد صاحب نے لے (اکن) ہیر سٹریٹ لکھے قابل ہمتوں میں ہے۔ اس کی ترتیب میں معانین کے معنی بلند معیار ہی کا خیال نہیں رکھا جاتا، بلکہ تنوع کا بھی اتنا خیال رکھا جاتا ہے کہ ہر چہ مختلف قسم کے مذاق کے لوگوں کے لئے یکساں مادیاب قوم ہوتا ہے۔

(۵) ہمایوں، کے معانین معنی بڑا معلومات ہی نہیں ہوتے، بلکہ ابتداء و رہے کے دلچسپ بھی ہوتے ہیں۔ اس لحاظ سے ہمایوں آپ اپنی نظیر ہے۔

(۶) ہمایوں، صاحب دہان کے لحاظ سے ذمہ پنجاب بلکہ ہندوستان بھر کے مستند ترین رسائل کی صفحہ اول میں شمار ہوتا ہے۔

(۷) ہمایوں، میں علمی و ادبی، تاریخی و مذہبی معانین، دلکش اسٹائٹ اور ڈرامے، ہاکیرو، نفیس، مزاحیہ مقالے، بشری، مغربی رسائل، کے دلچسپ و انتہا مسات اور ملک کی موجودہ ادبی تحریکات کے متعلق نہایت پیش رفت الامعات شائع کی جاتی ہیں۔

(۸) ہمایوں، ایک کے محکمہ تعلیم کی طوط سے منظر شدہ ہے، ہندوستان اور بیرون ہندوستان میں بے انتہا مقبول ہے۔

(۹) ہمایوں، کے کاغذ، کتابت، طباعت اور تعداد پر دفعہ و پر دل کھول کر روپیہ صرف کیا جاتا ہے۔

(۱۰) ہمایوں، کے سالگرہ، خبر، اور دیگر خاص خبروں کے لئے کوئی ذرا قیمت نہیں لی جاتی۔

چند سالانہ پانچ روپے چھ آنے، ہشتا ہی تین روپے، مع محصول ہے

خاکسار منیجر رسالہ ہمایوں لاہور

ہندوستان کے مشہور رسالہ کلمہ کیلئے دیانتدار اور مختصر اخبار کی ضرورت ہے

# بنام قوت و حیات

## کلیں و صلا

آگے گئی صدیوں ہے فنا نہ اپنا  
پہرہوں کوٹنے جا تا نہ اپنا

آگے گانہ جانے کب زمانہ اپنا  
قدرت بلا ہے محبکہ صدیق حکم

منظور سنده

ڈاکٹر ان تعلیم

سہ ماہی چندہ دو روپے

ریاستہائے میور۔ پیالہ وحیدر آباد دکن

سالانہ چندہ پچھ روپے

قیمت فی پرچہ نو آنے

ششماہی چندہ تین روٹھ آنے

### فہرست مضامین رسالہ کلیم بابتہ جون ۱۹۳۸ء عیسوی

| نمبر | مضمون نگار              | عنوان | نمبر | مضمون نگار | عنوان |
|------|-------------------------|-------|------|------------|-------|
| ۱    | اشعارات                 | ۱۳    | ۱۳   | ۱۳         | ۱۳    |
| ۲    | سرہار دار۔ شہر دار۔ کرم | ۱۴    | ۱۴   | ۱۴         | ۱۴    |
| ۳    | رقم                     | ۱۵    | ۱۵   | ۱۵         | ۱۵    |
| ۴    | مدالہ جوہرات            | ۱۶    | ۱۶   | ۱۶         | ۱۶    |
| ۵    | تفہیم (نظم)             | ۱۷    | ۱۷   | ۱۷         | ۱۷    |
| ۶    | جادوئی کے مختلف رنگ     | ۱۸    | ۱۸   | ۱۸         | ۱۸    |
| ۷    | حق یکتا دار و سید       | ۱۹    | ۱۹   | ۱۹         | ۱۹    |
| ۸    | ہندوستان فی ادب میں     | ۲۰    | ۲۰   | ۲۰         | ۲۰    |
| ۹    | نقد (نظم)               | ۲۱    | ۲۱   | ۲۱         | ۲۱    |
| ۱۰   | عشق است ہزار دلگاہی     | ۲۲    | ۲۲   | ۲۲         | ۲۲    |
| ۱۱   | درس غیرت (نظم)          | ۲۳    | ۲۳   | ۲۳         | ۲۳    |
| ۱۲   | افسانہ نگاری            | ۲۴    | ۲۴   | ۲۴         | ۲۴    |

(جسٹس اے۔ اے۔ جی۔ پرنٹرز پبلشرز صاحب المطبعہ دہلی میں چھپوا کر کلیم واقعہ صوفی (اس پریم ویرا گج دہلی سے شائع کیا)

# اشتراک

مدیر

## ایک صحیح ترین پیش گوئی

ہر پیش گوئی یہ دلی تباہی ہے کہ اُس کی پیش گوئی صرف صحیح ثابت ہو۔ لیکن بعض اوقات حالات کی نوعیت کچھ ایسی ہوتی ہے کہ پیش گوئی یہ تباہی کرتا ہے کہ اُس کی پیش گوئی کا ایک جزو بھی صحیح نہ ہو سکے۔

لیگ اور کانگریس کی مصالحت کے واسطے اس وقت جو گفت و شنود کا سلسلہ جاری ہے، اور جس کے باب میں خوش عقیدہ حضرات بہتر توقعات قائم کئے ہوئے ہیں، اُس کے بارے میں میری یہ پیش گوئی ہے کہ مصالحت کی تمام گفت و شنود قطعی بے نتیجہ اور بے استحاد کے تمام سیاسی عقیدے غیر شکور رہیں گے۔ اور ہر چند کہ میرا جانتا ہوں کہ جو کچھ میں کہ رہا ہوں، صرف حرف ایسا ہی ہو گا۔ پھر بھی میری یہ دلی آرزو ہے کہ کوئی لطیفہ فیہی ایسا پیدا ہو جائے کہ میری یہ پیش گوئی ہر صورت سے جھوٹی ثابت ہو کر رہ جائے۔

میری اس پیش گوئی کی بنیاد معاذ اللہ یہ نہیں ہے کہ میں لیگ و کانگریس کے اتحاد کا حامی نہیں ہوں، اور خدا بخواتین یہ چاہتا ہوں کہ ان دونوں جماعتوں کے درمیان کبھی صلح نہ ہو سکے۔ کیونکہ ان دونوں جماعتوں کے درمیان عدم اتحاد کی وہی آرزو کر سکتے ہیں جس کا دل و دماغ قنداری کے مرض سے مآذت ہو چکا ہے۔ نیز میری اس پیش گوئی کی بنیاد یہ بھی نہیں ہے کہ میں سوشلزم کا مرعوض ہوں، اور میرا دماغ اچھے خیالات کی

روشنی سے محروم ہے، کیونکہ میں اپنی زندگی میں ہر قدم پر اس کا تجربہ کرچکا ہوں کہ میری ہر شے کو حسن ظن کی اتنی کثیر مقدار و دلالت کی گئی ہے کہ جب تک کسی شخص کی بُرائی دو اور دو چار ہو کر میرے سامنے نہیں آجاتی ہے میں اُس کے متعلق بُری رائے قائم کرنے کے تمام تصورات سے روگرداں ہی رہتا ہوں۔

اصل میں میری اس پیش گوئی کی بنیاد یہ ہے (الف) لیگ کے قائدِ اعظم، مسٹر جناح کی ذات، اور (ب) مسلم لیگ کے اربابِ عمل و عقل کی ذہنیت۔

(الف) لیگ کے قائدِ اعظم، مسٹر جناح کی ذات۔

مسٹر جناح کی ذات، ہندو مسلم مصالحت کی راہ میں سب سے بڑا پھاڑ ہے۔ کیونکہ مسٹر جناح کے ضمیر میں یہ بات داخل ہے کہ وہ زندگی کی ہر منزل، اور حیات کے ہر میدان میں سب سے آگے اور سب سے پیش پیش رہیں۔ اور اس قدر پیش پیش، ہیں کہ اُن کے رفقاء میں سے کوئی اُن کی گرد کو کچھ نہ چھو سچ سکے۔ یہ الفاظ دیگر مسٹر جناح ہر صفحے میں ایک دیوتا بن کر رہنا چاہتے ہیں، اور دیوتا بھی ایسے جو وحدۃ لاشریک نہ ہوں۔

خدا ہرے کہ یہ بلا شرکت، وحدت، انھیں کانگریس کے حلقے میں بسر ہی نہیں ہو سکتی، کیونکہ کانگریس کے جمہوی والٹیر بھی اس قدر قربانیاں



کے آزادی کی دشمن طاقتوں کے خلاف ایک ایسا متحدہ محاذ قائم کریں گے کہ دیوبند کے لئے خون کا فوارہ جاری ہو جائے گا۔

## پروفیسر محمود شیرانی

آدمی جب بوڑھا ہو جاتا ہے تو اس کے علم پر جانی آتی ہے، علم کی دیوبی کا مزاج، تمام عالم کے سمیٹوں سے مختلف و متضاد واقع ہوا ہے، ہر حسین دیوبی نوجوان کے آغوش کی طالب ہوتی ہے۔ مگر علم کی دیوبی نوجوانی کو حقارت کے ساتھ دیکھتی ہے، اور پھر انسانی کے آغوش کو ترجیح دیتی ہے۔ میرا تیس مرحوم نے اسی حقیقت کو یوں بیان کیا ہے اسے

گھٹا زور، مشت سخن بڑھ گئی

ضعیفی نے ہم کو جواں کر دیا

علم کے منبر سے کسی شخص کو اس مذکرے ساتھ آنالینا کہ وہ بوڑھا ہو گیا ہے ایک نہایت خطرناک قسم کی چہالت ہے، اور یہ وہ چہالت ہے جس کا مظاہرہ پنجاب یونیورسٹی کر رہی ہے۔

سننے میں آیا ہے کہ پنجاب یونیورسٹی ہندوستان کے مایہ ناز ادیب اور مستند فاضل پروفیسر محمود شیرانی کو اس محکمہ فیر علت پر وظیفہ دے رہی ہے کہ وہ پچھن سال کی زد میں آ گئے ہیں۔

کیا کالج کی پروفیسری، کوئی پوسٹ یا فوج کا حکم، یا پہلو اڈوں کا اکر ڈھ ہے، جہاں جسم کی فرہی اور عمر کی نارسیدگی ہی سب کچھ سمجھی جاتی ہے؟

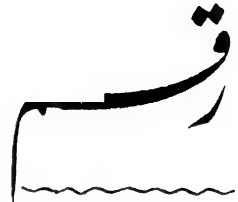
پنجاب یونیورسٹی کو معلوم نہیں کہ علم کا پارہ ۱۰۰ سال کی گرمی سے چڑتا ہے، اور جس قدر عمر بڑھتی ہے اتنا ہی علم میں اضافہ ہوتا اور تجربہ بڑھتا جاتا ہے۔ کیا اُسے یاد نہیں کہ برائن کو پھر انسانی میں پروفیسری پیش کی گئی تھی؟ اور کیا پنجاب یونیورسٹی کو علم نہیں کہ نوجوان بی لے، ایم لے، اور تو سال پی ایچ، ڈی، ہرگز اس قابل نہیں ہوتے کہ پروفیسری کی سی اہم ترین خدمت انجام دے سکیں۔ کیا وہ پروفیسری کو ایسا سمجھتی ہے کہ عمر کی کاسچہ انڈا ٹھکاکر باہر نکلا، اور فوراً دانہ چھٹکے لگا؟

میرا یہ بڑے ماہرین کے عمر کی بنا پر کسی پروفیسر کو وظیفہ نہ دیا جائے، لیکن جب تک کسی پروفیسر کی آنکھوں میں روشنی، بات پاؤں میں چنگھ، پھر نے کی شکست اور دماغ میں تدبیر و تفکر کی قوت باقی ہے، یا پالٹا دیکر جب تک کوئی پروفیسر ماہی حیثیت سے سسٹھا نہیں جاتا، اُسے یہ حق حاصل ہے کہ وہ کام کرتا رہے، اور اُسی وقت تک کام کرتا رہے جب تک کہ قدرت اُس سے کام کرنے کی صلاحیت دھچپن لے۔ پروفیسر کوئی چل نہیں کر سکیے ہی وہ چنچت ہو جاتا ہے، شاخ سے میوہ کر دیا جاتا ہے؟

اُس نے ہم نہایت روشن، گرم اور گرجتے ہوئے الفاظ میں پنجاب یونیورسٹی کو آگاہ کر کے ہیں کہ وہ یونیورسٹی کو پروفیسر محمود شیرانی کے علم اور تجربے سے محروم کر کے ایک ایسی چہالت کا ارتکاب نہ کرے، جس پر بے عمل بھی قہقہہ مار سکتی ہے۔

ظاہر کیا کہ دولت ہے صفائی بچی  
شکرتا کہ دل کو، دلربائی بچی  
بیگا نہ دوشی پایا شطرنج کی دنیا  
نہادان اکمال آشنائی بچی  
چش

زیرِ سکہ تاریخ زندگانی ہو جائے  
تمہیدِ الم نشادمانی ہو جائے  
ہاں یا عینِ سبزی سے خدا را بشنایا  
سکھن ہے کل عدد جانی ہو جائے  
چش



## فیضی پراجے

کا سودا سلف، یا اور چھوٹی موٹی ہتھیار، ہاں اس کی پیداواری حیثیت جنگ کے پیش نظر روز بروز محکم سے محکم تر ہوتی جاتی ہے۔

نمبر ۲۔ رقم وقار۔ موجودہ دور میں بیشتر غلام یا سہانہ ممالک میں مانا جاتا ہے۔ یہ ذہنی اقتصادیات میں لازمی عنصر ہے اور نہ باقی تین رقم میں سے کسی کی محسوس نمائندگی ہی کرتی ہے، یہ رقم محض شاہی حکومت وقت کے وقار کی نمائندہ ہے، اور اس کی حثیت کا تمام تر انحصار حکومت کے دبہ اور طاقت پر ہے، اس کا دوجہ کاغذی نمبر سے ہیں، جن پر حکومت کے نمائندہ کی طرف سے رقم دھات کی مقررہ تعداد کے ادا کرنے کا وعدہ تحریر ہوتا ہے، لیکن جب کبھی بھی مردہ حکومت کے وقار کو نقصان پہنچتا ہے یا کسی دوجہ سے خطرے میں پڑ جاتی ہے تو اقتصادی نمائندگیوں میں اس کاغذ کے پرزے کی، دی کاغذ کے سوا، کوئی قیمت باقی نہیں رہتی۔ جنگ غلغلیہ کے بعد اس رقم کا رواج کسی بھی ترقی یافتہ ملک میں نہیں رہا۔ یہ رقم حکومت کو لوٹ (Expenditure) کے مواقع بھی نہیں جاتی ہے، اس کے رواج سے رقم دھات سمٹ سٹا کر حکومت کے قبضہ میں چلی جاتی ہے، اور رقم پیداوار پر حکومت کا غلبہ برقرار رہتا ہے، اس طرح عوام محض اس وقاری کاغذ سے مزید بات پورے کرتے رہتے ہیں، اور حقیقی رقم دھات، اور پیداوار کے قبضہ سے محروم ہو جاتے ہیں، اگر شہنشاہی حکومت ملکی ہو تو رقم دھات معمولاً جتنی ہے اور رقم پیداوار کو کبھی زیادہ سے زیادہ، ہتھیاروں میں رقم دھات سے سہل کر

موجودہ دور رقم میں جبکہ انسانیت رقم کی محتاج محض ہو کر رہ گئی ہے رقم کی حقیقت و ماہیت پر فکر و غور، اور اس کی ابتدائی دارلقتانی حیثیت کو جاننا ضروری ہے۔ موجودہ وقت میں رقم پارٹیکلین اختیار کر چکی ہے، اور یہ چاروں ذریعہ ہیں۔

رقم دھات۔ سکہ، سونا، چاندی، پتیل، تانبا، لوہا وغیرہ  
رقم وقار۔ شہنشاہی نوٹ، ڈانٹا کے سرٹیفکیٹ، حکومتی قرضہ بانڈ وغیرہ۔

رقم اعتماد یا بی۔ چیک، ہنڈوی، بینک نوٹ، اسناد تبادلو وغیرہ۔  
رقم پیداوار۔ غلہ، روٹی، کوئلہ، تیل، مصنوعات وغیرہ۔

نمبر ۱۔ رقم دھات کی دو قسمیں ہیں، اعلیٰ ادائی، اعلیٰ کیاب دھاتوں پر مشتمل ہے، اور ادائی عام یا ب دھاتوں پر۔ اعلیٰ کا تو عوام سے بہت کم تعلق رہ گیا ہے۔ یہ زیادہ تر حکومتوں کے ذریعہ صرف ہے، اور حکومتوں کے اعتماد اقتصاد کی کے یقین کا کام دیتی ہے، اور کبھی کبھی دولتوں کے جنگی قرض اور تادان ادا کرنے میں بھی استعمال ہوتی ہے اور ادائی روز بروز اپنی وقائی حیثیت کھو کر پیداواری حیثیت اختیار کر رہی ہے، اس وقت اس ادائی رقم دھات سے اقتصاد کی لحاظ سے بہت کم کام لیا جاتا ہے۔ یہ صرت ادائی دوجہ کی ضروریات کی تکمیل، اور لین دین میں کام آتی ہے۔ شکار و غور

کروہتے ہیں، یہی نوٹ عوام سے رقم دھات اور پیداوار، کچھ کچھ کار اس اداؤ کے تصرف میں لے آتے ہیں۔ اب اُن کی ساکھ بڑھ جاتی ہے۔ باقی میانہ سرمایہ دار (Bourgeoisie) اور نیچے سرمایہ دار (Petty Bourgeoisie) اپنا اپنا سرمایہ ان اداروں میں جمع کر کے حساب کھولا لیتے ہیں، اقتصادیں مشینوں میں ایسے اداروں کی ساکھ بڑھ جانے کی وجہ اب لین دین ایسی ادارہ کے نام کے حامل کاغذ ہے۔ چیک یا ہینڈوسی سے ہونے لگتا ہے، اس طرح رقم اسی ادارہ میں ایک کے حساب سے دوسرے کے حساب میں منتقل ہوتی رہتی ہے، لیکن اصل رقم دھات یا رقم بینکار پر قبضہ بدستور اسی جماعت کا رہتا ہے، یہاں بھی اگر یہ ادارے دیسی ہوں تو قوم کا سرمایہ حکومت کے حدود کے اندر محفوظ رہتا ہے، اگر بدیشی ہوں تو تمام سرمایہ اُن مالک میں منتقل ہوتا ہے جن کی وہ ملکیت ہیں۔ اس طرح اداروں کے مالک مالک کے سرمایہ داروں کی ملکیت روز بروز بڑھتی رہتی ہے، اور جسمی غیر ملک میں یہ ادارے کام کر رہے ہوں وہاں کے عوام روز بروز بحال سے بد حال ہو کر اقتصاد کا محاذ سے اُن کے محتاج ہو جاتے ہیں، اس طرح سے برطانیہ کا ایک بھاری ادارہ (The Imperial Bank of Persia) بینک ہینشہی ایران - احمد شاہ قاجار ابتدائی عہد سے لے کر رضا شاہ پہلوی کے ابتدائی دور تک، ایران میں ایرانی نام لیکن انگریزی ملکیت سے کام کرتا رہا ہے اب چار سال پیشتر پارلیان ایران نے بند کر کے (De National Bank of Persia) بینک ملی ایران کی بنیاد رکھی، ہندوستان پر آج کل رقم دھات، اور رقم افتادہ دونوں کی فروش ہیں، اور تقریباً ایک صدی سے ہیں، اب اندازہ ہو سکتا ہے، کہ بچا رہے ہندوستان کے عوام کی مالی حالت کیا رہ گئی ہوگی، اس وقت مندرجہ ذیل بڑے بڑے بینک ہندوستان میں مصروف کار ہیں۔

برطانیہ عظمیٰ

- |                              |                                   |
|------------------------------|-----------------------------------|
| (۱) لائیڈ بینک آف انڈیا      | (۲) مرکٹنل بینک آف انڈیا          |
| (۳) چارٹرڈ بینک آف انڈیا     | (۴) نیشنل بینک آف انڈیا           |
| (۵) گرینڈ بینک آف انڈیا      | (۶) بینک آف انڈیا                 |
| (۷) پی ایچ ایف بینک آف انڈیا | (۸) امپیریل بینک آف انڈیا (مشرقی) |

مضونامہ کیا جاتا ہے، یہ مضونامہ بین الملی حیثیت سے حکومت کے وقار اور مدد کو بڑھاتا ہے۔ لیکن اگر حکومت غیر ملکی ہو تو اس طرح سے عجیبہ مقام سرمایہ کاروں کو قوم کے ملک میں منتقل ہو جاتا ہے، جس کے نتیجے کے طور پر ملکر ان ملک کی حکومت کی ساکھ تو بڑھ جاتی ہے، لیکن غلام ملک روز بروز نادار ہو جاتا ہے۔

نہر سو۔ رقم اعتدال دبا بھی۔ یہ رقم دھات اور کسی حد تک رقم پیداوار کی نمائندگی کرتی ہے، اس رقم کا وجود بینکوں، یا جسمی سوسائٹیوں، اور اجتماعی اداروں سے ظہور میں آتا ہے، یہ جن رقم کی نمائندگی کرتی ہے اس پر صرف، مندرجہ بالا اداروں کو قائم کرنے والی سرمایہ دار جماعت کا قبضہ رہتا ہے، اور عوام اس جماعت کے توسط (Medium) سے اپنی مزدوریت ناجتے رہتے ہیں۔ اس سے ایک فائدہ تو ہوتا ہے کہ انسانیت صرف ایک ہینشہ کی امتیاج سے نجات پا کر ایک جماعت کی دست نگر ہو جاتی ہے، یہی بینس بلکہ خود ہینشہ اس جماعت کا محتاج ہو جاتا ہے۔ لیکن دوسری طرف سے، زیادہ اور منظم ہونے کی وجہ، اس جماعت کی سرمایہ دارانہ گرفت ہینشہ کی گرفت سے زیادہ سخت اور مضبوط ہوتی ہے، جس کے اثر سے یہ جماعت تو لامال۔ لیکن عوام زیادہ نادار اور محنت ہو کر رہ جاتے ہیں، یہ سرمایہ دارانہ نظام کی سنگ بنیاد ہے، اس وقت امریکہ انگلستان اور جاپان میں اسی رقم کا دور دورا ہے ۱۹۲۵ء کے دوران میں ہر سال برطانیہ ملکی نے کل لین دین کا تقریباً ۳۱-۴۲ فیصدی اور امریکہ نے ..... ڈالر کا لین دین اسی رقم کے ذریعہ کیا، اور جاپان نے کل لین دین کا ۹۱.۸ فیصدی اس رقم کے ذریعہ کیا کیا۔ اس کا وجود لین دین میں ملتا ہے۔ چند سرمایہ دار ملک ایک ادارہ، بینک یا انجین رقم (Money Society) کے نام سے، اپنے سرمایہ کو ملا کر قائم کر لیتے ہیں، اور اس پر جمع شدہ سرمایہ کا کچھ فیصدی (Some Percentage) حکومت وقت کے پاس ضمانت کے طور پر رکھ کر اپنے ادارہ کے نام سے نوٹ اور ہینڈیاں (Drafts) جاری

(۱) The Communist answer to the world's needs: - by Julius F. Hecker. P. 34. ch. III.  
(۲) Japan Finance, By B. Koba Jishi. P. 79.

## امریکہ

(۱) دی سنٹرل بینک آف نیویارک (۳) امریکن ایکسپریس بینک

## جاپان

(۱) سنٹرل بینک (۲) یوکوباہا پس بینک (۳) سنٹرل کیش بینک

## باقی ممالک

(۱) نیدرلینڈ ٹریڈس بینڈش بینک (۲) نیدرلینڈ ٹریڈنگ سوسائٹی

## ہندوستانی

(۱) دی سنٹرل بینک آف انڈیا (۲) دی پنجاب نیشنل بینک آف انڈیا

(اس کے علاوہ کئی اور جو ملے مرنے ہندوستانی بینک ہیں، لیکن

اُن کی حیثیت ایک واحد سا ہو کار کے کاروبار کے کاروبار سے بھی کہے

اس لئے درج نہیں کئے جاتے)

ان کے علاوہ بے شمار غیر ملکی تجارتی ادارے ہیں جو بلیکنگ بھی کرتے

ہیں جن میں سے بڑے بڑے مندرجہ ذیل ہیں۔

## برطانیہ عظمیٰ

(۱) رائل برادرز (۲) والٹر برادرز (۳) فارنس فارنس کیمبل (۴)

ڈیوڈ سنسن (۵) ای۔ ڈی۔ ساسن (۶) بی اینڈ او کمپنی (۷) سٹینلین بیکنری

## جاپان

(۱) سنٹرل بوسان کیش (۲) سنٹرل بوسان کیش (۳) نیپن بوسان کیش

(۴) اوسا کیش (۵) جاپان کاشین کیش۔

امریکیٹ ممالک کے سرمایہ دار اپنے زیر اثر ممالک کے عوام کو کس

طرح تخت و تاراج کر کے، اور بکچہ لوٹ کر فائدہ کبھی پر مجبور کر دیتے ہیں

اس کا تصور ابھرتا اندازہ مندرجہ بالا اداروں کے اعداد و شمار سے

## میں

نہیں۔ رقم پیداوار حقیقت میں بھی وہ رقم ہے جس پر بقیہ تین رقم کا

بنیادی انحصار ہے، اور یہی وہ رقم ہے جو انسانی ضروریات کی تکمیل میں کام

آتی ہے۔ اور اسی سے رقم کے لحاظ سے انسانیت سب سے پہلے متاثر

ہوتی۔ اس پر زیادہ سے زیادہ تعداد میں قبضہ حاصل کرنے کے لئے

چالاک و دغاؤں کے رقم کی بقیہ تین اشکال کو ایجاد کیا، اور انہی تین نئی

اشکال نے انسانیت کو موجودہ ہائے دہریں مبتلا کر کے ایک دوسرے

سے لڑایا۔ اور فدا ہو پائی۔ چند ایک کو لوٹ کے اور عوام کو ملنے کے مواقع بہم

پہنچائے۔ اس ابتدائی رقم میں چند افراد کی چالاکئی نے تغیر تبدیل پیدا کیا اور

رفتہ رفتہ تبدیل شدہ اشکال و ادراج پذیر ہوئی گئیں۔ اور یہ ابتدائی رقم معصوم

عوام کا نام سے گردہ لگی۔ پہلے جہاں رقم پیداوار انسانی ضروریات کے درمیان

معیار جہاں دل کا کام دیتی تھی، اور حاجت کی تکمیل کے بعد زائد تھا دل کی ضرورت

بھی محسوس نہیں ہوتی تھی۔ اب رقم دھات۔ رقم دھار۔ اور رقم اعتماد معیار بدل

کی حیثیت اختیار کر گئے اور ابتدائی رقم جنس خام کی شکل میں عوام میں تبدیل ہوئے

گئی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پہلے جہاں ضرورت کی شکل میں عوام سے ہوتا تھا، یعنی

بے گنتی ہڈی کر کے جو لاپس کو نقد پڑا، اور جو بے گنتی کر کے کاغذ کر کے

لے کھڑا بنا، اب اجناس کا تہا دل ہوئے لگا، ضرورت کی بنیاد پر نہیں بلکہ حکمت

کی بنیاد پر۔ یعنی پہلے اگر ایک جو لاپس دس ہاتھ کپڑا پر نہیں ملتا تھا اور اس کی

ضرورت صرف دو ہاتھ سے ہونے کر پڑے سے پوری ہو جاتی تھی تو وہ زائد نہیں

ہوتا تھا۔ اور بقیہ وقت آرام میں گزارتا تھا، لیکن اب وہی جو بے ضرورت سے

قطع نظر، استطاعت کار کے ذریعہ، حکمت کو بڑھانے کے لئے زیادہ کام کرنے

لگا، تاکہ ضرورت کو پورا کر کے خالص مصنوعات سے زیادہ سے زیادہ رقم پیداوار

پر قبضہ کیا جاسکے، اور چونکہ رقم پیداوار کی فائدہ مند رقم دھات میں موجود تھی،

اب رقم پیداوار رقم دھات میں تبدیل ہو کر رہنے لگی۔ اس عمل کا نتیجہ عیاں

ہے، انسان کی ملکیت کے لالچ میں ضرورت سے زائد پیدا (Produce)

کرنے لگے، اور خالصتاً (Excess Production) پیدا ہونے

لگا۔ رقم پیداوار تو ذخیرہ ہو نہیں سکتی تھی، اس لئے بخت کو محفوظ کرنے کے

لئے رقم دھات میں بدلنے کی ضرورت محسوس ہوئی، اور رقم دھات سے زیادہ

سے زیادہ ادراج پذیر ہوئی گئی، ابتدا میں یہ خالص حاصل دستکاروں کے پاس

جمع رہا۔ بعد میں عقل نے دستکاری پر فتح حاصل کی سرمایہ بھی اہل فکر (

Capitalism) کے پاس منتقل ہو گیا، اور پھر کھینچنے پھینچنے (انسانیت کو تہم

دنیا میں صرف چند افراد یا جماعت کے زیر تصرف آ گیا، محدود ملکیت نے عوام

کی مانگ اور مقبولیت کو بڑھایا۔ رقم پیداوار کی ضرورت (حاجت) کے باوجود،

دقت گرتی گئی اور انسان زیادہ سے زیادہ رقم دھات حاصل کرنے کے لئے

استطاعت سے زیادہ مصروف کار رہنے لگے، لیکن اس مصروفیت اور زائد

محنت کے باوجود رقم دھات کا زائد معمولی کم نہ ہو سکا۔ رقم دھات کی ملک

آواز بلند ہوئی اور یہ خیال عام ہوا کہ اگر رقم ذاتی ملکیت کی بجائے عوام کی مشترک ملکیت پر اور حکومت عوام کے وسیع انتخاب کے ذریعے اجتماعی شکل میں قائم کر دی جائے اور وہ زمین، زمین، زمین اور ہر بہتر شے سے درجہ اتم کام سے کرنام انسانیت کی ضروریات کو مہیا کرنے کی ذمہ دار ہو تو مشکلات کا حل ہو جائے گا۔ چنانچہ سب سے پہلے **سوشلزم** نامی جمہوریت میں جمہوریت کے عظیم انسان انسان کا دل مارنے سے اس خیال کو عام کیا اور اسی خیال نے نظمی شکل "سوشلزم" اختیار کیا۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ کیا فی الواقع ہمیں رقم دھات کی ضرورت ہے یا نہیں؟ ہم رقم دھات کے محتاج ہیں؟ کیا رقم پیداوار نظام حیات کے لئے کافی ہے؟ میرے خیال میں رقم دھات، ایک ناقص و فضول عنصر اقتصادیات ہے اور نظام حیات میں ہمیں اس کی قطعی ضرورت نہیں۔ موجودہ دور میں بھی جہاں تک اجتماعی لین دین کا تعلق ہے دو تیس رقم پیداوار ہی سے کام لیتی ہیں، اس وقت جاپان کے ہندوستان، مصر، اور آسٹریلیا سے اقتصادی معاہدے بار کرسمس کے تحت ہیں۔ جن سے نمایاں اور یہ ہے کہ جاپان ایک لاکھ دین کی روٹی ہندوستان سے لے گا اور بدلے میں ایک لاکھ دین کی کپڑا دے گا، بنگلہ دیش (بنگلہ دیش) جاپان کا چاندی کا سکہ۔ رقم دھات کا واسطہ اختیار کیا گیا ہے۔ لیکن ادائیگی اور لین روٹی اور کپڑے میں ہے۔ اسی طرح روس کے اقتصادی معاہدات چین، افغانستان، ایران اور ترکی سے تبادلہ اجناس پر ہیں، رقم کی ادائیگی پر نہیں۔ جاپان — آسٹریلیا — روس — سوشلسٹ چین، سوشلسٹ ملک عوام کے لئے روا رکھتا ہے وہاں اپریٹ عزت حکومت یعنی چند سرمایہ داروں کے لئے جائز قرار دیتا ہے باقی کے لئے نہیں۔ عوام کو دہانے اور لوٹنے کا واحد ذریعہ رقم دھات ہے لیکن سوال پیدا ہوتا کہ کوٹ کیسے ہوتی ہے؟ ایسے مثلاً زمین کے دوسرا دی

جماعت نے پیداوار کی کثرت کے پیش نظر پیداوار اور دھات کے معاوضہ کی شرائط کو متحرک کر دیا، پہلے جہاں ایک تول چاندی کے لئے دس دن محنت کے حاصل کی ضرورت تھی اب وہی تول چاندی ۲۰ دن محنت کے حاصل سے بھی دستکار کو دستیاب نہ ہوتی۔ اب ایک طرف تو رقم دھات گراں ہو گئی، دوسری طرف ضروریات حیات "محنت" کی بجائے رقم دھات کی محتاج ہوئی اور تیسری طرف مصرفیت حد سے زیادہ بڑھ گئی۔ اس عمل سے جہاں رقم دھات کو کچھ کم کر دیا اور اس کے قبضہ میں آئی گئی وہاں عوام محنت کے باوجود ضروریات حیات کی تکمیل سے عاجز آ گئے، رد عمل لازمی تھا، بدلتی چھا گئی۔ انسانیت استقامت سے زائد محنت سے تنگ آ گئی۔ اب اہل خیال (*Intellect*) نے موجودہ پیداوار کی مقدار کو قائم رکھنے اور پھر بڑھانے کے لئے مشینری ایجاد کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پہلے جو چیز زائد محنت سے کم تعداد میں حاصل ہوتی تھی، اب کم محنت سے زائد تعداد میں حاصل ہونے لگی، نئے ہونے عوام کو ان ایجادات سے کچھ دیر آرام کرنے کا موقع مل گیا اور مشینری روز بروز مقبول سے مقبول تر ہو کر بڑھنے لگی، ضروریات لین و غنت محنت کے رقم دھات کے عوض مشینری حاصل (*Mechanical Production*) سے پوری ہونے لگیں۔ لوگ آسودہ ہوتے گئے

جب سابقہ زائد محنت سے حاصل کردہ محفوظ بحیثیت مشینری حاصل کے ذریعے سرمایہ دار کے قبضہ میں جا چکی۔ تنگ آ کر رہی، اور ضروریات کو پورا کرنے کے لئے رقم دھات کی ضرورت محسوس ہوئی تو لوگ کام کے متلاشی ہوئے۔ آپ کام کہاں تھا۔ کام پر تو مشینیں چھا چکی تھیں یعنی دیکھاری کا دور دورا ہوا۔ کچھ لوگ تو ایجاد مشینری کے ذریعے کام چلانے کے لئے تعلیم کی طرف راغب ہوئے، بڑی بڑی یونیورسٹیاں کھلیں۔ لیکن وقت کی رفتار کے ساتھ ساتھ مشینری میں بھی ترقی ہوئی گئی، پہلے جن مشین پر ۱۰ آدمی کام کرتے تھے اب وہ ایک آدمی کی مدد سے پہلے سے زائد کام کرنے لگی، تعلیم روز بروز باریک سے باریک تر ہونے کی وجہ سے ہنگامی ہوتی گئی۔ اور آمدنی کے ذرائع کم ہوتے گئے عوام افلاس و بیکاری سے تنگ آ کر زندگی سے عاجز آ گئے۔ اس نئی زندگی نے خدایاں نسل انسانی کو حقیقت حال پر غور و فکر پر مجبور کیا اور محسوس ہونے لگا کہ اس نئی کی سب سے بڑی وجہ رقم دھات، اور اس کی نامائندگی کے تحت رقم دھات اور رقم اقتدار، اور ان کی ذاتی (کسی) ملکیت ہے، ان کے خلاف

Basic Principles for Scientific Socialism  
A.S. Sacks.

۱۱) سوشلزم کے بنیادی اصولات کو سمجھنے کے لئے مندرجہ ذیل کتاب معاون ثابت ہوگی،  
۱۲) ڈاکٹر کمال داکٹر (۱۲) ہسٹری آف سوشلسٹ ٹھاٹ  
(History of Socialist Thought)  
H.W. Laidler (Socialist Thought)

۱۳) بارکرسمسٹ۔ روسی کے سماجی دوسے اجناس کا تبادلہ، ضرورت کی بنیاد پر، اجناس سے ہوتا ہے  
Socialism - A History  
J. Stalin - Leninism.

مکرم دہلی میں جن میں سے ہر ایک کی کاشت پر پانچ روپے اور دو کاشتکاروں کی دن کی محنت صرف ہوتی ہے، ایک پر ایک ایسے شخص کا قبضہ ہے جو سڑیہ دار ہے۔ لیکن خود محنت نہیں کرتا بلکہ اجرت پر کرداتا ہے، امداد دوسرے مکرم دہلی کے مالک دو کاشتکار ہیں جو خود محنت کرتے ہیں۔ اس کاشت کا کل یوں ہوگا۔

(۱) سرمایہ دار کا ملوکہ ٹکڑا۔

زمین + صرفہ کاشت ۵ روپے + دو کاشتکاروں کی دس دن کی مزدوری ۸ روپیہ = ۱۰ روپے کل = زمین + ۱۵ روپے = حاصل = ۲۵ من غلہ در ۵ روپے فی من = ۱۰۰ روپے۔  
۵ کاشتکاروں کا مقبوضہ ٹکڑا۔

زمین + صرفہ کاشت ۵ روپے + دو کاشتکاروں کی دس دن مزدوری بلا اجرت کل = زمین + ۵ روپے حاصل = ۲۰ من غلہ در ۵ روپے فی من = ۱۰۰ روپے۔

اس مثال سے صاف واضح ہے کہ سرمایہ دار سرمایہ کے باوجود محنت کا حصہ لیتا، لیکن کاشتکار سرمایہ کا محتاج صرف صرفہ کی حد تک متناہی اگر سرمایہ دار کل کام کا پچھلے حصہ احتیاج رکھتا تھا تو کاشتکار سرمایہ کا احتیاج کے لحاظ سے صرف پچھلے حصہ احتیاج میں اتنا فرق ہے وہاں اس کے برعکس حاصل کی تقسیم میں زمین و آسمان کا مندرجہ بالا دونوں ٹکڑوں پر کام کرنے والے مفتی افراد پر تقسیم حاصل مندرجہ ذیل تناسب سے ہوگا۔

(۱) سرمایہ دار کے ملوکہ کے حاصل کی تقسیم۔

حاصل ۱۰۰ روپے۔ صرفہ ۱۵ روپے = ۸۵ روپے

تقسیم صرفہ ۲ مزدور ۵ + ۵ سرمایہ دار ۸۵ روپے

(۲) کاشتکار ٹکڑا۔

حاصل ۱۰۰ روپے۔ صرفہ ۵ روپے = ۹۵ روپے

تقسیم ایک کاشتکار ۹۵ روپے ۵ روپے مزدور کا کاشتکار ۱۰۰ روپے  
اس لحاظ سے دو مزدوروں نے دو قطعات زمین پر سادی محنت کی اور حاصل محنت بھی سادی حاصل ہوا لیکن ان میں سے دو کو ۹۵ روپے فی من حاصل ہوا اور ۵ روپے فی من اس طرح مزدور کے جائز حق میں سے ۹۵ روپے فی من سرمایہ دار میں ذاتی ملکیت کی وجہ

سے کھالیا۔ درحقیقت اس نے کیا کیا کچھ بھی نہیں۔ میں نے اس مثال میں فرضی اعداد سے کام نہیں لیا۔ بلکہ ہندوستان کے موجودہ مزدوری اور نرخ کو استعمال کیا ہے۔ ہندوستانی کسان آج کل اسی شرح سے ٹٹ رہا ہے۔

انسان مخلوق ارضی کا ایک قلیل جہ ہے۔ لیکن یہ قلیل جہ سب سے زیادہ

دکھی۔ سب سے زیادہ مضطرب اور سب سے زیادہ پریشان ہے۔ کیوں؟

کیا قدرت کا خشاہد اس کو اثرات المخلوقات قرار دے کر پریشان کرنا تھا؟

کیا اس کو نیکر بند اور ذہن رسا پریشانی و اضمحلال کے لئے عطا ہوئے تھے؟

اگر دونوں سوالات کا جواب اثبات میں تصور کیا جائے تو نتیجہ لازمی یہ ہونا

چاہیے تھا کہ تمام نسل انسانی دکھی ہوتی بلا امتیاز۔ بلا تفریق۔ لیکن حالات

بالکل اس کے برعکس ہیں۔ انسان، ایک ہی بیٹ و ساخت کا انسان، دکھی

بھی ہے، شکمبی بھی، اقبال زاد پار کا یہ افراق عام حدود سے بڑھا ہوا ہے،

اس کی ایک وجہ، جو فلسفہ پارینہ کی منتی ہوئی یاد ہے، عمل تلافی جاتی ہے۔

اول تو عمل صالح و بد کی تعریف ہی فہم سے باہر ہے، ایک ہی فعل ایک ساری

کے نزدیک احسن ہے، اور دوسرے کے قریب قبیح۔ لیکن اگر دلیل کے طور پر

ایک ہی جماعت کے محدود اصولات کے تحت عمل صالح و بد کو بھی لے لیا جائے

تو اسودہ انسان بلا گناہ شاک و شبہ قیامتوں میں زیادہ مبتلا ہائے جانیں گے،

اور تنگدست کا اعلان نہ بہت حد تک صاف و صراح ہوگا، انسانی حیات

حاضر کا شاہدہ بھی پیش کرتا ہے، اور حیات کے ماقبل و مابعد حالات تک

رسائی ہمارے پس کی بات نہیں، مزید براں زندگی، علم، نظام اور اقتصادیات

کے جتنے بھی نظریے اور عکس موجود ہیں سب اسی زندگی کے مشاہدات و تفکرات

سے اخذ کردہ ہیں۔ اور جب ہم بھی اسی زندگی کے گرد و پیش کے حالات پر

نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں اقبال وادبا کے پس پردہ دوجی اسباب نظر آتے ہیں۔

خوش قسمتی ————— رقم و دولت کی افراط

بد قسمتی ————— رقم و دولت کی قناعت

بس یہ رقم ہی ایک ایسی شے ہے جو چند افراد کو خوش قسمت اور عوام کو

بد قسمت بنائے ہوئے ہے۔ ورنہ صانع کائنات نے سب کو یکساں پیدا کیا ہے

اور یکساں طور پر پرارہا ہے۔ مزید چالاک کی کا اسناد، رقم پیداوار کا رواج،

اور اس کی مساوی تقسیم، موجود ہے یعنی۔ افلاس، اور بیکاری کا داہد

عمل ہے۔



مزدی مالوزوں کے مقدسے فصل کیا کرتی تھیں، اور ثانی الذکر عدالتوں میں مالوس یا پالتو جانوروں کے مقدسے پیش کئے جاتے تھے، مقدمات کی سماعت اور ان کے پیش کرنے کے طریقے قریب قریب وہی تھے جو اس عہد میں ہیں، باقاعدہ ججوں کے حضور میں، مدعی و مدعا علیہ یا مستغنیث اور لازم پیش کئے جاتے تھے، شہادتیں قبلند کی جاتی تھیں۔ جو صلی کی جاتی تھیں، اور متخاصمین کے دلائل پیش بھی کرتے تھے۔

چودھویں صدی کے اوراق پارینہ میں ہے کہ ایک مرتبہ فرانس میں ایک بیل کو عدالت میں پیش کیا گیا۔ کہا گیا کہ اس بیل نے خنجر سرائی کے قریب ایک انسان کو ہلاک کر دیا ہے۔ مقدمہ کی سماعت ہوئی، بیل پر فرد جرم لگائی گئی اور اسے قصاص میں قتل کر دیا گیا۔ ۱۳۵۷ء میں پیرس کی پارلیمنٹ نے اس انوکھے فیصلہ پر پھر تصدیق بھی ثبت کر دی۔

۱۳۵۷ء میں فرانس کی عدالتوں نے ایک گھوڑے کو موت کی سزا دی، اس لئے کہ اس گھوڑے نے ایک شخص کو لاتیں مار مار کر موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ ۱۳۵۷ء میں اس کے ایوان داد و آئین نے قتل کے جرم میں ایک گھوڑی کو نذر آتش کر دیا۔

حیوانات کے مقدمات میں سب سے زیادہ دلچسپ اور انوکھا مقدمہ وہ ہے جو صفحات تاریخ میں فقیر سافینی کے نام سے مشہور ہے، ایک مادہ خنزیر اور اس کے چھوٹے چھوٹے چھ عدد بچوں نے ایک نوع انسان کے بچہ کو ہلاک کر کے کھا لیا۔ خنزیر کے اس لڑکے نے خاندان کو عدالت میں پیش کیا گیا۔ فرانس کے ایک مشہور و معروف قاضی ان نے جو ترجمانی اور فصاحت میں اپنی نظیر آپ تھا، مجھوس کی حمایت کی۔ یہ قادر الکلام قاضی اپنی جاودہ بیانی سے بچوں کو موت کی گنت سے بچانے میں کامیاب ہو گیا، لیکن ان کی بے زبان ماں موت کے چبڑے سے نہ چھوٹ سکی، بیچ اور جوہری دونوں نے با اتفاق مادہ خنزیر کو مجرم قرار دیتے ہوئے، اس کے لئے سزا موت تجویز کی، اور عام نمائش یوں کے دربردار عام پرائے سولی دی دی گئی۔

چند ایام کے بعد دوبارہ خنزیر کے بچوں پر مقدمہ دائر کیا گیا۔ اس مرتبہ عدالت نے فرمان صادر کیا کہ یہ بچے مخلوقہ میڈم ڈی سافینی کے سپرد رکھے جائیں۔

ایک مدت کے بعد جب حق انتظام حکومت کی حالت منتقل ہو گئی تو یہ طریقہ رائج ہوا کہ حکمران وقت اس چیز کو جس کے مصلحت دعویٰ کیا جاتا تھا مجرم قرار دیتا تھا، اس مجرم کو فروخت کیا جاتا تھا، اور اس کی قیمت راہ خدا میں خرچ کر دی جاتی تھی، اس مجرم کو دیونہ کہتے تھے جس کا ترجمہ ہے "الشدیہ قربانی"۔ دیونہ کے متعلق بیشتر احکام و قوانین وضع کئے گئے تھے، اگر کوئی انسان کسی گاڑی کے نیچے دبا جاتا تھا تو تمام گاڑی کو مجرم قرار دیا جاتا تھا، اور اگر گاڑی کھڑی ہوتی تھی اور اتفاق سے کوئی بچہ انسان اس کے کسی پینے سے ٹکرا کر ہلاک ہو جاتا تھا تو اس کی ذمہ داری تمام تربیتہ ہی پر عاید ہوتی تھی، ایک کشتی دریا میں تیرتی جا رہی ہے سو اتفاق سے کشتی میں سوار ہونے والوں میں سے کوئی شخص پانی میں گر کر فرقت ہو جاتا ہے، اس صورت میں کشتی پر مقدمہ چلایا جاتا تھا، اور اسے سخت عذوبت تصور کیا جاتا تھا، یہی کشتی اگر کسمندر پر روانہ ہوتی تھی، اور اس نوع کا کوئی حادثہ پیش آ جاتا تھا تو کشتی کو مجرم نہ سمجھا جاتا تھا، خیال کیا جاتا تھا کہ کشتی میں اتنی طاقت نہیں کہ وہ سمندر کی بے پناہ موجوں کا مقابلہ کر سکے، امریکہ کی قدیم تاریخ کا یہ واقعہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ عہد استعمار کے اوائل ہی میں ایک شخص درخت کی شاخ سے گر کر انتقال کر گیا۔ ایوان داد و آئین نے فیصلہ صادر کیا کہ اس درخت کو جلا کر خاک کیا جائے۔

یہ جملہ واقعات قدیم انسان کے صنعت عقل اور نقصان بھری پرکھنے ہوئے دلائل ہیں، اور ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ قدیم عدالتی فیصلے کیا تھے، عہد ترقی کے اخبارات و جرائد کے تقریجی کالم تھے۔

جہاں حوادث پر دعوے کئے جاتے ہوں وہاں حیوانات کو سزا دینا کرنا چندان عجیب انگیز نہیں۔ یورپ کی قدیم عدالتی دستاویزوں اور فیصلوں میں بے شمار اس نوع کی روایات ہیں جو اس دور تجرہ خیزیں کہ بدستور اس فعلی انسانی کو یاد رکھ سکتی ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ یورپ کے بعض اطراف میں حیوانات کے مقدمات فیصل کرنے کے لئے خصوصی عدالتیں قائم کی گئی تھیں۔ ان عدالتوں میں مجرم حیوانات کو معلوم یا اس کے متعلقین کے سپرد کر دیا جاتا تھا، کہ وہ خود اپنے ہاتھوں سے ان کو مزار دیں۔ یہ عدالتیں دو نوع کی تھیں۔ دینیہ اور بدنیہ۔ اول الذکر عدالتیں وحشی یا

حقیقت یہ ہے کہ اس قانون دان نے باطن و جہ اپنا فرض انجام دیا، اور باگل اسی طرح ان چوہوں کی حمایت و دفاع میں اُس نے سعی و کوشش کی، جس طرح وہ کسی امیر کبیر یا باغی رئیس کی مدافعت کر سکتا تھا۔

اُس نے عدالت سے کہا کہ چہ شہر کے اطراف و جانب میں پھیلے ہوئے ہیں، اس لیے ان کے مساکن کی تعزیت اور انہیں عدالت میں پیش کرنا چنداں ہل نہیں، جب عدالت نے اُس کے اس عذر کو قبول نہ کیا تو وہ خود چوہوں کا ٹانڈہ ہو کر عدالت میں آیا۔ اور اُن کے دفاع میں اس نے ایک پُر مغز تقریر کی جس میں اُس نے خصوصیت کے ساتھ اس امر پر زور دیا کہ چوہے جن کی طرف سے وہ نجات کر رہا ہے، اس قابل نہیں کہ عدالت میں حاضر ہو سکیں۔ ان کے مساکن ہیئت دور ہیں، اور راستہ غیر محفوظ ہے، اس لیے کہ راہ میں بلیاں اور کتے بکثرت ملتے ہیں، جن کے دست و دھن سے غلطی پاتا چوہوں کے لیے ہدیت دکھا رہے۔ اگر مذہبی یہ چاہتے ہیں کہ بہر حال میرے موکل عدالت میں حاضر کئے جائیں تو اُن کی زندگی و حیات کی ضمانت انہیں کرنا ہوگی۔

عدالت نے دعویٰ کرنے والوں سے دریافت کیا کہ کیا وہ ضمانت دینے کے لیے آمادہ ہیں، اور جب انہوں نے انکار کیا تو عدالت چوہوں کو بری کرنے پر مجبور ہوئی۔

اس سلسلہ کا ایک اور واقعہ جو سب سے زیادہ عجیب و غریب اور حیرت فزا ہے، یہ ہے کہ سوسٹر لینڈ کے شہر ہال میں ایک مرغ نے انڈیا دیا۔ وہاں کے باشندوں نے اُسے قابلِ اعتراض جرم تصور کرتے ہوئے شہر کی عدالت میں مرغ پر دعویٰ کر دیا، مرغ کو عدالت میں لایا گیا، عدالت نے شہر کے کاہنوں، افسروں اور اعیان و اشراف کے دو برو فیصلہ صادر کیا کہ مرغ کو سبقت ہوئی آگ میں ڈال کر ہلاک کر دیا جائے۔

حیوانات پر جو دعوے کئے جاتے تھے تو صرف اس خیال سے کہ ان کے اجسام میں ناپاک رو میں حلول کئے ہوئے ہیں، خنزیر یا سور اُن کی نظروں میں ناپاک ترین جانور تھا، اس لیے اس کو سخت سخت سزا دی جاتی تھی۔

عہد قدیم کے انسان کسی طرح بھی دو برو باغی اور موغیر نہیں

تھے۔ عیسویوں میں فرانس میں ایک خنزیر کو جس نے کنیہ سے متعلق زمین میں ایک شخص کو ہلاک کر دیا تھا، گرفتار کیا گیا۔ اس قابلِ خنزیر کا مقدر ایک مجلس کے سامنے پیش ہوا، جس کے ممبران ستر راہب تھے۔ مقدمے نے اپنے تمام مدالتی مدارج باقاعدگی کے ساتھ طے کئے۔ اور آخر میں حکم صادر ہوا کہ خنزیر کو بے رحمی کے ساتھ قتل کر دیا جائے۔ فیصلہ میں لگایا گیا تھا۔

ہم سب تارک الدنیا راہب ہیں۔۔۔۔۔ ہمارے رائے میں جرم کی نوعیت بدرجہ غایت مکروہ اور مسافکا نہ ہے، داد و انصاف کی تائید اور عبرت عامہ کی فرض سے ہم نے خنزیر کے لیے سزائے موت تجویز کی ہے۔“

دینی عدالتوں میں بالعموم ان جملہ مقدمات کی سماعت ہوتی تھی، جو چوہوں، چھچھو نندوں، مڈبوں، پھروں، مکھیوں، چرنبلیوں اور عام کڑیوں کوڑوں پر دائر کئے جاتے تھے۔ بیشتر حالات میں، حشرات الارض اور ایذا پہنچانے والے جانوروں کو یہ الہی عدالتیں جو سزا دیتی تھیں وہ لعنت ہوتی تھی۔ بارگاہِ خداوندی میں اگر گڑا گڑا کر دعائیں مانگی جاتی تھیں کہ وہ ان چرنبوں پر اپنی تہا ریت کے صدقے میں لعنت نازل فرمائے۔ سنہ ۱۸۵۷ء میں ایک مذہبی دل کو، جس نے تیرول کے علاقہ کو برباد کر دیا تھا، سزائے لعنت دی گئی، اور جب اتفاق سے اس گروہ پر کوئی لعنت نازل نہ ہوئی تو یہ سمجھا گیا کہ اس علاقہ کے باشندے گناہگار ہیں، اس لیے سختی رحمت پر دانی نہیں۔ چنانچہ اس غرض کے لیے کلیساؤں میں نمازیں پڑھی گئیں اور ہوسے بھلے عام تہا الناس یہ سمجھتے رہے کہ خدا نے ان کی خطاؤں کو معاف فرما دیا ہے۔

اسی سلسلہ کا عجیب و غریب مقدمہ اوتمان کے چوہوں کا مقدر ہے، سولہویں صدی عیسوی کے اوائل میں فرانس کے جملہ اطراف و جانب میں اُس کی کافی شہرت تھی، تفصیلات یہ ہیں۔ ایک علاقے کے چوہوں پر دعویٰ کیا گیا کہ انہوں نے جملہ مزدوعات کو برباد کر دیا ہے، جس کی وجہ سے جوگی فضل نامہ شہرت ہو گئی۔ فرمان صادر ہوا کہ چوہوں کو عدالت میں حاضر کیا جائے۔ ان کی طرف سے ایک قانون دان جس کا نام بارٹولومیوسا سانی تھا، پیش ہوا، اس قانون دان کی شہرت تمام تر اسی مقدمے کی رہنمائی

چاہتا۔

اس کے علاوہ چند اور عدالتی فیصلے بھی ہیں جن میں سہل سے سہل جرم کی سزا دشوار سے دشوار دی گئی ہے۔

یہ اور اس قسم کے بے شمار فیصلے علامت ہیں اس امر کی کہ یہ عدالتیں ذمہ داری کا سہنوم سمجھنے میں غلطی کرتی ہیں، اور ان حالات و ظروف پر نظر رکھنے بغیر جن میں جرم کا ارتکاب کیا گیا ہے۔ مجرموں کو سزا دیدیتی ہیں۔

جہاں تک ذمہ داری یا سؤلیت کا سوال ہے ہم سبھی اس کا مفہوم دہی سمجھتے ہیں جو قرون متوسطہ میں یا اس سے پہلے سمجھا جاتا تھا۔ اگر کئی فرق ہے تو اس قدر کہ ہم ذمہ دار صرف انسان کو قرار دیتے ہیں اور وہ حیوان اور چادہ جاندار اور بے جان سب کو ذمہ دار تصور کرتے تھے۔

بچوں سے زیادہ عاقل، زیادہ فہم، اور زیادہ باشعور نہ تھے، ان کے اعتقاد میں حیوانات، اور جمادات ان افعال و اعمال میں ذمہ دار قرار دئے جاسکتے تھے جو با منظر ار یا بلا شعور ان سے سرزد ہوتے تھے، یا کسی طرت ان کی طرف منسوب کئے جاسکتے تھے، یورپ اور امریکہ میں ہمد قریب تک دیوالاں اور کم فہم بچوں کو ان کے اعمال کا ذمہ دار بنایا جاتا تھا۔ بعض حالات میں ان مالک کی عدالتیں مضحکہ خیز فیصلے دیا کرتی تھیں۔ حال ہی میں امریکہ کے ایک شہر میں چھ سال کے نو عمر بچہ پر دھوئی کیا گیا کہ اس نے بند دق سے ایک شخص کو ہلاک کر دیا ہے۔ سچے سچے حکم دیا کہ اس بچے کو پندرہ سال کے لئے اصلاحی جیل میں بھیجا جائے۔

۱۹۳۵ء میں امریکہ کی ایک عدالت نے دو شخصوں کو دس سال کی سزا اس بنیاد پر دی تھی کہ انھوں نے اشتراکیت کی تائید میں کچھ کہنا

## تضمین

من و رطلب تو بہ مرادے نہ رسیدہ  
محروم پرو بال و تواوج نشینی  
معتوبم و افسردہ دلم، تشنہ مشام  
صدرق بہ آغوش فلک شد تبسم  
بایہمہ محسود رقیب با ہم و رسوا  
عاصی شدم ولذت عصیاں بخشیدہ

دُر کوئے تو معرو فم و اذ روئے تو محروم

(سعدی)

گر گدہن آلودہ و یوسف نہ دیدہ

رستمی صلیبی

# جانوروں کے مختلف رنگ

محمد یوسف، کلکتہ

علم حیوانات کی اصطلاح میں، حیوانات کی ایک قسم پر دوزو (Protozoa) یعنی حیوانات اولیٰ ہے، جس قسم کے حیوانات پر اس اصطلاح کا اطلاق ہوتا ہے اُن کی نسبت ایک اہم سوال یہ ہے کہ کیا وہ حقیقت وہ سلسلہ حیوانات کا اوّلین حلقہ ہیں یا اُن سے بھی پہلے کوئی کڑی ہونی چاہیے قطعی جواب تو اس کا کوئی نہیں دیا گیا۔ اور غالباً دیا بھی نہیں جاسکتا۔ البتہ موجودہ معلومات سے یہ امر مسلمہ ہے کہ اس وقت تک جتنے بھی حیوانات دریافت ہوئے ہیں، اُن سب میں سب سے سادہ ترین اور اولین حیوان بھی ہیں۔ ان حیوانات کے جو سب سے ایک خاص قسم کا لیسار مادہ خارج ہوتا ہے، اس مادہ سے جب بالوں کے ذرات ملتے ہیں، تو فوراً چمک جاتے ہیں، اور ان سے ایک خول (case) سرائیٹا ہو جاتا ہے، عموماً اس خول کا رنگ حیوان کے جسم کا رنگ سمجھا جاتا ہے، اب غور طلب چیز یہ ہے کہ اس میں رنگ کس چیز کا ہو گا۔ یا ہر ہے کہ بالوں کے علاوہ اور کسی چیز کا نہیں ہو سکتا۔

حیوانات کے ظاہری اعضا، کی طرح اندرونی اعضا، کے رنگ بھی مختلف ہوتے ہیں۔ مثلاً مگو کا رنگ اور سب سے بول کا اور۔ گردہ کا رنگ جدا ہے اور آنکھوں کا جدا۔ مگر ظاہری اعضا کی طرح اُن کے رنگوں کا اختلاف بھی فزائیجی کل اسباب کا ہی نتیجہ ہے۔ چنانچہ اُن کی کیا وہی تشریح کے نتائج اُن کی تسلی بخش شہادت دیتے ہیں۔

یہ ہیں علم وظائف الاعضاء کے دلائل

خود علم علم الحیات نے ہمیں بتایا ہے کہ جاندار چیزوں کی بالیدگی

یہ سلسلہ علم نباتات (Botany) اور علم حیوانات (Zoology) کا مشترک موضوع ہے جس قدر تحقیقات اس وقت تک ہوئی ہیں۔ وہ گویا ایک مرتب صورت میں مدون کر دی گئی ہیں۔ تاہم بعض ابتدائی درجے سے آگے بڑھنے کا بیش نہیں ملتا ہے۔ کیونکہ مقاصد و علل کا بہت کم حصہ سامنے آیا ہے، اور بہت بڑا میدان ابھی باقی ہے۔

علم وظائف الاعضاء (Physiology) کے ایک گروہ کی تحقیقات یہ ہے کہ حیوانات میں اختلاف الوان محض فزائیجی کل اسباب سے پیدا ہوا ہے۔ اور اس میں قدرت کے کسی ارادے اور قدر یا تقدیر و تقیضی کو دخل نہیں۔ فزائیجی کل صحیح ترجمہ میرے خیال سے علم وظائف الاعضاء ہے اور فزائیجی کل اسباب، وہ اسباب و موثرات ہیں جن کا تعلق علم وظائف الاعضاء سے ہے۔ پس میں پہلے اُن کی تحقیقات کا خلاصہ پیش کرتا ہوں۔

مادی اشیا، خواہ وہ حیوانات ہوں، یا نباتات یا جمادات، اُن کے لئے اکثر حالتوں میں رنگ کا ہونا لازمی ہے۔ حیوانات اور نباتات ایک طرف ہے جمادات میں بھی شکل کوئی ایسی مثالی ملے گی جس کا بعض گیسوں کی طرح کوئی خاص رنگ نہ ہو۔ چونکہ تمام حیوانات اور نباتات کے جسم اور جمادات سے مرکب ہیں اس لئے طبعی طور پر اُن کے جسموں میں ان جمادات کے رنگ کا رنگ ہونا ضروری ہے۔ البتہ ہماری آنکھوں کو صرف وہی رنگ نظر آتا ہے جو جسم کی بالائی سطح سے قریب ہوتا ہے۔ مگر جب کسی جسم کی تشریح کی جاتی ہے تو اس میں اُن جمادات کے رنگ یا اُن کے آثار نظر آتے ہیں جن سے اُن کا قوام مرکب ہوتا ہے۔

ہمارے سامنے محققین فائزین کا ایک ابراگروہ بھی ہے جس نے ہمارا  
الوان کا غائر تر نظر سے مطالعہ کیا ہے، اور اسے محض فزیا لوجی کی صورت  
کا نتیجہ یہ تصدیق کئے ہوئے ہے کہ ہمارا ہی طرح قائل نہیں ہے، اس واسطے میں ہیں  
سب سے زیادہ شہر مظلوم جارس ڈارون کا قانون ہونا چاہیے، جس نے  
اپنے سفر امریکہ کے حج کردہ جانوروں کے متعلق تحقیقات کرتے ہوئے اس  
موضوع کی طرٹ اشارہ کیا۔ اس کے بعد بعض علمائے حالی ہیں جو مظلوم جارتا  
کی تحقیق طلب ماہوں میں تلاش منزل مقصود کے لئے تنگ و دو کر رہے  
ہیں۔ قانون نشو و ارتقاء یا ڈاروینزم (Darwinism) کا  
ایک بنیادی مسئلہ (Feculogy) ہے جس کا ترجمہ قانون  
مطابقت کیا گیا ہے، اور تراجم عثمانیہ یونیورسٹی نے اس کا ترجمہ ثواب  
دست کیا ہے۔ مختصر الفاظ میں اس کا خلاصہ یہ ہے کہ حیوانات پر ان کے  
گرد پیش اور مولد و مومن کے نام حالات کا اثر پڑتا ہے، اور رفتہ رفتہ  
ان کے اعضا اور جسم میں تغیرات پیدا کر دیتا ہے جس قسم کی آب و ہوا میں  
رہتے ہیں جس طرح کا مکان انہیں ملتا ہے مٹی غذا ان کے اندر جاتی  
ہے، اس کے مطابق ان میں جسمی تغیرات بھی ہوتے رہتے ہیں۔ اور ان کے  
مناسب ان کے جسم کی ہر شے ہوجاتی ہے۔

اس قانون مطابقت سے اختلافات الان کے ایک بہت بڑے بعد کا  
انکشاف ہوتا ہے۔ خود علمائے حیوانات کی تحقیق میں ابھی لکھ چکا ہوں کہ آشا  
کا رنگ ان اجزاء کے رنگ کا نتیجہ ہوتا ہے، جس سے وہ رنگ پاتے ہیں۔  
مثلاً پتہ سبز ہوتا ہے، اس لئے کہ اس میں کلوروفیل (Chlorophyll)  
ہوتا ہے، جو سبز ہے، خون سرخ ہوتا ہے کیونکہ یہ ہیموگلوبن سے ملو ہے، جو  
سرخ ہے۔

پس اگر مرث نباتات اور جمادات کو پیش نظر رکھا جائے تو معلوم ہوگا  
کہ کرہ ارض کے مختلف حصوں میں عالم نباتات اور جمادات کی جس قدر بھی  
پیداوار ہیں، ان کی رنگت ان اجزاء کی وجہ سے ایک خاص قسم کی ہو گئی ہے،  
جن کی ان حصوں میں قدرت نے کثرت و فراوانی رکھی ہے، اور اسی لئے  
ہر حصہ زمین میں کسی خاص رنگت کا غلبہ اور احاطہ ہے۔

جب حیوانات ان حصوں میں رہنے لگے تو قانون مطابقت نے جن  
طرح ان کی تمام جسمانی حالت اور فوئی کو ان کے وسط کے مطابق بنا دیا۔

ایک خاص قانون کے تحت ہوتی ہے جس کو موازنہ یا مستطاب کہتے ہیں۔ یعنی  
مختلف اشیاء کا ہم قیاس میں لانا، اور ان کا موازنہ کرنا۔ یہ قانون جس طرح  
حیوانات کے قد جسم اور اندرونی ساخت میں نافذ ہے، بالکل اسی طرح رنگ  
میں بھی جاری ہے، چنانچہ جب ہم مختلف الان حیوانات کو غور سے دیکھتے  
ہیں، تو ان کی رنگارنگی اس کے تحت نظر آتی ہے، اگر ایک جانور کے دہنے  
بازو پر خاص رنگین خط یا گل ہے تو ضرور ہے کہ دوسرے بازو پر بھی بعینہ  
اس کی جگہ و سیاہی رنگ ہوگا، کیونکہ وہ دونوں بازوؤں کا خمیر ایک ہی قسم  
اور ایک ہی مقدار کے مادہ سے بنتا ہے،

شیر اور چیتے کے جسم کا موازنہ کیجئے۔ مور کے پروں کا مطالعہ کیجئے،  
کس نظام و ترتیب اور تناسب و تقابل کے ساتھ ایک پتھر سے پتھر نقش  
کی طرح نقاشی کی گئی ہے، جس سے زیادہ متضارب اور باقائدہ نقش و نگار  
ہو نہیں سکے۔ مختلف قسم کے ہوائی پرندوں پر نظر ڈالئے، اور چھوٹی چھوٹی  
تینکوں کو دیکھئے، جو شام کو اُڑتی ہوئی پودوں اور پھولوں پر اُڑتی ہیں،  
ان کے پروں میں نقش و نگار رنگ کا نود کیسا باقائدہ، کیسا منظر کیسا  
مرتب، کس درجہ با اصول ہے، ایک معمولی نقش چند کیریں بھی کچھ تباہ  
تو کسی زکی تصویر و نقش کے مقصد کو اپنے سامنے رکھتا ہے، پھر کیا قدرت  
کی اتنی بڑی نقاشی، محض ایک بے قصد و بے مقصد اتفاق اور ترکیب  
جیسی ہی کا نتیجہ ہے؟ اور کوئی غرض اور کوئی حکمت اس میں پوشیدہ  
نہیں؟

علمائے حیوانات، قانون متطاب کے رنگوں میں ایک باقائدہ  
موثر قانون تسلیم کرتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ اکثر شیر کے خطوط میں ایک قابل  
محسوس نسوہ اور نظام محفوظ ہوتا ہے، تو اس کی وجہ مرث ہی قانون ہے،  
جس کے سبب سے اس کے دونوں پہلوؤں میں مماثلت و مساوات نظر  
آتی ہے۔ جنگ بعض مثالیں ایسی بھی ملیں گی جہاں یہ قانون بظاہر غیر  
موثر نظر آئے گا۔ لیکن جب زیادہ وقت نظر سے کام لیا جائے گا، تو  
معلوم ہو جائے گا کہ دراصل وہاں بھی یہی قانون محفوظ ہے، مگر کسی  
غیر طبی سبب سے (مثلاً مختلف قسموں کے باہمی اختلاف سے یا گرد و پیش کے  
بعض موثرات خارجیہ سے، یا بعض عوارض اور ان کے قوارث وغیرہ سے)  
یہ حالت پیدا ہو گئی ہے۔

ان کے دودھ کو ارد گرد کی چیزوں سے الگ کر کے نہیں دیکھ سکتیں اور وہ ان کے حمل سے محفوظ رہ جاتے ہیں۔ گویا رنگت ان کے لئے ایک بہترین کیلن گاہ کا کام دیتی ہے۔

برستان کے اندر جانوروں کو دیکھنا کس قدر مشکل ہے، جن کی رنگت کی سفیدی اور ہرٹ کی سفیدی میں کوئی تفریق نہیں۔ رنگین کے اندر ان جانوروں کو کیونکر پہچانا جاسکتا ہے جو ریت کے کسی ٹیلے کے ساتھ لگ کر لیٹ گئے ہیں، اور ان کی کھال بالکل اسی رنگ کی ہے جو رنگت ریت کی ہوتی ہے۔ اس کا صحیح اندازہ ان لوگوں کو ہو سکتا ہے جو شکار کے شائق ہیں، اور بسا اوقات جنگلوں میں، سانپ کی نگلی ہوئی دم کو ایک خوشنما اور رنگین پتہ سمجھ کر پکڑ لیا ہے، حالانکہ وہ اس رنگت کا سانپ تھا جس رنگ کے پتوں اور گھاس سے جنگل کا وہ ٹکڑا بھرا ہوا ہے۔

یہ دنیا تنازع بقا کا (*Struggle for Existence*) میدان کا رزار ہے، اور ہر جان اپنے دشمنوں کی بڑی بڑی مٹیں اپنے سامنے رکھتا ہے، جو اس کے قرب و جوار میں پھیلی ہوئی ہیں، یا اُس فضا میں اُڑتی پھرتی ہیں، جو اس کے اوپر پھیلا ہوا ہے، اگر حیوانات کی رنگت اُس زمین اور وسط سے مطابقت نہ ہو جس میں وہ رہتے ہیں، تو ان کے لئے اپنے گھونسلوں سے نکل کر تلاش غذا میں بھرنے اور زندہ رہنا کس قدر مشکل ہوتا۔ لیکن قدرت نے ان کی رنگت کو ان کے وسط کی رنگت کے شل بنا کر اُن مٹیں دشمنوں کی نظر سے آڑیں کر دیا۔ وہ بھٹکتے ہیں، زمین پر پھرتے ہیں، ایک درخت سے اُڑ کر دوسرے درخت پر جاتے ہیں۔ لیکن اُن کے دشمن اکثر اوقات ان مٹیں پہچان نہیں سکتے۔

اگر ایک طبعیات دانق رنگتے والا قدرت کی نوازش اور ہدایتی کے علاوہ کسی دوسری چیز کا بھی طالب ہو۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ان حیوانات میں پہلے وہ تمام رنگ پیدا ہوئے، جن میں علم و غافلہ الاعضاء کی رد سے پیدا ہوتا چاہئے تھا، مگر بعد میں انتخاب طبیعی (*Natural Selection*) کا عمل شروع ہوا، جس کے تحت یہ ہیں کہ فطرت صرف قوی، موافق، مناسب، موزوں، اور صحیح و سالم چیزوں کو باقی رہنے دیتی ہے، اور نشو و نما کے لئے چھانٹ لیتی ہے۔ باقی معدوم و نابود ہو جاتے، پس جب یہ انتخاب نافذ ہوا تو صرف وہی رنگ رہ گئے جو ان

اسی طرح ضروری تھا کہ ان کی رنگت بھی اُن کے وسط کے مطابق ہوتی، کیونکہ قانون مطابقت ہر جماتی افعال پر موثر ہے۔

چنانچہ تحقیقات سے نظر آتا ہے کہ ایسا ہی ہوا۔ حیوانات کی ایک بہت بڑی تعداد کے متعلق ثابت ہو چکا ہے کہ اُن کے جسم کی رنگت، یعنی وہی ہے، جیسی رنگت ان کے گرد و پیش کے درختوں، پھولوں، پتوں، پتھر اور زمین کی ہے، یا اُن طبعی موجودات کی ہے، جن سے وہ خط گھرا ہوا ہے، علمائے نشو و ارتقاء نے اس حالت کو ایک خاص موثر طبعی تسلیم کیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ یہ "ممانعت" وسط ہے۔ یعنی اگر درویش سے حیوانات کے جسم کا رنگ ہم آہنگ ہو گیا ہے۔

مثلاً شیرستان میں رہتا ہے۔ اس کا اسی وطن وہی ہے، گو وہ کسی ٹاڈ کے اندر یا دریا کے کنارے پر لٹا ہوا نظر آجائے، پس اسی لئے اس کی کھال کے بالوں کا رنگ دھاری دار خاکی، یا سفید لال ہوتا ہے۔ بعض شیر لے ہیں، جو رنگینا میں رہتے ہیں۔ پس ان کی رنگت بھی گرد و آلود زروی مائل اور بالکل ریت کی سی ہوتی ہے۔

تقدیر شمالی کے دب کی رنگت دیکھی گئی ہے کہ بالکل سفید ہوتی ہے، کیونکہ اس کے وطن کی زمین ہمیشہ برف سے سفید رہتی ہے۔ اسی طرح بھنار پرند جو درختوں میں اُشیدائے جاتے ہیں، اور ان کی رنگت بالکل اُن چرن کی ہوتی ہے جو ان درختوں کی شاخوں میں لگتے ہیں۔

یہ ممانعت خواہ حیوانات اولیٰ کے لمبے درجہ کے ساتھ خارجی جزئیات اور اندر کے مل جانے کا نتیجہ ہو، جیسا کہ علمائے وظائف الاعضاء کا قول اور لکھا جا چکا ہے، یا کسی مخفی قانون طبعی کا نتیجہ۔ مگر یہ حال قانون نشو و ارتقاء کے علمائے تسلیم کرتے ہیں کہ اس کے اندر بعض مٹیں بہا متنازع اور کثیر نظر آتی ہیں۔

اذاً بخدا ایک حکمت جس تک فہم انسانی و سرس پاسکی، یہ ہے کہ یہ ممانعت حیوانات کی زندگی کے بقا اور دشمنوں سے غفلت کا ایک بہت بڑا وسیلہ ہے، یہ اگر نہ ہوتی تو ہزار ہا حیوانات دنیا سے نابود ہو جاتے ہیں، اس ممانعت کی وجہ سے وہ اپنے دشمنوں اور اپنے سے قوی تر حیوانات کی نظر سے پوشیدہ ہو جاتے ہیں، کیونکہ اُن کی رنگت اور ان کے گرد و پیش کی اشیاء کی رنگت ایک ہی ہے، اس لئے ان کے دشمن کی نظریں

پس جس طرح قانون ارتقاء کا انتخاب طبعی ایک مدت مدید کے بعد پوری نوع کی نوع میں انقلاب پیدا کر دیتا ہے۔ اسی طرح انتخاب معنی بھی انواع کے رنگ پر حیرت انگیز تغیرات طاری کر دیتا ہے۔

بہت سے جاندار ایسے ہیں، جن کے رنگ عام طور پر تو معمولی حالات میں رہتے ہیں۔ مگر جب ان کے والد و نسل کا موسم آتا ہے، اور زیادہ کی ایک جاتی ضروری ہوتی ہے، تو رنگوں میں ایک دلفریب چمک دمک اور ایک خاص رونق و حسن پیدا ہو جاتا ہے، حیوانات کے بعض انواع یعنی کبوتر، فاختہ، مور و غیرہ ایسی ہیں جن اتحاد و تناسل سے پہلے اپنی مادہ کو اپنی طرف مائل کرنے کے لئے مستازہ رقص و قوافل کرتے ہیں، اور اپنے پرؤں کے دلفریب رنگوں کی ایک خاص انداز سے فائز کرتے ہیں۔ اس کی وجہ سے ان کے اندر ایک خاص دلفریبی و رعنائی کی کشش پیدا ہو جاتی ہے، جو بے اختیار مادہ کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔ اور معجزہ طبعی کے لئے اختلاف الوان ایک بہت بڑا معین خارجی بن جاتا ہے۔ غرضیکہ حیوانات کی معنی خواہش پر رنگوں کا اثر پڑتا ہے۔ اور زیادہ تر دیہی رنگ موثر ہوتے ہیں، جو محبوب و دلفریب، نظر افزہ و دلچسپ ہوتے ہیں۔ اس لئے ثابت ہوا کہ حیوانات کی نسل کی افزائش و حفاظت کے لئے قانون انتخاب معنی اپنا کام کرتا رہتا ہے اور حیوانات کی رنگت ایک بہت بڑے مقصد حیات کو پورا کرتی ہے۔

وسط اور محیط کے مناسب تھے، اور بقیہ سب رنگ بہت سے اعضا کی طرح ناپید ہو گئے۔

اس سے بھی بڑھ کر اختلاف الوان کے مصالح کا بہت دوسرا اُس نظریہ سے ملتا ہے۔ جسے انتخاب معنی (Sexual Selection) کہتے ہیں۔ خواہ اسباب کچھ ہوں۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ ہر قسم کے حیوانات کی خاص خاص اور الگ الگ غذائیں ہیں، علم وظائف الاعضاء کی رو سے جسم پر جن چیزوں کا اثر پڑتا ہے۔ ان میں ایک بڑی شے غذا بھی ہے، غذا کا اثر رنگ پر بھی ہوتا ہے، جو بقدر استعداد طبعی کو درمیش ہوتا رہتا ہے، چنانچہ دیکھا گیا ہے کہ حیوانات کی غذاؤں کے رنگ اگر روشن ہیں تو خود ان کے جسموں کے رنگ بھی روشن ہوتے ہیں، اگر غذا کا رنگ تاریک ہے تو خود ان کا رنگ بھی تاریک ہے۔ مثلاً طوطا زیادہ تر سبز لکھتا ہے، اس لئے اس کا قیام پھل واسلے درختوں میں رہتا ہے۔ درختوں کے رنگ عموماً روشن ہوتے ہیں، اس لئے اس کا رنگ بھی روشن ہے، یا بعض ترکی لکھیاں ہیں، جو گندمی جگہ پر رہتی ہیں، اور بجاہت پر زندگی بسر کرتی ہیں۔ جس کا رنگ تاریک ہوتا ہے تو خود بھی ان کا رنگ تاریک ہو جاتا ہے۔

ایک عرصہ کے استعمال سے جانوروں کو اپنی غذاؤں کے رنگ سے ایک خاص قسم کی موانست ہو جاتی ہے، اس لئے جب ان کی تناسلی خواہش میں حرکت ہوتی ہے۔ تو دوسری جنس کے بعض افراد کی طرف بالخصوص مائل ہوتے ہیں جن میں ان کی غذاؤں کے رنگ زیادہ نمایاں ہوتے ہیں، یہی شے جس کو انتخاب معنی (Sexual Selection) کہتے ہیں،



دنیا میں بی شمار آنے والے  
آتے جا رہے ہیں گے روز جانے والے  
عنوان حیات ہو مبارک تنجیکہ  
عشرت غم پر مسکراتے والے  
آتش

مشرق میں پنہاں رہیں مجھ کو زنجیر  
تقصیر  
اک بندہ مجبور کی آخر  
آواز تو دو کوئی کہہ دے میری آخر  
دور وراثت و شرف و تقدیر  
آتش

# حق بحق دار رسید یا لیرا بادشاہ

عبدالواسع عصری چنگلوری

افرا و ڈراما

بادشاہ۔

فرخندہ یا حسینہ۔ بادشاہ کی بیٹی۔

نوجوان۔

نوجوان۔ شراب کھنچی جا رہی ہے یا کسی ان کی کھال؟  
ڈاکو۔ تم کون ہو؟

نوجوان۔ پیسے میرے سوال کا جواب دو۔  
ڈاکو۔ تمہارے سوال کا جواب (کوڑے دکھا کر) ان سے دیا  
جائے گا۔

نوجوان۔ اے بھڑے کادل رکھنے والے شیطاں! شرم کرو، اور  
اس حسینہ کی انگلیں کھول دو۔

ڈاکو۔ اے نوجوان! آنکھوں کی گرد صاف کر اور غور سے دیکھ  
پھر سمجھ لے کہ —

نوجوان۔ (کوڑے سے اتر کر) خبردار۔ (ریو اور نکال کر) پھر دوسرا  
لفظ دبان سے نکلا تو سمجھ لو کہ خیر نہیں۔ (ڈاکو ڈر جاتے ہیں۔ اور بھاگنے  
کی کوشش کرتے ہیں۔ نوجوان حسینہ کے سینے کی۔ سنی کھولتے ہیں۔ ڈاکو  
فرار ہو جاتے ہیں۔ لاجواں بے ہوش حسینہ کو ایک چٹے کے قریب لے  
جاتا اور زخم دھو تا ہے۔ متورپی ڈیرے کے بعد حسینہ کو ہوش آتا ہے)  
حسینہ۔ (آنکھیں کھول کر) ہا کون — انسان یا فرشتہ۔

نوجوان۔ میں فرشتہ نہیں بلکہ فرشتہ سیرت انسان کا غلام۔  
حسینہ۔ آپ نے میری جان بچائی۔  
نوجوان۔ نہیں، بلکہ خدا نے۔

## پہلا ایکٹ

منظر اول۔ صبح کا قاف و دق میدان جنگلی ڈاکو ایک حسینہ  
کو مار پیٹ کر رہے ہیں۔ وہ آہ و نالہ کر رہی ہے۔ ایک نوجوان گھوڑے پر سوار  
اُسی راستے سے گزرتا ہے اور روکنے کی آواز سن کر گھوڑا کھڑا کر کے ادھر  
ادھر نظر ڈالتا ہے، یہاں ایک اُس کی نگاہ چند درختوں کے جھنڈ پر پڑتی ہے۔  
نوجوان۔ آہا ہاں غلام — ایک بکس پر، مگر وہ سچی پر — کس قدر  
سنگدل ہیں یہ دنیا کے لوگ — کیا کیا جائے (سوچتا اور اپنے  
ریو اور نکال کر دیکھتا ہے) غلاموں کی تعداد بہت ہوگی — اور میں  
تنہا ان کا مقابلہ — ناممکن — (پھر کچھ سوچنے کے بعد) انہیں میں  
انسان ہوں — مجھے مظلوم کی حمایت کرنی چاہیے۔ یہ میری زندگی کا فرض  
ہے۔ (دانتا ہے۔ ریو اور ہاتھ میں لئے ہوئے گھوڑے کو دوڑاتا ہوا جاوے  
دوڑتا رہتا ہے) متورپی ڈاکو گھوڑے کے ٹاپوں کی آواز سن کر فرار ہو جاتا  
ہیں، صرف دو ڈاکو حسینہ کو مار رہے تھے ٹھہرے رہتے ہیں۔)

مجھ پر عرصہ حیات تنگ کر رکھا ہے، اُس نے میری ساری جائیداد اپنے فرض میں ضبط کر لی ہے، آہ میرے ننھے ننھے بچے ہوگو سب سے تڑپ رہے ہیں۔ آہ۔ ان کمزور ہاتھوں اور کندھوں میں اتنی طاقت کہاں کہ بوجھ ڈھوکہ ان کے لئے دال بھات کا سامان کروں۔

نوجوان۔ خدایا کتنا درد انگیز نظارہ ہے، اُس امیر کا مکان کہاں ہے۔ بوڑھا۔ یہی گلی کے قریب بڑی سڑک کے وسط میں ایک عالیشان کوٹھی ہے۔

نوجوان۔ ٹیرو۔ میں ابھی آتا ہوں۔ (نوجوان جاتا ہے) سڑک پر پہنچا گھوڑے کو چھوڑ دیتا ہے، اور سیاہ لباس پہنکر ریو الو راہ میں لے ہوئے چھٹا ہوا، کوٹھی کے بالائی حصے پر چڑھ جاتا ہے۔ کمرے کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ شمع جل رہی ہے۔ امیر ایک کرسی پر بیٹھا ہوا کھانا کھا رہا ہے، نوجوان کمرے میں داخل ہو کر ریو الو راگے بڑھاتا اور کہتا ہے)

نوجوان۔ خاموش رہنا، زبان سے کوئی لفظ نہ کہے، (امیر مڑ کر کہتا اور گہرا جاتا ہے، بچا رہنے کی ناکام کوشش کرتا ہے، مگر نوجوان ریو الو را کی نال سینے سے لگا دیتا ہے)

امیر۔ تو کیا چاہتا ہے۔

نوجوان۔ روپیہ اور کاغذات۔

امیر۔ کتنا اور کاغذات کیسے؟

نوجوان۔ غریب کسان کی جائیداد کے کاغذات اور پانچ ہزار روپیہ

امیر۔ میں نہیں دے سکتا۔

نوجوان۔ تو موت کے بچے سے بھی نہیں چھوٹ سکتا۔

امیر۔ تو کون ہے،

نوجوان۔ یہ ہیں بتا سکتا۔

امیر۔ ظالم! تو چور ہے۔ ابھی پولس کو خبر کروں گا۔ کسی کو بچا رہنے کی کوشش کرتا ہے۔ مگر نوجوان اس کو گھونٹے مار کر دم بخود کر دیتا ہے اور اپنی تریسی سے امیر کو ستون سے باندھ دیتا ہے، پھر بیگ سے نمبوں کے ٹکڑے کو اٹھاتا اور امدادی کھول کر روپے کاغذات کی گڈمی اُٹھائے جاتا ہے، اور غریب کسان کے گھر پہنچا کہتا ہے۔

حسینہ۔ آہ۔۔۔ تم کتنے خوبصورت ہو

نوجوان۔ خوبصورتی، قلمی خط وخال میں نہیں۔ دل کی صفائی اور نیک افعال میں ہے۔ آہ۔۔۔ انسان کتنا فاجر ہر میں ہے، خدایا ان غریبوں، مسکینوں، اور مظلوموں کا کیا حال ہوگا جو خوبصورت ہونے پر بھی، کالی گٹھ میں چاند کی طرح منہ چھپائے پڑی ہیں حسینہ کی مٹ ویکو کہ آپ اپنا ٹھکانا بتا دیجئے، تاکہ میں آسانی سے وہاں پہنچا دوں۔ حسینہ۔ آپ کا نام کیا ہے اور کہاں کے باشندہ ہیں۔

نوجوان۔ یہ نہ پوچھیں کہ میں کون ہوں؟

حسینہ۔ آپ کے احسان کا بجا ساری بوجھ مجھے شرمندہ بنا رہا ہے، نوجوان۔ بے شک۔ مگر میں مجبور ہوں، اس کے سوا اور کیا کر سکتا تھا۔ حسینہ۔ تو کیا آپ مجھ کو یاس کرنا چاہتے ہیں۔

نوجوان۔ معاف فرمائیے۔ میں ایک پراسرار زندگی بسر کر رہا ہوں، میری زندگی کی کتنی زبانی کے سلسلہ حادثوں کا شکار ہو رہی ہے۔ دشمن میری گھاٹ میں ہیں، اللہ سے امید رکھئے۔ اگر آپ میری سچی قدر کر رہی ہیں تو وہ ہیں عز و ملا دے گا۔

حسینہ۔ آہ کتنی دل دکھانے والی بات ہے۔

نوجوان۔ بات نہیں سنا ہے، اچھا بیٹے، جلد اپنے گھر کا پتہ بتا دیجئے۔

حسینہ۔ میں عراق کے ایک سردار کی بیٹی ہوں۔ اور بعد میں ایشیہ

نوجوان۔ میرے گھوڑے پر سوار ہو جائیے۔ اس کے سوا اور کوئی

مورت اس وقت ممکن نہیں۔ نوجوان حسینہ کو گھوڑے پر سوار کر کے روانہ

ہو جاتا ہے، اور لڑکی کو اس کے مکان میں پہنچا کر خدا حافظ کہتا ہوا نکل جاتا ہے۔

## دوسرا منظر

بعدہ کا ایک ننگ و تارک کو پہرہ رات کا وقت ہے، فضا خاموش ہے۔ نوجوان کا اس کوچے سے گزر رہا ہے۔ ایک گھر کا سارا کتبہ باہر نکل کر بے سروسامانی کا ڈھور کر رہا ہے۔ نوجوان وہاں پہنچ کر حالات پوچھتا ہے، نوجوان۔ بتا اے مرد غریب! کس سیاہ کار کے زہر کا درد ناخن نے تیرے دل کو بجھی کیا ہے۔

بوڑھا۔ بھائی! میں ایک غریب کسان ہوں۔ سر پہ وارڈیندار نے

نوجوان فوراً داروغہ کا ہاتھ متام لیتا ہے۔

نوجوان - عورتوں پر مرد ہاتھ نہیں اٹھاتے۔ مسلمان کسی عکس و منظر کا دل نہیں دھکتے، دھمکی شیعہ کو سمجھاؤ کہ، مرنے والے کو مار کر اپنی بہا دہی کا دعوتی نہیں کرتے، البتہ ایک کمزور عورت پر لاشی ہلا کر اپنی فوقیت سمجھانا اور اپنا رتبہ بہا دہی بڑھانا چاہتے ہیں یہ اچھا نہیں — آہ آج کل کمزوروں پر دباؤ ڈال کر اپنا مطلب نکالنا اور اپنے ہم قوموں کا گلہ گھونٹ کر دوسروں کو فائدہ پہنچانا، کاسیابی کی کچی سمجھا رہا ہے — داروغہ - آخر تو کونسا امیر زادہ ہے۔

نوجوان - تجھ کو یہ پوچھنے کا کوئی حق نہیں۔ اگر تو مسلمان ہے عورتوں کی تعظیم کر اور ان کے لئے آرام کا سامان کر۔

داروغہ - میں نے تیرے سے مسلمانوں کو بہت دیکھا ہے۔ ہوٹلوں کے سیٹارہ؛ تم کو عورتوں سے کیا غرض، ہوٹلوں کی وال روٹی، پردہ بیکہ کی عاشقی متباران رات کا شند ہے اور ہمارے ہی منہ پر اپنی بڑائی۔

نوجوان - کیا تو اس بڑھیا پر رحم نہیں کھائے گا۔

داروغہ - نہیں، ہرگز نہیں۔

نوجوان - دیکھ، اور دم آزار دیکھ؛ بڑھیا سردی سے کانپ رہی ہے۔

داروغہ - وہ مر جائے یا بجے۔ جہنم میں جائے یا جنت میں میری کیا۔

نوجوان - لعنت ہے تیری مسلمان پر — تو چاہتا کیا ہے؟

داروغہ - دام

نوجوان - کتنے

داروغہ - ایک رات کے پانچ روپے

نوجوان - بے (جب سے پانچ روپے نکال کر بھینکتا ہے) اگر

ان کا ذہابی بال بیکہ ہوا تو بھر تیری جان کی خبر نہیں — سنا

داروغہ - بہت اچھا۔

نوجوان - (دولان عورتوں کو کمرے میں داخل کرتا ہے، اور سرائے

سے باہر نکلتے ہوئے داروغہ سے کہتا ہے) ذرا بھل کے رہنا، کل ہی دن

تجھ پر بھی آنے والا ہے (بجلا جاتا ہے)

چوتھا منظر

نوجوان - (پتیلی سامنے رکھتے ہوئے) یہ۔ کاغذات اور ردیوں کی پتیلی۔

کسان - (خوش ہو کر اسے غریبوں کے دلوں پر راج کرنے والے دھمکی جگر پر دم رکھنے والے یہ تو بتاؤ کہ تم ہو کون؟

نوجوان - یہ نہ پوچھو۔ مگر خبردار! یہ راز کسی پر فاش ہونے دینا۔ خدا حافظ - (باہر نکل جاتا ہے)

تیسرا منظر

سراٹے

سراٹے میں مسافروں کا گانا لگا ہوا ہے۔ سراٹے کا داروغہ صدر دروازے میں بیٹھا ہوا ہے۔ انھیں مسافروں میں ایک بڑھیا ایک نوجوان لڑکی کے ساتھ سراٹے میں داخل ہونا چاہتی ہے۔

بڑھیا - داروغہ صاحب ہیں اس سراٹے میں ایک رات بٹھرنے کی اجازت دیجئے۔ میں مصیبت کی مادی ہوں۔ سردی سے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے رہے ہیں۔

داروغہ - جا جا — بڑی آئی آرام کرنے۔ کیا سراٹے تیرے باپ نے بنوائی تھی۔

بڑھیا - ارے بابا! سراٹے تو مسافروں کے لئے ہے۔ خدا کے لئے مجھ غریب پر رحم کھاؤ۔

داروغہ - جا جا — سبھی میں جا — رحم کی درخواست ملاؤں سے کر۔ لڑکی - کیا سراٹے غریبوں کے لئے نہیں ہے؟

داروغہ - اری منورہ لڑکی! اگر سراٹے میں رہنا پسند کرتی ہے تو یہ بتاؤ تو کسی سے انھیں لانا بھی سیکھی ہیں؟

لڑکی - یہ سراٹے ہے یا کسبی بازار۔ شاید تم بازاروں کے ٹھیکیدار ہو، سراٹے کے نگران نہیں۔

داروغہ - اری بد زبان لڑکی — اپنی عزت اور عصمت کی خبر چاہتی ہے تو یہاں سے نکل جا۔ رنہ —

لڑکی - ایک شریف لڑکی تیرے سے شہرت پرستوں کے دماغ کی کیلیں دھیلی کر دے گی۔ گراہنے والی عصمت پر دھبہ آنے دے گی۔ سمجھتا کیا ہے؟ داروغہ - (ٹھٹھکے سے) اپنا ڈنڈا اٹھاتا اور مارنا چاہتا ہے کہ ایک

جوان - مگر غبردار یہ مازناش ہونے پائے۔

## دوسرا ایکٹ

### پہلا منظر

محل - دربار - بادشاہ تخت پر بیٹھا ہے۔ فریادیں سن رہا ہے۔ درباری ہیں۔ درباری صاحب۔ امرا اپنی اپنی کرسیوں پر بیٹھے ہیں۔ بیکایک کسی کے رونے کی آواز سنائی دیتی ہے۔

امیر - روٹا ہوا ہے — وہائی، ہائے میں ٹٹ گیا، مٹ گیا۔  
بادشاہ - (کو تو ال سے) یہ شور کیسا، دیکھو کون ہے۔

کو تو ال - ہاں حضور! ایک فریاد ہے۔

بادشاہ - حاضر کرو — (کو تو ال اُس کو لاتا ہے) کیا حال ہے، کیوں پریشان ہو۔

امیر - جہاں پناہ! کیا بناؤں۔ زندگی بھر کی ساری کمائی چند ٹٹوں میں ایک چور کے حوالے ہو گئی۔ امیرانہ ٹھاٹ جاتے رہے، نان شینہ کا محتاج ہو گئے ہوں۔

بادشاہ - (کو تو ال سے) یہ کیا ماجرا ہے۔ ہائے تخت اور یہ اند بیگم کا کو تو ال - حضور عالی! جان بخشی ہو تو پورا قصہ عرض کروں۔

بادشاہ - کیا تم نے اب تک اُس چور کا پتہ نہیں لگایا؟

کو تو ال - لگایا کیوں نہیں، عالی جاہ! قدم قدم پر جاسوس مقرر ہیں، — چور کو پکڑ کر لانے پر انعام کا اعلان بھی سارے شہر میں کراؤ کیا ہے، مگر انھیں ساری تدبیریں بیکار ثابت ہو رہی ہیں۔

بادشاہ - اے دیوے!

کو تو ال - بات اصل یہ ہے کہ وہ چور نہیں بلکہ غریبوں، یتیموں، بے کاروں، زمینداروں کی غیبت امید ہے۔ شہر کے غریب طبقے کی کمیٹی اسی سے ہری بھری ہے۔ وہ ملک کے بیکار طبقے میں محل کا شکر بن کر کبھی کی طرح کرتا ہے۔ یتیموں کے نازہ زخم اُسی سے مندمل ہو رہے ہیں۔ مگر امیر

اور سرکاری طبقہ اُس سے نالاں ہے۔ میں مجبور ہوں۔ لاکھ جتن کئے مگر نراغ نہیں بن۔

بادشاہ - کیا راتوں میں سپاہی شہر میں گشت نہیں کرتے۔

میرے سے تھوڑے فاصلے پر داروغہ کی کوٹھی، داروغہ بستر لیٹا ہوا ہے،  
نوجوان آدمی رات میں سیاہ لباس پہنے ہوئے کمرے میں داخل ہوتا ہے۔  
داروغہ گھبرا کر اٹھ بیٹھتا ہے،

داروغہ - کون — چور — رحم — رحم — خدا کے

لئے رحم

نوجوان - درندوں میں رحم کا مادہ نہیں ہوتا۔

داروغہ - تو جانتا کیا ہے،

نوجوان - کراہے۔

داروغہ - کس کا کیسا، اور کتنے

نوجوان - کمرے کا۔ پانچ ہزار روپے

داروغہ - انس، مبراہن

نوجوان - اس وقت جب کہ جناب عدالت کی کرسی پر نشتر لیٹ فرماتے

داروغہ - مجھے معاف کیجئے۔

نوجوان - دام کے بغیر معافی نہیں مل سکتی

داروغہ - ہائے میں ٹٹ گیا، برباد ہو گیا۔

نوجوان - کیا ٹیڑھے بھی کہیں لٹے ہیں۔ محنت کی کمائی تھوڑی ہی

ہے جو مرا جاتا ہے بخت!

داروغہ - دیکھو تم چور ہو — آخراک نہ ایک دن پھنسو گے

اُس وقت میں کام آؤں گا۔

نوجوان - میں ایک غلام ملک کے غلام انسان سے مدد کی درخواست

نہیں کرتا۔ دوسری بھی کہیں کسی کے ڈسے وقت میں کام آتی ہے۔

داروغہ - مجھ پر رحم کرو۔

نوجوان - آج کل دام کی قدر رحم سے بڑھ کر ہے، روپیہ دو —

ورنہ تہا راجاں کی خیر نہیں۔

داروغہ - بالی ناخدا مست اُستاد صندوق کھول کر دوپوں کی تیلی چور

کے حوالے کرتا ہے، نوجوان نے کرسید حاسرے کے کمرے میں داخل

ہوتا اور بڑھیا سے کہتا ہے، اے لوہاں! (روپے کی تیلی میں کتے ہوئے)

مجھ سے نکل کر کہیں آرام کی زندگی گزارو، یہاں رہنا ٹھیک نہیں۔

بڑھیا - خدا ترن بھلا کرے۔

جار ہے ہیں۔ غریبوں کے خون سے ماتوں پر قشقہ لگا یا جا رہا ہے، اس کی روک تھام آپ کا فرض ہے، آپ کا جاہ و جلال بجا، مگر قدرت بھی کوئی چیز ہے۔ اگر اب بھی آپ نے غفلت کی تو اندیشہ ہے کہ آپ کو کسی قدرت کے ذہر آلود خنجر سے دوچار ہونا پڑے گا۔ جو آپ کی بہار زندگی کا آج ہی پیام ہو گا۔

بادشاہ۔ یہ لو ——— وہ تو مجھے اور میری حکومت کو چیلنج دے رہا ہے۔ بد معاش کہیں کا ——— (کو تو ال سے)  
کو تو ال۔ اگر تم نے اس کو تین دن کے اندر گرفتار نہ کیا تو ہمارے جس کے ٹکڑوں سے ٹکٹوں کی ضیافت ہوگی۔

کو تو ال۔ حضور ہی کوئی تدبیر بتا دیں تو بہتر  
بادشاہ۔ (دو ذہروں سے) کیا کوئی تدبیر کچھ میں آتی ہے۔

وزیر۔ ہاں ———

بادشاہ۔ کونسی

وزیر۔ اگر کوئی شخص غریب یا جس میں کسی جھگڑ میں در دھری کی داز سے چپے اور خراب دکرے گا تو یہ ضرور اس کی مدد کو آجینے گا۔ پس ذرا اپنا کام کر دیجئے۔

بادشاہ (خوش ہو کر) واہ واہ کیا دانائی کی بات بتائی ہے۔  
—— شہنشاہ ——— سنا کو تو ال تم نے

کو تو ال۔ جی ہاں، عالی جاہ!

بادشاہ۔ تو جاؤ اس پر فوراً عمل کرو، اور اس کو زندہ گرفتار کر کے میرے پاس لاؤ۔

کو تو ال۔ بہت اچھا ——— عالی جاہ! (کو تو ال جاتا ہے۔ دربار برخاست ہوتا ہے)

دوسری منظر

جنگل، ایک مرنے درخت کی ٹہنی پر ایک نوجوان بیٹھا ہوا نظر آتا ہے۔  
نوجوان۔ خدا یا ——— آج میرے دل پر اپنی پانی پر کائی کی طرح کیوں جم رہی ہے۔ دنیا کا ہر منظر آؤں کی رات کی طرح خون ناک کیوں دکھائی دے رہا ہے۔ آہ ——— آج میری زندگی کا آخری دن ہے؟ آہ ——— واقعی میں گنہگار ہوں، مگر معاف کر خدا یا تیرے

کو تو ال۔ کیوں نہیں حضور! اور جب سے اس کا شور مچا ہے۔ بجا ہوں کی جان پرین آئی ہے۔

بادشاہ۔ (تعب سے) ایک اس کا پتہ لگنا دشوار ہے۔

کو تو ال۔ جان چکوں کا کام ہے۔

بادشاہ۔ واہ رے چور ——— (دو ذہروں کی طرف دیکھ کر)  
ابسا چور بھی سہل آپ لوگوں نے کہیں دیکھا اور سنا ہے۔

وزیر اعظم۔ وہ تقریب کے وقت بھی ہے اور قابل لغت بھی۔

کو تو ال۔ اگلے اگلے! جو کام آج کل حکومت کے لئے دشوار ہے اس نے آسان بنا دیا ہے۔

بادشاہ۔ کونسا کام

کو تو ال۔ بیکاری کا مسئلہ

بادشاہ۔ وہ کیسے

کو تو ال۔ وہ امیروں، سرمایہ داروں۔ سرکاری حاکموں کے خزانے  
میں پر غصہ کی بجلی گرتا ہے، اور غریبوں کو ہر طرح مدد پہنچاتا ہے۔

بادشاہ۔ سمجھتے بھی ہو وہ امیروں کو لوٹ کر مال کا فائدہ نہیں کر پاتا۔  
کو تو ال۔ ضرور کر رہا ہے حضور! وہ حاجت سے زیادہ کسی کو نہیں

رٹتا۔

بادشاہ۔ آخر وہ رہتا کہاں ہے! کچھ یہ بھی معلوم ہوا۔

کو تو ال۔ وہ ہر جاتی ہے۔ لیکن کسی جھگڑ میں رہتا ہو۔ کیونکہ سارے

قافلے اسی کی پناہ میں بیچ سلوٹ شہر میں داخل ہوتے ہیں، (ایک چہرہ)  
محل میں داخل ہوتا اور سونے کی کشتی میں ایک عرصی گزارتا ہے)

بادشاہ۔ یہ کیا ہے؟

چہرہ اسی۔ ایک سواریہ دے گیا ہے۔

کو تو ال۔ وہ کدھر گیا۔

بادشاہ۔ تم کیوں اس قدر حیران ہوتے ہو۔

کو تو ال۔ عالی جاہ! لیکن ہے وہی جو۔

بادشاہ۔ اچھا اس کو پڑھو تو

کو تو ال۔ (پڑھتا ہے) عالی جاہ! ملک میں سرکاری حکام کی رشوت

سہتانی زورور پر ہے۔ کسان بچا کرے سرمایہ داروں کی کچھ میں ہے

ہارن رحمت بزرگوار۔ آہ اگر دنیا کے سنگدل امیر جو کون کی طرح خون چوسنے  
ولے سرمایہ دار غریب کی بھی بھدروی کرتے تو مجھے یہ نادر و اپنے اختیار نہ کرنا پڑتا  
۔۔۔ آہ انسان فی طبیعت قوم و ملت کے نام پر مذہب ڈاکے ڈال کر اپنی  
بیوی بچوں کا ہیٹ پالنے کی بجائے قوم کی صبح بھاننی کرتے تو آج یہ روز بد  
دیکھنا نصیب کیوں ہوتا۔ میں بدنام ہوا۔ سوسائٹی کے قابل نہ رہا۔ مگر ملین ہوں  
کہ میری زندگی کا ہر لمحہ قوم کی آسودہ حالی کے لئے ریڑھ کی ہڈی کی طرح سوز  
ثابت ہوا۔ اب اگر کچھ بھی جاؤں اور قتل بھی کر دیا جاؤں تو مجھے غم نہیں میں  
غشی سے موت کا ہیال دینے کے لئے بنا ہوں (کو تو ال اسی شکل میں سپاہیوں  
کو لئے آتا اور چھپا دیتا ہے۔ نوجوان ہنسی پر منہم مچھا ہوا کچھ سوچ رہا ہے،  
دور سے کسی کے رونے کی آواز آتی ہے۔ نوجوان گھبرا کر ادھر ادھر دھڑکتا  
اور کہتا ہے) شکر ہے کہ میری زندگی کا آخری لمحہ بھی ————— (پھر  
گھبرا کر) ————— یہ دھوکا تو نہیں دیا جا رہا ہے ————— (سوچتے ہوئے)  
ساری زندگی انہیں کاموں میں صرف ہوئی ہے۔ آخری وقت میں کیوں گھبراؤں۔  
اگر یہ دھوکا بھی ہے تو اللہ میرا حامی و ناصر ہے (درخت سے کودتا اور  
آواز کی طرف دوڑتا ہے۔ گوسپاہی اس کو گھیر لیتے ہیں۔ نوجوان چپ  
چاپ اپنے آپ کو ان کے حوالے کر دیتا ہے۔ سپاہی اور کو تو ال اس کو  
زنجیروں میں جکڑ کر بادشاہ کے پاس لے جاتے ہیں۔)

### تیسرا منظر

محل کا پائیں باغ۔ سپاہی اور کو تو ال قیدی کے قریب کھڑے  
ہوئے ہیں۔ بادشاہ چن پھانسیوں کے ساتھ باغ میں آتا ہے، شاہزادی  
فرخندہ اپنے کمرے میں کھڑی ہوئی کھڑکی سے دیکھ رہی ہے۔  
بادشاہ۔ اٹ، یہ قیدی ہے یا پڑوسیوں کا قمر۔  
قیدی۔ مایوسی مذہب اسلام میں کفر ہے۔  
بادشاہ۔ اوہر دیکھو تو آج تم کس قدر ہجوم ہو۔  
قیدی۔ ایک بیمار موت کے آخری اور تلخ لمحوں میں بھی خوش  
رہتا ہے۔

بادشاہ۔ وہ دھکی جوتے مجھے دیسی تھا دے۔

قیدی۔ جی ہاں۔ وہ دھکی ہیں سنی بلکہ معنور کو حقیقت سے آگاہ  
کرنا میرا فرض تھا۔

بادشاہ۔ کیا حکومت کے آگے بھی کسی کا درد ملتا ہے۔

قیدی۔ بیشک حضور حکومت سے بڑھ کر سبھی ایک طاقت ہے۔

بادشاہ۔ آج وہ غریب کہاں ہیں جن کی مدد پر تو —————

قیدی۔ وہ غریب تو یہاں نہیں، لیکن ان کی دعا میں میرے ساتھی۔

بادشاہ۔ (ناخوشی سے ہنستے ہوئے) بے وقوف۔ لگتا کہیں کا۔

قیدی۔ لگے وہ ہیں جو اپنے چند روزہ جاہ و جلالت کو عزت و

مرتبہ کو دنیا کی ظاہری چیزوں میں ڈھونڈتے ہیں۔

بادشاہ۔ مگر آج جب تکو مرے بچے سے کون چڑا سکتا ہے

قیدی۔ وہی جس نے فیملی کو فرد کی آگ سے، موشی کو فرفر سے،

یوسف کو کنوئیں سے نکالا تھا۔

بادشاہ۔ کیا تو منیر میری کا دعویٰ کر رہا ہے۔

قیدی۔ قدرت کی حقیقت اور اپنے ایمان کا اعتراف کر رہا ہوں۔

بادشاہ۔ تیری موت رسوائی کے ساتھ عمل میں آئے گی۔

قیدی۔ میں اپنی زندگی سے مطمئن ہوں۔

بادشاہ۔ یہ بات ہے

قیدی۔ جی ہاں۔

بادشاہ۔ (کو تو ال سے) سارے شہر میں اس کی موت کا اعلان

کرادو۔

کو تو ال۔ (ادب سے) عالی جاہ! بصورت اسی میں ہے کہ اس کی

موت خاموشی سے عمل میں لائی جائے۔ ورنہ بغاوت کا اندیشہ ہے۔

بادشاہ۔ (رجحان کو اس کو ابھی سولی پر چڑھا دو۔ (کو تو ال اور سپاہی

قیدی کو سولی پر چڑھاتے ہیں۔ فرخندہ فوراً اپنے ترکش سے تیر کھینچتی اور

تاک کر سولی کی رسی پر نشاء لگاتی ہے، رسی ٹوٹ جاتی ہے)

بادشاہ۔ (حیران ہو کر) یہ کیا؟

قیدی۔ آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا؟۔۔۔

بادشاہ۔ پھر چڑھاؤ اس مردود کو۔ (سپاہی قیدی کو دار پر کھینچتے

ہیں۔ دوسرا تیر سفتا ہوا آتا اور رسی کو کاٹ دیتا ہے)

بادشاہ۔ یہ جادو کا دور ہے یا رسی مکرور ہے۔

قیدی۔ صرف قدرت کا کیل ہے۔

بادشاہ۔ اس کو پھر دوبارہ لوہجھڑ دست (قیدی سولی پر سے) جایا جاتا ہے۔ تیسرا تیرہم کتاب ہے اور سی کو کاٹ دیتا ہے۔ ساتھ ہی ایک کاغذ بھی لگتا ہے، بادشاہ چھٹی کو حبس سے اٹھا کر کو قوال کو پڑھنے کے لئے دیتا ہے، کو قوال پڑھتا ہے "یہ ہے گنہ قیدی ہے حقیقی مجرم میں ہوں اور ابھی حاضر ہوتا ہوں"

بادشاہ۔ یا اللہ! یہ کیا ماجرا ہے۔ (کو قوال سے) تم نے مجھے دھوکا دیا۔ (اُن کی آن میں کالی گٹھا جاتا ہے۔) کبھی کو نڈتی ہے، اتنے میں ایک حسین و شیرازہ برق اوڑھے ہوئے بادشاہ کے سامنے آکر کھڑی ہو جاتی ہے)

بادشاہ۔ (گہرا کہ تم کون ہو۔)

اصبغی۔ آپ کا بھی ابھی معلوم ہو جائے گا۔

بادشاہ۔ کس لئے آئے ہو۔

اصبغی۔ حضور کا وعدہ یاد دلانے کے لئے۔

بادشاہ۔ میں نے کیا وعدہ کیا تھا اور کب؟

اصبغی۔ غور کیجئے۔ سوچئے

بادشاہ۔ مجھے یاد نہیں آتا۔

اصبغی۔ کیا یاد دلانے پر پابند رہیں گے حضور!

بادشاہ۔ ضرور

اصبغی۔ اس شخص کا بعد وہاں کیا جس نے دولت کے لالچ میں خنثی۔

بادشاہ۔ (حیران ہو کر) آئین۔ کیا کہا۔۔۔ جلد بتاؤ

اصبغی۔ قسم کھاؤ

بادشاہ۔ میرے تاج و سر کی قسم، لہذا جلد بتاؤ

(اصبغی۔ صحرائی ڈاکوؤں سے جس وقت مجھ کو۔۔۔)

بادشاہ۔ کون۔۔۔ فرزندہ۔۔۔ میری بیٹی۔۔۔ افسوس۔

(فرزندہ برق اُتار کر اعلیٰں نیچے کئے ہوئے بت کی طرٹ کھڑی رہ جاتی ہے،

قیدی اس کو غر سے دیکھتا اور یکایک چیخ ماکر بادشاہ کے پاؤں پر گر

جاتا ہے۔ بادشاہ اُس کو اٹھانے کے لئے ٹھٹکتا ہے، اور اُس کے گلے کی

سہری زنجیر دیکھ کر چلا اُٹھتا ہے) آہا ہا۔۔۔ فیروز۔۔۔ میرا بیٹا۔۔۔

(فیروز ہوش میں آتا اور ایک طرف ادب کے ساتھ کھڑا رہ جاتا ہے)

فیروز۔ ہاں میں وہی قسمت فیروز ہوں جو جلاوطن کر دیا گیا تھا حضور

بادشاہ۔ (آنسو بہاتے ہوئے) آہ بیٹا، خدا کے لئے مجھے شکلا دیری

خطاؤں کو بخشد، میں مجرم ہوں، ہوس دولت اور خواہش تاج نے مجھے

اندھا کر دیا تھا۔۔۔ آہ کس قدر ظالم ہوں میں۔ بیٹا، یہ لو (تاج کو ہٹا

ہوئے) تمہارا تاج جس کے تم حقیقی وارث ہو۔ (فرزندہ کا ہاتھ میں ہاتھ

دے کر آج سے یہ تمہاری ملک ہے۔)

بادشاہ جاتا ہے، درباریوں پر سناٹا مچا جاتا ہے اور یہ آواز گونج جاتی ہے۔

عجب دینا ہے یہ کھٹکتا نہیں راز اُس کی قدرت کا

ابھی دوزخ کا منظر تھا، ابھی نقشہ ہے جنت کا (ٹھٹھ)

اے حسن بزرگ بطور کج باغی  
صیباری سا سفر چھپک جائے گی  
مجھ کو تو یہ ڈر ہے کہ ڈالائی کیسی  
رجوڑائی جولی جلد سک جائے گی

پوش

پیر میں خوشی کا راج دیکھا میں نے  
پھر فرق جنوں پہ تاج دیکھا میں نے  
نیلے جو سفر سے تم نواک عمر کے جب  
اپنی جانب پھر آج دیکھا میں نے

ایکیش

# ہندوستانی ادب میں بین الاقوامی نقطہ نظر کی ضرورت

## ترقی پسند ادیبوں سے ایک گزارش

احمد حسین - الہ آباد دیوبند

دستاویز ہمارے سامنے پیش کر رہے ہیں — اور اپنی ترقی پسند رجحانات میں ہم کو اردو - ہندوستانی زبان کی بقا اور ترقی کا ایک خوشگوار مستقبل نظر آ رہا ہے۔ کیونکہ زندگی کی لحاظ بہ لحاظ متحرک حالتوں کے ساتھ ہم اس زبان کو بدلتا ہوا پاتے ہیں۔ اور اس کے ادب میں اپنی حیاتِ مجددہ کے مختلف نقوش اس قدر کامیابی کے ساتھ منکسر ہوئے دیکھ رہے ہیں۔

یہ سب درست، اور ہم کو ان خوشگوار علامات سے ایک گونڈا اطمینان بھی ہوتا ہے۔ حالانکہ ہمارے مصنفین کا بیشتر حصہ اپنے بناؤں اور ناقابلِ تیسر خواب سے بیدار ہو کر عصرِ حاضر کی زبردست اور طوفانی حقیقتوں سے آنکھ نہ مٹنے کی اب بھی حُرّات نہیں کر سکا ہے۔ پھر بھی اردو - ہندوستانی ادب میں عوام سے ہمدردی اور ان کی زندگی کی ترجمانی کے جو جراثیم پیدا ہو چکے ہیں کافی امید افزا ہیں۔ لیکن حیاتِ قومی کے ان تمام زندہ مسائل کو سمجھنے اور ان کی صحیح ترجمانی کرنے کے باوجود ہمارے شاعر اور نثر نگار ایک بڑی زبردست، جفاکشی اور ہم ترین حقیقت کو نظر انداز کر دیتے ہیں، یا شاید ان کی نظروں نے اس کے دور رس نتائج کا مطالعہ نہیں کیا ہے۔ اور ان کے خیالات اس کی انقلابی قوت کا اندازہ نہیں کر سکے ہیں۔

غالباً ہمارے ادیب ابھی اس چیز کو محسوس نہیں کر رہے ہیں، جو علم و فہم کے خلاف، بیکاری، جنگدستی اور فسادِ سستی کے خلاف، سیاسی غلامی، قومی پامالی اور اقتصادی لوٹ کھسوٹ کے خلاف، شہنشاہیت، استعماریت اور

آج ہندوستان ایک جدید انقلاب کے دروازوں پر کھڑا زور آزمائی کر رہا ہے جو نہ معلوم کس وقت کھل جائے اور سارا ملک تہ و بالا ہو جائے۔ خود اس نظام کے سر پرچہ ہمارے سماج کا سنگِ بنیاد ہے۔ تخریب اور فنا کی یہ ہمیں کوئی نیا ہی نہیں جو گزرنے معلوم کب اسے خاکستر کر دیں — بھوک، غزبت اور بیکاری کے سوال کو اٹھانے حالانکہ ابھی زیادہ دن نہیں گزرے، لیکن یہی سوال اتنی اہمیت حاصل کر چکا ہے کہ آج ہمارے تمام سیاسی، معاشی اور اقتصادی سوالوں کا مرکز بن گیا ہے۔ اور ہندوستان کی آزادی کا سوال ایک جذباتی سوال نہیں بلکہ یہاں کے مفلس اور بے بس ترین طبقات کی اقتصادی آزادی کا مسئلہ ہو گیا ہے، انحققریہ افلاس ہی کے نتیجہ جو نکلے ہیں جو سینہ ہندوستان میں کھڑکے والے شعلہ انقلاب کو تیزی سے ہوا دے رہے ہیں۔

ہمارا ادب بھی جو حیاتِ قومی کے مختلف پہلوؤں کی مصوری کرتا ہے ان انقلابی محرکات سے بخوبی متاثر ہوا ہے۔ ہمارے شاعروں کے خیالات بھر و وصل اور ساعر و سینا کی خشک فضا سے بھل کر مفلس کے دل کو بھونک دینے والی آگ کے شعلوں میں کود پڑے ہیں۔ ہمارے افسانہ نگار اور ناول نویس حضرت کے قوم، آدھستہ سیلون، برقی روشنی، گلاب گھر اور دھانی واقعات کے تذکرہ کے بجائے گلاؤں میں بیوس کے کچے جھوٹے، جھگڑے جراثیم، لاغر بیل، شستہ بیل، زمیندار کے ظلم، طوفان اور غلّیائی کی بربادی، روٹی کی فکر، امراض کی تکلیف دہائی کی پریشانی، محنت، مزدوری اور پھر بھی فاقہ رستی وغیرہ کی انسانک۔

مزد رہے۔ لیکن پھر بھی اس کو اپنے غلبہ و طاقت پر بھروسہ ہے، اس کے پاس  
خفاک آفات حرب کا ایک بے پناہ انبار ہے، اس کے پاس دولت ہے  
اور دولت سے خریدی ہوئی ایک غلیم سپاہ جس کے کس بل پر اسے یقین  
ہے کہ وہ زبردست سے زبردست مخالفت کو بھی انتہائی بے دردی سے  
کچل دے گی۔

لیکن آج سرمایہ داری نے خود اپنے ہاتھوں اپنی شامت بھائی  
ہے، کیونکہ اس کے باعث اس سے زیادہ شدید اور بھیساںک چیز یعنی  
شہنشاہی مصیبت وجود میں آ چکی ہے، شہنشاہی (یا سامراج) کے  
مصیبت ہیں سرمایہ دارانہ حقوق کا ضیاع کی طرح کسی خاص قوم یا ملک کے  
ہاتھوں تک جانا، اس کا نتیجہ خاموشیاں کی منڈیاں حاصل کرنے اور  
فروخت کے لئے بازار تلاش کرنے کی کوشش میں نو دار ہوا ہے۔ یورپ  
کی اقوام اور دیگر ممالک کی ہوس ملک گیری اور نوآبادیات حاصل کرنے  
کی دیوانہ دار واد ووش سامراج کی اسی حکمت عملی کا ایک فطری انجام  
ہے۔ لیکن اسی میں خود اس کی فنا کا راز بھی مضمر ہے۔ کیونکہ اس ملک گیری  
کی زد میں آ کر ایک طرف تو ان سرمایہ دار اقوام کو دشمن بنایا جاتا ہے جن  
کی حریصانہ نظریں کمزور ممالک پر ہمیشہ بڑا کرتی ہیں جو دوسروں کے مفتوح  
ممالک کی ٹوٹ میں بڑے سے بڑا حصہ لے کر بھی آسودہ نہیں ہوتیں، جو  
برہمنی بحری اور ہوائی راستوں کی پیچیدگی کی وجہ سے کسی بھی قوم کی فروخت  
میں اپنے حقوق پر نہیں لگتے ہوئے دیکھ لیتے ہیں اور تجارتی رقابت کے  
باعث کسی دوسرے ملک کی ہر طاقت کو اپنی کمزوری کا پیش خیمہ اور ہر  
ترقی کو اپنے مقاصد اور مکتوں سے مستحدام پاتے ہیں۔ اس طرح قومی  
دشمنی اور رقابت کے جذبات میں الجھ کر یہ حامد اقوام خود آپس ہی  
میں دست و گریبان ہو جاتی ہیں اور نہایت ہی خفاک اور بھیساں ملک  
جنگوں سے زمین کے چھوچھو کو بلا دیتی ہیں اور دوسری طرف مفتوح  
ممالک کے وہ لافقہ دار انسان جن کو یا تو تلوار کی دھماکا اور توپ کے  
دھاتوں سے فتح کیا جاتا ہے اور یا پھر سرمایہ دارانہ تجارتی معاہدوں کی  
زہر پاشی سے رفتہ رفتہ تمدنی موت کے جام پلائے جاتے ہیں۔ سامراج  
کی قوت کے خلاف ایک متحدہ محاذ تیار کرنے میں سرگرم ہیں تاکہ جب وہ  
سرمایہ دار قومی آپس میں ہندو آذنائی کر رہی ہوں اور جب قوت و طاقت

سرمایہ داری کے خلاف محض ہندوستان ہی میں جنگ نہیں جاری، بلکہ دنیا  
کے ہر گوشہ میں سماجی ترقی کا پرچم بلند کیا جا چکا ہے اور انسانیت کا ہر سال  
طبقہ اپنی اقتصادی آزادی کی کوشش کر رہا ہے۔ شاید ابھی ہم یہ نہیں دیکھ رہے  
ہیں کہ ہماری آزادی کی وہ تحریک جس میں کسان اور مزدور سب سے زیادہ  
پیش پیش نظر رہے ہیں کوئی مقامی جھگڑا نہیں بلکہ ایک عالمگیر جنگ ہے،  
جو ہر مورچہ پر پوری قوت کے ساتھ لڑی جا رہی ہے۔

اگر آج بیسویں صدی کے وسط میں تو اس جنگ کی عالمگیری حیثیت اتنی  
واضح ہو گئی ہے کہ خود ہندوستانی سیاست میں بھی اس کی جھلک آنے لگی ہے  
رہی۔ دنیا کی تاریخ کو ترقی بنار اس کو نئے سانچوں میں ڈھالنے والے واقعات  
مجبوری شدت اور کثرت سے ہر طرف رونما ہو رہے ہیں، انسانیت کی نعمت کا  
فیصلہ کرنے والی قوتیں ہیں اگرچہ جوشی سے برسر پیکار ہیں یا اس کی تیاریاں کر رہی  
ہیں۔ دنیا کی مظلوم قومیں اور مجبور طبقے تیزی تیزی کے ساتھ متحد ہو رہے ہیں،  
اور جتنی متعدد سی اسے اپنی قومی یا طبقاتی جدوجہد میں مشغول ہیں اس کی مثال  
تاریخ کے کسی دوسرے دور میں نظر آنا تقریباً ناممکن ہے۔ سرمایہ داری  
نے انسانیت کے ہر طبقے کا خون جی بھر کے چوسا ہے۔ اس لئے اس کے دھول  
نے دنیا کے ہر حصہ کو ایک وسیع برادری میں منسلک کر دیا ہے شہنشاہی کے  
عام خطرے کے خلاف ہر ملک اور ہر قوم میں ایک عام آواز اٹھ رہی ہے اور  
تمام پال پلتے اس اصول معاشرت کے خلاف جو نہ صرف اس قسم کے اجتماعی  
مظالم کو رد کرتا ہو بلکہ خود ان کی حفاظت کے لئے قائم کیا گیا ہو، اور جس  
کی باعث دنیا کی سبھی بھر جماعت کے علاوہ زمین و آسمان کے درمیان مسائل  
لینے والا ہر انسان ایک مصیبت اور عذاب کی زندگی بسر کرنے پر مجبور کر دیا  
گیا ہو، ایک جذبہ تخریب تیزی سے اڑھ کر تاجا جا رہا ہے، نکلے، بھوکے اور  
غیر آسودہ اندھا دیکھا ایک عظیم انسان کا رواں بڑی تیز رفتاری سے اسی منزل  
کی طرف رواں ہے، جہاں وہ استبدادیت کو مٹا کر انسانیت کی ہر گیسیتیت  
کا خاتمہ کر سکیں گے، اور جہاں تشدد اور بے اطمینانی کو نیست و نابود کر کے  
سوسائٹی کے لئے ترقی کی ان شاہراہوں کو کھولنے میں کامیاب ہو سکیں گے  
جو آج باطل مسدود ہو چکی ہیں۔

اس کے برخلاف سرمایہ داری بھی اپنی ضمن میں مشغول ہے وہ ان تمام  
محرکات کو خوب سمجھتی ہے اور حالانکہ اکثریت کی قوت سے کچھ نہ کچھ ہراساں

میں مالی مدد بھیج کر اور بین الاقوامی فوجی دستہ میں ہندوستانی سپاہیوں کو بھرتی کر کر اسپین کی حکومت سے انہی ہمدردی کا اعلان کرتا ہے۔ لیکن ہمارا ادب خیالات میں وسعت پیدا کرنے والی ان تحریکوں سے سر اسرگاز ہے۔ کوئی نظم۔ کوئی افسانہ اور ڈرامہ یا کوئی ادبی مصنف ہم اپنے ادبی رسالوں میں مشکل ہی سے پائیں جس میں اعلیٰ کے خلاف اظہار نفرت، چین کے ہماروں کے لئے ہمدردی اور محبت کے خیالات کا اظہار ہو، فلسطین کے عربوں کے لئے ادب میں جتنی ہمدردی کا اظہار ہو رہا ہے وہ صرف مذہبی نقطہ نظر سے جس کو بین الاقوامی وسعت نظری سے کوئی تعلق نہیں۔ یہاں پر یہ بھی عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ آج ہندوستان میں دنیا کا سب سے ترقی یافتہ زبان بن گیا ہے تو یہ کچھ لینا چاہیے کہ وہی زبان ترقی کیلئے ہندوستان کی شہر کہ زبان بن سکتی ہے جس میں دوسرے ممالک سے گفت و شنید کرنے کی آسانیاں ہوں، اور یہ آسانیاں اُس وقت تک بہم نہیں پہنچ سکتیں جب تک کہ ہمارا ادب مختلف ممالک کی تحریکات سے اپنی ہمنوائی کا ثبوت نہ دے۔

آخر میں ترقی پسند ادیبوں سے میں پھر عرض کروں گا کہ جب آپ کا دل کسی بیکار ہندوستانی نوجوان کو خودکشی کرتے دیکھ کر کھول جاتا ہے جب آپ ہندوستان کے عوام کو ہنشاہیت کے مظالم سے کچلتے دیکھ کر نظام کے خلاف ایک زبردست احتجاج کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں، تو پھر آپ کے دل میں چین کے بپا دروں کو کم گلوں کے شہداء جھیلنے اور جا پانی ہنشاہیت کی آغوشیں برداشت کرتے دیکھ کر گوش کیوں نہیں پیدا ہوتا ہندوستان کی جس بھوک اور منگی کے نظارے ہم کو ٹھوڑی دیر کے لئے ساری دنیا میں آگ لگا دینے کا خیال دلا دیتے ہیں تو جب اسی بھوک کے خلاف اور اسی منگی کو مٹانے کے لئے جب دنیا کے دوسرے گوشوں میں لڑائی ہوتی ہے تو ہم اُس کی ہم آہنگی کے لئے کیوں نہیں تیار ہوتے، ہمارے ادیب کا یہ فرض ہے کہ دنیا کی مختلف تحریکوں کی ایک بین الاقوامی جھلک ہمارے سامنے ضرور پیش کرے۔ اور ہمارے ذہن کو اس طرف منتقل کر دے جب کہ دنیا کے ہر کونے میں جنگنے والی آگ ایک بڑے شعلہ ریز شعلہ میں منتقل کی جائے۔

کی کجیاں حکومت کے ایوانوں سے نکل کر میدانوں میں حرکت کرنے والی اکثریت کے ہاتھوں میں منتقل ہو گئی ہوں۔ تشدد سے غافل ہو، اور جب دونوں جنگل کے اُن جانوروں کو جن پر کل تک دست درازیاں دوار کئے تھے جنگل کی شاداب وادیوں کی تھیں دلا دلا کر اپنی مدد کے لئے بلا رہے ہوں اُس وقت: — اُس ناکہ لمحہ میں یہ غلام اور سپاہان اہلین اور ان دونوں ہلاکت آفرین بھیرپوں کا فتنہ کر دیں۔ اسی وقت وہ اپنی اقتصادی آزادی کا سب سے پوری قوت اور آواز کی پوری ہم آہنگی کے ساتھ اٹھ کر سریاہ دارا زبھٹوں کو روندتے ہوئے دنیا کے ہر گوشے پر چھا جائیں اور طاقت پر غلبہ حاصل کریں — یہ گزشتہ جنگ عظیم میں ہو چکا ہے اور تاریخ اپنا یہ کارنامہ آئندہ جنگ عظیم میں ایک بار پھر دہرائے گا۔

ہمیں چاہیے کہ ہم آج بہت صاف طریقہ سے اس حقیقت کو سمجھ لیں کہ دنیا کی سیاست اس وقت قومیت کے تنگ چوے کو اتار کر بین الاقوامی لباس زیب تن کر رہی ہے، یہ معلوم قوم آج دنیا کی مظلوم اقوام کی آواز پر آواز دیتی نظر آتی ہے، ہر غلام ملک جب ہنشاہیت کی سفاک دوقلوں کے خلاف جہاد کرتا ہے تو وہ اپنے نعروں کے ساتھ دوسرے غلاموں کی آواز کے لئے نعرہ بھی لگاتا ہے۔ اور یہ واقعہ ناقابل انکار حتمی درست ہو چکا ہے کہ دنیا کی کل سیاسی تحریکوں میں تمام انسانیت کی جدوجہد کو نظم کرنے کی تحریک بڑی سرعت سے دماغوں میں بڑا پکڑ رہی ہے۔

اس مسئلہ پر ملک کے ادیبوں اور خصوصاً ترقی پسند ادیبوں کو خاص طور سے متوجہ کرنا چاہتا ہوں، کیونکہ یہی وہ پہلو ہے جہاں ہمارا ادب ہماری سیاست سے بہت کافی بچھو گیا اور یہی وہ بڑی تحریک ہے جس کی صحیح تصویر پیش کرنے سے ہندوستانی ادیب کیسے غافل ہو رہا ہے۔ آج دنیا میں جو بڑی تبدیلیاں ہو رہی ہیں ہندوستان اُن سے روز بروز زیادہ متاثر ہوتا جا رہا ہے، وہ دوسری پامال اقوام کی ہمدردی میں آواز اٹھاتا ہے۔ جب غلام ممالک اپنی آزادی کے مسئلہ کی جڑیں چھڑا کر شروع کرتے ہیں تو اُن کی بہت اخراجی کرتا ہے۔ یا جب کوئی سامراجی قوت کسی گزور ملک کی آزادی پر ڈاکو ڈالتی ہے تو اس کے خلاف اپنے غم و غصہ کا اظہار بھی کرتا ہے۔ یوم مشن۔ یوم فلسطین۔ یوم چین وغیرہ منکر وہ اپنی ہمدردیوں کا اظہار ان غریب اور مظلوم ممالک کے ساتھ کرتا ہے، اسپین

# تضاد

آسماں پر چھاپی تھیں شام کی تاریکیاں جیسے بیوہ کے غم ناکام کی تاریکیاں  
اور کلکتہ کے بازاروں میں روشن تھے چراغ جس طرح مُغلس کے دل میں یاس و محرومی داغ  
سیر کو نکلے تھے باہر شہر کے سرمایہ دار دعوتِ اہل نظر تھاجن کی پوشش کا نکھار  
مطمئن چہرے خوشی کے نور سے شاداب تھے عیش وائے سُکرانے کے لئے بیتاب تھے  
اُڑ رہے تھے اہل زرخرص و ہوا کے زوہیں سانس لیتی تھی امارت موٹروں کے شور میں  
پھر رہی تھیں ہر طرف ڈالے ہوئے ہاتھیں چاہتے تھے دلکش عورتیں کچھ خوشنماہروں کے ساتھ  
وہ تبسم ریزیاں باہم اشارے دیکھ کر آسماں پر سُکڑاٹے ستارے دیکھ کر

میں بھی اس ہنگامہ عشرت میں تھا کھویا ہوا

رُوح میں بیداریاں تھیں ذہن تھا سویا ہوا

ایک بیک کانوں میں آئی اک صدائے وُخراش جس نے پیدا کر دیا جذبات میں اک ارتعاش  
فکر نے منزل بدل دی، دل کی راہیں مُڑ گئیں میں نے دل پر ہاتھ رکھا اور نگاہیں مُڑ گئیں  
دیکھتا کیا ہوں کہ اک بڑھیا بہت زار و خفیف مُضطرب مُغلس، پریشاں حال، افسردہ، ضعیف  
جبر کے شدتِ درد و غم و آلام پر کہہ رہی ہے ایک پیسہ دو خدا کے نام پر  
پچھے پچھے آرہا ہے ایک ٹوڑھا آدمی اس طرح چلتا ہے جیسے کوئی اندھا آدمی  
جسم میں عرش ہے، منہ پر جھڑیاں ہیں، سر پہ خاک دیکھتا جانتا ہے شاید کوئی خواب ہو لٹاک  
ساتے تھیں میرے اپنی قوم کی رسوائیاں رفتہ رفتہ وقت نے لے لیں کئی انگڑائیاں

نصف شب تک اہل دولت دل کو پہلاتے ہے

اور یہ دونوں رُک یرِ ٹھو کریں کھاتے ہے



نہیں؛ میں سلطان کی عاشق ہوں، اور اُسی کے خدائے اسلام کی بندی؛ میریا۔ آج بھی وہ فتنی سی سہری صلیب ہمارے سینے پر، ہمارے اصلی کعبۂ ایمان کی، اک قطب ناک کی طرح، قبلہ نائی کر رہی ہے؛ یہ صلیب ہمارا سیحی ولایت پر اک ٹھہر چلائی ہے؛

زارہ۔ وقت ولادت پیسنے کے چھینٹے ہماری لوح دل پر کوئی تحریر ایمان نہیں لکھا کرتے؛ یہ دراصل ہماری تعلیم و تربیت ہوتی ہے جو ہماری منکم ایمان بنتی ہے؛ مجھے اور اُن مغلّی ہی سے محبت ہوئی کا دین زبان، اور نامی شریعت و شعار لکھا گیا ہے۔

(سلطان عثمان داخل ہوتا ہے۔)  
عثمان۔ شریف و شیریں زارہ، قبل اس کے کہ ہماری شادی کا رشتہ ریشی میرے تہارے درمیان من تو شدم تو من شدی کے انقلاب کا فتح باب کرے۔ میں تجھے یہ بات بتائے اور جتاے دیتا ہوں کہ میں نے اُن آسماں پسند ہمت رگ، رخصت لاز و وجہ جو مرگسم و شہار اسلام کو خیر باد کہہ دیا ہے جو فقہار دُنیا پرست نے سلاطین کی کاچوچوں کے لئے اخراج کر رکھے ہیں؛ امراے اسلام بندگان ہوس بن گئے، اُنھوں نے عسکراپوں کو گجیات اور خدام کے اُصلیل بنا ڈالا؛ پھر میں نے اپنی آنکھوں سے اُن کے پرچم رنگوں ہوتے دیکھے؛ غیور سبھی مجاہدوں نے اُن کی سلطنتوں کو درہم برہم کر ڈالا؛ لیکن تم میری زارہ میری تہنا بیوی ہو گئی؛ میری واحد و موعودہ العفت!! اور میں تمہارا عاشق ہوں گا۔

اور تمہارا شہیدائی و فدائی؛ تم میری جان جاں ہو گئی۔ تم میری میری روح پروری کر دو گئی۔ تمہاری کنا بیشیریں سے براہ راست میں میدان کا زارہ میں اُتروں گا؛ میں سلطنت اسلام کے سمار شدہ قصر کو بار و گرتغیر کر دوں گا؛ اور اُسے روئے ارض کی اک جے پناہ طاقت میں تبدیل کر دوں گا؛

زارہ۔ میرے آقا، میری روح و رواں میرے محبوب، میرے معبود!!۔۔۔۔ اگر تم میرے غلام بے دام بھی ہوتے،۔۔۔۔ صبیحی کہ اس وقت میں تمہاری کینیز ناچیز ہوں!۔۔۔ اور میں علّٰی عالم ہوتی، تب بھی میں فدا و تخت سے ہرنگوں ہو کر تمہاری حقیضی اسیری تک اُترتی۔ اور بہتیں اٹھا کر اپنا پہلو شین بناتی؛ عثمان میں خود تمہاری والدہ و شہید اپنا تمہاری ثروت و شوکت کی دلدادہ نہیں؛

کیا کُثر ہے کہ اب تمہارے آسروں میں اک تم منکس نظر آتا ہے؟۔۔۔۔۔ کیا ہنری لوٹ آیا؟۔۔۔۔۔ اترو اسے بدھارے ہوئے و دوسرے آتے ہیں؛ سلطان عثمان کی طرٹ سے اُس کی مشروط رہائی کو اس سے مکمل بھلا کیا نہ گذرا ہو گا؛ کیا کچھ ہنری آگیا ہے؛ اور ہم سب کی رقم فدیہ ادا کر دی گئی ہے؟

زارہ۔ اسیران جنگ جو قول و قرار اپنی گلو خلاصی حاصل کرنے کے لئے کیا کرتے ہیں، شاد و نا دہی اُھیں و فاکا کرتے ہیں؛ ہنری، جو ہمارے یارانِ زندان میں سے تھا، اب نہ کبھی آئے گا، نہ میں بند اسیری سے چھڑائے گا؛ یارانِ تیز زالی سے ہے یہ گلہ کہ ہائے ہم کو اسیر پنچو صیب و گئے؛ لیکن بہن میریا، اب مجھے بھی آزاد ہونے کی کہاں ہوس باقی ہے؟ بع ہوں گرفتار و فاندان سے گھبراؤں گی کیا؛

میریا۔ اچھا!۔۔۔۔۔ لیکن فرض کرو کہ وہ فرضی نائٹ آج ہیں چھوٹنے کے لئے آجئے؟

زارہ۔ سر زمینِ سفلین میں عرت ایک شخص ہے جو میری بند آزاد کر سکتا ہے، دوسرا کوئی نہیں؛۔۔۔۔۔ اور وہ ہے ہمارا آقا سلطان عثمان!۔۔۔۔۔ وہ شریف ترین، شجاع ترین، شیریں ترین روح ہے جو اس ارضِ مبارک کی خاکِ پاک سے اُٹھی ہے!۔۔۔۔۔ اور اُس نے مجھے قبل ازیں غم و غم سے آزاد کر دیا ہے!۔۔۔۔۔ تاہم میں اپنے کو ہمیشہ سے زیادہ اسیر دیا بزنجیر پاتی ہوں!!

ہوں گرفتار العفت و صیب!۔۔۔۔۔ ورنہ باقی ہے طاقت پر داز! میریا۔ سلطان عثمان؟ سلطان عثمان!۔۔۔۔۔

زارہ۔ مجھے محبت کرنا ہے؛۔۔۔۔۔ میں تمہارے مُبتدا کی خبر بہر پہنچاتی ہوں!۔۔۔۔۔ اب دوسرا خردہ جاں نواز سُنو کہ اُس نے مجھے اپنی خرم محرم بننے کا پناہ خوش بھی دیا ہے!!۔۔۔۔۔ سلطان کا ہرہ و قدس بننے کا!! عطا جاہ و حلال میش و صالی تباں نہ لُچھ!

میریا۔ ناہنک، ناہنک!۔۔۔۔۔ اک دخترِ سحیت، اور اس پیش کو نوازے؟! پھر اک خوشی سندان کی آغوش بھی تمہارے آگلیہ صحت دہی کی کیا رعایت کرے گی؟

زارہ۔ دخترِ سحیت؟! یہ کیا کہا؟ مجھے مادرِ سحیت کا یہ نسب روحانی نصیب

بخشنے کے لئے تیار ہے: زائرہ اک نجیب الطرفین مسیحیہ ہے، اور ایلفرڈ کابل رحم پیرا سیر ہے!

عثمان۔ بس جو کچھ میں نے کہدیا ہے اُس سے میں باز آنے والا نہیں! بس اب تخفیف تصدیق! ایک دن کے اندر اندر میرے سارے عطایا و مراعات کو لے کر رخصت ہو جاؤ! ہتھاری تاخیر میرے عتاب کی تعبیل کا باعث ہوگی! (زائرہ کی طرف متوجہ ہو کر) اچھا زائرہ! تم مجھ سر کی طرف صریح حرام ہو! میں بھی جلد حضورؐ میں باریاب ہوتا ہوں!

(زائرہ اور بہتری مختلف دروازوں سے رخصت ہو جاتے ہیں)

## دوسرا ایکٹ

زائرہ اور بہتری

زائرہ۔ پیارے بہتری! سلطان نے ادراہ ہر بانی مجھے اجماعاً سختی ہے کہ تم سے ملاقات کر لوں! اور میں ایک خوشخبری کی پیامبر بن کر آئی ہوں! تم جانتے ہو میں ہتھاری کتنی ممنونِ نوازش ہوں! ہم چھوٹے ہی چھوٹے تھے کہ سلطان صلاح الدین کے قیدیوں کی طرح ایک ہی بندی خانے میں دبا کرتے تھے! اس قید کے زمانے میں ہم اسیر محبت ہو گئے، اور ہم جیسے سے آزاد! ہتھاری خاطر میں نے کتنی کوشش و کادش کی ہے، اور آخر کار اس چیز کو حاصل کر لیا ہے جو تمہیں اتنی عزیز ہے! — یعنی بابائے محترم ایلفرڈ مدظلہم کی رہائی! آج وہ حکم سلطانی سے آزاد ہیں!

(ایلفرڈ داخل ہوتا ہے)

ایلفرڈ۔ ہاں، بلاشبہ میں آزاد ہوں! لیکن وہ سب کہاں ہیں؟ — میرے بچے: سیری گوداؤن سے سوئی کر دی گئی! میرا بچہ اور میری بیٹی قیدی کے سقوط کیے بعد قیدی بنائے گئے تھے اور سلطان عثمان کے محل کی حراست گاہ میں منتقل کئے گئے تھے!

بہتری۔ مجھے یاد ہے، مجھے یاد ہے! میں اُس وقت بالکل بے ہوش تھا، لیکن آج بھی اپنی خوابوں میں اُس سوختہ جنت جلتے ہوئے شہر کو دیکھتا رہتا ہوں! نیز ان عرب باجوج و ماجوج کو جیسیج کی بھیڑ ڈال کر تہ تیغ کر رہے تھے! ناخوہ میرے ساتھ، چند اور اسیروں کی صحبت میں، بیت المقدس بھی گئی تھی۔

(قداد داخل ہوتا ہے۔)

خالد۔ بہتری، وہ مسیحی غلام جو مجھ کے گلیا تھا کہ واپس آئے گا، اور قدیہ دے کر اپنے سارے رفقاء مسیحی کو چھڑائے گا، آیا ہے، اور میرے آقا جعفر کی باریابی کی درخواست کرتا ہے!

میرپا۔ تیری شان، اسے شہان!

عثمان۔ اُسے آنے دو!

(بہتری داخل دربار ہوتا ہے)

بہتری۔ شہامت و شرافت کے پیکر سلطان ذی شان! خاکسار باد و گشت اند و حضوری ہوتا ہے! میں اُس عہد کو پورا کرنے کے لئے حاضر ہوا ہوں — زائرہ اور میرپا اور وہ دس صلیبی مجاہد، جو سیلیانہ کے معرکے میں سلطان کی حراست میں آئے تھے ان سب کی رقوم قدیہ موجود ہیں، لیکن خود اپنا ذریعہ مالی میں ہم نہ پہنچا سکا جس کی پاداش میں میں اپنی گردن دو بارہ طوق اسیری کے لئے پیش کرتا ہوں!

عثمان۔ شریف النفس صلیبی! تو نے خوب ہی اپنا قول نباہا، لیکن شرافت و محبت کے کارناموں میں اک فرزند اسلام اک سچی غلام کو بھلا کر بازاری دے جانے دے گا! اچھا تم بھی دوسروں ہی کی طرح آزاد ہو! جو ذریعہ تم لائے ہو اُسے میں ہی عطائے تو بقیائے تو کرتا ہوں، نہیں، بلکہ یہ رقم سہ چند کر کے تم کو واپس کی جائے گی! پھر بھی نہیں، بلکہ اُن دس صلیبی مجاہدوں کے بجائے میں پورے ایک صد غازیانِ صلیب کی گلو غلامی کروادوں گا! پھر تم کو یہ بھی اختیار ہے کہ جس زندان خانے میں سے جاوے یہ سٹو شدہ سونے کی تعداد منتخب کر لو! — تاہم ایلفرڈ اس سے سختی رہے گا! — میں اُس کے بارے میں کوئی رعایت نہیں کر سکتا! وہ اس شاہی خاندانِ بونین کا کلہ گوبے جس کے زیریں کبھی یہ زمین وہ چمپی ہے! اس وہ میرپا سیاسی حریف ہے! —

اب رہی زائرہ — وہ اہلئے اجمال زائرہ! — تو اگر سارے شاہان و ملائبانِ فرنگ مجھ پر اپنی جبرمی افواج کے طوفان کو ریل دیں، تب بھی اس گوبر نایاب کو میری صدف سینہ سے نکال کر نہیں لے جاسکتے!

بہتری۔ کیا فرمایا سلطان نے؟ کیا مالی فتنہ اسیرِ مسلم کو اپنا وہ بیان سنیں یا دہش کہ وہ کمزیر زائرہ (اور گبر اسن ایلفرڈ کو قدیہ دہائی

آگئیں اٹھائے دیکھ، جدہر تیرا جی چاہے! اور آیات اللہ کے منارے  
تیری نظروں کے سامنے بند ہوتے دکھائی دیں گے! ہاں، ایک ہی نگاہ  
غلامانہ ڈال، اور دیکھ لے کہ وہ ہے سامنے وہ پہاڑی جہاں تیرا  
نے ہمارے جان دی تھی!!

زائرہ - باپ! میرے باپ! مجھے بتا کہ میں کیا کروں!!  
ایغفرؤ - اُف! اس میرے بڑے چاہنے کے بھڑک اٹھے ہوئے سر پر  
غم اور شرم کا بارگشت اٹھالے! ان کہنے کے میں سبھی ہوں!  
زائرہ - میں سبھی ہوں!

(سلطان عثمان داخل ہوتا ہے!)

عثمان - مودود! یہاں! بد آموزی، باطل کو شہ، خنڈ پر وازی  
جاری ہے!! کفار لا اعتبار! نکھر یہاں سے!..... کیا میرا فرمان  
تہا سے لے لے نہ خاک کو فی العور یہاں سے نہ کا لاکر جاؤ!!  
اسیجی در انداز رخصت ہو جاتے ہیں! زائرہ دم بخود کھڑی رہ جاتی  
ہے۔۔۔۔۔ زور زور اور لرزہ بر اندام!

(عثمان، زائرہ سے) آؤ میری زائرہ! ہماری شادی خانہ آبادی  
کی تیاریاں مکمل ہیں! عود کے بڑات، مسجد کی فضا کو بستر کے ہوئے ہیں!  
میری قدم کے نشستاں جمال کی نظریں تہا سے جلوے کی جو یا ہیں! سارا  
جشن عروسی تیار ہے! تخت شاہی تہا سے قدم کا اور عثمان کا سینہ تہا  
درد و مسود کا منتظر ہے!

زائرہ - میرے اشد، میں کہاں جا چھپوں! اے میرے باپ کے خدا،  
میری مدد کر!..... عثمان! اگر تم کو مجھ سے محبت ہے تو بلند اس  
شاہی کوٹھڑی کر دو! اور ہاں میری روح کا واسطہ کر مجھے بزرگ سال  
ایغفرؤ سے ملنے دو!

عثمان، ایغفرؤ! اس کوٹھڑی فلام سے تم کو کیا واسطہ! تم کوئی سیسی  
ہیں! تم ابتدائے خلقی سے اسی خدا کی حمد کو ہر جگہ کا میں شاکر ہوں!  
زائرہ - بہر حال، شادی کو ابھی اٹھا رکھنا چاہیے! ج  
نہ چھوڑے گھٹت باؤ پہاڑی راہ لگ اپنی!

عثمان - آنچہ می شوم بہ بیدار ست یارب یا بجزاب!!.....  
زائرہ - یہ تم جو بول رہی ہو!!

ایغفرؤ (آوازہ) در ہنری کی طرف دیکھ! تم دو دن ساتھ ساتھ پاؤں بچر  
کر کے یہاں لائے گئے! قبیرہ کی تعمیر کے وقت!..... میں ان حوادث و  
مناظر کا شہد نہیں بنا، میری دنیا تائیک تھی! میرا محسوس تھا تیرا ہوتا تھا کہ  
میں کچھ دیکھ نہ سکتا تھا! میری آنکھیں اب تو روشنی کی خور گئی ہیں! یہی ہیں!  
یہ زنجیر کیا میں!؟

(وہ زائرہ کی گردن کی زنجیر کو پکڑتا ہے، اس پر ٹھکتا ہے، اسے دہسے  
بھاڑ بھاڑ کے دیکھنا چاہتا ہے، اور پھر ایک دم اس زنجیر کو گھینچ لیتا ہے،  
جس پر زائرہ کے گلوئے حسین کی شہری صلب ٹھٹھک جاتی ہے!)

الحمد للہ! تم! الحمد للہ! میرے بچو، بولو! تو تعریف ہمارے خداوند خدا  
کی! یہ وہ صلیب جو میری اینداز بری کو میرا روحانی پد یقی! اور جسے  
اُس نے اپنی قرب دیدہ کے گلے کا ہار بنایا!..... اور ہاں ہنری! جس  
وقت اُن میدردوں نے میرے پہلو سے میرے منہ مل کر کو کاٹ لیا تو مجھے یاد  
پڑتا ہے کہ اُنھوں نے اُس کے پسینے کے بالائی حصے کو زخمی کیا تھا!.....  
وہ دم۔۔۔۔۔

ہنری - یہ سوجھ بوجھ پد محترم!  
اسنری فی العور ایغفرؤ کے قدموں پر گر پڑتا ہے! ایغفرؤ اُسے گلے لگاتا  
ہے، ساتھ ہی اپنا دوسرا غالی بازو زائرہ کو گٹا کر گرنے کے لئے پھیلاتا ہے! ہا  
زائرہ - باپ! میں آپ کی آغوشِ الفت کے قابل نہیں! میں مرتد ہوں!  
میں مسلمان ہو گئی ہوں!

ایغفرؤ - اے کاش کہ اک ربی مخالفت کرے، اور مجھے خاکِ سیاہ کر ڈالے!  
میں پاک ہشتاد سال پر دنیا ہوں، اے خدا! میں نے پوسے ساٹھ سال تیری  
راہ میں قتال کیا ہے! پھر یہ طویل سال تک میں تیری ہی رضا جوئی میں ایک  
لذاتِ سبھا کے اندر تکمیل ہوا کیا ہوں!! دشمنانِ حق نے میری بری اور میرے  
بچوں کو شہید کر ڈالا! میری خدا پرست قوم کے کثیر التعداد کے حلقوں سے  
اک جوئے طان بہادی! اس ارض مقدس کو دیران کر ڈالا! اولے میرے  
خداوند خلائج! اگر پاک کو تیرے قدموں نے نس کی تھام، وہاں اُنھوں نے  
اپنے اسنام و آذنان نصب کر دئے!! اور آج میری جی تیرے دشمنوں کی مصروف  
میں کھڑی ہوئی ہے!..... تیرے دامن پاک کا اک داغ!!.....  
ہیں نہیں میری بچی! تو خدا کے قدس کی گور سے گریزاں نہیں ہو سکتی!!

زائرہ - قربان سلطان! اس کیزنا چیز میں آپ کے عتاب کی تاب نہیں آتی؟  
 من شیخ جاں گودام، تو صبح و گلشنی سوزم گرت دینم، میرم جو رخ منائی!  
 نزدیکت امیں بچم، دور آہنجان کد گلبم، نے تاب وصل دارم، نے طاقت جلدائی!  
 میرے آقا! کم از کم اس وقت مجھے رخصت دیجئے، میرے آنسوؤں کو  
 میرے کچھ اجزاں میں رو پوش ہو جانے دیجئے!! (جانا چاہتی ہے)  
 عثمان - تو پھر اس سن سفید ایلیغز کو مفت میں کیوں ساتی ہو؟  
 اُس فرزانہ سی جوانِ رحمن، ہنتری، کا نام کیوں نہیں لیتیں؟!۔۔۔۔۔ ہاں،  
 یہ زوجان ہنری ہی ہے جو زائرہ اور عثمان کے درمیان حائل ہو گیا ہے!!  
 ۔۔۔۔۔ بلاشبہ وہی ہے! تب ہی تو یہ پروانہ پھر ہنتری شیخ حسن کا طواف  
 کرنے لوٹ آیا، کامل دو سال کے فضل نے بھی اُس کے سُورِ الفت کو سُورہ  
 نہیں کیا!!

(خالد داخل ہوتا ہے)  
 خالد - میرے آقا! یہ پیام میرے ہاتھ میں ڈالا گیا ہے! اک میسائی  
 قاصد اسے آستانہ سلطانی پر لایا!  
 عثمان - (مکتوب کو کھولتا ہے، اور پڑھتا ہے) پیاری زائرہ! اپنا  
 غزوہ، ہینغز کو حال کن تسلیم ہو گیا! اب اک ہنایت مزور پیام ہنتر سے  
 گوشنار کرنے کے مجھے تم سے اولین فرصت میں ملنا ہے! کیا تم آج  
 رات کو آ سکتی ہو؟۔۔۔۔۔ اسی سچ کی سُرنگ سے! میں ٹھیک نعت  
 شب کے وقت تمہیں وہاں بلوں گا!

(عثمان، خالد سے) خالد! یہ خط زائرہ کے نام کا ہے، اسے اُس کے  
 پاس لے جاؤ!

خالد - میرے آقا!!  
 عثمان - ہاں ہاں، اُسے بے تکلف جانے دو، اور اپنے محمدیان  
 راز سیموں سے ملنے دو! میں بھی وہیں اک گوشے میں کھڑا ہو کر ان کی  
 گفت و شنید کا سامع بنوں گا،

## تیسرا ایکٹ

سلطان عثمان اور شاہی پیش خدمت خالد  
 عثمان - خالد! زائرہ میری جانِ جان ہے! میں اسے کیسے امانال

سکتا ہوں! اُمت ج  
 جو اپنا دشمن جاں ہو دی دل کی دوا طہیرہ!!  
 خالد - کیوں، کیا ابھی وہ آپ کی امانت وار بدل جی ہوئی ہے؟  
 عثمان - صرف ایک شیعہ اُمید ہے جو ہنوز اُفتی پر عزوب نہیں ہوئی!  
 خالد - وہ زوجان مسکبی محابد بڑا دلدادہ تھا اور ناشکیبا واقع ہوا ہے جس  
 وقت وہ اُس دن اک مدت کے بعد واپس آکر زائرہ سے دوچار ہوا ہے،  
 اُس نے زائرہ کے لئے اپنی شینگلی دا اضطراب قلبی کا بے نقاب مظاہرہ کیا!  
 میں دونوں کی ایک ایک اد کو عقائی نظروں سے دیکھ رہا تھا، میں نے  
 فرانسیسی زوجان کی ولد و زائیں اور میکا نگا ہیں صاف صاف نہیں،  
 اور دیکھیں! اور اگرچہ یہ واردات میرے جذبات رشک و رقابت کو  
 آتش زدہ کئے دے رہے تھے، تاہم میں خاموش یوں رہا کہ میں نے یہ بھی  
 اچھی طرح دیکھ لیا کہ خود زائرہ ان راز و نیاز پر غیر متاثر رہی!!

خالد - لیکن میرے آقا! ہنتری، زائرہ سے ملاقات کی اک موکد  
 فرمائش کر رہا ہے!!  
 عثمان - اُسے کرنے دو! میرا خیال ہے زائرہ اس پیام پر لبیک نہ  
 کہے گی! تاہم تم مسجد کے پاس حنزدور جا بیٹھو، اور بہرِ نیاز سہاکی کے ساتھ  
 وہیں قنوت کرو! جس وقت وہ نصرانی زوجان وہاں نظر پڑے اُسے  
 گرفتار کرو!

(عثمان و خالد رخصت ہو جاتے ہیں، اور زائرہ اور تیسرا داخل  
 ہوتے ہیں!)

زائرہ - دیکھو، یہ ہے وہ خط! پڑھو اسے، اور بتاؤ مجھے کہ کیا  
 کرنا چاہیئے؟

میریا - یقیناً تمہیں ہنتری سے یہ ملاقات کرنی چاہیئے!  
 زائرہ - نا ممکن! ہنتری سے ملنا موت سے طاقی ہوتا ہے! پھر یہ کہ  
 کسی سچی جاؤں کا خطرے میں ڈالوں گی! انہی میں میرا بھائی بھی ہو گا! اور  
 وہ سارے سیمی قیدی محنت میں مارے جائیں گے جن کی رہائی کا سلطان حکم  
 دے چکا ہے۔

میریا - نہیں نہیں، میری بھولی زائرہ! جس شدید اندیشے کو یہ خلاف  
 پرست مینا کا نہ سمجھی کر رہے ہیں تاکہ تم کو ان بید بڑوں کے بچنے نہ کھرے نہات

زارہ - اچھا کہو اُس سے کہ میں اُس کی مراد دل سے دفعتاً کروں گی!  
 --- اب جس وقت وہ مرنے پر پہنچے اُسے سیدھے ہیں لے آؤ!  
 (زارہ رخصت ہو جاتی ہے، اور سلطان اور خالد داخل ہوتے ہیں)  
 عثمان - اللہ اکبر! ایک ایک گھڑی ساتھ قیامت کی طرح گزر  
 رہی ہے، اگر وقت کی رفتار یہی ہے تو میں یقیناً بخون ہو جاؤں گا!! (غلام  
 کو آتا دیکھ کر) کہو کہو اُس نے کیا کہا؟ بال ہاں جلدی کہہ! اے تو بے گلا  
 کہ نہیں!!

غلام - میرے آقا! اُس نے کہا کہ میں کہوں کہ وہ یہاں اُس کا اخلا  
 کرے گی، اُس سے ملاقات کرے گی، اور اُس کے مقصد دلی سے بے دخلی  
 نہ کرے گی!  
 عثمان - اچھا، جاؤ، معلوم ہو گیا!

(غلام چلا جاتا ہے)  
 (خالد سے) اچھا تم بھی چلے جاؤ! ابھی ابھی! ہاں بس رخصت رہو!  
 فوراً میرے سامنے سے ہٹ جاؤ، نہیں تو میرے ہاتھ سے دو چار کا خون  
 ہو جائے گا!!

(خالد چپکا چلا جاتا ہے!)  
 (تہائی میں) میں کہاں ہوں؟ میں کہاں ہوں!! اُنٹ یہ تاریکی!!  
 اہی نفسائے غلامات!! مجھے کچھ سمجھائی نہیں دیتا! --- زارہ! --- زارہ!  
 نہیں نہیں، میں کیوں کسی کو بچا دوں!! ج  
 موت کی راہ نہ دیکھوں کہ بہن آئے نہ ہے!!

آہ امیری خوش تھی کے مطلع ذہن پر یہ آئینہ تاریک اُسی کی کم نگاہی  
 ہی کا تو پرتو ہے!۔

اسے پرتو تہ تاب جہان تاب ادھر بھی  
 سامنے کی طرح ہم پر محب وقت پڑا ہے!  
 ہائے زارہ کی شہر سب شستی جہاں کی یہ پہلی تھی ہے! اور سہ  
 رگ دے میں جب اترے نہر غریب دیکھنے کیا ہو؟  
 ابھی تو تلمی کام و دہن کی آواز سنش ہے!

ہاں زارہ قلاب مہمان کے پاس نہ آئے گی، لیکن ہنسی حریفانہ زارہ  
 کے حواصن پاک کی طرف بڑھ رہا ہے!۔۔۔۔۔ اچھا آ رہا ہے مردود! دھڑک

دیں، وہ اندیشہ نہیں اس قدر شوش نہیں کر رہا ہے! بہتار سے دل نازک  
 کے اس لوفان اضطراب کا حشر پہ بجائے "احساس خوف" کے الگ کیف  
 محبت ہے! --- جس نے بہتار سے دماغ کو کمزور اور مدح کو مضطر  
 کر رکھا ہے، ہنسی قریبی، تم کانپ رہی ہو اس بات سے کہ کہیں اس وحشی  
 انسان (عثمان) کی چشم و آبرو پر کوئی بُنی نہ آجائے! --- وہ عثمان  
 جس کی محبت اک درندے کی دلدادگی شکار سے زیادہ نہیں! کیا سچ  
 مع عشق کا بھوت ایسا ہی اندھا بہرا کرنا ہے؟ کیا تمہاری آنکھوں  
 میں اتنی برائے نام مینا کی بھی باقی نہ رہی کہ تم اُس ملعون درندگی کو دیکھ  
 لو جو بہتار سے سلطان کے سین و سیار چلتی ہے!! وہ اک گرگ جگر خوار  
 ہے، تاہم اک زخمِ حلاوت اُس کے لے آہ کشی کر رہا ہے!! ج  
 لغو بر تو لے چرچ گرداں لغو!

زارہ - آہ میرے تیا!۔۔۔۔۔  
 دل کو روؤں کہ یا جگر کو تیر؟  
 میری دونوں سے آشنا کی تھی!

ایکاش کہیں اُس سرزمینِ سحبت کی زیارت کرتی جس میں میرا بھائی مجھے لجانا  
 چاہتا ہے! وہاں کہتا کہ مجھے عثمان کی خلوت الفت ہی میسر ہوتی!۔۔۔۔۔  
 میرے تیا! میں اک دو گونہ دُخ و عذاب میں مبتلا ہوں! اس اذیتِ دوئی میں  
 میرا دل بجا گرفتار ہے! وہ التزامِ فرض اور وفائے عشق کسی کا بھی اہل  
 نہ رہا! وہ اک قیامتِ غیر تھلک کے اندر متزلزل ہے! اور میرے اللہ! مجھے  
 میرے تاریک قیامت سے بچات دے!۔۔۔۔۔ ہاں، میں اُس سے ملو گی!  
 اُس سے دو دروہا تیں کروں گی! اور جس وقت وہ قدر سے رخصت ہو جائے  
 میں اپنی زندگی کا راز سب سے اپنے فاش پرتے نقاب کر دوں گی! وہ میری  
 "آئینہ دل" کا بے پردہ مطالعہ کرے گا، اور اک غریب نصرائی لڑکی پرتوں  
 کھائے گا، جو سلطان کی محبت اور سچ کی ارادت کے درمیان معلق ہو رہی ہے!  
 --- اچھا ہرج با داباؤ! بھجور سچ غلام کو جو یہ تحریر یہ پیام میرے پاس  
 لایا!

زارہ - (غلام سے) تم ہی یہ خط لائے تھے، مزارِ شہیدی صلی مجاہد کے  
 کے پاس ہے؟  
 غلام - جی ہاں!

نہا رہی شریک کار ہیں! آنے وہ ان سب سیدہ کاروں کو! سبھی کو وہ مل  
جہنم کر دوں گا! جہنم جہنم! ----- ہاں کیا میرا عزم انتقام نہ بجا  
ہے؟! ----- خالد! خالد! پلٹ آ!

(خالد داخل!)

کہو وہ نظر آیا؟ تم نے اسے گرفتار کیا؟

خالد۔ میرے آقا! وہ ابھی تک نہیں آیا!

عثمان۔ رات! رات! خفاک رات!! اک طرف ان غلات!!! لے

شبہ و بجز! اپنی ساری سیما ہی کے باوجود تو ان کفار زشت کار کے

جرم سیماہ کو کیوں کر اپنے پردہ تازیکی میں چھپا سکے گی؟! ----- آف

زائرہ! تیری میرے حرم دل میں یہ قدم ثانی و مفرد آئی! اور پھر لڑکی

گریز پائی!! آہ! آہ!

محبکہ خبر نہیں تھی کہ ہیں کتنے ہفت خوں

جام شراب ناب و لبہ میگا رہیں!

آف! یہاں یہ عشق مجنونانہ! اور اس پر ایسا جفا کار تازیانہ؟!

خالد۔ میرے معلوم آقا! تیرے پیش و مشیون اب ختم ہونے دیجئے! اور

اپنے ہاتھ میں جسم انتقام سمیٹ لے!

عثمان۔ ادھر سے خدا! اک عورت کسی ناگن ہوتی ہے! اپنی نیرنگی

میں بالکل اک گرگٹ! آف! رنگ جناہ خون شہیدان کو کس طرح اپنی ہی

طرح اک نمزدبے بود! سمجھتا ہے! آہ خالد! تم نہیں جانتے کہ میں اس

گردن ردنی غزالہ گریز پا کا کیسا قاتیل خرم ہوں! آف خالد! درم دم!

دوڑ! دوڑ! مجھے اس صدمہ کا جناح سے بچا! آہ زائرہ! تو کیسی سبھی چھری

ہے!! وادیا! وادھیبتا!!

خالد۔ آئیں! سلطان عثمان! اور صرحت شیون و دین!! اسے خدا یہ

میں کیا دیکھتا ہوں؟!

عثمان۔ ہاں ہاں، ٹھیک ہے! تیرا ان سلطان کے یہ پیسے آنسوؤں

جو اس کی آنکھوں سے نکلے ہیں! ہاں وہ خون کے گھونٹ بن کر پئے جائیں گے!

ان کی منہی اک ذائقہ باز گشت چمکائے گی! ہنسیاں کہ ان میں خون محبوب

کی رنگین ہے! اور مرگہ عدوی زہرناکی!! ----- زائرہ! میرے سر پر

پیچے وہ آب کرم! اور اب برقی سودا کا یہ پرچم!! اپنے کر قوت کے

خیال سے نہ آشنا لڑکی! تجھے کیا خبر کہ تو نے حتی زلیست کھو دیا ہے!!

تیرے سر کے شہنہے بالوں پر خونی موت مورچیل کر رہی ہے! -----

آئیں یہ کیا!! یہ کون!! خالد! جلدی جلدی! گرفتار کر آئے! گرفتار!!

ہاں! اس موزی کو پاؤں خبر کر کے کش کش! کش! میرے حضور میں لا!

(خالد جھاک کر جاتا ہے! زائرہ اور میرزا دھندلی شریک کار میں دھکی

دیتی ہیں!)

زائرہ۔ آؤ میرا!

عثمان۔ وہ آواز! ----- یہی وہ صوت جاں نواز ہے جو کبھی

میرے لئے اک کھڑکھڑتی تھی! لیکن آج کی رات اک خنجر خور زینہ! آف

نیرنگ ساز تھی! میں تیری خون آشام رنگ طرازی سے اب فرب میں

نڈاؤں گا! تجھے تیرے اصلی رنگ میں بے نقاب کر دوں گا!!

(وہ میان سے اک نیچو نکلتا ہے! اور پچکے پچکے آگے بڑھتا ہے!)

ہاں ہاں، دبی ہے، دبی ہے! میرے خدا! زائرہ! اور اس کے

ہاتھوں و فانی کشش کی تدفین اس لمحہ سیماہ میں؟!

(خنجر اس کے ہاتھ سے گر پڑتا ہے! اور وہ پچکے پچکے ٹھک آتا ہے!)

آف! یہ خنجر خن! اور اس کا گلوئے حسین؟! حیف جھپر!

زائرہ۔ میرزا! یہ کیا آواز تھی؟!

میرزا۔ اُسی بستی فرانسسی کی آمد کی خبر!

(عثمان معاصر خنجر رکھت ہو جاتا ہے!)

عثمان۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سادی سازش پوری ہست و پزیر چکی!

زائرہ۔ آہ! مجھ پر ہراس و یاس کا غلبہ ہو رہا ہے! آہ! میرا دل

دونم!! کیا یہ تم ہی ہو ہنستی پیارے؟!

عثمان۔ کہیں یہ عثمان! مسخوڑ! ----- وہ جیسے خدا نامہ تم ٹھکرا

رہی ہو۔ نگہ دہ جس سے مشوقانہ معاشقہ کے لئے جا رہی ہو! اور (خنجر چمک

و یہ ہے ہتھار اعلیٰ، ہتھارے رنگین دھوکے کے لئے!!

(زائرہ قدموں پر گرتی ہے! عثمان جھٹک دیتا ہے! اور خنجر اس کے

سینے میں پروت کر دیتا ہے!)

زائرہ۔ عثمان عثمان! ارے یہ تم! تم! آہ!

(جاں بچن ہو جاتی ہے!)

کالک پیام و صیت لارہا تھا جس کی نسبت میں نے پراسید مومہوم واسبتہ کی  
سہی کو شاید وہ اُس کے کردار دل داریت کو سب کے دین حق کی طرہ واپس  
لے آئے گا! لیکن وہ خدا کی فرخندہ دیوارِ حجاب کی مرکب ہوئی، اور اُس نے تجھ  
سے محبت کرنے کی پاداش میں تجھ سے ہی اس قدر کفر کر دیا کہ پتہ چلا!  
عثمان - (زارہ کی کنش کے پاس جا کر خالد! کھول دو شکوہ اس عمارتی  
نوجوان کی!۔۔۔۔۔ اور جاؤ، میری ساری دولت زبردست سبھی  
اسیروں کے درمیان تقسیم کر دو! اور سب کو رہا کر کے پاتھ (بندر گاہِ قدس)  
پہنچا دو!

خالد - لیکن میرے آقا۔۔۔۔۔

عثمان - لیکن میرے خادم! دم بخود ہو کر میرے حکم ناموں کی تعمیل کرو! (دہری  
سے مخاطب ہو کر) اور تو اسے سوختہ تختِ مجاہدِ مسلمی اور قلیلِ محبتِ خواہری  
اپنی مشیرِ عزیز کو لے جا، اور اُس کی مادرِ وطن کی آغوشِ معدیں اُسے نکالو  
اور اگر زبانِ خلق یوں شکوہِ سنگ ہو کہ ہائے یہ تو وہ پیکرِ نسوانی تھا جو فرات  
شیرِ بنی، عالی منشی، ادھمکوی کے آب و گلن کے کبھی دستِ قدرت نے بنایا  
تھا، تو کتنا کہ لاریب! اب اسے تھا! عثمان نے اُس سے محبت کی، اور سوئے  
فن کے خنجرِ مسموم سے اُسے شہید کیا، اور پھر اپنے ہی سے اپنے مقتول کا انتقام  
لیا! اس طرح! دیکھ!

(وہ خود کشی کر لیتا ہے!)

(کاپی رائٹ)

عثمان - ہا! خوش کام انتقام کی تھی! سو دگی!۔۔۔۔۔ اچھا اب مجھے جانا  
چاہیے۔ اب میں اُس کی طرہ ایک نظر نہیں دیکھ سکتا! اُس کی کنش بھی میرے لئے  
اب نامحرم ہے!۔۔۔۔۔ اچھا، کوئی تائے کھا، میں نے کیا کیا؟۔۔۔۔۔ کیا کیا؟  
۔۔۔۔۔ انصاف! انصاف!۔۔۔۔۔ اچھا توڑا دیکھ جائی، وہ دیکھو  
اُس کا ناش و عاشق بھی آتا ہے! مجھے عنادِ رقیبانہ کی لذت سے پر آشام میری  
ہو چکے دو!!

(دہری اسیرو پا بربخیر لایا جاتا ہے۔ خالد اور شیخ سلفی سہا پی اُس کو  
محاصرے میں لے ہوئے ہیں!)

دیکھ، ادبِ نبوت، دیکھ! تو نے میری حیاتِ ارضی سے ساری روحِ صرحت  
نکال لی! لیکن بسن کو اب ج

برگردن تو بند و برما گزندشت!

بد معاش، دیکھ! وہ بیوہ خالق، جسے تو نے اپنا بدنتِ عشق بنایا، اور  
اپنی بد آموزی سے اُسے اپنی نفسی سرنگ کی راہِ فدا رپی پر چلایا،۔۔۔۔۔ یہ تیرے  
سامنے پڑی ہوئی ہے!!

ہنری - ایں! مقتول! میری بینِ مقتول!! زارہ! چاری زارہ!!

(فعل کما جاتا ہے!)

عثمان - ایں! میں! اُس کی بہن! اگر شہر سازِ خدا! کیا یہ ممکن ہے!!

ہنری - ادھر فریتِ نبیث! لیکن کیا، سہ تحقیقت ہے! اسے ظالم۔

وہ میری بہن تھی، ماں جانی بہن!۔۔۔۔۔ اور ایفہ تو اُس کا باپ تھا!۔۔۔۔۔

وہ واصل بالشد ہو گیا، اور آہ میں زندہ درگور! میں زارہ کے پاس والدِ مرم

زیبا بنیں! از زندگانِ ایسی  
اللہ سے اور بدگسائی ایسی  
بہ شاد و بادہ جب کی تیں گزین

چپک

چپکے میں یہی ہے! اسرارِ نواز  
چپکے میں یہی ہے! اسرارِ نواز  
چپکے میں یہی ہے! اسرارِ نواز  
چپکے میں یہی ہے! اسرارِ نواز  
چپکے میں یہی ہے! اسرارِ نواز  
چپکے میں یہی ہے! اسرارِ نواز  
چپکے میں یہی ہے! اسرارِ نواز  
چپکے میں یہی ہے! اسرارِ نواز  
چپکے میں یہی ہے! اسرارِ نواز  
چپکے میں یہی ہے! اسرارِ نواز

چپک

# دریں غمستہ

زرد و رخ، نیچی نظر، افسردہ خاطر، دل بندصال  
 شوق میں بیٹے کے پانی پھر گیا ارمان پر  
 اُٹ یہ نازک وقت اور یہ ترش ابروئی تری  
 منفصل اور متصل، دل سرد، آہیں گرم، گرم  
 شعلہ جوالہ گھر میں پھر رہا ہے ہر طرف  
 ہو کے برہم اس قدر کھلوانے تو اپنا بھرم  
 تجھ کو قدرت نے کیا تھا مرد، تو نے کیا کیا  
 مرد ہونے سے ترے لعنت بڑی اک بڑھ گئی  
 تو نے بزم کبر و نخوت میں اُجالا کر دیا  
 بڑھ گیا تیرے سبب سے اور عصر سلطنت  
 اُس کو گر زندہ نہ رکھیں گھونٹ تیرے خون کے

ہاں مناسب کچھ یہی معلوم ہوتا ہے ہمیں

بیٹیاں ہی بیٹیاں ہوتی رہیں اُس قوم میں

جس کے بیٹے چھوڑ دیں ماں باپ کی تعلیم کو  
 مکتبوں کو چھوڑ کر جو داخل اسکول ہوں  
 ہوں بزرگوں کے شعائر سے جھینس بیزاریاں  
 ناڑ محبوبانہ سے ہر طور جن کا منفصل  
 جن کی ایک ایک بات سے مجروح ہو فرزانگی  
 مضحکہ سمجھیں بڑوں کی عزت و عظمت کو  
 دین میں مغفوج ہوں اخلاق میں مجھول ہوں  
 ٹھوکر دوں میں جن کی ہوں ماں باپ کی خود داریاں  
 اور ہر انداز سے جن کے نہایت تجھل  
 ہر ادھر ناز سے محبوب ہو مردانگی

جن کے دل نفرت سے معمور اور آنکھیں شعلہ دار  
جن کی تاریک نین لعل سے جیسم درکنار  
بڑ دلی کی ہوں سند جن کی کتابوں کے ورق  
لیں بجائے درسِ حریت غلامی کا سبق  
جس کے بیٹے مادرِ بھارت کی رسوائی کریں  
جس کے بیٹے غیر کے درجہ میں سائی کریں

تیر برس جن کی ہر تقریر سے ہمنمون سے  
راہ میں چوٹی کی پامالی کا بھی ڈر ہو جھنپیں  
جو نہ جیتے ہوں نہ مرتے ہوں وطن کے واسطے  
جیل جانے کے عوض جائیں جو دفتر کی طرف  
آہ وہ دفتر جہاں حیوانیت ہو حکمراں  
عدل اور انصاف کا نیلام ہوتا ہو جہاں  
حق کیا جاتا ہو ناحق اور ناحق، حق جہاں  
کوڑیوں کے مول میں انسان بکتا ہو جہاں  
مکر و کذب و فسق کی تلقین ہوتی ہو جہاں  
حق آزادی و حریت جہاں محبوس ہو  
داد خواہی جس جگہ روتی ہو دعاڑیں مار کر  
رنگ لیں دامن جو اپنے بھائیوں کے خون سے  
شیر مادر کی طرح خونِ برادر ہو جھنپیں  
ہوں جو نافرمان گل اپنے چمن کے واسطے  
ہوں غلامانہ نگاہیں جن کی انسر کی طرف  
ابن آدم کی شرافت ذبح ہوتی ہو جہاں  
خنجر بیداد و خوں آشام ہوتا ہو جہاں  
عدل کا خون، رحم کا ہوتا ہو سینہ شق جہاں  
چند سکوں کے عوض ایمان بکتا ہو جہاں  
صدق و عدل و رحم کی توہین ہوتی ہو جہاں  
اپنی رفعت سے جہاں انسانیت مایوس ہو  
بگناہی مار ڈالی جائے باڑیں مار کر

غور تو کر تجھ سے مر د اچھے ہیں اب یا عورتیں؟  
بھینسی سے ہے یوں تو قوم ساری ہی غلام  
شرم کی تیر سی طرح محروم ہیں کیا عورتیں  
تو ہے غیروں کا، مگر میٹھی ہے انہوں کی غلام  
سوچ دل میں شکر کھجکھج یا شکایت چاہیے  
نام سے بیٹے کے اد نامرد و غیرت چاہیے

بہل سیدی جوشی

نوبک

# افسانہ نگاری

محمد یوسف ظفر - بی اے

میں کس قدر زندگی ہے، اور یہ افسانہ اُس کے بچے کی آئندہ حیات پر کتنے اثر انداز ہو گا۔ مذہبی میدان میں افسانوں نے جن قدر حصہ لیا ہے، وہ انہیں اُس کے ہے۔ حضرت سلمان، حضرت موسیٰ، حضرت یوسف علیہم السلام اور دیگر واقعات قرآن مجید میں، کو رو پائڈوں کی جنگ۔ سری کرشن جی اور سری رام چندر جی کے واقعات رامائن میں؛ اور دیگر مذہبی کتابوں میں بزرگوں کے تذکرے فی الحقیقت افسانے ہیں اور اپنی افسانوں نے انسان کی زندگی کو رنگنے کی جس قدر کامیابی سچی کی ہے وہ ہر محاذ سے قابل ستائش و تحسین ہے۔

دنیا بھی ایک افسانہ ہے اور افسانہ کو پسند کرتی ہے، لیکن بہت کم ایسے لوگ ہیں جنہوں نے افسانہ نگاری کا علم حاصل کیا ہو، انسان کے دل و دماغ ایک رنگین اور دلکش کامیاب افسانے کے تاثرات کو بڑی شدت کے ساتھ محسوس کرتے ہیں۔ لیکن بہت کم افسانہ نگاروں کو یہ محسوس ہو سکا ہے کہ وہ احساس جو اس طرح پیدا ہوتا ہے کس قدر اخلاقی قوت کا حامل ہے اور اس اخلاقی قوت کو کس طرح جائز طور پر استعمال کیا جاسکتا ہے، اور یہ سوچ ہے کہ ایک ایک عہدہ اور کامیاب افسانہ، افسانہ نگار کے اپنے ذہنی ارتقا کا شاہد ہے۔

افسانوں کی ابتدا درس آموزی کی غرض سے ہوئی۔ اُس زمانے میں جب ادب صرف افسانوں اور کہانیوں کا دوسرا نام تھا، اُن کا مقصد محض تعلیمی تھا، واقعات ایک ذہن سے دوسرے ذہن میں افسانے کی

دورِ حاضر میں افسانہ کو تعلیم و تربیت کا بہترین ذریعہ قرار دیا جاسکتا ہے، اور فی الحقیقت موجودہ نسلوں کو گزشتہ زمانے کے تجربات اور موجودہ وقت کی ضروریات سے آگاہ کرنے کے لئے افسانہ ہی بروئے کار لایا جاسکتا ہے۔ افسانہ میں رومانی حقیقت کے علاوہ واقعات کو جس قدر دخل ہے وہ ظاہر ہی ہے۔ اگرچہ ان میں مبدت بہت کم ہوتی ہے، لیکن بہر کیف انسان کے اخلاق اور عادات پر انہیں افسانہ سازی واقعات نے جس قدر اثر ڈالا ہے وہ شاید ادبیات کی تمام دیگر مصنوعات سے بڑھ کر ہے، افسانے عہدہ اضی کے محسوس ہیں، اور دورِ جدید کے لئے یہ تجنیذ ہر لحاظ سے قابلِ قدر ہے۔ نسلوں کی تعلیم و تربیت میں افسانوں کا درجہ بہت بلند ہے، اُس زمانے میں جب استادوں اور کتابوں نے انسان کو سدھارنے کا بیڑا نہیں اٹھایا تھا، کہانیاں اور صرف کہانیاں ہی اس مقصد کو حل کر سکتی اور کرتی تھیں۔ بچے اور نوجوان - مرد اور عورتیں اپنے بزرگوں کے گرد حلقہ لگائے عشق و محبت و شجاعت و دلیری قربانی اور ایثار کے رنگین اور دلکش افسانے سننا کرتے تھے۔ افسانے حقائق پر مبنی ہوتے اور کوئی شخص بھی ان سے متاثر نہ ہوئے بغیر نہ رہ سکتا تھا، آج بھی ماں اپنے بچے کو رات کے اولین حصے میں اپنے بزرگوں کی تقلید کرتی ہے، اور اُسی روش پر گامزن ہے جو قدما و مرثا حزن نے تیار کی تھی، آج بھی وہ اپنے بچے کو خوش کرنے کے لئے افسانے سناتی ہے۔ لیکن اُسے یہ خبر نہیں ہوتی کہ اس ایک ہی طوطی اور ایک بھاٹا طوطا

بجائے دماغ کے احساسات پر اثر پڑے۔

چند چیزیں جو ہر انسان کے لئے جزوِ قائم ہیں اور جن کے بغیر انسان کی حقیقت کی انواع انسان ہو جاتی ہے، ہر انسان نگار کے لئے ضروری ہوتی ہیں۔ یہ نقاظِ انسانہ کی جان ہیں۔ خواہ وہ انسانہ اخلاقی ہو یا معاشرتی۔

سببِ سبب یا ہنسی، ہر انسان نگار ان پر جانے ہوئے یا نہ جانے ہوئے عمل کرتا ہے۔ ان میں نہ نقاظِ انسانہ کی روح درواں ہوتے ہیں۔ (۱) تہید (۲) واقعات کا بندرِ سج بڑھاؤ (۳) Climax (۴) یا انسانہ کا سوراخ (۵) اختتام۔

تہید ہر چیز کے لئے لازمی ہے۔ لیکن انسانہ کی ابتدا انسانہ کی جان ہوتی ہے جس طرح کوئی دودھیں ایک گھوڑے کی دودھ آواز پر منحصر ہوتی ہے بین اُسی طرح انسانہ کا آواز بھی اُسے کا سیاب یا کامیاب بنانے میں بڑا حصہ لیتا ہے اور جس بڑے آواز کی بنا پر کئی انسانہ ناکام ہو جاتے ہیں۔

تہید میں مقصد یہ ہونا چاہیے کہ ہیر دسے پڑنے والے کو تعارف کرادیا جائے یا ایک پردہ پس پشت انسانہ کے لئے تیار کیا جائے۔ اسے

(Background) کہنا چاہیے۔ لیکن اس تہید سے پڑنے والے میں کبھی ضرور پیدا ہو۔ اور یہ انسانہ کی رنگینی اور چاشت میں اضافہ کرے۔

انسانہ نگار کے لئے لازم ہے کہ وہ تہید ہی میں ایسی جذبیت پیدا کرے کہ اُن احساسات کو جگانے کی کوشش کرے جن کا تعلق نفسِ انسانہ سے ہے۔ پہلا

یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ میں قدر تہید چھوٹی ہوگی اُسی قدر ہنر اور موثر ہوگی۔ بلے بلے ہنر اور یکبار تہیدیں بلاوجہ باعثِ تکلیف ہو جاتی ہیں، اور پڑھنے والے

پُر اُن کا بار پڑتا ہے اور وہ اُن کو رد کرتا ہوا اصل انسانہ کی طرف بڑھتا چلا جاتا ہے۔ اسلئے اس انسانہ کی نسبت بھی اس کی چاشت اور کبھی اہم ہے۔

اور تہید سے ہی پڑنے والے کو یہ معلوم ہو جانا چاہیے کہ جس انسانہ کا وہ مشتاق ہے وہ انسانہ یہی ہے۔ ایسی چوڑی تہید کی بجائے چند توصیفی اور

ترکیبی جملے استعمال کرنے چاہئیں اور آواز کو سوچ کر چند حرف ہی بول کر تہید کا فی ثابِت ہوں گے۔

نفسِ انسانہ میں سوراخ کی طرف واقعات کا بندرِ سج بڑھاؤ بھی بہت اہم ہے۔ اس مقام پر ضرورت اس امر کی ہوتی ہے کہ واقعات کو قدمِ بقدم بڑھایا جائے، اور پڑھنے والا کم از کم سوراخ کو پیچے سے ہی سمجھنے کی کوشش کرنے لگے۔

مورت میں منتقل کر دئے جاتے تھے، تاکہ وہ لوجہِ انسانی کی زندگیوں کے بنانے میں کامیاب ثابت ہوں۔ اس طرح انسان قدرت کے احکام کی خلاف ورزی کرنے

کی پاداش اور فطرت کے جذبہ انتقام سے آگاہ کر دئے جاتے تھے، اور اس طرح وہ شجاعت پرستی اور اخلاقی جرأت کی غرابیہ دروحوں کو سیدھا کیا کرتے تھے،

جو جن ہم انسان کے ارتقا کی منازل پر غور کرتے ہیں آتے ہیں جو دیکھتے ہیں کہ انسان کا دورِ چرکی حالت میں بھی کہ نہیں ہوتا۔ ہر ہمدیں ہر نسل کے

پاس انسانوں کا مروتی ذخیرہ سینہ بسینہ چلا آتا ہے جو تاریکی لحاظ کے علاوہ اور انسانوں کی پہلے کا دورِ ایک بلند و بالا مقصد لئے ہوئے ہوتا ہے۔

ہمارے اپنے زمانہ میں بھی انسانہ اپنی فکر انسان وقت لئے ہوئے ہے اور ہم اس امر کا اعتراف کئے بغیر نہیں کر سکتے کہ شاید انسان کی زندگی پر اخلاقی

تدربھی کتب نے بھی اس قدر احسان پیش کیا جس قدر انسانہ کی مابیت نے کیا ہے۔ انسانہ جو سوکھ گزشتہ نسلوں کے ساتھ روا رکھا ہوا ہے آج ہم سے

بھی وہی رعایت برت رہے ہیں، اور ہم اُن کے ہم پر ہنر دست ہیں۔ اگر ہم جانوں اور انسانوں کی دائمی زندگی کے فرق پر غور کریں تو

ہمیں معلوم ہو گا کہ اس مسئلہ میں انسان کی فوقیت بالخصوص اس امر میں ہے کہ وہ مستقبل کے لئے اپنا مقصد قائم کر لیتا ہے، اور جالور اپنے آبا و اجداد کی

طرح اپنی شہنی زندگی بسر کرنے پر مجبور اور مطمئن ہیں۔ انسان کے دماغ میں اُن چیزوں کے تصورات کے دھندلے دھندلے نقوش پیدا ہو جاتے ہیں جو آئندہ

پر وہ میں پر وقوع پذیر ہونے دیتے ہیں۔ نتیجہ جالور اور انسان کی قدرِ اصل پر کھڑا ہو کر اپنے قرب و جوار پر نظر ڈالتا ہے، اپنے اندرونی جذبات کے تحت

اور بیانی بیانی کی بنا پر وہ ہر چیز کو ایک شہنی روشنی میں دیکھتا ہے۔ اب یہ انسانوں کی ذمہ ہے کہ وہ نتیجے کو اس شہنی اور شہنی دنیا سے نکال کر مادی

دنیا سے متعارف کریں اور نتیجے پر اس کی حقیقت اور اس کی زندگی کی عوام اور مقاصد واضح کریں۔

اب سوال یہ ہے کہ انسانہ کس کہتے ہیں؟ اگر ہم یہ سوال سلی طور پر دیکھیں میں معمولی نظر آتا ہے لیکن بہت کم اہل فکر انسانہ کی صحیح تعریف پیش کر سکے ہیں،

وہ واقعات کی بے نقاب یا تاریکی بیان کو انسانہ قرار دے دیتے ہیں حالانکہ حقیقت کچھ اور ہے۔ میرے نزدیک انسانہ سچے یا سچی واقعات کا اس طرح

پیش کیا جانا ہے کہ واقعات بتدریج ایک دوسرے سے منسلک رہیں، اور

سنبھالنا انجام بخیر ہے، اور پڑھنے والا خود بخود یہ کہنے پر مجبور ہو جائے کہ اس نے کامیابی حاصل کی ہے اور وہ دہی تنازات سے کراٹے جو معراج میں اس کے لئے رکھے گئے تھے۔ یہاں پر دعاؤں کو قدر سے سکون ملنا چاہیے تاکہ تمام انسان پر ایک نظر نازل ہو جائے اور گہرائیوں کی تہ تک پہنچنے میں کامیابی ہو۔

اس لئے ہر اچھے انسان میں کچھ پی پیدا کرنے والی تہید۔ واقعات کا بانا عہدہ اور کل پڑھاؤ، اور معراج جو تمام انسان کی روح ہے کا نظام اور ایک لطیف انجام جس سے پڑھنے والے کو سکون و سانس ملے ہو نا چاہیے۔ یاد دہی کے الفاظ میں ایک انسان کے لئے میر و واقعات کی رفتار پلاٹ اور انجام اس کا جسم ہیں۔

چند واقعات کا درجہ ایک لڑی میں پرو دینے کا نام انسان نہیں، بلکہ انسان کا جزو اس کی واقعات کا درجہ درجہ رابطہ اور ان کا ایک زبردست روشنی میں ظہور اور جھوٹے جھوٹے کردار واقعات پر دسترس ہی انسان کو یہ نام ملے سکتے ہیں، اور اس سے بھی بڑھ کر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ انسان میں سب سے زیادہ چیز یہ ہے کہ اس میں کچھ ہونا چاہیے۔

تاکہ اس کی دلچسپی میں خاطر خواہ اضافہ ہو۔ ہر انسان کا شعور، رابطہ پر ہی زور دیکر انسان کی خوبی پر چار چاند لگنا سکتا ہے۔ یہاں پر محاوروں کا استعمال اداسی کو بھی دخل ہونا چاہیے۔

معراج یا (Climax) پر تمام انسان کے کار و مدار ہوتا ہے، انسان میں محض معراج کی خاطر واقعات کو بڑھاتے چلے جانا چاہیے کیونکہ معراج کی ناکامی تمام انسان کی ناکامی ہے، انسان کی زندگی کا تمام تر انحصار معراج پر ہے، اور معراج میں انسان کا شعور کی قابلیت کی جھلک ہو جو ہوتی ہے۔ نیز معراج کے کوئی انسان انسان ہی نہیں ہو سکتا۔ اگر یہاں پر ذرا جراتی کو دخل ہو جائے تو یہ بھی اس کی خوبی ہے۔ اور کم از کم مذہب میں چرانی انسان کے لئے جزو لازم ہے اور اخلاقی انسان تو بغیر معراج کے بے معنی تحریروں کا مجموعہ ہے۔

معراج کی طرح انسان کے انجام کو بھی کامیابی اور ناکامی میں دخل ہے، ایک اچھا انسان خاطر خواہ انجام نہ پانے کی وجہ سے بے معنی سا ہو جاتا ہے، کیونکہ ان احساسات کا جو معراج میں انتہا تک پہنچے ہوئے ہوتے ہیں،

## مقدار یا معیار

بعض حضرات کا یہ خیال ہے کہ تعلیم کے علم کو دیکھتے ہوئے اس کا چندہ زیادہ ہے۔ حالانکہ یہ سراسر غلط واقعہ ہے، اتنے بڑے سائز کے ساتھ تعلیم کا جو حجم ہے وہ اردو زبان کے کسی پرچے کو میسر نہیں۔ چھوٹے سائز کے پرچے زیادہ سے زیادہ ساتھ ساتھ ہوتے ہیں، اور تعلیم بڑے سائز کے باوجود تقریباً سو فیصد پیش کرتا ہے، اور اس لحاظ سے وہ اردو کا سب سے زیادہ مستند پرچہ ہے۔

اور اگر یہ غلط واقعہ امر تسلیم بھی کر لیا جائے کہ تعلیم کا حجم حسب فرد نہیں ہے، پھر بھی یہ اہم سوال باقی رہ جاتا ہے کہ ہشمار کی مقدار قابل توجہ ہوتی ہے، یا ان کا۔ معیار اور کسی شے کا وزن اس کی خوبی کا ماسن ہوتا ہے، یا اس کے ماسن؟ اگر معیار و ماسن سے قطع نظر کر کے کسی شے کی قدر و منزلت مقدار و وزن پر مبنی ہو سکتی ہے تو خاک کے ایک بہت بڑے انبار کو ترجیح دی جاسکتی ہے، ایک ہیرے کے ٹکڑے پر، کیونکہ ہیرے کا ٹکڑہ چھوٹا ہوتا ہے۔ اور ایک ہاتھی کو ترجیح دی جاسکتی ہے انسان پر، کیونکہ ہاتھی کا جسم گوشت کی ایک بہت بڑی مقدار کا حامل ہوتا ہے۔

(منیجر تعلیم)

# انڈین نیشنل کانگریس

اور ہندوستانی مسلمانوں کے بڑے بڑے سوال

## گزارش

۱۹۷۰ء سے ۱۹۷۳ء تک مختلف اوقات میں کانگریس نے بار بار ایسی تجویزیں منظور کی ہیں جن کا براہ راست یا بالواسطہ مسلمانوں سے تعلق ہے، ان سب تجاویز کو جمع کرنے اور ان کے تعلق تفصیلی طور پر لکھنے سے ایک خاصی کتاب مرتب ہو جائے گی۔ ہمارا مقصد اس وقت صرف اس قدر ہے کہ کانگریس کی کارروائیوں میں سے بعض جیدہ جیدہ تجاویز درج کر دیں تاکہ مسلمانان ہند کو اس قومی ادارہ کی ہمہ گیری اور اہمیت کا ایک سا اندازہ ہو جائے اور وہ اُسے محسوس کر سکیں کہ مسلمانوں کی حقیقی خدمت فریقہ پرست انجمنیں نہیں بلکہ صرف استعمار دشمن اور کٹر قومی ادارے کر سکتے ہیں، جن کے دروازے ہر ملت کے قریب اور جہد و جد کرنے والے لوگوں کے لئے کھلائے ہوئے ہوں۔

مجھے بعض تجاویز بیرونی اسلامی ممالک کے متعلق دی ہیں اس لحاظ سے ہندوستان کے مسلمانوں کی دلجوئی نہیں ہے بلکہ دعویٰ ہے کہ مسلمانان ہند سے غریب محسوس کر لیں کہ آج ہندوستان اور اسلامی دنیا میں اس لئے قرب و دیگاہی پیدا ہو رہی ہے چونکہ بیشتر ایشیائی ممالک مغربی استعمار اور خصوصیت سے برطانوی استعمار کے نیچے دب گئے ہیں اور ایک ہی قومی جھنڈ کا دوسرے پر لانا ناگزیر ہے، یہی وجہ ہے کہ آج مصر، شام، فلسطین، ترکی

موتب کس دہ

شعبہ اطلاعات سیاسی و معیشتی آل انڈیا کانگریس کمیٹی - الہ آباد

طرابلس اور دوسرے اسلامی ملکوں پر ہندوستانی قومی تحریک کی براہِ نگاہ رہتی ہے اور خلافت کی تحریک نے تاریخی طور پر ہندوستان میں ایک بلند پایہ قومی اور ملکی تحریک کا درجہ اختیار کر لیا تھا، اس سے یہ بات بھی صاف ہوتی ہے کہ کہیت سے ایسے سیاسی سنے جن میں مسلمان غالباً مذہبی اور قبی تصور کرتے ہیں۔ کانگریس کے استعمار دشمن مسلک کی وجہ سے ہم کانگریسیوں کے لئے اسی درجہ اہم ہیں اور ہماری سیاست کا لازمی جزو ہیں، یہی وجہ ہے کہ اس زمانہ میں پنڈت جواہر لال نے تقسیم فلسطین اور دو قعات سرحد سے بڑے گہری دھسپی لی ہے اور کانگریس نے براہِ تجاویز منظور کیں اور ان پر عمل کیا ہے۔

مسلمانوں کے سیاسی مطالبات کے متعلق کانگریس کی تجاویز پڑھنے سے یہ خوب واضح ہو جائے گا کہ کانگریس نے یا تو مسلمانوں کے مطالبات کو تسلیم کر لیا ہے مثلاً سندھ کی علیحدگی اور صوبہ متحدہ کے لئے اصلاحات کا سولہ یا غیر مشتبہ الفاظ میں اس کا اعلان کر دیا ہے کہ کانگریس فرقہ وارانہ مسئلہ کا کوئی مخصوص حل اس وقت تک تسلیم نہ کرے گی جب تک تمام فرقوں کو یہ صورت منظور نہ ہو، کانگریس کی تاریخ میں ایسی مثالیں بھی مل گئی ہیں جب اس نے نرہی فرقہ وارانہ سوالات کا ایک حل پیش کیا لیکن جب اُسے یہ معلوم ہوا کہ ایک یا دو نرہی فرقوں کا مخصوص تجویز سے تعلق نہیں ہیں، تو اس نے

بلاتامل اُسے منوج کر دیا۔

غزفہ کے قیدیوں اور مسلمانوں کو بالخصوص کانگریس کے رویہ اور مذہب کے متعلق اطمینان ہونا چاہیے جنہیں وقت بے وقت (اور خاص کر ایسے زمانہ میں جب متحدہ قومی تحریک کے آثار بڑھنے لگیں اور آزادی کی جدوجہد سامنے ہو) یہ خوف دلایا جاتا ہے کہ کانگریس میں غیر شرط طور پر شریک ہونے سے اُن کے جائز حقوق خطرہ میں پڑ جائیں گے، اعتراض کرنے والوں اور خوف دلانے والوں کا نظاہر قومی اور ملکی آزادی کی جدوجہد سے کم از کم اس وقت دور کا بھی تعین نظر نہیں آتا۔

میں نے کانگریس کی سجاوید معنائیں کے اعتبار سے نہیں بلکہ سند اور تاریخ کے لحاظ سے بلا عنوان دئے درج کر دی ہیں تاکہ تسلسل کا اظہار ہو جائے۔ (محمد اشرف)

۱۔ آل انڈیا کانگریس کمیٹی بنارس ۳۰، ۳۱ مئی ۱۹۲۲ء

آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی قطعی رائے ہے کہ ترکی کو صلیح کی جو شرائط پیش کی گئی ہیں وہ ان دعووں کے خلاف ہیں جو حکومت برطانیہ نے کئے تھے اور قومی خود مختاری کے اصول، جسے اتحادی حکومتوں نے تسلیم کر لیا تھا، کے منافی ہیں اور ہندوستان کے مسلمانوں کے مذہبی جذبات کو تکلیف پہنچانے والے ہیں، اس بات کا خیال کرتے ہوئے کہ دوران جنگ میں ہندوستان کی دولت ابھی تک اس آزادی کے ساتھ استعمال کی گئی تھی، یہ کمیٹی اس کی مذمت کرتی ہے کہ اس استمال کا نتیجہ مذکورہ بالا صلیح کی شرائط کی صورت میں ظاہر ہو جس سے خلافت کا دار و مدار وقت نہا ہو جاتی ہے اور مسلمانوں کے مقدس مقامات خلافت کے قبضہ و حفاظت سے نکل کر عیسائیوں کے قبضہ یا اثر میں آتے ہیں۔

کمیٹی پر زور دیا کہ اگر ہندوستان میں امن اور اطمینان کے قیام کی خاطر صلیح ترکی کی شرائط پر ایسی نظر ثانی کی جائے کہ وہ مذکورہ بالا دعووں اور ہندوستان کے مسلمانوں کے جائز مطالبات کے مطابق ہو جائیں :

۲۔ اجلاس خاص کلکتہ ۴، ۵، ۶، ۷، ۸، ۹ ستمبر ۱۹۲۲ء  
اس امر کے پیش نظر کہ خلافت کے مسئلہ پر ہندوستان کے مسلمانوں

سے متعلق جو ذمہ داریاں عاید ہوتی تھیں اُن کو پورا کرنے میں حکومت برطانیہ اور حکومت ہند دونوں نمایاں طریقہ پر ناکام رہی ہیں اور وزیر اعظم نے ارادہ اُن دعووں کو جو انہوں نے مسلمانوں کے مفادات اور ذہنی کی ہے اور چونکہ ہر غیر مسلم ہندوستانی کا یہ فرض ہے کہ اپنے مسلمان بھائیوں کی ان کی مذہبی مصیبتوں کے دور کرنے میں ہر جائز طریقہ سے مدد کرے۔

• اور اس واقعہ کے پیش نظر کہ اپریل ۱۹۱۹ء کے حادثات میں دونوں مذکورہ بالا حکومتوں نے پنجاب کے بے گناہ لوگوں کو سہانے اور ان افسوس کو جنہوں نے ان کے ساتھ غیر سہا پناہ اور دشمنانہ سلوک کیا تھا سزا دینے میں یا تو کوتاہی کی ہے یا ناکام رہی ہیں اور سرکاری اڈوں اور لوگوں کو اکثر سرکاری جرائد کے ذریعہ راست یا بالواسطہ ذمہ دار تھے اور جنہوں نے ان لوگوں کی مصیبتوں سے جو ان کی حفاظت میں رکھے گئے تھے، بے پروائی برتی، ذمہ داریوں سے بری کر دیا ہے، نیز چونکہ دارالعوام اور دارالامر کے مباحثوں میں ہندوستان کے لوگوں کے ساتھ ہمدردی کی تکلیف دہ کمی ظاہر ہوتی ہے اور صوبہ پنجاب میں باقاعدہ تشدد اور ہمدردی کی حمایت کا پتہ چلتا ہے، اور چونکہ دہلی کے آخری اعلان میں پنجاب اور خلافت کے معاملات پر مذمت یا ناست کی کوئی علامت نہیں تھی اس لئے

• اس کانگریس کی رائے ہے کہ ہندوستان کو اس وقت تک نہیں آسکتا جب تک اس پر ذکر کی ہوئی دو بے انصافیوں کی تلافی نہ ہو جائے اور یہ کہ قومی وقار برقرار رکھنے اور اس قسم کی دوسری بے انصافیوں کو روکنے کا موثر ذریعہ صرف سراج کا حصول ہو سکتا ہے، اس کانگریس کی مزید رائے ہے کہ ہندوستان کے لوگوں کے لئے اس کے علاوہ کوئی دوسری راہ عمل نہیں ہے کہ غیر متشدد و ترک مداخلت کی پالیسی جسے غیر ملکی نے شروع کیا ہے، اختیار کی جائے تاکہ مذکورہ بالا بے انصافیوں کی تلافی ہو جائے اور سراج حاصل ہو جائے :

۳۔ ورنگنگ کمیٹی طبعی ۴، ۵، ۱۱ جون ۱۹۲۲ء  
اس مسئلہ کے متعلق کہ اگر حکومت برطانیہ، انگلورہ کی ترکی سلطنت کے خلاف جنگی کارروائیاں شروع کرے تو ہندوستانیوں کو حکومت کی مدد کرنی مناسب ہے یا نہیں؟ ورنگنگ کمیٹی کی رائے ہے کہ ترک مداخلت کی

اس مسئلہ کے متعلق کہ اگر حکومت برطانیہ، انگلورہ کی ترکی سلطنت کے خلاف جنگی کارروائیاں شروع کرے تو ہندوستانیوں کو حکومت کی مدد کرنی مناسب ہے یا نہیں؟ ورنگنگ کمیٹی کی رائے ہے کہ ترک مداخلت کی

(۱) حکومت ہند کی طرح سبھی ہندوستان کی رائے عامہ کی نمائندگی نہیں کرتی ہے اور اس کی جو پالیسی سچی ہوتی ہے اس کی غرض رواجی طور پر ہندوستان کی سرحدوں کی حفاظت نہیں ہوتی بلکہ ہندوستان کو ہمیشہ اپنی غلامی میں رکھنا ہوتی ہے،

(۲) کہ ہندوستان کو ایک خود مختار ملک کی حیثیت سے حاصل کرنے کے بعد دوسری حکومتوں سے ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں، چونکہ اس کے باشندے ان میں سے کسی کو نقصان پہنچانے کے خواہشمند نہیں ہیں، اور اس لئے ان کا ارادہ کسی ایسے تباہی رشتے کا قائم کرنا نہیں ہے، جسے مذکورہ بالا حکومتوں کے باشندے نہ پسند کرتے ہوں یا جو ان کے اغراض و مفاد کے منافی ہو۔

(۳) نیز یہ کہ ہندوستان کے باشندے اکثر ان معاہدوں کے متعلق جو حکومت برطانیہ اور ہمسایہ حکومتوں کے درمیان طے پائے ہیں، یہ خیال کرتے ہیں کہ وہ استعماری حکومت نے ہندوستان میں لوٹ جاری رکھنے کے لئے کئے ہیں، اور اس لئے ان حکومتوں سے جو ہندوستان کے باشندوں کی بدخواہ اور ہندوستان کے مفاد کو نقصان پہنچانے کے خواہشمند نہیں ہیں، مطالبہ کرتی ہے کہ استعماری حکومت کے ساتھ اس قسم کے معاہدے کرنے سے باز رہیں۔

”کیٹی ایسلائی حکومتوں کو یہ بھی یقین دلاتی ہے کہ جب ہندوستان خود مختاری حاصل کرنے کا تو اس کی خارجی پالیسی ایسی رکھی جائے گی جس میں مسلمانوں کے مذہبی فرائض کی توجہ پر خاص لحاظ ہوگا۔۔۔۔۔“

۶۔ اجلاس سالانہ منعقدہ احمد آباد ۲۸، ۲۹، ۳۰ دسمبر ۱۹۲۱ء

”یہ کانگریس غازی پور میں کال پاشا اور ترکوں کی کامیابی پر مبارکباد پیش کرتی ہے اور ترکی قوم کی یقین دلاتی ہے کہ ہندوستان کو ان کے ساتھ پوری ہمدردی ہے اور ان کی موجودہ حیثیت اور آزادی کو برقرار رکھنے کے لئے جدوجہد میں مدد کرنے کے لئے تیار ہے۔“

۷۔ آل انڈیا کانگریس کمیٹی ۲۰ تا ۲۴ جون ۱۹۲۲ء، کلکتہ

”آل انڈیا کانگریس کمیٹی ترکی قوم کو عالیہ فتوحات پر مبارکباد دیتی ہے

اس تجویز کے پیش نظر جو کلکتہ کانگریس کے خاص اجلاس میں منظور کی گئی تھی، ہر ہندوستانی کا فرض ہے کہ مسلمانوں کی رائے عامہ کے خلاف ان کا رد و قبول میں حکومت برطانیہ کی مدد کرنے سے باز رہے۔ اور اس لئے ہندوستان کے سبھی پیشہ طبقہ کو چاہیے کہ وہ اس سلسلہ میں حکومت کی خدمت کو نئے سے انکار کر دے۔“

۸۔ آل انڈیا کانگریس کمیٹی بمبئی ۲۸، ۲۹، ۳۰ جولائی ۱۹۲۱ء

”حسب ذیل تجویز جو مرکزی خلافت کمیٹی کے زیر اہتمام ۱۱ دسمبر ۱۹۲۱ء کے ایک عام جلسہ میں پاس ہوئی ہے نوٹ کر لیا جائے۔“

”اس واقعہ کے مد نظر کہ ہندوستان کے باشندوں کی قسمت لازمی طور پر ہمسایہ ایشیائی اقوام اور حکومتوں کے ساتھ وابستہ ہے، مسلمانان مبینی کا یہ جذبہ عام آل انڈیا کانگریس کمیٹی سے درخواست کرتا ہے کہ وہ ہمسایہ حکومتوں کے ساتھ محبت اور اتحاد کے جذبات کو ترقی دینے کی کوشش کرے اور ایک دوسرے کے ساتھ بھی خواہی اور ہمدردی کے تعلقات قائم کرنے کی غرض سے ہندوستان کی ایک واضح اور قطعی خارجی پالیسی ترتیب دے۔“

”لے کیا گیا کہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی طرف سے تجویز کی، رسید سرکار بنگالی، جلسہ کے صدر اور مرکزی خلافت کمیٹی کے پاس روانہ کر دی جائے اور اس بات کا شکریہ ادا کیا جائے کہ انھوں نے اسے اہم مسئلہ کی طرف آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی توجہ مبذول کرائی اور درگنگ کمیٹی سے درخواست کی جائے کہ وہ مذکورہ پالیسی کے متعلق ایک بیان تیار کرے تاکہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے دوسرے اجلاس میں غور و خوض کے لئے پیش کیا جائے۔“

۵۔ ورکنگ کمیٹی ۱۵ اکتوبر ۱۹۲۱ء بمبئی

خارجی پالیسی کی اس تجویز کے متعلق جس کے ذریعہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے جولائی کے اجلاس بمبئی میں خاص طور پر ورکنگ کمیٹی سے ایک بیان تیار کرنے کی درخواست کی تھی، ورکنگ کمیٹی کی یہ وجہ ہے کہ کانگریس پڑوسی حکومتوں اور دوسری مسلمانوں پر غماہ کر دے کہ

موصوبہ کی کانگریس کی مجلس عاملہ عام طور پر ان لوگوں کو ترجیح دے گی جن کی شعائر موصوبائی خلافت کیجی گئی ہو۔

(۳) مجلس قانون سازی کی کانگریس پارٹی کا کوئی رکن فرقہ دارانہ مسئلہ سے متعلق کوئی ایسی تجویز قانون یا ترمیم پیش نہ کرے گا جس کی کانگریس پارٹی کے ہندو یا مسلمان اراکین کی تین چوتھائی کی اکثریت خلاف ہو۔

## ۱۱۔ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی بجلی ۱۵، ۱۶، ۱۷، ۱۸ مئی ۱۹۳۲ء

ہندو مسلم مسئلہ کے متعلق حزب ذیل مزید تجویزیں منظور ہوئیں۔

(۱) مسلمان لیڈروں کی یہ تجویز کشمال مغربی سرحدی صوبہ میں اور برطانوی بلوچستان میں اس قسم کی اصلاحات نافذ کی جائیں کہ دوسرے صوبوں کو حاصل ہیں۔ کمیٹی کی رائے میں مناسب اور معقول ہے اور اس کو عمل میں لانا چاہیے، اور اس کا محاذ رکھنا چاہیے کہ دوسرے انتظامی اصلاحات کے ساتھ ساتھ ان صوبوں میں ایک مناسب عدالتی نظام بھی نافذ کیا جائے۔

(۲) اس تجویز کے متعلق کہ سندھ کو الگ صوبہ بنادیا جائے اس کمیٹی کی یہ رائے ہے کہ زبان کی بنیاد پر صوبوں کی دوبارہ تقسیم کا وقت آگیا ہے۔ یہ ایک ایسا اصول ہے جسے کانگریس کے دستور میں پسند کر لیا گیا ہے۔

کمیٹی کی یہ بھی رائے ہے کہ صوبوں کی دوبارہ تقسیم کا کام فوراً شروع کر دینا چاہیے اور جو صوبہ زبان کی بنیاد پر علیحدگی کا مطالبہ کرے اس کا اس اصول کے مطابق فیصلہ کیا جائے۔

کمیٹی کی مزید رائے ہے کہ اندھرا، سندھ اور کرناٹک کو علیحدہ صوبہ قرار دے کر اس کام کی ابتدا کی جاسکتی ہے۔

(۳) آئندہ دستور میں ہر شخص کو ضمیر کی آزادی حاصل ہوگی اور مرکزی یا صوبائی کسی کونسل کو آزادی ضمیر میں مداخلت کا حق حاصل نہ ہوگا۔

”ضمیر کی آزادی، سے مراد اعتقاد اور عبادت کی آزادی، مذہبی رسوم کی ادائیگی اور اجتماع کی آزادی، دوسروں کے مذہبات کا سزا دینے کے پتے اور دوسروں کے اسی قسم کے حقوق میں مداخلت کے بغیر مذہبی تعلیم و تبلیغ کی آزادی ہے۔“

## ۱۲۔ اجلاس، کلکتہ ۱۹۳۸ء

یہ کانگریس تیسرے شام فقہان اور عوامی کے لوگوں کو مغربی استقامت

اور اپنی اس قلمی رائے کا اظہار کرتی ہے کہ ایشیا اور یورپ کے ترکی علاقوں میں پوری اور بے درود آزادی دینے کے متعلق حکومت انگلورہ کے تمام مطالبات پر سے نہ کر دئے جائیں اور جب تک جزیرہ العرب کو غیر اسلامی قبضہ سے آزاد نہ کیا جائے ہندوستان میں امن و اطمینان نہیں ہو سکتا۔

## ۸۔ اجلاس سالانہ منعقدہ گیارہ ۱۹۳۲ء

”چونکہ مشرقِ قریب کے نازک حالات خلافت اور حکومتِ ترکی کے وجود کے لئے خطرہ ہو رہے ہیں اور ہندو، مسلمان اور ہندوستان کے دوسرے لوگ اس خطرے سے ہونے والے نقصانات کو روکنے کا عزم رکھتے ہیں، یہ کانگریس طے کرتی ہے کہ درکنگ کمیٹی، خلافت درکنگ کمیٹی کے مشورہ سے ایسے ذرائع اختیار کرے جن پر عمل کر کے ہندو مسلمان اور دوسرے لوگوں کی طرف سے ناجائز خفاہی خاطر ہندوستان کو استمال کئے جانے سے روکنے کے لئے متحدہ محاذ پیش کیا جاسکے اور صورتِ حالات کا بندوبست کیا جاسکے۔“

## ۹۔ آل انڈیا کانگریس کمیٹی بلگرام ۲۸ دسمبر ۱۹۳۲ء

”طے پایا کہ کانگریس سرکاریوں کے ساتھ ان کی کمیتوں میں مودبانہ رویہ کا اظہار کرتی ہے اور امید کرتی ہے کہ وہ بہادری کے ساتھ ان آلام کو برداشت کریں گے اور ان کے ٹھکان میں تشدد کا جو دور دورہ ہے اس کا کامیابی سے مقابلہ کریں گے۔“

## ۱۰۔ ورکنگ کمیٹی سا برمتی ۱۴ مئی ۱۹۳۲ء

”بحث و مباحثہ کے بعد ہندو مسلم مسئلہ کے متعلق مندرجہ اور باتوں کے حسب ذیل تین تجویزوں پر اتفاق ہوا۔“

(۱) گفتگو سبکدوش کی شرائط کے پیش نظر کسی مجلس قانون ساز کے کسی کانگریسی ممبر کو یہ اجازت نہ ہوگی کہ کوئی تجویز یا قانون جداگاندہ انتخاب کو ختم کر کے مشترکہ انتخاب مہاری کرنے کے لئے پیش کریں جب تک کہ اس کے متعلق مجلس قانون ساز کے ہندو مسلمان اراکین کے درمیان کوئی سمجھوتہ نہ ہو جائے۔

(۲) مجلس قانون ساز کے مسلمان امیدواروں کا انتخاب کرتے وقت

کر سکتے ہیں۔ یہ رپورٹ آئندہ مارچ کے اختتام سے پہلے کیٹی کے پاس پہنچ جانی چاہئے۔

تجزیہ ساز کا بلا کے الفاظ حسب ذیل ہیں۔

”جو شکائت مغربی سرحدی صوبہ، میں فریڈرک کراؤم ریگولیشن (ضوابط جرم صوبہ سرحد) مڈلس اور ٹیمپس ایکٹ (قتلانہ جرم کے متعلق قانون) اور ضوابط تحفظ (سیکیورٹی ریگولیشن) وغیرہ کے انتہائی تباہ کن طریقے نافذ کئے گئے ہیں جن کی وجہ سے عام شہریوں کی زندگی اس صوبہ میں ناقابل برداشت ہو گئی ہے اور جن کے غیر متناظر اور بلا امتیاز استعمال کی زد سے اچھے تعلیم یافتہ اصحاب بھی بچنے نہیں پاتے۔

۱۰۔ اور چونکہ قانونی سماعت، بحث یا اپیل کا موقع باقی نہیں رکھا ہے۔ جس کی وجہ سے سرکاری عہدہ داروں کو سن ماننے طریقے پر بے گناہ افغان کو ہر سال کرنے کا اختیار دیا گیا ہے۔

یہ تجویز کی جاتی ہے کہ جلد ایک تحقیقاتی کمیٹی مقرر کی جائے جو اوپر ذکر کئے ہوئے قوانین کو جانچے، شہادتیں لے اور ان کی وجہ سے جو نقصانات ہوئے ہیں ان کا پتہ چلائے اور ان کو جلد از جلد ختم کرنے کے ذرائع پر غور کرے۔

۱۶۔ مجلس سالانہ لاہور ۱۹۲۹ء

”چونکہ بہتر رپورٹ کو منسوخ کر دی گیا ہے، اس لئے فرقہ دارانہ مسئلے کے متعلق کانگریس کی پالیسی کا اعلان کرنا غیر ضروری ہے۔ کانگریس کو یہ یقین ہے کہ آزاد ہندوستان میں فرقہ دارانہ مسائل کو صرف قومی اہل پر حل کیا جاسکتا ہے، لیکن چونکہ سکھوں نے خالص اور مسلمان اور دوسرے فرقوں نے عام طور پر فرقہ دارانہ مسائل کے اس حل سے بے اطمینانی ظاہر کی ہے جو بہتر رپورٹ میں پیش کیا گیا ہے، کانگریس سکھوں، مسلمانوں اور دوسرے فرقوں کو یقین دلاتی ہے کہ کسی آئندہ امن میں اس مسئلہ کا کوئی ایسا حل کانگریس کے لئے قابل قبول ہوگا جو تمام متعلقہ جماعتوں کو پورا اطمینان نہ دلا دیں۔

۱۷۔ سالانہ اجلاس فضیل پور ۱۹۳۷ء

کانگریس کی رائے میں شمال مغربی سرحد پر حکومت ہند کی اختیار کردہ

کے پتے جو کانگریس کی رائے میں ہندوستان کی جنگ آزادی کے لئے بڑا خطہ ہے، آزادی حاصل کرنے کی کوششوں پر مبادک دیشن کرتی ہے اور ان کو ہندوستان کی پوری ہمدردی کا یقین دلاتی ہے۔

۱۳۔ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کنگھو ۲۸ ستمبر ۱۹۲۹ء

”آل انڈیا کانگریس کمیٹی ان ذلت آمیز اور تکلیف دہ پابندیوں کو جو جنوبی افریقہ کی یونین حکومت نے اپنے ملک میں ملحق برادران کے داخلہ پر عائد کی ہیں نہایت انصاف کی نگاہ سے دیکھتی ہے اور ان پابندیوں کو قومی توہین خیال کرتی ہے، کمیٹی کی رائے میں حکومت ہند، یونین حکومت پر ان ناقابل اعتراض پابندیوں کو اٹھانے اور جنوبی افریقہ میں ملحق برادران کے داخلہ میں ہونے والی بہتر پیمانے پر اصرار نہ کر کے قومی وقار کو برقرار رکھنے میں ناکام رہی ہے، خاص کر ایسی حالت میں جبکہ انہوں نے اس ملک میں قیام کے دوران میں سیاسی مباحث سے الگ رہنے کا ذہنی وعدہ کیا تھا۔

۱۴۔ اورنگ کیٹی نیو دہلی ۳۰ فروری ۱۹۲۹ء

”کمیٹی نے افغانستان کی حالیہ اندرونی مشکلات، اور شاہ امان اللہ کی نافذ کردہ اصلاحات کو ختم کرنے کی رجحان پسندانہ کوششوں کا یقینی کے ساتھ مطالعہ کیا ہے، یہ کمیٹی دل سے ملک کی ترقی پسندانہ فکر کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کرتی ہے اور افغانستان کو متحد اور ترقی پرورد ملک بنانے کی کوششوں کو کامیاب دیکھنے کی آرزو مند ہے۔

۱۵۔ اورنگ کیٹی لاہور ۲۲ جنوری ۱۹۳۰ء

”نیچے درج کی ہوئی تجویز (جنگ کانگریس میں پیش کرنے کے لئے تیار کی گئی) اور اورنگ کیٹی کو بھیجی گئی اسکے متعلق یہ کمیٹی ڈاکٹر سید محمود، ڈاکٹر کھنڈ اور لالہ دوئی چند انبالی کو اس تجویز میں مندرجہ الزامات کے متعلق تحقیق کرنے اور جن قوانین اور ضوابط کا حوالہ دیا گیا ہے ان کی نوعیت اور ان کے نفاذ کے طریقوں کے متعلق رپورٹ تیار کرنے پر مامور کرتی ہے، مزید برآں اس کے اصحاب و دستاوی صاحب کو بھیجی کی تعداد زیادہ سے زیادہ دہوٹر ملک کا

اعانت پہناتے کے جیسے فوجی مرکز میں تیار کر کے یا کسی دوسرے پردے میں ان کے علاقوں میں مدخلت نہ کی جائے۔ کانگریس یقین رکھتی ہے کہ سرحد کے پٹھان قبائل کے خلاف غیر متوازن حملہ ناک، ظالم اور محدود ہونے کے الزامات بے بنیاد ہیں، اور اس لئے رائے گئے ہیں کہ ان کی بنا پر ناجائز مدخلت اور غیر فوجی اخراجات کو صحیح ثابت کیا جائے۔

کانگریس اعلان کرتی ہے کہ ہندوستان کے لوگ اپنے ہمسایوں سے دوستی چاہتے ہیں۔ اور ان کے ساتھ امن اور صلح انسانی کی ترقی دینے والے بڑے کاموں میں تعاون کے لئے تیار ہیں۔

سرحد پار کے علاقوں میں کھپتی غزری کارروائیوں کی جو حکومت ہند کی بے نتیجہ اور خطرناک سرحدی پالیسی کی مزید نشانی ہے اور جس سے تباہی اور ناخوشگوار ہی کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہوتا ہے کانگریس مذمت کرتی ہے۔ کانگریس کی رائے میں سرحد کے مسئلہ کو حل کرنے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ سرحدی علاقہ کی اقتصادی سیاسی اور فوجی حالات کی تحقیقات کی جائے، تاکہ سرحدی قبائل کو ساتھ لے کر سرحدی مسائل کو پر امن طریقہ پر ہمیشہ کے لئے حل کر دیا جائے۔

پالیسی قطعاً ناکام رہی ہے اور اس لئے ہندوستان اور سرحد پار کے قبائل کے مفاد کو نقصان پہنچا رہا ہے۔ یہ پالیسی ملکیت کے اغراض کی خاطر اختیار کی گئی، جس کا مقصد زیادہ تر یہ ہے کہ ہندوستان کے گرانبار فوجی اخراجات کو جائز ثابت کیا جائے، اور غیر جنگی حالات پیدا کر کے ان فوجوں کو جو عام طور پر کچی پڑی رہتی ہیں، اقتصادی اغراض کے لئے ٹریننگ دی جائے، کوئی پالیسی جو ہوائی جہازوں کے ذریعہ مہماری جیسے خلاف انسانییت اور وحشیانہ طریقوں کے استعمال اور سرحد پار کے علاقوں پر ہمیشہ فوجی حملوں کو ضروری قرار دے قابل مذمت ہے، اس کے علاوہ یہ پالیسی سرحد پر امن قائم کرنے میں نمایاں طریقہ پر ناکام رہی ہے اور اکثر سرحد پار کے ملکیت قبائل کو دشمن اور مخالفت بناتی رہی ہے۔ ہندوستان کے اندرونی وسیرونی دونوں مفاد کا نقصان یہ ہے کہ سرحد پر امن ہو اور ہمارے ہمسایوں کے ساتھ دوستوں کا ساتھ ملے قائم رہے، اور کانگریس یقین رکھتی ہے کہ یہ دوستانہ تعلقات اور امن بغیر کسی وقت کے قائم کئے جاسکتے ہیں، اگر سرحد پار کے قبائل کے ساتھ دونوں اور اچھے ہمسایوں کے مانند سلوک کیا جائے اور ہندوستان کو اقتصادی

آزاد و بے رنج، شادمانی ہے پی  
بنشاش بوقلب، کامرانی ہے پی  
کچھ بھی ہو خراش قلب و نیش کم  
محسوس نہ کر کہ زندگانی ہے پی

طوفان کے بغیر شب کو بلب کرے  
اس برق چہاں شوق کو نیش کرے  
ہنگامہ سپا ہے علم سے اسے مضبوط  
معلوم جہالتوں کو داپس کرے

## وہ واقعہ!

### آخر اور نیوی، ایم، اے

پر آہستہ آہستہ گرنے والی برف کے گالوں کی طرح تھا، شاد بہنے لگا  
میں معاشیات اور تاریخ کا مضمون لے رکھا تھا اور اس کا زیادہ وقت  
سلاٹے میں صرف ہوتا تھا۔

یوں تو میں بھی پڑھنے لکھنے میں بیٹھا نہ تھا، مگر میں کتابوں کو محنت کی  
طرح اوڑھے نہیں رہتا تھا۔ کھیل کود اور محبت احباب کا مجھے کافی شوق  
تھا۔ نازک احساسات شاد میرے دل میں کبھی نہیں رہے اور میں دل  
پر جبر کرنے کا بھی حامی نہ تھا۔ میں نے بی لے میں انگریزی اور فارسی  
ادب لیا تھا۔ کالج میں ہم دونوں کی چولا لگا ہ بھی جدا جدا کیمنی۔ شاد  
معاشیات اور تواریخ کی سوسائٹیوں کا ممبر تھا، اور میں بزم ادب  
ادکشی رانی کے کلب کا۔ البتہ مجس مناظرہ میں ہم دونوں برابر کے شریک  
تھے۔ وہاں بھی اکثر ہمیشہ ہم لوگ ایک دوسرے کی مخالفت ہی میں ہوتے  
آدھی کے چوہر دکھلاتے تھے، ہوسٹل کی عام مجلسوں میں بھی جب نظریہ  
اخلاقیات یا طریقہ تعلیم و تعلم کی بحث چھڑتی یا سینیما کی جدید فلموں پر  
زنی ہوتی تو ہم دونوں فریقین مخالفت ہی کی حیثیت سے ان میں حصہ لیتے۔  
غرض ہم لوگ ایک دوسرے کے حریف تھے۔

شاد نے معاشیات میں اعزاز کے ساتھ درجہ اعلیٰ میں اول  
ہو کر بی لے پاس کیا، میں نے بھی انگریزی ادب میں اعزاز حاصل کرتے  
ہوئے معمولی طور سے بی لے کر لیا۔ ایم، اے میں شاد نے معاشیات میں  
غریب ہو گیا، اور میں انگریزی ادب کی دلفریب دستوں میں موملگشت

انسان کی زندگی بعض دفعہ کچھ چھوٹے چھوٹے واقعات سے شدید  
طور پر متاثر ہو جاتی ہے۔ یہ بظاہر معمولی واقعات کیسے انقلاب انگیز ثابت  
ہوتے ہیں۔ کبھی کبھی تو یہ روزمرہ کی ناقابل التفات باتیں وہ سمجھ نہ لاتی کرتی  
ہیں کہ اہم حادثات بھی انگشت پر نشان ہو کر رہ جاتے ہیں۔

میں اور شاد ہر دو ایک سے ساتھ رہتے ہی آئے تھے، وہ میرا چچا زاد  
بھائی تھا، ہم لوگ ابتدا سے برابر لڑتے چھکڑتے رہتے تھے، میں اُسے اکثر  
چیلر کرتا تھا، اُس پر پھینکاں کست رہتا، اُس کی نفیس اُٹارنا، اور سوسٹج  
سے اُسے پریشان کرتا تھا، شاد بھی بڑا ذور سچ تھا، مجمع مذاق کی باتیں  
اُسے دلانے کے لئے کافی تھیں، وہ بہت حساس تھا، دن گزرتے گئے اور  
ہم لوگ اسکول کی منزل مل کر کے کالج میں پہنچے بن شعور کو پہنچ کر دو ایک  
کی باتیں تو خیر فرم ہوئیں، لیکن اب بھی میں اور شاد بد برسر پر کار رہتے تھے۔ یہ  
تقریریں جنگ ہوتی تھیں، خیالات اور عادات میں ہم دونوں بہت فحش  
تھے۔ لہذا ہم لوگوں کے درمیان اکثر مباحثہ و مناظرہ ہوا کرتا تھا۔

شاد کا دل ایک شاعر کے دل کی طرح نازک تھا، مگر وہ کسی شاعر نہ  
تھا، وہ حدود درجہ جذباتی تھا، لیکن جذبات پرست نہ تھا۔ اُسے اپنے جذبات  
پر اقتدار حاصل تھا اور یہ اقتدار رفتہ رفتہ پیدا ہوا تھا، مجھے حیرت ہوتی  
تھی کہ دو ایک میں بات بات پر رونے والا شاد کس طرح ایک زبردست  
قوت ارادی کا مالک ہو گیا ہے، پھر بھی اُس کے دل کی رقت علیٰ عالم فہم  
تھی۔ وہ جذبات کی آگ میں جلتا رہتا تھا، مگر اظہار جذبات میں وہ بہادر





کو پیسے دینے لگا۔ وہ غریب مجھے اتار کر رکشا کے سائے میں بیٹھا ہاں پناہ تھا۔ اس کا سارا جسم پسینے میں شرابور تھا، ناقوال گردن جھکی جاہری سوتی، دھنسی ہوئی کمرور آنکھیں نفاہت سے جھپانک ہو رہی تھیں اور ایک خفیت سا رشتہ سارے جسم پر طاری تھا۔

میں نے دریافت کیا۔ ”کیوں جی رکشا والے، بیمار ہو گیا؟ بیمار ہو تو کام کیوں کئے جاتے ہو؟“ پیسے میں نے اُس کے سامنے پھینک دیئے۔ وہ جواب دینے سے قاصر تھا۔ میں سر پر آمدہ سے دسٹ میں چلا آیا اور شاہد کے پاس بیٹھ گیا۔ شاہد خاموش بیٹھا حالات کا مطالعہ کر رہا تھا۔ میں نے پوچھا۔

”کہاں جانے کی تیاری ہے شاہد؟“ شاہد خاموش تھا۔ میں اپنی ٹٹائی ٹوٹھیلی کر رہا تھا۔ ٹٹائی گھول کر میں نے کوٹ اتار کر سی کی کپڑت پر لٹا کر دیا۔ رکشا والا اب تک اسی حالت میں تھا۔ مجھے اُس کے حال پر ترس آ رہا تھا۔ میں نے پھر پوچھا۔ ”کیوں جی رکشا والے تم بیمار ہو؟“ رکشا والے نے مضطرب انداز میں سر اٹھایا اور بولا۔

”جی ہاں مجھ کو“ وہ دام لینے کے لئے رکا اور پھر بولا۔ ”مجھ کو فونوہ ہو گیا تھا، پرسوں سے بوکھا رہا تھا۔ کل پیٹھ پٹایا۔“ اس کا دم چھوٹنے لگا۔ مجھ کو مالک کا رسکا ہے۔ دس دن سے مالک کو روہیت نہیں ملا ہے۔ دو تین روپے سے اُن کا آدمی تنکا جا کر رہا تھا۔۔۔۔۔۔“ رکشا والا ڈک ڈک کر بول رہا تھا۔ ”سرکار! مالک دوسرے کو رسکا ٹھیکہ بیٹھ کر کہتے تھے۔۔۔۔۔۔“ مجھ کو فونوہ ہو گیا ہے۔ تین روپے سے گھر میں کھر جی نہیں۔ بال بچے۔۔۔۔۔۔ سب ٹھیکے ہیں۔“ بنا اُدھار بھی نہیں دے پے مجھ کو اس کے حال دار پرہیت رحم آ رہا تھا میں نے پرس سے دو چرتیاں نکال کر رکشا والے کو دیں۔ وہ سیدھر دوہوا۔ دو آؤ تو اُس کو مزدوری مل ہی چکی تھی۔ اُس کے ب سے شکرے الفاظ بھی نہیں نکل سکے۔ صحت نگاہوں میں جذبات نفاہت قفس کر دے تھے میرے دل میں افکار و دستر کی کیفیتیں چل رہی تھیں۔ شاہد ایک اندوہ میں سرکناہٹ کے ساتھ سارے ماہرے کو دیکھ رہا تھا۔ کچھ لگا۔ یہ پندارہ خود ہی ہے عاقل نیکی نہیں۔“ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ شاہد نے میری دھنسی ہوئی رنگ پڑائی۔ میں شرمسار ہو رہا تھا، مجھ سے کوئی جواب نہ آیا۔ شاہد نے سلسلہ مکالم

تو بہت سی عزوری جھپکی۔ اس سیلاب میں تباہ ہو جاتی ہیں، رقص کی خدائے سیزاری اشتراکیت کا نتیجہ نہیں انقلاب کا حاصل ہے، رقص کے مذہبی ٹھیکہ و اداروں نے خدا کو زار کی ایک تصویر کلاں کی شکل میں پیش کیا تھا۔ لہذا انقلاب کی شہد سائیموں نے جب زار اور وزارت کا حکم کر ڈالا تو خدا پر بھی آنچ آگئی۔ پادریوں کا خدا اب وہاں حکومت نہیں کرے گا بلکہ انسانیت کا خدا اب العالین اپنے جمال و جلال کا تخت وہاں بچھائے گا۔ شاہد کی گفتگو میں ایک اثر تھا۔ مگر میں نے طنزیہ سرکناہٹ کے ساتھ مستترض صاحب سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ”جلو جھوڑ کر کیکٹ کھینچنے، شاہد کو خوش افتادہ دی کی جنت میں رہنے دو، ہم دونوں کمرے سے باہر نکل گئے اور دوسرے طلباء نے بھی ہماری پیروی کی۔ شاہد پھر رسالہ کے مطالعہ میں مشغول ہو گیا ہو گا۔

شاہد روز بروز اپنے شغل میں سرگرم ہوتا جا رہا تھا۔ کالج کے آبنا اختیارنے والے صاحب کو اس کی اطلاع بھیج دی۔ وہ شاہد سے سخت پرہم ہوئے اتفاق سے اُن دونوں اُن کا پتہ ہی میں تبادلو ہو گیا تھا، انھوں نے ہم لوگوں کو ہوسٹل سے بڑا الیا ہم لوگ اُن کے ساتھ رہنے لگے۔ مگر شاہد کو جانے قیام کی تبدیلی نے ذرہ برابر بھی نہیں بدلا۔ ان دونوں وہ ابجن کارکنان ملنے کی تنظیم میں مشغول تھا اور میں لوگری کی تلاش میں راہ ہاں پناہ پھر رہا تھا۔ گریسوں کے دن تھے۔ ایک روز میں ڈی۔ پی۔ آئی صاحب سے ملنے گیا تھا۔ وائس میں ایک رکشا کرایہ کر کے میں نے گھر کی راہ لی، میرا رکشا والا بہت ہی آہستہ آہستہ جا رہا تھا۔ مجھے کوفت ہو رہی تھی۔ سڑکی کی دوپہر میں سوٹ اور ٹائی میں بندے رہنا فاسمی مصعبت ہے، میں رکشا والے کو راستہ بھر بانڈر ہاں مگر وہ کجبت تیز چلنے کا نام ہی نہیں لیتا تھا، اُس کے خفیف و عیاں جسم سے پسینہ ٹپاٹ گر رہا تھا اور وہ بُری طرح ہاں پناہ رہا تھا۔ اکثر سے کی خستہ شرک تو سے کی طرح ہی رہی تھی اور گرم ہوا کے تیز جھوکے رخ پر ہلچلنے مار رہے تھے۔ میں رکشا میں بیٹھا ہوا جھٹکا جا رہا تھا، مگر کتنا تو کیا کرتا۔ میں نے رکشا والے کو دو چار سخت شست جھلے سنائے۔ مگر وہ تو کچھوے کی چال چلنے پر مہم تھا، کشان کشان میں اپنے مکان پہنچا۔ مکان کے برآمدے پر شاہد کہیں جانے کے لئے تیار بیٹھا تھا۔ میں رکشا سے اترا۔ پرس جب سے نکال رکشا والے

کی نازوں سے غافل ہو جاتا ہے۔ حائد! الغزل میں کبھی مقام ہے، مگر ترکِ فرائض کے بعد نوافل کا اہتمام مشکلِ خیرات ہے؟  
 شاید کا حوت اثر بن کر میرے دل میں اتر اٹھا رہا تھا، شاید اٹھا اور چل گیا۔ رکش والا ہمارے مکان کے سامنے سڑک پر ایک سائڈ اڈا درخت کے نیچے اپنے اور میرے مستقبل سے بے خبر رکش کے جو اسے تکیہ لگائے سو رہا تھا، گرم کوکے تیز جھونکے چل رہے تھے، دفنائیں بگولے قوس کناں تھے۔

بس ایسی معمولی واقعہ نے میری زندگی میں انقلاب برپا کر دیا۔ اس کے بعد میں شاید کبھی خیال تھا اور شریک کار۔

جاری رکھتے ہوئے کہا۔ چرائی ہوئی نیکی اور دوزیدہ مسرت؛ کاش لوگ کو مجموعی طعہ پر دیکھ لیتے، حائد؛ بھاری نیکی میں بائیدگی نہیں، زندگی نہیں۔ بے روح نیکیاں ان دنوں عام ہیں۔ ایک نعلوت زدہ رکش والا ساج کے منگولوں کا نائنڈھ تھا، کیا تم آٹھ آٹھ بخش کر سارے کوئی لوگوں کو غلیم سے بچا سکے؛ نہیں؛ بلکہ اُس ایک فرد کی زندگی بھی سوانہ سے تم قاصر رہے۔ تم نے اپنے غرور و پندار میں اٹھا ڈال دیا اور اُس غریب مزدور کی عزت نفس پر تیر ملا یا۔ بھاری نیکی اُس باروازی کی نیکی کی طرح ہے جو ہزاروں انسان کے خون جس لینے کے بعد کسی اوار کو خیرات بانٹ کر نیکی خریدتا ہے یا اُس ناز کی نیکی کی مانند ہے جو عیدین کی نمازیں پڑھ کر سال بھر

## غزل مسلسل

فصل گل نسیم ہیراں نہ پوچھے  
 جوشِ شباب و بادۂ و محبوبِ حور و شش  
 اک اک نگاہِ مست ہے محشر طراز۔ اُف!  
 پیچھے ہی رہ گئی ہیں جنوں کی حدیں تمام  
 یہ سر ہوا اور اُس بُت کا فس کا آستان  
 میں ذرہ اور ذرہ نواز می آفتاب  
 اُس مہ جیس کے عشق میں ہوش و خرد دے آج  
 اب حالتِ خرابِ محبت نہ دیکھئے  
 سُن لیجئے فناء بے چارگی عشق!  
 ابرِ سیاہ و زلفِ پریشاں، نہ پوچھے  
 سب ہیں شکستِ توبہ کے سماں، نہ پوچھے  
 رو و داؤد و دوانشِ حسیراں، نہ پوچھے  
 طغیانِ دوق و شوقِ نسرِ اداں، نہ پوچھے  
 شوقِ نیازِ مسند کے ارماں، نہ پوچھے  
 تابندگیِ قسمتِ نازاں، نہ پوچھے  
 کیونکر جنوں ہے دستِ دیگرِ پاں، نہ پوچھے  
 ذکرِ وفائے قلبِ پریشاں، نہ پوچھے  
 لیکن کمالِ حسنِ پشیاں، نہ پوچھے

اک کافرِ حسیں کا پجاری ہے آج کل

اب مسلکِ غلیقِ مسلمان نہ پوچھے

# نیکدل سرمایہ دار

احسان دہلی

زیہ نظم ایک خاص واقعہ سے متاثر ہو کر کہی گئی ہے۔ جو جناب خلیفہ ہوشیار پوری نے مجھ سے کیا۔  
 اک دن کہ دو پہر کی جوانی تھی کامیاب آتش فشا نیوں میں تھا مصروف آفتاب  
 مٹی بام و در پہ زورِ جہنم فشانہ خزان جھنجھلائی سی زمین، بھر گنا سا آسمان  
 ایسے میں اک مریض ادب خستہ و زبون  
 لیکر عقیدتوں کا اُسمار ابھرا جنوں  
 ہر سانس میں غلوں کی خوشبو لئے ہوئے دل میں خیالِ خدمت اُردو لئے ہوئے  
 سودا رُسوخ کا نہ جنونِ مصاحبت سر سام مغنیوں کا نہ خط ملا زمرت  
 خواہش نہ قرض کی، نہ سفارش کی آرزو شہرت کی اور نہ دادِ نگارش کی آرزو  
 ملنے کو اک محافظ اُردو کے گل گلیں  
 رو کا ہزار ذوقِ خودی نے، گل گلیں  
 نیکی کا جس کی سارے زمانے میں شور ہے ہاتھوں میں ہی نہیں ہے، قلم میں بھی زور ہے  
 ہے جس کے رنگِ رُخ کا زورِ سیم پر مدار قلوں سے کامگارے پشتوں سے مالدار  
 لیکن بنیو پوچھے اس آئے کا کیا سبب؟  
 اس دھوپ میں عذاب اُٹھانے کا کیا سبب؟  
 با صد غرور جاہ و بانداز بیچ و تاب دولت کی بخود ہی نے یہ بڑھکر دیا جواب  
 آرام کا یہ وقت ہے اس وقت جائے  
 گر ہو سکے تو شام کو تشریف لائے  
 ارماں بھری نگاہ کو جسکے سا آگیا دنیا کے آرزو پہ اندھیرا سا چھا گیا  
 رنگیں بیانیوں کے قدمِ رُخ کے رہ گئے خود داریوں کے سبز غمِ تھک کے رہ گئے  
 ثابت ہوا کہ فطرتِ زر میں غور ہے  
 شہرت کا طمعِ اراقِ حقیقت سے دور ہے

احسان دہلی

لے یہ حضرت احسان کی سیدھی سادی کی نظم جو مثنوی و نقلی حیثیت سے ان کی دوسرے نظموں کے متعابہ کی نہیں ہے، اس لئے درج کی جاتی ہے کہ اس سے زردار و میاں  
 ادب کے اخلاق پر روشنی پڑتی ہے۔ سچ ہے ادب ہونے کے باوصف زردار، زہد دار ہی رہتا ہے۔ (مُرب)

# ماں کا خط

جی، آر، قیس، شیخ پوری

ہر چند اس خط میں خلی کی شان مغفود ہے، اور یہ خط لکے پر دے میں ایکسٹن  
ہے۔ لیکن چونکہ اس سے چندستان کے افلاس پر روشنی پڑتی ہے اس  
سے شایع کیا جا رہا ہے۔ حیر

میری زندگی کی روشنی

میاں اشک: اب میں بڑھی ہو گئی، قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھی ہوں۔ زندگی  
کی کتنی راتیں میرے لئے گئی ہوں گی۔ کتنے دن اور جیوں کی نہیں کہہ سکتی۔ اس  
دنیا میں میرا بس اور چند روز سے زیادہ نہیں۔ نہ معلوم کب — میری  
کشتی نہایت سہجہ ہماریں آکر ڈوب جائے۔ مرنے سے پہلے چاہتی ہوں کہ تمہیں شکہ  
اور شایخی کی زندگی گراستے دیکھوں۔ تم نہیں سمجھ سکتے کہ ماں کے پریم بھرے دل  
میں کتنے جذبات، کتنی آندھی اور کتنے طوفان اُٹھ رہا ہے۔ بیٹا — ماں  
کا دل پریم کا اچھا سا گروا کر رہا ہے۔

جب سارا سنا رہا جاتا ہے، حتیٰ کہ رات کی خوفناک تاریکی میں سمندر  
کی لہریں بھی خاموش ہو جاتی ہیں تو میرے دل کی گہرائیوں میں صرٹ ہنسا  
ہی خیال ہوتا ہے۔ گو تم میری نظر سے دور ہو۔ لیکن میں اپنے دل کے قریب پائی  
ہوں۔ پردہ میں نہ جانے کہاں کہاں کی خاک چھانے پھرتے ہو گے۔ تمام  
دن جکرے بعد رات کو کہاں اور کدھر صرستے ہو۔ پی لے اور ایم لے کی  
ڈوگری حاصل کرنے میں کوئی دھڑادی نہیں ہوتی۔ لیکن لاؤری کے لئے جان  
دینی پڑتی ہے۔ نہیں اب تک کوئی لاؤری ٹی یا نہیں۔ بہت دلوں سے کہا  
کوئی خط نہیں ملا جس سے دل میں دھڑکن اور بے چینی رہتی ہے۔ آج دودھ

سے آنکھیں پھڑک رہی ہیں جس سے طرح طرح کی بھنگونی ہو رہی ہے۔ بھنگون  
کھلا کرے۔ رات کو بچہ سے میں مینا دور سے بھر بھرٹانے لگی، اور بھر دودھ  
آدا زیم ایسی بولی میں سے دوزخی ہو گئی۔ یا ڈر گئی ہے! ماں سے ڈر کے دھڑکن  
سے اور پرندے بھی خوفزدہ ہو کر اُٹ گئے۔ میں رات بھر جاگتی رہی، ہلک  
بھی نہیں مار سکی۔

ہر اٹھوڑے ڈاکہ ایسی طرح ڈاک کا قہقہے لگاؤں میں پہنچتا ہے۔  
ڈاکہ کو دیکھ کر شاما دڈی جاتی ہے اور اپنی قوتی زبان سے بولتی ہے کہ  
بیٹے بیٹا کا خط دودھ ڈاکہ کو میری بے چینی، اضطراب اور پریشانی کا حال  
کیا معلوم —؟ آج بھی ہمارا کوئی خط نہیں ملا۔ شاما اور بھی اُداس  
ہو گئی۔ اُس کو ہمارے خط سے شایخی ملتی ہے، اور میرے دل کو بھی قہقہے  
کا بل ہر۔ نہ ماں کا خیال ہے نہ شاما کا، شاما کہتی ہے کہ اب بیٹے بھی نہ  
بولوں گی۔ وہ ہم کو یاد نہیں کرتے۔ وہ تیری شاما تم سے رُوٹ گئی۔

آج دس دودھ سے جا رہی ہوں۔ بخار ہے، اور حرارت سے بدن  
پتک رہا ہے۔ کچھ بیماری، کچھ غلغلہ سستی اور کچھ مجبوری نے حالت خراب کر دی  
ہے۔ چپے پھر نے بنے مجبور ہو گئی ہوں۔ ایک قدم چلنے کی نکت نہیں، دوسرے،  
درد دھم، رنگ دالم بھٹی دیا بولی نے اور ہمارا حال کر دیا ہے، بیوک سے مر  
رہی ہوں۔ گھر میں نہ ناچا ہے، نہ کبیرہ شکل سے ایک وقت روٹی میسر ہو جاتی  
ہے، اور دوسرے وقت پیٹ پر پیچہ باندھ کر سو رہی ہوں۔ بھوک سے زنجیر  
ہوئی شاما اور چیلنے ہوئے بچوں کو دیکھا نہیں جاتا۔ مصائب اور تلخیات

سے بھری ہوئی زندگی کو صبر اور حوصلے سے بسر کرنا صرت غریبوں کا کام ہے، اور رومان صفت امیروں کے لئے مخصوص ہے۔ غریبوں کے لئے ہمیں تھک سنے بھی امیروں کو راج رجنے کے لئے، اور غریبوں کو دکھ سینے کے لئے پیدا کیا ہے۔

میں اپنی غناک کہانی کہاں تک لکھوں، کہیں ایسا ہو کہ تمھاری آنکھوں سے آنکھوں کا چشمہ پھوٹ نکلے۔ ہمیں غرور و دیکھ بڑا دکھ ہوتا ہے۔ سادوں کا بھینہ بھی آگیا۔ گھر گرا جا رہا ہے۔ جہاں چھپرے مرمت ہونے کی وجہ سے بٹھا جا رہا ہے۔ آج سات دن، اور سات راتیں گزرتیں ہیں۔ لیکن پانی کا زور کسی طرح نہیں رکتا۔ چھابوں پانی برس رہا ہے۔ ایسی جھڑی لگی ہے جو کسی وقت نہیں تھکتی ہے۔ سرد اور طوفانی رات ہے۔ جب بادل زور سے گرجتا ہے، تو ساری سستی کانپ کر جاگ اٹھتی ہے۔ بادل کا لڑک، بجلی کی چمک، اور ہوا کے زور و شور سے دل دہل جاتا ہے۔ اس پاس کے مکانات تاریک اور ڈراؤنے معلوم ہوتے ہیں، اور رات ہی موت سے زیادہ ہمیں کالم معلوم ہو رہی ہے۔ امیروں اور دولت مندوں کی امیری قائم ہے۔ وہ اندکے ساتھ رات بھر سو رہے ہیں۔ ان کی نیند ننگھ کی نیند ہوتی ہے۔ غریبوں کے دکھ کو وہ کیا جانیں، ہم غریبوں کے لئے خوشنما اور عالی شان مکانات کی جگہ نہایت بہت کوتاہی بھی کئی کا جھونپڑا ہوتا ہے۔ جن پر گھاس پھوس کے چھپر ٹپسے ہوتے ہیں، اور قید خانے کی کوٹھڑیوں سے بدتر ہوتا ہے پھر بھی سب کو ان کو منظور نہیں تھا۔ اور ستم ڈھانا تھا۔ گھر نہیں بچ سکا گاؤں کا شاید ہی کوئی ایسا گھر ہو گا جو بچا ہو گا۔ اچھا گھر بھی اسی آندھی پانی میں بہہ گیا۔ صرف ایک کو نہ رہ گیا ہے جس کے سہارے پناہ گزین ہوں۔ افلاس کی زندگی گزار رہی ہوں۔ پیسہ میرے لئے محتاج، اور دانہ دانے کے لئے ترس گئی ہوں۔ ہمارا دی سے مجبور ہوں پیسہ نہیں جو مکان کی مرمت کراؤں۔ پھر قرض کس سے مانگوں، اور قرض کون دیتا ہے۔ امیروں کو قرض آسانی سے مل جاتا ہے امیر قرض میں ہزاروں لاکھوں ہی کے ہوتے ہیں۔ غریب کو کوئی ایک پیسہ بھی مشکل سے دینے والا نہیں۔ اب تم بھی کہو کہ اس مفلسی اور بیماری میں کس کے سامنے ہاتھ پیسوں، اور نہ اب اتنی سکت ہے کہ زندگی بسر کرنے کے لئے محنت

مز دوری کر سکوں، اور نہ ہاتھ پیر میں اتنی قوت ہے جو دن رات ایک کلمے کی چکی پیسوں۔ وہ زمانہ اور تھا بیٹا۔! جب صبح ہونے سے پہلے محنت کی دیوی پر اپنی خوشگوار نیند بھینٹ چڑھا دیتی تھی۔ اور کچی دیکر سینے بیٹھ جاتی تھی۔ صبح سے شام تک محنت مز دوری کرنے کے بعد گھر کا خرچ نکل جایا کرتا تھا۔ لیکن اب غن پانی کرنے کے بعد وہی نہیں تھی۔ جب سے یہ پہلے کی شین گاؤں میں آئی ہے۔ کسی گھر سے کچی سینے کی آواز نہیں آتی۔ نہیں تو گھر گھر کچی چلتی تھی ماس لوپ کی شین نے میٹوں اور جواؤں کے سہارے کو ادھی ڈھیا۔ گاؤں کے بڑے بابو اور بیبا خوشی کے ساتھ شین ہی میں آٹا پس اسنے کٹے غریب ہمیشہ دولت مندوں اور امیروں سے رحم و کرم کی توقع کرتے ہیں۔ لیکن ان کی نظر غریبوں پر نہیں ہوتی ہے۔ گاؤں کی دیکھا یاں مز دوری کے لئے رتی ہیں۔ مگر ان کی مز دوری ہمیں کرایے کو دی جاتی ہے جو کسی طرح حق دار نہیں۔ سننے میں کسوں آٹا آدھ گھنٹہ کے اندر سوا ہوا، اور مز دوری بھی بہت کم ہے۔ اب اس مندر میں ہم ایسے غریبوں کو کہنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ عزت آبرو پچانا مشکل ہو گیا ہے غریب روکھی سوکھی روٹی کھا کر سب کو ان کا شکر بھی لاتے ہیں اور اپنی غریبی کو حسرت کا نتیجہ قرار دے کر چپ ہو رہتے ہیں۔ اور دولت مندوں کی عشرت اور آسائیں غریبوں، محتاجوں، یتیموں اور بواؤں کی پاک سر قوں کا خون اور محنت ہے۔ غریبوں میں اپنی حالت کا احساس نہیں ہوتا ہے صرف اس لئے کہ غریب ہیں، نام دار ہیں، اور محتاج ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی آنکھ اور ٹھانڈ قائم ہے۔ ورنہ آج اگر ذرا بھی دل میں احساس ہو جائے تو ان کی عشرت آراہیوں کا چراغ کبھی بجنے پائے۔

بیٹا۔! ان آغوش کے بعد دوسری صحبت اپنی بیباک اور مکروہ شکل میں نظر آ رہی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ ناداد بھین کی خوشگوار سوزوں سے گزر کر اب شہزادہ جوائی پر قدم دھر چکی ہے۔ جوائی کا احساس اب اس پر بڑی طرح غلبہ پا چکا ہے۔ دیکھتی ہوں کہ اس کی جوائی میں ٹی بی جا رہی ہے۔ ساتھ کی کیسی لڑکیوں میں اب کوئی کنواری نہیں۔ جوان لڑکی کو کب تک گھر میں بٹھائے رکھوں۔ بد وقت گھر سے سچ میں پڑی رہتی ہوں، اور جس قدر بونچھتی ہوں گہری آنکھوں میں اضافہ ہوتا ہے۔ ایک ایک دن میرے لئے ایک ایک برس ہو رہا ہے۔ دنیا کی کسی چیز میں میرے لئے سکھ نہیں۔ جب سب لوگ نام کرتے ہیں میں اکیلی جاگ کر ساری رات گزار دیتی ہوں کہ رادھا میری حیات

دیتی ہے۔ چاروں طرف گھب اندھیرا معلوم ہوتا ہے اس لئے گھر کی تباہی اور کچھ سے بچنے کے لئے میرے جیتے جی راہ گاہے ہاتھ، برہن کے ہاتھ نہ بھی، اچھوت کے ساتھ بیاہ کر دو۔ رقم اس بیکار پر مجھ سے نفرت کر دے گی۔ لیکن اوپر ذات کا برہن، اور نیچے ذات کا کھینٹی سبھی ایک ماں باپ کی اولاد ہیں۔ اگر آج نہیں تو کل، آخر ایسا ہی کرنا پڑے گا۔ میں اُس کو ذلت اور رُسوائی سے اچھا سمجھتی ہوں۔ بہت سی لڑکیاں بے آسرا ہو کر اندھرا دھرم بٹنگ گئیں۔ اس لئے قسمت کبیں ایسے غار کی طرف لے نہ جائے۔ جو تباہی کی آخری حد ہوتی ہے، سماج اور سماج کا بنایا ہوا قانون اندھا ہے۔ سماج کو چھوڑ دو۔ سماج کو بکنے دو۔ وہ بڑا کر خود ہی چپ ہو جائیں گے۔ غلم و تشدد کرنے والے رہنروں کی مجلس کا نام سماج ہے، اور تم اُس کی پوجا کرنا چاہتے ہو۔

زمانے کی بے وفار فدا کو دیکھتے ہوئے اسلام آباد کا بیڑا اٹھاؤ۔ اظہار فی جرات پیدا کرو۔ جھوٹ جھات کے بُت کی مہیلتہ کے لئے توڑ دو۔ تباہی سخت زیادہ سے زیادہ ہو گی، لیکن رفتہ رفتہ تم لوگوں کو اپنا ہونا بنالگے۔ مہتا رہی آواز آج نہیں، مگر ایک روز اچھی طرح سُنی جائے گی۔ لوگوں دلوں پر اثر کرے گی، اور کیا تعجب ہے کہ اپنی زندگی میں اس کا خوشگوار نتیجہ دیکھ لو۔ یا اگر نہ دیکھ سکو تو سنیں تم سے سن لیں گی۔ آنے والی عورتیں نہیں انصاف کا دِلوتا کہیں گی، تم دُنیا کے کھن بھگے جاؤ گے۔

مکھان کے غصیت کو بے کس کر دے  
اس بڑی جہاں سوز کو پتھر کر دے  
ہنگامہ سبیا بے علم سے اسے معصوب د  
معصوم عیالوں کو دوا پس کر دے  
(دھپس)

کی آخری خوشی ہے، اس کا بیاہ ہو جاتا، میری آنکھ کو شادی ملتی، لیکن بیاہ کہاں سے کر دں جس کو ایک وقت کھانے کا ٹھکانہ نہیں جس کو رہنے کی جھوپڑی نہیں وہ نقد ہزار، پانچویں کی رقم کہاں سے لائے۔ زمانہ کی ترقی کے ساتھ دلچ ہو گیا ہے کر لڑکی والے جب تک لڑکے کو کم از کم ہزار — پانسونہ دیں۔ شادی کرنا پاپ سمجھتے ہیں۔ پڑنے لکھنے لڑکوں کو دیکھتی ہوں کہ وہ دلاہت جانے کا خرچ مانگتے ہیں۔ موٹر چاہتے ہیں، اور بہت کچھ فرمائشیں ہوتی ہیں۔ ہائے پیٹے کے لوگ کیسے سیدھے سادے ہوتے تھے۔ پیلے روپے اور سونے چاندی کے زیورات شادی کے موقع پر مرد کی جانب سے عورت کو دئے جاتے تھے۔ مگر ہائے زمانہ کنٹینر ہلٹ گیا۔ وہ کارخانہ ہی بدل گیا ہے کہ اب عورت ہی کی طرف سے مرد کو سونے چاندی دئے جاتے ہیں۔ غریب لڑکی والے مارے جاتے ہیں۔ وہ کچن کی طرح پسے جاتے ہیں۔ اور امیر اپنی شا دیوں میں دل کھول کر خرچ کرتے ہیں۔ ہزار، دو ہزار کی آتش بازی پھونک ڈالتے ہیں۔ دان جیبر حوصلے کے مطابق دیتے ہیں۔ تمام لڑکیاں دل کھول کر نکلتے ہیں۔ برات کے ساتھ دھول باجہ ہوتا ہے۔ عیش و نشاط کی گھٹیل آداستہ کرتے ہیں۔ غیر ضروری اور بڑے رسوں میں بڑی بے دردی کے ساتھ روپ خرچ کیا جاتا ہے۔ امیر اپنی دلچسپی اور عیش و آرام کے سانس میں کمی کرنا گوارا نہایت نہیں کرتے ہیں۔ غریب خون پھانے کے لئے اور سرمایہ دار جو تک کی طرح خون چوسنے کے لئے پیدا ہوئے ہیں۔ اُن کی آنکھیں یہ بھی نہیں دیکھتیں کہ پڑوس میں کتنی بد نصیب عورتیں ایسی ہیں جن کا کوئی سہارا نہیں۔ جن کے سہاگ کے دن برباد ہو رہے ہیں۔ دکھیااری ماں رو رہی ہے۔ ایک طرف گھر میں جوان لڑکی بیٹھی مڑ رہی ہے، اور دوسری طرف میز پر بیٹھ کر شوگر پر ہموک سے بھلاتے مارے پھر رہے ہیں۔ بچوں کی بڑی حالت اور گھر کی تباہی دیکھ کر، باپ جرم کی طرف قدم اٹھانے کے لئے مجبور ہو جاتا ہے۔ اور ماں ایک عصمت فروش عورت کی طرح گھر کی چار دیواری سے باہر نکل پڑتی ہے، بیٹا — انسان سب کچھ کر سکتا ہے، مگر بھوک کی آگ پر برداشت نہیں کر سکتا۔

بیٹا — اس احساس کے بعد — جب متغیبل کا بھانک خواب دیکھتی ہوں، تو کانچے لگتی ہوں، اور جب اُس کی گہرائیوں پر نظر ڈالتی ہوں تو اس تاریک پردے میں کسی طرف سے مدہم روشنی بھی دکھائی نہیں

# تخیلات کے تین پھول

سلام مہمبلی شہری

۱۔ پریم کی موت

میرے پیارے! میرے مرنے کے بعد میرے ماتم میں حسرت آگئیں نئے  
نہ کاٹا۔ میرے سر ہائے پھول نہ چڑھانا۔ میری قبر پر کوئی سایہ وارد رخت نہ لگنا۔  
حسرت ہرگز کسی شبیں نظروں کے ساتھ میری قبر پر آگے گی۔  
کبھی کبھی مجھے یاد کر لینا۔ یا باطل مچول جانا:  
میں سایوں کو نہ دیکھ سکوں گی۔  
بارش کو نہ محسوس کر سکوں گی۔

عند لب کے حسرت آگئیں نئے زین سکوں گی۔  
اور طویل خواب نیم شبی میں کبھی کبھی تجھے یاد کیا کروں گی۔  
یا شاید بھول جاؤں گی۔ (ترجمہ) (کر سچیانہ روز بٹی)

مہنگا کا بچاری  
عام لڑکیوں کی طرح وہ ظاہری حسن سے موصوف نہیں۔

جب وہ دیکھ کر مجھے سکاڑی تو پہلی بار میں نے اُس کے شُن کر بے نقاب  
دیکھا۔ اور پہلی بار میں اس حقیقت سے آگاہ ہوا کہ اُس کی نظر ایک جڑ  
الغت اور ایک جڑ بابت لڑ رہی ہے۔ لیکن اب اُس کی نگاہیں سرور  
اور فراموش گاہ ہیں، اور میری پرشوق نگاہوں کا جواب نہیں دیتی۔  
پھر سبھی میں اُس کی نظر میں محبت کی روشنی دکھتا ہوں، اور اب  
بھی اُس کی چڑھی ہوئی تیرہاں مجھے دوسری لڑکیوں کے مقبوض سے  
زیادہ سہلی معلوم ہوتی ہیں۔

(ترجمہ)

(کر لڑ)

۲۔ اندھی لڑکی

اندھی لڑکی نے ماں کی انگلی چھوڑ دی اور باغ میں ایک جگہ بیٹھ گئی۔  
پھر ادھر کان لگا کر اور یہ اطمینان کر کے کہ کوئی سُن تو نہیں رہا ہے اور چلنے  
باتہ دعا یہ انداز میں اٹھائے اور آسمان کی طرف سنہرے کپڑے پہنے لگی۔  
"میرے اندھیال! اُمّی جان کہتی ہیں کہ تم نے سورج بنایا ہے جو اپنی  
روشنی سے ساری دنیا کو روشن کر دیتا ہے، چاند اور سورج بنائے ہیں جو  
اندھیری راتوں میں دن کی طرح اُجالا کر دیتے ہیں۔

اُمّی جان کہتی ہیں کہ تم نے طرح طرح کے پھول کھلائے ہیں جو اپنے  
رنگ و بُو سے دیکھنے والوں کی آنکھوں میں طراوت اور دل میں تازگی پیدا  
کر دیتے ہیں۔

اُمّی جان یہ بھی کہتی ہیں کہ تم نے بڑے بڑے پہاڑ دریا سمندر اور  
جگل بنائے ہیں جن سے ہماری قدرت ظاہر ہوتی ہے!

میرے اندھیال! تم نے جو مجھے ان چیزوں کے دیکھنے کے لئے  
آنکھیں بنیں دیں تو میں اُس کی شکایت نہیں کرتی اور ان میں سے کبھی  
چیز کو دیکھنا نہیں چاہتی۔ لیکن میرا دل اتنا غمزور چاہتا ہے کہ  
کم از کم اپنی اُمّی جان کی صورت تو دیکھ لیتی !!!

(سلام مہمبلی شہری)

(مطبوعہ)

الغاس  
پرچہ نہ پہونچنے کی شکایت ہر ہینہ کی دس تاریخ تک مسجد بنی  
چاہیے ورنہ بعد میں تعمیل نہیں کی جائے گی۔ (منجور مجرم)

# بیر کا درخت

سندھیر کا پنوری

تھی، جو اُسے اس مارت کھینچ لائی تھی ایک ایسی مقناطیسی طاقت جس کے زیر اثر اُس کے قدم خود بخود اُٹھتے چلے آئے تھے۔

سندھیر ایسی جگہ بیر کے درخت کے نیچے کھڑی بیر توڑ رہی، وہ کس حد تک تھی سنی شب اب کے بوجھ سے دہلی ہوئی اُس وقت اُس کے رخسار شفت کی سطح سے کیسے گلتا رہا ہو رہے تھے۔ وہ سندھیر کو اب بھی اُس کے دل کی گہرائیوں میں پرشیدہ ہے۔ اُس کی بکریاں اُسے دیکھ کر مینا کی ہوائی ہوئی بھاگ گئی تھیں، اُن کے بھلنے سے جو سرسراہٹ پیدا ہوئی تھی وہ ابھی تک اُس کے کانوں میں گونج رہی ہے، وہ اُسے دیکھ کر چٹانک پڑی تھی۔ اور شرمناک رہیں بھی کر لی تھیں، اُس وقت اُس کی یہ ادا عجیب کیفیت پیدا کر رہی تھی۔

دن گزرتے گئے، ان کی ملاقات بڑھتی گئی اور چپکے چپکے محبت میں تبدیل ہوتی گئی۔ وہ بیخ ذات کی ضرورت تھی۔ لیکن پرہیز ذات بات کو تو نہیں دیکھا کرتا۔ اب اُس کا دل اپنے گاہوں میں باغلی نہ لگتا۔ اس لئے زیادہ تر وہ اپنی مری کے گاؤں میں رہنے لگا، سندھیر کی ہر نغمہ رفاقت اُسے اپنے اندر جذب کے رہتی۔ بڑی رات تک وہ اور سندھیر ایسی فردوسِ محبت میں چہل قدمی کیا کرتے۔ بیٹھا کرتے اور میٹھی باتیں کیا کرتے۔ باتیں کیا کرتے اور کبھی نہ اُٹھاتے، ایک رات جبکہ چندرا پوری آب و تاب کے ساتھ

آسان پر راج رہا تھا، زرد جواہر کی طرح آکا ش پر تارے بکھرے ہوئے ہوئے تھے جھلی بھولوں کی باس سے بے ہوئے ہوا کے چھوٹے چھوٹے فضا کو مسطر کر رہے تھے، رمدان و شہریت کی بادشہجہ رہی تھی۔ ان دونوں نے جان بانٹا محبت

جاڑے کا موسم تھا۔ سرد ہوا میں چل رہی تھیں اور جوار کی سفید بالیاں سے لدے تھیں۔ دونوں کے کیتوں سے سرسراہٹ ہوئی گز رہی تھیں، گذر رہی تھیں اور ایک عجیب اُداس نغمہ پیدا کر رہی تھیں، بوڑھا سونے کیتوں کی روش پر آہستہ آہستہ قدم بڑھا رہا تھا، بڑھا رہا تھا اور کچھ گزری ہوئی باتوں کا خیال کرتا جاتا تھا۔ ہیں برس قبل کے واقعات اُس کے دماغ میں گردش کر رہے تھے۔ عہد پارینہ کے گزرنے ہوئے حالات اس طرح اُس کے سامنے آ رہے تھے جیسے فلم کے پردے سین پر نقویں گردش رہی ہوں۔ ایک ایک واقعہ اُس کی آنکھوں میں ایسا تازہ تھا۔ گویا وہ ابھی گزرا ہو، آہستہ آہستہ قدم بڑھاتا ہوا وہ داہنی طرف گھوما اور ایک کنویں کے قریب لگے ہوئے بیر کے درخت کو کھڑے ہو کر تنے لگا۔ جہے بھرے درخت میں کچے، زرد اور سرخ بیر ڈالوں کو بھٹکائے ہوئے تھے۔ کہیں دوسرے قریبی کی دلداز نو خواتی نسیم کے دوش پر آ رہی تھی اور فضا کو غمگین بنا رہی تھی وہ خیال کر رہا تھا کہ دن بھی اُس کی زندگی کا کتنا سنہرا اور پیارا دن تھا، اسی دن تو صبح سمنوں میں اُس کی زندگی کا آغاز ہوا تھا، اُس دن کو وہ کبھی نہیں بھول سکتا، وہ تو اُس کے دماغ میں اس طرح آباد ہے جیسے ستاروں کے درمیان روشن چاند۔

بہی سردیوں کا زمانہ تھا اور یہی سر پہر کا وقت، نیچے آسان کے ہنڈ میں آفتاب ایک نر کی شمشیر کی طرح مغرب کی طرف بڑھ رہا تھا، وہ اپنی مری کے گاؤں جا رہا تھا، کہ گھوٹا، بیر کرتا اور بھر آ نکلا، ایک خاص کشش

اُس کے سینے پر رکھ دیا تھا، مومن نے سندی کی کمر بستہ دلاسا دیا اور بعد  
 ٹوٹ آنے کے وعدہ پر اُسے روٹا ہوا چھوڑ کر رخصت ہو گیا۔ پردیس میں  
 اُسے سنت تکلیف اور سختیں اٹھانا پڑیں۔ کئی روز کام نہ ملنے کی وجہ سے  
 فاقہ کرنا پڑا، آخر بڑی دشواری اور مشکل سے چنے چاب چاب کر اُس نے  
 کچھ رقم جمع کی اور اُس کو لے کر چھپنے کے بعد گاؤں واپس آیا۔ وہ خوش  
 خوش سیدھا سندری کے چھوٹے کے طرف جا رہا تھا۔ دوپہر کا وقت  
 تھا، سورج تیزی سے چمک رہا تھا۔ پسینے میں شرابور جب وہ راستے میں  
 بلکہ کے درخت کے نیچے سے گزرا تو کسی نے کہا: سندری تو مر گئی۔ اُسے  
 یقین نہ ہوتا تھا۔ لیکن اُس کا دل خوف و ہراس سے زور زور سے دھڑک  
 لگا۔ جوں جوں سندری کا گھر نزدیک آتا گیا اُس کے قدموں کی رفتار  
 سست ہوتی گئی۔ اُسے اندیشہ ہونے لگا تھا کہیں یہ بات سچ نہ ثابت ہو جائے  
 دھڑکنے والے دل اور لڑنے والے قدموں کے ساتھ وہ چھوٹے میں  
 داخل ہوا، اُس وقت اُس کا سانس رک جاتا تھا، گھر میں ادا سی جھانپتی  
 ہوئی تھی، سندری کی ماں چپ چاب رنج و غم کی صورت بنی بیٹھی تھی اُسے  
 دیکھتے ہی وہ جنھیں مار مار کر روٹنے لگی اور روتے ہوئے کہنے لگی: اُس نے  
 تمہارے لئے جان دیدی۔ تمہارے جانے کے بعد کئی روز تک اُس کے لئے  
 میں ایک کیسل بھی اڑ کر نہیں گئی تھی، چند روز بعد گاؤں کے نیر دار، چوکی دار  
 اور محاسبے چٹا آئے اور مجھے اُس کی شادی جلد اپنی برادری کے کسی لڑکے  
 کے ساتھ کرنے پر مجبور کرنے لگے، مجھے طرح طرح دھمکیاں، ڈراما، آخر خودی  
 بڑھلائی اور بیاہ کا انظام کر دیا، جس میں مجھ کو بیاہ کا دن تھا، سندری کا پتہ  
 نہ تھا۔ بہت جستجو کے بعد اُس کی لاش سیر کے درخت کے پاس دھلے کڑوں  
 سے برآمد ہوئی۔ اُس وقت اُس کا مارغا چل گیا تھا، اُسے یاد نہیں وہ  
 چھوٹے سے کب اور کیسے نکل گیا تھا، اور حزن و ملال میں ڈوبا ہوا معلوم  
 نہیں کہاں کہاں کی خاک چھانٹا پھر تھا۔

ماں نے خوشگوار ایام کے آغاز اور اُس کے خوش انجام کی یاد سے اُس کا  
 دل ایک بار پھر چین ہو گیا، اُس کی بے رونق مگر دلچسپ آنکھوں سے آنسوؤں  
 سے قطرے گرنے لگے۔ چھیل سیدالوں سے سرد ہوائیں آرہی تھیں اور  
 جوار کی سفید بالیوں سے لدے ہوئے خمیدہ پرودوں کے کھیتوں سے سرسبز  
 ہوئی گز رہی تھیں، گز رہی تھیں اور غم انگیز ہوا اس نئے پیدا کر رہی تھیں۔

کالیف و معصوم بیان، چاند کی تقری کرکڑوں کے زیر سایہ، نئے نئے نازک  
 پہلوؤں کو گواہ بنا کر۔

بعد ہی گاؤں والوں کو اُن کے ملنے کی خبر ہو گئی، اور وہاں سے  
 رنہ رنہ اُس کے پتہ کے قائل تک بھی پہنچ گئی، اُس کے پتا اُس کی ہر  
 طرح سے دلہنہ کر سکتے تھے، اُس کی ہر بات اور ہر آواز و پوری کر سکتے تھے،  
 لیکن اُس کو ایک بچ ذات کی لڑکی سے ملنے اور دم تباہ ہونے نہیں دیکھ  
 سکتے تھے، اپنی ذات، اپنے خاندان کو دھجکے کو نہیں بڑھت کر سکتے تھے،  
 برادری میں سبک ہونا نہیں چاہتے تھے، جب انھیں معلوم ہوا کہ وہ سندری  
 سے بیاہ کرنا چاہتا ہے تو بہت ہی برہم ہوئے۔ اول بھانے بھانے رہے،  
 اور دھمکاتے بھی رہے۔ لیکن وہ تو محبت کا مذہب قبول کر چکا تھا۔ پریم  
 دیوی کے چرناں کے آگے سر جھکا چکا تھا اور پریم دیوی کا سچا بھاری  
 ہی بنا رہا اُس کے لئے بڑی پرانتھائی، اسی خیال میں مدہوش وہ ہر  
 مخالفت کا مردانہ مقابلہ کرنے کو تیار ہو گیا۔ جب اُس کے چنانے اُس  
 کی ضد اور ہٹ دھرمی تو سخت عقہہ ہوئے۔ اسی شدید غصے کی حالت  
 میں اُسے بڑی فست حالت ملی، اور دنیا میں ہمیشہ آرام و مصائب کی زندگی  
 بسر کرنے کی بد دعا دیکر گھر سے نکال دیا۔

گھر سے نکلنے کے بعد وہ باطل مجلس تھا، اس لئے اس نے پہلے کچھ  
 بونجی جگہ کرنے کا فیصلہ کیا اور بعد میں بیاہ کرنے کا، کیونکہ وہ نہیں چاہتا  
 تھا کہ سندری اُس کی ہوجانے کے بعد تکلیف اور پریشانی میں ڈنگی  
 بسر کرے۔ دونوں گاؤں میں اُس کا ستارہ ہو چکا تھا، اس لئے اُسے  
 وہاں کوئی کام ملنے کی امید نہ تھی۔ اگر امید تو شہر میں، اگرچہ وہ سندری  
 کی طویل مفارقت اور جدائی نہیں برداشت کر سکتا تھا۔ لیکن وہ جانتا  
 تھا کہ اس عارضی جدائی میں اُس کی اور سندری کی آئندہ بہتری کا کما  
 پیشہ وہ ہے۔ اسی خیال نے اُس کے ارادہ کو مضبوط بنا دیا تھا۔ جب  
 اُس نے اپنے ارادہ کو سندری پر ظاہر کیا تو وہ گھبرا گئی۔ سخت پریشانی  
 ہو گئی اور عاجزی و خوشامد سے اُسے روکنے لگی۔ لیکن جب اُس نے اُسے  
 طرح طرح سے سمجھایا اور جاننے پر آمادہ کیا تو وہ روٹنے لگی، اُس کی آنکھوں  
 کی اتھاہ ندی سے محبت کے قطرے ٹپکنے لگے، اُس نے روتے ہوئے کہا  
 تھا: میں یہ جدائی نہیں برداشت کر سکتی گی۔ اتنا کہہ کر اُس نے اپنا سر

# شاہ پارے

از منیجر افکار عالی جناب معنی القاب فرمانروائے ریاست ٹونک دام اقبالہ

ٹھمری

جب شام کی مُرلی کان پری میں جات ڈگریا ہساری رہی  
گھونگھٹ سے جو داکو دیکھا سکھی پت لاج اجیرن مو پہ بھی

استرہ

جب شام نے بپتا دیکھی موری تب راج نگر کی باٹ لئی  
جب برہ اگن میں پھنکن لگی داہو مُرلی نے سانچے سُرمیں لہی  
تن من کو جلا دے سُن رسی سکھی جو خاک بھی اکسیر بھسئی

جب شام

ٹھمری

ہے برہ اگن کی آ سانچ نئی تن چھوڑ کے جائے من میں لگی  
سُکلت ہوں نہ پوچھے بات کوئی کانوں پہ دھرت ہیں ہاتھ بھی

استرہ

جب کوک کروں سنار بنے جب چپکی رہوں تو گھاؤ لگے  
اس غم کی بکھا کو کون سنے اپنے بھی پرائے ہو کے چلے  
میں ہائے کروں تو راج کہے جب رُوئی جلی تب جوت بھی

ہے برہ اگن

ٹھمری

کر جو رہی ٹھکرائے گیو بیدردی موئے ترپائے گیو  
دن رین کا چین لیو سبجی مکھ مور کے سوتن سنگ بھو

## چور — نیگور کی ایک نظم سے ماخوذ

افسر ماہ پوری

میری آنکھوں میں آنسو از خود اُمنڈا آئے، زمیندار کے سامنے میں  
بالکل مجبور تھا، بالآخر میں نے گلوگیر آواز میں کہا "صحت کیجئے سرکار! مجھے  
تباہی میں نہ ڈالئے۔ کیا یہ میرے لئے باعثِ ندامت نہیں ہے کہ صرف  
دو بیگہ زمین جو میرے باپ دادا کی واحد یادگار رہ گئی ہے اُسے بھی  
فروخت کر کے نان شبیہ کے لئے محتاج ہو جاؤں؟"

زمیندار کا چہرہ مارے غصہ کے سرخ ہو گیا، اُس کے بٹھرے سے  
خشم و قہر کے آثار نمایاں ہو گئے۔ وہ چند سکند تک خاموش رہا۔ پھر کچھ  
دیر کے بعد صحتی پھیپھڑے ہونے لگے۔ "ابھی کچھ ہرج نہیں دیکھا جاتا تھا"  
ابھی شکل دوماہ گزرے ہوں گے کہ زمیندار نے ایک جلی بیئرڈنٹ  
بنا کر مجھے دو لڑائی بیگہ زمین سے بے دخل کر دیا۔ افسوس! جن لوگوں کے  
قبضہ میں دنیا کی ساری زمینیں کھٹ کر آگئی ہیں وہ بھی زیادہ سے زیادہ  
زمین حاصل کرنے کے لئے بدترین فعل کرنے سے گریز نہیں کرتے ہیں۔

"شاید خدا کو یہ نظر نہیں ہے کہ میں اب دنیا میں زندہ رہوں؟"  
میں نے دل میں سوچا "اسی لئے تو اُس نے میری بچی بچی زمین بھی چین  
کر زمیندار کو دے دی؟"

یہ خیال کر کے مجھے دنیا کی نعمتوں اور مسترتوں میں حصہ لینے کا کئی  
حق حاصل نہیں ہے۔ میں نے ایک سادہ موکا کا تھپکڑ لایا۔ اس کے ہمراہ در  
در مارا مارا پھرنے لگا۔ گلی گلی کی خاک چھائی۔ میں نے دنیا سے تعلق منقطع

دو بیگہ کے سوا میری تمام زمینیں ہمارے ہاں اور زمینداروں کی ہڈی  
ہو گئیں۔ میں نکت و عشرت کے عیبناک غار میں گر پڑا۔ دو بیگہ زمین کی  
بساط ہی کیا! والے بٹھے پر بھی گزرا اوقات کرنا دشوار ہو گیا۔ اکثر فاقہ کرنا پڑتا  
تھا۔ مگر بڑا ہو غربت کا کہ یہ دو بیگہ زمین جس پر میری تمام زندگی کا  
مدار تھا، گاؤں کے زمیندار کی آنکھوں میں ٹپکنے لگی۔ چنانچہ ایک دن زمیندار  
مجھے ہار کھینے لگا۔

"اوپن! ایک خاص کام کے لئے تمہاری زمین کی شدید ضرورت  
ہے۔ اگر میرے ہاتھوں فروخت کر دو تو بڑی اچھی بات ہوگی۔ معقول  
قیمت دے دوں گا۔"

"آپ زمیندار ہیں سرکار! آپ کے پاس تو دنیا بھر کی زمینیں موجود  
ہیں۔ آپ کو مزید زمین کی کیا ضرورت ہو سکتی ہے، اگر جو بھی تو میں غلطی جوڑ  
ہوں سرکار! صرف دو بیگہ زمین باقی رہ گئی ہے۔ اگر اسے بھی بیچ دوں  
تو کھاؤں گا کیا سرکار؟"

"تم میرا مطلب نہیں سمجھتے اوپن! زمیندار چوبِ زبانی سے کام  
لیتے ہوئے بولا تہا یہ ہے کہ تمہاری زمین کو اپنے ہاتھ سے غنم کر کے  
اس میں بھی پودے لگا دینا چاہتا ہوں۔ اس طرح باغ کی خوبصورتی  
اور نظرفرخی دو بالا ہو جائے گی۔ قیمت کی طرف سے مطمئن رہو۔ کچھ  
زیادہ ہی دیدوں گا۔"

نکلا ہوں سے دیکھنے لگا۔

اسی اثنا میں باغ کے ایک گوشے سے مانی نکلا اور مجھے بُری بُری گالیاں دینے لگا۔ مجھے سخت غصہ آیا۔ مگر اپنی بکلی کا جائزہ لے کر خاموش رہ گیا۔ دو آم پرانا عتاب میں سے دل میں سوچا۔

مانی مجھے پہچانتا نہیں تھا۔ وہ مجھے پکڑ کر زمیندار کے پاس لے گیا، جو اُس وقت تالاب میں مچھلی پکڑ رہا تھا، اُس کے چاچوس دوست اُسے گھبرے ہوئے تھے اور اس کی تعریف میں رطب اللسان تھے۔ جب زمیندار نے کل واقعہ سن لیا تو اس کا چہرہ مارے غصے کے لال بھجھوکا ہو گیا۔ ”تجھے مارا کر ادا دھ مو کر دوں گا“ زمیندار نے گرج کر کہا، اس کا جسم ہتھ تھک رہا تھا۔

”آپ تو خواہ مخواہ خفا ہو گئے، میں نے تو صرف دو آم اٹھائے تھے“ میں نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

”سادھو کا روپ تجھے سادھو نہیں بنا سکتا ہے، چور بدعاش“ یہ کہہ کر زمیندار اپنے دوستوں کے ساتھ بھٹنے لگا۔

زمیندار کے اس جھگے نے میرے دل پر کاری ضرب لگائی، میری آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔

”ہاں سرکار! آج کل ریاکار زمیندار تو سادھو سمجھے جاتے ہیں مگر فی الحقیقت سادھو چور“ یہ میرے دل کی غناک آواز تھی جو سینے سے بلند ہو کر ہوا میں منتشر ہو گئی۔

خوبی شپہ چل رہی ہے یارب  
خوبی شپہ چل رہی ہے یارب  
خوبی شپہ چل رہی ہے یارب  
خوبی شپہ چل رہی ہے یارب  
خوبی شپہ چل رہی ہے یارب  
خوبی شپہ چل رہی ہے یارب  
خوبی شپہ چل رہی ہے یارب  
خوبی شپہ چل رہی ہے یارب  
خوبی شپہ چل رہی ہے یارب  
خوبی شپہ چل رہی ہے یارب

کر کے پرسکون زندگی گزارنے کی متعدد بارسکی کی۔ مگر ہر دفعہ ناکامی ہی سے دوچار ہو رہا تھا۔ کیونکہ تنہا ہی اس اکثر گاؤں کی جدائی اور دو بیگزین کاغم مجھے طون کے آنسو لاتا تھا۔

اس کوچہ گدی میں چندہ سال بیت گئے۔ اب میرے دل میں گھر کا خیال برابر آنے لگا۔ لہذا ایک روز اپنے گاؤں کی طرف چل کھڑا ہوا۔ چند دلوں کی مسافت کے بعد میں اپنے گاؤں پہنچ گیا۔ مجھے کتنی مسرت و خوشی ہوئی تھی: گاؤں کے ہرے بھرے گھیتوں نے میرا نہایت پر تناک خیر مقدم کیا۔ لنگا کی فرحناک اور سرور انگیز ہوائے میرے غمزہ اور مجروح دل کو سکون و اطمینان بخشا۔ گھیتوں کے درمیان ناگن کی طرح بل کھاتی ہوئی پکڑنڈیاں، گاؤں کی چھوٹی چھوٹی جھونپڑیاں، ام کے گٹھے گٹھے جھینڈ میرے دل کو اپنی طرف بے اختیار کھینچنے لگے۔

گاؤں کی معموم لڑکیاں اپنی اپنی کمروں پر ایک ایک نگری رکھے ہوئے نکلیں گے گھر والے جا رہی تھیں، ان کا معصوم دل سینے کے اندر ایک لطیف دھڑکن پیدا کر رہا تھا۔ میں اُنھیں دیکھ کر کسی قدر سرد ہوا: ہر ایک کو میں نے جب تک کسلا کیا، اُنھوں نے مجھے ماں کی طرح دھامیں دیں۔

دوسرے روز گاؤں کی سیر کرنے کے لئے نکلا۔ کہار کے گھر، بازار اور مندر سے گزرتا ہوا میں اس سگہ پہنچ گیا جہاں کبھی میرا مکان تھا۔ مگر اُسوں، آج اس کا نام و نشان بھی باقی نہ تھا۔ میں تنگ گیا تھا چنانچہ میں نے چاروں طرف ایک سرسری نظر دوڑائی۔ زمیندار کے باغ کی دیوار کے نزدیک وہی قدیم آم کا درخت اب تنگ کھڑا تھا جس کے سائے میں میں نے بہت سے دن گزارے تھے، میں اسی کے سایہ میں جا بیٹھا۔ کسی غیر معلوم جذبہ سے متاثر ہو کر میں زار و قطار رونے لگا۔ آنسو نے میرے دل کی کبوتر اس کال دی۔ گزشتہ واقعات ایک ایک کر کے میری نظروں کے سامنے قفس کرنے لگے۔ جیسا کہ میں ایک مرتبہ جب کہ آمدھی نہایت تیزی سے چل رہی تھی میرا ہتھ جھانگ رہا تھا۔ علی الصباح مانی باغ میں آم چٹنے کے لئے آیا تھا۔ میں اسی خیال میں غلط تھا کہ دفعتاً ہوا کا ایک تند بھونکا آیا۔ میرے پاؤں کے قریب ہی دوپٹے ہوئے آم درخت سے گر پڑے۔ میں بہت خوش ہوا اور اُنھیں حسرتناک

# نقار وقت!

ادارہ کلیم

اڑیسہ کا سبق!

شان فرداد دھڑکنے پر اہم اصرار  
جاکے نکلائے ہیں دردِ دل چاہنا دل سے!

الغرض حکومت اس باجرائے عجیب کو نہیں سمجھتی۔ غلط فہمی، بغیر معاملہ دہنی، غیر مردِ شناسی، غلط کوٹھی، غیر جبریت پذیر، ناکامیابی، بیسود دست دیا، نہی، پپی اُس کے کاروبار ہوتے ہیں، جو اُس کی آنکھیں اُس وقت جا کر کھولتے ہیں جب کہ نقاب اُٹھنی بھی بے معارف ہو جاتی ہے، تاج و تخت کے پتلا زل ہونے سے پہلے تاج پوشی اور تخت نشینیوں کے دماغ معطل اور حواس مخفی ہو جایا کرتے ہیں اسے

بیدار دشت سے نہیں ڈرتا مگر آئندہ جس دل پر ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا!  
تہار اور بونی میں کانگریسی وزراء نے غلط کوٹھی لٹکانے کی کوشش میں ناکام ہو کر، اب اڑیسہ میں کانگریسی وزارت کی بیداری حواس و انتفا

ضیمہ کا حکومت نے جائزہ لیا! اُس نے شاید فرض کر لیا کہ خانہ کانگریس کے سائین، ایک سو گئے ہوں گے۔ کیا سنا لیتے ہیں اگر اُن کے پاؤں کی جوتی اُتار کر اُن کے سر کا تاج بنا دی جائے! یعنی وزارت کے آہستہ سیکریٹریٹ کے اک اہل کار کو صوبے کی گورنر شپ کی شہنشاہی پر متین

کر دیا جائے! یہ کتنی معصوم عیاری اور کیسی محفوظ پس منین تیر اندازی ہوگی!!

کانگریسی عقول کی طرف سے اک ہوش آور جُرم احتجاج پلایا گیا جو

کی خود فہمی کا پردہ تو اُسی وقت جاگ ہو گیا تھا، تاہم وہ دوسروں کو اپنے پر قیاس کرنے کی ان کی زبردستی سے جلد بخت نہ پاسکی! اُس نے اگر پپی

صوبہ اڑیسہ کا سابقہ جمہور اور اس کا معسور مل، کانگریسی وزارتوں کی سیاسی فتوحات میں اک طرہ افتخار کا اور اضافہ ہے! کانگریسی کا قبولی منصب اگرچہ ہر لوٹ اور صنعت سے پاک رہا ہے، لیکن انگریزی سرمایہ داری اور برطانوی سامراج مسلسل اُسے ترغیب اور ترغیب کی دو گونہ آداب میں گرفتار کرتا رہا ہے! اک مستبد و غاصب حکومت خود اپنی جگہ طاقت اور دولت کی صید زبوں ہوا کرتی ہے، پس اپنی زار و زبلی رعیت کو وہ ان دونوں مذکورہ فتوں کی کارفرمائی سے بالاتر کیونکر سمجھ سکتی ہے! انجیو یہ ہے کہ وہ بار بار یہی دو گونہ طلسم اُس پر چلاتی ہے اور ہر

ناکامی پر اک تلخ کام استغاثہ سے دوچار ہوتی ہے اسے

خدا یا! جذبہ دل کی مگر تاشیر اُٹھتی ہے!

کہ جتنا کھینچنا ہوں اور کھینچتا جائے ہے مجھے!

اپنے در مقابل فرین کا یہ خطای سننے کی صلاحیت غلط کوشش

بشکل رکھتی ہے کہ

برادریں دام پر مرغ و گرنہ کہ غفار اعلیٰ دست آشیانہ!

حقیقتہً اس معرکہ کے فریقین جگہ یہ ہوتے ہیں:

اس طرف تیغ و تلنگ، اس طرف اک ذوقِ عمل  
جنگ سپر ہو جاتی ہے دیوانوں کی فرزانوں سے!

اینگلو انڈین ہسٹری آف انڈیا میں نامور قلم کار سر سید کا یہی ارض وطن کا وہ تاریخی سا نقطہ ہے جہاں دس ہزار عرقِ اللہ نے اپنے وطنِ گرم سے ملت جلتے ہوئے قوم کے ساتھ اپنی بے پناہ عقیدت کا طغیانی - فائزنگ "کی زبانِ شہادت کی ہمنوائی میں خاکِ میسور کی لوحِ محفوظ پر لکھ دیا اور پھر اس عقیدت کے اخلاص کے احترام و خیر مقدم میں دربارِ میسور شریفانہ دنیا شان آگے بڑھا، اور کانگریس کے "ترنگے جھنڈے" کو اپنی ملکیت کا "ٹاٹاڑی علم" تسلیم کر لیا! یہ دیکھیں تو کس طرح اُنھیں جوتا نہیں اُتر

لواج نام لکھتے ہیں خونِ عکس سے ہم!  
"شہید کا جو خون اک کلیسا کی تعمیر کے لئے" آبِ وطن بہہ نہتا ہے وہ آزادی کے مندر کے خاکے کی صورتِ نگری کیلا کیوں نہ کر دیکھا! شش جہت میں قربانی ہی کے کھڑکن کیوں کی کائنات نظر آتی ہے! سخی حرات ہے نشانِ قیاسِ دشان کو بہن عشق نے آباد کر ڈالے ہیں درخت و کوہا!

"حادثہ" دو دور اٹھانے کے بعد بے درپے جو واقعات ظہور آئے اُن کی تلخ زبانِ حال بجز اس کے کس حقیقت کی ترجمان ہے کہ سارا ساتھ اک وقتی غلط فہمی کی تابکاری تھا! "میسور ہندوستان کی اک درجہ اول کی ریاست ہے" ترقی و تقدم" اس کی پیشانی پر بے خطہ کنبدہ رہے ہیں! گزشتہ سینکڑوں سالوں کے گہرے کی تقریب سید پر ہاتھ لگاتے ہوئے نے دربارِ میسور کے قلم و نظم کو "رام راج کا قریب ترین دستیاب ہندوستانی نو ذریعہ تھا! ماضی قریب کی اس سکھان اور روشناس ہندوستان "تاریخِ ندیں" کی جلد کا ایک جزو، صلاوت و دور اٹھانے کا "درقِ خویش" کس طرح بن سکتا تھا! ایک صغر ریاست میسور کی شاہراہِ ترقی و ارتقا کا ملبوس رواں ایسے غارت گریک کی "مٹا دے بالا واقع ہوا تھا! چنانچہ وقوعِ واقعہ کی پہلی صدائے بازگشت پر گویا میسور کے نظامِ عصی کا ایک ایک ریشہ بیدار ہو گیا! اور وہاں کی حکومت نے معاملہ کو تسلسل و تکرار سے متعدد ایسے دلیزلہ اقدامات کا مظاہرہ کیا کہ ہندوستان کی بنیادیں نگرانِ آنکھوں کو خوش حال میسور کے "کڑے روشن پرائگاہاں بڑھانے والی اس نقابِ تاریک پر ہم کو زہریلی ہتھیار، معاً میسور کا اسی چھوٹا سا

مگر رسائی کی کارروائی کو اک شریف آدمی کے گھر میں "مداخلت بوقت شب کا اقدام" سمجھا تھا تو کانگریسی وزارت کی تینہ کوسجی اک گیدڑ بھکی سے زیادہ فرض نہ کیا! پھر دیکھئے کہ اس تیس فاسد کی اساس فاسد پر ابابیل جل و عقد کی تخت آزمائی کس لذت تک پہنچی! ہسٹری آف وزیرِ اعظم اُڑسیہ جب بعض افواہی استغنی، پوری رواں ہونے کے لئے اپنی کاٹیں پار کر باہر ہو گئے تو اس وقت گورنرِ ہند کے قدم متزلزل ہوئے اور اُنھوں نے بذریعہ ٹیلیفون مائل پر داؤدِ وزیرِ اعظم کو مطلع فرمایا کہ "آپ تکلیف نہ فرمائیے میں نے اپنا عزمِ زخمت نسخ کر دیا ہے، اور سارا معاملہ رفت و گزشت ہے! یہ

کچھ ہو رہے کا عشق و ہوس میں بھی انیاز آیا ہے اب مزاجِ ترا آستان پر! تاہم تفسیرِ اُڑسیہ کا اسی بن ایک قدم آگے واقع ہے! قبولِ سبب کے وقت یہ اندیشہ کیا گیا تھا کہ کہیں کانگریسی دروازہ اس خیلانہ آئین کے جامہ تنگ کے شکنجے میں کھل کر نہ جاوے! جامے کی تنگی میں شک نہ تھا، لیکن قوم پرست وزیروں کی سیاسی و اخلاقی توندی بھی ہر شک و شبہ سے بالاتر ثابت ہوئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اُن کے زندہ و بالیدہ اجسام نے جامہ آئین کو کہیں کھینچ مان کر فراغ کر لیا اور کہیں اپنے گدا بد کے وزن سے اُسے جھاڑ ڈالا! جو ملحق العنان گورنر، منتخب شدہ وزراء پر عرصہ ذلت تنگ کر دینے والے تھے، خود اُن کی ولادت اور وضعِ محل میں آج کانگریسی وزیرِ حال ہو گئے!

درجہاں مانند جوئے کو ہمارا از نشیب و ہم فرسار از آگاہ شو یا مثالِ سیل ہے ز ہمارا زنی فارغ از پست و بلند راہ شو! جو وزارت چھتاری و غیر ہم کے لئے اک دامگاہ تھی وہ داس و اٹا ہم کے حق میں اک در ز شاہ گاہ بن گئی! یہ

ہر جہ گیر ملحق ملت شود "کفر" گرد کاٹے "ذمت" شود (۱-۱-خ)

میسور میں کانگریسی علم کی سرفرازی!

"دو دور اٹھانے"، ریاستِ میسور کا اک گنام کو روہ، شاید جدید العہد تاریخِ میسور میں اُنک سے زیادہ یادگار مقام بننے والا ہے مگر

واقفیت کو اس عاقلانہ معاملہ بندی کی زبان میں ادا کرنا پسند کرتے ہیں کہ  
"میں سرسرخ جہاں کے جناب میں بار باریاب ہونے کے لئے جا رہا ہوں"۔

مستعد ہے ناز و غرور، دے گنگو میں کام  
نبتا نہیں ہے دشمن و خنجر، کہے بغیر

تاہم آپ یہ خیال نہ کیجئے گا کہ سرسرخ جہاں کی بارگاہ ناز کے مصلیٰ آداب کے  
پہ آخری مکن مدو میں احشا دکلا، اس اجمال کی تفصیل آپ لوں کیجئے گی کہ  
کیجئے کہ اپنی ڈیر ذکر ایام گفت و شنید کی اختصار کی تاریخوں میں کہیں بدگیتی سے  
مولانا ابوالاعلام آزاد نے بریل تذکرہ اک نامندہ پریس سے انشاید ویا کز آفاک  
ذکرات مسیح اک مثلث ناخط و کتابت کا جمل ہیں جس کے ایک طرف سرسرخ جہاں  
بھی ہیں۔ اس پر ہندوستان کے مختار الملک، اسلامی ہندوستان کے  
"قائد اعظم"، علامہ اہل و عجبی کے "شہزادہ اسلام" نے سنا کہ برقی پیام سے  
مکی پریس کو نوازا جس میں اس شائبہ ملک کو مسترد کیا گیا کہ افسوس کے موجود  
گنگوئے مصاحبت کی سلسلہ بینا کی طرح انڈی کے کسی ملک کو گوارا کیا ہے۔  
ہندہ پرورد، اگر خدا شدد؟

جن بزرگوں کو وطن غلو کے مسئل و مشکلات سے اپنی ہمدردی ہے مثنیٰ  
کہ سرسرخ جہاں کی ذات "عصیت" آپ کے ان کلمات سے ترشح ہوئی ہے، انکی  
یشکل کشائی، پرہیز ایمان لائے ہیں؟

ہم کو ان سے وفا کی ہے اُسید جو پیش جاننے وفا کیا ہے!  
سچ تو یہ کہ سرسرخ جہاں خود مسلمانان ہند کی اک ملاح سیاسی شکل  
ہیں، بلکہ ان کا اصل شکل، خود اک عقدہ و شوار کو ہم نے ناخن تدبیر فرس کر  
رکھا ہے، اک طاعون کو "تیاقی"!

ہاں ذریعہ بحث لغت و شنید کے آئندہ مراحل سے اگر آپ اس کی بات  
پر دروہوں کا اندازہ لگانا چاہتے ہیں تو اس خبر کے اندر اک سرسرخ جہاں  
کہ اب مزید گنگو جہاں اور پریس کے درمیان خط و کتابت کے ذریعہ ہوگی!  
یہ کتاب لغت الملمات "نہوں گے، لغت التعریض" ہوں گے!۔

قدیم حکم موت کہاں رہی باقی؟ ذریعہ باتوں کا اب جبکہ طبعین ہوا!  
حقیقت یہ ہے کہ مسلم لیگ اک درود لاو ہے! ارباب لیگ کے چرخہ  
مرکز داخل ہیں تو ناگفتہ بہ ہیں، اور جو گفتنی ہیں وہ تفصیل حاصل ہیں! پھر وہ  
کوئی سمجھو، داد و مستند کے اصول پر کرنے کے لئے تیار نہیں! وہ زیادہ

سبا دایں صبح را بار ب غم از یاد پریشانی!

سر مرزا آئیل بالقہ اور سردار پٹیل کے درمیان جو مفاہمت  
عمل میں آئی ہے وہ مستقبل قریب کے برطانوی ہند اور ہندوستانی  
ہندوستان کی بلنگیری کا تہیدی شیک ہیڈ ہے!۔  
شکراز و کرمیاں سن و اوصل فتاد  
حوریاں رقص کنان ساغر مستانہ ذوق

عالی جناب ہمارا جو بہا و میسر کی پیشگاہ سے ترجم خسروانہ کے  
جو ایک سے زائد اعلانات ہوئے ان میں شکست خوردگی کے کسی پہلو  
کی تلاش کی کاوش، اس شانہ کریم انفسی پر براخراش تین ہو گیا!۔  
تو نے ظاہر میں رعایا سے جو کھائی ہے شکست  
یہ حقیقت میں ظفر ہندی سلطانہ ہے!

اگر وہ حور اسوا سحر کے شہداد کا خون، قوی پرچم کو اتار خرخ رو  
کر سکتا ہے تو ہم اسے ناکافی "خزینہ" نہیں سمجھتے، اگر اک غلط کا حل حکومت  
کا قفارنگ آرڈر اصل قلب ریاست سے قومی مملکت کے چہرہ ری رنگ  
میں رنگ دے جانے کے اک نامندہ کیشن کے تعزیری "گلبانگ" کا  
آہنگ پیش بن سکتا ہے تو ہم اسے سینہ زنگات "کی معنی" سامع خراش  
کہنے میں بھی تامل کریں گے!۔

تفاوت است میان شنیدن من و تو

تو بستن درو سن فتح باب "می شنوم

(۱-۱-خ)

## گنگوئے مصاحبت

مسلم لیگ کی باتوں کو منانے پر چلنے کا بزرگان کا گلوں نے پورک  
مرتبہ مسئلہ شرد کیا ہے، گاڈ جی کو اس سہی بجا صل "کی لذت"  
سبارک ہو!۔

گفتہ گفتہ میں شدم بسیار گو از شکایک کس نشد اسرار جو!  
تسلط عربہ جو "کی نزاکت" کی اتنی رعایت اس سمازی  
طالب "بہاقتا" کو منظور ہے کہ وہ اپنی اور جناح کی طاقت کی نیا

جو محض ایک پردہ ہی! اگر آج وہ کانگریس سے متفق ہو جائیں تو قائد اعظم کی بلند نشیں سے معزول ہو کر ایک سیاسی مرتد کے گھریے میں دھکیل دیئے جائیں گے۔ کانگریس مولانا محمد علی مرحوم کا گٹر مسلم حلقوں میں قبل ازیں ہی خضر ہو چکا ہے۔ ان الزبج جناح اپنی مذکورہ بالا باب دولت و ریاست اور ان ہی خطاب یافتہ و راہوں اور حکام رس خواجہ سراؤں کا ذکیل ہے۔ حمزہ اہل معاملہ نہیں۔ قائد اعظم کا خطاب مرت مٹھانے کا ایک جز ہے جو بجائے نقد کے جن میں ادا ہوا ہے، اسی طرح محمد الملک کا لقب امرا کے معنی میں مختار نامہ لگانے کی ایک فیس ہے! پس مسٹر جناح کو مفید کن عنصر سمجھنا بڑی مخالفاً نیز فحش ہے! اصل فریق معاملہ محتویات و محتاری ہیں۔ چنانچہ محمد راضی ناسے کی شرائط کو کھلنے لپنے موکلوں کی طرف رجوع کر دیا ہے۔ جو ہم چون کو اس کے دکات خانہ و خانہ میوں میں قدم بڑھانا ہر کر اپنے عدالتی نمائندے کو ضروری احکام دیں گے۔

سوال یہ ہے کہ کانگریس ہندال کی ساری دست کے باوجود زیادہ اتنا فراج کیا جاسکتا ہے کہ محمود آباد و چنتاری کو اس کے اندر یکا کوڈٹ کیا جاسکے؟

صلح کران کانگریس کی طرف سے یہ غیر ملفوظ فریاد ہمارے گوش زد ہوتی معلوم ہوتی ہے کہ اس

بس، عجم نامیدی خاک میں جاگئی یہ جو اک ہماری ہی بے مال ہے!

(۱-۱۰)

## کان پور کی ہڑتات

کان پور کے کارخانہ پانچ پارچے بانی کی تازہ آغاز حبیب ہڑتال، سرایہ داری کی نااہلی اور بے دردی کی ایک پرمسور رسوائی ہے، جہاں تازہ سرایہ داری کی مرید کے اک ہمدرد معالج اور دوسو تیار دار واقع ہوئے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ سرایہ داری کی اصلاح ضرور کرنی چاہیے۔ لیکن اسے منسوخ نہ کر دینا چاہیے۔ تمام دولت مندوں کو امانت داران دولت کے غالب میں ڈھال لو۔ اور سمجھو تم کو، باشوک انقلاب کی ضرورت ہے، نہ کیلبرٹ تشدد کی۔ نہ ڈکٹیٹر شپ آف وی پر ولیٹر ٹیٹ کی! امرا اور غریب زیادہ سے زیادہ ہب ذرا بے فکر والدین اور تدریس محروم نظر

سے زیادہ یافتہ کا بدلہ زیادہ سے زیادہ طلب سے دینا چاہتے ہیں۔ اور دوسرے کو زیادہ سے زیادہ باندھ کر کے انعم البدل ان کے ہاں اپنی زیادہ سے زیادہ آزادی و مقید ہے۔ ان کے فلسفہ انتہائی میں حقوق کے بالمقابل فرائض دانت نہیں ہوتے ہیں۔ صرف حقوق کی ہوس ہے۔ کانگریس کی کوئی بات انہیں، کانگریسی وزارتوں کی کرسیوں کے سوا پسند نہیں یعنی وہ کانگریسی جبار آزادی پر تو تیزی بھیجتے ہیں۔ لیکن اس کے آثار و فتنے میں اس کا ہاتھ بنانے کے لئے تیار رہتے ہیں۔ ان کی شرائط معافیت یہ ہیں کہ ہم مٹھانے یہاں آئیں گے تو کیا کھلاؤ گے! اور تم ہمارے یہاں آؤ گے تو کیا لاؤ گے؟ غالب اس ایک طرف معاملت میں اک راستہ ہے۔ اور وہ یہ کہ اہل لیگ، زمین ثانی کی ساری پیشکشوں اور مراعات کا معاوضہ اپنی طرف سے یہ سمجھتے ہیں کہ ہم آئندہ اپنی رخصت اندازوں اور فتنہ پروازوں کو ترک کر دیں گے؟ پس ہم سے کوئی سمجھوتہ کرے تو اس حیثیت سے نہیں کہ ہم کوئی حقدار فریق ہیں جسے اپنا حق ملنا چاہیے۔ یا یہ کہ ہم کو کوئی کارآمد ملی جاعت ہیں جنہیں اپنے سیاسی مستقبل سے مطمئن کر کے اختلاص وطن کے سر کے میں و دش بد دش کھڑا کیا جاسکتا ہے۔ بلکہ اسے اہل محض اس لئے کہ اگر ہماری تو دین دوزی نیک محنتی تو ہم تنہا راہی خواب و خور حرام کر دیں گے پس صرف ہمارے منتر سے ڈر کر ہم سے معاملہ کر دو۔ اور تمہارے عطیات کی ہماری طرف سے یہ کافی و دوائی نمیت ہے۔ کہ ہم اب شرارت نہ کریں گے! — یہ کوئی پارٹی پالیسی نہیں ہے، تو لیکل ایک میلنگ ہے۔

مسلم لیگ کے ارباب مل و عقد کے یہ آخری ممکنات ہیں: امرادہ نہا نواہان و تعلقہ امان کو اگر آپ ہمارے ہندوستان کی پیشکش بھی نہ رد ہیں تب بھی وہ برطانوی سامراج کے خلاف کسی جدوجہد میں شریک نہیں ہرکتے! آخر الذکر چیز ان کے دلتنداد شاخ و برگ کی بیخ نہ تہ ہے۔ اور کوئی شے امکاناً ناہنے دادر بدد کے ساتھ جنگ نہیں کر سکتی۔ اگر امرا سے سمجھوتا ممکن ہے تو ہندوستان کے تلتہ نشیں برٹش سوسائٹیز سے بھی اک معاہدے کی طرح دانی مبینہ اسی طرح دائرہ امکان میں ہے: ہم سادہ لوح کانگریس کے دلت سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ اسے

دلی نادان سمجھتے ہو کیا ہے؟ آخر اس دود کی دوا کیا ہے! مسلم لیگ کے عجبیہ پتے بھی مخصوص مفادات ہیں۔ نہ کہ شرجان!

مہر لاد لاؤ کسی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور حضورؐ کی تعلیم اور تلقین اور مہربانی  
میں سلسلہ جنبانی کر کے بعد دو دنوں کے درمیان سلاہ رکھتی کے تعلقات  
بحال ہو سکتے ہیں! — بہانہ بھی کی نیکی و معصومی کا یہ اک نہایت خطرناک  
ہلو ہے۔ جس چیز کو وہ بھائی کہتے ہیں اس کی تاریخی پشت پر وہ ذرا دل سے  
لے کر کسی وقت بھی کوئی ایسی شے کبھی معرض وجود میں نہ رہی جو جو خطرات  
آویزش کے تادور و خضر کی آویزش کی صورت میں جلوہ گر ہوئی ہو! بلاشبہ  
ایسے افراد بجز نت ہونے ہیں جنہوں نے اس اذعان کو اپنے سینوں میں  
پایا کر وہ ایک ہی خاندان آدم کے ارکان ہیں جن کے ساتھ ایک ہی دسترخوان  
پرا ہوں نے کھانا کھایا۔ و کمر بھینگو گی لاہور میں کاٹشپ! اک ایسی ہی  
ہستی تھا۔ سفر آٹھ ایسی امت بشری کا کاک دوسرا دمی تھا۔ مسٹر ایچ۔ جی  
ویلز دزدہ و زندہ جاوید سورج تار پچ عالم اک ایسا ہی عالمی دل و دماغ  
رکھتا ہے۔ جو دنیا کو ہمارا بڑا گاؤں کہتا ہے۔ خود بہانہ کا گندھی اسی سلسلہ  
عالیہ کے اک حلقہ زیر ہیں۔ اور پھر تاریخ کی سب سے بڑی بولہ بھی یہ ہے  
کر سوسٹیلزم و کمیونزم کا پیغمبر، کارل مارکس۔ شائے ایک کا ہم سنا تھا۔ اور  
ساری دنیا کے کلمہ نبیوں اور کردہ نبیوں کی دولت کو۔ محرومین و مساکین  
اس کے لئے حلال کر دینے والا! ابھی تار و نوں اور فرعونوں کے بڑے  
بڑے لعنتانے ترے تازیت گریزاں و در گرداں رہا! —  
تاہم سب کچھ کہنے کے بعد حقیقت اس سے آگے نہیں بڑھتی کہ یہ  
سب افراد کی داستان تھی، افراد کی، لیکن ناپیدکنار انسانی مجلس  
کے یہ معدودے چند گندہ اس نیستان موسائی کے منظر  
خارزار میں کوئی قابل تندیلی پیدا نہیں کرتے۔ ایسے افراد و ذرا انسانی  
کارماں بننے میں جتنے کامیاب ہیں اتنے ہی کامیاب ہیں ان کو شکر اقدار  
عامۃ اور دوداد و احوال و احوال بھٹا اس قدر نیک خواہی نہیں جس قدر کہ پچھلی  
ہے اگر تیرے موجود ہوتا تو گاندھی جی کو تھانا کہہ  
مت سہل ہیں جانو پھر تھے فلک بریں تب خاک کے پرے کی انسان بھٹے ہیں!  
اخلاقی و معاشی و اجتماعی فلسفیوں نے اسی حقیقت کو اخلاقی فرد  
اور اخلاقی سوسائٹی کے اصطلاحی کلمات میں بیان کیلئے، معنیت  
جو انسان دین عالم کو بسیارست و نیست!  
اس وقت کان پور کے سرمایہ داران، اجتماعی طب کے دار التعمین

میں کھڑے کئے جا چکے ہیں۔ اب گاندھی جی و دیگر لیبر کن ان ریلوین کی متانی  
حرکات مذہبی کے چارٹ کے اندراجات کیا تھے ہیں۔ ان مانٹ داران  
دولت قومی نے کار خا جات کان پور کی گزشتہ متعدد دسترخوانوں  
میں فائز دشاؤنڈ نارنگ مزدوروں کا نفس سہل دیکھا: تاہیں حرفت  
کے مراعاتی قانون سے پرانا فائدہ اٹھانے کے باوجود مزدوروں کی اجرت  
کو قوت لایوت کے بیاندہ تنگ تک بھی نہ پہنچایا: روٹی کے بھانڈے کرنے  
کے نتیجے میں ہندوستانی کا ششکار کو کر دوں کا مجموعی خسارہ ہونے کے  
علی الرغم، کار کا ہوں کے بازائی ساختہ کرپے کے زرخ میں مطلق کسی تغیر  
پر ناگدی کا اظہار نہ کیا۔ حکومت کی مامور کردہ تحقیقاتی کمیٹی کے سامنے پاک  
حساب کے سارے اذکار کے بارصفت حاسبہ کتب حساب سے عوامانہ گریز  
کیا۔ کمارگری وزارت کی تنبیہ پر بھی کمیٹی کی نہایت معتدل سفارشات  
کو عملی جامہ پہنانے سے انکار کر دیا۔ حکومت کی حرکات پر خود اس کی معذور  
کر وہ کمیٹی کو گونا گوں اصطلاحی سے منا بطلوں کے ارتکاب کا ملزم کر دنا۔  
لیبر کمیٹی سے اشتراک عمل کرنے کے بجائے اس کے ارکان کو عین وقت آخر  
پراپی سفارشات میں ترمیم و تحریف کرنے کی سازش کی اثر آفرینی کی: ابتدا  
اعلان اسٹراٹک کے بعد کارخانوں کو کھلنے کی کوشش کی اور پھر تالی  
مزدوروں کے راستے میں لیٹے ہوئے اجسام کو خوام ناذاک سے ٹکراتے ہوئے  
اپنی ٹیکڑوں کے دفتروں کے کاشانوں میں دڑاتے ہوئے چلے جانے کی  
مشتوقانہ حفا کار یوں کی نمائشیں کیں: چالیس بچاس ہزار کے درمیان  
مزدوروں اور ترقی یافتہ ٹراکٹورس رکھنے والے مزدور خاندانوں کے ذہن پچ  
کو بے آب وناں اور شایبہ خاں سمجھ و گریہ تھی۔ شکر دار ولایت  
کی بہشتوں کی طرف رخ الی اسما فرماتے! — سجان اللہ بریں آت  
دارائی دولت قومی: سب علی بریں تلج پذیر بی سلطان سرمایہ واری!  
ہندوستان کے سرمایہ دار مہاتما گاندھی کے گویہ پر اس سے  
بڑھ کر شرح صدر کا بغوث نہیں دے سکتے۔ جتنا کہ پر یڈیٹ رڈو لٹ  
کے پند گرام تنہید معیشت پر امریکن ملک التجار نے دیا ہے۔  
مایخیت آدم بغیر گراست قوت قوی زکی گراں میداری!  
موجودہ ملے پر بھی ارتقاء بشریت کی پماندگی کا ریفشہ ہے: یہ  
ہاں نور بشر میں نہیں ہے اب تک انسان رو راست پر نہیں ہے اب تک

اللہ کو ہونے والا کہ جس اعدائوں نے ہمارے دل میں اب تک  
شریعت کا دیرینہ سلطان، نیز اس کے لئے ایک جدید فاحشکار برآمد  
نہیں کیا ہے؛

خواجہ انور بن رجب مزدوری صاحب و صاحبزادہ خدایاں کشتہ بختاں خراب  
انقلاب ! انقلاب ! اے انقلاب ! (۱-۱۰-۱۱-۱۲)

## لیبر کمریسی

لیبر کمریسی کے نام سے آل انڈیا نیشنل کانگریس نے ایک مہم کا  
ادامہ قائم کیا ہے جس کے اغراض و خدمات کی نوعیت کا ایک عمومی  
نقدور اس کے نام ہی سے قائم کیا جاسکتا ہے، یہ جدید معینہ آئینہ کے  
ہندوستان گیر کانگریسی ایوان حکومت کا ایک پورا یا پر دو بال مستقل حکمہ  
بن سکتا ہے۔ اور یہ امکان بھی چنداں بعید نہیں کہ وہ مستقبل کی سوشلسٹ  
حکومت ہند کا تمام ثابت ہوا جسے شاید کہیں بغیر برادر پروبال!  
بہت سی۔ یوپی۔ تیار اور بروئے و جزیرہ میں حرقی مزدوروں کی زندگی و  
لازمیت کے حالات کی جو تحقیقات ماضی قریب میں عمل میں آئی ہے۔ بے  
درد گاہوں کے بارے میں جو اعداد و شمار جمع کئے گئے ہیں۔ اوقات خدمت  
کی ساعات میں جو تخفیف اور مضارہ اجرت میں جو اضافہ ہوا ہے۔ افتاد  
مرض و برہ میں جو رعایتیں منظور ہوئی ہیں۔ زانہ مزدوروں کو ایسا موضع  
محل و ابتدائی زمانہ زندگی میں جن مراعات کی سفارش کی گئی ہے۔ نیکر پڑاؤ  
کی جو توسیع عمل میں آئی ہے۔ بچہ بردار مزدوروں کی خدمت کے کارخانات  
و مقامات میں سو ویٹ آداب حکومت کی اتباع میں شیر جھاڑوں کے لئے  
جن گھبراہٹوں کی مبارک جدت کا اجرا کیا گیا ہے، وغیرہ کچھ، ان تمام  
حرقی و مزدوری و اسلئے عنوان حیات و وطن کے تحت جس قدر قابل ذکر  
و دادا تہ نشو و نما مختلف کانگریسی صوبوں اور بعض ترقی کو ش رہاستوں  
کے اندر ظہور میں آئی ہے، اس پر کسی لیبر کمریسی نے اظہار امتحان کیا ہے  
ادراں سرگرمیوں کی مزید ترقی و توسیع کی باصرہ و تکرار متعلقہ جاعتوں  
اور حکومتوں سے فرمائش و سفارش کی ہے۔ کانگریس کا یہ اہم شہدہا ہے  
پرجوش خیر مقدم کا مستحق ہے؛ (۱-۱۰-۱۱-۱۲)

## ماہرین کی کمیٹی

کانگریسی صوبہات ہند کے وزیر نے اپنے حال کے اجتماع  
بہت سی کی تقریب سے ماہرین کی کمیٹی کے قیام و انتخاب کی ایک غیر معمولی  
جوڑ پیش کی۔ اس اجمال کی کچھ تفصیل ملاحظہ فرمائیے؛

ماہرین فن کی ایسی کمیٹیاں جو مخلوط و مشترک علمی و فنی و حرفتی  
و حکومتی مسائل و مہمات پر متعلقہ ارکان حکومت کو مشورہ دیں تاکہ  
آزادہ فکر کی تعمیری تجاویز پیش از پیش کامیابی سے بار آور ہوں۔  
اپنے وسیع ترین مالودا علیہ میں ایک بالکل جدید اہم تصور ہے۔ مہذب  
ممالک کی حکومتیں اگرچہ صدیوں سے دینی شمس سے آزاد ہو چکی ہیں اور  
ای تقریب سے "ایوان حکومت اور حرم کلیسا کا افتراق" عمل میں آیا ہے  
لیکن اس الہامی محور سے لنگر گستا ہو جانے کے بعد ان کو کوئی دوسرا  
معینہ مرکز نقل بھی نہیں ملے۔ ان کا عام ترقی پسندانہ، متمدن زادہ  
نکاحہ کافی نہیں کہا جاسکتا۔ عالم غیب کے الہامی دین سے ان ریاستوں  
نے جو رہائی حاصل کی تھی وہ عالم غاہر کے مثبت علم و سائنس کی علم کشتی  
پر کی تھی۔ لیکن اس پس منظر کی روشنی میں انتقالی حکومت کا داخل خارج  
عین صحیح فزق کے نام نہ ہوا۔ ہم "پادریوں کے بچے" سمجھے اور "پالیشنوں"  
کے چٹل میں چٹس گئے؛ علم کی حکومت نہ وہ تھی، نہ یہ ہے؛ ہمارا نقل  
مکان، کورانہ عقیدے سے عام سیاسی توہمات اور قوم پرستانہ  
انصبات کو ہر گیا۔ مزدور تھی کہ گلو غلام شہری کا ہر کچھ جہل و وجود  
سے چھڑا کر عین علم و فن و تقدم و تقدیر کے دست بعیت میں دے دیا  
جائے، اور جہاں پادری اور غلامی سیاسی ہر دو کو سرستہ حکومت  
سے خارج البلد کر دیا جائے۔

انسانی و ماشا ابھی تازہ تازہ ہی اس نقدور کی علمی الاطلاق بوسبت  
و قطعیت سے آشنا ہوا ہے۔ چنانچہ اس مسلک سیاست و حکومت کی  
ترجمانی کے لئے جو اصطلاحی نام تجویز ہوا ہے وہ "یکنو کریسی"  
(۱-۱۰-۱۱-۱۲) ہے؛ — یعنی نظم و نسق علم و فن؛

کانگریسی وزراء کی موجودہ کمیٹی ماہرین اسی تصور کا خواب ابتدائی  
ہے؛ اور اسی نئی تبدیہ امر کا نقش اول۔ ان حکومتی کمیٹیوں کے

ایک پیش کردہ ٹکٹن، سر سوسائڈ ریڈائیائے صنعت و انجینئرنگ کے اکٹھا  
غفلت و غلامت واقع ہوئے ہیں۔ (۱۰-۱-۱۸)

## دہلی اور نئی دہلی

دہلی کی میونسپلٹی میں ماہ محنت کے دوران میں میونسپل کمیٹی کے غیر  
سرکاری صدر کی تائید میں اک بلند آہنگ ریزولوشن پیش ہوا جس پر  
ایوان کی دونوں پارٹیوں کے درمیان جنگا منیجر محاذ لہ ہوا۔ باہر نزع  
یہ چیز تھی کہ پانچ تخت سلطنت تہنہ کی ۵۰ سالہ میونسپل کارپوریشن کی  
پیرنایا بلنی "کایہ کیا حال ہے کہ بایں ہمدیش شش اس کی سند صدارت  
پراس کا خضرہ اک سرکاری حاکم چلا آتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ کہاں تک  
قابل برداشت شرمناکی ہے؟

دلی صدیوں اور قرون سے ہندوستان سلطنتوں کی تحکاک  
بنی ہوئی ہے۔ بس اس کے رگ و ریخے میں طاقت کے سامنے سجدہ ریزی  
کا ذوق غم جو چکا ہے۔ سلطنتوں کے پانچ تخت سیاسی سطوت کے قلعے  
ہوتے ہیں اور اخلاقی بزدلی کے زمانہ خانے؟ یہاں کا ہر شخص طبعا "امیر"  
ہوتا ہے۔ اور ہر امیر غلظت اک "خدا ہے سرا" دلی کا ایک ایک چپہ اور اس  
کے کرہ باد کا ایک ایک جرمہ ہوا اسی روح کی پرورش کا دیرینہ وارث  
ہے۔ پس عہد جدید کی ساری طاعت سنگینوں کے علی الرغم یہاں کا  
قدیم الایام سیاسی سوسنات "آج بھی خاصا باب و تاب ہے۔ البتہ اس  
معبود کے مجاوروں کی اکثریت محمود غزنوی اور براہم جیل اندک کے علم یو  
مدھیوں کے خانوادوں سے بھرتی ہو اگتی ہے

اگر حقیقت اسلام و جہان بین ست ہزار خندہ کمرست برسلانی  
چنانچہ انگلستان کے سیاسی سینیٹ ہال میں جو لڑلہ زیر ذکر میونسپل  
ریزولوشن سے ڈالا گیا اس میں ایک سے ایک بڑھ کر ستون اسلام او  
برج توجہ دینے اس کی تزلزل بنیادوں کی پشت بنائی کی اور اپنے  
عقیدے میں اپنے عقیم کیمیز اپنے "نفع کثیر" دونوں کے تحفظ کی ضمانت  
کر لی! یہ  
نوجہا ہے تو بے خاک بھی اک بندہ پاک میں خدا کی کو بناؤں جو خدا تو ہر جگہ

اللہ اللہ سرکاری صدر کا نقلی الہی؟ — اگر آپ کہیں کہ غیرت قومی  
کے لئے یہ تصور بھی کسی درجہ شرمناک ہے تو معاف فرمائیے۔ ہمارے قوم  
جابلوں کی آنکھوں پر ایسے سمایا غلط پڑے ہوئے ہیں کہ وہ اس ذلت  
آخری کے دیکھنے سے نفقہ قاصر ہے! ساتھ ہی خان بہادر آنا بلند باگ  
اسم اعظم ہے کہ ہر جاہل کا سامع اس کے تلفظ ہی پر مرعوب ہو جاتا ہے!  
نئی دہلی کی حالت پرانی دلی سے کہیں زیادہ ناگفتہ بہ ہے۔ براہم  
ایشیا کا یہ جدید ترین شہنشاہی شہر و تیانوسی ترین آئینی زندگی رکھتا  
ہے! یعنی اس کی ملکہ عالیہ کے ایوان ذی شان کی کرسیوں کو ایک بھی  
غضب شدہ ممبر کی نشست و اغذار نہیں کرتی؛ یہ پارلیمنٹوں کی والدہ العابدہ  
والی قوم اک آزاد شہر ہے۔ یا شبلی قاسم انجینئر کا مستقر استبداد  
حصار کان بلو؟ (۱۰-۱-۱۸)

## یورپ

یورپ کے سیاسی ہیجان و مجراں کی دیک "سکون و تہریہ پر آتی"  
مسلم نہیں ہوتی۔ مسٹر جیمز کین صدر اعظم برطانیہ، اپنے محبوب عقیدے  
میں اک تھ شغلہ کر اٹھے تھے۔ جس کی نسبت ان کا راجح ایمان یہ تھا کہ  
اگر اللہ شافی۔ اللہ کافی کے زمرہ ہائے دُعا کے زیر سایہ اس کے پلانے  
کا موخہ انہیں دیا گیا تو وہ فریجی براہم "اور اس کے بعد ہفت اقلیم کے  
اس رفت کی متاع کم گشت کو آپ کی ہتھیلی پر لگا کر رکھ دیں گے! —  
انہوں نے پہلے تام یورپ پر اک نگاہ غلط انداز دلی اور بیک نظر  
اس کے ماؤٹ ترین نقطہ بدن پر اچھلی رکھ دی! یہ عبارت تھی  
امی سے!

انہوں نے کہا کہ یورپ کا اصل فتنہ گز مسیحی ہے۔ اور اس کے  
جذبہ فتنہ گری کا نوری علاج شافی اک معامہ ہے۔ یہ معامہ اتنی  
خاتما کر چڑھے کہ اگر تریغا لگاویکو برآمد کی جوتی پر کھٹے ہو کر بھی وہ  
اس کی اثر آفرینی مسیحی سے کریں تو سٹائی مدبری کوئی بات نہ ہوگی۔  
پورے، لاغرا نام جیمز کین کا دل ایسا ٹوٹ کے سولہ بی کے تسلیں خلد  
خالی پر یا کہ عجزوں کے عشق بیتی کا درمان سر دہ گیا ہے۔

برّی طرح چراغ پا کر چکا ہے۔ لیکن وہ منہ رہے کہ سکتا ہے کہ حالات اب اک  
نقصہ باریہ بن چکے ہیں مستقبل کی لامحدود دوریوں تک روتہ اور برتن  
غنا بٹیاں نظر آتے ہیں! چنانچہ اسپین سے سویٹینی کی موعودہ دست کشی نے یہ کیشہ دکھایا کہ  
فرینکو کے دست و بازو میں شاید وہ چند قوت آگئی۔ اور اس نے سارے  
اسپین کو بھرا دیا تو اس اور بھراؤ کے سوا مل کے درمیان پامال کر ڈالا!

انگلستان کے بعد اب فرانس دو سرا شکا پر ابلہ فریبی بن رہا ہے  
وہ جب انگلستان کی سی تلخ پیشگی سے حاضر نظر آیا تو سہلے اپنے تازہ  
دم جیوش قدرتی حصار پر تیز پر دوڑا دیے! تجویز یہ ہے کہ انگلستان کے  
بے دردانہ و بزدلانہ سکوت سے فائدہ اٹھا کر فرانس کو مرعوب و مغلوب  
کر لیا جائے۔ دُوس سے بھی اس کے رد ابط و دستی منقطع کر دیے جائیں  
اور سارے خرشوں کو صاف کر کے دنیا کا اک نیا نقشہ بنایا جائے جس پر  
فرانس اور انگلستان سے طوعاً یا کرہاً دستخط کر لے جائیں۔ کنٹرول کا یہ بے  
پناہ جلوس رواں دواں ہے۔ آج کل وہ زیکو سکو د کیما کی جرمن سرحد  
کو پھیرے دے رہا ہے۔ بہت جلد یہ امر مفخر اخبارات میں اساتذہ  
بزم و انجمن بن جائے گا۔ (۱۰-۱۱ خ)

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ تیش غالب کو لگنے لگے اور بھجائے دیئے:  
اتنی کے آہنکر زادے“ پر پہلی قربانی ستر چیر لین نے اپنے نوجوان زونڈ  
سیاست کینان ایدن کی چڑھائی جس غریب نے اضطراب کہہ دیا تھا کہ  
آپ کس مزدوم و زکو اپنا ڈیڑھا رہے ہیں؟ صاحب حال چیر لین نے ایدن  
کو جھڑک دیا! اور ع

گفت خامش مشو مجھوں نیستی

بالآخر چیر لین اور سویٹینی کی بغل گیری میں حال کوئی کاشا نہ رہا۔ اور  
آزادانہ ان کی پیش کش عشق کے کار و بار شروع ہوئے۔ وزیر اعظم انگلستان  
نے بھراؤ دم کے پورے نصف پانی سے تیش خوار آل دیون کا غضب ٹھنڈا  
کیا، لیکن قبل اس کے کہ اس علی تدبیر کے اثرات مرتب ہوں۔ ہر سہلے اپنے  
کاغذانہ کرب کے سارے جہنم کی حرارت کو اپنی جلو میں لے روتہ اُدھمکا!  
اس نے اپنے کمر جو شش معالقت اور تیش خور و خطبوط سے اٹلی کی فضا  
میں جو تیز ہوا کی امواج پیدا کیں ان کی پیا شش آپ سویٹینی کی مابعد تغیر  
جنیو آئے کیجئے۔ جس میں اعلان کیا گیا کہ اُٹلی اور جرمنی کا اتحاد غیر متزلزل  
ہے۔ دونوں کو جو طاقت و نفرت نصیب ہوئی ہے وہ ایک دوسرے کی  
پشت گرمی کا نتیجہ ہے۔ جرمنی کا الحاق آسٹریا پر ہمارا صا و لوگوں کو

جو منزلت انساب ہو جاتے ہیں  
اک رخ سے مگر خراب ہو جاتے ہیں  
انسان کے سینے میں تہذیب کے ہمراہ  
کسی عجیب بادیاب ہو جاتے ہیں!

پامال خزاں طرب کا گلشن ہو جاتے  
رنگین شربتِ خون سے دامن ہو جاتے  
سب دل کی تانیں نکل جاتیں اگر؟  
انسان کو زندگی اجسیر ہو جاتے!

# گورنمنٹ میسور سلائیٹری

کی جی ہونی جارہا، کریب

Fastidious people -

یہاں سائن ملاحظہ فرمائیے یقیناً

آپ ان کی عمدہ بناؤں کو

خوبصورتی کو دیکھ کر ہندوستانی


صنعت پر تحیر رہ جائیں گے

کیونکہ وہ بالکل ایسی ہی عورت

بنی کارآمد، دیرپا اور مضبوط

Govt. Silk Weaving Factory

MYSORE



مال سے تیار کی جاتی ہیں، جیسے ولایتی، کثیر تعداد میں نئی قسم اور  
جدید ترین ڈیزائن کے نمونے ملاحظہ فرمائیے۔ یہ خالص اور مضبوط  
خالص ریشم سے تیار کی گئی ہیں۔ اس میں کسی قسم کی ولایتی یا نقلی  
آئینہ نشانی نہیں ہے۔

## گورنمنٹ سلائیٹری میسور

ایجنٹ برائے دہلی اور صوبہ جات متحدہ

میسرز گوگل چند رکھنہ، اینڈ کمپنی سودیشی کلا تھ پریس  
دہلی کلا تھ مارکیٹ، لکشمی بازار گیٹ۔ کونسل روڈ دہلی

## عروسی

یہ ایک کامیاب علاج ہے جو بعد از روغن عروس تزیین دیا گیا مگر دراصل  
عروسی کی کامیابی کا راز شہناشائے خریداران طشت اذہام کیا جاتا ہے جو بہت  
اشارہ اشتہار میں لکھا جاتا تھا۔ لیکن اس طرح پر خط و کتابت کی طوالت کو  
کو تکلیف دہ سمجھتی۔ تاہم دوسروں کے متناہی میں کامیاب اور مانگ زیادہ تھی  
اور صاحب بنسبت کو خاص طور پر لکھا جاتا تھا اگر لاٹری کے سوا پیش پس  
میں نامہ واری و کچھ ہوتا ہے وہ شیشیاں جو دن میں بالکل اس عیب کو رفع  
کروں گی، موافق ہدایت استعمال کریں جن کی قیمت مبلغ صفر ہے۔ پھر عروسی کا  
استعمال طاقت رفتہ اہلکار کو دائمی نفع کا باعث ہو گا۔ ورنہ معمولی شکایات تو  
عروسی کھودے گی یہ علاج ہر موسم میں ہو سکتا ہے۔ اس کے ہمراہ چار چیزیں  
موسی، بناقی، بھیدی، ٹیٹی اور دی جاتی ہیں ایک سٹ عروسی ہنر سب کو کافی  
ہوتا ہے جس کی قیمت چم علاوہ محصول ڈاک مقبر ہے۔ صاحب فرمائش نام  
بہ خوشخط تحریر فرمائیں۔

## شفا خانہ رضویہ چاندنی محل دہلی

### ناظرین رسالہ کلیم

اگر آپ ادب اردو کی خدمت کرنا چاہتے ہیں  
اگر آپ کلیم کی خوبیاں میں خاطر خواہ اضافہ دیکھنا چاہتے ہیں  
اگر آپ ملک کے بہترین شعرا اور ادبا کے حصے بڑھانا چاہتے ہیں  
اگر آپ اپنے علمی و ادبی ذوق کو ترقی دینا چاہتے ہیں  
اگر آپ اردو کو ہندوستان کی واحد زبان دیکھنا چاہتے ہیں۔  
اگر آپ ماضی اور حال کے شعرا اور ادبا کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں  
اگر آپ ایسی کتب کی ضرورت کو محسوس کرتے ہیں جو ملک کی ضروریات کو مدنظر  
رکھ کر لکھی گئی ہیں۔

اگر آپ بکفایت بہترین اخلاق اور ادبی کتب خریدنا چاہتے ہیں

کلیم بک ڈپو، جینتی نواس نمبر ۱۰ دریا گنج دہلی سے خریدیے

# عالمی نجاب شرف الملک بہادر حکیم دلہن خان صاحب کی چار منظرہ عیادت

|                                                                                                                                                                                                                                                                                      |                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                       |                                                                                                                                                                                                                            |                                                                                                                                                                                                                                                                                         |
|--------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------|---------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------|----------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------|-----------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------|
| <p>روغن فیض رساں نہرا<br/>اسے ہر صبح و شام عضو پر مالش کیا<br/>کیا جاتا ہے۔ آٹھ دس روز کے<br/>استعمال سے عضو مخصوص کی<br/>کبھی کبھی، ڈبل پین بلا تکلف دور<br/>ہو جاتی ہیں جن لوگوں نے جوانی میں<br/>بد اعتدالیاں کی ہوں ان کے<br/>لئے یہ روغن اکیر ہے۔ قیمت فی<br/>شیشی تین روپے</p> | <p>حب مقوی عنبر و جواہر اہلی<br/>ان گولیوں کے چند روزہ استعمال سے آپ<br/>لطف جانی حاصل کر سکتے ہیں۔ بڑھاپے<br/>کو دور کر سکتے ہیں۔ اور از سر نو اولاد<br/>پیدا کرنے کے قابل بن سکتے ہیں۔ پندرہ<br/>اور بے روغن چہرے کو تروتازگی اور سرخی<br/>میں تبدیل کر سکتے ہیں صفت باہ اور گڑبازی<br/>کے مریضوں کے لئے یہ گولیاں آجیٹا ہیں قیمت<br/>فی دہجن پندرہ روپے اور ایک کتے دت دو روپے</p> | <p>اکیر دوق<br/>تب دوق، بالخصوص بڈیوں<br/>کے تب دوق کی بے نظیر اور<br/>لاجواب دوا ہے، بڈیوں کی<br/>بے قاعدگی اور ناسور کے لئے<br/>بھی لاجواب چیز ہے۔ قیمت<br/>فی شیشی جو پندرہ روز کے لئے<br/>کافی ہے<br/>پانچ روپے صر</p> | <p>لاکاپیداکر نیلی گولیاں<br/>ان گولیوں کے استعمال سے شریطہ<br/>اور جھکی لاکاپیداہوتا ہے جس شریطہ<br/>پر آپ چاہیں قینا یا لاکا ہونے کے<br/>بعد رخم آدھارنے کا اقرار نامہ<br/>بھی کر مفت منگو سکتے ہیں۔ اس کے<br/>لئے ہر جگہ ایکشنوں کی ضرورت<br/>ہے پیشگی قیمت دس روپے<br/>مقرر ہے۔</p> |
|--------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------|---------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------|----------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------|-----------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------|

نئے کا پتہ: شاہی مطب نرود جامع مسجد دہلی - ٹیلیفون نمبر ۶۲۵۵ - نہرت سنت ارسال کی جاتی ہے

## مصری جدید برقعہ

دو حصوں میں منقسم



تشریح زیریں حصہ



تشریح بالائی حصہ

سر سے شروع ہو کر ہاتھوں کی لمبائی تک رہتا ہے، اس میں نہایت خوبصورت  
چٹا دار ٹوپی ہے جس کے پہنے سے نہر کا شیف ظاہر ہوتا ہے۔ کتنی تکلیف  
بشرط دلپس منگائیں، ناپ کندہ سے پہرے کے ٹخنہ تک اور سر کی گولائی تک ناپ رواں کریں۔ قیمت سفید یا رنگین سو تی چھ روپے۔ نس  
روپے۔ کرپ سٹاک بارہ روپے۔ جو شکی پندرہ روپے۔ ناپ کندہ ہونے پر اسی روز واپس کر دیں۔

خاتون اسٹور نمبر ۱۳ چاندنی چوک دہلی

دفعہ ۱۹۳۸ء  
۲۱ جون  
کیم

WIN  
Rs 3,000  
۳۰۰۰

دفعہ ۱۹۳۸ء  
۲۱ جون  
کیم

تین ہزار روپہ

تمام مذاہب اہل اہر متفق ہیں کہ انسان اپنی تقدیر خود بناتا ہے، کیا آپ بھی جانتے ہیں کہ آپ کی تاریخ قسمت ختم زون میں روشن ہو کر آپ کو اس پر ترس انسان بنا دے یقین جانیے کہ آپ کو یہ درجہ حاصل ہو سکتا ہے، جس کا کھلا راز یہ ہے کہ آپ اس آسان ترین سمت کو حل کر کے بغیر کسی شک و شبہ کے سبجی اور تین ہزار روپہ کی رقم تقدیر میں حاصل کریں یا درجہ کبھی ہذا دیگر مجموعی کمپنیوں کی طرح دھوکا باز نہیں ہے۔ دھوکا نہایت

| اشارات                                  | مترہ        | جوابات      |
|-----------------------------------------|-------------|-------------|
| ۱۔ میریں صدی کی حیرت انگیز ایجاد        | ر ی ڈ ی ڈ ی | ۱۔ ریڈیو    |
| ۲۔ خواہش - آرزو                         | ن و ق       | ۲۔ نو       |
| ۳۔ برصورت میں اسات کی غولی ہونی ضروری   | م و ر ت     | ۳۔ مروت     |
| ۴۔ ہندوستان کی ایک فلم کمپنی            | ن ج ی ت     | ۴۔ نوجوا    |
| ۵۔ ہنسنی - مخول                         | م و ا ق     | ۵۔ موزیک    |
| ۶۔ انسان سے حاصل کر نیے کے جناب ہو جائے | ر ا و       | ۶۔ راولپنڈی |
| ۷۔ سر زمین بھارت کا مشہور رشتہ          | ک م ی ر     | ۷۔ کرم      |

لے کر آپ ہم سے قانڈا نا پانچھند روپہ کا نقد انعام لے سکتے ہیں  
نقد مل کر فی کس طریقہ بڑے خالی خاؤں کو اس طرح سے بھر کریں کہ بڑے  
بڑے اشارات کو اپنی منہی خیر انعام بن جائیں جس طرح نمبر کے خالی نمائندہ  
میں صورت حق اور ق کاٹنے سے نظارہ ریڈیو بن جائے جو مطلوبہ نقد ہے۔  
شرائط میں داخلہ فی مل صرف چھ آئے ہے۔ اور ای حساب سے آپ  
جس قدر چاہیں مل بھیج سکتے ہیں۔  
۱۔ ایک مل فی فیض داخلہ کمپنی کی صورت میں اور ایک سے زائد کی بڑے  
بہتر ڈیویڈنڈ اور پائل آرڈر آتی چاہیے۔  
۲۔ ایک مل بھیجے والا کتبہ عشق مہمانی پلے کا اعتبار ہوگا۔  
۳۔ تمام مل ۲۵ جون ۱۹۳۸ء تک پورے ہو جائے ضروری ہیں۔ سید کا نقد نام  
بھی مل بھیجے جا سکتے ہیں۔

۴۔ اس سمت کا مفوضہ کو در سر پھر مل ۲۵ جون ۱۹۳۸ء تک کے اخبارات میں شائع کر دیا جائے گا۔ نتیجے کے دن دفتر کیمپن میں ہر شخص جلد روک ٹوک آسکتا ہے۔ ضرورت پڑنے پر منبر کو  
ارتھ داخلہ بدلے کا اعتبار ہوگا۔

نوٹ۔ ڈائریکٹ سبجی کی ضرورت نہیں۔ ہر کمپنیز کو مکمل نتیجہ سے منبت آگاہ کیا جائے گا اور جیتیم انعامات میں کوئی غنیمت نہ کی جائے گی۔  
پتہ۔ مینجر دی پبلک ریسروئیز کمپنیز لیمیٹڈ (پنجاب)

# ہندوستان کا ترمین سیاسی مسئلہ فیڈریشن یا وفاق کا قیام ہے

اس موضوع پر اردو زبان میں پہلی بار ایک جات اور دھبہ کنی بآسان  
زبان میں شائع کی گئی ہے۔ اس کا نام "وفاق ہندوہ"۔ وفاق ہند کے مطالبے  
مسئلے سے معلوم ہوجاتا ہے کہ مذکورہ موضوع سے لے کر انجک ہندوستان پر  
پرس طرح حکومت کی گئی ہے۔ اور جدید آئین ہندوستان کی رو سے کس قسم  
کی فیڈرل یا وفاق حکومت قائم کی جا رہی ہے۔ وفاق ہند میں وفاق کی  
تشریح کر کے بتایا ہے کہ اس ڈھنگ کی حکومت کس طرح چلائی جاتی ہے، اس  
کی تاریخ کیا ہے اور اس حکومت کے دستور اور اجرائی کیا ہوتے ہیں۔ قدر  
۱۹۳۳ء سے لے کر ۱۹۳۷ء تک طرح حکومت میں جو جو آئینی تبدیلیاں ہوتی  
ہوتی ہیں، ان کو بھی اہل زبان کر دیا ہے۔ ریاستوں کی قدیم و جدید پوزیشن پر  
پوری طرح روشنی ڈالی ہے۔ مرکزی اور صوبائی حکومتوں کے اختیارات،  
ان کا دائرہ عمل، مرکزی اور صوبائی کونسلوں اور اسمبلیوں کا طریق انتخاب  
صوبائی حدود انتظامیہ، گورنر جنرل کی عطا کردہ پوزیشن، برکے کا بند و بست،  
سرکاری دفتروں، مرکز، صوبوں اور ریاستوں کے انتظامی تعلقات، وفاق  
مالیات، انصاف و عدالت۔

غرض جدید دستور کی کوئی ضروری بات چھوڑی نہیں ہے۔ آخر میں پانچ  
صفحے بھی ہیں جن سے نفس معنوں کی مزید تشریح و توضیح ہوجاتی ہے۔ چاہا  
نفسہ بھی دے ہیں۔ زبان نہایت سادہ، اور انداز بیان نہایت سہل ہے۔

لکھائی، چھپائی، کاغذ اور تیاری بہترین ہے

قیمت صرف ایک روپیہ

کلیم بک ڈپو۔ دریا گنج نمبر ۱۱ جنتی نو اس دہلی

## دولہا بھائی

مجھے دہلی سے پری جمال صاحب مرزا لاہور آئے ہیں تم سے ہرگز نہ ہوں گی یہ میری ہی کو استقبال کرتے  
ہوں وہ دہلی کے ایک خانہ دانی تھیں صاحب کا چارہ کہ ہے خوشیوں کا جواب اور خانہ دانی کی کسی بھی چیز  
جو چیزوں کا مرکز ہے مجھوں کا دو گار گورنہ و خوشیوں ہونے کی چیز  
پر پری جمال صاحب (دستور) کا رنگ کھو یا ہو پھر چند روز کی رہنے سے کل کی ہند  
خانہ اور دھبہ کی بنی طرح شروع رہنے لگا ہے کہ ہے۔ چہرے کی تمام جھانیاں۔ ہند سے دے دے  
دہلی میں رہے ہو جاتے ہیں۔ لیکن میں گھٹت ایک صاحب دانی ایک دوپہ اور  
زنا نہ سنگھار کیں اور ہر حال میں ہے۔ دہلی کے کہیں میں پانچ چوبیس اور ان کے کہیں میں آنکھیں  
صاحب ایک ایک (۳۲) پری ہار کالی جیسی کا قدر (۳۰) خوشیوں دہلی ایک ایک (۱۰) ہار ایک ایک  
(۵) زنا نہ صاحب ایک ایک اور ہار شہر نہ لڑ نکھار۔ جنت میں ایک ایک روپہ کا وہ نکھار ڈنگ

## لطف کی رات کیوں گزر گئی ہے؟

وہ صحت دہلی کے علماء قدیم خانہ دانی فریضی کے ایک غور عالی جانب ملک خود محبوب خان صاحب  
کی لکھی جاتے ہیں کہ وہ عجیب بات ہیں کہ کوہ عدن، افراط، امر کو نکال اپنے آئینہ ہونے کا خوشی  
ہے۔ آؤ آئیے اور میں عرض کیے۔

موسیقی پریم باست شباب کی جات ہے۔ جوت واسک کے لئے کا جواب خیر خیر ہے جنت و جنت  
آج ہند موسیقی خود عاشق بن جاتا ہے۔ جنت کی خوشی ہمارے ایک روپہ  
میں کی موج فہریدہ لڑتی ہیں گورنر شہر دلی ہوجاتے ہیں دہلی ایک روپہ آٹھ آٹھ  
ہند ہے۔ منہجر دو افغانہ لاہور قن بازار فرشتانہ دہلی

ادارہ ادبیات اردو کا تصور دلچسپ دہلی رسالہ

# سبکدوش

ذیرنگوانی  
ڈاکٹر سید محمد الدین قادری نور  
ذیر ادراست  
صاحبزادہ میکش (عثمانیہ)

پرنسپل جامعہ عثمانیہ  
سلا لاہ چند  
چار روپے آٹھ آنے (للہ)  
منوفہ کا بیچہ  
سات آنے

ملتی کا پتہ  
خواجہ حمید الدین بہتم سب قن  
رفت منزل۔ خیریت آباد۔ حیدر آباد دکن

# ادبی دنیا

ملک بھر کے جادو نگار ادیبوں اور شعراء کے بہترین افکار  
۸۲ دلائل و اسانے مضامین اور نقیص  
مشرق و مغرب کے بلند ترین صورتوں کے نظر افروز شاہکار  
۸۸ بہت رنگ و یک رنگ تصاویر

قیمت صرف ایک روپیہ چار آنے علاوہ محصول ڈاک

سالانہ خریداروں کو مفت

سالانہ چندہ پانچ روپے مع محصول ڈاک

آج ہی اپنا نام خریداروں کی فہرست میں درج کر اگر یہ بے نظیر تحفہ مفت حاصل کیجئے

مینجر رسالہ ادبی دنیا لاہور

نئے سال کا نیا تحفہ

آئی۔ سی۔ اس۔

اردو کے بہترین فسانہ نگار پروفیسر سید علی عباس حسینی۔ ایم۔ اے۔

مصنف ”رفیق تہائی“ سر سید احمد پاشا وغیرہ کے

چرچہ انقلاب انگیز افسانوں کا تازہ ترین، مجلد، ودیدہ زیب مجموعہ

ہیڈ آفس:- انڈین پریس لیڈنگ آفاد۔ یو۔ براہمنج:- لکھنؤ۔ لاہور۔ دہلی۔ جیلپور۔ بنارس۔ کلکتہ

سے طلب فرمائیے۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے

# مطبوعات ۱۹۳۵ء

ذکرہ دہلی مرحوم کا اسے دوست نہ چھوڑا خواجہ محمد شفیع دہلوی نے دہلی مرحوم کی داستانِ اہم، اس کے ایامِ عروج کی طرف اشارہ کیا، دہلی کا سنبھالا دستِ جناح کے کام سے یہ سن نہ ہرگز (مصابیحِ کمال کا تذکرہ اس کتاب میں کیا ہے جواب ناہو ہے، انڈیا بیان کیا مرثیہ کہ دل ہے اختیار ہو جا ہے، کتابت، طباعت اور تجدید کے لئے مکتبہ کا نام کافی ہے صفحات ۵۵ قیمت فی جلد ایک روپیہ

لطائفِ غالب (پہلے کے لئے اسے ضرور پڑھئے جنت ایک روپیہ۔

تین نئی شاعرِ فطرت حضرت مجاہد آبادی کے کلام کا مجموعہ، جو حضراتِ شعلہ طہر بر ایک دفعہ بھی اچھٹی ہوئی نظر ڈال چکے ہیں وہ شعلہ طور اس طرح لے پھرتے ہیں جیسے کہ لوگ زائد انقلابِ فرانس میں مجاہدہ عمرانی لے پھرتے تھے۔ اس ایڈیشن میں چند نئی سحرانہ غزل کا اضافہ کیا گیا ہے۔ بالکل نئی ترتیب۔ از حد دیدہ ذہب۔ بیچ بچی سہرا کور۔ اور جگر کی ایک مینیر تصویر۔ قیمت دو روپے آٹھ آنے

مردِ غالب کے کیا باب بلکہ نایاب فارسی کلام کا مجموعہ۔ اس میں قصائد، قطعات، شوبان، ترکیب بند، ترجیع بند۔ غزلیات اور رباعیات سید حسین (سب کچھ شامل ہیں۔ اس کے ساتھ ہی مردِ غالب کی مکمل سوانح حیات اور تعقیفات کا تذکرہ بھی شامل کر دیا گیا ہے قیمت ۱۲ روپے

مردِ غالب (مردِ غالب کی مکمل سوانح حیات، اب تک مرزا صاحب کی سوانح حیات پر باوجود مردِ غالب، غالب اور غالب نامیہ چھپ کر غالب (پہلی جس لیکن اس کے باوجود غالب کی زندگی کے بہت سے ایسے پہلو تھے جو تاریکی میں تھے۔ چنانچہ اس کتاب میں تمام ممکن ذرائع سے معلومات فراہم کر کے غالب کی زندگی کے تمام پہلوؤں کو اجاگر کیا گیا ہے۔ غرض یہ کتاب اتنی جامع اور مختصر ہے کہ شعر و ادب کا ذوق رکھنے والے حضرات کے لئے عمدہ اور پڑوسری کے طلباء کے لئے خصوصاً از بس مفید۔ قیمت آٹھ آنے

قرآن پاک کیا ہے اور اس نے کیا کر دکھایا؟ ہے۔ قرآن پاک آسمان پر کس طرح اترتا تھا؟ آپ کس طرح لوگوں تک پہنچاتے تھے کیسے اس کی حفاظت آپ نے اور آپ کے بعد صحابہ کرام نے کی۔ اور کیسے اس نے لوگوں کے دلوں پر اثر کیا۔ بہت مفصل سبب شامل قیمت چھ آنے

دہلی (پہلی دہلی کی خاص عمر توں کا دہمپ بیان جس کے پر سے دہلی کی مقرر تاریخ بتا دی گئی۔ ہلاک کی جو تصاویر۔ اچھی اور دہلی (پہلی دہلی کے دولٹے۔ قیمت چار آنے۔

## مکتبہ جامعہ

دہلی - سنہ ۱۹۳۵ء





